حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

خطباتِ حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے
مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے
جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشرز۔ کراچی۔ پاکستان

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جلد — ۳

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج وتحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب ونظر کو بالیدگی اور فکر وروح کو بصیرت وتازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ
بانی ومدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج وتحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم ونگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

معرفت باری تعالیٰ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ:...... فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ٥ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بجواب سپاس...... بزرگانِ محترم! ابھی آپ حضرات کے سامنے میرے ایک محترم بھائی نے دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے بزرگوں کی نسبت، نیز خود میرے متعلق جوکلمات ارشاد فرمائے (اس کے بارے میں عرض ہے کہ)۔ جہاں تک دارالعلوم اور اس کے بزرگوں کا تعلق ہے، یہاں تک یہ کلمات بالکل صحیح اور حق ہیں۔ دارالعلوم بھی بڑی جگہ ہے، اور وہاں کے اکابر واساتذہ بھی بڑے لوگ ہیں، بڑے ہی تھے، بڑے ہی اب بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک انہوں نے میرے متعلق فرمایا یہ ان کا ایک حسن ظن اور نیک گمان ہے۔ خود میرے اندر کوئی ایسی اہلیت وصلاحیت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ان بزرگوں کے جیسے یہ لوگ خوشہ چین اور وہاں کے فاضل ہیں، اسی طرح کا میں بھی وہاں کا ایک فاضل اور خوشہ چین ہوں۔

دارالعلوم کی ترقی غیبی قوت کی مرہون منت ہے...... جہاں تک دارالعلوم کی ترقیات کا تعلق ہے تو اس پینتیس سالہ خدمت کے دوران ہم نے اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ دارالعلوم کو چلانے والی کوئی غیبی طاقت ہے۔ یہ محض ایک تہمت ہے کہ فلاں مہتمم ہے۔ اس نے کوئی خدمت کی یا ترقی دی۔ یہ محض ایک راستہ اور وسیلہ کی بات ہے۔ ورنہ اس دارالعلوم کو بنانے اور چلانے والی ایک غیبی طاقت ہے، تہمت کے طور پر نام آ جاتا ہے کہ فلاں مہتمم یا منتظم ہے۔ اس نے یہ کیا اور وہ کیا۔ حالانکہ اس نے جو کچھ واقع ہوا، وہ سبھی کچھ من جانب اللہ ہے۔

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷-۲۸۔

کارِ زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں | مصلحت را تہمتے برآہوئے توبستہ اند

فارسی کا شاعر محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے اور حقیقتاً محبوب حقیقی حق تعالیٰ ہیں۔ کہ ''تیری زلفوں کا اثر ہے کہ مشک میں سیاہی بھی اور خوشبو بھی پیدا ہوگئی۔ تہمت کے طور پر نام رکھ دیا گیا۔ کہ مشک ہرن کے اندر پیدا ہوتا ہے''۔ ہرن بے چاری کی کیا مجال تھی کہ مشک پیدا کرے۔ اس کے اندر خون بھرا ہوا تھا۔ خون جما کر سیاہ کر کے خوشبو پیدا کر دینا، اے اللہ! یہ تیرا کام ہے۔ ہرن کا کام نہیں ہے۔ نام ہرن کا لگ گیا کہ اس میں خون جم کر مشک بن گیا۔ بنانے والا تو ہے۔ ہرن بنانے والا نہیں ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ میرے اندر کوئی خون بھرا ہوا ہے۔ یہ بھی اسے پتہ نہیں کہ خون میں خوشبو کس طرح پیدا کی جا رہی ہے۔ جب ہرن سے خوشبو نکلی، لوگوں نے کہہ دیا، ہرن میں سے خوشبو نکلی، حالانکہ ہرن بے چارے کو خبر بھی نہیں ہے کہ کہاں سے خون آیا ہے؟ کس طرح سیاہ ہوا؟ کس طرح اس میں خوشبو پیدا ہوئی؟

تو کہنے والے نے یہ کہہ دیا کہ فلاں آدمی مہتمم ہے۔ اس کے زمانے میں ترقی ہوئی۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ کس طرح ترقی ہوئی۔ کس طرح سے یہ دارالعلوم چل رہا ہے۔ یہ محض ایک غیبی طاقت ہے جو چلا رہی ہے۔ یہ تہمت کی بات ہے کہ فلاں نے ایسا کیا۔

حقیقت میں ایسے مخلص بزرگوں نے اس کی بنیاد رکھی کہ ان کے اخلاص کی برکت سے آج تک دارالعلوم چل رہا ہے۔ تہمت ہم پر آ رہی ہے۔ بلکہ ہماری برائی دارالعلوم کے سائے کے اندر دبی ہوئی ہے۔ اصل خیر اس کی ہے۔ چلانے والے نے اس زور سے پہیئے کو لڑھکایا تھا کہ وہ آج تک لڑھکتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ہمارا کام اس کو چلانا نہیں ہے۔ ہم تو خود اس کے ساتھ لگے ہوئے اپنا کام بنا رہے ہیں۔ ہمیں دین اور علم حاصل ہو رہا ہے۔ یہ دارالعلوم کا طفیل ہے، نہ کہ دارالعلوم کو ہم بنا رہے ہیں اور نہ اسے چلا رہے ہیں۔ اس کو چلانے والے نے ترقی دی ہے وہ غیبی طاقت ہے، جو چلا رہی ہے اور ان اہل اللہ کی برکتیں، جنہوں نے اخلاص پر اس کی بنیاد قائم کی، وہ چلا رہی ہیں۔

دارالعلوم کی روح معرفت خداوندی ہے...... کس طرح سے انہوں نے بنیاد قائم کی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ عارف باللہ تھے۔ اللہ کی معرفت، اس کے کمالات کا جاننا اور اس کی پہچان ان کے قلوب کے اندر تھی۔ اس معرفت اور پہچان کا ثمرہ تھا کہ انہوں نے دارالعلوم کو قائم کیا اور ان کی برکت سے یہ دارالعلوم چل رہا ہے۔ تو دارالعلوم کی اصل روح معرفت خداوندی ہے جس کے وہ لوگ حامل تھے جو ان کے اندر موجود تھی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''رَاْسُ الْعِلْمِ مَعْرِفَةُ اللّٰهِ'' ''سب سے بڑا علم اللہ کی پہچان ہے''۔

آپ پہاڑوں اور زمین کو پہچان لیں، اپنے گھر کو پہچان لیں، دنیا کے مور، تیتر کو پہچان لیں تو عارف نہیں کہا جائے گا۔ اگر اللہ کی ذات وصفات کو پہچان لیں تو آپ کو عارف کامل اور عالم کہا جائے گا۔ یہ بزرگ عارف باللہ تھے۔ انہیں اللہ کی شان جلال و جمال کی پہچان تھی۔ اس کی برکت تھی جو اتنا بڑا کام کر گئے کہ آج مشرق و مغرب

میں اس کا فیض پہنچ رہا ہے۔ساؤتھ افریقہ، ہندوستان سے آٹھ ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں بھی ان کے نام لیوا موجود ہیں۔ان کی برکت کا ظہور ہے اوران کی برکت معرفت الٰہی کے تابع تھی۔اس لئے اصل بنیادی چیز جو دارالعلوم کو چلا رہی ہے وہ معرفت خداوندی ہے۔غرض سب سے بڑا علم عالَم میں اللہ کی پہچان ہے اس کے لئے قرآن اترا، اسی کے لئے حدیثیں آئیں اسی کے لئے علماء کی جدوجہد ہے کہ اللہ کی پہچان حاصل ہو جائے۔

انسان خدا کو دلائل سے نہیں فطرت کے دباؤ سے مانتا ہے..... حق تعالیٰ کو پہچاننے کے طریقے قرآن کریم میں بیسیوں ذکر کئے گئے ہیں۔لیکن سارے طریقوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی قدرت کی کچھ نشانیاں انسان کے اندر موجود ہیں، کچھ نشانیاں کائنات میں باہر موجود ہیں۔ جوان کو پہچان لیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ تعمیر کو دیکھ کر معمار پہچانا جاتا ہے۔ لکھے ہوئے کو دیکھ کر لکھنے والا پہچانا جاتا ہے۔شعر کو دیکھ کر شاعر کی پہچان ہو جاتی ہے۔تو اتنی بڑی کائنات اور اتنی بڑی نشانیاں، انہیں دیکھ کر خود اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بنانے والا کوئی بہت بڑا ہے اور بڑی عظیم الشان ذات ہے۔جس نے اتنی بڑی کائنات بنا کر رکھ دی۔یہ کائنات از خود نہیں بنی۔ بلکہ ایک حکیم نے بنائی ہے جو اسے چلا رہا ہے۔ بہت سے دہریوں نے انکار کیا کہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ کائنات از خود بن گئی۔یہ بالکل جہالت ہے اور فطرت کے خلاف ہے۔دلیل سے آدمی اللہ کو نہیں پہچانتا۔ بلکہ دل پر ایک دباؤ ہے کہ مجبور ہو کر ماننا پڑتا ہے کہ ہے کوئی ذات۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ان کے زمانے میں مہدی جو اموی خلیفہ تھا۔اس کے دربار میں ایک دہریہ آیا، جو خدا کی ذات کا انکار کرتا تھا۔اس نے کہا میں نہیں مانتا کہ خدا موجود ہے۔یہ کائنات طبعی رفتار سے خود بنی ہے اور خود ہی چل رہی ہے،لوگ مر رہے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں وغیرہ۔یہ سب ایک طبعی کارخانہ ہے۔کوئی بنانے والا نہیں ہے۔یہ اس کا دعویٰ تھا اور اس نے چیلنج کیا کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا عالم ہو اس کو میرے مقابلے میں لایا جائے۔تاکہ میں اس سے بحث کروں،لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ اپنی طاقتوں کو خواہ مخواہ ایک غیبی طاقت کے تابع کر دیا ہے۔ جو سارے جہان کو چلا رہی ہے۔تو اس کے زمانے میں سب سے بڑے عالم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔مہدی نے امام صاحبؒ کے پاس آدمی بھیجا۔رات کا وقت تھا۔رات ہی کو خلیفہ کا دربار منعقد ہوتا تھا۔آدمی بھیجا کہ وہ آ کر اس دہریے سے بحث کریں اور اسے سمجھائیں اور راہ راست پر لائیں۔

چنانچہ آدمی پہنچا بغداد میں ایک بہت بڑا دریا ہے اسے دجلہ کہتے ہیں۔اس کے ایک جانب شاہی محلات تھے۔ایک جانب شہر،امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ شہر میں رہتے تھے۔اس لئے دریا پار کر کے آنا پڑتا تھا۔اس آدمی نے کہا اصل میں دربار میں ایک دہریہ آ گیا ہے اور وہ دعویٰ کر رہا ہے کہ خدا کا وجود نہیں ہے، کائنات خود بخود چل رہی ہے۔آپ کو مناظرہ کے لئے بلایا گیا ہے۔امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھا آپ جا کے کہہ دیں کہ میں آ رہا ہوں۔وہ آدمی واپس گیا اور کہا امام صاحب کو میں نے خبر کر دی ہے اور آپ آنے والے ہیں۔

اب دربار لگا ہوا ہے، خلیفہ، امراء، وزراء بیٹھے ہوئے ہیں اور دہریہ بھی بیٹھا ہوا ہے۔ امام صاحب کا انتظار ہے۔ مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں آ رہے۔ رات کے بارہ بج گئے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ندارد۔ دہریے کی بن آئی، اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب ڈر گئے ہیں اور سمجھ گئے ہیں کہ کوئی بڑا فلسفی آیا ہے۔ میں اس سے نمٹ نہیں سکوں گا، اس واسطے گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے اور آپ یقین رکھیں وہ نہیں آئیں گے۔ میرے مقابلے میں کوئی نہیں آ سکتا۔ اب خلیفہ بھی متامل ہے۔ درباری بھی حیران ہیں اور دہریہ بیٹھا ہوا شیخی دکھا رہا ہے۔ جب رات کا ایک بجا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہنچے، دربار میں حاضر ہوئے خلیفۂ وقت نے تعظیم کی، جیسے علماء ربانی کی کی جاتی ہے۔ تمام دربار کھڑا ہو گیا۔ خلیفہ نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ اتنی دیر میں کیوں آئے؟ آدمی رات کے آٹھ بجے بھیجا گیا تھا۔ اب رات کا ایک بجا ہے۔ آخر اتنی تاخیر کی کیا وجہ پیش آئی؟ شاہی حکم تھا۔ اس کی تعمیل جلد ہونی چاہئے تھی نہ یہ کہ اس میں اتنی دیر لگائی جائے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آ گیا۔ جس کی وجہ سے مجھے دیر لگی اور عمر بھر میں میں نے ایسا واقعہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں حیران ہوں کہ کیسا قصہ پیش آیا۔ اس شد و مد سے بیان کیا کہ سارا دربار حیران ہو گیا کہ کیا حادثہ پیش آ گیا فرمایا: بس عجیب و غریب ہی واقعہ تھا اور خود مجھے اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا قصہ تھا؟ جب سارے دربار کو خوب شوق دلایا اور سب سرتاپا شوق بن گئے۔ حتیٰ کہ خود امیر المومنین نے کہا کہ فرمائیے کیا قصہ پیش آیا؟ فرمایا: قصہ یہ پیش آیا جب میں شاہی محل میں اترنے کے لئے چلا ہوں تو دریا بیچ میں تھا دریا کے کنارے پر جو پہنچا تو اندھیری رات تھی، نہ کوئی ملاح تھا نہ کشتی تھی، آنے کا کوئی راستہ نہ تھا، میں حیران تھا کہ دریا کو کس طرح پار کروں۔ اس شش و پنج میں کھڑا تھا کہ میں نے یہ حادثہ دیکھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود لکڑی کے نہایت عمدہ بنے بنائے تختے نکلنے شروع ہوئے اور ایک کے بعد ایک نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ میں تحیر سے دیکھ رہا تھا کہ یا اللہ! دریا میں سے موتی نکل سکتا ہے، مچھلی نکل سکتی ہے۔ مگر یہ بنے بنائے تختے کہاں سے آئے؟ ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ اس سے زیادہ عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ تختے خود بخود جڑنے شروع ہوئے۔ جڑتے جڑتے کشتی کی صورت ہو گئی میں نے کہا یا اللہ! یہ کس طرح سے کشتی بن گئی آخر انہیں کون جوڑ رہا ہے کہ اوپر نیچے خود بخود تختے لگے چلے جا رہے ہیں۔

ابھی میں اس حیرت میں تھا کہ دریا کے اندر سے لوہے پیتل کی کیلیں نکلنی شروع ہوئیں اور خود بخود اس کے اندر ٹھکنے لگیں اور جڑ جڑا کے بہترین قسم کی کشتی بن گئی۔ میں حیرت میں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ تختے جو جڑے ہوئے تھے انکی درجوں سے پانی اندر گھس رہا تھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود ایک روغن نکلنا شروع ہوا اور ان درجوں میں وہ بھرنا شروع ہوا جس سے پانی اندر گھسنا بند ہو گیا۔

ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ وہ کشتی خود بخود میری طرف بڑھنی شروع ہوئی۔ اور کنارے پر آ کر ایسے جھک

گئی، گویا مجھے سوار کرنا چاہتی ہے، میں بھی بیٹھ گیا وہ خود بخود چلی مجھے لے کر روانہ ہوگئی۔ دریا کی دھار پر پہنچی پانی ادھر کو جار ہا تھا کشتی خود بخود ادھر کو جا رہی تھی۔ کیونکہ شاہی محلات ادھر کو تھے۔ میں حیران تھا کہ یا اللہ! آخر پانی کے بہاؤ کے خلاف کون اس کو لے جا رہا ہے؟ یہاں تک کہ شاہی محل کے قریب کنارے پر پہنچ گئی اور آ کر جھک کر پھر کنارے پر کھڑی ہوگئی کہ میں اتر جاؤں، تو میں اتر گیا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کشتی غائب بھی ہوگئی۔ گھنٹہ بھر اس کنارے اور گھنٹہ بھر اس کنارے پر سوچتا رہا کہ یہ کیا قصہ تھا؟

یہ سانحہ تھا جس کی وجہ سے تحیر میں کئی گھنٹے لگ گئے اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا ماجرا تھا؟ اور میں امیر المومنین سے معافی چاہتا ہوں کہ آٹھ بجے بلایا گیا اور میں ایک بجے پہنچا ہوں۔ دہریے نے کہا، امام صاحب! میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ بڑے عالم ہیں، بڑے دانش منداور فاضل آدمی ہیں۔ مگر بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ پانی میں سے خود بخود تختے نکل آئیں، خود ہی جڑنے لگیں، خود کیلیں ٹھک جائیں، خود ہی روغن لگ جائے، خود آ کے کشتی اپنے آپ کو جھکا دے، آپ اس پر بیٹھ جائیں اور خود ہی لے کے چل دے، خود ہی وہ کنارے پر پہنچا دے۔ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے دانش مند، فاضل اور عالم ہیں۔ امام آپ کا لقب ہے اور باتیں کر رہے ہیں آپ نادانوں اور بچوں جیسی؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کشتی بنانے والا نہیں، خود بخود بن گئی، کوئی کیلیں ٹھونکنے والا نہیں، خود بخود ٹھک گئیں کوئی روغن بھرنے والا نہیں، خود ہی بھر گیا کوئی چلانے والا ملاح نہیں، خود ہی چل پڑی۔ کوئی سمجھانے والا نہیں، خود ہی سمجھ گئی کہ مجھے شاہی محل کے اوپر جانا ہے۔ یہ عقل میں آنے والی بات ہے؟

امام صاحب نے فرمایا اچھا! بات نادانی اور بے وقوفی کی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! فرمایا: ایک کشتی بغیر بنانے والے کے بن نہ سکے، بغیر چلانے والے کے چل نہ سکے، بغیر کیلیں ٹھونکنے والے کے اس کی کیلیں ٹھک نہ سکیں، اور یہ اتنا بڑا جہان جس کی چھت آسمان ہے، جس کا فرش زمین ہے، جس کی فضا میں لاکھوں جانور ہیں۔ یہ خود بخود بن گیا، خود ہی چل رہا ہے سورج بھی، چاند بھی خود ہی چل رہے ہیں۔ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ ایک معمولی کشتی جسے انسان بنا سکتا ہے۔ یہ تو بغیر بنانے والے کے نہ بنے اور اتنا بڑا جہان جو انسان کے بس میں نہیں وہ خود بخود بن جائے تو تمہاری عقل بچوں جیسی ہے یا میری عقل بچوں جیسی ہے؟ میں نادان ہوں یا تم نادان ہو؟

مناظرہ ختم ہو گیا اور بحث تام ہو گئی اور دہریہ اپنا سامنہ لے کر واپس ہو گیا اب کیا بحث کرے جو اس کی بنیاد تھی وہ ساری ختم ہو گئی۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا وجود اور اس کی پہچان دلائل کی محتاج نہیں ہے بلکہ قلب کے اندر خود بخود فطرت کہتی ہے کہ اس جہان کا ہے کوئی بنانے والا انسان کے قلب پر فطرت کا دباؤ ہے۔ ایک بچہ اور غیر مسلم وہ قلب میں اس چیز کا دباؤ محسوس کرتا ہے، حالانکہ اس نے کسی کالج میں نہیں پڑھا، کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا۔ مگر دل میں دباؤ محسوس کرتا ہے۔

انسان اگر سوچے تو قدم قدم پر اللہ کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ہزاروں تمنائیں کرتے ہیں اور ہزاروں کام کرتے ہیں لیکن کامیابی سو میں سے ایک میں ہوتی ہے۔ ننانوے میں ناکامی ہوتی ہے۔ تو کون سا انسان چاہتا ہے کہ میں ناکام ہو جاؤں؟ کون چاہتا ہے کہ میں دوکان پر بیٹھوں اور مجھے خسارہ ہو؟ نفع ہی کی خاطر بیٹھتا ہے۔ لیکن بہت سی جگہ خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ خسارہ دینے والا اور خلاف مرضی چلانے والا کون ہے؟

انسان چاہتا ہے کہ اولاد ہو، بیس بیس برس گزر جاتے ہیں، دوائیں کرتا ہے دعائیں کراتا ہے، نہیں ہوتی، بعضے چاہتے ہیں کہ ہمارے اولاد نہ ہو، بلکہ برتھ کنٹرول کا سسٹم جاری کرتے ہیں کہ اولاد بند ہو جائے اور جب سے برتھ کنٹرول کی دوائیں شروع کیں، جب سے اولاد زیادہ پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ غرض آدمی چاہتا ہے کہ اولاد نہ ہو اور ہوتی چلی جا رہی ہے، چاہتا ہے کہ ہو مگر بیس بیس برس گزر جاتے ہیں نہیں ہوتی۔ ایک چاہتا ہے کہ نفع ہو، مگر خسارہ ہو جاتا ہے اسی طرح ایک کو لاکھوں روپے کا نفع ہو رہا ہے۔

آخر یہ سب کچھ کرنے والا کون ہے؟ سب سے برتر مخلوق انسان ہے۔ جب اس کا کیا ہوا پورا نہیں ہوتا تو گدھے اور گھوڑے تو اس سے نیچے کی چیز ہیں، درخت اور پتھر اس سے نیچے کی چیز ہیں۔ جب انسان اپنے ارادے میں عاجز ہے تو اور چیزوں کا کیا کہنا؟ جب برتر مخلوق بھی عاجز ہے۔ تو ضرور کوئی قوی اور طاقت ور ذات موجود ہے۔ کوئی اوپر کی طاقت ہے جو انہیں چلا رہی ہے۔ ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ دنیا میں انسان ہزاروں باتیں چاہتا ہے کہ یہ ہو، مگر نہیں ہوتیں، گھٹتا بھی ہے، پریشان بھی ہوتا ہے۔ لیکن لاکھ پریشان ہو جو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں؟ سارے زندگی چاہتے ہیں موت کا اندیشہ ہوتا ہے تو دوائیں کرتے ہیں، غذائیں کھاتے ہیں، تفریح کرتے ہیں آب وہوا بدلتے ہیں کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ لیکن جب وقت آتا ہے تو بادشاہ، نواب لکھ پتی سب مجبور ہیں۔ اگر روپیہ خرچ کر کے جان بچا کرتی تو امیر آدمی ایک نہ مرتا سارے بے چارے غریب مرا کرتے، جن کے ہاتھ میں پیسہ نہ ہوتا اور بادشاہ تو مرنے کا نام ہی نہ لیتا خزانے کا منہ کھول دیا کرتا کچھ ملک الموت کو، کچھ انکے فرشتوں کو رشوت دے دی اور اپنی جان بچالی تو دولت مند کوئی نہ مرتا۔ لیکن سب مرتے ہیں، چاہتا کوئی نہیں، پھر مرتے ہیں۔ پھر آخر کون ہے جو موت دینے والا ہے؟ کون ہے جو مرضی کے خلاف زندگی چھیننے والا ہے؟ اپنی مرضی سے ہم دنیا میں آئے بھی نہیں۔ اپنی مرضی سے جائیں گے بھی نہیں۔ جب آنا ہوتا ہے تو آنے پر مجبور ہیں، جب جانے کا وقت آتا ہے تو جانے پر مجبور ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔ مجبور کے لئے کوئی نہ کوئی جابر ہونا چاہئے جو جبر کر رہا ہے اور اس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔

ہم مخلوق ہیں۔ خود ہم نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا جب مخلوق ہیں تو مخلوق ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی خالق ہو جس نے ہمیں مخلوق بنایا ورنہ ہم خود خالق بنیں، مقہور ہیں تو قاہر کی خبر ملتی ہے۔ مرزوق ہیں تو کسی رازق کا پتہ چلتا ہے۔ تو ہر ہر قدم پر انسان اللہ کو اور اسکی شانوں کو پہچاننے پر مجبور ہے اور اس کو دلائل سے نہیں پہچانتا بلکہ اس کی ہستی

میں واقعات وحوادث ہیں جو اس کو ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔

عقل سے خدا کو مانا جاتا تو فلاسفر عارفین کاملین ہوتے...... باقی دلائل تو ہم خود واقعات سے بنا لیتے ہیں۔ دلائل پر خدا کا وجود موقوف نہیں ہے۔ اگر دلائل پر موقوف ہوتا، تو سب سے بڑے عارف اور خدا پرست فلسفی لوگ ہوتے۔ حالانکہ فلسفی جو عقل پرست ہیں، وہی خدا سے بعید ہیں اس لئے معرفت باری تعالیٰ کا دارومدار عقل اور دلائل پر نہیں ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اسکے وجود پر سو دلیلیں قائم کی تھیں، بڑی پکی اور فلسفیانہ مضبوط دلیلیں تھیں اور انہیں ناز تھا کہ میرا ایمان سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ کیونکہ سو دلیلیں میں نے ایمان کے اوپر قائم کی ہیں۔ بلکہ بے پڑھا لکھا آتا تو اسے حقارت سے دیکھتے کہ اس کا ایمان کیا ہے؟ ایمان تو میرا ہے کہ میں نے دلیلوں کے زور سے اللہ کو ایک سمجھا ہے۔ ان جاہلوں کو پتہ ہی کچھ نہیں۔ یہ تو محض تقلیدی طور پر مانتے ہیں۔

ایک دفعہ امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ کھیت پر چلے جا رہے تھے۔ کھیت کا ایک کاشت کار سامنے آ گیا کاشت کار بیچارہ بے پڑھا لکھا، نہ مولوی، نہ فلسفی، نہ عالم۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کہ کون ہو؟ اس نے کہا مسلمان ہوں۔ پوچھا، مسلمان کس کو کہتے ہیں؟ اس نے کہا جو یہ کہے کہ اللہ ایک اور رسول برحق، آخرت حق، وہ مسلمان ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ مسلمان تو ہے۔ مگر تیرے مسلمان ہونے کی دلیل کیا ہے؟ دیہاتی نے کہا۔ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تو کوئی دہریہ آ گیا ہے۔ لاٹھی لے کے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے ہولیا کہ ٹھہر جا تجھے بتلاؤں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آگے آگے اور دیہاتی پیچھے پیچھے کہا کہ مسلمان ہونے کی دلیل مانگتا ہے؟ ارے مسلمان نے خدا کو دل کے یقین سے پہچانا ہے نہ کہ دلیل سے، دلائل کے پیر لکڑی کے ہوتے ہیں لکڑی آگ میں بھی جل جاتی ہے، پانی میں بھی بہہ جاتی ہے۔ ہوا میں بھی اڑ جاتی ہے۔ تو دلیلوں پر خدا کا وجود نہیں خدا کا وجود دل کے یقین پر ہے اور یقین اللہ ہی کی طرف سے ڈالا جاتا ہے کہ میں ہوں اور میری شانیں برحق ہیں۔

قرآن کریم نے مشاہدات وواقعات سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا ہے...... اسی واسطے قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کے وجود کے دلائل پیش کئے ہیں۔ وہ منطقی اور فلسفیانہ انداز کے نہیں ہیں۔ بلکہ مشاہدات کو پیش کیا ہے کہ تم اس چیز کو دیکھو اور اس میں سے خدا کے وجود کو نکالو اس چیز کو دیکھو اور اس سے خدا کو سمجھو۔ اسی کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مجھے یاد آیا ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ فرمایا: میں نے شہتوت کے پتے سے پہچانا اس طرح کہ شہتوت کا پتہ بکری کھاتی ہے تو مینگنیاں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ ہرن کھاتا ہے تو مشک نکلنا شروع ہو جاتا ہے، ابریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو ریشم نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو ایک پتہ ہے کہیں مینگنی نکلی، کہیں مشک نکلا، کہیں ریشم نکلا۔ یہ پتے کی طبیعت نہیں ہے۔ طبیعت ایک کام کر سکتی ہے، دس کام نہیں کر سکتی

اس کی طبیعت کے اوپر کوئی بنانے والا ہے کہ کبھی یہ بنا دیا، کبھی وہ بنا دیا میں نے اس حقیر سے پتے سے خدا کے وجود کو سمجھا۔ اگر آدمی سمجھنا چاہے تو ایک پتے سے خدا کے وجود کو نکال سکتا ہے اور نہ سمجھنا چاہے تو انبیاء علیہم السلام ہزاروں دلیلیں پیش کر دیں، رات دن معجزے دکھلائے ابوجہل کو نہیں سمجھنا تھا، مرتے دم تک نہیں سمجھا ابولہب کو نہیں ماننا تھا، آخر تک نہ مانا اور مان لیا تو صدیق اکبر نے عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے۔ جس نے مانا، تو کوئی صدیق بنا، کوئی فاروق بنا۔ جس نے نہیں مانا کوئی ابوجہل رہ گیا، کوئی ابولہب رہ گیا۔ معلوم ہوا جب آدمی نہیں ماننے پر آتا تو پیغمبر بھی نہیں منوا سکتے اور ماننے پہ آتا ہے تو شہتوت کے پتے سے خدا کو پہنچان لے۔

امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ مسلمان ہیں۔ فرمایا: ہاں الحمد للہ اس نے کہا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ فرمایا، جو اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو اس نے کہا، آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ ایک ہے؟ وہ موجود ہے اور کائنات بھی اسی نے بنائی ہے۔ اب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر یہ ارشاد فرماتے کہ اللہ نے اپنے قرآن میں یہ ارشاد فرمایا وہ جاہل نہ سمجھ سکتا۔ اسی کے انداز پر اسے سمجھایا فرمایا میں جو خدا کے وجود کو سمجھا ہوں ایک عجیب انداز سے سمجھا ہوں۔ میں نے دنیا میں ایک محل دیکھا کہ وہ چاندی کا بنا ہوا ہے۔ اس میں نہ کہیں درز، نہ سوراخ، نہ کوئی روشن دان، کچھ بھی نہیں۔ اس محل کے اندر ایک سونے کا محل بنا ہوا ہے۔ اس میں بھی کوئی در و دیوار اور کھڑکی وغیرہ نہیں ہے۔ غرض یہ دو محل بنے ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں نہ کوئی اندر کی چیز باہر جا سکتی ہے اور نہ باہر سے اندر جا سکے حتیٰ کہ ہوا کا بھی گزر نہیں، ایک محل باہر ہے اور دوسرا اس کے اندر ہے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس محل کی دیوار ٹوٹی اور اس میں سے ایک جاندار نکلا پیدا ہوتے ہی بچہ نادان ہوتا ہے۔ مگر اس نے وہ کام شروع کیا جو تجربہ کار جانور کرتا ہے۔ اس سے میں سمجھا کہ اس محل میں باہر سے تو کوئی اندر گیا نہیں اور اندر سے یہ باہر نکلا ہے۔ تو کوئی اس محل کے اندر بنانے والا ہے جس نے اسے اندر تیار کر دیا ہے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ خدا کی ذات ہے۔

لوگوں نے عرض کیا حضرت! یہ چاندی کا محل جسے آپ دیکھ کے آئے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھا اور چاندی کے محل میں سونے کا ایک اور محل ہو یہ ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ آخر آپ اس محل کو دیکھنے کس دنیا میں گئے تھے۔ فرمایا یہ تمہارے ہاں بھی موجود ہے۔ لوگوں نے کہا ہم نے تو نہیں دیکھا فرمایا، تم آنکھ بند کر لو تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے۔ یہ تو تمہارے گھر میں بھی موجود ہے۔

فرمایا: کیا تم نے کبھی انڈا نہیں دیکھا؟ وہ چاندی کا ایک محل ہے اس میں جو زردی ہے۔ وہ سونے کا محل ہے، کوئی دروازہ نہیں نہ اندر کی چیز باہر آئے، نہ باہر کی چیز اندر آئے۔ مرغی لے کر اسے بیٹھ گئی اچانک اکیس دن کے بعد دونوں محلوں کی دیوار ٹوٹی اور بچہ نکل آیا، اور اس بچے نے وہی کام کرنے شروع کئے۔ حالانکہ نہ وہ کسی اسکول میں گیا، کوئی ڈگری اس نے نہیں پائی، ماں سے تربیت اس نے نہیں پائی۔ مگر جس طرح اماں دانہ چگتی ہے، وہ بھی چگنے لگا، جس طرح وہ بولتی ہے، اسی لغت میں اس نے بھی کلام کرنا شروع کر دیا۔

تو انسان کے بچے کو جب تک مکتب میں نہ بٹھائیں مادری زبان کی بھی جب تک کتاب نہیں پڑھے گا۔ وہ ادیب وشاعر نہیں بنے گا اور دوسری زبانوں کی تو بات ہی الگ ہے۔ خود مادری اور ملکی زبان جب تک اس کو کتابی صورت میں نہ پڑھے، پڑھا لکھا نہیں سمجھا جا سکتا تو ایک انسان بغیر سیکھے زبان نہ بولے اور سیکھنے کے لئے اس کو بیسیوں ملکوں کا سفر کرنا پڑے کہیں جا کے دوسری زبان سے واقف ہو۔ اور یہ سونے چاندی کے محل میں سے ایک بچہ کڑ کڑ کرتا ہوا نکلا اور اس نے وہی کام کرنا شروع کیا، جو اس کی ماں کر رہی ہے۔

گویا وہ ترقی یافتہ پیدا ہوا۔ اس محل میں آخر اس کو کس نے پڑھایا لکھایا ہے، کس نے اس کو سمجھایا کہ تو نے اس طرح بولنا ہے اور کس نے وہ طریقہ بتلایا کہ انڈے سے باہر نکلتے ہی دانہ چگنا شروع کر دینا یہ تعلیم کس نے دی؟ یہ اس نے تعلیم دی جس نے فرمایا۔ ﴿رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾ ① ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پیدا کر کے ہر چیز کے مطابق اس میں ہدایت ڈال دی کہ تو یہ کام کر''۔ انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو انسانی حرکتیں خود بخود اس سے سرزد ہونا شروع ہوتی ہیں۔ علم کی بات الگ ہے۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانے کی خواہش، سونے کی خواہش۔ یہ بلا کسی تعلیم کے خود بخود کرتا ہے۔ تو اندر کوئی تعلیم دینے والا ہے۔ جس نے دل میں راہنمائی کی ہے اور وہ وہی اللہ کی ذات ہے۔ جو دل کے اندر ہدایت دیتی ہے۔

اللہ دل میں آتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے

اکبر الٰہ آبادی نے خوب کہا ہے کہ۔

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا

دل میں تو ہر انسان کے ہے کہ بے شک کوئی جابر ہستی ہے۔ جو اس کائنات کو چلا رہی ہے۔ سمجھنا چاہے تو اس کی ذات بڑی بلند وبالا ہے۔ ہماری سمجھ کے احاطے میں نہیں آ سکتی ہے تو اکبر کہتا ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ نہیں آتا ⠀⠀⠀ بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

تو جو دل میں آ جائے، سمجھ میں نہ آئے۔ بس خدا کی ذات کی یہی پہچان ہے۔ ورنہ جو چیز دل میں آتی ہے۔ پہلے آدمی اسے سمجھ جاتا ہے۔ ایک خیال ہمارے دل میں آیا پہلے ہم اس کو سمجھ گئے تو ایک نظریہ ہمارے دل میں پیدا ہوا، ہم اس کو سمجھتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کا وجود دل میں آتا ہے۔ مگر سمجھ نہیں سکتے کہ اس کی حقیقت وکیفیت کیا ہے۔ انسان عاجز ہے مگر ماننے پر مجبور ہے۔

اللہ تعالیٰ جسم وجہت سے پاک ہے جیسے روح پاک ہے...... بالکل اسی طرح سے جیسے آپ موجود ہیں اور آپ کے اندر روح بھی موجود ہے۔ بدن کی تربیت اندر روح ہی کر رہی ہے۔ یہ بدن کے اوپر جو سرخی اور چہرے کے اوپر تروتازگی ہے، یہ روح ہی کا اثر ہے۔ اگر روح نکال دی جائے تو بدن مرجھا کر، کملا کر، پژمردہ ہو کر

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۰.

تین دن کے اندر مٹی میں مل جاتا ہے۔ مٹی مٹی میں، پانی پانی میں، ہوا ہوا میں اور آگ آگ میں مل جاتی ہے۔ تمام شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کو روح نے جوڑ رکھا ہے۔ لیکن آج تک آپ نے روح کو دیکھا نہیں مگر یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ روح ضرور ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر ہماری زندگی کس طرح سے ہے؟ آج تک آپ نے اپنی روح پر کوئی دلیل قائم نہیں کی، کہ کوئی فلسفی یوں کہے کہ یا تو دلیل سے بتاؤ میرے اندر روح ہے۔ ورنہ میں نہیں مانتا کہ میرے اندر روح ہے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا ایک بھی دلیل نہ ہو۔ آپ ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر نہیں مانتے پھر آپ کو زندہ کہنا مشکل ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں زندہ ہوں۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ میں مردہ ہوں۔ لیکن کہتے ہیں کہ زندہ ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ روح موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے کبھی روح کو دیکھا ہے؟ کوئی دلیل آپ کے پاس ہے؟ ہر شخص موجود ہے، میں اس سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ آپ میں روح موجود ہے؟ دلیل تو نہیں۔ ہم کہیں گے آپ نے کبھی روح کو دیکھا؟ جواب یہ ہوگا کہ کبھی نہیں روح کی شکل وصورت کیسی ہے؟ معلوم نہیں۔ مگر ہے ضرور۔ تو دلیل ایک نہیں، دیکھا بھی نہیں پھر روح موجود ہے۔ تو یہ ایک ایسی مخلوق ہے کہ آدمی اسے بلا دلیل مانتا ہے اور خدا کی ذات کو نہ مانے، یہ حیرت کی بات ہے؟

جب ہمارا بدن بغیر روح کے نہیں ٹھہر سکتا تو اتنا بڑا بدن جس کا سر آسمان ہے، جس کے پیر زمین ہے۔ یہ اتنا بڑا بدن کس طرح قائم ہے۔ جب تک اس کے اندر کوئی روح موجود نہیں ہے۔ وہ چلا نہیں رہی اور تدبیر نہیں کر رہی؟ غرض جس طرح سے آپ روح کے ماننے کے لئے دلیل کے محتاج نہیں۔ محض قوت یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح سے پوری کائنات کے مدبر اعظم اور روح اعلیٰ کو دلیل سے نہیں مانا گیا۔ قلب کے یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر کسی انسان کو کسی کے بدن کے اندر گھسایا جائے کہ بھئی ذرا دیکھ کر آؤ روح کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے۔ دل میں یا دماغ میں ہاتھ پیر میں، اس کا مقام کہاں ہے؟ پھر اس سے پوچھو کہ بھئی کیا دیکھا؟ وہ یوں کہے گا کہ میں جدھر دیکھتا ہوں، روح کا جلوہ نظر آتا ہے مگر اشارہ کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ روح وہاں بیٹھی ہے یا یہاں بیٹھی ہے۔ جہاں جہاں بھی بدن موجود ہے وہیں وہیں روح موجود ہے۔ حتیٰ کہ بال، ناخن، آنکھ میں بھی موجود ہے۔

اور جس طرح ہمارے بدن میں ہماری روح ہے۔ جو سمت وجہت سے بھی پاک ہے اور اشارے سے بھی بری ہے اس طرح سے کائنات کی روح اعظم اللہ رب العزت کی طرف بھی اشارہ کر کے نہیں کہہ سکتے کہ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں یا وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سمت وجہت سے بری اور اشارہ سے بری مگر کائنات کے ذرے ذرے میں ان کا جلوہ موجود ہے۔ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ① ''تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تمہارے ساتھ ہے۔'' ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾ ② تم ایک جگہ تین ہو تو چوتھا خدا موجود ہے اور اگر پانچ ہو تو چھٹا خدا

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۴۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۷۔

موجود ہے۔ زیادہ ہو یا کم، مگر خدا وہاں موجود ہے اور پھر بھی اشارے سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہے اللہ میاں۔ اس لئے کہ اتنے لطیف ہیں کہ بدن سے بھی پاک ہیں، صورت سے بھی پاک ہیں۔ تو جب ان کی بنائی ہوئی ایک مخلوق یہ شان رکھتی ہے کہ اس کو اشارے سے نہیں بتا سکتے کہ یہ ہے تو اللہ کی ذات تو کہیں بڑی و بالا ہے۔ روح کی آج تک آپ نے شکل دیکھی؟ نہیں دیکھی ہوگی اور آپ کہتے ہیں کہ روح کی کوئی شکل نہیں۔ اللہ ربّ العزّت بھی شکل سے بری و بالا ہیں۔ روح کا آپ نے کبھی رنگ دیکھا؟ کہ زرد یا کالی ہے؟ یہ گورے کالے کا فرق جو ہے، یہ تو بدن سے چلتا ہے روح سے نہیں چلتا۔

حقیقت پسند انسان کی نظر روح پر ہوتی ہے صورت پر نہیں ...... اسی لئے جو روحانی لوگ ہیں، ان کے ہاں کالے گورے کا فرق کوئی نہیں، وہاں تو روح کی چمک اور نورانیت دیکھی جاتی ہے۔ چمڑی کسی کی کالی ہو یا سفید ہو۔ یہ اوپر اوپر کی چیزیں ہیں۔ وہ انسان خطا پرست ہوگا جو حقیقت کو چھوڑ کر محض چمڑی کو دیکھے حقیقت پسند انسان کی نظر کبھی چمڑی کے اوپر نہیں ہوتی کبھی صورت پر نہیں ہوتی وہ سیرت کو دیکھتا ہے

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سیاہ فام ہیں، موٹے موٹے ہونٹ ہیں کوئی ظاہری شکل وصورت نہیں ہے۔ جب انہیں نکاح کی ضرورت پیش آئی تو بڑے بڑے اجلاء صحابہ جو قریش کے سردار تھے، انہوں نے کہا، "بِلَالٌ سَیِّدُنَا وَمَوْلَانَا" ① بلال رضی اللہ عنہ ہمارے سردار اور آقا ہیں۔ ان کے لئے سب کی بیٹیاں حاضر ہیں۔ اگر وہاں کالے اور گورے کا فرق ہوتا تو گورے رنگ کا کوئی بیٹی دینا پسند نہ کرتا۔ مگر اسلام نے یہ سارے فرق مٹا دیئے اسلام کہتا ہے کہ صورت کو نہ دیکھو، سیرت اور حقیقت کو دیکھو شکل وصورت اور رنگوں کو مت دیکھو یہ تو آنی جانی اور اوپر اوپر کی چیزیں ہیں۔ یہ ظاہری شکلیں چند روزہ ہیں۔ اصل سیرت ہے جو باقی رہنے والی چیز ہے۔ اور صورت کو آپ کتنا ہی بنالیں مگر صورت بگڑنے کیلئے ہی پیدا ہوئی ہے۔ یہ بنتی نہیں، یہ بگڑتی ہی ہے۔ اللہ بھلا کرے بخار کا۔ تین دن بخار آجائے تو ساری صورت بگڑ جاتی ہے۔ جو رنگ وروغن، غذائیں کھا کے مہینوں میں پیدا کیا تھا۔ بخار نے تین دن میں ختم کر دیا۔ اور بخار بھی نہ آئے تو بڑھاپا تو کہیں گیا ہی نہیں، بڑھاپا آ کے ساری صورت کو چوق موق کر دیتا ہے نہ رنگ رہتا ہے نہ سفیدی۔ اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں موت آ کے ساری صورت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اس لئے صورت بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اسے آپ کہاں تک بنائیں گے؟ کہاں تک اس کی خدمت کریں گے؟ جتنی خدمت کریں گے جب بگڑنے پہ آئے گی بیماری بگاڑ دے گی کوئی فکر لگ گیا اس سے بگڑ جائے گی بڑھاپا بگاڑ دے گا، موت بگاڑ دے گی اس لئے جو صورت بگڑنے کیلئے پیدا ہوئی اس کے بنانے سنوارنے میں وقت لگانا، وقت ضائع کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ تھی اور بہت سے مرید اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے اور شیخ ان

---

① تفسیر ظلال القرآن، پارہ: ۳۰، سورۃ عبس، ج: ۷، ص: ۴۶۱.

کی تربیت کرتے تھے۔ایک شخص نیا مرید آیا اور بیعت ہوگیا۔اس نے اللہ اللہ کرنی شروع کی۔ابھی اللہ اللہ نے دل میں اثر نہیں کیا تھا۔بالکل نو آموز اور مبتدی تھا۔وہ بھی اپنے ذکر و شغل میں لگا۔شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ ان کے گھر سے کھانا پکا ہوا آتا تھا۔گھر میں ایک باندی تھی۔وہ کھانا ہر ہر حجرے میں بانٹ جاتی تھی۔یہ جو نئے مرید پہنچے تو معمول کے مطابق باندی انہیں کھانا دینے آئی۔باندی ذرا قبول صورت تھی۔ان کی اس سے آنکھ لڑ گئی اور ان کے دل میں عشق و محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔اب جب وہ آتی، تو کھانا رکھ لیتے مگر اسے گھورنا شروع کرتے۔شیخ کو پتہ چل گیا کہ سیکھنے تو اللہ اللہ آئے ہیں اور باندی سے عشق بازی اور آنکھ لڑانا شروع کر دی۔انہوں نے علاج کیا۔مگر اہل اللہ کے ہاں علاج زبان سے نہیں ہوتا، وہ تو ڈھنگ ایسا ڈالتے ہیں کہ خود بخود علاج ہو جائے۔شیخ نے جب دیکھا کہ اس آدمی کے اندر عشق پورا اثر کر گیا ہے اور بجائے اللہ اللہ کرنے کے یہ باندی باندی پکارتا ہے، بجائے اللہ کے مشاہدہ کرنے کے باندی کی صورت میں الجھ گیا ہے، اس کا علاج کرنا چاہئے۔علاج یہ کیا کہ کسی ڈاکٹر سے دست آور دوا منگوائی اور اس باندی کو کھلا دی اس کو دست آنے شروع ہوئے، تو اس کے لئے ایک جگہ مقرر کر دی کہ یہاں بیٹھ کے استنجاء سے فارغ ہو۔صبح سے شام تک اس کو خوب دست آئے اور شام کو یہ کیفیت ہوگئی کہ ناک پکڑیں تو اس کا دم نکلنے نہ رنگ رہا، نہ روغن رہا۔ہڈی کو اس کا چمڑا لگ گیا۔اس کی صورت بالکل بھیانک ہوگئی۔اس کے بعد اس سے کہا کہ اس مرید کے پاس کھانا لے جا اور جو وہ معاملہ کرے مجھے اطلاع کر نا وہ کھانا لے کے پہنچی چلا جاتا نہیں تھا۔پاؤں لرز رہے ہیں زرد رنگ، ہڈیاں نکلی ہوئیں، صورت اس کی بری ہوگئی۔اب وہ کھانا لے کر آئی۔یا تو یہ صاحب انتظار میں بیٹھے رہا کرتے تھے کہ باندی آئے تو اسے گھوروں اب جو آئی اور اس کی شکل دیکھی۔تو انہیں بڑی نفرت ہوئی۔منہ پھیر کے کہا رکھ دے کھانا۔چلی جا جلدی یہاں سے۔وہ بے چاری چلی گئی۔شیخ نے پوچھا، اس نے کیا معاملہ کیا؟ اس نے کہا حضرت! آج تو یہ معاملہ کیا کہ دیکھنا تو بجائے خود ہے۔اس نے تو نفرت سے منہ پھیر کے مجھے کہا کہ جا جلدی یہاں سے، رکھ دے کھانا۔میری طرف دیکھا بھی نہیں۔فرمایا، ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' علاج ہوگیا۔

شیخ تشریف لائے، انہوں نے اس مرید سے کہا، ذرا میرے ساتھ تشریف لایئے ان کی انگلی پکڑی اور وہ جو قدمچہ تھا، جہاں باندی فارغ ہوئی تھی۔نجاست اس میں بھری ہوئی تھی فرمایا۔یہ آپ کا معشوق ہے۔اسے اٹھا کے لے جایئے اور بڑی حفاظت سے رکھئے اس لئے کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔آپ کو پاخانہ سے محبت تھی۔جب تک یہ باندی میں تھا آپ کو عشق رہا۔جب یہ نکل گیا، آپ کا عشق ختم ہوگیا تو باندی سے عشق نہیں تھا، اس گندگی سے تھا۔اس اپنے معشوق کو لے جایئے اور صندوق میں بڑی حفاظت سے رکھئے اور اس کی زیارت کیا کیجئے اس دن مرید کی سمجھ میں آیا کہ:

عشق صورت عاقبت ننگے بُود

صورتیں عشق کے لئے نہیں ہیں، سیرت عشق کے لئے ہے۔صورت تو بگڑنے والی چیز ہے، صورت درحقیقت ایک گندگی ہے۔گندگی جب تک رہتی ہے صورت باقی ہے۔یہ نکل جائے تو صورت ختم ہو جاتی ہے لیکن

سیرت ہر حالت میں موجود ہے۔ اگر اچھی سیرت علم اور کمال ہو تو دنیا میں رہے گا جب با کمال، قبر میں جائے گا جب با کمال، حشر میں پہنچے گا جب با کمال اور صورت یہاں کہیں بھی ساتھ نہیں ہوگی۔ سیرت ہی سیرت انسان کے ساتھ رہتی ہے۔ اس لئے انسان کا یہ فرض ہے کہ اپنی سیرت بنانے کی فکر کرے نہ کہ صورت بنانے کی فکر میں رات دن لگا رہے۔ یہ تو بگڑنے والی ہے۔ ایک نہ ایک دن بگڑے گی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک تابعی ہیں عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ یہ غلام تھے اور حبشی تھے، سیاہ رنگ تھے، صورت اچھی نہیں تھی۔ لیکن علم اتنا بڑا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''مَا رَأَيْتُ أَفْضَلَ مِنْ عَطَاءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ'' ① ''میں نے اپنی عمر میں عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کوئی شخص عالم، افضل، برتر اور کامل نہیں پایا'' تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس کی تعریف کریں سمجھ لیجئے وہ شخص کس درجے کا ہوگا، کس درجے کا عالم ہوگا، تو علم اتنا بڑا کہ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے عاشق اور صورت کالی کلوٹی۔ اس لئے اسلام نے صورت پر مدار نہیں رکھا سیرت پر مدار رکھا ہے کہ اندرونی حقیقت درست ہونی چاہئے۔

انسان سیرت سے اشرف المخلوقات ہے صورت سے نہیں...... اور بھائی صورت کا تو یہ ہے کہ صورت ہمیشہ فتنوں میں ڈالتی ہے۔ سیرت ہمیشہ امن پیدا کرتی ہے اور عزت و بلندی پیدا کرتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ ہم اور آپ خوبصورت نہیں ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی۔ قرآن کریم میں موجود ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب اللہ نے حسن و جمال کو پیدا کیا، تو آدھا حسن پوری دنیا کو دیا اور آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا تو کتنے بڑے حسین وجمیل تھے۔

مصر کی بیگمات جب جمع ہوئیں اور ان کی صورت مبارک دیکھی تو کہا۔ ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ ② یہ کوئی انسان بشر نہیں یہ تو کوئی فرشتہ ہے جو آسمان سے اتر آیا ہے۔ اتنا حسن و جمال تھا۔ لیکن یوسف علیہ السلام جہاں جہاں مصیبتوں میں گرفتار ہوئے صورت کی خوبصورتی نے انہیں گرفتار کرایا، کنعان کے کنویں میں ڈالے گئے، حسن و جمال سبب بنا، بھائیوں نے حسد کیا اور کنویں میں ڈال دیا۔ قافلہ نکال کے لے گیا اس نے مصر کے بازار میں بیچ دیا۔ غلام بنے تو صورت کی وجہ سے بنے۔ زلیخا عاشق ہوگئی اور اس کی وجہ سے نو برس جیل میں رہنا پڑا۔ ان سب کا باعث صورت کی خوبصورتی تھی اور جب مصر کی سلطنت کا وقت آیا خود فرمایا ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ ③ اے بادشاہ مصر! ملک میرے سپرد کر، میں انتظام کر کے ملک چلا کے دکھاؤں گا زمین کے خزانے میرے حوالے کر۔ اس کی یہ وجہ بیان نہیں کی "اِنِّیْ حَسِیْنٌ جَمِیْلٌ"۔ مصر کی سلطنت میرے سپرد کر دے، اس واسطے کہ میں بہت خوبصورت ہوں، بلکہ یہ فرمایا، ﴿اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ④ ''اس

---

① علل الترمذی، ج: ۱۲، ص: ۴۹۲. ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱.

③ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵. ④ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

واسطے کہ میں علم والا ہوں'' مجھ میں ملک چلانے کی قوت وصلاحیت موجود ہے۔غرض جب فتنے میں پڑنے کا وقت آیا تو صورت اس کا باعث بنی اور جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو سیرت آگے بڑھی تو سیرت انسان کو بلندی پر پہنچاتی ہے۔صورت ترقی ورفعت اور بلندی کا باعث نہیں ہے۔

جیسے آپ خوبصورت ہیں۔ بہت سے جانور بھی خوبصورت پھرتے ہیں۔مور کتنا خوبصورت ہے،اس کے اوپر کیسے عمدہ عمدہ نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، پہاڑوں کے اندر جو مرغ زرین ہوتا ہے۔کئی کئی رنگ اس کے پروں کے اندر ہوتے ہیں۔کتنا حسین وجمیل ہوتا ہے بہت سے درندے بھی ایسے ہی خوب صورت ہوتے ہیں۔شیر کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کھال ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے بہت اعلیٰ قسم کا کمبل اوڑھ کر آیا ہے۔رنگ الگ ہوتے ہیں نقش الگ ہوتے ہیں۔آپ تو نقل اتار کے ایسا کمبل بناتے ہیں۔اس کے پاس قدرت کا بنا ہوا موجود ہے تو جانوروں کی کیسی عمدہ عمدہ کھالیں، پرندوں کے کیسے عمدہ عمدہ رنگ،ان سے زیادہ کون خوبصورت ہے۔ اگر خوبصورتی باعث ترقی ہوتی۔تو انہیں اشرف المخلوقات بنا دیا جاتا۔ یہ آخر آپ ہی کو کیوں دعویٰ ہے؟ اور آپ ہی کے بہت سے بھائی بند ہیں۔صورت کے لحاظ سے کم رتبہ ہیں۔لیکن تقویٰ وطہارت کی وجہ سے بڑے بڑے ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔اگر صورت معیار ہوتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی کوئی بھی تعریف نہ کرتا عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تعریف نہ کرتے اس لئے کہ صورت کالی کلوٹی تھی لیکن سیرت سامنے تھی۔اس لئے ان کی بڑی عظمت وبڑائی کی جاتی تھی۔معلوم ہوا صورت سے انسان انسان نہیں بنتا۔سیرت سے آدمی آدمی بنتا ہے۔خوب کہا ہے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہ

گر بصورت آدمی انساں بدے ۔۔۔ احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

اگر صورت کی وجہ سے آدمی آدمی بنتا،تو ابوجہل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ایک درجے کے ہی ہوتے، کیونکہ اس کی صورت بھی آدمیوں جیسی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل بھی انسانوں جیسی ہے۔لیکن سیرت دیکھی جاتی ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت عرش سے اوپر پہنچی ہوئی ہے اور ابوجہل کی سیرت تحت الثریٰ کے اندر پہنچی ہوئی ہے۔سیرتوں کے لحاظ سے زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔صورت کے لحاظ سے کچھ بھی فرق نہیں اس لئے کہتے ہیں:

گر بصورت آدمی انسان بدے ۔۔۔ احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

ز بروں چوں گور کافر پر حلل ۔۔۔ وز اندروں قہر خدائے عز وجل

باہر سے دیکھو تو ایک کافر کی قبر کو دیکھو۔اس کے نقش ونگار بنے ہیں۔اس پر چادریں چڑھی ہوئی ہیں، پھول پڑے ہوئے ہیں اور اندر جا کے دیکھو تو عذاب خداوندی بھرا ہوا ہے۔تو صورت اگر اچھی ہو،مگر اندر اخلاق اچھے نہ ہوں،علم کا کمال نہ ہو،معرفت الٰہی نہ ہو تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کافر کی قبر اس کے اوپر اچھی اچھی چادریں پڑی ہوئیں

ہیں۔اندر خدا کا قہر پڑا ہوا ہے۔اس لئے آدمی سیرت سے آدمی بنتا ہے۔صورت سے انسان انسان نہیں بنتا۔
اہل سیرت کو ہی تاریخی عظمت نصیب ہوتی ہے...... دنیا میں ہر دور میں ہزاروں حسین گزر گئے اور خاک میں مل کر خاک ہو گئے کوئی جاننے والا بھی نہیں۔لیکن جو سیرت والے گزرے ہیں۔آج تک ان کے نام کے ساتھ آپ عظمت کے الفاظ بولتے ہیں۔عظمت سے انہیں یاد کرتے ہیں۔انبیاء علیہم السلام کا ذکر آتا ہے تو آپ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہتے ہیں۔صحابہ کرام کا ذکر آتا ہے تو آپ ''رضی اللہ عنہم اجمعین'' کہتے ہیں۔اولیاء کا ذکر آتا ہے آپ ''رحمتہ اللہ علیہم اجمعین'' کہتے ہیں۔حالانکہ ان کی صورتیں موجود نہیں ہیں اور ان میں سے کوئی کالا تھا، کوئی گورا تھا، کوئی زرد رنگ کا تھا، کوئی سرخ رنگ کا تھا تو رنگ کا کوئی پتہ نہیں۔لیکن نام لینے میں آپ آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔اس لئے کہ ان کی سیرت سامنے ہے۔ان کا علم وکمال سامنے ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا نام آ جائے، عقیدت سے آپ گردن جھکا دیں گے، ان بزرگوں کی شان میں اگر کوئی ادنیٰ گستاخی کرے، آپ جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ ہم یہ گستاخی نہیں سن سکتے، محبت وعظمت آج تک قلوب میں موجود ہے۔حالانکہ وہ ہستیاں سامنے نہیں ہیں۔ان کی سیرت اور علم وفضل ہی ہمارے سامنے ہے۔

صاحب! سیرت ہی خلافت خداوندی کا مستحق ہے......اس لئے اصل بنانے کی چیز علم ومعرفت اور اخلاق وکمالات الٰہیہ ہیں۔انبیاء علیہم السلام جو دنیا میں تشریف لائے، وہ صورتیں بنانے کے لئے نہیں آئے انبیاء کا یہ موضوع نہیں ہے۔وہ سیرت بنانے کے لئے آئے ہیں کہ دلوں کے اندر اخلاق ربانی اجاگر کرو، دلوں کے اندر محبت الٰہیہ پیدا کرو انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب بننے کے لئے آیا ہے۔خلیفہ وہ ہوتا ہے جس میں اللہ کے اوصاف آ جائیں ایک شاعر اسی کو خلیفہ بنائے گا جس کے اندر شعر کہنے کا مادہ آ جائے ایک بڑھئی اس کو خلیفہ بنائے گا جو بڑھئی کے فن کے اندر ماہر ہو۔ایک میاں جی جو لڑکوں کو قرآن مجید حفظ کراتا ہے۔لڑکوں میں سے اس کو خلیفہ بنائے گا جو قرآن مجید کا حافظ ہوگا۔اللہ میاں اپنا خلیفہ اس کو بنائیں گے۔جس میں اللہ میاں کے اخلاق پیدا ہو جائیں گے، اللہ کے علوم وکمالات پیدا ہو جائیں گے۔اللہ میاں کی نیابت وخلافت شکلوں پر نہیں ہے وہ سیرت پر ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے گا وہ خلیفہ اور نائب الٰہی بن جائے گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین کی عظمت آپ کے دلوں میں ان کے کمالات کی وجہ سے ہے۔ان کی صورتوں کی وجہ سے نہیں ہے۔آج بھی اگر آپ کسی عالم سے محبت رکھتے ہیں یا اس کی عظمت کرتے ہیں یا اس کو سر پر بٹھاتے ہیں، اس کے چہرے مہرے کی وجہ سے نہیں بٹھاتے یہ جان کر کہ اس کے اندر علم کا مادہ موجود ہے، اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اور علم یہ درحقیقت اللہ کی چیز ہے کسی انسان کی چیز نہیں ہے۔انسان کی ذات میں نہ علم ہے، نہ اخلاقی کمالات ہیں۔یہ حاصل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں، محنت کر کے آدمی اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

علم کے لئے مدرسے ہوتے ہیں۔ نو نو برس محنت کرتے ہیں۔ جب آدمی عالم بن کے آتا ہے۔ اخلاق درست کرنے کیلئے خانقاہیں بنتی ہیں، شیوخ کے ہاں رہتے ہیں۔ مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ تب جا کے اخلاقی کمالات حاصل کرتے ہیں۔ لیکن کوئی مدرسہ ایسا بھی قائم ہوا ہے۔ جس میں جہالت بھی سکھلائی جاتی ہو اور آپ بچے کو داخل کر دیں کہ صاحب اس کو جاہل بنا دو۔ یا دنیا میں کوئی خانقاہ ایسی ہے کہ آپ بچے کو وہاں داخل کر کے کہیں کہ صاحب! ذرا اسے بداخلاق بنا دیجئے ہم آپ کو تنخواہ دیں گے۔ بداخلاقی کے لئے کوئی خانقاہ نہیں اس لئے کہ بداخلاق تو پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ حاصل کرنے کی چیز علم ہے نہ کہ جہالت وہ تو پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے سیرت بنانے کے لئے محنت اٹھانی چاہئے علم و اخلاق پیدا کرنے کے لئے نہ کہ صورت بنانے کے لئے نہ کھال کو اجلا کرنے کے لئے یہ چیزیں تو من جانب اللہ جسے ملتی ہیں مل جاتی ہیں۔

انسانوں کا جوہر ایک ہے تفوق بلحاظ سیرت ہے جو امر اختیاری ہے...... اسی واسطے قرآن کریم نے ایک اصول ارشاد فرمایا ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ ① اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام ان دو سے ساری اولاد چلی۔ سب کے سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ کوئی کالا، کوئی گورا، کوئی سانولا، کوئی اجلا، کوئی سیاہ فام، کوئی سفید فام۔ یہ آدم کی اولاد ہیں۔ خاندان اور قبیلے ہم نے بنائے تاکہ دنیا میں پہچان سکو، کہ یہ فلاں کی اولاد ہے، یہ فلاں کا بیٹا ہے۔ تاکہ احکام جاری ہو سکیں کہ یہ فلاں کی اولاد ہے۔ لہٰذا میراث کا یہ مستحق ہے، دوسرا نہیں۔ وراثت اسے ملے گی، دوسرے کو نہیں ملے گی۔ تو خاندانوں سے پہچان اور وراثت ملتی ہے۔ خاندان اس لئے نہیں ہیں کہ تم شیخیاں بناؤ کہ میں شیوخ میں سے ہوں اور میں سادات میں سے ہوں اور یہ نیچ ہے، میں اونچ ہوں (مراد اعلیٰ و ادنیٰ)، اسلام نے ان سب چیزوں کو مٹا دیا۔

فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔ ہاں اونچ نیچ تم میں ہے۔ مگر یہ اختیاری ہے جس کا جی چاہے نیچ بن جائے۔ ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ ② "جو تم میں زیادہ متقی ہے وہ اللہ کے ہاں زیادہ باعظمت ہے"۔ جس میں تقویٰ اور طہارت کم ہے وہ اللہ کے ہاں کم وقعت ہے اور تقویٰ حاصل کرنا یہ انسان کا اختیاری فعل ہے۔ تو متقی بن کے جس کا جی چاہے باعزت بن جائے فاسق و فاجر بن کے جس کا جی چاہے ذلیل بن جائے۔ خلقی طور پر جوہر میں فرق نہیں ہے کہ کسی کا جوہر اونچا ہے، کسی کا جوہر نیچا ہے۔ فرمایا "اَنْتُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ" ③ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو ہم نے مٹی سے پیدا کیا، لہٰذا تم سب کا جوہر مٹی ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی انسان سونے

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳۔

③ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب، ج: ۱۳، ص: ۳۲۰، رقم: ۴۴۵۲۔ حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح و ضعیف سنن ابی داؤد ج: ۱۱ ص: ۱۱۶ رقم: ۵۱۱۶۔

سے بنا ہے، کوئی مٹی سے بنا ہے اور کوئی لوہے سے بنا ہے اور کوئی پیتل سے، لہٰذا ان کے اندر فرق ہے۔ بلکہ سب مشت خاک ہیں۔ جب ہمارے باپ ہی خاک سے پیدا کئے گئے تو ہم میں چاندی کہاں سے آ جاتی ہے۔ اور مٹی کا کام کیا ہے؟ مٹی جتنا نیچے رہے گی با عظمت رہے گی۔ جتنا اونچا اڑے گی ذلیل ہوگی اگر مٹی اوپر چڑھ کے آنکھوں میں پڑی، تو آپ لعنت بھیجیں گے۔ کپڑوں پر پڑی تو دامن جھٹکیں گے کہ کمبخت کہاں سے آ گئی جب تک جوتیوں میں پامال رہے گی با عظمت رہے گی اور جہاں اس نے اوپر اڑنا شروع کیا، لوگوں نے لعنت بھیجنا شروع کی۔

متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہے...... اس لئے آدمی بھی وہ بہتر ہے جس میں خاکساری عجز و نیاز اور تواضع ہو۔ جو بڑا بنے گا اور ابھر کر شیخی لگائے گا، تو یہ ایسا ہے جیسے مٹی آنکھ میں پڑ گئی۔ تو لوگ لعنت بھیجیں گے جو ابھرے گا اسے پست کر دیں گے، جو شیخی بگھارے گا اسے نیچا دکھایا جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ۔ ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ'' ① ''جو اللہ کے لئے جھکتا ہے۔ اللہ اس کو بلند کرتا ہے'' اور جو خود بلند ہوتا ہے اسے پٹخ دیتا ہے کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں ۔۔۔ پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست

جو خود ابھرتا ہے اسے پٹخ دیتے ہیں اور جو خود گر جاتا ہے اسے ابھار دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے، نماز پڑھ کے، روزہ رکھ کے شیخی بگھارے اور یوں کہے کہ یا اللہ! میں نے نماز پڑھی میں نے روزہ رکھا، گویا میں نے بہت بڑا کام کیا۔ معاذ اللہ: میں نے گویا آپ کے اوپر کوئی احسان کیا ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ نالائق! تو نے کیا کام کیا؟ طاقت تیرے اندر ہم نے دی، ارادہ ہم نے تیرے اندر پیدا کیا، اسباب ہم نے مہیا کئے تو نے کیا کیا؟ اور اگر بندہ نماز پڑھ کے، روزہ رکھ کے سب کچھ کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ جتنا میں نے کیا، تیرا فضل و کرم تھا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں تھی۔ تو نے سب کچھ کیا۔ غرض جو یوں کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا اسے بلند کرتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا اور جو یوں کہتا کہ میں نے کیا۔ تو میں کے گلے چھری پھیر دی جاتی ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا یہ تو سب کچھ ہمارا کیا ہوا ہے۔ اصل چیز انسان میں یہی ہے کہ سب کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا میں عاجز ہوں اور ہے بھی بات یہی۔

اس لئے کہ اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ ان کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اگر آپ ان کا شکر ادا کریں گے تو وہ بے شمار اور بے حد نہیں ہو سکتا۔ آپ خود محدود ہیں دماغ محدود ہے، عقل اور طاقت محدود ہے۔ محدود ہو اور لامحدود افعال کیسے انجام دے دے؟ تو نعمتیں لامحدود ہیں اور شکر محدود ہے۔ پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ آدمی شکر ادا کر کے یوں کہے اے اللہ! میں عاجز ہوں، میں شکر ادا نہیں کر سکتا تیری نعمتیں بے شمار ہیں

---

① المصنف لابن ابی شیبہ ج: ۸، ص: ۱۷۹، رقم: ۹. حدیث حسن ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب لا فضل لاحد علی احد ج: ۳ ص: ۴۰۴.

اور میرے اندر طاقت کی کمی ہے۔تو عاجز ہونے کا اظہار کرنا، اپنے عجز کو مان لینا اللہ کے ہاں یہی پسند ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ۔﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ① ''اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو۔'' داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے اللہ! بے شک میرا فرض ہے میں شکر ادا کروں گا۔ کیونکہ جب آپ کا حکم ہے میں تعمیل کروں گا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا شکر ادا کروں تو کس طرح کروں؟

اس واسطے کہ جب نعمتوں پر شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق آپ ہی دیں گے، تو توفیق خود ایک نعمت ہوگئی۔ اس کا شکر ادا کرنا چاہئے اور جب اس کا شکر ادا کروں گا۔ تو اس شکر کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے، پھر وہ ایک نعمت ہوگئی۔ تو پہلے اس کا شکر ادا کروں تو ہر شکر سے پہلے شکر نکلتا ہے اس لئے میں تو شکر کی ابتداء نہیں کر سکتا۔ شکر کروں تو کس طرح کروں میں تو بالکل عاجز ہوں میرے بس میں نہیں ہے حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔

اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو شکر ادا کرنے سے عاجز ہے۔ تو یہی شکر کی ادائیگی ہے کہ اپنا عجز مان لو، اپنی ناتوانی تسلیم کرو کون ہے جو ہمارا شکر ادا کرے اور ہماری طاعت کا حق ادا کر دے، فرض ادا کر کے یہ کہنا کہ کچھ نہیں ہو سکا۔ بس یہی ادائیگی شکر ہے کہ اپنی ہار مان لو۔ اس لئے بندے کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کر کے یوں کہے کہ میں کچھ نہیں کر سکا اور یہ تواضع نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا فضل اگر دستگیری نہ کرے تو ہماری نجات بھی نہیں ہو سکتی عمل بھی قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری نمازیں ان کے اندر کیا رکھا ہے؟ وسوسے بھرے ہوئے، خیالات بھرے ہوئے۔ نمازیں انبیاء علیہم السلام کی ہیں یا اولیاء اللہ کی۔ مگر یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ وہ قبول کر لے اور اپنے فضل و کرم سے قبول کرتے ہیں ہمارے عمل کے اندر کوئی جان نہیں ہے۔

مدارِ نجات فضلِ خداوندی ہے۔۔۔۔۔۔اور نجات بھی فضل سے ہے حدیث میں ہے کہ۔''لَنْ يُّنْجِيَ اَحَدَكُمْ عَمَلُهٗ'' ''تم میں سے کسی کو بھی تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ جب تک اللہ کا فضل نہ ہو''۔ ②

شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب آخرت کے احوال پر لکھی ہے اس میں پچھلی امتوں میں سے بنی اسرائیل کا ایک بڑا عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک عابد تھا جو رات دن اللہ کی عبادت میں لگا رہتا تھا مگر بہر حال جب آدمی دنیا میں رہتا ہے تو کھانے پکانے کی بھی ضرورت ہے، بیوی بچے ہیں، گھر بھی ہے، رشتہ دار بھی ہیں۔ کچھ نہ کچھ ان میں بھی مشغولی ہوتی ہے۔ اس عابد کو یہ بھی ناگوار تھا کہ اتنی دیر بھی بیوی بچوں میں کیوں لگے؟ یہ وقت بھی اللہ ہی کی عبادت میں لگنا چاہئے تو اس نے یہ کیا کہ بیوی، بچے، رشتہ دار، مال، جائیداد کو ترک کر کے سمندر کے بیچ میں

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۱۳۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ، ج: ۲۰ ص: ۹۹ رقم: ۵۹۸۲۔

ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا کہ بس اب میں فارغ ہو گیا ہوں اور چوبیس گھنٹے اللہ کے ذکر میں مشغول رہوں گا۔ اس زمانے میں یہ چیز جائز تھی۔ اسلام نے اس چیز کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن پچھلی امتوں میں رہبانیت یعنی گوشہ گیری کرنا اور پہاڑوں پر چلا جانا، یہ جائز تھا۔ یہ بھی پہنچ گیا اور ایسی جگہ پہنچا کوئی آدمی وہاں نہ پہنچ سکے۔ سمندر اور اس کے بیچ میں ایک ٹیلہ تھا۔ اس پر جا کے بیٹھ گیا اور ایک چھپر ڈال لیا اللہ نے فضل کیا۔ اسی پہاڑ کے ٹیلے پر ایک انار کا درخت اگ آیا اور اس پر میٹھے انار لگنے لگے اور اسی کڑوے پانی کے اندر اس پہاڑ میں سے اللہ نے ایک چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ ایک انار روز کھا لیا، ایک کٹورا پانی پی لیا اور چوبیس گھنٹے نماز میں مشغول نہ رات کو سونا نہ دن کو کہیں جانا۔ دن بھر نماز، رات بھر نماز پانچ سو برس اس نے اسی طرح گزارے۔ اور یہ عبادت بھی خالص اس لئے کہ وہاں دکھلاوا کس کو ہوتا۔ وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شہرت اور نام آوری مقصود نہیں تھی۔ وہاں کون نام سننے والا تھا۔ تن تنہا یہ بندہ اور اس کا خدا۔ تو خالص عبادت اور پانچ سو برس۔

پانچ سو برس گزر کر جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے نماز پڑھتے ہوئے سجدے کی حالت میں موت دیجئے اور میرے اس بدن کو سجدے کی حالت میں قیامت تک محفوظ رکھئے تاکہ قیامت تک میں تیرا سجدہ گزار بندہ سمجھا جاؤں کم سے کم سجدہ کرنے والے کی صورت ہی بنی رہے۔ تو میری لاش سجدے کے حالت میں قیامت تک محفوظ رہے۔ یہ دعا قبول ہوگئی۔ اور حدیث میں ہے کہ اس کو عین سجدے کی حالت میں موت آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آج تک اس کی لاش سجدے میں محفوظ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اس کی روح نکل گئی اور بارگاہ حق میں اس کی پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بندے! میں نے اپنے فضل و کرم سے تجھے بخشا اور تجھے جنت کا مقام رفیع عطاء کیا۔ تو ابدالآباد تک کے لئے اب چین میں رہ۔ اور ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کو جنت میں لے جاؤ۔ یہ میرا مقبول بندہ ہے۔ میں نے اس کو اپنے فضل و کرم سے نجات دی۔

اس عابد کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا کہ پانچ سو برس میں نے عبادت کی۔ بیوی، بچے، رشتہ داروں اور مال و دولت میں نے چھوڑا اور اب بھی اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا کم سے کم میری تسلی کے لئے کہہ دیتے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دے دی۔ تو نے گھر بار چھوڑا تھا۔ تیرے اس عمل کے طفیل نجات دے دی۔ تو ذرا میرا دل خوش ہو جاتا کہ میرے عمل کی کچھ قدر کی اتنی میں نے محنت کی، ساری دنیا کو میں نے ترک کیا اور اب بھی بخشا تو اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا گویا میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ یہ ایک وسوسہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کی کھٹک کو جانتے ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (1) ''سینوں میں جو خیالات ہیں ان کو بھی جانتے ہیں''۔

اس لئے ملائکہ سے فرمایا، جنت کی بجائے اس عابد کو جہنم کے راستے پر لے جاؤ۔ جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔

---

(1) پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۴۔

لیکن اتنی دور جہنم سے کھڑا کرو جہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستہ پر ہو، اس کو وہاں پہنچایا گیا، وہاں جو جہنم کی ایک لو اور لپٹ آئی ہے تو سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہوگیا اس کو کانٹے چبھنے لگے اور پیاس پیاس چلانا شروع کیا۔ جہنم کا ایک جھونکا لگتے ہی اس کی ساری روح خشک ہوگئی۔ حدیث میں ہے ہے کہ ایک ہاتھ غیب سے نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑتا ہوا گیا کہ اسے اللہ کے بندے یہ پانی مجھے دے۔ یہ آگے گیا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا، یہ اور آگے ہوگیا، ہاتھ اور پیچھے ہٹ گیا یہ اور آگے ہوگیا، ہاتھ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کہا خدا کے لئے مجھے پانی دے۔

جواب یہ ملا، آواز آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے، مگر اس کی قیمت ہے۔ اس عابد نے پوچھا کیا قیمت ہے؟ کہ پانچ سو برس کی عبادت جو خالص کی ہو۔ وہ اگر قیمت میں ادا کردی جائے تو یہ پانی کا کٹورا مل سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ اس نے کہا، میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ اور وہ جلدی سے پیش کردی کٹورا لے کر پیا تو کچھ دم میں دم آیا۔

حق تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ اس عابد کو لوٹا کے لاؤ اور پھر ہمارے سامنے پیش کرو پھر پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے، تیری پانچ سو برس کی عبادت سے تو ہم چھوٹ گئے۔ تو نے پانچ سو برس عبادت کی تھی۔ اس کی قیمت ایک کٹورا پانی تجھے مل گئی اور وہ قیمت تو نے خود تجویز کی۔ ہم نے نہیں کی تو نے ہی کہا کہ میں پانچ سو برس کی عبادت دیتا ہوں اور کٹورا خریدتا ہوں۔ اس لئے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے ہم ادا ہوئے۔ معاملہ برابر سرابر ہوگیا۔

اب ان لاکھوں کٹوروں پانی کا حساب دے جو دنیا میں تو نے پیئے ان کے بدلے میں کیا کیا عمل لے کر آیا اور وہ جو دنیا میں تو نے لاتعداد اناروں کے دانے کھائے ہیں۔ ایک ایک دانے کا حساب دے ان کے بدلے میں کتنے سجدے، کتنے رکوع کئے کتنی عبادتیں کیں؟ اور دانہ پانی تو الگ ہے۔ وہ جو تیری آنکھوں میں روشنی تھی جس سے تو صورتیں دیکھتا تھا، ایک ایک تار نگاہ کا حساب دے اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا ہے؟ اور نگاہ تو الگ ہے۔ یہ جو تو سانس لیتا تھا۔ جس کے ذریعے زندگی قائم تھی۔ ایک ایک سانس کا حساب دے اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو بدن میں ہم نے جان دی تھی۔ جس نے پانچ سو برس زندگی رکھی اور تو نے عبادت کی۔ اس طاقت کا حساب دے۔ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

اور وہ جو چشمہ اور انار کا درخت تیرے لئے رکھا تھا اور ہواؤں کو تیری طرف متوجہ کیا جس سے تو سانس لیتا تھا۔ اور جو ہم نے اپنے سورج کو گرمی بخشی جس نے تجھ تک گرمی پہنچائی، جس سے تیرا بدن قائم رہا۔ ان سب چیزوں کا حساب دے۔ ہماری دنیا کے ذرے ذرے سے جو فائدہ اٹھایا، اب سب کا حساب دے۔ کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

عابد بے چارہ تھرا گیا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ! بے شک نجات تیرے فضل ہی سے ہوتی ہے۔

بندے کے عمل سے نہیں ہوتی۔ عمل کی تو کل قیمت یہ ہے کہ پانچ سو برس کے عمل کے بدلے ایک کٹورا پانی مل گیا۔ اور وہ بھی آپ نے فضل ہی سے دے دیا اگر آپ یوں فرماتے کہ کٹورا اسے ملے گا۔ جس نے ایک لاکھ برس عبادت کی ہے۔ میں تو اس سے بھی محروم رہ جاتا۔ تو نے قیمت اتنی رکھی جو میں ادا کر سکا یہ بھی تیرا ہی فضل ہے۔ اس لئے نجات فضل سے ہوتی ہے، عمل سے نہیں ہوتی۔

عمل علامت فضل ہے...... مگر بھئی! اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائیو کہ آج سے ہی نماز تو صفر اور گھر بیٹھ گئے کہ جب نجات فضل سے ہوگی، پھر عمل کی محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس پر فضل ہونا ہوگا، ہو جائے گا اور جس پر نہیں ہوگا نہیں ہوگا ہم کیوں محنت اٹھائیں؟ یہ خیال مت کرنا۔ بے شک فضل سے ہی نجات ہوگی لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ ہم پر فضل متوجہ ہے بھی یا نہیں؟ اس کی علامت عمل ہے۔ عمل جو کر رہے ہیں وہ اس کی دلیل ہے کہ فضل متوجہ ہے عمل کو چھوڑ دینا اس کی علامت ہوگی کہ فضل متوجہ نہیں ہے۔ دنیا میں جب فضل متوجہ ہوتا ہے، تو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جب فضل متوجہ ہوگا تو جنتیوں کی صورت میں صلہ ملے گا یہاں بھی فضل، وہاں بھی فضل ہی کام کرے گا۔

جنت عمل کا نہیں ایمان کا صِلہ ہے...... البتہ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو کہ جنت کا بدلہ ایمان پر ملے گا عمل پر نہیں ملے گا۔ عمل محض علامت ہے جس سے ایمان پہچان لیا جائے ورنہ اصل میں ایمان کا بدلہ جنت ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ اگر سونا خریدنے کے لئے کسی صراف کی دوکان پر جائیں اور ایک ہزار روپے کا سونا آپ کو خریدنا ہے تو آپ یہ نہیں کرتے کہ آپ نے ہزار روپیہ دیا، اس نے سونا دے دیا اور آپ لے کے چلے آئے۔ پہلے اسے پرکھتے ہیں کہ اصل بھی ہے یا نہیں؟ اس میں کھوٹ ملا ہوا تو نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسوٹی ایک پتھر ہوتا ہے، اس پر گھسا کر دیکھتے ہیں۔ اگر اس پر سفید چمک دار لکیریں پڑیں، یہ اس کی علامت ہوئی کہ سونا کھرا ہے تو آپ ہزار روپے دیدیں گے، سونا لے لیں گے اور اگر میلی اور مٹیالے رنگ کی لکریں پڑیں تو آپ سمجھیں گے کہ سونا کھوٹا ہے۔ آپ نہیں لیں گے۔

یہ جو آپ نے سونا خریدا اور صراف کو ہزار روپیہ دیا۔ یہ ہزار روپیہ کیا ان لکیروں کی قیمت تھی۔ جو پتھر پر کھینچی گئیں یا سونے کی قیمت ہے؟۔ یہ سونے کی قیمت تھی، لکیروں کی نہیں تھی۔ وہ تو علامت تھیں، جن سے پہچانا گیا کہ سونا کھرا ہے۔ اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت جو ملے گی یہ ایمان کا بدلہ ہوگا، عمل کا نہیں۔ عمل کی لکیریں ہوں گی جن سے ایمان کے کھرے کھوٹے ہونے کو پرکھا جائے گا عمل اچھے ہیں، تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان بھی اچھا تھا۔ لہٰذا اس ایمان کی قیمت جنت ادا کر دی جائے گی۔ اگر عمل برے ہیں تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان میں کمی تھی، کھوٹ تھا۔ لہٰذا بدلہ پورا نہیں مل سکتا اس لئے بدلہ جو ملے گا وہ عمل کا نہیں، ایمان کا ملے گا ایمان کو پہچاننے کے لئے عمل کو دیکھا جائے گا۔

اگر عمل کا بدلہ ہوتا، تو میں نے اور آپ نے پچاس برس مثلاً عمل کیا۔ تو بس پچاس برس جنت میں رہتے، اس کے بعد کان سے پکڑ کے باہر نکال دیئے جاتے کہ جاؤ باہر، بدلہ ہوگیا۔ جنت میں جو آپ ابدالآباد رہیں گے یہ عمل کا بدلہ نہیں اس لئے کہ عمل محدود وقت تک انجام دیا تھا۔ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو عمر بھر قائم رہے گا۔ اور جب آدمی مرتا ہے تو یہ عزم لے کے جاتا ہے کہ اگر ایک کروڑ برس بھی زندہ رہوں گا، تب بھی اس ایمان کو نہیں چھوڑوں گا۔ تو ایماندار ہی ہوتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایمان چونکہ ابدی چیز ہے۔ اس لئے بدلہ بھی ابدی ملا عمل ابدی چیز نہیں ہے۔ اس لئے عمل کا بدلہ نہیں ہوتا اس کو بطور علامت دیکھتے ہیں۔ ظاہر میں بے شک عمل سے جنت ملی، مگر ایمان نہ ہو، کیا پھر بھی جنت مل جائے گی؟ نہیں ملتی معلوم ہوا عمل سے نہیں ملتی، ایمان سے ملتی ہے۔ ایمان ہو، تبھی عمل بھی معتبر ہوتا ہے اور ایمان کی پرکھ عمل سے ہی ہوتی ہے۔

اس واسطے میں عرض کر رہا ہوں کہ بلاشبہ فضل سے نجات ہوگی۔ لیکن عمل کرنا اس کی علامت ہے۔ اس لئے عمل کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان کا کمال شکل وصورت سے نہیں ہے، بلکہ سیرت سے ہے اور سیرت کا تعلق علم سے، اخلاق سے، اعمال صالحہ سے، ایمان باللہ سے، آخرت کو پہچاننے اور یاد کرنے سے ہے۔ اس سے سیرت بنتی ہے۔ یہی اصل مقصود ہے۔ اسے بنانے کی ضرورت ہے۔

دلائل قدرت..... اس کے لئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دلائل قائم کئے ہیں۔ اپنے وجود کو منوانے اور اپنے کمالات کو بتلانے کے لئے دلائل قائم کئے ہیں اور وہ دلائل فلسفیانہ نہیں ہیں۔ بلکہ دنیا کی چیزیں پیش کی ہیں کہ ان میں غور کرو، تاکہ اللہ کا وجود تمہاری سمجھ میں آجائے۔ یہ جو آیت میں نے پڑھی یہ بھی اللہ کے وجود کی مستقل دلیل ہے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ (۱) ''اے مخاطب! تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا''۔

پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے۔ اسے اوپر چڑھا کے کون لے گیا پانی نیچے سے ابلنا چاہئے۔ زبردستی آپ نکالتے ہیں۔ ورنہ اسے نیچے جانا چاہئے۔ یہ ہزاروں میل کی مسافت پر اوپر چڑھا کر کون لے گیا کہ وہاں سے پانی کو گرانا شروع کیا۔ تو پہلی دلیل تو یہاں سے معلوم ہوتی ہے کہ پانی کو نہ ہم بادلوں پر لے کر گئے نہ ہمارے آباؤ اجداد۔ کوئی بڑی ذات ہے جس کے حکم سے وہاں پہنچ گیا اور طبیعت کے خلاف اسے وہاں جانے پر مجبور کیا۔ اس لئے اللہ کا وجود پہلے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا۔

پانی آکر زمین میں جذب ہوا، پھر زمین سے پھل، غلے، ترکاریاں اور سبزیاں اگنا شروع ہوئیں۔ ﴿فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا﴾ (۲) ہم نے اس کے ذریعے پھل نکالے، ان پھلوں کے نکالنے والا کون ہے؟

(۱) پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷. (۲) پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷.

کاشت کار نے اگر بیج ڈال بھی دیا، تو منوں مٹی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے کونپل کو نکال رہا ہے؟ ہم نے نکالی؟ یا ہمارے آباؤ اجداد نکالنے گئے تھے؟ کاشت کار زیادہ سے زیادہ بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ خبر نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ زمین کے اندر اس بیج کو توڑنا پھوڑنا، اس میں سے کونپل بنا کے نکال دینا، یہ اللہ ہی کا کام ہے۔ پھر یہ کونپل ایسی نرم و نازک چیز ہے کہ آدمی اسے انگلیوں سے مسل دے، کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لیکن طاقت و را تنی ہے کہ زمین کو پھاڑ کر نکل رہی ہے۔ تو اس میں یہ طاقت کس نے پیدا کر دی کہ وہ منوں مٹی کو چیر پھاڑ کر اوپر آ گئی۔ جب کہ اس کی طبیعت نیچے جانے کی تھی۔ گھاس کو آپ اوپر کو اچھالئے اوپر نہیں جائے گی نیچے کو آئے گی۔ یہ اس کی طبیعت کے خلاف نیچے سے اوپر کی طرف چڑھانے والا کون ہے؟

تو پانی کو نیچے اتارنا، اوپر چڑھانا، پھر زمین کے اندر بیج میں طاقت پیدا کرنا کہ بیج پھٹا، اس میں سے کونپل نکلی۔ منّوں مٹی کے اندر سے اس نے زمین کو چاک کیا اور اوپر آ کے اپنا چہرہ دکھلایا کہ میں آ گئی ہوں۔ یہ سارے کام کرنے والے، بجز حق تعالیٰ کے اور کون ہیں؟

اور آگے دلیل یہ بیان کی کہ۔ ﴿مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا﴾ ① ہر پھل کے رنگ الگ سیب دیکھو اور رنگ، آم دیکھو اور رنگ، انگور دیکھو اور رنگ بلکہ اب تو ہر نوع کے اندر خدا جانے کتنی اقسام اور کتنے رنگ ہیں۔ سیب کی بہت سی اقسام اور بہت الوان۔ اس طرح آم کی بے شمار اقسام۔ انگور کی بھی اقسام ہیں رنگ بھی مختلف ہیں۔ حالانکہ جنس ایک ہے اور مزے مختلف ہیں۔ ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ② حالانکہ سب کی اصل زمین ہے۔ زمین کے اندر سے نکل رہے ہیں اور رنگ سب کے مختلف۔ اگر زمین کی طبیعت رنگ بناتی تو طبیعت تو ایک رفتار پر چلا کرتی ہے۔ یہ مختلف رفتار سے کام کوئی پھل، کوئی پھول، کوئی، پیلا، کوئی نیلا، کوئی سرخ، کوئی کالا۔ یہ بجز حق تعالیٰ کے کون کر سکتا ہے؟ اور فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ یہ سلسلہ صرف پھلوں ہی کا نہیں بلکہ ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ﴾ ③ پہاڑوں کو دیکھو تو کوئی سفید، کوئی نیلے رنگ کا، کوئی کالے رنگ کا، کوئی سبز و سرخ رنگ کا۔

یہ جو بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے آیت پڑھی۔ وہ آج کے سفر سے یاد تازہ ہوئی پہاڑوں کے بیچ میں سے نکل کر آ رہے تھے کہ کوئی پہاڑ نیلے رنگ کا سامنے آ گیا، کسی میں سرخی جھلک رہی ہے، کسی میں گلابی رنگ، کسی میں کالی مٹی، کسی میں سے کوئلہ نکل رہا ہے. تو پہاڑوں کے اتنے مختلف رنگ۔ اگر یہ پہاڑ کی خاصیت ہوتی تو ایک ہی رنگ کے پہاڑ بنتے۔ یہ رنگ کیسے پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فاعلِ مختار ہے۔ جو ان کے اندر اپنی مرضی سے رنگ بھرتا ہے۔ خود پہاڑ اپنی طبیعت سے پیدا نہیں کرتے۔ پھر کالے بھی معمولی رنگ کے نہیں، بلکہ فرمایا،

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۴۔

③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷۔

﴿وَغَرَابِيبُ سُودٌ﴾ ① گاڑھے رنگ کے کالے اَسْوَدُ غَارِبٌ اسے کہتے ہیں، جس کے اندر بڑی گہری سیاہی ہو، دولفظ ہیں، غَرَابِيبُ اور سُودٌ یعنی انتہا کی سیاہی۔ تو پہاڑوں سے کوئلہ نکلتا ہے۔ جو انتہائی سیاہی ہے۔

پھر فرماتے ہیں، اسی طرح انسانوں کو دیکھو تو ان میں مختلف رنگ ہیں۔ عربوں کو دیکھو تو سرخ رنگ، حبشیوں کو دیکھو تو کالے رنگ کے، تتروں میں سیاہ رنگ کے، چین اور جاپان میں زرد اور پیلے رنگ کے۔ ہندوستان میں دیکھو تو بوقلموں۔ کہیں کالے، گورے، سب گڈمڈ مختلف رنگوں کے انسان ملیں گے۔ اگر انسان کی طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ سفید ہو تو پھر کچھ کالے اور سفید کیوں ہو گئے؟ طبیعت سب کی انسان ہی ہے۔ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنا، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھرنے والا موجود ہے، کوئی خالق موجود ہے۔ جیسا اس نے چاہا ویسا کر دیا۔ اور فرماتے ہیں انسانوں ہی کی کیا بات ہے۔ چوپایوں کو دیکھو، ان میں بھی رنگ مختلف ہیں۔ ہزاروں چوپائے مختلف رنگ کے ہیں۔ شیر زرد رنگ کا، ہرن سیاہ رنگ کا، ہرنی پیلے رنگ کی، بگلا سفید، کوا سیاہ، تیتر سبز، مور ست رنگا، ہر جانور درندے، چرندے، پرندے سب کے رنگ الگ اور رنگوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اسی طرح ایک ہی نوع میں مختلف رنگ ہیں۔ گائے میں سفید رنگ کی بھی کالی بھی، سرخ رنگ کی بھی اور سفید بھی اور چت کبری بھی ہوتی ہے۔ بکریوں اور اونٹوں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر یہ حیوانی طبیعت کا تقاضا تھا، ایک رنگ ہوتا۔ یہ دس رنگ کیوں ہیں؟ پہاڑ کی طبیعت کا تقاضا ایک رنگ کا تھا، یہ پچاس رنگ کیوں ہیں؟ بجز اس کے کہ اس کو مانا جائے کہ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنے والی ذات وہ ہے، جس کو ہمہ قسم کے اختیارات حاصل ہیں کہ جس کو جیسا چاہے رنگ دے دے۔ جس کو جیسا چاہے بنادے۔ تو اللہ کی شان ان تمام چیزوں کے اختلاف کو دیکھ کر ثابت ہوئی۔ پھر انسانوں میں اختلاف ہے، چہرے کا اختلاف، صورتوں کا اختلاف۔ یعنی کروڑوں انسان آج بھی موجود ہیں۔ اربوں گزر گئے ہیں، اربوں آنے والے ہیں۔ ایک کا نقشہ دوسرے سے نہیں ملتا۔ اللہ کا اتنالا محدود عمل ہے کہ ہر انسان کی شکل جدا کر دی۔

پھر فرق پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ کسی کی ناک وہاں لگا دیتے، کسی کے یہاں لگا دیتے، کسی کے کان آگے ہوتے، کسی کے کان پیچھے ہوتے۔ کان، ناک وہیں ہیں جہاں ہونے چاہئیں، آنکھیں وہیں ہیں۔ اس کے باوجود فرق موجود ہے۔ غرض رنگوں کا اختلاف الگ، صورتوں اور نقشوں کا اختلاف الگ ہے۔ پھر زبانوں کا اختلاف الگ ہے۔ ایک جانور مثلاً طوطا ہے۔ اس کو دیکھیں عرب کا ہو، ہندوستان کا ہو، ترکستان کا ہو، کسی ملک کا ہو اس کی زبان ایک ہی ہوگی یا بیل ہے ہندو کا ہو، سندھی کا ہو، ایک ہی بول بولے گا۔ مرغ ہے وہ بھی ایک طرح بولے گا۔ لیکن انسان ہے کہ بھانت بھانت کی بولی بولتا ہے۔ مشرق، امریکہ، افریقہ، ہندوستان، انگلستان، جرمنی، فرانسیسی وغیرہ سب کی الگ الگ زبان ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں اس وقت اصولی طور پر ایک سو بیس

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۷۔

زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ ہر صوبے کی زبان الگ الگ ہے۔ پنجابی، سندھی، مدراسی، مراد آبادی، بلوچستانی وغیرہ۔ ہر ایک کی زبان الگ۔

پھر ہر زبان میں فرق ہے۔ دہلی والوں کی اردو اور ہے، لکھنو والوں کی اور ہے، بہار کی اور طرح کی، یوپی کی اور طرح کی۔ انسان عجب چیز ہے کہ زبانوں کا اختلاف بے حد و بے حساب ہے۔ دنیا کی زبانیں گنیں تو ہزاروں کی تعداد نکلے گی۔ اگر انسان کی جبلّت کا تقاضا عربی وغیرہ تھا۔ سارے انسانوں کی ایک ہی زبان ہوتی۔ یہ کسی کی عربی، کسی کی ترکی۔ بتلانے والے نے بتلایا۔ یہ میری قدرت ہے کہ میں قلوب کو ہدایت دیتا ہوں کہ اس طرح بولو تم تھوڑا ہی زبانیں سکھلاتے ہو۔ ماں کے پیٹ سے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو ماں باپ ایک ایک لفظ تھوڑا ہی سکھلاتے ہیں۔ وہ خود ہی بولتا ہوا اٹھتا ہے تو یہ کون ہے جو اندر تعلیم دیتا ہے غرض اختلاف اَلْسِنَہ اللہ کے وجود کو پہچاننے کی مستقل دلیل ہے۔

اس لئے ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ﴾ ① اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے زمین و آسمان کی بناوٹ ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ مگر ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ ② اس میں قدرت کی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں، تفکر کرتے ہیں، جو یہ سوچ بچار کرتے ہیں کہ آخر یہ اختلاف کیوں ہے؟ اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی راز ہے۔ اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو کائنات کا اختلاف کیوں ہے؟ اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی راز ہے۔ اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو کائنات کا اختلاف یہ اللہ کے وجود کو پہچاننے کی ایک مستقل دلیل ہے۔ زبان، صورت، رنگ، پہاڑ، جانور، ہر ہر چیز میں اختلاف ہے۔ ایک ہی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ انسان اگر کچھ بنانے بیٹھے گا۔ تو وہ بھی یہ نہیں کہے گا کہ ایک رنگ کی چیز ہو۔ وہ بھی یہ چاہے گا کہ دس قسم کی چیزیں ہوں۔ یہ دس جذبات کس نے پیدا کر دیئے طبیعت کا تقاضا تھا کہ ایک ہی وضع کی چیز بنانا۔ ایک کا لباس ایسا ہو، ایک کا ایسا۔ تو میں روز ایک سے ایک فیشن نکالتی رہتی ہیں۔ آج جو فیشن ہے وہ کل پرانا ہو جائے گا۔ کل اور فیشن آ جائے گا۔ اگلے دن اور خدا جانے سو برس میں کتنے فیشن بن چکے ہیں، کتنے بدل چکے ہیں۔ آخر انسان میں اگر یہ جبلّت اور طبیعت کا تقاضا ہے تو وہ ایک شکل پر آتی۔ ہر چیز میں اختلاف ہے، عقلوں میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف پیدا کرنے والے اللہ ہیں۔ معلوم ہوا طبیعت کا تقاضا نہیں۔ کسی فاعل مختار کے ارادے، کا یہ فعل ہے۔ اس نے جیسا ارادہ کیا ویسا بنا دیا۔ اس لئے اگر انسان اللہ کو پہچاننا چاہے تو اپنے کو دیکھ لے، جب پہچان جائے گا۔ پہاڑ پہ نگاہ ڈالے تو پہچان جائے گا۔ غرض جس چیز پہ نگاہ ڈالے گا، اللہ کا وجود اس سے نمایاں ہوگا۔ اور اگر فکر نہ کرے تو انبیاء بھی تعلیم دیں جب بھی نہیں مانے گا اور ماننا چاہے تو اللہ نے ایک ایک چیز کو واعظ و مبلغ اور مذکر بنا دیا۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

بہر حال یہ آیت میں نے اس لئے تلاوت کی تھی کہ اس آیت سے حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے وجود کو منوایا ہے اور دلیلیں ایسی بیان کی ہیں، جو فلسفیانہ انداز کی نہیں ہیں۔ ایسی ہیں کہ گاؤں کا رہنے والا اور شہر کا رہنے والا بھی سمجھ جائے۔ قرآن کریم سارے انسانوں کے لئے کتاب ہے۔ اس میں ایسے دلائل ہونے چاہییں، جس کو عوام و خواص یکساں سمجھ سکیں اور اگر فلسفیوں کی طرح شکل اول بنائی جاتی، مقدمات لگائے جاتے اور صغریٰ و کبریٰ ملتا، پھر نتیجہ نکلتا۔ تو بے چارہ گنوار دیہاتی ان کو کیا سمجھتا؟ اس لئے ایسے دلائل سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا گیا کہ کم فہم سے کم فہم اور بے پڑھا لکھا بھی آسانی سے سمجھ سکے۔

بہر حال یہ آیت میں نے پڑھی تھی اس کے متعلق چند باتیں میں نے عرض کیں اللہ تعالیٰ ہمیں فہم سلیم عطا فرما دے۔ ہمارے لئے دنیا و آخرت میں بھلائی مقدر فرمائے۔ اپنی معرفت اور پہچان کی، علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ حق تعالیٰ اپنے رسول پاکؐ کی سنتوں پر چلنے کی توفیق نصیب فرما دے۔ دین کو ہمارا شعار بنائے۔ دنیا و آخرت دونوں ہماری درست فرما دے۔ آخرت میں بلا حساب ہمیں جنت میں داخل فرما دے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور معیت نصیب فرما دے۔ آمین

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

ذکر اللہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ:......... فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ، وَلَذِكْرُاللّٰهِ اَكْبَرُ ،وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بزرگانِ محترم !...... یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ جواس وقت آپ حضرات کے سامنے میں نے تلاوت کی۔اس وقت پوری آیت کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں ہے۔ بلکہ آیت کے صرف ایک جز کے بارے میں کچھ کہنا ہےاوروہ درحقیقت ساری شریعت کی روح ہے۔اوروہ جز ﴿وَلَذِكْرُاللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② ہے۔ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔نماز آدمی کو بے حیائی کی باتوں سے بچاتی ہے برائیوں سے روکتی ہےاوراللہ کا ذکر بہت ہی بڑی چیز ہے۔نماز فحش اور منکرات سے کس طرح بچاتی ہے؟اس وقت اس کے بارے میں کلام نہیں کرنا بلکہ ﴿وَلَذِكْرُاللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ③ کے بارے میں چند باتیں گذارش کرنی ہیں۔

اعمالِ شرعیہ کی روح...... اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکرُ اللہ ہی سب سے زیادہ اعمال میں افضل ہے۔اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں۔بلکہ عمل مقبول ہو تا ہے تو ذکرُ اللہ ہی کی وجہ سے مقبول ہوتا ہے۔ اگر نماز میں ذکرُ اللہ اور یادِ خداوندی نہ ہو۔(۲۸۔جولائی ۱۹۶۳ءافریقہ) نماز بے روح رہ جائے گی،روزے میں ذکرُ اللہ نہ ہو روزہ بے روح رہ جائے گا،زکوٰۃ میں ذکراللہ نہ ہوزکوٰۃ بے روح ہو جاتی ہے۔سارے اعمالِ شرعیّہ کی روح فی الحقیقت ذکرُ اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔اس لئے اس پر کلام کرنا گویا ساری شریعت پر اور شریعت کے سارے احکام پر کلام کرنا ہے۔اس وجہ سے میں نے اس آیت کا انتخاب کیا ہے۔یہ آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر چیز کی

① پارہ: ۲۱،سورۃ العنکبوت،الآیۃ: ۴۵. ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت ، الآیۃ: ۴۵.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

زندگی روح سے ہے محض بدن سے کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک کہ بدن کے اندر روح نہ ہو۔ روح نکل جاتی ہے تو پھر آدمی کو مُردہ کہتے ہیں۔ پھر وہ اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اسے باقی رکھا جائے۔ بدن کو لے جا کر دفن کر دیتے ہیں۔ یا جلا دیتے ہیں یا پانی میں بہا دیتے ہیں۔ غرض وہی انسان جس سے محبت کا تعلق ہوتا ہے جس کی طرف کشش ہوتی ہے ایک منٹ اس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں روح نکلی ہر شخص کو وحشت ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے اسے جلد سے جلد اپنے سے دور کر دیا جائے۔ تو معلوم ہوا تعلق اور محبت در حقیقت بدن سے نہیں بلکہ بدن کے اندر جو روح سمائی ہوئی ہے اس سے تعلق ہوتا ہے وہ نکل گئی تو تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ تو اصل بنیادی چیز اس دنیا میں روح ہے۔ بغیر روح کے کسی شے کے لئے بقا نہیں ہے۔

جس طرح سے ان مادی چیزوں میں روح سے ہی بقا ہے۔ اسی طرح سے اعمال شریعت بھی ڈھانچے ہیں۔ جب تک ان میں ذکر اللہ کی روح نہ ہو وہ لاشے کے مانند ہیں۔ ان کی کوئی قدر قیمت نہیں ہے۔ اگر نماز میں یادِ خداوندی کی بجائے غفلت آ جائے، نماز ختم ہوگئی۔ اس لیے کہ فرمایا گیا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ ① ''نماز قائم کرو میرے ذکر کے لئے''۔ جب ذکر نہ رہا، روح نماز ختم ہوگئی۔ اب محض ایک اُٹھک بیٹھک یا ایک بدنی ورزش ہے جس کی کوئی قدر و قیمت عنداللہ نہیں ہوگی۔ اس طرح سے اگر روزے کے اندر ذکر، تلاوت اور تراویح نہ ہو تو روزہ بھی ایک فاقہ ہے۔ جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ نیت کے سچے اور اس میں یادِ خداوندی ہونے سے روزہ زندہ ہو جاتا ہے اس کو عبادت کہتے ہیں یہ روح نکل جائے عبادت کی بجائے عادت ہو جاتی ہے۔ تو عادت اور عبادت میں فرق یہی ہے کہ عادت محض ایک ڈھانچہ ہوتی ہے۔ جس میں اللہ کی یاد نہیں ہوتی اگر یاد ہوتی بھی ہے تو اپنے نفس کی ہوتی ہے۔ اگر بلا نیت کے سارا دن کھانا نہ کھائیں، پانی نہ پئیں، بیوی کی طرف رخ کر کے بھی نہ دیکھیں۔ اسے فاقہ کہیں گے اور نیت کے ساتھ اور یادِ خداوندی کے ساتھ کریں تو اسی کو روزہ کہیں گے۔ اگر حج میں ذکر اللہ نہ ہو اور نیت صحیح نہ ہو تو حج نہیں بلکہ سیر و سیاحت ہے۔ اگر اسی میں سچی نیت آ جائے۔ وہ حج بن جاتا ہے تو عادت اور عبادت میں یہی فرق ہے۔ کہ عادت میں نفس کا جذبہ کام کرتا ہے اور عبادت میں جذبہ یادِ حق ہے۔ جس سے وہ عبادت بن جاتی ہے۔ حاصل یہ نکلا جب اس کائنات کی روح اللہ کی یاد ہے۔ اس طرح سے پوری شریعت کی روح بھی اللہ کی یاد ہے اگر دنیا میں سے روح نکل جائے تو دنیا ڈھانچہ بن جائے گی۔ شریعت میں سے کوئی اس روح کو نکال دے تو شریعت عادت بن جائے گی عبادت نہیں رہے گی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''لَاتَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ'' ② قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی۔ جب تک اس دنیا میں ایک آدمی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہو۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان آخر الزمان، ج: ۱، ص: ۳۵۴، رقم: ۲۱۱۔

قیامت قائم کردی جائے گی۔

قیامت کے معنی درحقیقت عالم کی موت کے ہیں۔جیسا کہ مرنے کے بعد بدن پھول پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔اسی طرح قیامت کے دن صور پھونکنے کے بعد آسمانوں کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جائیں گے۔ زمینیں ریزہ ریزہ ہوجائیں گی، پہاڑ گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے پانی مٹی میں اور مٹی پانی میں، سارا کارخانہ گڑبڑ اور درہم برہم ہوجائے گا۔یہ قیامت ہے۔تو حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے جب ایک بھی نہیں رہے گا۔جبھی عالم کو موت آجائے گی۔معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی روح ذکرُ اللہ ہے۔تو پوری دنیا کی زندگی اور روح درحقیقت یادِ خداوندی ہے۔

دنیا کے ایک ایک جز میں ذکرُ اللہ سے زندگی ہے...... یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے ایک ایک جز میں زندگی کے آثار ذکرُ اللہ سے ہیں۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ چلتا ہوا پانی اللہ کا ذکر کرتا ہے۔جب تسبیح بند ہوجاتی ہے۔تو وہی وقت اس کی موت کا ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر جاتا ہے جہاں پانی ٹھہرا تو چند دن کے بعد خراب ہوجاتا ہے، میل کچیل بڑھ جاتا ہے۔بہتے ہوئے پانی میں میل کچیل قائم نہیں ہوتی۔اس لئے بہتا ہوا پانی تھوڑا ہو یا زیادہ، اس سے وضو جائز ہے۔اگر اس میں کوئی گندگی بھی گر جائے اس کی پاکی میں کوئی فرق نہیں آتا۔اس لئے کہ اس میں تسبیح اور ذکرُ اللہ جاری ہے۔وہ اسے ناپاک نہیں ہونے دیتا اور ٹھہرا ہوا پانی اگر مقدار میں کم ہے اور اس میں کوئی گندگی گر جائے وہ پورا پانی ناپاک ہوجاتا ہے۔اس سے وضو وغیرہ نہیں کر سکتے۔گندگی کیوں پھیلی؟ اس لئے کہ اس کے اندر وہ روح ختم ہوگئی۔تو چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور ٹھہرا ہوا پانی تسبیح سے محروم ہوجاتا ہے۔وہی اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ درخت کی ٹہنیاں جب تک سرسبز ہیں، وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔تسبیح بند ہوئی جب ہی اس پر زردی آتی ہے خشک ہوجاتی ہیں۔وہی جلانے کے قابل بن جاتی ہیں۔گویا جہاں ان سے ذکر کی روح نکلی تو پھر اسے جلادیا جاتا ہے۔اسی طرح سے حدیث میں فرمایا گیا کہ نیا کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے جہاں اس کی تسبیح بند ہوئی جبھی اس پر میل کچیل آنا شروع ہوجاتا ہے اور تسبیح ختم ہوتے ہی جہاں وہ میلا بنا، پھر پہننے کے قابل نہیں رہا، آپ اسے اُتار کر دھوبی کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔جب تک دُھل کر نہ آئے آپ اس قابل نہیں سمجھتے کہ اسے بدن کے قریب بھی کریں۔اس سے معلوم ہوا کہ کپڑے کی صفائی اور ستھرائی ذکرُ اللہ سے قائم ہے۔ذکر کے بند ہوتے ہی اس میں میل کچیل آنا شروع ہوجاتی ہے۔

انسان کی صفائی بھی فی الحقیقت یادِ خداوندی سے ہے۔جب اس میں ذکر اور یادِ حق باقی نہیں رہے۔تب انسان کے قلب میں میل کچیل گندگی اور نجاست آنی شروع ہوجاتی ہے۔جہاں یادِ الٰہی ختم ہوئی انسان میلا ہوجاتا ہے اور میلا انسان میلے کپڑے کی طرح ہے۔وہ دھکے دینے کے قابل ہوجاتا ہے اسے کوئی اہل اللہ میں سے پسند نہیں کرتا۔روح کے اندر جتنا ذکر زیادہ رہے گا، اتنی صفائی زیادہ رہے گی جتنا ذکر کم ہوجائے گا۔اتنی ہی کدورت

پیدا ہوگی۔ جتنی کدورت اور ظلمت پیدا ہوگی۔ گناہ معصیت اور نافرمانی کرنے کے جذبات پیدا ہوں گے۔ شرک وبدعت کے جذبات اُبھریں گے جب تک ذکر قائم ہے اور روح کے اندر تازگی ہے، بدن تازہ ہے۔ نفس کے اندر صفائی ہے تو نورانیت پیدا ہوتی ہے اس سے نیکی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان ہو یا دنیا کا کوئی بھی جز ہو وہ جبھی تک زندہ ہے جب تک اس میں یادِ خداوندی ہے۔ ذکر نہ ہو تو عالم کے لئے فنا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس دنیا کو اللہ اللہ کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔

زراعت وتجارت سے نہیں دنیا دیانت سے قائم ہے...... دنیا کے بہت سے طبقات کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے مثلاً ایک کاشتکار کا دعویٰ ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے اس واسطے کہ دنیا کھانے پینے سے قائم ہے۔ میں غلہ اُگاتا ہوں، گیہوں، چاول اور چنا سب میری بدولت اگتا ہے میں اگر اگانا چھوڑ دوں۔ کھانے کو کچھ نہ ملے تو دنیا فنا ہو جائے گی۔ دنیا کی زندگی میرے دم سے ہے۔

اگر کاشت کار اور زمیندار دنیا میں نہ ہوں تو دنیا فنا ہو جائے گی۔ تاجر نے آ کر کہا کہ دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے، اس لئے کہ تو تو کچی اجناس اُگاتا ہے۔ ان جنسوں کو اگر میں بنا سنوار کر دکانوں پر نہ سجاؤں۔ کپڑا، غلہ اور پھل، پھول سپلائی نہ کروں۔ دنیا بھوکی مر جائے گی۔ تو میری بدولت دنیا قائم ہے، نہ کہ تیری بدولت۔ تو نے غلے کا انبار لگا دیا۔ مگر ڈھیر سے کیا ہوتا ہے۔ بکے گا تو میری دکان پر آ کر۔ تو نے روئی اُگا دی۔ لیکن روئی کے گالے اگر پڑے رہیں تو کیا ہوتا ہے؟ کپڑا بنا کر میں نے اپنی دکان پر رکھا تو دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ تیرا دعویٰ غلط ہے۔ ان دونوں کے بالمقابل ایک سیاسی اور حکومت کا آدمی ان دونوں کو کہتا ہے کہ تم دونوں غلط کہتے ہو دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے۔ اس لئے کہ میں نے دنیا کا نظام قائم کر کے اس میں امن قائم کر رکھا ہے۔ اگر میں امن قائم نہ کروں، وہ آپا دھاپی پڑے کہ کاشت کار تاجر کو ختم کر دے اور تاجر کاشتکار کو، سرمایہ دار مزدور کو مار ڈالے اور مزدور سرمایہ دار کو۔ تاجر کاشتکار کے اور کاشت کار تاجر کی دکان پر ڈاکے مارے۔ دنیا ساری گڑ بڑ ہو جائے۔

میں نے اپنے عدل وانصاف سے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ میں کرسی سیاست پر بیٹھ کر دنیا کو تھام رہا ہوں تو کاشت کار، تاجر اور زمیندار نہیں سنبھال رہا میں سنبھال رہا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم سارے غلط کہتے ہو، دنیا کو سنبھالنے والا تو ہمارا نام لینے والا ہے۔ جو ہماری یاد میں مصروف ہے۔ اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ نہ کہ تاجر، کاشت کار، زمیندار اور سیاسی آدمی نے۔ ہم نے اور ہمارے نام لینے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔ غور کریں تو اللہ ہی کا دعویٰ سچا ہے۔ باقی سب کے دعوے غلط ہیں۔ اگر ایک دیندار کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے تو اس نے کب تک سنبھال رکھا ہے؟ اگر کاشت کار دیانت داری سے کام کرتا ہے نہ وہ دوسرے کی زمین پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ ایک انچ زمین دوسرے کی نہیں لینا چاہتا۔ جتنا غلہ اس کے ہاں اگتا ہے۔ اسی کو وہ بازار میں لے جا کر بیچتا ہے۔ دوسروں کے غلے چرا کر اپنے غلے میں ملا کر نہیں لے جاتا۔

تو جب تک وہ دین و دیانت سے کام کر رہا ہے۔اس وقت تک اس کی زمینداری چل رہی ہے اور اگر بد دیانتی اور ظلم وستم پر آ جائے۔لوگوں کی زمینوں پر چھاپے مارے۔لوگوں کے غلوں میں اپنا غلہ ڈال کران کے غلے کھینچ لائے۔اگلے دن اس پر مقدمہ قائم ہو جائے گا۔تو نہ اس کی کاشت کاری باقی رہے گی، نہ زمینداری نہ یہ دنیا کو سنبھال سکے گا۔تو معلوم ہوا کہ زمیندار نے اگر سنبھال رکھا ہے تو دیانت کی وجہ سے، دیانتداری ہی اللہ کا ذکر ہے۔تو بات یہ نکل آئی کہ ذکر کرنے والے نے دنیا کو سنبھالا، دیانت دار نے سنبھالا، بد دیانت نے نہیں سنبھالا۔

ایک تاجر اگر کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھالا۔وہ اس وقت صحیح ہے کہ وہ عدل وانصاف کے ساتھ تجارت کرتا ہو۔اصول تجارت کا پابند ہو۔اس کا جذبہ یہ ہو کہ نہ میرے گاہک کو نقصان پہنچے نہ مجھے۔وہ ایک منٹ کے لئے یہ نہیں چاہتا کہ یہ گاہک آ رہا ہے تو لاؤ اس کی کھال بھی اُتار لوں اور اس کو بالکل گھول کر کھا جاؤں۔یہ اس کا جذبہ نہیں ہے۔وہ کہتا ہے کہ میرے ہاں سے یہ مال لے جائے تو میری بھی اس کے دل میں یاد رہے میں اس کو اچھی چیز دوں اتنی قیمت میں دوں جتنی مناسب ہے۔نہ غبن فاحش کروں، نہ بلیک مارکیٹنگ کروں۔بلکہ دیانت داری سے اُصولی طور پر واجبی قیمت وصول کروں۔جس کے اندر کوئی دَغا وغیرہ نہ ہو۔حدیث میں فرمایا گیا ہے۔''غَفَرَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ کَانَ سَھْلًا اِذَا اشْتَرٰی سَھْلًا وَبَاعَ سَھْلًا'' ① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیانت دار تاجر کو دعا دی ہے اور فرمایا، اللہ اس شخص کی مغفرت وبخشش کرے جو سہولت کے ساتھ بیچتا اور خریدتا ہے۔انصاف کے ساتھ قیمت لگاتا ہے۔گاہکوں کے ساتھ سہولت کا برتاؤ کرتا ہے۔تنگی اور سختی نہیں کرتا۔یہ نہیں ہے کہ جب مال خریدے تو قیمت کم سے کم لگائے کہ میں اسے لوٹ لوں اور جب بیچنے پہ آئے تو ساٹھ گنی لگائے کہ مجھے زیادہ ملے۔ہر صورت میں اپنا نفع چاہتا ہے۔ایسا نہیں ہے بلکہ بیچتے وقت اچھا مال دیتا ہے اور قیمت کفایت سے لیتا ہے اور خریدتے وقت کوئی کمی نہیں کرتا تا کہ بائع کو نقصان نہ پہنچے اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی ہے یہ تاجر کون ہے؟ یہ وہی ہے جو دین کو پیش نظر رکھ کر تجارت کر رہا ہے۔

تو تجارت نے دنیا کو نہیں سنبھالا در حقیقت تاجر کی دیانت داری نے سنبھالا۔اگر بد دیانتی اور بے اصولی سے تجارت کرے ممکن ہے ابتدا میں کچھ بازار چل جائے اور کچھ فروغ ہو جائے۔لیکن پھر جو خسارہ پڑے گا تو راس المال کی بھی مصیبت آ جائے گی کہ وہ بھی باقی رہتا ہے یا نہیں۔تو اگر بد دیانتی شامل حال ہے تو وہ دکان بھی نہیں سنبھلے گی، دنیا کیا سنبھلے گی؟ اس سے واضح ہو گیا کہ تاجر نے دنیا کو نہیں سنبھالا، اسکی دیانت داری نے سنبھالا ہے۔دیانت داری میں پھر ذکر اللہ آ جاتا ہے۔تو اللہ کا نام لینے والے دنیا کو سنبھال رہے ہیں نہ کہ کوئی اور۔نظام حکومت سیاست سے نہیں دیانت سے چلتا ہے......کرسی عدالت پر بیٹھنے والا جج یا کرسی پر بیٹھنے والا

---

① السنن للترمذی، ابواب البیوع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی استقراض البعیر، ج:۵، ۱۴۹، رقم: ۱۲۴۱.

حاکم، بے شک اس نے امن کا نظام قائم کر رکھا ہے مگر کب؟ جب کہ عدل وانصاف قائم کرے اور اگر وہ ظلم وزیادتی کرتا ہے۔ پوری پبلک کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھتا اپنے اور پرائے کا فرق کرتا ہے وہ حکومت کو بھی تباہ کرے گا اور خود بھی تباہ ہوگا۔ لیکن اگر عدل سے کام لے رہا ہے جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْعَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ ① ''اے ایمان والو! ''قَوّام بِالْقِسْطِ'' بنو یعنی عدل وانصاف سے فیصلے کرو، دیانت داری سے فیصلے کرو۔ اگرچہ دیانت داری سے تمہارے نفس کے خلاف فیصلہ ہو۔ تو اپنے اوپر برداشت کرو۔ مگر فیصلہ حق کا کرو۔ اگرچہ تمہاری اولاد پر بن جائے، مت پرواہ کرو۔ عدل سے کام لو''۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک دعویٰ کیا اور قاضی شریح چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) ہیں کہ میری ایک ذرہ جو میں جنگ کے موقع پر سر پر رکھتا تھا وہ فلاں یہودی کے ہاں ہے۔ اس نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے اور وہ دینا نہیں چاہتا دعوی بالکل سچا تھا۔

قاضی شریح نے امیر المومنین کو عدالت میں طلب کیا حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین ہیں۔ قاضی شریح ان کے ماتحت ہیں لیکن عدل اور عدالت کا مقام اتنا بڑا ہے کہ امیر ہو یا خلیفہ اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ ایک مدعی اور مدعا علیہ کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ امیر المومنین ہیں۔ ان کے لئے تو کرسی بچھائی جائے اور غریب آدمی دعوی کر کے آئے تو وہ کٹہرے میں کھڑا ہو جب امیر المومنین مدعی بن کے آئے گا تو اسے وہیں کھڑا ہونا پڑے گا جہاں عام مدعی اور مدعیٰ علیہ کھڑے ہوں گے۔

تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سمن پہنچا کہ آپ عدالت میں حاضر ہوں آپ مدعی ہیں اور یہودی سے کہا کہ تو مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے حاضر ہو۔ دونوں کو حاضر ہونا پڑا اور دونوں کو ایک درجے میں کھڑا کیا، یہودی بھی کھڑا اور امیر المؤمنین بھی کھڑے ہیں۔ امیر المومنین کے مقابلے میں یہودی کی کیا حیثیت تھی۔ مگر قاضی اور عادل حاکم کی نگاہ میں دونوں ایک درجے کے تھے اس لئے دونوں برابر کھڑے کئے گئے۔ قاضی شریح نے فرمایا کیا دعویٰ ہے؟

امیر المومنین نے فرمایا: دعویٰ یہ ہے کہ اس نے میری ذرہ پر زبردستی قبضہ جما رکھا ہے دیتا نہیں حالانکہ ذرہ میری ہے۔ یہودی نے کہا کہ ان کی ذرہ نہیں ہے۔ یہ تو میری ہے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے تھے۔ یہودی کی واقعی ذرہ نہیں تھی۔ مگر قاضی شریح نے کہا کہ کوئی گواہ ہے؟

فرمایا جی ہاں تو ایک غلام کو پیش کیا اور ایک اپنے بیٹے حضرت حسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو پیش کیا۔ قاضی نے فرمایا بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے اور دو گواہ کے بغیر دعوی ثابت نہیں ہوسکتا۔ کوئی اور گواہ لاؤ۔ انہوں نے کہا اور تو میرے پاس کوئی گواہ نہیں، یہی دو گواہ تھے یا میرا بیٹا یا یہ میرا غلام۔ فرمایا، اگر گواہ ایک ہو تو آپ

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۳۵.

کے حق میں ڈگری نہیں دی جاسکتی، یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ ذرہ اسی کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں مل سکتی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دعویٰ سچا تھا۔ مگر ضابطہ کا ثبوت مہیا نہیں ہوا، اس واسطے فیصلہ ان کے خلاف ہوا اس عدل کا اثر کیا ہوا؟ یہودی نے اسی وقت وہیں کھڑے ہو کر کہا: ''اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ.'' سچے دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہوا اور کہا جس دین کے اندر اتنا عدل و انصاف ہے کہ ایک امیر المؤمنین اور ایک غریب سے غریب غیر مسلم ایک نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں وہ دین سچا ہے اور میں اس دین کی حقانیت کا قائل ہوتا ہوں اور علی الاعلان کہا کہ میرا دعویٰ غلط تھا، سچے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور ذرہ ان کو دے دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اب مجھے ذرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرہ کا تو ہی مالک ہے ذرہ بھی تو رکھ تیرا دین جب اسلام بن گیا تو میرے لئے سب کچھ ہو گیا۔ تو ایک سچائی نے کتنوں کو فائدہ پہنچایا امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی حقانیت کھلی یہودی کو دین نصیب ہو گیا ذرہ اس کو مل گئی اسلام کی عظمت واضح ہو گئی ایک سچائی سے کتنی برکات اور فائدے ظاہر ہوئے افراد کے حق میں الگ، دین کے حق میں الگ، اسلام کی عدالت کے حق میں الگ۔

تو اسلام یہ چاہتا ہے کہ کرسی عدالت پر بیٹھ کر دیانت داری سے فیصلہ کرو چاہے تمہارے خلاف فیصلہ ہو، چاہے تمہاری اولاد کے خلاف ہو، چاہے تمہارے رشتہ داروں کے خلاف ہو مگر عدل و انصاف ہونا چاہئے (اگر ایک حاکم اس عدل سے فیصلے کرتا ہے۔ تو درحقیقت اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے مگر حاکم نے) نہیں اس کی دیانتداری اور عدل نے سنبھال رکھا ہے۔ تو وہی بات آ گئی کہ ذکر اللہ کرنے والے نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے. عالم کو تھامنے والی چیز اللہ کا ذکر ہے۔ اگر تاجر اور کاشت کار دیانت چھوڑ دے اگر حاکم عدالت دیانت چھوڑ دے اگر بادشاہ وقت دیانت چھوڑ دے، یہ سب دنیا کی تباہی کا ذریعہ بنیں گے۔ اور اگر دین و دیانت سے کام لیں گے تو دنیا کو سنبھالنے والے بنیں گے تو دنیا کو دیانت ذکر اللہ اور یاد خداوندی سنبھالتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کی خلافت کا دور ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعب اور دبدبہ وہ ہے کہ ان کا نام سن کے دنیا کے بادشاہوں کے پتے پانی ہوتے ہیں۔ ان کے زمانے میں جبلہ ابن ایہم جو روم کا بادشاہ یا گورنر تھا، وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا، اسلام قبول کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوا اور حج کے لئے مکہ مکرمہ گیا، جب وہ طواف کر رہا تھا تو قبیلہ فزار کا ایک بدوی دیہاتی بھی طواف میں مشغول تھا۔ جو لوگ حج کرنے گئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مطاف کے اندر کتنا ہجوم ہوتا ہے۔ لاکھوں آدمی ایک وقت کے اندر طواف کرتے ہیں تو دھکے مکے بھی لگتے ہیں، ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آتا سب جانتے ہیں کہ سب اللہ کی یاد میں مشغول ہیں۔ تو کوئی کسی سے ٹکرا جائے یا گر جائے تو نہ برا مانتے ہیں نہ مقابلہ کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ تھا۔ وہ فزاری طواف کر رہا تھا۔ اس وقت جبلہ ابن ایہم بھی طواف میں

مشغول تھا۔ تو جبلہ ابن ایہم کی لنگی پر اس دیہاتی کا پیر پڑ گیا اور لنگی کھل گئی وہ اپنے ہاں کا بادشاہ تھا۔ یہاں وہ مسلمان ہو کر غریب الوطن تھا۔ جذبات اس کے وہی شاہانہ تھے۔ اس نے دیکھا کہ میری لنگی پر ایک دیہاتی کا پیر پڑ گیا، اور وہ کھل گئی ہے تو اس نے زور سے ایک طمانچہ مارا وہ دیہاتی بے چارہ چوٹ کھا کے گرا۔ اس کے بعد اس نے لنگی درست کی اور پھر طواف میں مشغول ہو گیا۔ دیہاتی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں جا کے دعویٰ کیا کہ اس نے ناحق میرے طمانچہ مارا ہے۔ اس کی لنگی پر میں نے جان بوجھ کر پیر نہیں ڈالا تھا اور کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی کہ لنگی پر آدمی جان بوجھ کر پیر ڈالے۔ مجمع کے اندر کوئی کسی کی لنگی کھول کر تھوڑا ہی لے جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ عقل کے بھی خلاف ہے کہ میں اس کے اوپر پیر بدنیتی سے بھی نہیں ڈال سکتا تھا ہزاروں آدمی وہاں موجود تھے۔ دھکے مکے میں میرا پیر لگ گیا، تو مجھ سے یہ غلطی ہوئی، مگر ارادی غلطی نہیں ہوئی، یہ مجھے تنبیہ کر دیتا، دھول جمانے کا کون سا موقع تھا۔ اس کا حق کیا تھا؟ یہ دعویٰ دائر کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت سے جبلہ ابن ایہم کے نام سمن جاری ہوا کہ عدالت میں حاضر ہو، وہ حاضر ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تو نے کیوں چپت مارا؟ اس نے کہا اس نے میری لنگی پر پیر ڈالا، فرمایا لنگی پر پیر ضرور پڑا۔ لیکن وہ موقع ایسا ہے کہ وہاں ارادے سے پاؤں کوئی نہیں ڈال سکتا۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اس واسطے تم سے قصاص لیا جائے گا یا تو یہ دیہاتی تمہیں بھی اتنی زور سے دھول مارے گا یا پھر تم مالی طور پر فدیہ ادا کرو، اس نے جو چوٹ کھائی ہے اس کے بدلے میں کچھ مال دے دو، جبلہ نے کہا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر ہو گیا!!!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اسلام میں سب برابر ہیں۔ یہاں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے خدا کے گھر میں ایک دیہاتی اور ایک امیر برابر ہیں۔ ایک صف میں بادشاہ اور اس کے برابر میں غلام بھی کھڑا ہوگا وہاں کوئی فرق روا نہیں رکھا جا سکتا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز

یہاں سب بندے ہیں۔ بندہ نواز کوئی نہیں بندہ نواز تو اللہ ہیں، جو اپنے بندوں کو نوازتے ہیں۔ اس عدالت میں آ کر تو امیر المومنین اور دیہاتی سب برابر ہیں۔ بادشاہ اور فقیر ایک جیسے ہیں۔ اسے سخت ناگوار گزرا کہ اس دین کے اندر ایک لاٹھی سے سب کو ہانکا جاتا ہے۔ وہ راتوں رات بھاگ گیا اور اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور بدستور پھر عیسائی بن گیا۔ عیسائیوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں کہ بادشاہ بھی ہمارا آ گیا اور اس کا قدیم دین بھی واپس آ گیا بہر حال اسلام نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ ایک صحابی قسطنطنیہ بلا ارادہ ہجرت، تجارت کے سلسلے میں تشریف لے گئے تھے۔ جبلہ ابن ایہم کو خبر ہوئی کہ ایک صحابی آئے ہیں۔ آخر مسلمان تو ہوا تھا۔ کچھ نہ کچھ اسلام کا دھیان اس کو تھا ہی ان صحابی کو اس نے دعوت دی اور بلایا اور یہ بھی پہنچے اس نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے میں اسلام لے آیا تھا۔ لیکن وہ فزاری کے

ساتھ میرا مقدمہ ہوا تو میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر نہیں ہو سکتا۔لیکن آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ آج تک نہ میرے دل کو سکھ ملا نہ چین، سچی بات وہی تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی۔ دین حق بھی وہی ہے اور سچا بھی وہی ہے اور میں اس پر نادم ہوں کہ میں مرتد ہوا گو مجھے ظاہری بادشاہت پھر مل گئی، لیکن میرے دل میں سکھ اور چین نہیں ہے۔ میرا اب جی چاہتا ہے کہ میں پھر اسلام میں داخل ہو جاؤں، مگر چونکہ بادشاہ ہوں اس واسطے میں اپنے وقار کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہوں کوئی ایسا حیلہ ہو جائے جو میں کہہ سکوں کہ بھئی اگر میں نے اسلام قبول کیا تو کوئی بری بات نہیں کہ فلاں نعمت بھی مجھے ملی اور وہ یہ ہے کہ اگر امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی سے میری شادی کر دیں اور اس کا وعدہ دے دیں، تو میں اس کو حیلہ بنا کر اسلام میں داخل ہو جاؤں بعد میں چاہے وہ شادی کریں یا نہ کریں، یا میں ہی انکار کر دوں، مگر میرے لئے ایک حیلہ اور عذر بن جائے گا، میں اپنی قوم سے کہوں گا کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا بادشاہ جس سے دنیا کے بادشاہ ڈرتے ہیں۔ جب وہ اپنی بیٹی دے رہا ہے تو میری اس سلطنت سے ان کی بیٹی زیادہ عزت والی ہے۔ میں پھر اسلام قبول کر لیتا ہوں۔ ①

ان صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا، میں امیر المومنین کے پاس جا کے ذکر کر دوں گا اور اس کے بعد میں پھر آپ کے پاس آؤں گا۔ چنانچہ یہ واپس ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ سارا واقعہ ذکر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تم نے کیوں نہ وہیں وعدہ دے دیا؟ عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اسلام کے مقابلہ میں کیا چیز ہے؟ اگر ایک شخص اسلام میں آئے اور عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اس کے نکاح میں چلی جائے میری بیٹی کی اسلام کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمہیں وعدہ کر لینا چاہئے تھا کہ ٹھیک ہے میرا وعدہ ہے'' ②

انہوں نے کہا، امیر المومنین! میں تو ڈر رہا تھا کہ میں کیسے وعدہ کروں؟ فرمایا نہیں فوراً جاؤ قسطنطنیہ کا سفر کرو اور کہو کہ ''عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حاضر ہے تو اسلام قبول کر۔

چنانچہ وہ واپس ہوئے۔ جب قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تو جبلہ ابن ایہم کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس کی قسمت میں اسلام نہیں تھا۔ خاتمہ ایمان پر نہیں ہونا تھا۔ صحابی رضی اللہ عنہم بے چارے واپس چلے آئے۔ تو میں نے یہ عرض کیا کہ حاکم عدالت جب بادشاہ اور غلام کو، فقیر اور حقیر کو، خادم اور اس کے آقا کو، کرسیٔ عدالت پر بیٹھ کر ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ اصول اپنائے ہوئے ہے۔ تو یہی اصل دین و دیانت ہے۔ تو ایک حاکم عدالت یا امیر کرسی عدالت پر بیٹھ کر دنیا کو سنبھال رہا ہے اور امن قائم کر رہا ہے۔ وہ امن جبھی تک قائم ہے جب تک دین و دیانت کے اصول کو برتے اور دین و دیانت کو برتنا فی الحقیقت یہی ذکر اللہ ہے۔ معلوم ہوا دنیا ذکر اللہ سے قائم ہے، سیاست سے قائم نہیں۔ زراعت سے قائم نہیں۔ دعوی اللہ ہی کا سچا رہا کہ دنیا کو تھامنے والے وہ ہیں جو اللہ اللہ کرتے ہیں اور کوئی نہیں۔ جنہوں نے دعوی کیا خواہ وہ تاجر، کاشت کار، حکام یا سیاسی لوگ ہوں ان کا دعوی غلط ہے۔ دنیا کو

① تاریخ بغداد للخطیب البغدادی، ج: ۲، ص: ۱۶۴۔ ② مختصر تاریخ دمشق ''ابن عساکر'' ج: ۲، ص: ۲۵۳۔

تھا منے والے اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔

سلاطین دنیا بدنوں پر اور اہل اللہ قلوب پر حکومت کرتے ہیں...... ظاہر میں بے چارے اللہ اللہ کرنے والے کوئی حقیقت نہیں رکھتے کوئی لاؤ لشکر اور فوج ان کے ساتھ نہیں، مگر ان کا سب سے بڑا لشکر اللہ کے ہاں مقبولیت ہے۔ قبولیت عنداللہ، یہ ان کی سب سے بڑی طاقت ہے، جس کو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر کہا ہے کہ۔

مبین حقیر گدایاں عشق راکیں قوم　　　شہان بے کمر و خسروانِ بے کلاہ اند

یہ جو اللہ اللہ کرنے والے ہیں یہ اللہ کے عشاق ہیں۔ یہ عاشقان خداوندی ہیں۔ انہیں حقارت سے مت دیکھو اگر چہ ان کے کپڑے معمولی اور پھٹے پرانے ہوں انکے پاس کوئی کوٹھی بنگلہ نہیں ہے۔ جھونپڑوں میں رہتے ہیں، انہیں حقیر مت سمجھو یہ بادشاہ ہیں، اگر چہ سر پر تاج نہیں ہے اور لاکھوں روپے کا پٹکا ان کی کمر پر بندھا ہوا نہیں ہے۔ بے تاج بادشاہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تاج والا بادشاہ بدنوں پر حکومت کرتا ہے۔ اور یہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک آدمی بادشاہ کی حکومت کے نیچے جبری طور پر ہوتا ہے۔ دل میں عظمت نہیں ہوتی دل میں لعنت بھیجتا ہے ویسے مجبور ہے۔ لیکن اللہ والوں کی حکومت دل پر ہوا کرتی ہے۔ تنہائی میں بھی ہوگا تو بے ادبی سے ان کا نام نہیں لے سکتا، تو حقیقی عظمت وہ ہے کہ خلوت میں جائے جب بھی دل میں بھری ہوئی ہو اور مجمع میں آئے جب بھی، بادشاہان دنیا کی عظمت بھرے مجمعوں میں تو ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک کو خطرہ ہے کہ اگر میں نے کوئی گستاخی کی، تو پولیس آ کے گردن ناپ لے گی، جیل جانا پڑے گا اس ڈر کے مارے آدمی بادشاہ کی عزت کرتا ہے. تنہائی میں آ کر اس پر لعنت کرتا ہے۔ لیکن اللہ والوں کی، سامنے بھی اور تنہا بیٹھ کے بھی گستاخی نہیں کرتا سمجھتا ہے کہ میری آخرت بگڑ جائے گی۔ اہل اللہ کی بادشاہت دنیا میں ان کی عدم موجودگی میں بھی قائم ہوتی ہے

ان کی عظمت کے لئے ان کی موجودگی ضروری نہیں ہے وہ نگاہوں کے سامنے چھوڑ، دنیا میں بھی نہ ہوں پھر بھی تعظیم کی جاتی ہے۔ آج حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام آتا ہے، قلب جھک جاتا ہے آپ کہتے ہیں، رضی اللہ عنہ اللہ، ان سے راضی ہو آج امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آتا ہے۔ تو آپ عقیدت سے گردن جھکا دیتے ہیں اور کہتے ہیں، رحمتہ اللہ علیہم اجمعین اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے تو اتنی گرویدگی ہے کہ اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لے کر کوئی گستاخی کرے، تو آپ جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور اس کو برداشت نہیں کریں گے حالانکہ آج دنیا میں دونوں نہیں ہیں۔ مگر عقیدت مندوں کا یہ حال ہے کہ ان کی بادشاہت و عظمت تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ یہ عظمت کاہے کی ہے؟ ان میں سے کسی کے پاس دولت، تاج اور قباء شاہی نہیں تھی مقبولیت عنداللہ تھی خدا کے مقبول بندے تھے۔ اس کی برکات ان کے قلوب کے اندر موجود تھیں۔ اس عظمت کی

وجہ سے آج تک آپ کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ تو ان کی حکومت دلوں پر ہے اور ایسی کہ وہ دنیا میں بھی نہیں، جب بھی حکومت قائم ہے۔

مسٹر آرنلڈ، یہ سرسید کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' (Preaching of Islam) لکھی ہے۔ اسلامی تہذیب کے متعلق اس نے دور دکھلائے ہیں کہ اسلام دنیا میں کس کس طرح سے پھیلا عرب، ہندوستان اور چین میں کیسے پھیلا اسلامی طور وطریقے اور آداب، مبلغین اسلام کی محنتیں اور جانفشانیاں اور ان کی جدوجہد، ان سب پر اس نے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں اس نے ایک لطیفہ لکھا وہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں میں نے ایک عجیب چیز دیکھی جو دنیا میں اور جگہ دکھلائی نہیں دی۔ (وہ اسے نہیں دکھلائی دی ہوگی لیکن اور جگہ بھی ہے۔ مگر اسے کم از کم ہندوستان ہی میں نظر آئی)۔ وہ یہ ہے کہ جب میں اجمیر گیا، تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے پورے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے اور اس کا نام سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ یعنی حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کو ہم امیر الہند، امام الہند اور سلطان الہند کہتے ہیں اس لیے کہ خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں آ کر اسلام کو پھیلایا اجمیر شریف میں چھپر کی ایک کٹی ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہندو، مسلم اور غیر مسلم انکے دربار میں حاضر ہوتے عقیدت سے بیٹھتے، ان کی زبان فیض ترجمان سے کلمات حقہ سنتے ان کی دیانت، ان کے معاملات کی صفائی اور خدا پرستی دیکھ کر قلوب پر اثر ہوتا ہزاروں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوتے خود اسی آرنلڈ نے لکھا ہے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بلاواسطہ ننانوے لاکھ آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے۔ ان کی تعداد الگ سے یعنی ایک کروڑ ہے۔ یعنی ایک کروڑ کے قریب افراد اسلام میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پھر آگے جتنوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا ان کی تعداد الگ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اجمیر میں یہ انوکھا واقعہ دیکھا ہے کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا پورے ہندوستان کا سلطان بنا ہوا ہے اور سب کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ لوگ قبر پر آتے ہیں تو ان کی حکومت قائم ہے۔

اور بعضے تو جاہل شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں عظمت سہی ان کے دلوں میں مگر جب خلاف شرع عظمت ہوگی، اللہ کے ہاں مقبول نہیں، بعضے سجدے اور طواف کرتے ہیں۔ مقصد تعظیم تھا۔ مگر انہوں نے اس کو غلط طریق پر جاری کیا۔ ایک وہ ہیں کہ فاتحہ پڑھتے ہیں، استفاضہ کرتے ہیں اور پابند شرع بھی ہیں اصول شریعت کے متبع بھی ہیں۔ تو اتباع شریعت اور عدم اتباع شریعت تو الگ رہا مگر عظمت لے کے سب جاتے ہیں۔ حالانکہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی عظمت ایسی قائم ہے کہ اگر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں تشریف رکھتے اور ہم جا کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اتنی ہی عظمت وہاں بھی کرتے، جتنی اب قبر پر جا کر کرتے ہیں۔ تو اس کی حقیقت کیا چیز ہے؟ یہی کہ ان کی حکومت دلوں کے اوپر قائم ہے تو اللہ والے دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے بادشاہ بدنوں، پہاڑوں، پتھروں اور زمین کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ دلوں پر ان کی

عظمت وحکومت قائم نہیں ہوتی دل سے لوگ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے اور ہم آزاد ہو جائیں اور اللہ والوں کی نسبت دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی حکومت اور زیادہ مضبوط ہو جائے ان کی محبت میں اگر ہم فنا ہو جائیں تو ہم کامیاب ہو گئے، ہماری دنیا بھی بن گئی، آخرت بھی بن گئی تو جامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا کہ

مبین حقیر گدایاں عشق راکیں قوم   شہان بے کمر و خسروانِ بے کلاہ اند

اللہ والوں کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو یہ بے تاج بادشاہ ہیں، موجود ہوں تب بھی اور موجود نہ ہوں تب بھی ساری دنیا ان کی رعیت میں داخل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا نام آتا ہے تو عقیدت سے کہتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم ان پر درود وسلام پڑھتے ہیں۔ ان کے صحابہ کا نام آجائے تو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ ان کے ائمہ کا نام آجائے رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں۔ کسی ولی مومن کا نام آجائے مرحوم ومغفور کہتے ہیں۔ غرض دعاؤں سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی محبت میں فنا ہوتے ہیں۔ تو بات یہ نکلی کہ ان لوگوں کی عظمت ہمارے دلوں پر قائم کیوں ہے؟ ان کے دلوں میں ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔ یادِ حق نے ان کو اللہ سے ملا کر ایسا کر دیا جیسے حدیث میں فرمایا گیا: اللہ والوں کی یہ شان ہے کہ ''اِذَارُاَوْا ذُكِـرَ الـلّٰـهُ'' جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان لوگوں کا بھی ساتھ میں ذکر آتا ہے جب ان لوگوں کا ذکر آتا ہے تو ساتھ ہی اللہ کا بھی ذکر آتا ہے گویا

خاصان خدا خدا نہ باشند   لیکن از خدا جدا نہ باشند

خاصان خدا خدا نہیں ہوتے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے جب اللہ کا ذکر آئے گا تو اہل اللہ کا بھی ذکر ساتھ آئے گا اور جب اہل اللہ کا ذکر آئے تو خدا اور رسول کا بھی ذکر آئے گا ان کی عظمت دراصل اللہ سے ہے اسی ذکر سے آدم کی عظمت بھی قائم ہے۔ تو اصل یہ ہے کہ ذکر اللہ ہی درحقیقت سب سے بڑی سلطنت ہے۔ جب یہ سلطنت آجاتی ہے تو ان کی حکومت قلوب پر قائم ہو جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام یا اولیاء اللہ کی محبت ذکر اللہ کی وجہ سے ہے۔

اہل اللہ دنیا کو کیوں لات مار دیتے ہیں؟...... آخر کوئی دولت تو ہوتی ہے کہ وہ ساری دنیا کی دولت کو لات مار دیتے ہیں۔ نہ ان کے سامنے دنیا کی وقعت، نہ اس کی شوکت کی وقعت، نہ تاج وتخت اور محلات کی وقعت کسی چیز کی بھی وقعت نہیں یہ جو ساری دنیا کو ٹھکرا دیتے ہیں، کوئی بڑی چیز ان کے پاس ہوتی ہے۔ جبھی تو ٹھکراتے ہیں معاذ اللہ: کوئی مجنون تھوڑا ہی ہیں کہ ساری دنیا کو لات مار دی بلکہ دنیا سے بڑھ کر سلطنت دی جاتی ہے۔ جب وہ آجاتی ہے تو پوری کی پوری دنیا ان کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہے دنیا کو ضرورت سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مگر اس کی عظمت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ بڑی چیز ان کے قلب میں موجود ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ ان کی خانقاہ میں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ذکر اللہ کرنے والے دس دس ہزار مہمان ایک ہی وقت میں خانقاہ میں ہوتے تھے اور لنگر کا کھانا تقسیم ہوتا تھا، حضرت شیخ سے بادشاہ

سنجر بھی بیعت تھا۔ سنجر خراسان کے اندر جو کہ ایک بہت بڑا ملک تھا۔ اس ملک کا ایک صوبہ تھا۔ جس کو نیمروز کہتے تھے۔ بادشاہ سنجر کی حکومت نیمروز میں بھی تھی۔ چونکہ حضرت شیخ کے ہاں مہمانداری ہزاروں کی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ شیخ کے گھر نہ جائیداد نہ دولت کس طرح مہمانوں کی مدارات کرتے ہوں گے اس نے نیمروز کا پورا صوبہ حضرت شیخ کے نام ہبہ کیا اور لکھ کر بھیجا کہ یہ پورا صوبہ میں آپ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کرتا ہوں اس کی آمدنی لاکھوں روپے سال کی ہے مہمانداری میں سہولت ہوگی آپ کے ہاں دشواری ہوتی ہوگی اس واسطے یہ پورا صوبہ اور جائداد قبول فرما لیجئے۔

سبحان اللہ! حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب لکھا، تو وہ جو اس نے پرچہ لکھ کر بھیجا تھا اسی کاغذ پر حضرت نے بادشاہ سنجر کے نام جواب لکھ کر بھیجا اور دو شعر کا قطعہ لکھ دیا فرمایا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد ۔۔۔ دردل بود اگر ہوس ملک سنجرم

حاصل اس کا یہ تھا کہ بادشاہ سنجر کا جو چتر ہے۔ ایک تو بادشاہ کے سر پر تاج ہوتا تھا اور اس کے پیچھے ایک سیاہ قسم کا چتر لگاتے تھے تاکہ اس کی سیاہی میں بادشاہ کا سفید و سرخ چہرہ نظر آئے وہ گویا عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ سر پر تاج ہو اس کے پیچھے ایک چتر ہو اس میں سونے کا کام ہو وہ چتر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا۔ تو حضرت شیخ نے لکھا کہ بادشاہ سنجر کا جو سیاہ چتر ہے میرے نصیب پر بھی اسی طرح سیاہی آ جائے جیسے بادشاہ سنجر کے چتر کی سیاہی ہے اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ذرا بھی ہوس پیدا ہو تو میں بدنصیب اور سیاہ بخت بن جاؤں میرے دل میں کوئی ہوس نہیں۔ ہوس کیوں نہ آئے؟ اگلے شعر میں اس کا جواب دیا اور وجہ بیان کی ہے فرمایا:

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیم روز رابیک جو نمی خرم

جس دن سے مجھے نیم شب کا ملک ہاتھ لگا ہے۔ اس دن سے نیمروز کے صوبے کی میرے دل میں کوئی وقعت باقی نہیں ہے۔ نیم شب کا ملک کیا ہے؟ یعنی وہ جو میں رات کو اٹھ کر دو چھوٹی چھوٹی رکعات پڑھتا ہوں وہ سلطنت جو مجھے ملی ہے اس کے مقابلے میں نیمروز کا ملک میرے نزدیک جو کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا تو مجھے نیم شب کا ملک حاصل ہے۔ نیمروز کے ملک کی کیا ضرورت ہے؟ آدھی رات کی سلطنت مجھے حاصل ہے تو آدھے دن کی سلطنت مجھے درکار نہیں ہے:

خلیل آسا در ملک یقین زن ۔۔۔ نوائے لا احب الآفلین زن

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے چاند اور سورج کو دیکھ کر فرمایا تھا، جب وہ غروب ہو گئے ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ﴾ ① یہ ابھی طلوع ہو کر غروب ہونے والے ہیں، ابھر کر گرنے والے ہیں مجھے ان سے کوئی محبت نہیں، مجھے اس ذات سے محبت ہے جو ہر وقت عروج، رفعت اور بلندی کے اوپر ہے۔ گم ہونے والی چیزوں سے مجھے محبت

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۶.

نہیں ہے اس لئے اہل اللہ کے ہاں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

تو میں اس پر عرض کرر ہا ہوں یہ جو ساری دنیا پر لات مار دیتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے پورے صوبے پر لات ماردی اور ٹھکرادیا۔ فرمایا اگر میں دل میں ذرا بھی ہوس لاؤں تو بدنصیب بن جاؤں مجھے تیرے ملک سنجر کی ضرورت نہیں اس کی وجہ یہی تھی کہ دوسرا ملک ان کے ہاتھ میں ہے۔ جو اس سے بڑا ہے تو جب وہ ہاتھ آ جائے تو چھوٹے ملک کی کیا ضرورت رہی؟

اہل اللہ کی سلطنت کی وسعت...... حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ایک دن ان کی زبان سے ایک بڑا بھاری کلمہ نکلا جب وجد طاری ہوا اور معرفت الٰہی کا ایک نشہ ان پر طاری ہوا اور سکر میں گئے تو زبان سے نکلا "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" میری سلطنت اللہ کی سلطنت سے بڑی ہے۔ مریدین بے چارے پریشان اور دم بخود۔ جب شیخ کو ہوش آیا اور افاقہ ہوا انہوں نے عرض کیا، حضرت! آج آپ کی زبان سے کفر کا کلمہ نکل گیا فرمایا کفر کا کلمہ؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا تم نے پھر سزا کیوں نہیں دی تم نے کفر کا کلمہ کیسے برداشت کیا اسی وقت سزا دینی چاہئے تھی پھر کبھی کفر کا کلمہ نکلے، فوراً سزا دو ایسا آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اسے چھوڑا جائے۔ فورا اسے تنبیہ کی جائے اور اس کی خبر لی جائے مریدین بے چارے چپ ہو گئے شیخ پر دو چار دن بعد پھر وجد طاری ہوا پھر وہی کلمہ نکلا کہ "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" مریدین تیار کھڑے ہی تھے شیخ کا حکم تھا۔ کوڑے لے کر شیخ کے اوپر برسانے شروع کر دیئے مگر شیخ جس مقام پر تھے۔ وہ کوڑا ان پر تو نہ لگا جتنا مارا، وہ ان کی کمروں پر لگنا شروع ہوئے اب مارنے پر تو یوں مجبور کہ شیخ کا حکم ہے اور جتنا مار رہے ہیں خود پٹ رہے ہیں۔ سارے مریدین لہولہان ہو گئے اور شیخ کا کچھ نہ بگڑا۔ مارتے مارتے جب خود بھی تھک گئے اور ساروں کی کمروں سے خون جاری ہو گیا اتنے میں شیخ کو ہوش آیا تو دیکھا کہ سب آدھ مرے پڑے ہوئے ہیں تو پوچھا بھئی! تم پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ حضور! آپ کا حکم تھا کہ (ایسا کلمہ نکلنے پر مجھے مارنا) ہم مارنے کھڑے ہوئے تو پٹے تو ہم، حضور پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ① فرمایا: آخر وہ کیا کلمہ ہے۔ جس کو تم کفر کا کلمہ کہتے ہو؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا کہ "مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْکِ اللّٰہِ" فرمایا: نامعقولو! یہ کفر کا کلمہ کب ہے۔ یہ عین ایمان کا کلمہ ہے۔ اب تم نہ سمجھو تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ تم نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی لفظوں کو دیکھ لیا یہ تو عین کمال اور عین توحید کا کلمہ ہے۔ حضرت! آخر یہ کیسے ایمان کا کلمہ ہے کہ میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ③ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

فرمایا: اس کا مطلب سمجھ لو یہ بتلاؤ کہ اللہ کا ملک کیا ہے اور وہ کہاں ہے؟ اللہ کا ملک زمین، آسمان، پہاڑ،

---

① تفسیر حقی، تحت تفسیر سورۃ الملک، ج:۵، ص: ۴۳۶. ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

③ پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۷۲.

ستارے ہیں، میں ہوں تم ہو، یہ سب اللہ کا ملک ہیں اور میرا ملک کیا ہے؟ اللہ کی ذات وصفات، اسی میں میں سیر کرتا ہوں، اسی میں عروج کرتا ہوں رات دن اللہ کی ذات وصفات میں گھرا ہوا ہوں تو میرا ملک تو اللہ کی ذات ہے اور اللہ کا ملک میری ذات ہے۔ بتلاؤ پھر میرا ملک بڑا ہے یا اللہ کا ملک؟ ① واقعی یہ بزرگ تو ایسے ہیں کہ ماریں اور مار کے رونے بھی نہ دیں یعنی خود جو کلمہ کہہ دیں وہ تو عین حق ہو جائے اور ہم حق بھی کہیں تو وہ بھی کفر بن جاتا ہے اب اس کا علاج کیا ہے؟ تو بظاہر یہ کلمہ کفر تھا۔ مگر شیخ نے بتایا کہ یہ عین ایمان کا کلمہ ہے کہ ہمارا ملک اللہ کی ذات وصفات ہے۔ تو ہمارے ملک کے مقابلے میں سارے عالموں کی کیا حقیقت ہے؟ تو ملک میرا بڑا رہا۔

میرا عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جن کو یہ ملک ہاتھ آ جائے وہ اس ملک کا لالچ کیوں کریں گے؟ جنہیں یہ دولت وسلطنت ہاتھ آ جائے کہ اللہ کی ذات وصفات میں سیر کریں اور رات دن عروج کریں ذات وصفات کے عجائبات ان پر کھلیں، علوم وکمالات اور معارف نئے سے نئے کھلیں، وہ تو اس پورے جہاں کی طرف رخ نہیں کریں گے یہ دنیا تو دنیا ہے۔ وہ چاند اور سورج کو بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کی بھی کوئی عظمت نہیں ہے۔

اللہ کے نام کے بغیر بڑی سے بڑی مخلوق کوئی حقیقت نہیں رکھتی ...... اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دین کی دعوت دینی شروع کی پورے عرب کے اندر آپ کی دشمنی پھیل گئی خود آپ کے عزیز واقرباء دشمن بن کے کھڑے ہوئے اور کہتے تھے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ کا دین پھیلانے والے تھے۔ کسی کی دوستی، دشمنی کی آپ کو کیا پرواہ تھی آپ دین پھیلاتے رہے اور ابو طالب تھے تو اپنے آبائی دین پر، مگر حمایت ومدد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے تھے۔ قوم کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، وہ جمع ہو کر ابو طالب کے پاس آئے اور کہا اے ابو طالب! تمہارے بھتیجے نے ہمارے ناک میں دم کر دیا ہے۔ وہ ہمارے بتوں کو برا کہتے ہیں ہمارے آبائی دین کو یہ ترک کرانا چاہتے ہیں اور نیا دین پیش کر رہے ہیں۔ ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا مگر ہم اس سے مجبور ہیں کہ تم ان کے حمایتی ہو تم ہمارے بڑے اور سردار ہو اس لئے ہم تمہیں واسطہ بناتے ہیں کہ تم اپنے بھتیجے سے ایک دفعہ ہماری طرف سے کھل کر بات کر لو کہ وہ چاہتے کیا ہیں؟ جو وہ چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں۔ مگر خدا کے لئے اس کلمہ سے باز آ جائیں آپ ایک دفعہ ان پر حجت تمام کر دیں تا کہ ہم لوگ بھی آزاد ہو جائیں پھر جو ہمارا جی چاہے گا ہم کریں گے جو ان کا جی چاہے گا وہ کریں گے اب تم آڑے آ جاتے ہو تمہاری وجہ سے ہم مجبور ہیں۔

ابو طالب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ اے میرے بھتیجے! تیری قوم کے سردار سب کے سب جمع ہو کر میرے پاس آئے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ تمہاری قوم یہ کہتی ہے کہ اگر تمہارا مقصد دولت ہے، تو ہم پورے حجاز کی دولت سمیٹ کر ان کے قدموں میں لا کے ڈالے دیتے ہیں۔ آج سے وہ اس

① تفسیر حقی، تحت تفسیر سورۃ الحشر، ج: ۱۵، ص: ۲۴۳.

دولت کے مالک اور ہم ان کے تابع اور اگر ان کا مقصد حسن و جمال ہے تو حجاز کی جتنی بیٹیاں ہیں، تو وہ سامنے کئے دیتے ہیں جتنی چاہیں وہ پسند کر لیں ہم ان کی خدمت میں پیش کر دیں گے اور اگر وہ اقتدار و حکومت چاہتے ہیں تو ہم سارے مل کے آج سے انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کئے لیتے ہیں۔ جو وہ چاہیں اس کے لئے ہم تیار ہیں دولت، اقتدار اور بیٹیاں حاضر ہیں۔ یہ لے لیں، مگر خدا کے لئے یہ کلمہ بلند نہ کریں، ہمارے بتوں کی توہین نہ کریں، اس سے باز آ جائیں اور ہم سب چیزیں دینے کو تیار ہیں۔ ابو طالب نے کہا کہ میرے بھتیجے! تیری قوم یہ کہہ رہی ہے اور مجھے پیامبر بنا کے بھیجا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے چچا! آپ نے جو کہنا تھا کہہ چکے؟ کہا کہ ہاں کہہ چکا۔ فرمایا، اب میری سن لیجئے ”خدا کی قسم اگر میری قوم میرے دائیں ہاتھ پر سورج لا کے رکھ دے اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کے رکھ دے تب بھی میں یہ کلمہ نہیں چھوڑوں گا یا عالم میں اس کلمہ کو میں پھیلا کے رہوں گا یا اپنی جان قربان کر دوں گا۔“ ①

اس سے اندازہ ہوا کہ دنیا تو دنیا ہے چاند، سورج اور آسمان کی چمک دمک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھکرا دیا یہ کلمہ جب تک میرے پاس ہے، نہ مجھے چاند عزیز ہے نہ سورج۔ معلوم ہوا یہ کلمہ چاند، سورج سے بھی زیادہ اونچی چیز ہے۔ یہ اللہ کا نام ہے۔ اللہ کے نام سے ہی تو عالم زندہ ہے چاند، سورج بے چارے کی حقیقت کیا ہے۔

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے۔ جس کے لفظ اس قسم کے ہیں کہ میں اس نام سے التجا کر رہا ہوں جو تو نے قرن شمس پر لکھا ہے۔ آفتاب کے اوپر جو آپ نے نام لکھا ہے جس کی وجہ سے آفتاب کو زندگی ملی ہے میں اس نام سے تیرے سے دعا کرتا ہوں تو چاند اور سورج کی زندگی اللہ کے نام سے ہے۔ عرش عظیم اگر زندہ ہے۔ تو اس کے پایوں پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ اسی نام سے وہ قائم ہے تو ذکر اللہ اور نام خداوندی سب سے اونچی چیز ہے۔ اس کے مقابلے میں سورج، چاند حتی کہ عرش و کرسی کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ عرش و کرسی کی عظمت بھی تو اللہ ہی کے نام سے ہے۔ اگر اللہ میاں عرش و کرسی سے اپنے نام کو جدا کر دیں تو ہزار عرش و کرسی ہوں، کوئی وقعت نہیں لیکن چونکہ اللہ کے نام سے لگ گئے ہیں، اس واسطے وہ باعظمت بن گئے۔

قلب محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ذکر اللہ کا خزانہ ہے...... اس سے اندازہ کیجئے کہ سارے جہان ایک طرف، عرش و کرسی اور لوح و قلم ایک طرف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک ایک طرف جو عظمت اس قلب کی ہوگی، وہ عرش و کرسی، لوح و قلم اور تمام جہانوں کی نہ ہوگی اس لئے کہ آپ کا قلب مبارک اللہ کے ذکر کا خزانہ ہے اور ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ جب یہ آتا ہے تو ساری چیزیں ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ کسی چیز میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

① فی ظلال القرآن للسید قطب المصری، ج:۷، ص: ۲۹۳، سورۃ القلم۔

② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

اللہ کے اسم مبارک کا وزن...... حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ میدان محشر میں ایک شخص حاضر ہوگا اور گناہوں کے ننانوے دفتر اسکے ساتھ ہوں گے یعنی اتنے گناہ کئے ہوں گے کہ ننانوے دفتر گناہوں سے بھرے ہوئے ہوں گے اور ایک ہی دفتر اتنا بڑا ہوگا کہ اسے پھیلایا جائے تو زمین وآسمان اس میں چھپ جائیں تو بقایا اٹھانوے دفتر کتنے بڑے ہوں گے؟ مطلب یہ ہے کہ اس کے گناہ اتنے زیادہ ہوں گے کہ جہانوں میں اس کی سمائی نہیں ہوگی۔ وہ میدان محشر میں حاضر ہوگا حق تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی وہ دفتر سامنے رکھے جائیں گے اور وہ دل میں یقین کئے ہوگا کہ میری نجات کی کوئی صورت نہیں ننانوے دفتر جو ہیں۔

تو یہ تیار ہے کہ حق تعالیٰ ابھی حکم دیں گے کہ اسے جہنم میں پہنچاؤ یہ اسی قابل ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے بندے! یہ گناہ تو نے کئے؟ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے کئے فرمائیں گے تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ کہے گا کہ اے اللہ! کوئی عذر نہیں، محض اپنی سیاہ بختی، شقاوت اور بدنصیبی سے میں نے یہ برے اعمال کئے۔ کوئی حجت میرے پاس نہیں میں نے اپنے نفس کی خواہشات پوری کی ہیں۔ لذات نفس میں گرفتار تھا۔ کسی حجت اور دلیل سے میں نے یہ گناہ نہیں کئے۔ اب اسے یقین ہے کہ ابھی حکم ہوگا کہ اچھا پھر جا جہنم میں۔ تیرا ٹھکانا ہمارے پاس نہیں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے، تیرے ان ننانوے دفتروں میں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ایک چھوٹی سی پرچی نکلے گی کہ ساری عمر میں اس نے نیکی کیا کی؟ ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' یہ کلمہ پڑھا گویا بس مسلمان تھا۔ ایک دفعہ کلمہ پڑھا، یہی ایک نیکی باقی کوئی اور نیکی اس کے پاس نہیں تو ننانوے دفتروں میں نیکی کی ایک چھوٹی سے پرچی پڑی ہوگی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیری ایک نیکی یہی ہے اور جا کر میزان عمل میں اپنا نامہ اعمال تلوا اور اپنی نگرانی میں تلوا وہ بندہ عرض کرے گا کہ اے اللہ! آپ مجھے کیوں رسوا کرتے ہیں۔

''رَبِّ مَا هٰذِهِ الْبِطَاقَةُ؟'' اے اللہ! ان ننانوے دفتروں کے مقابلے میں یہ ذرا سی پرچی کیا حقیقت رکھتی ہے؟ میں تو جہنم کے قابل ہوں، مجھے جہنم میں بھیج دیجئے میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے، نہیں ﴿لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ﴾ ① ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے۔ رتی رتی کا حساب ہوگا ان اعمال کو جا کے تلوا اور اپنی آنکھوں کے سامنے تلوا کبھی تجھے یہ خطرہ پیدا نہ ہو کہ میرے فرشتوں نے تیرے اوپر کوئی ظلم کر دیا یا ناپ تول میں کوئی کمی کر دی۔

یہ پھر عرض کرے گا، یا اللہ! آپ مجھے کیوں رسوا کرتے ہیں۔ فرمائیں گے نہیں تلوا جا کے، یہ تلوائے گا تو ایک پلڑے میں ننانوے دفتر رکھے جائیں گے دوسرے پلڑے میں یہ پرچی رکھی جائے گی۔ جب تولیں گے تو ننانوے دفتر ہلکے پڑ جائیں گے اور پرچی کا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور تول میں غالب آ جائے گا فرمائیں گے تیرے لئے

① پارہ: ۲۴، سورۃ المومن، الآیۃ: ۱۷.

جنت اور نجات ہے اور وجہ بیان فرمائیں گے۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① اللہ کا ذکر سب سے وزنی چیز ہے تو لاکھوں برس کے گناہ کرتا رہے، لیکن ایک دفعہ سچی توبہ کر لے اس توبہ کا وہ وزن ہے کہ لاکھوں برس گناہ کرتا رہے، لیکن ایک دفعہ سچی توبہ کر لے اس توبہ کا جو وزن ہے وہ عالم کی کسی چیز کے اندر نہیں ہے۔ اس کو نجات دے دی جائے گی تو یہ ہے ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② کہ ایک ذرا سی پرچی ننانوے دفتروں پر غالب آ گئی خدا جانے اس نے کس اخلاص سے یہ اللہ کا نام لیا ہوگا کہ اس اخلاص کے وزن نے ہر چیز کو ہلکا کر دیا۔ ③

حضور قلب سے ذکر میں وزن پیدا ہوتا ہے...... اصل میں وزن جو ہے وہ اخلاص کا ہوتا ہے۔ ہم رات دن اللہ اللہ کہتے جائیں لیکن غفلت کے ساتھ کریں۔ روح کے اندر بے داری اور دل میں خلوص نہ ہو، دنیا کے دکھلاوے کے لئے ہو، تو اللہ اللہ تو کیا مگر یہ اللہ اللہ ڈھانچہ ہے۔ اس میں روح نہیں ہے جس سے قدر و قیمت بڑھتی ہے اور وزن قائم ہوتا ہے۔ یہ وزن درحقیقت وہ یاد حق ہے صرف اللہ اللہ کہہ دینا کافی نہیں۔ جب تک کہ لفظ اللہ کے ساتھ دل کی یاد بھی شامل نہ ہو زبان سے اللہ اللہ ہو اور دل میں غفلت بھری ہوئی ہو جس کو مولانا رومی رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ

برزبان تسبیح ، درد دل گاؤخر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

زبان پر تو تسبیح جاری ہے، مگر دل میں گھربار کے خیال بھرے ہوئے ہیں۔ بات دوکان کی سوچ رہا ہے اور زبان پر اللہ اللہ جاری ہے یہ ذکر تو ہے مگر قلبی ذکر نہیں، زبانی ذکر ہے۔ تو جو زبان سے اللہ اللہ کہا جائے، دل ساتھ نہ ہو، وہ کافی نہیں وہ بلا روح ڈھانچہ ہے۔ وہ ڈھانچہ کتنا ہی بڑا ہو، اس کی کوئی وقعت نہیں کسی پہلوان کا لاشہ پڑا ہوا ہو اور بڑا ڈیل ڈول کا ہو مگر انتقال ہو چکا ہو اس کی کیا قدرت و قیمت ہے؟ اور ایک دق زدہ مریض ہے۔ اٹھنے کے قابل نہیں مگر زندہ ہے اس کی وقعت ہے اگر اسے کوئی قتل کر دے گا تو پھانسی چڑھے گا۔ وہ نہیں کہہ سکتا کہ صاحب! یہ تو ایک منٹ میں خود ہی مرنے والا تھا۔

آپ مجھے کیوں پھانسی دیتے ہیں یہ مرتا ہی تھا میں نے لاٹھی ماردی مر گیا۔ کہا جائے گا کہ جاندار کو مارا ہے۔ جان پر حملہ کیا اس لئے تجھ سے قصاص لیا جائے گا۔ اور پہلوان کی لاش پر پچاس لاٹھی مار دے کوئی قصاص نہیں اس لئے کہ اس میں جان ہی نہیں تھی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں پتھر کی زیادہ قیمت ہے لاش کی کوئی قیمت نہیں۔ ایک پتھر آپ کا چند روپے میں بک جائے گا۔ اور لاش دس پیسے میں بھی نہیں بکے گی۔ اس واسطے کہ پتھر کو ستون بنائیں کھڑا کر کے عمارت بنائیں گے۔ اور لاش کو آپ کہاں کا ستون بنا دیں گے؟ وہ کسی کام کی نہیں وہ یا تو دفنائی جائے، یا جلائی جائے، یا بہائی جائے، اس کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔ تو اصل میں قدر و قیمت جان سے ہوئی۔ اللہ اللہ کرنا،

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ③ السنن للترمذی، ابواب الایمان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی من یموت وھو یشھد...... ج: ۹، ص: ۲۳۲، رقم: ۲۵۶۳۔

نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا ایک ڈھانچہ ہے۔ اس کی روح ذکراللہ یعنی یادِ حق ہے۔ دل میں بے داری، تنبہ اور اللہ سے لگاؤ یہ روح ہے جب یادِ حق نہیں تو زبان سے کتنے ہی لفظ ادا کرلیں ان کی کوئی قیمت نہیں جب تک لفظ کے اندر معنی نہ ہوں معنی کی اصل میں قدر و قیمت ہے۔ تو قیامت کے دن ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① کا ظہور ہوگا کہ ایک اتنی سی پرچی ننانوے دفتروں پر غالب آئے گی اس لئے کہ اس نے صرف لفظ اللہ نہیں کہا تھا بلکہ اللہ کہنے میں اس کا اخلاص اور قلب کا لگاؤ شامل تھا۔ تو ذکر کے معنی اللہ اللہ کہنے کے نہیں، ذکر کے معنی دل کے بیدار ہونے کے ہیں کہ یاد رکھی ہوئی ہو اس یاد سے کلمات جو نکل رہے ہوں وہ کلمات یادِ خداوندی کے اندر ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں وہ ذکراللہ کہلاتے ہیں۔ وہ جب دل میں ہوگا تو چھوٹے سے چھوٹا جملہ بھی، کہے گا اس کی بھی قدر و قیمت ہوگی۔

الفاظ میں جذبات قلب سے تاثیر پیدا ہوتی ہے...... اللہ والوں کے چھوٹے جملوں میں بھی جو تاثیر ہوتی ہے۔ وہ لفظوں سے نہیں ہوتی وہ لفظوں کے اندر معنی اور دل کی یاد سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی تاثیر ہوتی ہے۔ جو دلوں پر پڑتی ہے۔ ورنہ محض شاعری کی کیا تاثیر ہے کوئی بڑا اچھا فصیح و بلیغ کلام بول دے شاعروں سے بڑھ کر فصیح و بلیغ کون ہوگا۔ لیکن شاعر پچاس غزلیں پڑھ لیں اثر کچھ بھی نہیں ہوتا لوگ واہ واہ تو کردیں گے لیکن آگے اس کا کوئی اثر نہیں لوگ دل میں کچھ نہیں لے کے جاتے اسلئے کہ اس کے اندر معنی نہیں ہیں محض لفاظی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ کوئی شاعر کسی امیر کے ہاں گئے تھے۔ تو انہوں نے جا کے وہاں قصیدہ پڑھا اور شعر ہے ہی وہ جس میں جھوٹ زیادہ ہو اور سچ کم ہو اگر شعر کے اندر ساری سچی پکی باتیں ہوں، وہ شعر ہی کیا ہوا؟ تو جب تک اس میں مبالغے اور بہت سی باتیں جھوٹ نہ ہوں، شعر بنتا نہیں کسی نے کہا ہے کہ شعر کی تعریف کیا ہے کہ "اَحْسَنُهٗ اَكْذَبُهٗ" جو سب سے زیادہ جھوٹا شعر ہوگا وہ سب سے زیادہ عمدہ شعر ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہوگا تو لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں۔ معنی اس کے اندر نہیں ہوتے۔ خیر وہ شاعر صاحب ایک لمبا چوڑا قصیدہ نواب کی شان میں لکھ کے لے گئے اور اس میں خوب ایران توران کی ہانکی کہ آپ کا جو تختِ سلطنت ہے اس کا پایہ آسمان کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ اور آپ کی کلاہ تاج ہے اس کا کنگرا ساتویں آسمان تک پہنچا ہوا ہے، اور آپ کی آنکھوں کے سامنے ثریا بھی ماند ہے اور چاند کی کوئی روشنی ہی نہیں جو آپ کی آنکھوں میں چمک ہے اور آپکے ہاتھ میں جو قوت ہے تو بجلی بھی وہ کام نہیں کرسکتی، جو آپ کا ہاتھ کرے گا غرض ایران توران کی ہانکی۔

امیر صاحب بہت خوش ہوئے کہ اس نے بڑی تعریف کی تو قصیدہ سنتے ہی کہا کہ پرسوں آنا تمہیں ہم دو ہزار روپیہ انعام دیں گے یہ بہت خوش ہوگئے اور جاتے ہی پانچ سو روپے قرض بھی لے لئے اور گھر میں مرغا بھی پک رہا ہے اور لباس وغیرہ بھی خوب بنائے کہ پرسوں کو تو دو ہزار روپے مل ہی جائیں گے۔ پانچ سو قرضے کے ادا کردیں گے تو ان میں سے پھر بھی باقی بچ جائیں گے مجھ سے زیادہ اب امیر کون ہوگا۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

چنانچہ وہ حسب وعدہ بڑی عمدہ شیروانی پہن کر وہاں پہنچ گئے، اب وہ امیر صاحب بیٹھے ہیں، نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے، انہوں نے سلام کہا، انہوں نے گردن بھی نہیں اٹھائی، تھوڑی دیر تو یہ بیٹھے اس کے بعد کھنکارنا شروع کیا، مگر امیر صاحب نے جب بھی کچھ نہیں سمجھا آخر یہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ حضور میں حاضر ہوں۔ آپ کون ہیں؟ وہی جو پرسوں شاعر آیا، قصیدہ کہا تھا تو حضور نے وعدہ کیا تھا کہ ہم دو ہزار دیں گے، میں اس وعدے کے مطابق حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا تم بڑے بے وقوف آدمی ہو، ارے بھائی! تم نے ہمیں لفظوں سے خوش کیا تھا۔ ہم نے بھی لفظوں سے خوش کر دیا تھا۔ نہ ان لفظوں کے کوئی معنی تھے نہ ان لفظوں کے کوئی معنی۔ جو قصیدہ تم نے کہا تھا اس کے لفظوں کے بھی کوئی معنی نہیں تھے اور ہم نے جو دو ہزار کے لفظ کہے تھے تو ان لفظوں کے بھی کوئی معنی نہیں۔ بڑے بے وقوف آدمی ہو تمہیں صلہ مل چکا۔ اس نے کہا حضور! میں تو پانچ سو روپے قرض بھی لے چکا ہوں اگر تم نے لئے تو جھک مارا۔ کس نے تم سے کہا تھا؟ معلوم ہوا تم بے وقوف بھی ہو شاعر نہ ہوتے، عقلمند تو ہوتے عقل کی کچھ تو قیمت ہوتی۔

تو حقیقت یہی ہے کہ لفظوں کی کوئی قدر قیمت نہیں ہوتی جب تک لفظوں کے اندر معنیٰ نہ ہوں اور معنیٰ کے اندر دلی جذبات نہ ہوں اس وقت تک لفظوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہم جیسا کوئی اللہ اللہ کرے گا تو وہ محض زبان سے ہوگا، دل کی بیداری شامل نہیں ہوگی اور اللہ والے جو اللہ اللہ کرتے ہیں۔ تو دل کا ذکر، محبت و معرفت، لگاؤ نسبت اور تعلق اس میں شامل ہوتا ہے۔ اس لئے جو لفظ نکلتے ہیں وہ قلوب کے اوپر تاثیر کرتے ہیں۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولانا رکن الدین پڑھنے کے لئے دہلی گئے۔ اور آٹھ دس برس کے بعد بڑے اچھے عالم بن کے آئے۔ مریدین نے عرض کیا، حضرت! صاحبزادے عالم بن کے آئے ہیں اگر وعظ کرا دیا جائے۔ فرمایا، ہاں بھئی! ضرور وعظ کہلاؤ جب علم پڑھا ہے تو علم کا اثر ظاہر ہو، دوسروں کو مسائل معلوم ہوں۔ صاحبزادے کھڑے ہوئے اور بڑا عمدہ وعظ کہا تمام لوگ خوش ہوئے بہت سے مسائل بیان کئے لوگوں نے مسائل سیکھے، تعریف کی لیکن کوئی خاص اثر پیدا نہ ہوا کہ لوگ رونے لگے ہوں یا آپے سے باہر ہوئے ہوں۔ یہ کچھ بھی نہیں بس یہ ہوا کہ بہت اچھے صحیح مسئلے بیان کئے دل میں قدر و قیمت تھی۔

جب مولانا رکن الدین وعظ کر چکے، تو حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ منبر کے قریب کھڑے ہوئے ایک جملہ کہا، فرمایا، ''بھائی! رات عجیب بات پیش آئی، رکن الدین کی ماں نے فقیر کے لئے کھیر پکائی تھی، وہ کھیر پکا کے کھونٹے پہ رکھ دی، بلی آئی اور کھا کے چلی گئی فقیر محروم رہ گیا۔'' بس یہ کہنا تھا کہ ایک دم جو لوگوں پر گریہ طاری ہوا اور کپڑوں کو پھاڑ ڈالا اور مسجد میں ایک طوفان بپا ہو گیا اب اس میں آخر کیا چیز تھی؟ کھیر پکی رکھی تھی، بلی آئی وہ کھا گئی تو یہ کون سے حقائق و معارف تھے؟ مگر حقیقت میں وہ جو قلب کی تاثیرات تھیں ان تاثیرات نے ان الفاظ کو آلہ بنایا اور الفاظ نے کانوں کو کھٹکھٹایا اور دل کی تاثیر الفاظ کے راستے سے دل پر پڑی اور دلوں میں محبت الٰہی بھری اور

انہوں نے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ تو یہ لفظوں کا اثر نہیں تھا۔ شیخ کے قلب کا اثر تھا۔ اصل میں اہل اللہ دل میں اثر ڈالتے ہیں۔ الفاظ محض ان کا آلہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی قیمت نہیں ہوتی۔ کسی اللہ والے کے پاس سے آپ قلب میں کوئی اثر لے کے جائیں کوئی آخرت کا دین کی عظمت ومحبت کا، وہ الفاظ کا اثر نہیں ہوتا، وہ قلب کی تاثیر ہوتی ہے۔ اگر اس کے قلب میں کوئی اثر نہ ہوتا وہ بہتر سے بہتر لفظ کہتا آپ اس سے کوئی بھی اثر نہ لیتے۔ لفظ تو اثر نہیں کرتے، وہ معانی کرتے ہیں تو معانی لفظوں کے اندر وہی ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ وہی تاثیر وتصرف ہے جس سے قلوب جگمگا اٹھتے ہیں۔ قلوب کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو قرآن کریم نے فرمایا ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ① سب سے زیادہ وزنی چیز، سب سے زیادہ پر عظمت چیز وہ اللہ کی یاد ہے کہ دنیا وما فیہا اللہ کی یاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یاد حق دل میں آ جائے تو بندہ عرشی ہو جاتا ہے...... جب بندے کے دل میں یہ یاد آ جاتی ہے تو لاکھوں سلطنتیں ایک طرف اور یہ چیز ایک طرف، اس کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی قدر وقیمت نہیں ہوتی۔ شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے ہاں بھی مہمانداری بہت تھی اور مریدین کا ہجوم رہتا تھا۔ دو اڑھائی سو تک آدمی، ان کے مریدین میں سے نواب میر خاں جو ہندوستان میں ریاست ٹونک ہے، اس کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کے ہاں مہمانداری بہت ہے اور کوئی دولت، جاگیر، جائیداد ہے نہیں ہے تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک ضلع ان کے پاس لکھ کر بھیج دیا کہ یہ میں آپ کو دیتا ہوں اس کی ہزاروں روپے ماہانہ آمدنی ہے۔ مہمانوں کا خرچ چلے گا اور وہ پیتل کے پترے پہ لکھ کے بھیجا کہ یہ میں بنام حضرت شاہ غلام علی عطیہ دیتا ہوں۔ یہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ آپکے مرید نواب میر علی خاں ہیں۔ انہوں نے یہ پورا ضلع ہدیہ پیش کیا ہے۔ اس کی پشت پر شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں ایک شعر لکھ کے بھیج دیا جیسے حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ انہوں نے بھی ایک شعر لکھ کر بھیج دیا اور وہ شعر یہ تھا کہ:

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم — با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر وفاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے اور وہ آسمان سے آرہی ہے۔ تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ یہ اتنی استغناء اور اتنی بیداری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک دل کے اندر کوئی دولت جمع نہ ہو وہ دولت یہی ذکر اللہ کی تھی۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے تو ضلع، صوبہ، پوری دنیا کیا چیز ہے، ذکر اللہ کے سامنے چاند اور سورج کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔ جب وہ قلب میں آ جاتا ہے تو بندہ پھر عرشی بن جاتا ہے عرش کے اوپر کی باتیں کرتا ہے نیچے کی نہیں کرتا تو یہ ہے وہ

①② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

ذکر اللہ جو ساری شریعت اور کائنات کی روح ہے۔ اگر اس دنیا میں سے ذکر خداوندی نکل جائے، اسی دن قیامت آ جائے اور یہ خیمہ ختم کر دیا جائے اور اگر کسی کے قلب میں سے نکل جائے اسی دن ایمان و اسلام ختم ہے۔ کسی قوم میں سے نکل جائے، وہ قوم بھی بے عزت، اس کی آبرو اور عزت بھی ختم۔ تو ہر چیز میں دولت، عزت حکومت کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ جب تک دین و دیانت، یاد الٰہی اور یاد خداوندی شامل نہیں ہوتی اس وقت تک عالم میں کوئی چیز زندہ نہیں ہوتی کیونکہ سب چیزوں کی روح یہ ہے۔

ذکر اللہ کا مظہر اتم...... اس کا سب سے بڑا مظہر اتم جس سے ذکر الٰہی ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ نماز تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے اس سے پہلے فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ① نماز فحش سے، بے حیائی کی باتوں اور منکرات سے بچاتی ہے، جو شریعت میں گناہ ہیں۔ ان سب چیزوں سے نماز بچاتی ہے اور آگے بطور دلیل کے فرمایا، ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ② نماز کی روح ذکر ہے اور ذکر سب چیزوں سے بڑا ہے۔ ذکر کی روشنی جب آئے گی تو کوئی ظلمت اور تاریکی اس کے آگے ٹھہر نہیں سکتی گناہ ہو، کچھ ہو، سب ختم ہو جائے گا۔

اس سے ایک شبہ کا جواب نکل آتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو شاید یہ سوال پیدا ہو کہ ہم تو خوب پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، مسجدیں بھی بنواتے ہیں، لاکھوں روپے بھی اس میں لگواتے ہیں اور بچے بچے کو لاتے ہیں مگر اس کے باوجود منکرات میں مبتلا ہیں۔ بعض بے غیرتی اور بے حیائی کی باتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ نمازی بھی ہیں۔ مگر یہ حرکتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ نماز فحش اور منکرات سے بچا دیتی ہے۔ حالانکہ ہم نمازی بھی ہیں پھر بھی منکرات میں مبتلا ہیں۔

اس شبہ کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ آپ اس سے مقابلہ کیجئے جو بالکل نماز نہیں پڑھتا۔ اس میں کتنے منکرات ہیں اور نمازی میں کتنے ہیں۔ زمین و آسمان کا فرق دکھائی دے گا۔ نماز پڑھنے والا اگر مبتلا بھی ہو گا تو اتنی برائی نہیں ہو گی جتنی بے نمازی کے اندر ہوتی ہے۔ نمازی کے دل میں پھر بھی خوف خدا تھوڑا بہت موجود ہو گا تو ایک جواب تو یہ ہے، جو سرسری ہے کہ اللہ کا ذکر اور نماز بلاشبہ منکرات سے بچاتی ہے۔ آپ نہیں بچ رہے ہیں۔ تو یہ اصل میں زیادہ میں مبتلا نہیں، کم میں مبتلا ہیں۔ جو بالکل نماز نہیں پڑھتے وہ اس سے زیادہ میں مبتلا ہیں تو کسی نہ کسی حد تک تو آپ کو نماز نے بچا دیا۔

حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ، ہمارے مرشد بھی ہیں اور دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم بھی ہیں۔ ملا محمود رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے استاذ اور مولانا محمود رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ یہ دار العلوم کا ابتدائیہ ہے کہ دو محمودوں سے ابتداء ہوئی۔

الٰہی عاقبت محمود گرداں

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵. ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

جب ابتدا محمود ہے تو ان شاء اللہ عاقبت بھی محمود ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ سادات میں سے تھے۔ مگر ہیں سرحدی تو وہاں کے سادات کو بھی خان ہی کہتے ہیں۔ سب پٹھان کے لقب سے معروف ہیں۔ پٹھان اور خان گویا ان کے ہاں ایک عظمت کا لفظ ہوتا ہے۔

میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں کے اخبارات نے شائع کیا کہ مولانا محمد طیب خاں حالانکہ میں پٹھان نہیں۔ مگر وہ خان عزت وعظمت کا لفظ ہے۔ تو مولانا عزیر گل صاحب گویا انہیں عرف کے لحاظ سے سرحدی پٹھان کہنا چاہئے یوں تو سادات میں سے ہیں۔ وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج میں بڑے دخیل تھے اور بعض دفعہ اتنے جوش سے بات چیت کرتے تھے۔ جیسے کوئی اپنے سے چھوٹے سے بات کر رہا ہو یعنی اتنے دخیل تھے کہ بعض دفعہ بے ادبی کی بات ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت کچھ خیال نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ صحیح بخاری کے درس میں انہوں نے سوال کیا اور کہا حضرت! یہ مسئلہ کیسے ہے؟ حضرت نے سرسری جواب دے دیا بس کہنے لگے کہ خود کو نہیں آتا اور سرسری جواب دے کے آگے چل دیئے پڑھانے کے لئے بیٹھ گئے اور جواب دینا آتا نہیں تو اس طرح سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ یہ ان کی عام بات تھی کہ جب ہم لوگوں سے گفتگو شروع کرتے تو ''آپ'' سے شروع کرتے آپ نے یہ کہا، آپ نے یہ کہا۔ اس کے بعد جب جوش آتا تو ''تم'' کہتے، تم نے یہ کہا، تم نے یہ کہا۔ اس کے بعد ''تو'' نے یوں کہا، تو نے یوں کہا۔ اور اس کے بعد یہ کہ ارے خبیث تو نے یہ کیوں کہا۔ تو ''آپ'' سے شروع ہو کر ''خبیث'' پہ انتہا ہوتی تھی۔ ان کا ایک عام طرز تھا۔ تو بے تکلف بہت اور حضرت کی شان میں بعض جگہ بے ادبی کے کلمات کہہ دیتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے یہ عرض کیا کہ حضرت اتنے دنوں وہ آپ کی صحبت میں رہے اور انہیں تہذیب نہ آئی اتنے بے ہودہ اور بھدے کلمات کہہ دیتے ہیں۔ بیس پچیس برس آپ کی صحبت اٹھائی اور پھر بھی آدمی نہ بنے۔

حضرت نے فرمایا: یوں خیال کرو، اگر یہ بیس پچیس برس صحبت میں نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ جب رہ کر اتنے ہوئے، اگر بالکل نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ تو وہی میں کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھ کر اتنی برائیوں میں مبتلا ہیں۔ بالکل نہ پڑھتے تو کیا ہوتے؟ اور کتنی برائیاں کرتے؟ تو سیدھا جواب تو یہ ہے کہ نمازی اگر مبتلا بھی ہوگا تو کم مبتلا ہوگا بے نمازی زیادہ مبتلا ہوگا۔

لیکن اصل جواب یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے باوجود اگر آدمی فحش سے نہیں بچتا، بے حیائی اور برائی سے سے نہیں بچتا اس نے نماز کا ڈھانچہ قائم کیا اور جو ذکر اللہ کی روح ہے، وہ قلب کے اندر نہیں ہے، روح ہوتی، یقیناً بچ جاتا۔ تو نماز بے حیائی سے بچاتی ہے۔ جب کہ نماز جاندار ہو اور اگر بے جان پڑھے جس کے اندر روح ہی نہ ہو تو لاشہ اور ڈھانچہ کوئی چیز نہیں وہ تو کام نہیں کر سکتا تو نماز بھی کام نہیں آسکے گی نماز اٹھک بیٹھک کا نام نہیں ہے۔ نماز عظمت خداوندی اور یاد حق کا نام ہے کہ دل اللہ کی یاد میں غرق ہے دوسری چیزیں دل سے فنا محض ہو جائیں تو جتنی

یا دزیادہ ہوگی، اتنا ہی بے حیائی سے بچے گا جتنی کم ہوگی، اتنا ہی کم بچے گا۔ بالکل نہیں ہوگی تو چاہے پانچوں وقت نماز پڑھے، جب بھی نہیں بچے گا اس لئے کہ جان تو ہے ہی نہیں تو اصل جواب یہ ہے کہ نماز بلاشبہ فحش سے بچاتی ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس کا کلام حق ہے۔ ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ ① یقیناً نماز بے حیائی سے اور منکرات سے بچاتی ہے۔ بچاتی کیوں ہے؟ ﴿وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ② اس لئے کہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ ③ نماز ذکر اللہ ہی کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ ذکر روح ہے اگر روح نہیں ہوگی تو نہیں بچائے گی۔

روح نہ ہونے کے شبہ سے محض صورت عمل کو ترک نہ کیا جائے...... لیکن میں اتنی بات عرض کئے دیتا ہوں کہ کبھی یہ سمجھئے کہ پورا ذکر تو ہے نہیں، ہماری نماز تو صورت ہی صورت ہے۔ یہ برائی سے بچاتی نہیں، تو آج سے اسے بھی چھوڑ دو اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہوا نہیں اس صورت کو قائم رکھو اس لئے کہ جو صورت بنا رہا ہے تو وقت آئے گا کہ اس صورت میں ہی روح آ جائے گی اگر صورت ہی نہیں بنے گی تو پھر روح کس میں آ کر پڑے گی؟ اس واسطے اس صورت کو بھی قائم رکھو۔ اگر روح نہ ہو، شکل اس کی بنائے رکھو اچھی شکل میں اچھی حقیقت آ جاتی ہے۔ آج نہیں آئے گی، کل آئے گی پڑھتے پڑھتے کسی دن تو خیال ہوگا کہ بھئی! یہ جو محض رسمی اور تصویری نماز پڑھ رہا ہوں، یہ بے کار نہ جائے۔ اس میں جان پیدا کرو تو پڑھتے پڑھتے چند دن کے بعد دھیان آ سکتا ہے۔ اور روح بن جائے گی اس واسطے چھوڑنا اسے بھی نہیں چاہئے جیسے مولانا رومی رحمہ اللہ علیہ نے کہا کہ۔

بہر دین و بہر دنیا و بہر نام   اللہ اللہ کردہ باید والسلام

تم اللہ اللہ کرو، دنیا کے لئے کرو، دکھلاوے کے لئے کرو، نام و نمود کے لئے کرو، کرتے رہو اس لئے کہ کرتے رہو گے تو اسی میں اخلاص بھی آ جائے گا اور بالکل ہی گھر نہ بناؤ تو مسافر آ کے ٹھہرے گا کہاں؟ تو گھر بنا لے، ممکن ہے ذکر اللہ کا مسافر آ جائے اور آ کر اس کے اندر مقیم ہو جائے۔ تو چاہے ریا کاری کی نماز ہو، چاہے بے دھیانی کی ہو، قلب میں کچھ نہ ہو مگر فرض ادا کرتے رہو صورت ہی ان شاء اللہ چند دن کے بعد اپنی طرف کھینچ لے گی تو یہ وسوسہ نہیں آنا چاہئے کہ جب اس میں روح نہیں تو پڑھنے سے فائدہ کیا؟ فائدہ ہے کم سے کم مفتی فتوی دے رہا ہے کہ نماز ہو گئی اسے دل کی خبر نہیں اور جب اللہ کی ہزاروں مخلوق نمازی کہے گی تو عند اللہ بھی معتبر ہوگی۔ تو جب سرکاری گواہوں نے گواہی دے دی کہ فلاں آدمی نمازی ہے تو عند اللہ بھی نمازی ہے۔ تو کیا خبر ہے کہ یہ نمازی کی صورت ہی آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جائے اس لئے چھوڑنا نہیں چاہئے۔

بہر حال مجھے اس ساری آیت سے کلام کرنا نہیں تھا کہ میں نماز کی حقیقت بیان کروں اور پھر یہ بیان کروں کہ نماز کس طرح منکرات اور بے حیائی سے بچاتی ہے بلکہ صرف ذکر اللہ کے بارے میں چند باتیں کہنی تھیں جو

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ③ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

آیت کا دوسرا جز ہے، ﴿وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ① وہ بھی اس لئے کہ وہی سارے عالم اور ساری شریعت کی روح ہے۔ شریعت سے ذکر اللہ نکل جائے تو شریعت کے اعمال ڈھانچہ بن جائیں گے۔ دنیا کے اندر ذکر اللہ نہ رہے، تو یہ دنیا بے جان لاشہ بن جائے گی اور ختم ہو جائے گی اس واسطے ذکر اللہ کی رعایت کرنی چاہئے۔

ذکرِ کثیر کے حصول کی سہل صورت...... اور اس کے لئے سیدھی صورت یہ ہے کہ شریعت نے جو اعمال بتلائے ہیں۔ اگر بچپن سے ہی بچے کو وہ یاد کرا دئے جائیں۔ موقع بموقع کی دعائیں ہیں۔ ان کو ذکر کثیر کہا گیا ہے تو جب وہ دعائیں پڑھائیں گے تو قرآن حکیم میں جو حکم ہے کہ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا﴾ ② اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثیر کرو تو کثرت ذکر کیا ہے؟ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کثرت ذکر یہ کہ مختلف اوقات میں جو اذکار اور دعائیں آتی ہیں وہ ان اوقات میں پڑھی جاتی رہیں، تو ذکر کثیر ہو گیا مثلاً جب چارپائی پر سونے کے لئے لیٹیں تو اس کی دعا الگ ہے کہ "بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی." ③ یا سو کے اٹھیں اس کی دعا الگ ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ." ④ یا کھانا کھانے کے بعد کی دعا ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَکَفَانَا وَاٰوَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ." ⑤ یا استنجا کے لئے جائے پاخانے میں بایاں قدم رکھے اور کہے کہ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ." ⑥ اور جب واپس آئے تو دایاں پاؤں پہلے رکھے اور کہے: "غُفْرَانَکَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ." ⑦ یا جب لباس پہنے تو پڑھے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ ھٰذَا وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ." ⑧ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ مِنْ خَیْرِہٖ وَخَیْرِ مَاصُنِعَ لَہٗ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّہٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَہٗ." ⑨

یا مثلاً بیوی کے پاس جائے تو یہ دعا پڑھے۔ کہ "اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مَارَزَقْتَنَا" ⑩ اولاد مقدر ہوگی تو صالح اولاد پیدا ہوگی۔ یا مثلاً بازار جائے تو بازار میں جانے کی دعا یہ ہے۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ صَفْقَۃً رَابِحَۃً وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ صَفْقَۃٍ خَاسِرَۃٍ" ⑪ "وَلَفْظُہٗ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ خَیْرَ ھٰذِہِ السُّوْقِ

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۱. ③ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب مایقول اذانام، ج: ۱۹ ص: ۳۷۴ رقم: ۵۸۳۷. ④ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب مایقول اذانام، ج: ۱۹ ص: ۳۷۴ رقم: ۵۸۳۷. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، باب مایقول اذاطعم، ج: ۱۰، ص: ۳۳۳، رقم: ۳۳۵۲. ⑥ الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب مایقول عندالخلاء، ج: ۱ ص: ۲۴۶ رقم: ۱۳۹.

⑦ السنن لابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب مایقول اذا خرج من الخلاء، ج: ۱ ص: ۳۵۶ رقم: ۲۹۷. ⑧ السنن لابی داؤد، کتاب اللباس، باب بلاترجمۃ، ج: ۱۱ ص: ۳۷ رقم: ۳۵۰۵. حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۹ ص: ۲۳. ⑨ السنن لابی داؤد، کتاب اللباس، باب اذا لبس جدیدا، ج: ۱۱ ص: ۳۶ رقم: ۳۵۰۴.

⑩ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب التسمیۃ علیٰ کل حال، ج: ۱ ص: ۲۴۴ رقم: ۱۳۸.

⑪ المعجم الاوسط للطبرانی، باب من اسمہ: محمد ج: ۱۲ ص: ۲۷۰. علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن ابان الجعفی وھوضعیف، دیکھئے: مجمع الزوائد، باب مایقول اذا دخل السوق ج: ۴ ص: ۳۹۸.

وَخَیْرَمَا فِیْهَا، وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَافِیْهَا، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اُصِیْبَ فِیْهَا صَفْقَةً خَاسِرَةً." "اے اللہ! میں نفع کا سودا چاہتا ہوں اور گھاٹے کے سودے سے پناہ مانگتا ہوں"۔ یا سورج نکلے تو دعا بتلائی گئی ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَنَا الْیَوْمَ عَافِیَةً وَجَآءَ بِالشَّمْسِ مَطْلَعِهَا." ①

تو ہر موقع کا ایک ایک ذکر ہے۔ یہ اذکار علماء نے چھاپ بھی دیئے ہیں۔ اگر بچے کو ابتداء سے یہ یاد کرا دیئے جائیں، تو یہ موتی ان کے قلوب میں بھر جائیں گے اور زندگی اسلام بن جائے گی۔ جب عادت پڑ جائے گی کہ پاخانے جاتے ہوئے یہ، کھانے کے وقت یہ، لباس پہننے کے وقت یہ، دوستوں سے مصافحہ کرو، تو یہ، کسی سے ملے تو یہ، عادت پڑ جائے گی تو اسی سے اسلامی زندگی بنتی ہے۔ یہ ذکر کثیر مفت میں ہاتھ آ جاتا ہے۔ تو بڑی آسان بات یہ ہے کہ بچوں کو یاد کرا دی جائیں اور بڑے بھی اگر یاد کریں، تو مہینے ڈیڑھ مہینے میں ساری یاد ہو سکتی ہیں۔ پچاس ساٹھ سے زیادہ یہ دعائیں نہیں ہوں گی، زیادہ ہوا تو سو ہو جائیں گی۔ تو ایک دن میں اگر ایک دعا یاد کر لے اور چار مہینے لگ جائیں، تو تین چار مہینے میں پورا دین حاصل ہو جائے یہ بڑے نفع کا سودا ہے، کوئی گھاٹے کی بات نہیں۔ تین مہینے میں نہیں، چار مہینے سہی اور بچے تو بہت جلدی یاد کرتے ہیں۔ چند دن میں یاد ہو جائیں گی اس طرح ذکر کثیر کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

یا پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کر لیا جائے کہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ ایک آدھ گھنٹہ آدمی اللہ میاں کے لئے دے دے چوبیس گھنٹے دنیا کی ضروریات کے واسطے اگر اس میں کچھ وقت اللہ کے نام پر نکال دے تو کون سے بڑی بات ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ساری زندگی اللہ کی ہوتی، چھوٹا موٹا وقت دنیا کے کاموں کے لئے ہوتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں چلو تم سارا ہی وقت دنیا کے کاموں میں لگا دو تھوڑا سا وقت اللہ کے لئے دو۔ تو روزانہ صبح کے وقت بیٹھ کر ایک سو مرتبہ کلمہ تمجید، "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ." ② سو مرتبہ استغفار، "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ." ③ اور سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا جائے اور وہ مختصر یہ ہے: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ."

یہ کون سی بڑی بات ہے؟ ایک بیس منٹ کی بات ہے۔ لیکن ذکر کثیر کی دولت مفت میں حاصل ہو جاتی ہے تو سوتے وقت بھی پڑھ لے اور صبح کو بھی پڑھ لے۔ دونوں وقت نہ سہی، چلو صبح کی نماز کے بعد پڑھ لو صبح نہیں تو سوتے وقت آدھ گھنٹہ دے دو تو آدمی ذکر اللہ کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا اور ﴿وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ﴾ ④ کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ آدمی اگر دیندار بننا چاہے تو دین بڑا آسان ہے۔ دنیا کمانی بڑی مشکل ہے۔ دنیا اس

---

① حدیث محل کلام ہے۔ عمل الیوم واللیلة، ج: ۱ ص: ۲۷۷ رقم: ۱۴۶۔ ② الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التهلیل والتسبیح، ج: ۱۳ ص: ۲۰۵ رقم: ۴۸۶۱۔ ③ السنن لابی داؤد، کتاب الصلوة، باب فی الاستغفار، ج: ۴ ص: ۳۱۳ رقم: ۱۲۹۶۔ ④ پارہ: ۲۱، سورة العنکبوت، الآیة: ۴۵۔

وقت تک نہیں آسکتی جب تک آپ چوبیس گھنٹے دماغ دو کان میں نہ لگائے رکھیں، ذکر اللہ اور دین آسکتا ہے۔ اگر بیس منٹ بھی دے دیں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تو دنیا کمانا مشکل اور دین کمانا آسان ہے۔ لوگوں نے آسان کو چھوڑ دیا اور مشکل کو اختیار کر لیا تو۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ کی فضیلت یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ مختلف اوقات کی دعائیں یاد کی جائیں اور یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ صبح، شام یہ تین تسبیح پڑھ لیں اور نماز کی پابندی کی۔ تو انشاء اللہ بہت سی برکات اسی سے پیدا ہو جائیں گی۔

اس واسطے میں نے اس آیت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں گذارش کیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ذکر اللہ کرنے اور یادِ خداوندی میں لگنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے دین کی ہمیں محبت عطا فرمائے اپنی اور اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے قلوب میں ڈال دے۔ اس محبت سے عظمت پیدا فرما دے اور عظمت سے متابعت اور اطاعت و اتباع کی دولت نصیب فرما دے۔ (آمین)

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ."

طریقِ اصلاح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا."

أَمَّا بَعْدُ:

دنیا کی ایک عام حالت، تمہید...... بزرگانِ محترم! اس دنیا کی بناوٹ اور ساخت پر ہم غور کریں، تو اس سے یہ اندازہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں دو سلسلے جاری ہیں۔ ایک خیر اور بھلائی کا، ایک شر اور برائی کا، ہر چیز میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی ذوات کو چھوڑ کر کہ وہ خیرِ محض ہیں دنیا میں جتنی چیزیں ہیں۔ ان میں کچھ بھلائی پائی جاتی ہے اور کچھ برائی۔ نہ کوئی خیرِ محض ہے نہ شرِ محض۔ ہر چیز میں سے ایک راستہ شر کا ایک اور ایک بھلائی کا نکلتا ہے۔ روٹی جیسی نعمت جو ہم روز کھاتے ہیں، وہ جس طرح زندگی بناتی اور طاقت دیتی ہے۔ ذرا بے اعتدالی ہو جائے، وہی موت کا سبب بنتی ہے۔ یہی پانی، جس کے بارے میں فرمایا گیا، ﴿وَجَعَلْنَامِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (1) ہر چیز کو ہم نے پانی سے زندگی دی، یہی پانی اگر زیادہ پیا جائے تو تخمہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی ہوا حیات کا سبب ہے۔ اگر یہی زیادہ پہنچ جائے، سانس اکھڑ جاتی ہے۔ فنا کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے زمین فرش بھی ہے اور قبر بھی بن جاتی ہے۔ موت کا بھی ذریعہ ہے، حیات کا بھی۔ تو ہر چیز میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔

انسان کو دیکھا جائے تو جہاں اس سے بھلائیاں پہنچتی ہیں کہ جتنی بھلائیاں یہ کرتا ہے اتنی کوئی نہیں کر سکتا۔ یہی جب شر پر آتا ہے تو اس سے اتنی شر پہنچتی ہے کہ شیطان بھی اتنی نہیں پہنچا سکتا، جتنی راحتیں اس سے پہنچتی ہیں، اتنی ایذائیں بھی پہنچتی ہیں۔ تو انسانوں میں کھانے میں، پہننے میں اور استعمال کی ہر چیز میں کچھ بھلائی ہے اور کچھ برائی۔

لیکن جہاں تک ہم غور کرتے ہیں تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ برائی تو ہر شی کی ذات میں رکھی ہوئی ہے اور بھلائی باہر سے لا کر اس کے اندر داخل کی جاتی ہے۔ ذات میں کوئی بھلائی موجود نہیں۔ جدوجہد اور محنت کرتے ہیں تو کچھ خوبی

---

(1) پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۰۔

آ جاتی ہے۔ اگر محنت نہ کریں تو خرابی لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود بخود اندر موجود ہے۔

فرض کیجئے کھانا ہے تو اس کی عمدگی یہ ہے کہ خوش ذائقہ خوش رنگ اور خوشبو ہو ان صفات کو قائم رکھنے کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑتی ہے کہیں آپ نعمت خانہ بنائیں گے، کہیں بہترین الماری بنوائیں گے جس کی جگہ بھی ٹھنڈی ہو، ہوا بھی پہنچتی رہے۔ تا کہ کھانا خراب نہ ہو تو کھانے کی خوبیوں کو برقرار رکھنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر آپ کھانے کو سڑانا چاہیں کہ اس میں بدبو آنے لگے، خراب ہو جائے تو کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ اپنی محنت چھوڑ دیجئے، دو دن کے بعد سڑ جائے گا۔ بدبو آنے لگے گی، رنگ بھی بگڑ جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ برائی اس کھانے کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم ہوئی وہ اندر کی برائی خود بخود سامنے آ گئی۔

یا مثلاً ایک بہت عمدہ باغ ہے تو اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو، ہرا بھرا ہو، شاداب ہو، درخت لہلہا رہے ہوں، سبزہ چھایا ہوا ہو، ان خوبیوں کو دیکھ کر آپ مال بھی خرچ کریں گے، ملازم بھی رکھیں گے جو پانی بھی دے اور درختوں کی نگرانی بھی کرے تب جا کے باغ کی یہ خوبی برقرار رہے گی۔ لیکن اگر آپ باغ کو اجاڑنا چاہیں کہ وہ خشک ہو جائے اور جلانے کے قابل ہو جائے۔ تو نہ مالی اور تنخواہ دار ملازم رکھنے کی ضرورت، محنت بند کر دیجئے دس دن کے بعد وہ خراب، خشک ہو کر پتے جھڑیں گے، شاخیں ٹوٹیں گی۔ جلانے کے قابل ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ خرابی اس باغ کی ذات میں چھپی ہوئی تھی۔ تم نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم کر دی۔ خرابی خود بخود اندر سے ابھر آئی۔ خرابی پیدا کرنے کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اسی طرح مکان ہے۔ کئی لاکھ روپے لگا کر آپ نے بلڈنگ بنوائی۔ اس کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ملازم رکھنے پڑتے ہیں۔ تب مکان خوشنما اور بہتر طریق پر باقی رہے گا۔ لیکن اگر آپ مکان کو اجاڑ یا ویرانہ بنانا چاہیں، اس کے لئے ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن کے لئے جھاڑو دینا چھوڑ دیجئے پہلے گرد جمے گا، پھر پلاستر گرے گا، پھر اینٹیں گریں گی۔ چند دن کے بعد مکان کھنڈر بن جائے گا، تو کھنڈر بنانے کے لئے محنت کی ضرورت نہیں۔ عمدہ بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمدگی کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ خرابی خود بخود بلا محنت اندر سے ابھر آتی ہے۔ یہ دنیا کی عام حالت ہے۔

برائی انسان کی ذات میں موجود ہے...... اسی پر اپنے آپ کو قیاس کیجئے۔ انسان بھی بہر حال دنیا ہی کی ایک چیز ہے۔ انسان کو قابل بنانے کیلئے محنت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کسی کو عالم بنائیں گے تو کسی مدرسہ میں بھیجنا پڑے گا، گھر پڑھائیں گے تو ایک عالم کو رکھنا پڑے گا۔ تنخواہ اسے الگ دیں گے خوشامد الگ کریں گے۔ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ الگ ہوگی کہ محنت کرے، تعلیم پائے تب جا کر وہ عالم بنے گا۔ لیکن جاہل بنانے کے لئے نہ آج تک کوئی مدرسہ کھلا نہ کسی معلم کو رکھا گیا کہ آپ ہمارے بچے کو جاہل بنا دیجئے۔ جاہل خود ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا

ہے۔علم کولانے کے لئے معلم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہالت ذات میں موجود ہے۔علم لاکر اسے چھپا دیا جاتا ہے جس کے لئے محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ۔

قرنہا باید تا یک سنگِ خاراز آفتاب لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

سالہاسال کی مدت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک پتھر آفتاب کی گرمی سہتے سہتے تپش اور جلن لیتے لیتے صدیوں میں جاکر لعل بدخشاں اور یاقوت بنے گا۔جس کی قیمت اٹھے گی تو یاقوت بننے کے لئے پتھر کو ضرورت پڑی کہ آفتاب کی گرمی کو سہے اس کی تپش کو جذب کرے تب جاکر لعل بنے گا۔لیکن پتھر بنانے کے لئے وہ تو پہلے سے بنا بنایا پتھر ہے۔لعل بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ بے قیمت پتھر بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں تو شاعر نے خوب کہا کہ سینکڑوں برس ایک پتھر آفتاب کی کرنوں کو جذب کرے تب جاکے لعل بدخشانی بنتا ہے اور شاعر کہتا ہے کہ۔

ماہ ہا باید کہ یک پنبہ دانہ بعد کشت جامہ گردد شاہدے رایا شہیدے راکفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ بنولہ کا ایک دانہ،اسے زمین میں ڈالو،مہینوں وہ مٹی میں دبے،اپنی ہستی کو ختم کرے،اس میں سے کونپل نکلے،درخت بنے،اس میں روئی لگے،پھر روئی کو صاف کیا جائے پھر دھنا جائے،پھر کپڑا بننے والے کے ہاں بھیجا جائے کہ اس کے تار بنائے اور مشینوں پر لگائے کپڑا بنے،تب جاکے کپڑا کسی محبوب کا لباس بنے گا یا کسی شہید کا کفن بنے گا۔لیکن اگر یہ روئی کا دانہ محنت نہ اٹھائے۔نہ اسے کپڑا بننا نصیب ہوگا،نہ جامہ محبوب بننا نصیب ہوگا۔وہ محض ایک بنولہ کا دانہ ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔تو بنولہ کے دانے میں یہ کمال آجانا کہ اس میں سے نکلی ہوئی چیز محبوبوں کے سر پر جائے،جب ہوتا ہے جب بنولہ کا دانہ محنت اٹھائے مٹی میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کرے،اور کاشت کار کی محنتوں کو سہے تب جاکے اس رتبے پر پہنچتا ہے۔کمال پیدا کرنے کے لئے محنت کی ضرورت پڑی اور بے کمالی پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں۔دانہ پڑا پڑا خود ہی خراب ہو جائے گا اور خوب کہا ہے۔اسی شاعر نے کہا۔

سالہا باید تا یک کودکے از درس علم عالمے گردد نکو، یا شاعرِ شیریں سخن

سالہا سال کی مدت چاہئے کہ آدمی کا ایک نادان بچہ میاں جی کی مصیبتیں سہے۔مکتب میں جائے،نو برس تک مصیبتیں اٹھا کر کورس کو حاصل کرے تب جاکے عالم یا شاعر شیریں سخن بنے گا۔لیکن اگر یہ محنت نہ اٹھائی جائے۔تو جاہل رکھنے کے لئے کسی قسم کی محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔بے محنت چھوڑ دو،جاہل بنا بنایا ہے تو جاہل بنانے کے لئے آج تک کوئی مدرسہ قائم نہیں ہوا۔کوئی کہے کہ بھئی ہمارے بچے کو جاہل بنا دو۔وہ کہے گا کہ جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔بنوانا چاہتے ہو تو عالم بنادوں گا بشرطیکہ یہ بھی محنت کرے اور میں بھی محنت کروں۔تو خوبی محنت سے لائی جاتی ہے۔خرابی کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔کیونکہ خرابی ہر چیز کی ذات میں موجود ہے۔

بااخلاق بنانے کے لئے مربیوں کو محنت کرنی پڑے گی۔ مربیانِ دین کے سپرد کرنا پڑے گا، شیوخ طریقت محنت کریں گے، اپنے مرید سے محنتیں کروائیں گے۔ جب جاکے برسہابرس میں اس کے اخلاق درست ہوں گے۔ تو خانقاہ اس لئے بنائی جاتی ہے کہ اخلاق کو درست کریں کیریکٹر کی اصلاح کریں۔ انسان کو اعلیٰ انسان بنائیں۔ آج تک کوئی خانقاہ اس لئے قائم نہیں ہوئی کہ کسی بچے کو بداخلاق بنادیا جائے بداخلاق بنتا نہیں۔ آپ ذرا محنت کر کے اخلاق کو خراب کردیجئے یہ کہے گا ارے احمق! یہ تو ماں کے پیٹ سے ہی بداخلاق پیدا ہوا ہے۔ محنت خوبی کے لئے کی جاتی ہے، خرابی کے لئے نہیں کی جاتی۔

تو انسان کے اندر دو ہی بڑے بڑے کمال ہیں: ایک علم اور ایک اخلاق۔ جس سے عمل درست ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کمال محنت سے لائے جاتے ہیں اور محنت نہ کی جائے تو علم کی جگہ جہالت ہے، وہ بھی پہلے سے موجود اور حسن اخلاق کی جگہ بداخلاقی، وہ بھی پہلے سے موجود۔ قرآن کریم میں علم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ”اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حالت میں کہ تم جاہل مطلق تھے۔ ذرہ برابر تمہارے اندر علم نہیں تھا“۔ انسان کا بچہ ایک مضغہ گوشت پیدا ہوتا ہے۔ نہ اسے اچھے برے کی تمیز، نہ سیاہ کو جانتا ہے نہ سفید کو۔ حق تعالیٰ اس کے اندر سمجھنے، دیکھنے اور سننے کا مادہ رکھتے ہیں۔ تب سن سن کر، دیکھ دیکھ کر، سوچ سوچ کر برسہابرس میں جاکے وہ عالم بنتا ہے، محنت کرتا ہے تو عالم بن جاتا ہے۔ مگر خلقی طور پر جہالت لے کر پیدا ہوتا ہے تو علم انسان کی ذات میں نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں جہالت ہے۔

اخلاق کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا، حضرت یوسف علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ ② میں اپنے نفس کی بریت نہیں کرتا۔ نفس جب حکم دے گا، برائی کا حکم دے گا۔ اس میں شر ہی شر چھپا ہوا ہے۔ تو خیر لائی جاتی ہے، شر پہلے سے موجود ہے۔ اخلاق میں بھی بدی پہلے سے موجود، نیکی محنت سے لائی جائے گی۔ علم میں بھی جہالت پہلے سے موجود، علم محنت کر کے لایا جائے گا۔ دو ہی کمالوں سے آدمی آدمی بنتا ہے، علم سے اور اخلاق سے اور وہ دونوں اس کی ذات میں موجود نہیں ہیں۔ اس کی ذات کے اندر بداخلاقی اور جہالت ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے جتنے مادے ہیں۔ وہ سب گندے اور نجس ہیں۔ ان سے علم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان سے نیک اخلاقی بن ہی نہیں سکتی۔ ان کے ساتھ جہالت اور بداخلاقی ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم نے ذکر کیا: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ ③ ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا اس گندے قطرے میں کوئی خوبی، شعور، بھلائی اور دانش مندی نہیں، بلکہ ناپاک قطرہ

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۳۔ ③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۔

ہے۔ بدن سے نکل آئے تو غسل واجب، کپڑے کو لگ جائے تو اس کا دھونا واجب، مسجد میں آنا جائز نہیں، قرآن پڑھنا جائز نہیں۔ اس درجہ گویا ناپاک اور نجس چیز ہے کہ عبادت سے آدمی جاتا رہتا ہے۔ مسجد میں آنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اس سے تو انسان کی پیدائش واقع ہوئی۔

بعض ائمہ کا اس بارے میں مذہب یہ ہے کہ وہ قطرہ پاک ہے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ عام ائمہ کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ ناپاک ہے۔ مگر بعض اس کے قائل ہیں کہ وہ پاک ہے وہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کا مادہ ہے۔ تو اس کو نجس کیسے کہہ دیں۔؟ تو کچھ نہ کچھ اختلاف ہو گیا۔

لیکن ماں کے پیٹ میں جا کر آگے کیا ہوتا ہے۔ چالیس دن کے بعد خون بنتا ہے۔ خون کے پاک ہونے کا کوئی قائل نہیں گویا ناپاکی کی طرف بڑھا۔ اب تک اختلاف تو تھا کہ کوئی پاک کہتا تھا، کوئی ناپاک، لیکن حدیث میں ہے کہ وہی نطفہ چالیس دن کے بعد خون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خون بالاتفاق ناپاک ہے۔ اس کی پاکی کا کوئی قائل نہیں تو گویا دوسرا مادہ انسان کی پیدائش کا ایسا گندہ ہے کہ سب ہی اس کی گندگی کے قائل ہیں۔ چالیس دن کے بعد خون کی یہ بوند ایک لوتھڑا بن جاتی ہے۔ اس میں بھی کوئی خوبی نہیں، کوئی نورانیت اور چاندنا نہیں۔ اس کے چالیس دن بعد ماں کے پیٹ میں اس میں ہڈیاں پیدا کی جاتی ہیں، اور ان پر گوشت ڈالا جاتا ہے، کھال بن جاتی ہے، ایک شکل بنا دی جاتی ہے اس میں بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔ غرض ابتداء سے لے کر انتہا تک گندے یا خراب قسم کے مادے ہیں۔ جس کو قرآن کریم نے ایک موقع پر ذکر فرمایا کہ: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ ① ''ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا''۔

ظاہری بات ہے کہ مٹی میں نہ شعور و عقل نہ تمیز و امتیاز نہ علو شرف، ہر وقت پامال ہے، جوتیوں میں روندی جاتی ہے۔ یہ انسان کی پیدائش کا مادہ ہے۔ مٹی کے خلاصے سے پھر گندہ قطرہ بنا، وہ نجس، اس گندے قطرے سے خون بنا، وہ نجس۔ اور فرمایا ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ ② یہاں حق تعالیٰ نے دور بتلائے ہیں کہ پہلے انسان مٹی تھا۔ مٹی سے گندہ قطرہ، پھر مضغہ گوشت بنا، پھر ہڈیاں آئیں، پھر کھال پہنائی گئی تب جا کے کہیں اس میں جان پڑی۔ اتنے ادوار میں جتنے مادے آئے۔ وہ سب گندے اور ناپاک۔ ان میں کوئی خوبی نہیں۔ اس سے انسان کی پیدائش عمل میں آئی جس مکان میں پیدائش ہوئی وہ بھی گندا ماں کے پیٹ میں کوئی چاندنا تھوڑا ہی ہے۔ نہ ظاہری روشنی نہ باطنی روشنی۔ قرآن کریم نے ایک موقع پر فرمایا ﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ ③ ہم نے تمہیں

① پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۱۲۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۱۳، ۱۴۔

③ پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۶۔

ماں کے پیٹ میں تین اندھیری کوٹھڑیوں کے اندر پیدا کیا۔ ان میں ظلمت کے سوا نورانیت کا نشان نہیں۔ تو پہلے ماں کا پیٹ ہے۔ اس میں کون سا چاندنا ہے، پھر اس میں رحم مادر ہے. اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی اس میں اور زیادہ ظلمت پھر اس میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے۔ وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ دایا اسے کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔ گویا تین ظلمتوں میں انسان کو پیدا کیا گیا تو پیدائش کے مادے وہ بھی گندے، مکان پیدائش کے وہ بھی گندے۔ اتنے گندے مادوں میں سے علم کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ اخلاق کیسے پیدا ہو سکتے تھے؟ نجاستوں میں سے خوبی نہیں نکلتی جب انسان کی پیدائش ہی ایسے مادوں سے ہے، اس میں خوبی کہاں سے آتی؟۔

انسان میں کمال منجانب اللہ ہے...... لیکن آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ دنیا میں جتنی خوبیاں ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ انسان ہی سے ظاہر ہوئی ہیں۔ انسان میں اولیاء علماء پیدا ہوئے انبیاء وحکما پیدا ہوئے دنیا کو بھی انسان نے سجایا اور آخرت کو بھی انسان نے بنایا تو خوبیاں بھی انسان میں ہیں۔ پھر اگر یہ ایسا گندہ تھا تو یہ خوبیاں کیوں اس کے اندر ظاہر ہوگئیں؟

اس کا جواب بھی سن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جہاں انسان کی پیدائش کے مادے ذکر کئے وہاں ان گندی چیزوں کا ذکر کیا۔ لیکن ان گندی چیزوں میں سے نہ کوئی علم نکلتا ہے نہ کمال علم کا تعلق اس کی روح، حقیقت اور روحانیت سے ہے۔ روح کا جب ذکر کیا، اسے اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا فرمایا ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ ① ''میں نے انسان کے اندر اپنی روح ڈال دی''۔

﴿فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ ② تو جہاں کمال کا ذکر آیا۔ اسے اپنی طرف منسوب کیا کہ ان کے اندر کمال میرا ہے۔ جہاں گندگی اور گندے مادوں کا ذکر آیا وہاں انسان کی طرف نسبت کی ﴿خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ طِيْنٍ﴾ ③ انسان کو ہم نے مٹی سے بنایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ ④ انسان کو سڑے ہوئے گارے سے بنایا تو جہاں انسان اور اس کے مادوں کا ذکر ہے۔ وہاں انسان کی طرف نسبت کی گئی۔ جہاں روح کا ذکر آیا۔ وہاں کہا کہ میں نے اپنی روح انسان میں ڈال دی۔

معلوم ہوا کہ کمالات جتنے آتے ہیں، وہ خدا کی طرف سے آتے ہیں۔ عیب جتنے ہیں وہ انسان کی ذات میں پہلے سے موجود ہیں۔ اسے واسطے اسے کمال پیدا کرنے کے لئے اللہ کی طرف جھکنا پڑے گا۔ وہیں سے کمال ملے گا۔ اس کی ذات میں کچھ نہیں ہے۔ علم اور اخلاق کے لئے محنت کرنی پڑے گی اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، کیونکہ علم وکمالات اور اخلاق کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ لیکن کتنا ہی علم آجائے، ذات تو انسان کی ذات ہی رہے گی۔ ذات میں وہی کوراپن وہی گندگی۔ یہی وجہ ہے کہ علم آجانے کے بعد جتنا علم بڑھتا رہتا ہے،

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۲۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۱۲۔

③ پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۱۲۔ ④ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۲۶۔

اتنے ہی اہل علم تواضع سے جھکتے رہتے ہیں، سرنیچا رکھتے ہیں، غرور نہیں کرتے۔ اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ علم ہمارا کمال نہیں ہے۔ غرور آدمی کرے تو اپنی چیز پر کرے۔ دوسرے کی چیز پر آدمی کیا غرور کرے جو آ بھی سکتی ہے، چھینی بھی جاسکتی ہے۔ یہ ہماری چیز نہیں ہے۔

آپ اپنے خزانے پر کسی خزانچی کو بٹھلا دیں اور خزانچی آپ کے امر سے دوسروں کو دیتا رہے تو خزانچی کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں اس خزانہ کا مالک ہوں اور میں دے رہا ہوں؟ وہ جانتا ہے کہ خزانے کا مالک دوسرا ہے۔ اس کی اجازت سے میں خرچ کر رہا ہوں۔ میں تو امین ہوں اور میں تو محض منتقل کر دینے کا ذمہ دار ہوں، مالک نہیں ہوں تو خزانچی کے دل میں کبھی غرور پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ خزانہ میرا نہیں ہے۔

اسی طرح سے انسان کتنا ہی عالم وفاضل بن جائے۔ مگر جب وہ یہ دیکھے گا کہ میری ذات سے یہ علم نہیں آیا۔ یہ تو باہر سے آیا ہے۔ یہ عمدہ اخلاق میرے نہیں ہیں۔ میرے مادے تو گندے اور برے تھے۔ یہ کہیں اور سے آئے ہیں۔ اس لئے دانش مند آدمی کبھی شیخی نہیں کرے گا۔ کبھی اترائے گا نہیں اصلیت کو سمجھے گا اور یوں کہے گا کہ میں ان کمالات پر شکر تو کر سکتا ہوں۔ لیکن فخر نہیں کر سکتا فخر اپنی چیز پر ہوتا ہے۔ یہ چیز میری ہے ہی نہیں۔ جتنے بڑے لوگ، علماء، اولیاء اور حکماء گزرے ہیں جتنا اونچے بنتے گئے، اتنا ہی سر جھکاتے گئے ہیں کہ ہم کوئی چیز نہیں، ہم ہیچ در ہیچ ہیں، ہم میں کوئی خوبی نہیں۔ اس لئے کہ ان پر اصلیت منکشف ہوتی ہے۔

اہل کمال میں تواضع بھی بدرجہ کمال ہوتی ہے...... اس عالم میں سب سے بڑے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مخلوقات میں آپ کے برابر کا کیا ہوتا؟ کوئی آپ کے لگ بھگ بھی نہیں ہے۔ سب سے بالا اور برتر آپ کی ذات عالی ہے۔ اللہ کے بعد اگر رتبہ ہے تو بس خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اتنی بڑائی عالم میں کسی کو نہیں دی گئی جتنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ اگر غرور فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے، اگر اتراہٹ ظاہر فرماتے تو آپ فرماتے۔ لیکن آپ سے زیادہ تواضع کرنے والا بھی عالم میں کوئی نہیں۔ آپ سے زیادہ سر کو جھکانے والا بھی کوئی نہیں۔ قدم قدم پر اپنی تواضع ظاہر فرماتے۔ کبھی زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ننگے پیر کھانا کھاتے اور فرماتے "آكُلُ كَمَا يَأْكُلُ الْعَبْدُ" ① میں ایسے کھانا کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتے ہیں۔ میں کوئی بادشاہ اور سلطان نہیں ہوں۔ میں ایک غلام ہوں۔ جیسے غلام کھانا کھاتے ہیں، میں کھاتا ہوں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ میں کوئی چیز ہوں۔

اسی طرح سے جب آپ چلتے تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ فرمائیں کہ میں آگے آگے رہوں، بقیہ سب پیچھے رہیں۔ وہاں بھی کمال تواضع کہ صحابہ آگے پیچھے، دائیں بائیں چل رہے ہیں۔ آپ کوئی اپنا امتیاز ظاہر نہیں فرماتے۔ یہ کمال تواضع ہے لیکن یہ آگے اللہ کی دی ہوئی بزرگی ہے کہ آپ اپنے کو لوگوں میں کتنا ہی رلاتے ملاتے اور مل ملا کر

① المصنف لعبدالرزاق، ج: ۱۰، ۴۱۵، رقم: ۹۵۴۳. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ۲ ص: ۸۲.

لوگوں میں چلتے۔ لیکن سب سے اونچے آپ ہی نظر پڑتے تھے، حالانکہ بہت سے صحابہ ہیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک میانہ تھا نہ پستہ قد تھے نہ بہت لمبا قد۔ نہایت موزوں اور خوبصورت قد تھا۔ جب آپ چلتے تو سب سے اونچے آپ دکھائی دیتے تھے۔ یہ اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی۔ آپ خود آگے بڑھنے کی کوشش نہیں فرماتے تھے۔

مجلس میں جب آپ بیٹھتے تو اور لوگ بھی بیٹھتے۔ صحابہ آگے پیچھے اور دائیں بائیں بھی ہیں۔ کبھی اپنے لئے کوئی امتیازی مقام تجویز نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ لمبے لمبے قد کے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں مگر سب سے اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر پڑتے تھے۔ تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سب سے بلند اور بالا آپ ہی نظر پڑتے تھے تو آپ کی ذات ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تواضع آپ ہی فرماتے تھے۔ کہیں فرماتے ہیں، ''لَاتَطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ'' ① اے لوگو! میری تعریف میں مبالغے مت کرنا، مجھے میری حد سے مت گزارنا، جیسے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعریف میں مبالغے کئے کہ انہیں خدا کا بیٹا بلکہ خدا تک کہہ دیا۔ میری بزرگی یہ ہے کہ مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو ''اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ،'' نہ میں خدا ہوں، نہ خدا کی اولاد، وہ اولاد ہونے اور باپ ہونے سے بری ہے۔ ''اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ'' میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ ہاں یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے اپنا رسول بنایا، مجھے اپنا ایلچی اور پیغمبر بنایا اور اتنی عظمت مجھے عطا کی۔ یہ اس کی دین ہے، میں بندہ ہی ہوں، تو جگہ جگہ فرماتے ہیں۔ ''اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ'' (صلی اللہ علیہ وسلم)

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو کہا کہ ''یَاسَیِّدَنَا'' اے ہمارے سردار! حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سردار ہی تھے۔ آپ تو جہانوں کے سردار ہیں۔ لیکن فرمایا، ''اَلسَّیِّدُ اللّٰهُ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ'' ② سردار اللہ ہے۔ میں تو اللہ کا بندہ اور غلام ہوں۔ فوراً اصلاح فرمائی کہ ایسے خطاب بھی مت دو جس سے مبالغے ٹپکتے ہوں۔ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''لَاتَقُوْلُوْا اَنَا خَیْرٌ مِنْ یُّوْنُسَ ابْنِ مَتّٰی'' ③ اے لوگو! یہ کبھی میری نسبت مت کہو کہ میں حضرت یونس علیہ السلام سے بہتر اور برتر ہوں۔ حالانکہ آپ تمام انبیاء میں افضل ہیں۔ لیکن روکا یعنی اس طرح تعریف مت کرو کہ دوسرے کی تنقیص وتوہین ہونے لگے۔ مقابلے ڈال ڈال کر میری بڑائی مت بیان کرو، کہ میرے مقابلے میں دوسرے کم رتبہ ہیں اور میں زیادہ رتبے والا ہوں۔ یہ ادب کے خلاف ہے۔ گستاخی کی بات ہے۔ یہ کمال تواضع ہے تو کہیں ہدایت فرمائی کہ میری تعریفوں میں مبالغے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ واذکر فی الکتاب مریم، ج: ۱۱ ص: ۲۶۲ رقم: ۳۱۸۹.

② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی کراھیۃ التمادح ج: ۱۲ ص: ۴۲۹.

③ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ وان یونس لمن المرسلین ج: ۱۱ ص: ۲۲۳ رقم: ۳۱۶۳.

مت کرو اور کہیں فرمایا کہ دیکھو میری حیات طیبہ میں ادب کرو۔ مگر مبالغے مت کرو اور وفات کے بعد فرمایا، ''لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ '' ① میری قبر کو بت مت بنالینا کہ پوجا شروع کردو، سجدے شروع کردو یا جھکنا شروع کردو، بت مت بنالینا۔ اور کہیں فرمایا: ''لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا '' ② میری قبر کو عیدگاہ مت بنانا کہ وہاں میلے ٹھیلے کرنے لگو، وہاں جماعتیں بن کر آئیں۔ یہ مت کرنا۔ اس وقت میرا حق ہے کہ تم میری زیارت کرنے کے لئے آؤ۔ روضہ اقدس پر حاضر ہو۔ حدیث میں فرمایا: ''مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ ''③ جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔ میرا حق ہے کہ وہ میرے پاس آئے۔ اگر زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آدمی سفر کر کے جائے۔ تو اس کا حق ہے کہ سفر کرے اور زیارت کرے اور روضہ اقدس پر حاضر ہو اور صلوٰۃ وسلام پڑھے۔

بہرحال وفات کے بعد اور وفات، سے پہلے جتنے آداب بتلائے ان میں اپنی عبدیت و بندگی ظاہر فرمائی کہ میرے ساتھ نہ زندگی میں مبالغے کرو، نہ وفات کے بعد کہیں فرمایا، ''لَا تَقُوْمُوْا لِیْ کَمَا یَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ'' ④ میرے دربار میں میرے پاس آ کر یہ مت کرو کہ میں بیٹھا ہوا ہوں اور لوگ میرے سامنے کھڑے ہوئے ہوں. جیسے عجمی بادشاہوں کے سامنے لوگ کھڑے رہا کرتے تھے اور درباری بادشاہوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ چاہے دو گھنٹے ہوں یا تین گھنٹے بادشاہ بیٹھتا تھا۔ لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ فرمایا: یہ مت کرو جیسے سلاطین دنیا کے سامنے کیا جاتا ہے۔ یہ رسمی تعظیم ہوتی ہے۔ حقیقی ادب نہیں ہوتا حقیقی ادب یہ ہے کہ دل میں عظمت اور عقیدت گھر کی ہوئی ہو اور بیٹھے رہو۔ جیسے میں بیٹھا ہوں۔ اس سے منع فرمایا تو یہ بھی کمال عبدیت کا اظہار ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ میری بندگی پیش نظر رکھو۔

رسالت و بشریت...... حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے رسول بھی ہیں اور رسالت کی بزرگی کی وجہ سے ان کے ہاتھوں پر معجزات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر کرامتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ تو ایک طرف تو یہ کرامت کہ اشارہ فرمادیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہوجائیں اشارہ فرمائیں تو درخت اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگتے ہوئے سامنے آجائیں۔ طشت میں انگلیاں ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے جاری ہوجائیں اور چودہ سو آدمی سیراب ہوجائیں ایک طرف تو یہ۔ اور ایک طرف یہ کہ غزوہ احد میں پتھر پیشانی مبارک پر لگا تو خون مبارک بہہ نکلا، گھوڑے سے آپ گڑھے میں گر پڑے۔ ایک طرف تو عظمت کے تصرفات آسمان تک پہنچے ہوئے

① سبل السلام، کتاب الجنائز، باب النهی عن البناء والتجصیص علی القبور، ج: ۳، ص: ۱۴۸، رقم: ۵۴۳

② السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب زیارة القبور ج: ۵، ص: ۴۱۸، رقم: ۱۷۴۶ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۵ ص: ۴۲ رقم: ۲۰۴۲. ③ کنز العمال، ج: ۱ ص: ۶۲ رقم: ۱۲۳۶۹. علامہ عجلونی فرماتے ہیں کہ ابن الجوزی وغیرہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ لیکن اس حدیث کو موضوع قرار دینا مناسب نہیں دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۴۴. ④ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب قیام الرجل للرجل، ج: ۱۳، ص: ۴۶۶، رقم: ۴۵۵۳.

کہ چاند تک اثر پہنچا اور ایک طرف یہ بے بسی کہ آپ گھوڑے سے گر پڑتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب بخار آتا ہے تو اوروں کو ایک درجے کا آتا ہے، مجھے دوگنا آتا ہے، جتنا اوروں کو چڑھتا ہے، اس سے دوگنا مجھے چڑھتا ہے اور زیادہ قوت کے ساتھ بخار آتا ہے۔ تو ایک طرف یہ بے بسی اور ایک طرف یہ اقتدار کہ اشارہ کریں تو چاند کے دو ٹکڑے ہوجائیں، اشارہ کریں تو سورج ہٹ جائے، زمانے کی حرکت بند ہوجائے، حق تعالیٰ نے یہ چیزیں کیوں رکھیں کہ ایک طرف بے بسی رکھی اور ایک طرف یہ دعویٰ رکھ دیا کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول بھی ہوں۔ یہ اس لئے کہ جب انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر معجزے ظاہر ہوتے ہیں۔ تو لوگ کہیں ان کی خدائی کے قائل نہ ہوجائیں۔ اس لئے بشریت کے لوازم رکھ دیئے تاکہ خدائی کا کوئی اقرار نہ کرے۔ یوں کہیں کہ بندے ہیں۔ تو جہاں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے وہاں یہ بھی کہ گڑھے میں گر پڑے ایک دفعہ شکست بھی ہوگئی۔ بیماری بھی آجاتی تھی۔ علاج کرنا پڑتا تھا۔ یہود نے سحر کرادیا تو آپ سحر سے متاثر ہوگئے۔ غم بھی آجاتا تھا۔ خوشی بھی آجاتی تھی جتنے بشریت کے عوارض اور لوازم ہیں۔ وہ خود آپ پر طاری ہوتے تھے اور یہ اس لئے کئے جاتے تھے کہ آپ کے معجزات دیکھ کر کہیں آپ کو خدا ہی نہ مان لیں۔ یوں سمجھیں کہ آپ بندے ہی ہیں اور یہ خدا کی دی ہوئی بزرگی ہے۔ اس لئے آپ زبانِ مبارک سے بھی تواضع کے کلمات فرماتے، عمل بھی تواضع کا فرماتے۔ حق تعالیٰ آپ سے معاملہ بھی وہی کرتے جو بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ انبیاء علیہم السلام باوجود رسول ہونے کے، باوجود اللہ کے مقرّب بندے ہونے کے ہیں بندے ہی، خدا نہیں ہیں۔ انسان اور بشر ہی، بشر بھی ایسے کہ جو بشریت کے آثار و خواص ہیں، وہ ان پر طاری ہوتے ہیں۔

بہر حال عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مقدس اور زیادہ بزرگ طبقہ اس عالم میں کوئی دوسرا نہیں اور اس میں بھی سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ نے فرمایا: ''اَنَا نَبِيُّ الْاَنْبِيَآءِ'' (الحدیث اخرجہ علی المتقی الھندی، فی کنز العمال، ''وَلَفْظُهٗ: اَنَا سَيِّدُ الْمُرْسَلِيْنَ، '' ''اور نبی امتوں کے نبی ہیں، میں نبیوں کا نبی ہوں''۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا کہ نبی آخر الزماں پر ایمان لاؤ۔ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ ① حق تعالیٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں نبوت دوں اور کتاب دوں۔ اس کے بعد وہ رسول آئیں۔ جن کی تمہیں بشارت دی گئی ہے تو اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی مدد بھی کرنا، اس کی اتباع کرنا اور اس کے ساتھ رہنا۔ گویا انبیاء علیہم السلام سے بھی عہد لیا گیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور ایمان نبی پر لایا جاتا ہے۔ گویا نبیوں کا بھی آپ کو نبی بنایا گیا اور انبیاء علیہم السلام کو ایمان لانے کا مکلف قرار دیا گیا۔ جیسے ہمیں اور آپ کو حکم ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

لائیں۔ انبیاء کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بھی ایمان لائیں اس لئے فرماتے ہیں کہ۔ ''اَنَـا نَبِیُّ الْاَنْبِیَآءِ'' اور نبی امتوں کے لئے نبی ہیں، میں نبیوں کے لئے نبی بنایا گیا ہوں۔ تو اتنی بڑی ذات اقدس کہ انبیاء میں بھی آپ کا اتنا اونچا درجہ کہ خاتم انبیاء بنائے گئے۔ اگر عیاذاً باللہ غرور یا تکبر کرتے، تو آپ کرتے مگر سب سے پہلے زیادہ تواضع فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنے کمالات ہیں وہ اللہ کے ہیں، ادھر سے آتے ہیں۔ انسان کی ذات میں کمال نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے، عمل سے یہ بتلا دیا کہ انسان اپنے کو کورا سمجھے اور اللہ کا شکر مانے کہ اس نے تمہیں کمال دے دیا۔ اس لئے دنیا میں جتنے بھی بڑے گزرے ہیں۔ جتنے بڑے ہوتے گئے، اتنے ہی تواضع میں بڑھتے گئے۔ اتنی خاکساری اور عجز و نیاز برتنے لگے۔ اس لئے کہ ان پر حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ کمال ہمارا نہیں، اللہ کا ہے۔ اور جب آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ کمال دینے والا دیتا ہے۔ لیکن جب لینے پر آتا ہے لے بھی لیتا ہے۔ انسان کے بس میں نہیں کہ روک لے۔ جیسے ایک طرف یوں فرمایا کہ انسان ماں کے پیٹ سے علم و ہنر اور اخلاق لے کر نہیں آتا۔ ہم دیتے ہیں۔

اسی طرح آخری عمر کے بارے میں فرمایا ﴿مَنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا﴾ ① انسان اخیر میں جب اَرذلِ عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے جو عمر بہت ہی گری ہوئی ہے۔ سو یا سو سے زیادہ برس کا ہو گیا تو ایک ایک کر کے اس کا علم کھونا شروع ہو جاتا ہے۔ آج آنکھوں میں فرق آ گیا تو دیکھنے کا علم ختم ہو گیا، دماغ کمزور ہو گیا تو سوچنے سمجھنے کا علم ختم ہو گیا، کانوں کے سننے میں فرق آ گیا تو سننے کا علم ختم ہو گیا۔ نیا علم نہیں آ رہا۔ پرانا علم حافظہ میں محفوظ تھا۔ آج حافظہ کمزور ہو گیا، تو پچھلی معلومات ختم ہو گئیں، اگلی معلومات کا دروازہ بند ہو گیا۔ پچھلی ختم ہو گئیں انسان جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ بتلا دیتے ہیں کہ علم تیری چیز نہیں جب چاہا ہم نے دے دیا، جب چاہا ہم نے چھین لیا۔ پھر ایسا انسان کس طرح سے غرور کر سکتا ہے؟ اگر اس کے پاس علم و کمال آ جائے۔ وہ جانے گا کہ علم و کمال میرا نہیں، میرے مالک کا ہے، میں خزانچی اور امین ہوں۔ خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ یہ مال میرا ہے۔ یہ مال تو مالک کا ہے۔

علم و اخلاق کے حصول کا طریق اول، فیضِ صحبت...... بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذات میں ہنر نہیں ہے اور کچھ محنت کرے گا تو آئے گا۔ اب علم و اخلاق کے آنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ اتنی بات تو واضح ہو گئی حاصل کرنا پڑے گا۔ بلا حاصل کئے نہ علم آئے گا نہ اخلاق پیدا ہوں گے تو پھر اچھے اخلاق پیدا کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ سب سے بہتر طریقہ علم اور اخلاقی کمال حاصل کرنے کا فیض صحبت ہے۔ اہل اللہ اور اکابر دین کی خدمت میں رہ کر ان کی زبان سے جب آدمی سنتا ہے تو علم آدمی کے دل میں اترتا ہے۔ ان کے فیض صحبت سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ حضرات صحابہ کو صحابہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں۔ صحابہ

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۰.

اس طرح علم حاصل نہیں کرتے تھے کہ کوئی کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے رات دن مطالعہ کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے، فیضِ صحبت حاصل کیا۔ فیض صحبت کی برکت سے علماء، عرفاء، کامل، زاہد اور درویش بن گئے۔ علم واخلاق کے سارے کمالات پیدا ہو جاتے تھے۔ اعلیٰ ترین طریق فیض صحبت ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔ ان کے قلب کا اثر انسان کے قلب پر پہنچتا ہے۔ ان کے قلب میں اگر علم ہے تو قلب سے قلب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان کے اندر اگر پاکیزہ اخلاق ہیں تو اخلاق منتقل ہوتے ہیں، قلب پر اثر پڑتا ہے۔ اس واسطے تاکید کی گئی ہے کہ اچھی صحبت حاصل کرو، بری صحبت سے بچو، اچھے ماحول میں رہو، بُرے ماحول سے پرہیز کرو۔ مولانا رومیؒ نے کہا کہ۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند   صحبتِ طالح ترا طالح کند

''نیک صحبت تجھے نیک بنادے گی، بری صحبت تجھے برا بنادے گی''۔ تو صحبت ومعیت کا اثر پڑتا ہے۔ اور انسان تو انسان میں کہتا ہوں کہ ہر چیز کی صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ آپ کپڑوں کے صندوق میں گلاب کے پھول بھر دیں۔ ہفتہ بھر بعد جب نکالیں گے، سارے کپڑوں میں سے گلاب کی خوشبو آئے گی۔ تو کپڑا گلاب نہیں تھا۔ گلاب کے پھول کی صحبت حاصل کی، خوشبو ادھر بھی منتقل ہوگئی اور کپڑوں میں سے وہی خوشبو آنے لگی۔ جو گلاب کے پھول میں سے آتی تھی۔

آپ جب گرم کپڑے کیڑے کے ڈر کی وجہ سے صندوقوں میں بند کرتے ہیں تو کافور کی گولیاں اس میں ڈال دیتے ہیں۔ یا تمباکو ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ کیڑا نہ لگے۔ اب جب سردیوں میں کپڑے نکالیں گے تو کپڑوں میں سے تمباکو کی بو آتی ہوگی۔ حالانکہ خود کپڑا تمباکو نہیں تھا۔ مگر تمباکو کی صحبت میں رہ کر کپڑے نے بھی وہی خوبی پیدا کرلی۔

لوہے کو آپ بھٹی میں ڈال دیں۔ پندرہ منٹ آگ کی صحبت میں رہنے کے بعد جو آپ نکالیں گے تو شکل بھی اس کی آگ جیسی، وہی سرخ رنگت، کام بھی وہی کرے گا۔ جو آگ کرتی ہے۔ اس میں روشنی گرمی بھی ہے۔ اس کا سرخ رنگ ہوگیا۔ جیسے آگ کا ہوتا ہے اگر آپ اس جلتے ہوئے لوہے کو کسی چھپر میں ڈال دیں تو دو منٹ میں سارا گھر پھونک دے گا۔ جو کام آگ کرتی ہے، وہی لوہا کرے گا۔ اسلئے کہ آگ کی صحبت میں رہ کر وہی خوبی اس نے اختیار کرلی۔ بلکہ شکل بھی وہی بنالی جو آگ کی شکل تھی۔

صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ، اکابر اولیاء اللہ اور بڑے کاملین میں سے ہیں۔ دہلی میں ان کا مزار ہے۔ حضرت مجددؒ صاحب کے شیوخ میں سے ہیں۔ ان کے یہاں اتفاق سے مہمان آئے اور شیخ کے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ کئی دن سے فاقہ ہو رہا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ پریشان کہ کس طرح مدارات کروں گھر میں ایک دانہ نہیں، مہمانوں کو کیا کھلاؤں؟ اسی گھبراہٹ میں کبھی گھر میں جاتے ہیں، کبھی باہر آتے ہیں۔ پریشان ہیں کہ کس طرح سے مہمان کو کھلاؤں پلاؤں۔ گھر میں تو ایک دانہ بھی نہیں۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے ایک بھٹیارہ، جو کھانے کی دکان کرتا تھا۔ آج اسے ہوٹل اور ہوٹل مالک کہتے ہیں۔ کل وہ بھٹیاری سرائے اور بھٹیارہ کہلاتا تھا، کھانا پکاتا تھا اور بیچتا تھا۔ وہ بھٹیارہ سمجھ گیا کہ شیخ کے گھر فاقہ ہے اور کھانے پینے کو کچھ ہے نہیں۔ مہمانوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تو فوراً مجلس سے اٹھا۔ اپنی دکان پر گیا اور عمدہ عمدہ کھانے، جو اس کے ہاں پکے ہوئے تھے ان میں سے کھانے لے کر دستر خوان تیار کیا۔ کئی آدمیوں کا اور کئی قسم کا بڑا عمدہ کھانا، سر پر رکھ کر لایا اور ہدیہ کے طور پر پیش کیا۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بے حد خوش ہوئے۔ مہمانوں کو بڑی عزت اور مدارات سے کھانا کھلایا اور خوشی سے چہرہ کھل گیا کہ ''اَلْحَمْدُلِلّٰہ'' میرے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور میں مدارات کر سکا۔ جب مہمان رخصت ہو گئے۔ تو خواجہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جوش میں آ کر بھٹیارے سے فرمایا، تو نے آج مجھے اتنا خوش کیا ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟ جو تو آج مانگے گا، تجھے ملے گا۔

بھٹیارے کی زبان سے یہ نکلا کہ حضرت! مجھے اپنے جیسا بنا دو۔ اب یہ چیز بڑی بھاری تھی کہ بھٹیارہ بعینہ خواجہ باقی باللہ بن جائے، خواجہ باقی باللہ کی استعداد اور صلاحیتیں، اور بھٹیارہ بے چارہ معمولی آدمی۔ نہ اس میں علم کی وہ صلاحیت نہ اخلاق کی استعداد۔ گویا اس نے درخواست اپنے حوصلہ سے بڑھ کر کی۔ یہ کہتا کہ دعا کیجئے مجھے اللہ نیک اور صالح بنا دے، اللہ مجھے جنت دے دے، یہ نہیں۔ بلکہ فرمایا بس اپنے جیسا مجھے بنا دیجئے۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ یہ تو نے اپنے حوصلہ سے بڑھ کر درخواست کی ہے۔ کوئی اور چیز مانگ۔ اس نے کہا نہیں۔ میں تو یہی مانگتا ہوں۔ اب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متامل کہ اس کو آخر میں اپنے جیسا کیسے بنا دوں۔ اور اگر میں کوشش بھی کروں تو اس میں اتنی استعداد کب ہے کہ اتنا علم اٹھا سکے تحمل بھی کر سکے اور ان اخلاقی کمالات کو برداشت کر سکے، جو میرے اندر اللہ نے دیئے ہیں۔ ہر انسان کی صلاحیت الگ ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی استعدادیں اور ہیں۔ جو نبوت کے کمالات برداشت کرتے ہیں۔ امت میں کسی بڑے سے بڑے قطب، غوث اور ولی کی مجال نہیں کہ ان کمالات کی برداشت کر سکے، وہ ولایت کے کمال کا تحمل کریں گے۔ جو ولی نہیں ہے، معمولی عالم ہے، وہ ولایت کے کمالات کا تحمل نہیں کر سکتا۔ عوام الناس میں سے ہے وہ اہل علم کے کمالات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو ہر ایک کی استعداد و صلاحیت الگ ہے۔ اگر پیالہ پاؤ بھر کا ہو، جس میں پاؤ بھر غلہ آ سکے۔ وہ یوں کہے کہ میرے اندر دو مَن بھر دو، کیسے بھر دیں؟ اس کے اندر کب صلاحیت ہے اتنا بھر دینے کی؟ تو بھٹیارے کا یہی قصہ تھا کہ استعداد تو پاؤ بھر کی بھی نہیں تھی اور مانگ لیا اس نے کہ دس من میرے اندر بھر دو۔ اب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے اندر کیسے بھر دیں؟

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پھر فرمایا، تو نے اپنی ہمت سے بڑھ کر درخواست کی ہے تیرے اندر تحمل اور قوت نہیں ہے۔ اتنی بات مانگ جتنی تو برداشت کر سکے۔ اس نے کہا نہیں، اب تو میری زبان سے نکل گیا۔

اب تو مجھے اپنے ہی جیسا بنا لو۔ اب پھر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متامل ہوئے۔ فرمایا، اچھا اللہ کے نام پر۔ فرمایا، اُٹھ میرے ساتھ، اسے اپنی کوٹھڑی میں لے گئے۔ اندر سے دروازہ بند کیا اور بیٹھ کر اس کے اوپر توجہ ڈالنی شروع کی، اس کی روح میں تصرف کرنا شروع کیا۔ اس درجہ تصرف کیا اور اس درجہ اس کی روح کے اندر نسبت و کمالات کو بھرنا شروع کیا کہ وہ ساری چیزیں بھر دیں جو اپنے اندر تھیں۔ اور کیفیت یہ ہوئی کہ بھٹیارے کی شکل بھی ویسی بن گئی۔ جیسی حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ اب جب کوٹھڑی سے باہر نکلے تو دو خواجہ باقی باللہ آ رہے ہیں۔ ایک اس طرف، ایک اس طرف شکل بھی وہی، صورت و رنگ بھی وہی۔ اپنی استعداد و صلاحیت سے اس طرح اس کے باطن کو بھرا کہ اس کی ظاہری شکل بھی ویسی بن گئی۔ لوگوں نے پہچانا کس طرح سے؟ ایک خواجہ باقی باللہ تو بڑی قوت اور متانت سے آ رہے تھے اور ایک خواجہ باقی باللہ اس طرح کہ پیر لڑھک رہے ہیں، بدن لرز رہا ہے، جیسے بوجھ ہے برداشت نہیں ہوتا۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ یہ بھٹیارہ ہے۔ جس کی صورت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بن گئی۔ تین یا چار دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ بے چارہ برداشت نہیں کر سکا تو

آرزومی خواہ ولے دباند ازہ خواہ

آرزو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر اتنی آرزو کرو، جتنی آدمی برداشت کر سکے، جتنی اندر صلاحیت ہو۔ میں نے کس وجہ سے یہ واقعہ ذکر کیا؟ اس لئے کہ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دس منٹ صحبت اٹھائی، دوسرا باقی باللہ بن گیا۔ تو صحبت کا اثر پڑتا ہے اچھے آدمی کی صحبت سے قلوب کے اندر اچھائیاں پیوست ہوتی ہیں۔ اس سے انسان میں صلاحیتیں بڑھتی ہیں۔ کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ تو حضرات صحابہ کو جو کمالات حاصل ہوئے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے حاصل ہوئے۔

فیض صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے ہیں...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر نظر کی جائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار ہا معجزات ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزوں سے الگ معجزے ظاہر ہوئے۔ چاند سورج پر الگ معجزات ظاہر ہوئے اور دنیا کی ہر چیز پر آپ کے معجزات نمایاں ہوئے۔ پتھروں نے آپ کی نبوت کی شہادت دی اور بول پڑے۔

حدیث میں ہے کہ آپ کو استنجا کی ضرورت پیش آئی ریگستان تھا۔ میلوں تک کوئی آڑ نہیں تھی۔ کوئی صورت نہیں تھی کہ بیٹھ سکیں۔ میل بھر پر ایک اور دوسرے میل پر ایک درخت تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر ادھر اشارہ فرمایا۔ دونوں درخت دوڑتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ دو میل کی مسافت طے کر کے آئے اور آ کر اس طرح کھڑے ہوئے کہ اپنی شاخیں پھیلا دیں۔ جیسے خیمہ اور پردہ بن گیا استنجا فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ چلے جاؤ وہ درخت اپنی جگہ چلے گئے تو درختوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔ جانوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا روتا ہوا آیا۔ آنکھوں میں اس کے آنسو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آ کر سر ڈال دیا اور بلبلا رہا ہے۔ آنکھوں سے پانی جاری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے مالک کو بلاؤ۔ مالک حاضر ہوا۔ فرمایا، یہ شکایت لے کر آیا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ اس کے اوپر بوجھ لادتا ہے۔ تجھے غیرت نہیں آتی؟ تیرا ذریعہ معاش یہ ہے، تیری کمائی اس کے ذریعے ہے۔ پھر اس پر رحم نہیں کھاتا؟ واقعہ سچا نکلا۔ اس نے توبہ کی کہ یا رسول اللہ! آئندہ میں ظلم نہیں کروں گا، اس کا حق پہچانوں گا، اسے غذا دوں گا، اتنا ہی بوجھ لادوں گا جتنی اس میں طاقت ہے۔ تو جانور آ کے شکایتیں کرتے ہیں۔ حضور فیصلے فرماتے ہیں تو یہ معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اسی طرح پتھروں نے بھی آپ کی نبوت کی شہادت دی۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ساری مجلس والوں نے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں صِدّیق اِکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیں۔ تسبیح جاری رہی، پھر انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو دے دیں پھر تسبیح جاری رہی، پھر انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں دے دیں تو تسبیح بند ہوگئی۔ بہر حال یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا کہ کنکریوں سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔

تو چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، پتھروں کا شہادت دینا، درختوں کا دوڑ کے چلے آنا، انگشتان مبارک (انگلیوں) سے پانی کے چشمے بہہ پڑنا، یہ عظیم معجزات ہیں جو نمایاں ہوئے۔ لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ یہ سارے معجزات ایک طرف اور یہ ایک معجزہ ایک طرف کہ ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہم آپ کا ایک مستقل معجزہ ہے کیوں؟ اس واسطے کہ پتھر کو موم بنا دینا آسان ہے۔ لوہے کو نرم کر دینا آسان، لیکن انسان کی روح میں انقلاب پیدا کر دینا، یہ بڑا مشکل ہے۔ انسان کو انسان بنا کر اس کے دل کو پھیر دینا یہ بڑا مشکل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں یہ ہے کہ ایک شخص مجلس مبارک میں آتا ہے، وہ کافر بھی ہے مشرک بھی ہے۔ بدعقیدہ بھی ہے اور بدعمل بھی ہے۔ ساری خرابیاں اسی میں ہیں۔ لیکن جونہی دستِ مبارک پر بیعت کر کے واپس ہوتا ہے تو اس حالت میں واپس ہوتا ہے کہ عالم بھی ہے۔ عارف بھی ہے، کامل بھی ہے، زاہد بھی ہے، عابد بھی ہے اور متقی بھی ہے۔ ایک دم دل کے اندر انقلاب پیدا ہوگیا تو پتھروں میں انقلاب آسان ہے۔ مگر انسان میں انقلاب پیدا کرنا بڑا مشکل ہے تو ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مستقل معجزہ ہے یہ اعجاز کیسے ظاہر ہوا؟ یہ فیض صحبت کی ہی برکت تھی۔ آپ کی صحبت مبارک میں منٹوں میں وہ تاثیر ہوتی تھی کہ دوسری جگہ برسوں میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیعت کرتے ہی ہر شخص کامل ہو جاتا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس حالت میں آئے کہ شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ لیکن آ کر جونہی دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اسلام قبول کیا۔ تو یہ وہ زمانہ تھا کہ چھپ کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ کل تیرہ آدمی مسلمان تھے۔ دارِ ارقم میں

اندر سے زنجیر بند کر کے نماز پڑھتے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پہنچے، بیعت کی، اسلام قبول کیا۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ فرمایا کیوں نہیں ہیں؟ عرض کیا پھر چھپ کر نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ پر ہمیں بھروسہ کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا چلو، آگے آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پیچھے پیچھے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہیں۔ مسجد حرام میں پہنچے۔ مشرکین کی مجلسیں جمی ہوئی تھیں۔ اعلان سے کہا کہ جو جانتا ہے، وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ اب جان لے میں عمر ہوں اور میں کلمہ پڑھ کر آیا ہوں ''اَشْھَدُاَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَاَشْھَدُاَنَّ مُـحَـمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ① یہ کہنا تھا کہ تمام مشرکین مارنے پیٹنے پر پل پڑے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی آستینیں کھینچی، مار پٹائی سب کچھ ہوئی، لڑائی بھی ہوئی۔ مگر اللہ پر بھروسہ ایک منٹ میں اتنا پیدا ہو گیا کہ یا کفر میں پڑے ہوئے تھے یا ایک دم ایمان میں بڑھ گئے۔ یہ فیضِ صحبت ہی کا اثر تھا۔ بہر حال نبوت کی صحبت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بنے اور صحابہ کے بارے میں اہل السنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اس امت میں صحابہؓ سے بڑھ کر کوئی مقدس نہیں۔ کوئی ولی قطب بن جائے، غوث بن جائے۔ مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ کی جو شان ہے، وہ کسی کی نہیں بن سکتی۔ وہ اس وجہ سے کہ انہوں نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ دوسروں کو یہ شرف میسر نہیں ہے۔ تو سب سے بڑی بنیادی چیز جس سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ وہ فیضِ صحبت ہے۔ اگر ہمیں اپنے اخلاق اور اپنا علم صحیح کرنا ہو تو جو نیک اور صالح لوگ ہیں۔ ان کے پاس بیٹھنا چاہئے چاہے کچھ بولیں یا نہ بولیں۔ لیکن پاس بیٹھنے سے ہی ایک اچھا اثر پیدا ہوتا ہے۔

بے شعور اشیاء کی صحبت ...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی اور بری صحبت کی مثال دی ہے فرمایا، نیک صحبت کی مثال تو عطار کی دُکان جیسی ہے۔ عطر بیچنے والے کی دکان پر جب آپ بیٹھیں گے، چاہے عطر نہ بھی خریدیں۔ کم از کم دماغ میں ہی خوشبو آ جائے گی۔ دماغ تو معطر ہو ہی جائے گا، کپڑوں میں خوشبو کی ہوا بھرے گی۔ گھر پہنچیں گے تو گھر والے کہیں گے۔ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ اور کچھ نہیں تو بدن کو ہی خوشبو لگ جائے گی، ناک میں ہی پہنچ جائے گی اور اگر کہیں عطر خرید ہی لیا اور مل لیا، پھر تو سبحان اللہ۔ مگر عطار کی دوکان پر محض جانے سے کم از کم دماغ تو معطر ہو ہی جاتا ہے۔ ②

اور بری صحبت کی مثال ایسی فرمائی کہ جیسے لوہار کی دوکان کہ بعض دفعہ لوہا گرم ہوتا ہے۔ کٹتا ہے تو اور کچھ نہیں تو تھوڑی سی کالک ہی کپڑے کو لگ جائے گی، لوہا جلنے کی تھوڑی سی بدبو ناک کے اندر آ جائے گی۔ ③ غرض آدمی کوئی نہ کوئی کدورت دماغ میں لے کر آئے گا۔ کوئی نہ کوئی کالک اور سیاہی کپڑے کو لگا آئے گا۔ بری صحبت کی

---

① المطالب العالية، كتاب السير والمغازي، باب اسلام عمر، ج: ۱۲، ص: ۱۵۸، رقم: ۴۳۴۴.

② ③ السنن لابی داؤد، كتاب الادب، باب مايومران يجالس...... ج: ۱۲ ص: ۴۵۷ رقم: ۴۱۹۱. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۳۲۹ رقم: ۴۸۲۹.

مثال یہی ہے کہ برے کے پاس بیٹھ کر یا تو برا بنے گا، برا نہیں بنے گا تو کم سے کم برائی کی برائی دل سے نکل جائے گی۔کل کو برائی پر آمادہ ہو جائے گا۔ نیکوں کے پاس اگر بیٹھے گا، اگر دیندار نہیں بنے گا، تو کم سے کم دین کی محبت تو پیدا ہو ہی جائے گی محبت نہ بھی پیدا ہو، کوئی کلمہ سن کے دل کی برائی ہی جاتی رہے گی تو راستہ درست ہو جائے گا۔ جیسے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

''اللہ کے کسی ولی، مقبول اور دوست کے پاس ایک گھڑی بیٹھنا، یہ سو برس کی عبادت سے بہتر ہے''۔ اس لئے کہ ایک گھڑی بیٹھنے سے بعض دفعہ دل کی گرہیں ایسی کھل جاتی ہیں کہ سو برس کی عبادت کا راستہ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ جو دل میں گنجلک پڑی ہوئی ہوتی ہے، وہ نکل جاتی ہے تو فائدہ سے خالی نہیں ہوتا اس واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی۔ مثل مشہور ہے کہ ''خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے''۔ ہر چیز اپنا اثر کرتی ہے۔ آپ روز دریا کے کنارے دو چار گھنٹے جا کر بیٹھیں مزاج میں رطوبت پیدا ہو جائے گی، نرمی آ جائے گی، تری آ جائے گی۔ اس لئے کہ پانی کی صحبت اختیار کی۔ آپ آگ کے پاس بیٹھیں مہینہ بھر سینکتے رہیں۔ مزاج میں جھنجھلاہٹ اور گرمی پیدا ہو جائے گی۔ آپ مٹی پر بیٹھیں، یبوست اور خشکی پیدا ہو جائے گی۔ مٹی کا اثر ہی یہ ہے۔

جب یہ ساری چیزیں جو بے شعور اور بے جان کہلاتی ہیں۔ یہ بھی اثر کرتی ہیں۔ کسی جاندار کے پاس بیٹھیں گے تو اس کا اثر کیوں نہیں ہوگا؟ اور ایماندار کے پاس بیٹھیں یا کسی فاسق و فاجر کے پاس بیٹھیں۔ آپ کے اندر وہی جذبات پیدا کر دے گا۔ جو اس کے اندر تھے .تو اصل چیز اخلاق درست کرنے کی یہ ہے کہ صحبت صالح اختیار کی جائے کہ ان کے پاکیزہ اخلاق کا اثر آپ کے قلب پر پڑے گا چند دن کے بعد آپ کو فرق محسوس ہوگا کہ اخلاق کچھ صحیح ہونے لگے۔ دل کا راستہ بدل جائے گا۔ دل ادھر ہی کو چل پڑے گا، جدھر کو اس صالح اور نیک آدمی کا چل رہا ہے۔ اس لئے سب سے اعلیٰ طریقہ علم و معرفت اور اخلاق حاصل کرنے کا اہل اللہ، اہل دل اور سچوں کی صحبت ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں امر فرمایا گیا ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ① اے ایمان والو! اللہ کے سے ڈرو اور سچوں کی معیّت اختیار کرو۔ یعنی ڈر تمہارے دل میں قائم نہیں رہے گا۔ جب تک ڈرنے والوں کی معیّت نہ اختیار کرو۔ ان کے پاس بیٹھو تو ڈر دل میں اثر کر جائے۔ تقویٰ دل کے اندر اثر کر جائے گا۔

دین اہل اللہ کی صحبت سے پیدا ہوتا ہے...... اصل یہی ہے کہ دین محض کتابوں کے ورقوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ اہل اللہ کے دلوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کتابیں کوئی لاکھ پڑھ لے۔ صحبت نہ ملے، دین اثر نہیں کرے گا۔ قلب کے اندر رنگ نہیں پیدا ہوگا۔ محض کتاب یا کاغذ سے مراد نہیں، اہل دل کے پاس بیٹھ کر دل میں اثر پیدا ہوگا۔ لسان العصر اکبر الٰہ آبادی یوپی کا بڑا شاعر گزرا ہے۔ اس نے کہا ہے۔ وہ اکثر علی گڑھ کالج کے لڑکوں سے خطاب کیا کرتا

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹.

تھا۔ جو چوٹیں ہوتی تھیں۔ ان پر طعن بھی کرتا تھا۔ ساتھ میں انہیں سمجھاتا بھی تھا۔ تو کالج کے لڑکوں سے اس نے خطاب کر کے کہا کہ۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا ‏ ‏ ‏ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل اللہ کی نظر پڑتی ہے، دین آنا شروع ہو جاتا ہے۔ نہ کتاب سے آتا ہے نہ مدرسے کے دروازوں سے اہل دل کے دل سے آتا ہے۔

از دل خیزد بردل ریزد

دل سے بات اٹھتی ہے تو دل ہی سے جا کے ٹکراتی ہے۔ اس واسطے اعلیٰ ترین طریقہ دین اور دینی اخلاق حاصل کرنے کا وہ فیضِ صحبت ہے خواہ علماء ربانی کی صحبت میسر ہو یا کوئی حقانی درویش اور اہل اللہ میں سے ہو۔ اس کی صحبت میسّر ہو وہ بھی نہ ہو، تو کسی نیک آدمی ہی کی صحبت میسّر ہو۔ عوام میں بھی نیک ہوتے ہیں، تاجروں میں ہوتے ہیں۔ ہر طبقے میں اللہ کے نیک بندے ضرور ہوتے ہیں۔ آدمی چھانٹ لے کہ یہ مقبول ہے اور مقبولیت اعمال سے معلوم ہو جاتی ہے، بلکہ صورت سے نظر پڑتی ہے کہ یہ آدمی مقبول ہے۔ اس کے چہرے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا، مگر دل سے پڑھ لیتا ہے کہ یہ کوئی اللہ والا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ایمان کی نرمائی، ایک بھول پن، ایک سادگی، اللہ پر بھروسہ اور توکل ہوتا ہے، نہ چالاکی اور عیاری برستی ہے، بلکہ سچائی برستی ہے۔

جیسے فرمایا گیا: ’’اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ کَرِیْمٌ وَالْمُنَافِقُ خَبٌّ لَئِیْمٌ‘‘ (۱) مومن کی شان یہ ہے کہ وہ بھولا بھالا، سیدھا، سچا ہوتا ہے۔ بھولے پن کے معنی یہ کہ عیاری، مکاری، چالاکی نہیں سیدھی سیدھی بات ہے اور ایک بے وقوفی ہے یہ اور چیز ہے۔ مومن بے وقوف نہیں ہوا کرتا جس درجے کا ایمان ہوگا۔ اس درجے کی عقل مندی بھی اس کے اندر ہوگی۔ ہاں ایمان ہی کمزور ہو، عقل بھی کمزور ہوگی۔ ایمان قوی ہے تو عقل بھی قوی ہوگی۔ ان کے چہروں پر بھول پن ہوتا ہے۔ یعنی فریب کاری نہیں ہوتی۔ سیدھی سیدھی جو دل میں ہے، وہی زبان پر، جو زبان پر ہے وہ دل میں۔ تو چہرہ مہرہ بتلا دیتا ہے کہ یہ آدمی سچا ہے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہندوستان میں آئے ہیں۔ تو اول سندھ میں داخل ہوئے ہیں۔ سندھ کے راستے سے پنجاب پھر پنجاب کے راستے سے ہندوستان پہنچے ہیں۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم سندھ کے بازاروں سے گزرے۔ تو ہزاروں آدمیوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا ہے اور کہا کہ یہ جھوٹوں کے چہرے نہیں۔ ان چہروں پر سچائی برستی ہے۔ ان کے چہرے دلیل ہیں کہ ضرور اسلام حق ہے۔ اسلام ان کے چہروں پر برستا ہے۔ ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے زبردست محدث، عالم، عارف باللہ تھے۔ ان کے چہرے پر نورانیت برستی تھی۔ مظفر نگر میں مسلمانوں کا آریوں سے مناظرہ ہوا۔

---

(۱) السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب العشرة، ج: ۱۲، ص: ۴۱۱، رقم: ۴۱۵۸.

ادھر ہندو آریہ تھے، ادھر مسلمان تھے، تو اسٹیج پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، مناظرہ نہیں فرمایا۔ مناظرہ دوسرے علماء کر رہے تھے۔ مگر صدر کی حیثیت سے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تشریف رکھتے تھے۔ تو آریہ مناظر نے کہا کہ۔ اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جا سکتا تھا۔ تو میں اس شخص کا چہرہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیتا۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا ہے، اس کے چہرے پر ایمان کھل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس شخص کا دل، ایمان وعلم اور کمال سے بھرا ہوا ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور　　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

مرد حقانی کی حقانیت چہرے پر آ جاتی ہیں۔ یہ چہرہ اصل میں چغل خور ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے، چہرہ چغلی کھا دیتا ہے کہ یہ چیز دل میں بھری ہوئی ہے۔ اگر بدنیتی بھری ہوئی ہے، چہرے پر برستا ہے کہ یہ آدمی اچھا نہیں اور سچائی بھری ہوئی ہے تو چہرہ بول دیتا ہے کہ یہ سچا مادی کیفیات ہوں یا روحانی چہرے پر برسنے لگتی ہیں۔ اگر کسی کے دل میں خوف بھرا ہوا ہے تو چہرے پر ایک زردی اور پریشانی ظاہر ہوگی۔ دیکھتے ہی آپ کہیں گے کہ بھئی! تم ڈر رہے ہو؟ حالانکہ ڈر چہرے میں نہیں۔ ڈر دل کے اندر ہے مگر دل کے اثرات چہرے پر آتے ہیں۔ چہرہ آئینہ ہے۔ دل کی چیز چہرے پر کھل جاتی ہے۔ اگر آپ کے دل میں خوشی بھری ہوئی ہے، کسی تقریب سے مسرت ہے۔ چہرہ خوشی سے دمکتا ہوا ہوگا لوگ دیکھ کے کہیں گے کہ بھئی! بڑے خوش نظر آ رہے ہو، کیا بات پیش آئی حالانکہ خوشی تو دل میں بھر رہی ہے۔ مگر چہرہ چغلی کھا دیتا ہے کہ دل میں خوشی ہے۔ اگر دل میں غمی ہے چہرہ اداس پریشان ہوگا۔ لوگ کہیں گے کہ بھئی کیا بات ہے، کیوں پریشان ہو؟ حالانکہ پریشانی دل میں ہے، چہرے میں تھوڑا ہی ہے۔ مگر چہرہ آئینہ ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی اوپر آ جاتا ہے۔ جب قلب میں نور ایمان چمکتا ہے۔ تو اس کی چمک دمک چہرے کے اوپر نمایاں ہوتی ہے۔ کفر اندر بھرتا ہے تو چہرے پر فساد اور سخت دلی نمایاں ہوتی ہے۔ تو ایمان کا نور چہرے پر آتا ہے۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور　　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

آدمی فوراً پہچان لیتا ہے۔ بہر حال "اَلظَّاهِرُ عُنْوَانُ الْبَاطِنِ" "ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے"۔ جو باطن میں چھپا ہوا ہوتا ہے وہ ظاہر کھول دیتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے چہروں پر نور ایمان برس رہا تھا تو ہزاروں آدمی ان کے چہرے دیکھ کر مسلمان ہو گئے کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، یہ خبر سن کے عرب میں آئے کہ کوئی نبی پیدا ہوئے ہیں۔ چونکہ پچھلی کتابیں پڑھی تھیں۔ دنیا کو انتظار لگا ہوا تھا کہ اس زمانے میں کوئی نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ وہ علامتیں جو اس نبی کی ہیں، پائی جا رہی ہیں۔ تو جب دعویٰ نبوت سنا۔ یہ فوراً گئے کہ میں جا کر دیکھوں۔ آپ صحابہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی یہ پاس نہیں پہنچے، تو اچانک دور سے چہرہ مبارک پر نظر پڑی، تو چلا کر کہا کہ:

''وَاللّٰہِ لَیْسَ ھٰذَا الْوَجْہُ وَجْہُ الْکَذَّابِ'' '' خدا کی قسم یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے''۔ چہرہ خود بتلا رہا ہے کہ اس کے اوپر سچائی برس رہی ہے۔ اس کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ اس کے قلب کے اندر نورِ نبوت بھرا ہوا ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صحبت سے وہ قلبی نور منتقل ہوتا ہے جو دوسروں کے قلب کے اندر ہے۔ اس لئے دین میں کمال پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ اہل اللہ، اکابرِ دین کی صحبت ہے کہ کتاب سے وہ چیز حاصل نہیں ہوگی، جو قلوب سے حاصل ہوگی۔ بلکہ کتاب کا مضمون بھی آپ سمجھیں گے تو شخصیتوں کی بدولت سمجھیں گے۔ اگر معلّم اور مربّی کتاب کا مطلب نہ سمجھائیں، وہ مطلب آپ کا اپنا مطلب ہوگا، کتاب والے کا مطلب نہیں ہوگا، خدا کا مطلب نہیں ہوگا، کتاب والے کا مطلب تب سمجھیں گے، جب کتاب والا خود بتلائے یا کسی کو بتلا کر بھیجے تو اللہ نے اپنی کتاب کا مطلب اپنے رسول کو سمجھایا، رسول نے اپنی صحبت سے صحابہ کو سمجھایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی صحبت سے اپنے شاگردوں کو سمجھایا۔ محض کتاب سے کام نہیں چلا، جب تک مربّیوں کی شخصیت سامنے نہ ہوئی۔ ان کی صحبت حاصل نہ ہوئی۔ تو بڑا ذریعہ فیضِ صحبت ہے۔ جس سے دین اور دینی اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

علم واخلاق کے حصول کا دوسرا طریق، مواخاۃ فی اللہ...... اس لئے بڑی چیز فیض صحبت ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب ہم ایک ایسی بستی میں ہیں۔ وہاں ہمیں کوئی اچھا آدمی نظر نہیں پڑتا۔ جس کی صحبت میں بیٹھا کریں نہ ہماری بستی میں کوئی عالم ہے، نہ کوئی درویش ہے اور ویسے ہی اچھے تو خود ہم بھی اچھے ہی ہیں۔ ہم کس کے پاس جائیں؟ اتنے اچھے ہم بھی ہیں۔ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جس کی صحبت اٹھائیں کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ کیا ہمارے اخلاق درست نہیں ہوں گے؟ اس لئے کہ آپ نے بتلایا کہ دین، علم اور اخلاق کے کمال کے لئے صحبت اصل چیز ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے کہ ہم اس کے فیض صحبت سے دین واخلاق حاصل کرلیں تو ہماری اصلاح کی کوئی صورت نہیں رہی۔ کیا ہمیں مایوس ہوجانا چاہئے؟ میں اس کے لئے عرض کرتا ہوں کہ نہیں آپ کے لئے ایک دوسرا راستہ ہے۔ اگر نیک صحبت میسّر نہ ہو، پھر ایک اور تدبیر ہے۔ جس سے آپ اپنے دین میں کمال پیدا کرلیں۔ اخلاق درست کرلیں اور سیدھے راستے پر پڑ جائیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ کسی ایک آدمی سے دوستی پیدا کرلیں۔ اور دوستی اللہ کے لئے پیدا کریں معاہدہ یہ ہو کہ ہم اس لئے دوستی کر رہے ہیں کہ میں تمہارے دین کی حفاظت کروں گا، تم میرے دین کی حفاظت کرنا۔ اگر میں نماز میں سستی کروں کان سے پکڑ کر گھسیٹ کر مسجد کے اندر لے جانا اور تم نے اگر سستی کی، میں لے جاؤں گا۔ تم اگر برے راستہ پر گئے میں زبردستی ہٹاؤں گا۔ اگر میں چلوں تو تم ہٹانا۔ ہم اس لئے آپس میں دوستی کرتے ہیں کہ اس دوستی کی وجہ سے ایک دوسرے کے دین کی حفاظت ہوجائے۔

آپ اندازہ کیجئے کہ اگر آپ نے کسی ایک شخص سے دوستی کرلی اور اس میں روک ٹوک شروع ہوئی اور روک ٹوک دوسرا ہی کرسکتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ اپنا عیب انسان کو نظر نہیں آتا۔ دوسرا فوراً پرکھ لیتا ہے کہ یہ عیب

کی بات ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر ہو کے نظر پڑتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر بھی آدمی تنکا نہیں سمجھتا''۔ اپنی برائی کو آدمی خود محسوس نہیں کرتا۔ دوسرا فوراً سمجھ لیتا ہے یہ برائی ہے۔ اپنے ساتھ آدمی کو بڑا حسنِ ظن ہوتا ہے کہ میں تو اچھا ہوں۔ میرے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس حسنِ ظن سے جب دیکھتا ہے اپنی ہر حرکت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کوئی برائی کی۔ دوسرے کو اتنا حسن ظن ہوتا نہیں اس واسطے وہ نگاہ رکھتا ہے۔ پھر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ برائی ہے اور ہے وہ دوست، تو فوراً ٹوکے گا کہ بھئی! اس برائی کو چھوڑ دو۔ اس دوستی کو شریعت کی اصطلاح میں مواخات کہتے ہیں۔ یعنی دین کی خاطر بھائی چارہ قائم کرنا۔ کہ بھئی! جب میں کسی اچھی جگہ جاؤں گا، تمہیں ساتھ لے جاؤں گا، تم کہیں جاؤ تو مجھے ساتھ لے جانا تم برائی کرو، تو میں روک دوں گا۔ میں برائی کروں تو تم مجھے روک دینا۔ غرض ایک دوسرے کے دین کے حفاظت کریں گے۔ اس لئے بھائی بندی اور دوستی اختیار کرتے ہیں۔ اس کو مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔

یہ اصول خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آپ تشریف لائے۔ تو ایک مہاجر اور ایک انصاری کو ملا کر دونوں میں آپ نے بھائی چارہ قائم کیا۔ جتنے تھے سب کو جوڑا جوڑا بنا دیا۔ یہ تمہارا دینی بھائی، یہ تمہارا دینی بھائی۔ اخیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، رہ گئے انصار کی تعداد ختم ہوگئی۔ سب مہاجرین کا بھائی چارہ قائم ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نمبر آیا تو اب کوئی انصاری باقی نہیں تھا کہ ان کی بھائی بندی کسی سے کرائی جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کچھ آزردگی پیدا ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَنَا اَخُوْکَ فِی اللّٰہِ" ① تیرا دینی بھائی میں بنتا ہوں اور میرے ساتھ معاہدہ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ خوش ہوگئے۔ اس سے بہتر کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھائی بنیں۔ بہر حال اس کو مواخات فی اللہ یعنی اللہ کے لئے بھائی بندی قائم کرنا کہتے ہیں۔ اس طرح سے اگر آپ بھائی بندی اختیار کریں تو چالیس دن میں پتہ چلے گا کہ کتنی برائیاں دور ہوگئی ہیں۔ اس واسطے کہ وہ دوست آپ کی برائیاں دیکھ دیکھ کر آپ کو مطلع کرے گا۔ آپ متنبہ ہوں گے۔ بہت سی برائیوں کی اصلاح ہو جائے گی بہت سے برے اخلاق چھوٹ جائیں گے، اس کے بھی چھوٹ جائیں گے، آپ کے بھی چھوٹ جائیں گے۔ تو بھائی بندی کے اصول سے آپ نے وہ چیز کمالی۔ جو کسی شیخ وقت سے کماتے، کسی عالم ربّانی کی صحبت سے کماتے یا کسی درویش ربانی کی صحبت میں بیٹھ کر کماتے۔ اب یہ عذر باقی نہیں ہے کہ صاحب! میری بستی میں نہ کوئی عالم ہے نہ درویش نہ سچے لوگوں لوگوں میں سے کوئی ہے، میرے اخلاق درست نہیں ہو سکتے تو دوسرا طریقہ مواخات کا ہے۔ اس کے ذریعے اپنے اخلاق درست کریں۔ اس اصول پر چل کر چالیس دن کے بعد فرق محسوس کریں گے۔ اگر اسی طرح برس دن گزر جائیں۔ اس وقت تک آپ ولی بن جائیں گے۔ اس لئے اصل چیز فیض صحبت ہے۔ دوسرے درجے کی چیز مواخات ہے۔

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب علی رضی اللہ تعالی عنہ، ج: ۱۲ ص: ۱۸۳ رقم: ۳۶۵۴.

علم واخلاق کے حصول کا تیسرا طریق، اِتّعاظ بالغیر...... لیکن اگر آپ پھر کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی بستی میں ہوں جہاں کوئی اچھا آدمی نہیں کہ میں اسے دوست بناؤں۔ سب برے ہی برے پھر رہے ہیں۔ یہ عقل سے تو بعید ہے کہ کوئی ایسی بستی ہو جس میں کوئی بھی اچھا آدمی نہ ہو۔ یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ جہاں مسلمانوں کا مجمع ہو گا سو پچاس ہوں گے۔ تو علماء یہ لکھتے ہیں کہ چالیس آدمی جمع ہو جائیں ان میں کوئی نہ کوئی مقبول الٰہی ضرور ہوتا ہے۔ تو ایک بستی کی بستی ہو اور کوئی اللہ کا مقبول نہ ہو یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرتا ہوں کہ بستی کے اندر کوئی بھلا آدمی نہیں اور دوست ہونے کے بجائے سارے آپ کے دشمن ہی دشمن پھر رہے ہیں، بدخواہ ہی بدخواہ ہیں کوئی بھی نیک انسان نہیں۔ میں کس سے بھائی چارہ قائم کروں؟

میں اس کے لئے ایک تیسری تدبیر بتلاتا ہوں کہ آپ ان دشمنوں سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ کیسے؟ اس کو اِتّعاظ بالغیر کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں سے عبرت پکڑ کر اپنی حالت کو درست کرنا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کی ٹوہ لگائیں۔ کہ آپ کے دشمن آپ کے حق میں کیا کہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ دشمن آپ کی بھلائیاں تو پھیلانے سے رہے۔ وہ تو چھانٹ چھانٹ کے آپ کی برائیوں کو شہرت دیں گے۔ فلانے میں یہ کھوٹ ہے، یہ برائی ہے۔ اگر آپ کی بھلائیاں شائع کرنے لگیں، وہ دشمن ہی کیا ہوئے۔ وہ تو آپ کے دوست ہوئے۔ مگر دشمن کا کام یہی ہے کہ برائیاں چُن چُن کر پھیلائے، بدنام کرنے کی کوشش کرے، رسوا کرے، آپ اس دشمن سے شیخ وقت کا کام لیں۔ وہ یہ کہ آپ یہ سنیں کہ میرے دشمن کیا کہتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے جائیں آپ اسے چھوڑتے جائیں۔ جتنی برائیاں وہ بیان کریں، آپ اسے ایک ایک کر کے چھوڑ دیں۔ چالیس دن تک آپ عمل کر کے دیکھیں۔ بیسیوں برائیاں آپ میں سے ختم ہو جائیں گی۔ تو دشمن سے آپ نے وہ کام لے لیا، جو شیخ وقت سے لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کام لینا چاہیں، دشمن سے بھی لے سکتے ہیں۔ تو پہلی چیز فیض صحبت، دوسری مواخات فی اللہ اور تیسری اِتّعاظ بالغیر ہے کہ غیر سے نصیحت حاصل کرنا۔ تو دشمن سے آپ نے شیخ وقت کا کام لے لیا۔ اس لئے اگر کوئی اپنے دین کو درست بنانا چاہے تو راستہ کہیں رُکا ہوا نہیں ہے۔

علم واخلاق کے حصول کا چوتھا طریق، محاسبۂ نفس...... اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی جگہ ہوں کہ جہاں نہ کوئی عالم و عارف نہ کوئی دوست، نہ دشمن گویا یہ بعید بات ہے کہ دوست نہ ہو۔ لیکن دشمن بیسیوں مِل جاتے ہیں۔ دشمن تو ٹکے سیر ملتے ہیں اور دوست سینکڑوں روپے سیر بھی نہیں ملتا۔ بلکہ ٹکے سیر بھی زیادہ قیمت ہے۔ دشمن تو مفت بھی مل جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ آدمی پڑھا نہ لکھا تو جہالت کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ دشمنیاں ہی کرے گا۔ دوست علم واخلاق سکھاتے ہیں۔ جب علم واخلاق حاصل نہ کئے تو آدمی دنیا میں دشمنی اور حسد ہی کرتا پھرے گا۔ برائی چاہے گا، بھلائی نہیں چاہے گا۔ اگر آپ یوں کہتے ہیں کہ میں بالکل تن تنہا ہوں۔ میرے اخلاق کی درستگی کا کوئی طریقہ نہیں۔ اس لئے کہ سفر کر کے یوں نہیں جا سکتا کہ میرے پاس پیسہ نہیں۔ گھر میں

میرے پاس کوئی عالم اور درویش نہیں۔ اپنے ماحول میں میرا کوئی دوست اور دشمن نہیں۔ میرے لئے اب تحصیل علم واخلاق اور کمال پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تو میں چوتھی تدبیر بتلاتا ہوں کہ آپ اس کے باوجود بھی اپنے اخلاق درست کرلیں۔ اور وہ بھی صحیح طریقہ ہے، فرضی نہیں ہے۔ اس طریقہ کا نام محاسبہ نفس ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ آپ عشاء کی نماز کے بعد دس منٹ مقرر کرلیں اور اس میں یہ سوچیں کہ آج دن میں، میں نے کتنی بھلائیاں کی ہیں اور کتنی برائیاں کی ہیں، تو عمر بھر کی بھلائی برائی یاد نہیں رہے گی۔ لیکن دن بھر کی بھلائی برائی یاد رہے گی کہ آج کس کو فائدہ پہنچایا، سخاوت کی، کس کی غیبت کی، کس کی چغلی کھائی، میں نے کوئی جھوٹی گواہی دی، کتنوں کا میں نے مال دبالیا، بدنیتی کر کے کس کا قرضہ دبالیا۔ جیب کتری، غرض جو بھی بری حرکت دن میں کی ہے، رات کو ضرور یاد رہے گی۔ اتنا بدحافظہ کوئی نہیں ہوتا کہ دن بھر کی باتیں عشاء کے بعد بھول جائے۔ تو محاسبہ کر کے شمار کرلیجئے کہ دس میں نے نیکیاں کی ہیں اور دس ہی بدیاں۔ دس نیکیوں پر اللہ کا سچے دل سے شکر ادا کیجئے۔

کہ اے اللہ! میں قابل نہیں تھا کہ نیکی ادا کروں۔ یہ تیرا فضل اور احسان ہے تو نے مجھ سے نیکی کرادی میرے میں کہاں اہلیت تھی۔ اگر میں نے اپنے ارادے سے نیکی کی تو ارادہ بھی تو ہی پیدا کرنے والا ہے۔ میں ارادے سے نیکی کرتا۔ لیکن اگر عمل کرنے کے سامان نہ ہوتے، عمل کیسے کرتا؟ وہ سامان تو نے ہی پیدا کئے، توفیق تو نے دی، بدن میں طاقت تو نے دی۔ تیرے فضل وکرم سے یہ نیکی ہوئی۔ میں شکر کرتا ہوں اور تیرا احسان مانتا ہوں۔ وعدہ خداوندی ہے۔ ﴿لَـئِنْ شَـكَـرْتُـمْ لَاَزِيْـدَنَّـكُـمْ﴾ ① جس نعمت پر شکر ادا کرو گے۔ اس نعمت کو بڑھاؤں گا، ترقی دوں گا۔ لہٰذا جب آپ نیکیوں پر شکر ادا کریں گے۔ اللہ کے وعدے کے مطابق نیکیاں بڑھنی شروع ہوں گی۔ مال پر شکر ادا کرو گے، مال بڑھے گا، دین پر شکر کرنے سے دین بڑھے گا۔ عمل صالح پر شکر کرو گے، صحت ترقی کرے گی۔ قوت پر شکر ادا کرو گے، قوت بڑھے گی۔ دین پر شکر ادا کرو گے، دین بڑھے گا۔ عملِ صالح پر شکر کرو گے عمل صالح ترقی کرے گا۔ اس لئے کہ آیت عام ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ① یہ نہیں فرمایا: ”لَـئِنْ شَكَرْتُمْ فِي الْمَالِ لَاَزِيْدَنَّكُمْ“ مال پر شکر کرو گے میں بڑھادوں گا اور کسی چیز پر وعدہ نہیں۔ تو کوئی قید نہیں لگائی اور جب بلاقید کے فعل آتا ہے تو ہر چیز اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ جب آپ نے نیکیوں پر شکر ادا کیا۔ تو وعدہ خداوندی کے مطابق اس میں ترقی ہوگئی۔

اور دس ہی برائیاں یاد آئیں کہ کچھ چغلی کھائی تھی، غیبت کی تھی، کچھ یہ کیا، کچھ وہ کیا، کسی کا مال مارلیا، کچھ ناپ تول میں کمی کردی، ڈنڈی مارلی اور مال کم دیا، پیسے گاہک سے پورے لے لئے یا مال خراب دے دیا دام پورے کرلئے۔ تو ایک تو حقوق اللہ ہیں دیانت کے بارے میں۔ اس میں توبہ سے معاف ہو جانے کی توقع ہے۔ تو

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷.

جب بدیاں یاد آئیں ان سے توبہ کرلیں دس بدیاں تھیں چاہے دس دفعہ توبہ نہ کریں۔ ایک دفعہ ہی توبہ کرلیں دس بدیاں معاف ہوجائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر وعدہ خداوندی ہے۔ اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ ① ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں''۔ بالکل پاک صاف ہوگیا تو نیکیوں پر شکر کیا، وہ بڑھنی شروع ہوگئیں۔ بدیوں پر توبہ کی وہ گھٹنی شروع ہوگئیں۔ چالیس دن اگر آپ اس عمل کو روزانہ کریں گے۔ اور دس دس بدیاں روزانہ کا حساب لگائیں تو چالیس دن میں چار سو بدیاں کم ہوگئیں۔ حالانکہ چار سو آپ کرتے بھی نہ، مگر بالکل مٹ گئیں شیخ وقت اتنی بدیاں نہ مٹا سکتا۔ جتنی آپ نے محاسبہ نفس سے مٹا دیں۔ آپ نے اپنے اخلاق درست کرلئے۔ اب آپ کے لئے کوئی حجت باقی نہیں رہی کہ صاحب! میرے ہاں نہ کوئی شیخ ہے نہ عالم نہ دوست نہ دشمن۔ مجھ سے اللہ میاں پوچھیں گے کہ تو نے اخلاق کیوں نہیں درست کئے؟ میں کہہ دوں گا، حضور! اخلاق کو درست کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں کیسے درست کرتا اور پیسہ میرے پاس نہیں تھا کہ سفر کرکے کسی بزرگ کے پاس جاؤں اس واسطے میں بداخلاق رہ گیا۔ فرمائیں گے نہیں تو تنہا پہاڑ پر تھا۔ جب بھی اخلاق درست کرنے کا طریقہ تھا اور وہ محاسبہ تھا۔ اپنے نفس کا حساب لینا تھا۔ اگر آپ عشاء کے بعد دس منٹ روز اس مراقبہ کو کرلیا کریں اور پھر اندازہ کریں چالیس دن کے بعد کتنے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ کتنی بداخلاقیاں مٹتی ہیں، کتنی نیکیاں بڑھتی ہیں۔ آپ جتنا کام ایک شیخ وقت سے لیتے۔ آپ نے شیخ وقت اپنے نفس کو بنالیا۔ نفس نے وہی کام کیا جو ایک شیخ وقت اور مربی دین کرتا ہے۔

اپنے عزم کے بغیر اصلاح ممکن نہیں...... حاصل یہ نکلا کہ اگر آپ اپنے اخلاق کو درست کرنا چاہیں تو راستہ بند نہیں ہے۔ ہاں اپنے اخلاق کی آپ اصلاح نہ چاہیں تو پیغمبر کے زمانے میں لوگ موجود ہوتے ہیں اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ جب کرنا چاہیں تو اللہ کے رسول نے راستے بتلا دیئے ہیں، کرسکتے ہیں۔ نہ چاہیں، خود پیغمبر بھی نصیحت کریں۔ آدمی درست نہیں ہوسکتا۔ جنہیں اپنی اصلاح منظور تھی۔ اللہ کے رسول کے قول پر عمل کیا۔ کوئی صدیق رضی اللہ عنہ بنا، کوئی فاروق رضی اللہ عنہ بنا، کوئی ذی النورین رضی اللہ عنہ بنا، کوئی علی مرتضی رضی اللہ عنہ بنا اور جنہیں اصلاح مقصود نہیں تھی تو کوئی ابوجہل بن گیا، کوئی ابولہب بن گیا، کوئی مسیلمہ کذاب بن گیا۔ غرض بگڑے ہی رہے اور نبی وقت سے بھی ان کی اصلاح نہ ہوسکی۔ اس لئے کہ انہیں خود اپنی اصلاح منظور نہیں تھی۔

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

جب تمہیں ہی مقصود نہیں کہ اپنی اصلاح کرو تو دس تاویلیں کرلو گے، دس باتیں بنالو گے۔ مگر اللہ کے ہاں تاویلیں نہیں چلیں گی۔ دنیا کو آدمی دھوکہ دے سکتا ہے۔ تو خدا کی حجت بندے پر پوری ہوچکی۔ کسی بھی حالت میں

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ۱۲ ص: ۱۳۰۱ رقم: ۴۲۴. علامہ سخاوی فرماتے ہیں: ہمارے شیخ (ابن حجرؒ) نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے لیکن اپنے شواہد کی وجہ سے حسن ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۸۴ حرف التاء.

ہوں اصلاح اخلاق کا راستہ موجود ہے۔ دوست و دشمن میں ہوں جب بھی تنہا یا جماعت میں ہوں تب بھی۔

یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ دنیا میں ہر چیز میں شر اور برائی اس کی ذات میں گھسی ہوئی ہے اور خوبی محنت کر کے لائی جاتی ہے۔ تو انسان کا بچہ بھی پیدائشی طور پر برائیوں سے بھرپور ہے۔ جب تک اصلاح کی جدوجہد نہیں کرے گا۔ اس میں خوبی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کی طبعی جہالت رفع نہیں ہوگی۔ جب تک علم حاصل نہ کر لے اس کے اخلاق پاکیزہ نہیں بنیں گے جب تک کسی بااخلاق کی صحبت نہ اٹھائے یا قلب کا محاسبہ نہ کرے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

جب آدمی اپنی اصلاح خود نہ چاہے، کوئی اصلاح نہیں کر سکتا۔ خود اپنی خواہش سے آدمی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا﴾ ① ''اے پیغمبر! قیامت سے آپ اسی کو ڈرا سکتے ہیں، جو دل میں ڈرنے کا ارادہ رکھتا ہے''، جو اپنے دل میں ڈرنے کا مادہ رکھتا ہے اور جس نے یہ تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو مجھے نہیں ڈرنا، اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ وہ جب قبر میں جائے گا جبھی اسے ڈر لگے گا۔ دنیا میں اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ جب تک کوئی خود نہ چاہے۔ بڑے سے بڑا عالم آجائے لیکن وہ نہ چاہے کہ مجھے علم پہنچے، کبھی بھی علم نہیں پہنچے گا۔ بڑے سے بڑا درویش اور ربانی آجائے اور اس کا جذبہ نہ ہو کہ میں اخلاق درست کروں، کبھی بھی اخلاق درست نہیں ہوں گے اور اگر اپنا جذبہ ہو کہ اخلاق درست کروں تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ آپ اپنے نفس سے درست کر لیں گے۔ اصل میں آپ کا جذبہ اور آپ کا عزم ہے۔ یہ اصل چیز ہے۔ عارف رومی نے کہا ہے کہ۔

آب کم جو، تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو، اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس ہوگی تو پانی خود آجائے گا۔ پیاس تو ہے نہیں اور آدمی یوں چاہے کہ پانی آجائے، تو اوپرے دل سے پانی کی تلاش کرے گا۔ اوپرے دل سے طلب کرنے پر کچھ بھی نہیں ملا کرتا۔ دل کے جذبے سے جب طلب ہوتی ہے، جبھی ملتا ہے۔

اگر بیوی یوں کہے کہ فلاں زیور بنوا کے دے اور خاوند کے دل میں جذبہ پیدا ہو تو خاوند چوری کرے گا، ڈکیتی کرے گا۔ مگر اسے بنا کے دے گا۔ اس لئے کہ جذبہ پیدا ہو گیا اور جذبہ نہیں ہے تو وہ لاکھ چلائے، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کام تو اپنے جذبے سے چلتا ہے جب تک دل میں طلب نہیں ہوگی، محض کہنے سننے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ حال ایمان اور دین کا ہے. لاکھ وعظ کہنے والے وعظ کہیں۔ لیکن جب تک آپ کا عزم نہیں ہوگا کہ ہم درست ہوں۔ کبھی بھی درست نہیں ہوں گے۔ اگر آپ وعظ میں اس نیت سے آئیں کہ بھئی! دیکھیں کون کیسا بولتا ہے۔ گویا آپ تماشا دیکھنے آئے کہ بھئی! مداری کا تماشہ تھا۔ فلاں نے اچھا کہا اور فلاں نے غلط۔ کبھی بھی فائدہ نہیں

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۴۵.

ہوگا اور اگر اس لئے آئے کہ مجھے بھی کچھ دین کی بات لے کے جانی ہے، مجھے زندگی میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ اگر کوئی جاہل آدمی بھی سچی بات کہے گا۔ تو اس سے بھی آپ عبرت پکڑیں گے۔ اپنے دل کی خود ہی اصلاح کر لیں گے۔ تو پھر اپنے اوپر بات رہی۔ اپنے اندر طلب صادق پیدا کیجئے اپنے اندر پیاس پیدا کیجئے پانی آ جائے گا۔ اپنے اندر زر کی طلب پیدا کیجئے۔ دولت آنے لگ جائے گی۔ اس کے لئے دس حیلے کریں گے۔ دوکان پر بیٹھیں گے، زمین پر جائیں گے، صنعت وحرفت کریں گے دولت آ جائے گی اور اگر آپ کے دل میں طلب نہیں ہے، سست پڑا رہنا آپ کو گوارا ہے کہ بس چارپائی پر پڑے رہو، اس سے کیا ملے گا؟

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے ایک کاشت کار ہو۔ برسات کی ہوائیں چلیں اور پانی پڑنا شروع ہوا۔ تو اس وقت بیج ڈالا جاتا ہے، بیج ڈالتے ہیں تو کھیتی اگتی ہے۔ مگر کاشت کار نے کہا، کیسی عمدہ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور یہ چار مہینے ٹھنڈی ہواؤں کے ہیں۔ میں پڑ کے آرام سے سوؤں گا۔ کون جائے کھیت پر؟ کون بیج ڈالے؟ برسات کے چار مہینے اس نے چارپائی پر پڑ کے گزارے۔ یہاں تک کہ برسات ختم ہوگئی، گرمی آئی اور لو چلنی شروع ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے گھر میں غلے لے کے آئے اور یہ اب منہ تک رہا ہے۔ بیج ڈالتا تو غلہ لے آتا؟ مگر اس نے سونے میں اور آرام طلبی میں سارا وقت گزار دیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا اب تو جو بیج پڑا ہوا ہے، اس کے بھی مارے جانے کا اندیشہ ہے، لو چل رہی ہے، آگ کی سی ہوائیں چل رہی ہیں۔ اب کھیتی باڑی کا کیا کام؟ تو جیسے اس وقت سُست کاشت کار کو پشیمانی اور ندامت ہوگی۔ مگر وہ ندامت کام نہیں دے گی اس لئے کہ وقت گزر چکا۔ اس طرح سے اگر ایک دین کے طالب میں سچی طلب نہیں ہے اور یہ دنیا کی عمر اس نے لہو ولعب اور کھیل کود میں گزار دی اور یہ سمجھ کے کہ آج تو چارپائیاں بھی ہیں، بستر بھی ہیں اور کھانے کی نعمتیں بھی ہیں۔ اب کون جائے نماز کو؟ اور کون روزے رکھے؟ کون دین کی تلاش کرے؟ یہ مزے پھر کہاں ملیں گے۔ تو جب موت کا وقت آئے گا۔ اس وقت کہا جائے گا۔ ﴿اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمُ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ ① "اس نفس کو حوالے کرو، یہ تمہاری ملک نہیں ہے۔ آج کے دن عذاب چکھنا پڑے گا"۔ اب ندامت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تو اس وقت ندامت نہ فائدہ دے گی نہ عمل کا وقت ہوگا۔

دنیا کا ہر ذرّہ واعظ ہے...... حدیث میں ہے کہ بعض لوگ موت کے وقت ملک الموت سے کہیں گے کہ اے ملک الموت! مجھے تھوڑا سا وقفہ دو کہ میں توبہ کر لوں اور میں اللہ کی طرف رجوع کر لوں۔ ملک الموت حیرت سے کہیں گے کہ کیا تیرے پاس میرے قاصد نہیں پہنچے؟ انہوں نے تجھے موت کا پیغام نہیں پہنچایا؟ جو آج توبہ کے لئے مجھ سے وقت مانگ رہا ہے؟ میرے بیسیوں قاصد اسی لئے پہنچے کہ تو توبہ کرے، وقت موجود تھا۔ اتنے قاصدوں پر جب تو نے توبہ نہ کی۔ میں تو آج آخری قاصد ہوں۔ اس کے بعد توبہ کا زمانہ ہی نہیں۔ وقت گزر

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۳۔

گیا۔ وہ کہے گا کہ میرے پاس تو کوئی قاصد نہیں پہنچا۔ ملک الموت کہیں گے: قاصد نہیں پہنچا؟ میں نے بہت سے اپنے پیامبر بھیجے۔ جنہوں نے اطلاع دی ہوگی کہ میں تیرے پاس آنے والا ہوں۔ وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں پہنچا۔ فرمائیں گے کیا تیری داڑھی میں سفید بال نہیں آئے؟ کیا تیرے سر کے اندر بڑھاپے کے آثار نمایاں نہیں ہوئے؟ یہ بڑھاپا میرا ہی تو قاصد تھا، جو خبر دے رہا تھا کہ میرے آنے کا وقت آ رہا ہے۔ موت کا پیغام آ چکا ہے۔ موت قریب آنے والی ہے وہ میرا قاصد ہی تھا۔ فرمائیں گے کیا تیرے پوتے نہیں پیدا ہوئے؟ نواسے نہیں پیدا ہوئے؟ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی قاصد تھے کہ ان کا زمانہ آ گیا ہے۔ تمہارے لئے دنیا کا وقت ختم ہو چکا۔ ان کے لئے جگہ خالی کرو۔ یہ میرے ہی تو قاصد تھے، جو خبر دے رہے تھے۔ ﴿وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾ کیا ڈرانے والے تیرے پاس نہیں آئے؟ یہ سارے میری طرف سے آئے تھے۔ اور فرمائیں گے، کیا یہ دن رات کا لوٹ پھیر، اس نے تجھے وعظ نہیں کیا؟ سورج طلوع ہوا، طلوع کے بعد عروج کرتے کرتے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے بعد جب گرنا شروع ہوا، یہ اس کی موت کا پیغام تھا۔ سورج کا چہرہ فق ہوا، روشنی زرد پڑ گئی اور آخر میں غروب ہو کر چھپ گیا۔ گویا ختم ہو گیا۔ روز طلوع اس کی حیات ہے اور غروب اس کی موت ہے۔ جب اتنی بڑی ہستی روزانہ آتی بھی ہے اور فنا بھی ہے، مٹنا بھی ہے، چھپ جانا بھی ہے۔ تو سورج بھی ایک واعظ ہے۔ جو وعظ و نصیحت کہتا ہے۔ لیکن کوئی عبرت کی نگاہ سے دیکھے۔ تو اس کے وعظ کو سنے گا۔ اور اگر بیلوں کی نگاہ سے دیکھے، تو بیل کے سامنے بھی سورج چھپتا ہے مگر وہ اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اس لئے کہ نہ عقل ہے نہ علم۔ اگر انسان بھی کائنات کے واقعات کو بیلوں کی طرح دیکھنے لگے کہ واقعات کی صورت تو دیکھ لے۔ عبرت، نصیحت حاصل نہ کرے تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ گیا۔ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ جانور واقعات کی صورتوں کو دیکھتا ہے۔ انسان ان کی حقیقتوں میں گھس کر ان سے کچھ علم اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی۔ فرمایا: ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ ① کتنی ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں کہ انسان پر گزرتی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے اور آنکھ بند کر کے چلا جاتا ہے۔ اس سے عبرت و نصیحت حاصل نہیں کرتا اور فرمایا، بہت سے وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے ہوئے ہیں۔ پھر بھی شرک میں مبتلا ہیں۔ مومن بن گئے ہیں، مگر شرک سے خالی نہیں ہیں۔ اس واسطے کہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ہر چیز سے کٹ کر اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ ہر حادثے کو دیکھ کر عبرت پکڑتے اور مالک کو پہچانتے۔ لیکن یہ پھر بھی اپنے ہی نفس کی رضا میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی ہی نفسانی خواہشات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اپنے ہی آرام کی فکر میں ہیں۔ نہ آخرت، نہ عبرت، نہ نصیحت، پیش نظر' تو مومن بھی ہیں مگر ساتھ مشرک بھی ہیں۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے، کہ سورج کے طلوع و غروب کے واقعات حیوان کے اوپر بھی گزرتے ہیں اور انسان بھی دیکھ رہا ہے۔

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۵، ۱۰۶۔

حیوان فقط شکل کو دیکھتا ہے، انسان اس کی حقیقت پر غور کرتا ہے کہ جب اس میں تغیر ہے تو کون سا ذرہ خالی ہوگا، جس میں تغیرات نہ ہوں۔ ہواؤں کا چلنا، زمین کی تعمیر و تخریب موسموں کا آنا جانا، پھلوں کا آنا اور مٹ جانا۔ ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ عالم موت اور حیات کی کشمکش میں ہے۔ پیدائش بھی ہے اور موت بھی ہے، عروج بھی ہے زوال بھی ہے۔ ترقی بھی ہے، تنزلی بھی ہے، تعمیر بھی ہے، تخریب بھی ہے۔ جو چیز پیدا ہوئی وہ موت کے منہ میں ضرور جائے گی۔

عیسیٰ بن مریم نے فرمایا: "لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ" ① جو موت کے لئے بچوں کو مرنے کے لئے پیدا کرو، تعمیریں بناؤ ڈھانے کے لئے جو تعمیر بنے گی، ایک دن اس کی تخریب بھی ہوگی۔ دنیا میں ہر تعمیر کے لئے تخریب اور ہر بقاء کے لئے فنا لازم، ہر حیات کے لئے موت لازم، ہر آغاز کے لئے انجام لازم ہر ابتداء کے لئے انتہا لازم۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس میں تغیر نہ ہو۔

ہمارے مرشد حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ دنیا کے ذرات کو اور حالات کو دیکھو کہ وہ اعلان کر رہے ہیں کہ "فَافْهَمْ فَافْهَمْ......" اب بھی سمجھو، اب بھی سمجھو، غفلت کی نیند کو چھوڑ دو، ان تغیرات کو دیکھ کر اب بھی متوجہ ہو لو، کہ تم میں بھی تغیر آنے والا ہے۔ تم بھی اس دنیا کے جز ہو۔ جب دنیا کے ہر جز میں تغیر ہے اور تغیر کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز فنا کی طرف جا رہی ہے۔ تو تم بھی فنا کی طرف جا رہے ہو۔ انسان پر جو بیماریاں آتی ہیں۔ یہ علامت ہے کہ جب یہ تغیر صحت سے پیدا ہوا تو صحت والے پر بھی ایک دن تغیر آنے والا ہے، طاقت بدن میں آتی ہے ایک دن اس کے گھٹنے کا زمانہ بھی آتا ہے۔ غذائیں ہضم کرنے کی قوت ہوتی ہے، ایک دن ضعف تغیر کا زمانہ ہے، جوانی آتی ہے، ایک دن بڑھاپے کا دور آنے والا ہے۔ جب انسان کے عوارض میں تغیرات ہیں تو ذات میں بھی تغیر ہوگا۔ یہ بھی ایک دن ختم ہو جائے گا۔ ان تمام چیزوں کو دیکھا جائے تو یہ سارے واعظ و مقرر ہیں۔ سارے نصیحتیں کر رہے ہیں۔ آپ اس تلاش میں ہیں کہ کسی واعظ، مقرر یا عالم کو بلائیں اور تقریر سنیں میں نے ہزاروں واعظوں کا پتہ دے دیا کہ گھر بیٹھیے اور وعظ سنتے جایئے۔ سورج زمین، ہواؤں کا چلنا، دنیا کے تغیرات۔ الغرض ذرہ ذرہ واعظ ہے، سننے والا اور عبرت پکڑنے والا ہونا چاہیئے وہ ہر جز سے عبرت پکڑے گا۔ تو گھر میں واعظ موجود ہے اور گھر چھوڑ آپ کے بدن کے اندر واعظ موجود ہیں۔ اپنے اندر کے تغیرات کو دیکھئے کہ ہر ہر چیز فنا کی طرف جا رہی ہے۔ استاد داغ بڑا شاعر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ؎

ہوش و حواس، تاب و تواں داغ جا چکے ــــ اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

سامان تو چلا گیا۔ اب مسافر بھی روانہ ہو رہا ہے۔ روزانہ سامان جاتا رہتا ہے اور ہمیں عبرت نہیں کہ ایک

① المطالب العالیة، کتاب الرقاق، باب الوصایا النافعة ج: ۹ ص: ۱۳۶ رقم: ۳۱۹۹.

وقت آ رہا ہے کہ ہمیں بھی جانا ہے۔

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستان میں نوشیرواں کا واقعہ لکھتے ہوئے خوب کہا ہے کہ ؎

خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر   زاں پیشتر کہ بانگ در آید فلاں نماند

اے عزیز! کچھ نہ کچھ خیر اور بھلائی کر لے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ یہ موتیوں جیسے دن ہیں۔ جو جا رہے ہیں انمول موتی ہیں۔ جو قیمت سے نہیں، اللہ نے بلا قیمت دے دیئے ہیں۔ تو کوئی خیر کر لے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ اس سے پہلے کہ یہ آواز دی جائے کہ آج فلاں نہیں رہا۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ ① اس سے پہلے کچھ کرنا ہے تو کر لے۔ آج ہم قبرستانوں سے گزرتے ہیں۔ ہزاروں وہ آدمی جو ہمارے دوست، احباب، والد، عزیز، اقرباء تھے آج وہ قبر کی تہہ میں پڑے ہوئے ہیں اور خاک کا جز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ افسوس! یہ آدمی تھے اور آج نہیں۔ کل کو ہم پر بھی یہی وقت آنے والا کہ گزرنے والے ہمارے اوپر سے گزریں گے اور کہیں گے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں تھے۔ مگر آج ان کا نشان اور پتہ نہیں تو ہر شخص اس راستے پر جانے والا ہے کچھ اس راستے کی بھی فکر کر لینی چاہئے۔

شیطانی دھوکہ......بعض آدمی کو دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میرے اندر قوت ہے۔ جب بڑھاپا آئے گا، توبہ کر لیں گے ابھی تو کھانے پینے لہو ولعب اور قوت کا دور ہے۔ موت کے کچھ آثار ونشانات نہیں ہیں۔ جب بڑھاپا آئے گا اور یہ بات سامنے آجائے گی کہ اب چند دن باقی رہ گئے۔ اس وقت توبہ کر لیں گے اب مزے اڑا لیں۔ عیش میں رہیں۔ مگر یہ محض دھوکہ شیطانی وسوسہ ہے۔ اس لئے کہ موت کے لئے بڑھاپا، جوانی، بیماری شرط نہیں ہے۔ بلا بیماری کے آدمی بیٹھے بٹھائے چلا جاتا ہے۔ جوان بھی مرتے ہیں، بچے، بوڑھے بھی مرتے ہیں۔ موت کا بازار گرم ہے سب کو آ رہی ہے۔ اس وسوسے کو تب آپ دل میں جگہ دیں کہ بڑھاپے کے بغیر آدمی مرا ہی نہ کرتا۔ کہہ سکتے تھے کہ ابھی موت کا وقت ہی نہیں آیا۔ لیکن جب بڑھاپے سے پہلے موت آجاتی ہے پھر دل میں یہ خیال کیسے گزرا کہ بڑھاپا آئیگا جب توبہ کر لیں گے۔ کیا خبر ہے کہ بڑھاپا آئے گا بھی کہ نہیں؟ یہ اللہ کے علم میں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں، میں تو یوں کہوں گا کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں۔ جوانی میں موت زیادہ آتی ہے۔ بوڑھاپے میں کم آتی ہے۔

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آپ مجمعوں کو دیکھیں، بازاروں میں گھومیں۔ آپ کو بوڑھے کم نظر آئیں گے، جوان زیادہ نظر پڑیں گے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ اس واسطے کہ اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے، تو دنیا میں بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ سارے سفید داڑھی کے نظر پڑا کرتے حالانکہ جوان زیادہ نظر پڑتے ہیں، بوڑھے کم نظر پڑتے ہیں۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ بڑھاپے تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ پہلے ہی ختم ہو جاتے

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۶۔

ہیں۔تو جوانی میں زیادہ اور بڑھاپے میں کم موت آتی ہے۔یہ محض ایک دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا،توبہ کر لیں گے۔بڑھاپا شرط نہیں اور تو اور ماں کے پیٹ میں بھی مرجاتے ہیں۔دنیا میں آنے ہی نہیں پاتے۔اس کی بھی نظیریں ہیں تو موت کے لئے کوئی خاص سبب متعین نہیں ہے۔پھر اس میں اس دھوکے میں پڑنا کہ جب فلاں بات ہوگی،تب توبہ کریں گے۔آج نہیں کل کریں گے یہ جو کل پر بات ٹالنے کا عادی ہوگیا ہے۔جب وہ کل آئے گی تو اگلی کل پر ڈال دے گا۔وہ آئے گی تو اس سے اگلی کل پر۔اسی کل کل میں رہے گا اور موت کا وقت آجائے گا۔توبہ نصیب نہیں ہوگی۔جسے توبہ کرنی ہے۔وہ آج کرے اور اس عمر کو غنیمت سمجھے۔

عمل کا زمانہ جوانی ہے...... بلکہ یہ خیال کرے کہ عمل کرنے کا زمانہ جوانی کا ہے۔بڑھاپے کا زمانہ عمل کا نہیں ہوتا بڑھاپے کا زمانہ پنشن کا زمانہ ہے اور حق تعالیٰ کے ہاں پنشن دی جاتی ہے۔جیسے گورنمنٹ کے ہاں پچپن سال کی عمر ہو جائے تو پنشن دے دیتے ہیں۔مگر گورنمٹوں بے چاریوں کے خزانے چھوٹے ہیں۔اس واسطے وہ آدھی پنشن دیتے ہیں۔دوگنی اور تگنی تو کیا؟ پوری تنخواہ بھی نہیں۔آدھی تنخواہ دیتے ہیں۔اللہ میاں کے ہاں سے پوری پنشن ملتی ہے۔حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جوانی میں کوئی عمل کرتا تھا۔بڑھاپا آگیا،طاقت رہی نہیں اور عمل نہیں کرسکتا حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں۔کہ نامہ اعمال میں ثواب برابر لکھتے رہو۔اس واسطے کہ اس نے خود نہیں چھوڑا بڑھاپا ہم نے بھیجا ہے۔اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔لہذا عمل برابر لکھتے رہو۔گویا آج بھی عمل کر رہا ہے۔جو دس مسئلے پڑھتا اور آج وہ نہیں پڑھ سکتا مگر ثواب دس ہی کا لکھتے جاؤ اس لئے کہ اس کے ارادے کا قصور نہیں ہے۔لہذا جوانی عمل اور بڑھاپا پنشن کا زمانہ ہے۔جس نے جو کچھ کیا،جوانی میں کیا ہے۔اس واسطے جوانی کے اندر یہ لیت ولعل کہ جب بڑھاپا آجائے گا،جب توبہ کرلیں گے۔''الٹے بانس بریلی کو'' یہ تو اوندھا قصہ ہے کہ جب پنشن ملنے کا زمانہ آئے جب آدمی کہے کہ میں کام کروں گا۔جیسے کوئی آدمی گورنمنٹ سے کہے کہ صاحب! ابھی تو میری پندرہ برس کی عمر ہے۔ابھی آپ مجھے ملازم نہ رکھیں۔جب میں ساٹھ برس کا ہو جاؤں،جب ملازم رکھیں۔گورنمنٹ کہے گی کہ تو پاگل ہوگیا ہے۔ارے ملازمت کا زمانہ جوانی کا ہے۔بڑھاپا پنشن کا اور عمل کے چھوڑنے کا زمانے ہے۔تو عمل کا زمانہ سمجھ رہا ہے۔یہی دین میں بھی بات ہے۔جس نے جو کچھ بھی کیا ہے،جوانی میں کیا ہے بڑھاپے میں تو ثواب لوٹنے کا زمانہ ہے۔وہ کسی شاعر نے کیا خواب کہا ہے کہ ؎

من نمی گویم کہ زیاں کن، یا بند سود باش ‏ ‏ ‏ اے زفرصت بے خبر، در ہر چہ باشی زود باش

میں یوں نہیں کہتا کہ کوئی نفع یا نقصان کا کام کرو۔یہ کہتا ہوں کہ جو کرنا ہے جلدی کرلو۔اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا۔تو عمل کا زمانہ یہی ہے جسے توبہ کرنی ہے آج کرے،کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔اس واسطے وعظ سن کر یا دنیا کے ان ذروں سے وعظ سن کر یا دیکھ کر کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہو،فوراً کرے۔ممکن ہے کل کو یہ جذبہ بھی باقی نہ رہے۔

نیک کام کے لئے مشورے کی ضرورت نہیں.....: حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر

میں لکھا ہے اگر کسی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ میں ایک پیسہ اللہ کے راستے میں صدقہ کروں، فوراً کر دے۔ اس لئے کہ ممکن ہے گھنٹہ بعد قلب کی وہ کیفیت نہ رہے کہ ایک پیسہ دے کے کیا کروں گا اور ہزار دینے پر قادر نہیں۔ پھر یہ نہ ایک کرے گا نہ ہزار کرے گا۔ محرومی اس کے سر پر پڑے گی۔ اس لئے جب کسی نیکی کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کر گزرے، نیکی کے اندر مشورے طلب کرنے یا استخارے کرنے کی ضرورت نہیں۔ استخارہ مشورہ ان چیزوں میں ہوتا ہے۔ جن میں حق واضح نہ ہو کہ بھئی مشورہ کرلو، حق واضح ہو جائے۔ جس چیز کا اللہ نے حکم دے دیا۔ اس میں استخارہ کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ نے کہا کہ نماز پڑھو۔ آپ نے کہا، میں ذرا گھر والوں سے مشورہ کرلوں کہ پڑھنی چاہئے یا نہیں، تو لوگ کہیں گے، احمق آدمی! خدا کے حکم کے بعد مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ نے کہا زکوٰۃ دو کہ جی میں ذرا استخارہ کرلوں۔ اگر استخارہ اللہ سے پوچھنے کو کہتے ہیں تو وہ خود کہہ رہے ہیں کہ زکوٰۃ دو، قرآن میں حکم دے رہے ہیں۔

در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

کارِ خیر میں استخارہ کی ضرورت نہیں۔ جس میں آدمی کو تذبذب ہو اور اس کا خیر ہونا پوری طرح ثابت نہ ہو۔ اس میں استخارہ و مشورہ کرے۔ آج اگر کسی وعظ و نصیحت سے نیکی کرنے کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کر گزرے، کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔ اللہ پر بھروسہ کرے۔ پھر وہ جاری بھی ہو جائے گی۔ ''لَیْتَ وَ لَعَلَّ'' میں نہ پڑے کہ کل کرلوں گا، پرسوں کرلوں گا۔ یہ شیطان کی طرف سے ڈھیل کرائی جاتی ہے کہ اس کے دل سے یہ جذبہ نکل جائے پھر میں اس سے نمٹ لوں گا۔ تو جب جذبۂ خیر، جذبۂ حق آ جائے۔ اسے خدا کی طرف سے امر سمجھو، اسے کر ڈالو۔ تو اپنی اصلاح کا تھوڑا بھی جذبہ پیدا ہو، آدمی کر گزرے۔ اپنے اخلاق کو درست کرنے کا جذبہ خواہ نفس کے محاسبے سے ہو یا مواخات فی اللہ سے ہو یا غیروں سے عبرت پکڑنے سے ہو یا سچوں کی صحبت اختیار کرنے سے ہو، آدمی کر گزرے۔ اس لئے یہ حیلہ کام نہیں دے گا کہ صاحب! کوئی درویش، عالم نہیں ہے، کوئی دوست نہیں ہے، کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں بھئی! کوئی بھی نہیں تو خود تو موجود ہے۔ اپنے نفس سے ہی کام لے سکتا ہے۔

تو یہ ایک نسخہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ جو چار دواؤں پر مشتمل ہے۔ صحبتِ صالحین، مواخات فی اللہ، اِتعاظ بالغیر اور محاسبۂ نفس۔ اب ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مل جائے۔ وہ بھی ان شاء اللہ کار آمد ہے۔ بعض نسخے ایسے ہوتے ہیں کہ اس کی ایک دوا بھی مل جائے۔ تو وہ بھی صحت کے لئے مفید ہوتی ہے اور اگر چاروں دوائیں مل کے معجون مرکب بن جائے، تو سبحان اللہ کہ صحبت نیک بھی میسّر ہو مواخاۃ فی اللہ کہ دینی بھائی بندی بھی ہو جائے، دشمنوں سے عبرت بھی پکڑے اور روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرے۔ چاروں دواؤں کا نسخہ اگر پیئے تو بڑا مقوی ہوگا۔ جس نسخہ کا ایک ایک جز شفا کا ذریعہ ہو۔ اس نسخے کے اگر سارے اجزا مل جائیں، وہ تو اکسیر بن جائے گا۔ اس واسطے یہ چند چیزیں میں نے ذکر کیں تا کہ ان سے عبرت بھی ہو۔ ان سے اپنی اصلاح کا جذبہ بھی پیدا ہو

اوران سے اپنے اخلاق بھی درست ہوں اور آدمی یہ سمجھ لے کہ میری ذات میں کوئی خوبی نہیں ہے۔خوبی کی میں جتنی محنت کروں گا آجائے گی برائی محنت سے نہیں آتی۔ وہ میرے اندر پیدائشی طور پر ہے۔اسے زائل کرنے کے لئے مجھے کچھ کرنا ہے اوراس کے زائل کرنے کے یہ چار طریقے ہیں۔جو میں نے عرض کئے۔بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔اب وقت بھی زیادہ ہوگیا ہے۔دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفس کی اصلاح کرنے،اپنے اعمال واخلاق کو درست کرنے اور اپنے عقائد کو سچا بنانے کی توفیق دے۔اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا نصیب فرماوے،اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے،حق تعالیٰ ہمارے دین اور ہماری دنیا کو درست فرماوے،ہماری آخرت کو بھی درست فرماوے،ہم میں جتنے کھوٹ ہیں۔اللہ ان کو نکال دے،نفس میں جتنی بیماریاں گھسی ہوئی ہیں،ان کو زائل فرماوے۔اللہ تعالیٰ ہمیں دشمنوں کے نرغے سے محفوظ رکھے،حق تعالیٰ ہر مشکل سے ہمیں بچائے،ہماری راہ درست فرماوے۔

”اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.“

رضائے الٰہی

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ:...... فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿یٰۤاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ o ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً o فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ o وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴾ ①
(صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ)

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے۔ جو اس وقت میں نے تلاوت کی۔ یہ سورۂ فجر کی آخری آیت ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اے نفس مُطْمَئِنَّہ! لوٹ چل اور واپس آ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی ہے اور اللہ تجھ سے راضی اور میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا"۔

یہ آیت بہت سے علوم و معارف اور حقائق پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ موقع نہ سب کے بیان کرنے کا ہے اور نہ ہی وقت ہے کہ پوری تفسیر کی جائے اور پورے حقائق کی تشریح بیان کی جائے۔ ورنہ آیت کا جب حق ادا ہو کہ پہلے نفس مطمئنہ کی تشریح کی جائے کہ نفس مطمئنہ کیا ہے؟ کسے کہتے ہیں؟ ﴿ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ﴾ ② اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ یہ لوٹنا کیسا ہے؟ لوٹنا جب ہوتا ہے کہ پہلے آنا واضح کیا جائے۔ راضی اور مرضی ہونے کے کیا معنی ہیں؟ خاص بندوں میں شامل ہونے کی کیا حقیقت ہے؟ جنت میں داخل ہونے کی کیا کیفیت ہے؟ غرض یہ بہت سے مقاصد ہیں جن پر یہ آیت مشتمل ہے۔ ہر مقصد ایک مستقل موضوع ہے اور مستقل وقت چاہتا ہے اور اتنا وقت نہیں ہے۔ اس لئے اس آیت کے سلسلے میں تین باتوں کے متعلق میں کچھ تشریح تھوڑی سی عرض کروں گا۔

یہ آیت ایک تو واقعہ پر مشتمل ہے، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ایک بشارت پر جس کی آیت میں وضاحت کی گئی ہے اور ایک انعام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس مختصر سے وقت میں انہیں تینوں چیزوں کی مختصر تشریح کرنی ہے۔

① پارہ: ۳۰،سورۃ الفجر،الآیۃ: ۲۷،۳۰. ② پارہ: ۳۰،سورۃ الفجر،الآیۃ: ۲۸.

وقتِ نزع کا خطاب......اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اس کی موت و نزع کے وقت خطاب کیا جائے گا۔ جو اس کا آخری وقت ہوگا۔ گویا یہ خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جیسے شرعی خطابات زندگی میں کہے گئے ہیں کہ "صَلُّوْا" نماز پڑھو۔ یا "عَلَیْکُمْ بِالصِّیَامِ" روزے رکھو یا "عَلَیْکُمْ بِالْحَجِّ" حج ادا کرو وغیرہ۔ یہ زندگی کے خطابات ہیں اور یہ زندگی کے خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جب کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوگا اور اس دنیا کی زندگی کو ختم کر رہا ہوگا۔ اور اسی وقت کی یہ بشارت ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے اور اسی وقت ایک انعام کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔

﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ ① یہ خطاب کس وقت ہوگا؟ حدیث میں اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے کہ جب مومن پر اس کا آخری وقت آتا ہے اور اس کا نزع شروع ہوتا ہے تو ملک الموت کے اعوان و انصار اس شخص کے پاس پہنچتے ہیں جو حالت نزع میں ہے اور اس کی موت کی ابتداء ہو رہی ہے۔

ملکُ الموت کے دو قسم کے اَعوان مددگار ہیں۔ ایک اصحابِ یمین اور ایک اصحابِ شمال۔ ایک دائیں جانب کے ملائکہ ہیں اور ایک بائیں جانب کے۔ دائیں جانب کے ملائکہ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ بیض الوجوہ ہیں۔ یعنی سورج اور چاند کی طرح سفید اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ بائیں جانب کا لشکر وہ ہے جو مظلم ہے۔ تاریک اور سیاہ اور ڈراؤنے ان کے چہرے ہوں گے۔

مومن کی جب روح قبض کرنے کا وقت آتا ہے۔ اس وقت پہلے دائیں جانب کے ملائکہ بھیجے جاتے ہیں جنہیں اصحابِ یمین کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ بندہ جس کی موت قریب آ چکی ہے۔ یہ دور سے دیکھتا ہے جیسے منزلوں پر سینکڑوں سورج اور چاند روشن ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسے ایک قسم کا تحیر پیش آتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی ملائکہ ہوتے ہیں جو اصحاب یمین اور ملک الموت کا دائیں جانب کا لشکر کہلاتے ہیں۔ دور سے اس لئے نظر پڑتے ہیں کہ ایک نئے عالم سے سابقہ ہے، نئے عالم کی مخلوق سامنے آ رہی ہے۔ ایک دم سامنے آنے سے کہیں مومن گھبرا نہ جائے اور جزع فزع میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے پہلے دور بیٹھ کر اپنا جمال دکھلاتے ہیں اور آہستہ آہستہ قریب ہوتے جاتے ہیں تاکہ رفتہ رفتہ انس پیدا ہو۔

یہ وقت اس میت پر ایسا ہوتا ہے کہ اس میت پر ایک عالم تحیر طاری ہے کہ سورج اور چاند ہیں، کیا چیز؟ آہستہ آہستہ قریب آ رہے ہیں، یہاں تک کہ بالکل قریب آ جاتے ہیں، اب متشخص ہوتا ہے کہ یہ محض روشنیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی شکل وصورت سب متشخص ہو کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ اس مومن کے ساتھ نہایت ہی خاطر و مدارات اور نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ آتے ہی اس کی جان نکالنی شروع کر دیں۔ بلکہ ترغیب دینا شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: "اُخْرُجِیْ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الطَّیِّبَةُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّیِّبِ اُخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَّ

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷۔

رَیْحَانٍ وَرَبٍّ غَیْرَ غَضْبَانٍ " ① اے پاک روح اور نفس! نکل اس بدن میں سے کہ تو نے اپنے عمل سے اسے پاک بنا دیا تھا۔ تیرا بدن بھی پاک اور تو خود بھی پاک۔ کہاں نکل اور کہاں جا؟ راحتوں، نعمتوں، آسائشوں اور آرام کی طرف اور ایسے پروردگار کی طرف چل جو کبھی تجھ پر غضب ناک نہیں ہوگا۔ بلکہ رحمت کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس طرف چل یہ گویا ایک قسم کا وعظ ہوتا ہے. جس سے وہ آخرت کی طرف جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس میں دنیا کی گندگی اور برائیاں بھی بیان کرتے ہیں کہ تو کس گندے عالم میں پھنسا ہوا ہے۔ پاک عالم کی طرف چل جس میں نہ غم والم اور نہ پریشانی ہے۔ بلکہ بشاشتیں، راحتیں اور اِنبساط ہے۔ ادھر چل اور اَخیر میں اس پروردگار کی طرف چل جس کے لئے تو نے زندگی بسر کی، محنتیں اٹھائیں۔ اب وہ نتیجہ قریب آ رہا ہے۔ یہ ایک وعظ وترغیب ہے تا کہ مومن کا دل آخرت کی طرف پھر جائے تو مرنا آسان ہو جائے گا۔ دوسرے عالم کی طرف نکلنا سہل ہو جائے گا۔

ملائکہ موت مومن کو ترغیب دے کر آخرت کے لئے آمادہ کرتے ہیں...... غرض پہلے دنیا کی برائی دل میں بٹھاتے ہیں اور آخرت کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر طبعی طور پر انسان کو موت شاق ہے کہ اس عالم سے نکل کر جس میں پچاس، ساٹھ ستر برس گزارے ہوں، دوسرے عالم میں جائے۔ اس لئے جیسے بدن کا چھوڑنا بھاری ہے۔ اس جہان کا چھوڑنا بھی بھاری ہے۔ اس لئے طبعی طور پر موت انسان کے حق میں مکروہ ہے۔ طبیعت گوارا نہیں کرتی، لاکھ بشارتیں دی جائیں، نعمتوں کا پیغام سنایا جائے۔ مگر وہ طبعی کراہت اور جھجک غالب ہے تو آمادہ نہیں ہوتی۔ بعض طبائع تو وہ ہیں۔ جنہوں نے دنیا میں رہ کر ہی اپنے قلب کو فارغ بنا لیا تھا وہ فوراً ہی آمادہ ہو جاتی ہیں۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ، میں ایک دن ان کی مجلس میں حاضر تھا۔ دو یا تین آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ عام مجلس نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے حضرت کی طبیعت میں کچھ جوش سا پیدا ہوا۔ تو ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی اجنبی آدمی تو نہیں جیسے گویا کوئی بڑے راز کی بات کہنا چاہتے ہوں، تو ادھر ادھر دیکھا تا کہ کوئی بیگانہ آدمی نہ ہو۔ جب مطمئن ہو گئے تو ہم سے خطاب کر کے فرمایا کہ: "الحمدللہ! میں موت وآخرت کے لئے اتنا تیار بیٹھا ہوں کہ اگر ابھی پیغام آ جائے تو خوشی خوشی چلا جاؤں"۔ یہ بات فرمائی یہ بات ہمیں کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ کون سی ایسی نئی بات ہے جس شخص کے پاس بھی موت کا پیغام آئے گا، خواہی نخواہی اسے تو جانا ہی پڑے گا۔ یوں کہنا میں تیار بیٹھا ہوں۔ اس سے کیا حاصل؟ یہ تیار ہو یا نہ ہو جب موت آئے گی تو جانا ہی پڑے گا اس میں تیاری کی کیا بات ہے؟

گویا ہمیں ایک استعجاب سا ہوا کہ یہ کون سی ایسی راز کی بات تھی کہ حضرت نے دیکھا کہ ادھر ادھر کوئی اجنبی اور بیگانہ نہ ہو۔ مگر بعد میں واقعی معلوم ہوا کہ ایک تو موت کا آنا تکوینی طور پر ہے۔ جب آ جائے گی تو آدمی جائے گا۔ جیسے پیدا ہونے میں مجبور ہے۔ جب اللہ کسی کو دنیا میں لانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہے نہ چاہے اسے آنا پڑتا ہے۔

① السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له، ج: ۱۲ ص: ۳۱۴.

اسی طرح جب آخرت میں لے جانا چاہیں گے۔وہ چاہے نہ چاہے جانا ہی پڑے گا۔تو ایک فعل خداوندی ہے کہ تکوین الٰہی کے سامنے انسان مجبور ہے۔ایک رضا ہے کہ اپنی خوشی سے جائے۔یہ جب ہوگا جب اللہ سے انس و محبت غالب آجائے۔آخرت کی نعمتوں کی رغبت غالب آجائے وہاں کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ معلوم ہو۔قرآن کریم کی ایک آیت دنیا و مافیہا سے زیادہ اونچی اور برتر نظر آئے اور یہ سمجھے کہ اگر ایک آیت کا مفہوم میرے ذہن میں آگیا اور کیفیت یہ طاری ہوگئی کہ پوری دنیا مجھ سے چھین لی جائے، یہ نعمت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔یہ جب ہوتا ہے جب حق تعالیٰ اور دین اسلام کی محبت کا غلبہ ہو جائے۔اس وقت پھر انسان کے دل میں موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ کس طرح سے دنیا سے نکلوں جیسے بعض عارفین کا قول ہے کہ۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردیم   تادر میکدہ شاداں و غزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو چھوڑ کر ہم اس آباد دیار میں پہنچیں گے اور اس شہر مطلوب میں پہنچیں گے۔جہاں کے ہم سے وعدہ کئے گئے ہیں۔اس لئے موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔

مومن کو عندالموت حق تعالیٰ براہِ راست بھی خطاب فرماتے ہیں......حدیث میں موت کی تمنا کی ممانعت فرمائی گئی۔فرمایا "لَایَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ" ① کوئی شخص تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے۔اس لئے کہ موت آکر زندگی اور عمل کو بھی قطع کر دے گی۔جتنی زیادہ زندگی نیکی کے ساتھ ہو اتنی بہتر ہے۔اس لئے موت کی تمنا مت کرو اور ایک جگہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ ھَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ② "اے یہود! اگر تمہیں اولیاء اللہ اور ولی کامل ہونے کا دعویٰ ہے تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ"۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن ہونے اور ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے۔بظاہر ایک تعارض سا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جگہ حکم ہے تمنا کرو، ایک جگہ حکم ہے کہ ہرگز مت کرو۔یہ دو باتیں آپس میں ٹکرا گئیں لیکن ایک دوسری حدیث نے اس مضمون کو صاف کر دیا۔فرمایا گیا: "لَایَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ بِضُرٍّ نَزَلَ بِہٖ" ③ کوئی شخص کسی مصیبت سے اکتا کر موت کی تمنا نہ کرے۔یہ بے صبری اور اللہ پر بے اعتمادی کی علامت ہے کہ مصیبت کی وجہ سے آدمی کہے کہ موت ہی کیوں نہیں آجاتی۔اگر موت آگئی اور وہاں بھی مصیبت ہی ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا، یہ انعام خداوندی کو ٹھکرانا ہے، بے صبری ہے۔اس کی ممانعت ہے۔لیکن اگر اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا

① الصحیح للبخاری، کتاب المرضیٰ، باب تمنی المریض للموت، ج:۱۷ ص: ۴۲۱ رقم: ۵۲۳۹.

② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶.

③ الصحیح للبخاری، کتاب المرضیٰ، باب تمنی المریض للموت، ج:۱۷ ص: ۴۲۱ رقم: ۵۲۳۹.

ہو۔ یہ عین مطلوب ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جب وفات قریب آئی تو چہرہ بشاش، داڑھی کا ایک ایک بال کھلا ہوا یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوشی ان کے دل سے ابلی پڑتی تھی۔ فرمایا: ''غَدًا نَلْقَى مُحَمَّدًا وَّ اَصْحَابَهٗ'' کل ان شاء اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اوران کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے ملاقات ہوجائے گی۔ اس کی خوشی ہے۔ یہ خوشی عین مطلوب ہے۔ اس لئے اگر موت کی تمنا ہے تو یہ عین مطلوب ہے۔ البتہ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا یہ خلاف مطلوب ہے۔ بہرحال ولایت جب کامل ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے: ''اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَّعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُكَ'' ① ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت پیدا کردے جو میرے نبی اور رسول ہونے کا قائل ہے''۔

اور ایک دوسری حدیث میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے: ''اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ'' ② موت مومن کے لئے تحفہ ہے۔ ''يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ'' ③ جو ایک عاشق کو اس کے محبوب حقیقی تک پہنچاتا ہے۔ اگر عاشق ہوتو محبوب کے پاس جانا مطلوب ہوتا ہے یا مکروہ؟ جو عاشقِ خُداوندی ہے اس کو اللہ سے ملنے کی تمنا ہوگی اور اللہ سے نہیں مل سکتا جب تک بیچ میں موت نہ آئے۔ تو موت درمیانی واسطہ ہے۔ اس واسطے کے بغیر محبوب سے نہیں مل سکتا۔ بہرحال جب ولایت ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔ اس وقت ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو واقعی موت کے شائق ہیں۔ لیکن ہم اور آپ جیسے جن کو طبعاً موت مکروہ ہے۔

ملائکہ علیہم السلام اور ملک الموت کے اَعوان وانصار آ کر انہیں موت کی ترغیب دیتے ہیں کہ کس گندے عالم میں پڑے ہوئے ہو۔ اس عالم کی طرف چلو جہاں روح وریحان ہے اور اس رب کی طرف جو کبھی نامہربان نہیں ہوگا اور اس کی مہربانی دوامی ہوگی۔ جب اس کے دل میں انعام کی ذرا مضبوطی ہوتی ہے اور وہ راضی ہوجاتا ہے۔ پھر نزع شروع ہوجاتا ہے۔ لیکن بعض ایسے ہیں کہ ان کے چہرے دیکھ کر بھی پوری طرح آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ طبعاً موت مکروہ ہے اور جان آمادہ کرکے نکالنی ہے۔ گویا ظاہری طور پر جبراً اس کو کھینچنا نہیں ہے۔ یہ مومن کے ساتھ لطف اور مدارات کا برتاؤ ہے۔ تو حدیث میں ہے اس وقت ملائکہ اس کو کچھ تحفے لاکر دکھلاتے ہیں۔ یہ چیزیں جب سامنے آتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر پھر مومن اپنے قابو میں نہیں رہتا اور ایک دم بہادری کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ پھر اس طرح سے روح نکلتی ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی مشک کو تم الٹا کردو۔ تو

---

① المعجم الکبیر للطبرانی ج:۳ ص:۲۷۸. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۳۰۹. ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ عزوجل ج:۸ ص:۱۷. روایت ضعیف ہے، دیکھئے: کشف الخفاء رقم: ۲۶۶۷.

③ یہ حبان الاسود کا قول ہے دیکھئے۔ فیض القدیر ج:۳ ص:۳۰۷.

غرغرا کر ایک ایک قطرہ ٹپک جاتا ہے اور باقی نہیں رہتا۔ اس طرح سے روح پرواز کر جاتی ہے۔ اس وقت یہ کہا جاتا ہے۔ ﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً o فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ o وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴾ ①

تو بالواسطہ ملائکہ پیغام دیتے ہیں کہ اُخْرُجِیْٓ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الطَّیِّبَةُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّیِّبِ اُخْرُجِیْٓ اِلٰی رَوْحٍ وَّ رَیْحَانٍ وَّرَبٍّ غَیْرَ غَضْبَانَ ② اے پاک روح چلی آ۔ تیرا بدن بھی پاک تھا اور خود بھی تو پاک ہے۔ یہ تو ملائکہ علیہم السلام کے واسطے سے بشارت ہوتی ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست پیغام دیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ خود پکارتے ہیں یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o...... اے نفس مطمئنہ آ۔ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ﴿ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ﴾ ③ لوٹ اپنے پروردگار کی طرف کہ تو خود بھی اپنے پروردگار سے راضی تھا اور تیرا پروردگار بھی تجھ سے راضی۔ یہ اس وقت کا خطاب اور بشارت ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کو ہوگا۔ یہ تو وہ واقعہ ہے جو ہر بندے کو پیش آئے گا۔ مگر یہ خطاب صرف مومن کے لئے ہوگا۔

مؤمن کے لئے اعلان رضا کی بشارت...... بشارت اس میں کیا ہے؟ ﴿رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً﴾ ④ یہ بشارت ہے۔ یعنی اے نفس مطمئنہ آ اور ہماری طرف لوٹ۔ اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی۔ اعلان رضا یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔ مومن کو کہا جائے گا تو ہم سے اور ہم تجھ سے راضی۔ مومن کے راضی ہونے کے کیا معنی؟

بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا کون سا انسان ہے جو اللہ سے راضی نہیں ہے۔ سوائے چند دہریوں کے جو خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں ہیں۔ باقی پوری دنیا خدا سے راضی ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب کی ہو۔ مذہب کی بنیاد ہی خدا کے وجود پر اور اس کے ماننے پر اور اس سے راضی ہونے پر ہے۔ کیا ایک یہودی کہہ دے گا میں اللہ سے راضی نہیں ہو؟ کیا کوئی عیسائی کہہ دے گا کہ میں اللہ سے ناراض ہوں؟ یا ایک مشرک جو سینکڑوں خداؤں کو مانتا ہے اور کہتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے۔ یہ بھی یہی کہتا ہے کہ میں اس سے راضی ہوں۔ غرض مومن کے لئے یہ کون سی نئی بات ہے۔ سارے اللہ سے راضی ہی ہیں۔ مومن کی کیا خصوصیات ہے؟

احادیث کے اندر اس رضا کی تفسیر فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ ایک تو رضا خدا کی ذات کے ساتھ ہے۔ ایمان کے لئے یہ تنہا کافی نہیں ہے۔ یوں تو ہر قوم کہے گی کہ ہم خدا سے راضی ہیں۔ جب تک ان افعال الٰہیہ کے ساتھ رضامندی نہ ہو، جو بندے کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ یعنی ہر تقدیر پر راضی اور ہر اس فعل پر راضی ہو جو اللہ اپنے بندے کے ساتھ کر رہا ہے۔ یہ ایمان کے لئے ضروری ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، جیسے خالق و مالک ہیں، رب بھی ہیں۔

---

① پارہ: ۳۰، سورة الفجر، الآیة: ۲۷ تا ۳۰. ② السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له ج: ۱۲ ص: ۳۱۴. ③ پارہ: ۳۰، سورة الفجر، الآیة: ۲۸. ④ پارہ: ۳۰، سورة الفجر، الآیة: ۲۸.

رب کے معنی پالنے والے کے ہیں۔ پال پرورش کے اندر وہ افعال بھی کئے جاتے ہیں، جن سے ظاہری طور پر بندہ خوش ہو جائے اور ایسے افعال بھی کئے جاتے ہیں جن سے بظاہر وہ ناراض بھی ہے۔

ماں بچے کو پالتی ہے تو جیسے چمکارتی ہے تھپڑ بھی تو مارتی ہے۔ جیسے پیار کرتی ہے کبھی کبھی طمانچہ بھی مارتی ہے۔ باپ جیسے بچے کو کھلاتا پلاتا ہے، کبھی کبھی مکتب میں نہ جانے پر یا پڑھنے میں کوتاہی کرنے پر سزا بھی دیتا ہے۔ کبھی یہ بھی کہہ لیتا ہے کہ میرے گھر سے نکل جا۔ تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا دل میں محبت موجود ہے مگر کہہ رہا ہے کہ گھر سے نکل جا اور کبھی جوش میں کہہ دیتا ہے کہ اب اگر تو نے کوتاہی کی تو دیوار سے دے کر تجھے ماروں گا۔ کیا واقعی اس کا جذبہ یہ ہے کہ بچے کو دیوار میں دے مارے۔ صرف ڈرانے دھمکانے کے لئے ایسا کہتا ہے۔ غرض جیسے پیار کرتا ہے کبھی کبھی سزا بھی دیتا ہے۔ تو ماں اپنی مامتا کے سبب جیسے پالتی اور پرورش کرتی ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی سختی بھی کرے اسے بھی تربیت کہتے ہیں یہ تربیت سے خارج نہیں ہے۔

اگر بچہ ماں کے دودھ پلانے پر خوش ہو جائے روٹی کا نوالہ کھلائے تو بھی راضی رہے اور جب تھپڑ مارے تو کہے کہ نہ تو میری ماں ہے نہ میں تیرا بیٹا ہوں۔ تو کہا جائے گا کہ بڑا نامعقول اور نا خلف بیٹا ہے۔ جیسے اسے ماں کے دودھ پلانے پر راضی ہونا چاہئے تھا ویسے ہی ماں کے تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تھپڑ مارنا بھی اس کی مصلحت کے لئے ہے۔ کیوں کہ ماں کا جذبہ عداوت کا نہیں، محبت کا ہے۔ اگر نہ مارے گی بچے کی راہ ہی درست نہ ہوگی۔ خلف صالح وہ کہلائے گا جو باپ کے چمکارنے اور تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہے۔ کھانا کھلانے پر بھی راضی اور جب سزا دے کہ تو پڑھنے کیوں نہیں گیا۔ ایک وقت کی روٹی بند کر دے۔ تو بھی راضی ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ میری ہی مصلحت کے لئے ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ایک دودھ پیتا ہوا بچہ اس وجہ کو سمجھتا ہے جسے کوئی شعور نہیں جب ماں دودھ پلاتی ہے جب بھی وہ ماں کی گود میں جاتا ہے۔ جب طمانچہ مارتی ہے تو روتا جاتا ہے۔ مگر دوڑتا ماں ہی کی طرف ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس گود کے سوا میرے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے۔ میرا ٹھکانہ یہی ہے۔ بہر حال جب کھلانا پلانا اور سب چیزیں دینا یہ تربیت ہے۔ تو کبھی کبھی تھپڑ مارنا یہ بھی تو تربیت ہے۔ بندہ وہ ہے کہ اللہ کے ہر فعل پر راضی ہو۔ اگر وہ تونگر بنا دے، تو جتنا اس وقت راضی ہو، اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جب وہ ساری نعمتیں چھین کر مفلس بنا دے۔ تب کہا جائے گا کہ یہ صحیح معنی میں اللہ کا بندہ ہے جتنی رضامندی نعمت میں ہو، اگر وہ مصیبت بھیج دے تو اتنی ہی رضامندی مصیبت میں بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ بندہ کو مصیبت بھیجتا ہے تو کسی عداوت کے سبب نہیں۔ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے یہ بھی تربیت کا حصہ ہے۔

بعض دفعہ نعمت دے دی جاتی ہے۔ مثلاً بے شمار دولت دے دی، اقتدار دے دیا، لیکن بندے نے اس کو غلط طریق سے استعمال کرنا شروع کیا۔ بجائے اس کے شکر گزاری سے رات دن اپنے پروردگار کے آگے جھکتا اس

نے تعیش میں آ کر اسی دولت کو خدا سے بے گانہ ہونے کا ذریعہ بنالیا۔ تو انصاف اور عقل سے سوچئے کہ تھپڑ مارنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔؟ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ تنبیہ کی جائے۔ اس لئے کبھی کبھی دولت چھین لیتے ہیں۔ حقیقۃً وہ چھیننا نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ ہمارے خزانے میں کمی تھی۔ لاؤ اس سے چھین کے بھرلو بلکہ ایک تنبیہ مقصود ہوتی ہے۔ شاید یہ اس چھیننے سے عبرت پکڑے اور باز آ جائے اور جس برائی کی طرف جارہا ہے۔ پھر توبہ کر کے ہماری طرف رجوع کرے جس کو قرآن کریم میں ایک موقع پر فرمایا گیا ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِکَ فَاَخَذْنٰھُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّھُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ﴾ ① ''ہم دنیا کی قوموں کو کبھی کبھی مصیبت سے آزماتے ہیں، کبھی کبھی خوف میں مبتلا کرتے ہیں، کبھی دشمنوں کو مسلط کر کے آزماتے ہیں۔ تاکہ یہ دوبارہ تضرع اور زاری کے ساتھ ہماری طرف رجوع کریں ہماری پناہ ڈھونڈیں۔''

بہت سی قومیں ہیں کہ عبرت پکڑ کے جھک جاتی ہیں۔ پھر ان پر مزید انعاموں کی بارش ہوتی ہے لیکن بہت سے ہیں کہ پھر بھی نہیں جھکتے۔ آگے اس کا ذکر کیا ﴿فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَھُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰکِنْ قَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ ② ''ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب ہماری طرف سے مصیبت بھیجی جائے۔ تو یہ جھک کر تضرع اور زاری اختیار کریں''۔ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے کہ ان کے دل پتھر ہو چکے ہیں۔ یہ عبرت قبول نہیں کرتے۔ نصیحت کا اثر ان پر نہیں ہوتا۔ اور شیطان نے یہ زندگی ان کے سامنے اتنی آراستہ کر دی ہے کہ اگلی اور دوسری زندگی کا وہم ہی نہیں گزرتا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو قبضے کی زندگی ہے۔ اس کو کوئی چھیننے والا نہیں ہے۔ اس درجہ ان کے سامنے دنیا مزین ہو جاتی ہے، اس کی رنگینیوں میں الجھ کے رہ جاتے ہیں۔ دوسری طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ تو جسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ وہ چھین بھی سکتا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُکِّرُوْا بِہٖ﴾ ③

جب نصیحتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور بھلا دیتے ہیں اور جتنی یاددہانی کی گئی سب اکارت جاتی ہے تو ﴿فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ کُلِّ شَیْءٍ﴾ ④ ہم بھی آزمائش کے لئے ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ہر طرف سے دروازے کھل گئے۔ عزت، آبرو، رزق کے، اشیاء اور سامانوں کے، اولاد کے بھی۔ ﴿حَتّٰٓی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا﴾ ⑤ جب وہ مطمئن ہو گئے کہ اب تو وسائل زندگی قابو میں ہیں۔ اب چھننے والے نہیں ہیں۔ کون ہے جو ہم سے لے لے؟ ﴿فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا﴾ ⑥ مگن اور مطمئن ہو گئے، انجام کو بھلا چکے۔ پھر ﴿اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً﴾ ⑦

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۲. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۳. ③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.

④ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴. ⑤ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴. ⑥ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.

⑦ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴.

اچانک ہم پھر پکڑ کرتے ہیں اور عقاب کا پنجہ آ کر پڑتا ہے۔ ﴿فَإِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾ ① اب حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ مصیبت کہاں سے آ گئی؟ اس کا تو وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ یہ آفت کہاں سے آ گئی؟ ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② اس وقت ظالموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ ظلم اور ظالم دونوں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ربوبیّت الٰہیّہ میں جیسے انعام ہیں ویسے انتقام بھی ربوبیت کے لئے ہے۔ جیسے دینا ربوبیّت ہے، چھیننا بھی ربوبیّت ہے۔ تو عبرت ونصیحت دلانے کے لئے کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں۔

اللہ کی ذات سے ہی نہیں اس کے اَفعال پر بھی راضی رہنا چاہئے ...... حاصل یہ نکلا کہ بندہ صحیح معنوں میں وہ ہے جو اللہ سے راضی ہے۔ اس کے افعال سے بھی راضی ہو۔ یعنی اس کے دینے پر اور چھیننے پر راضی ہو۔ اس کے انعام پر بھی راضی ہو اور کبھی سزا یا انتقام لے تو اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جتنا نعمت پر تھا۔ اس لئے کہ نعمت اور مصیبت بھیجنے والا اللہ ہے اور حکمت کے ماتحت بھیجتا ہے، بندے پر شفقت کے ماتحت بھیجتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمت پر ہم راضی ہو جائیں اور بھیجی ہوئی مصیبت پر نہ ہوں۔ دونوں پر یکسانی کے ساتھ رضا مندی ہونی چاہئے۔

اس لئے راضی اس بندے کو کہیں گے جو اللہ کی ذات سے ہی نہیں، بلکہ اس کے اَفعال سے بھی راضی ہو۔ اس کی تقدیرات سے بھی راضی ہو۔ اس کے معاملات سے بھی راضی ہو اور جب بندہ اتنا راضی ہو گیا کہ نعمت میں بھی راضی اور مصیبت میں بھی راضی۔ نعمت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ مصیبت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ تو پھر ادھر سے رضا شروع ہوتی ہے کہ یہ بندہ پسندیدہ ہے۔ ہر حالت میں اپنا ہے، لہٰذا ہم بھی اس کے۔ یہ اگر ہم سے راضی ہو تو ہم بھی اس سے راضی۔ اسے نہ عیش کا دھیان، نہ مصیبت کا دھیان اسے تو عیش اور مصیبت بھیجنے والے کا دھیان ہے۔ نہ یہ عیش میں الجھا ہوا ہے نہ مصیبت میں۔ اس کا دھیان تو ہماری طرف ہے۔

ہمارا دہلی کا جو آخری بادشاہ ظفر تھا۔ کچھ بے چارہ صوفی مزاج تھا ہی کچھ مصائب اور آفات نے اسے بنا دیا تھا اور بہترین شاعر بھی تھا۔ اس نے ایک قطعہ اپنے ان مصائب کے وقت کہا تھا۔ بڑی عبرت کی اور بڑی عجیب بات کہی، پہلی بات تو اس نے یہ کہی کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر	رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی جو اپنی خرابیوں پر جو نظر	تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!!

دوسروں کو آدمی اس لئے برا کہتا ہے کہ اپنی برائی اس کی نگاہ میں نہیں ہوتی اور اگر اپنی برائی سامنے آئے تو دوسرے کو معذور سمجھے گا، بلکہ اچھا سمجھے گا۔ کسی عرب کے شاعر نے کہا کہ ؎

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۴۔ ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۴۵۔

لعمری إن فی ذنبی لشغلا　　بنفسی عن ذنوب بنی امیة

خدا کی قسم مجھے اپنے گناہوں کا اتنا شغل ہے کہ مجھے بنی امیہ کے گناہ یاد کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ تو ظفر کہتا ہے کہ

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر　　رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر　　تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!!

اور آگے کہتا کہ

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا　　گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

اسے آدمی نہ سمجھنا، خواہ کتنا ہی دانا اور دانش مند ہو۔

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی　　جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

تو آدمی وہ ہے کہ عیش میں بھی اللہ کو نہ بھولے اور طیش میں بھی، نعمت میں بھی نہ بھولے مصیبت میں بھی نہ بھولے۔ دنیا میں نعمت بھی آزمائش کیلئے ہے۔ مصیبت بھی آزمائش کے لئے ہے۔ بندہ وہ ہے کہ دونوں حالتوں میں پورا اترے۔ اسے کہیں گے کہ یہ اللہ سے راضی ہے اس لئے رضا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب اللہ کے قائل ہوگئے اور ہم اس کی ذات سے راضی ہیں۔ اس طرح تو مومن اور غیر مومن دونوں راضی ہیں۔ مومن کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افعال سے، اس کی تقدیرات سے اور اللہ اپنے بندے کے ساتھ جو معاملہ کرے اس سے راضی۔ اگر وہ نعمت بھیج کر بادشاہ بنادے۔ تو کہے اے اللہ! میں راضی ہوں۔ تیرا بندہ ہوں اور اگر یوں کہے کہ اس تخت کو چھوڑ کر جا کر اس وقت جنگ کرو۔ وہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں، میں جا کر جنگ کروں گا اور اگر کہے کہ جان دے دو تو بندہ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں اور اگر کہے کہ ہم سب مال چھیننا چاہتے ہیں۔ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں۔ اس لئے کہ آپ جو کچھ بھی کریں گے میری مصلحت سے کریں گے۔ آپ کے افعال میں کوئی غرض نہیں ہوسکتی آپ غنی عن العالمین ہیں۔ حق تعالیٰ اپنے کسی نفع کے لئے بندے کو نہ نعمت دیتے ہیں نہ مصیبت ان کو نفع نقصان سے کیا تعلق؟

حدیث میں ہے کہ اگر سارے بندے مل کر اتقی قلب ہوجائیں۔ سب کا قلب ایسا بن جائے جیسے انبیاء کا قلب ہوتا ہے تو میرے ملک میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کرسکتے۔ اور اگر سب کے قلوب شیطان کے قلوب بن جائیں تو میرے ملک میں ذرہ برابر نقصان نہیں کرسکتے۔ اللہ کو نہ نفع کی پرواہ نہ نقصان کی نہ وہ نفع کا محتاج نہ نقصان کا۔ اس لئے جو کچھ بھی ہے بندے کی مصلحت کے لئے ہے اور بندہ اس پر ہر طرح سے راضی ہے، اس کو راضیۃ کہا گیا ہے۔ اس حالت میں تو ہمارے پاس آرہا ہے کہ تو راضی تھا۔ دنیا میں ہم نے جو معاملہ تیرے ساتھ کیا تو نے اس پر رضا کا اظہار کیا۔ ہر حالت اور ہر تقدیر پر راضی رہا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تجھ سے راضی نہ ہوں؟ ہم تجھ سے راضی ہیں۔

آدمی صاحبِ نسبت کب ہوتا ہے؟...... حضرات صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کا نام نسبت ہے۔ یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں صاحب نسبت بزرگ گزرے ہیں، اربابِ نسبت میں سے ہیں۔ اس نسبت کے معنی یہ ہیں کہ بندے کو اللہ سے اتنا قوی تعلق پیدا ہو جائے کہ وہ اللہ سے راضی، اللہ اس سے راضی۔ جانبین سے جب رضا ہوگی تو کہیں گے کہ آدمی صاحبِ نسبت بن گیا۔ جہاں ایک طرف سے رضامندی ہو وہ صاحب نسبت نہیں۔ اللہ بھی راضی ہو جب صاحب نسبت بنے گا۔ جیسے نکاح اس وقت ہوتا ہے کہ عورت بھی راضی ہو۔ مرد کہہ دے کہ صاحب میں تو راضی بس ہو گیا میرا نکاح اور عورت راضی نہیں۔ نکاح کیسے ہوسکتا ہے؟ جانبین کی رضا شرط ہے۔ جب یہ تعلق مضبوط ہوگا۔ اس سے نیک ثمرات پیدا ہوں گے۔ آگے اولاد ہوگی تو جانبین کی رضا سے نکاح منعقد ہوتا ہے۔

اس طرح سے حق تعالیٰ شانہ، کے ساتھ جو تعلق ہے وہ جانبین سے ہوگا تب کہا جائے گا یہ بندہ صاحب نسبت ہے کہ یہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی ہے۔ تو بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی اور اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو گیا۔ حتیٰ کہ اگر یہ بندہ کوئی غلطی بھی کر گزرے گا۔ تب بھی ناراض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ منشاء صحیح ہے۔ رضامندی سے کر رہا ہے۔ بھول چوک ہو گئی، کام غلط ہو گیا، اس لئے وہ بھی ناراض نہیں ہوتے۔ یہ وہ مقام ہے جس کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ۔ ”یا رسول اللہ! آپ کی ذات بابرکات عجیب وغریب ہے کہ اللہ میاں آپ کی خواہش پوری کرنے کے لئے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ آپ میں خواہش پیدا ہوئی اور پوری ہوئی۔ حق تعالیٰ آپ کی ہر خواہش اور نفس کے تقاضے کے ساتھ ہیں۔“ ①

اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس اللہ کی رضا میں اتنا فانی ہے کہ اس نفس سے خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ہوتا ہی نہیں۔ جو ہوگا رضا کے مطابق ہوگا لہٰذا وہ پسندیدہ ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا پاک ہوتا ہے کہ نفسانی خواہش بھی ابھرتی ہے۔ وہ بھی عین حق وصواب ہوتی ہے۔ اگر نبی بیوی کے پاس جانا چاہیں تو وہ خواہش نفسانی کہلاتی ہے۔ مگر نفس اتنا پاک ہے کہ اس میں بھی رضائے خداوندی مطلوب ہوتی ہے اس لئے ان کو اس میں بھی وہی اجر ملتا ہے جو آپ کو نماز اور روزے میں ملتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کا ہر فعل پسندیدہ ہے۔ کیونکہ نفس رضائے حق میں فانی بن چکا ہے۔ تو جو اتنے اللہ سے راضی ہیں کہ اس کی ہر تقدیر پر راضی، تو اللہ ان سے اتنا راضی ہے کہ ان کے ہر فعل پر راضی اور ان کا ہر فعل پسندیدہ۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ہے: **”اذا حکم الحاکم ثم اصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتھد ثم أخطا فلہ اجر واحد“** ② حاکم خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ صواب کرے گا تو دو اجر ملیں گے۔ خطا کرے گا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ تعالیٰ ترجی من تشاء منھن ج: ۴ ص: ۴۷۲ رقم: ۴۴۱۴۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب اجر الحاکم ج: ۲۲ ص: ۳۳۵ رقم: ۶۸۰۵۔

تو ایک اجر ملے گا تو خطا کرنے پر بھی اجر ملنا حالانکہ غلطی تھی۔ اس لئے کہ یہ اس غلطی میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ مسئلہ حق واضح ہو، اتفاق سے پہنچ نہیں سکا۔ تو اس نے جان بوجھ کر غلطی نہیں کی۔ بلکہ عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی اس واسطے یہ غلطی بھی کرتا ہے تو اسے ایک اجر دیا جاتا ہے۔ تو یہ کس لئے؟ کر تو رہا ہے خطا اور اوپر سے مل رہا ہے ثواب۔ غلطی کر رہا ہے اور ثواب دیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نفس رضاءِ حق میں فانی ہو چکا ہے۔ اس حالت میں غلطی بھی کر جائے گا۔ وہ بھی اس کا ثواب سمجھا جائے گا۔

این خطا از صد صواب اولیٰ تراست

یہ خطا بھی ہمارے صواب سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ فانی فی اللہ اور فانی فی الحق ہے۔

مقامِ صاحبِ نسبت...... اس مقام کے بارے میں فرمایا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "دَارَ الْحَقُّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ" ① حق ادھر ہی کو گھوم جاتا ہے جدھر کو حضرت عمر گھومتے ہیں۔ یعنی بظاہر تو یوں فرماتے ہیں کہ جدھر کو حق گھومتا ہے عمر ادھر گھوم جاتے ہیں۔ حق کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہا جا رہا ہے کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں حق ادھر گھوم جاتا ہے۔ یہ کب کہا گیا؟ جب عمر رضی اللہ عنہ رضائے حق کے اندر اتنے فانی ہو چکے تھے۔ کہ اب وہ جو بھی کرتے تھے وہ عین مرضی خداوندی ہوتا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کی رضا خود ڈھونڈتی تھی۔ جو وہ کہہ دیں بس وہی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ امور میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے وحی سے مل گئی۔ جو رائے دی اسی کے مطابق وحی نازل ہو گئی۔

حدیث میں ہے کہ ابتداء میں عام عورتوں کا پردہ نہیں تھا۔ مجلس میں ازواج مطہرات بیٹھتی تھیں، ذکر و تلاوت اور علم کی باتیں سنتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ کی مجلس میں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، بعض منافق بھی شامل ہوتے ہیں، مجھے پسند نہیں آتا کہ ازواج مطہرات چہرے کھول کر بیٹھیں۔

یہ رائے دی تھی اور اسی دن وحی نازل ہو گئی کہ: ﴿فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ ② اور ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ ③ "گھروں میں ٹھہری رہو، باہر مت نکلو"۔ جو رائے دی۔ عین اس کے مطابق وحی آئی۔ ④

اس طرح کے متعدد واقعات گزرے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رائے عرض کی اور وحی آ گئی۔ حدیث میں ہے کہ مقام ابراہیم، حج کرنے والے جانتے ہیں کہ طواف کرنے کے بعد دو رکعت اس طرح پڑھی جاتی ہے کہ مقام ابراہیم کو بیچ میں لے لیا جائے۔ تاکہ استقبال قبلہ کا کیا جائے اور بیچ میں مقام ابراہیم آ جائے طواف کا دوگانہ

① رحم اللہ عمر یقول الحق وان کان مر حضرت عمرؓ کی شان میں یہ حدیث آئی ہے بجائے حدیث بالا کے، دیکھئے: جامع الاصول لابن الجزری ج: ۱، ص: ۴۶۶۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۵۳۔

③ پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۳۔ ④ کنز العمال ج: ۱۳ ص: ۴ رقم: ۳۶۰۸۸۔

واجب ہے مگر اس شان کے ساتھ یہ ابتدائے اسلام میں نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام ابراہیم کے فضائل بیان کئے کہ یہ وہ پتھر ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور اس پر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پیر کا نشان بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فضائل بیان فرما رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''لَوْ كُنَّا نُصَلِّيْ خَلْفَهٗ......'' یارسول اللہ! کیسا اچھا ہو کہ ہم مقام ابراہیم کو بیچ میں لے کر نماز پڑھیں جس دن یہ کہا، اسی دن شام کو یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى﴾ (۱) ''مقام ابراہیم کو مصلّٰی بناؤ اور اسے درمیان میں لے کر دوگانہ ادا کرو''۔ (۲)

اس طرح کی متعدد چیزیں جو تقریباً بارہ ہیں۔ جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو رائے دی وحی بعینہٖ اس طرح سے نازل ہوئی۔ گویا ان کا ضمیر وحیِ خداوندی کا اِتّباع کرتا تھا۔ اِدھر ہی چلتا تھا جدھر وحیِ خداوندی آنے والی ہوتی تھی۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ'' (۳) اگر میرے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہوتا اور کوئی نبی آتا، تو عمر ضرور نبی بنائے جاتے۔ مناسبت نبوّت سے اتنی ہے کہ جو رائے دیتے ہیں۔ وحی اس کے مطابق آتی ہے۔ مگر یہ صورت کب ہوئی؟ یہ صورت جب ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نفس رضائے خداوندی میں بالکل فانی ہو گیا۔ اپنے نفس کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ اس حالت میں نفس میں بھی جو خواہش آتی ہے وہ بھی پسندیدہ، حق اور مرضی خداوندی ہوتی ہے۔ تو اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے ہر فعل پر اللہ راضی ہو جائے۔ حتی کہ اگر نفسانی خواہش بھی پیدا ہو تو اس پر بھی اللہ راضی ہو۔ اس لئے کہ اس کا منشاء حق کا طلب ہے اور بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی نعمت دے جب راضی، مصیبت دے جب راضی۔

اللہ کے ہر فعل پر راضی ہونے کا دنیا میں اِنعام...... حضرت عمران ابن الحصین رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک پھوڑا نکلا وہ ناسور بن گیا۔ کوئی بتیس برس تک اس کا زخم رہا۔ ہر وقت اس میں سے پیپ وغیرہ بہتی اور بتیس برس تک چت لیٹے رہے، کسی ایک جانب کو کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے لیٹے کھانا کھاتے اسی طرح وضو کرنا، اسی طرح نماز پڑھنا۔ اندازہ کیجئے جو شخص بتیس برس تک ایک کروٹ پر چارپائی پر پڑا رہے۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن حضرت عمران ابن الحصین کے چہرے پر وہ بشاشت تھی کہ کسی تندرست وتوانا کے چہرے پر بھی وہ رونق نہ ہو۔ جوان کے چہرے پر تھی۔

لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! تکلیف کا تو یہ عالم برسہا برس گزر گئے آپ اٹھ نہیں سکتے، کروٹ نہیں لے

(۱) پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۵۔ (۲) کنز العمال ج: ۱۳ ص: ۴ رقم: ۳۶۰۸۸۔

(۳) السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب فی مناقب عمر، ج: ۱۲ ص: ۱۴۶ رقم: ۳۶۱۹۔

سکتے چت لیٹے ہوئے ہیں۔ پھر اتنے ہشاش بشاش؟ ان دونوں باتوں کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا۔ فرمایا ''تکلیف آئی۔ میں نے رضا کا اظہار کیا کہ اے اللہ! میں راضی ہوں جس حالت میں تو رکھے میں راضی ہوں اس لئے کہ تو میری مصلحت کو جانتا ہے۔ میں اپنی مصلحت کو خود نہیں جانتا میں نے رضا کا اظہار کیا۔ وہ رضا میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔ میرے صبر و رضا سے اب یہ کیفیت ہے کہ میں چت لیٹے لیٹے ملائکہ علیہم السلام کی زیارت کرتا ہوں۔ عالم غیب مجھ پر منکشف ہے، عالم ملکوت مجھ پر روشن ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ یہ تکلیف جائے۔ اتنا میں راضی ہوں۔ تو جو اللہ کے افعال پر اور اس کی تقدیر پر ہر طرح راضی ہو جائے تو اللہ بھی اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ بھی کرے اللہ اس سے راضی اور یہ برا کرے گا ہی نہیں۔ جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔

جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں کہ مسلمان تنگی کی حالت میں تھے اور شام کی طرف رومیوں سے مقابلہ تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ فرمایا۔ لیکن اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جہاد ہونے والا ہے۔ اس کی یہ فضیلت ہے۔ اس کے لئے چندہ جمع کرو۔ مسلمان غربت کی حالت میں تھے۔ چندہ لا نہیں سکتے تھے۔ امراء میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے سو اونٹ مہیا کر کے ان کی زینیں، چادریں، ہر اونٹ کے مناسب ہتھیار، اس پر توشہ چڑھا ہوا کہ مجاہد بیٹھ کر کیا کھائے گا۔ اس طرح سو اونٹ مکمل لا کر پیش کئے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک کھل گیا اور چمک ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج آپ کے چہرے کے اندر دوڑ رہا ہے اور یہ لفظ فرمائے: ''مَا عَلٰی عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ'' ① ''آج کے بعد عثمان کچھ بھی کرے۔ اس کے اوپر کوئی وبال نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے کوئی برائی اور نا مرضی نہیں ہے۔ جو چاہے کرے''۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ کبیرہ گناہ کر لیں۔ جب بھی اللہ ان سے راضی ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آج کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نفس اتنا مطمئن بن گیا ہے کہ ان کی نفسانی خواہش بھی پاک ہو گئی۔ جو کریں گے وہ پسندیدۂ الٰہی ہو گا۔ یہ گویا رضا کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی۔

بشاشت کے ساتھ رضا کا اعتبار ہے مجبوری کے ساتھ نہیں...... تو انسان کے نفس میں اللہ سے اتنی محبت، تعلق اور اتنا اطمینان پیدا ہو جائے کہ اس کی ہر تقدیر پر وہ بشاشت کے ساتھ راضی ہو۔ مجبوری کے ساتھ نہیں صبر بشاشت کے ساتھ ہو۔ مجبوری کا صبر سب کو آ جاتا ہے۔ کیسی کے ہاں خدانخواستہ کوئی میت ہو جائے۔ تین چار دن کے بعد خود ہی صبر آ جاتا ہے مگر صبر وہ ہے جو بروقت ارادے سے کیا جائے۔ جب کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہو۔ اسے صبر کہتے ہیں۔ جیسے ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی اور بین کر کے رو رہی تھی اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بڑی بی! صبر کر! بڑی بی کو غم میں غصہ آ گیا۔ کہا تمہارے کوئی مر جاتا تب میں جانتی تم صبر کرتے میرا تو ایک ہی بیٹا تھا۔ گزر گیا میں کیسے صبر کروں؟ فرمایا اچھا تیری مرضی مت صبر کر۔

① السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان ج: ۱۲ ص: ۱۶۱ رقم: ۳۶۳۳.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوگئے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو پریشان ہوگئی اور دوڑی ہوئی پہنچی کہ یارسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ تھے اور آپ نے صبر کے لئے فرمایا۔ میں اب صبر کرتی ہوں آپ نے ارشاد فرمایا: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی'' ① صبر کا وہ وقت تھا جب صدمہ پڑا ہوا تھا۔ تین دن کے بعد تو سبھی کو صبر آ جاتا ہے۔ یہ تو مجبوری کا صبر ہے سب کو حاصل ہو جائے گا۔ صبر وہ ہے جو ارادے اور اختیار سے ہو اور اس حالت میں ہو جب کہ غم پڑا ہوا ہے اس وقت بندہ مطمئن ہو کہ جو کچھ ہے من جانب اللہ ہے اور اس کے اندر خیر ہی خیر ہے۔ میں راضی ہوں اور مطمئن ہوں در حقیقت یہ اطمینان رضا ہے۔

رضاءِ الٰہی پر اُخروی و اَبدی انعام...... غرض مومن کو یہ ایک بشارت مرنے کے بعد دی جائے گی کہ ﴿یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥﴾ ② اے نفسِ ''مطمئنہ''! تجھے اللہ کے ہر فعل اور ہر تقدیر پر اطمینان حاصل تھا۔ ''ضرّآء ہو یا سرّآء'' ہو، نعمت ہو یا مصیبت ہو، خوشی ہو یا غمی ہو۔ تو ہر حالت پر اللہ سے مطمئن تھا کہ جو ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے۔ تو اے نفس! جس کی یہ کیفیت تھی کہ اسے اللہ کے افعال پر طمانیت و بشاشت حاصل ہوگئی۔ اب تو اس حالت میں ﴿اِرْجِعِیْ﴾ ہماری طرف لوٹ کہ تو بھی راضی، ہم بھی تجھ سے راضی تو نے اپنی عمر رضا میں گزار دی۔

ہم اب تیری ابدی عمر اپنی رضا میں گزاریں گے کہ ہم تجھ سے راضی ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گے۔ جب تو اس مقام پر رہے تو ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ﴾ ③ اب تیرا نام میرے بندگانِ خاص میں لکھ لیا گیا ہے۔ تو ان میں داخل ہے مطلقاً بندے تو سبھی ہیں۔ کفار و فجار بھی اسی کے بندے ہیں۔ ابلیس بھی اس کا بندہ ہے۔ مگر عبادِ خاص نہیں ہیں۔ جن کو مقرب کہا جائے، جن پر عبد کا اطلاق آئے۔ عبد وہ ہے جس میں عبدیت ہو اور عبدیت مطلقہ۔ عبدیت کے معنی غلامی کے ہیں۔ یعنی اللہ کے سامنے ایسے غلامی ہو کہ جو بھی وہ کہیں بس اس کے سامنے راضی ہی راضی ہو۔ ناخوشی کا کوئی سوال نہ پیدا ہوا سے عبدِ مطلق کہتے ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں قرآن کریم نے تفویض کہا ہے: ﴿اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ ④ ''ہر معاملہ اللہ کو سونپتا ہوں''۔

تفویض میں راحت، تجویز میں مصیبت ہے...... جو وہ کرے میں مطمئن اور راضی ہوں۔ واقع یہ ہے کہ بندے کے لئے راحت بشاشت جتنی ہے تفویض کے اندر ہے۔ جتنی مصیبتیں ہیں سب تجویز سے آتی ہیں۔ خود ہم تجویز کرتے ہیں کہ یوں ہونا چاہئے۔ ویسا ہوتا نہیں، تو بیٹھ کے گھٹتے ہیں یہ مصیبت ہے۔ اور اگر شروع سے یہ کہہ دیں کے جو اللہ میاں کر دے کہ بس میں اس پر راضی ہوں. پھر خلاف طبع کوئی چیز پیش ہی نہیں آئے گی جب خلاف طبع نہیں

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور، ج: ۵ ص: ۹ رقم: ۱۲۰۳۔

② پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷۔ ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۹۔

④ پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۴۴۔

پھر مصیبت کیا ہوئی۔ مصیبت ہے، ہی اپنی تجویز اور جب تفویض کر دی۔ سارا معاملہ اللہ کو سونپ دیا اور یہ سمجھ لیا کہ جو ہوگا خیر ہوگا۔ قلب کے اندر گھٹن ہی پیدا نہیں ہوگی۔ نعمت آ جائے جب بھی راضی، مصیبتیں آ جائے جب بھی راضی۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو، جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا، آپ کیا اس درجے کے ہیں کہ دونوں جہانوں کے کارخانے آپ کی مرضی پر چل رہے ہیں، فرمایا ہاں الحمدللہ۔ میں اسی درجے کا ہوں۔

لوگوں نے کہا، آخر یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ فرمایا یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے. جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو کوئی چیز میرے خلاف طبع دنیا میں ہوتی ہی نہیں۔ کوئی پیدا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں، الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا، کوئی دنیا سے گزرتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ میں کون ہوں کہ اللہ کوئی کام کرنا چاہے میں کہوں کہ یہ نامناسب ہے نہ ہونا چاہئے۔

جیسے بعض لوگ اخبارات میں کسی بڑے آدمی کے انتقال کے موقع پر لکھ دیا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بے وقت موت سے ہمیں بڑا صدمہ پہنچا۔ اس بندہ خدا سے کوئی پوچھے کہ خدا کی طرف سے کوئی چیز بے وقت بھی ہوتی ہے۔ بے محل اور بے موقع بھی ہو سکتی ہے؟ یہ بڑی گستاخی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ آپ سے مشورہ لینا چاہیے تھا کہ کون سا وقت مناسب ہے۔ جس میں اس بندے کو موت دی جائے اور پھر موت دی جاتی۔ بڑی جرات کی بات ہے۔ موت جب آئے گی اپنے وقت پر آئے گی، مرضی الٰہی سے آئے گی ہم اس معاملہ میں گھسنے والے کون ہیں؟ کسی کی ولادت ہوگی اپنے وقت پر ہوگی۔ اس پر کسی کو صدمہ کرنے کا حق کیا ہے؟ ہر حالت میں بندہ کو رضا اپنانی چاہئے۔

تو اس بزرگ نے کہا کہ دونوں جہانوں کے کارخانے میری مرضی پر چل رہے ہیں. اس لئے کہ وہ اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ لہٰذا کوئی چیز دنیا میں خلاف طبع ہوتی ہی نہیں۔ یہ درحقیقت ان کی عبدیت کا مقام ہے کہ جو پیش آئے گا وہ من اللہ ہوگا اور جو من اللہ ہوگا وہ خیر ہوگا، وہی مصلحت ہوگا۔ اس پر ہم راضی ہیں ہمیں ناراض ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس مقام کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اے نفسِ ''مطمئنہ!'' جب تو نے اپنی زندگی میں نیکی سے، فلاح و رشد سے اپنے نفس میں طمانیت پیدا کر لی اور اللہ کے کسی فعل پر تجھے کوئی اعتراض باقی نہیں رہا۔ جو ادھر سے فعل ہوا، تو نے کہا ٹھیک ہے میں مطمئن ہوں تو جب تو نے اطمینان کا برتاؤ کیا۔ ہم بھی تجھ پر مطمئن ہو گئے جب تو ہم سے راضی، ہم بھی تجھ سے راضی۔

دنیا میں قانونِ مکافات کا عمل جاری ہے...... اس لئے کہ دنیا میں اللہ نے قانون مکافات جاری کیا ہوا

ہے۔ یعنی اَدل بَدل کا قانون کہ جیسا تم کروگے ویسا ہی تمہارے ساتھ برتاؤ ہوگا۔ ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ'' ① ''جیسی راہ تم اختیار کروگے، ویسے ہی تمہارے متعلق ادھر سے اختیار کی جائے گی''۔ بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ﴾ ② ''اگر تم گناہ کرنے سے لوٹ جاؤ گے ہم عذاب دینے سے لوٹ جائیں گے''۔ ﴿اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ ③ ''تم بدی کی طرف لوٹو گے ہم عذاب دینے کی طرف لوٹیں گے''۔ جیسا تم کروگے ویسا ہم کریں گے۔ ''مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآئَهٗ'' ''جو ہم سے ملنا پسند کرتا ہے۔ ہم بھی اس سے ملنا پسند کریں گے''۔ ''مَنْ کَرِهَ لِقَآءَ اللّٰهِ کَرِهَ اللّٰهُ لِقَآئَهٗ'' ④ ''جو ہم سے ملنا مکروہ جانتا ہے۔ ہم بھی اس سے ملنا مکروہ جانتے ہیں۔ ہم بھی اسے نہیں ملیں گے''۔ ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْکُمْ﴾ ⑤ ''تم اللہ کی مدد کروگے اللہ تمہاری مدد کرے گا'' ﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾ ⑥ ''تم ہماری یاد کروگے، ہم تمہاری یاد کریں گے''۔ غرض قانون مکافات ہے۔ جو برتاؤ بندے کا ہوگا، وہ اللہ کا بندے کے ساتھ ہوگا۔

اپنے بارے میں اللہ کی رضا معلوم کرنے کی کسوٹیں...... اس لئے اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ حق تعالیٰ کا تعلق میرے ساتھ کیسا ہے؟ تو وہ یہ دیکھ لے کہ اللہ کے ساتھ میرا تعلق کیسا ہے۔ اس پر قیاس کرلے ویسا ہی ان کا تعلق ہے۔ اگر آپ کی طبیعت میں اللہ کی طرف سے بعد ہے تو ادھر سے بھی بعد ہے۔ اگر آپ کی طبیعت میں رجحان ہے اور جھک رہے ہیں۔ ادھر سے بھی رحمت جھکی ہوئی ہوگی یہ کسوٹی ہے۔ ہر شخص پہچان سکتا ہے کہ اللہ کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہے۔ وہ اپنا معاملہ دیکھ لے اپنے سے قطع نظر کرکے اللہ کے معاملات کو دیکھنا چاہے۔ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا۔ شکایت پیدا ہو جائے گی کوئی برائی آئی اور شکایت پیدا ہوئی کہ یہ کفار سارے رہ گئے تھے مصیبت کے لئے میرا ہی گھر رہ گیا تھا مجھ پر ہی مصیبت بھیجنی تھی۔ حالانکہ میں مومن ہوں یہ شکوہ کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ اپنے معاملات پر نگاہ نہیں جب بندہ یہ دیکھے گا کہ میں کتنی عبادت کررہا ہوں کتنی اطاعت کررہا ہوں اور اللہ سے کتنا راضی ہوں، تو جتنی کوتاہی اپنے اندر ہوگی، سمجھ لے کہ اتنی رحمت کی ادھر سے کمی ہو جائے گی۔

اگر یہ پوری طرح سے متوجہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ادھر سے بعد ہو۔ غرض اللہ کے معاملات کو پہچاننے کی کسوٹی یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو اللہ سے دیکھ لے، حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم کیسے پہچانیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے یا یہ کہ ہم حق تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں۔

فرمایا اس پر دیکھ لو کہ تم اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہو۔ اگر پڑوسی کو ستاتے ہو، سمجھ لو کہ اللہ میاں کو بھی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب وسمیت ام الکتاب، ج:۱۳ ص:۳۸۵.

② پارہ:۹، سورۃ الانفال، الآیۃ:۱۹. ③ پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۸.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب من احب لقاء اللہ...... ج:۲۰ ص:۱۶۴ رقم:۶۰۲۶.

⑤ پارہ:۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ:۷. ⑥ پارہ:۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۵۲.

تم سے بعد ہے۔ اس کا معاملہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہوگا۔ اگر تم پڑوسی کے ساتھ انتہائی لطف وکرم کا معاملہ کرتے ہو۔ یقیناً امید رکھو کہ ادھر سے لطف وکرم کا برتاؤ ہوگا۔ تو کسوٹی بیان کر دی گئی کہ آدمی اپنے معاملے کو دیکھ کر اللہ کے معاملے کو پہچان لے۔ اس لئے اگر آپ خود اللہ سے راضی ہیں اور صبح سے شام تک آپ کے قلب کا رخ یہ ہے کہ جو پیش آ جائے، آپ مطمئن ہیں کہ میں راضی ہوں بس ٹھیک ہے میں شکر گزار ہوں۔ سمجھ لو کہ حق تعالیٰ بھی آپ کے ہر فعل سے راضی ہیں اور آپ کو اچھی راہ دے رہے ہیں۔ تم اسی راہ پر چلو گے جو ان کی پسندیدہ ہوگی اور اگر آپ ان کی راہ سے ناراض ہیں کہ وہ جو معاملہ کرتے ہیں آپ اس سے اکتاتے ہیں۔ وہ آپ کے معاملے سے ناراض ہیں آپ کی عبادت بھی ناپسندیدہ ہوگی۔ آپ لاکھ سجدے کریں جب دل میں ناراضگی ہے تو سجدے سے کچھ نہیں ہوتا۔

ایک ملازم اپنے آقا کی خدمت بہت کرتا ہے مگر آقا کے ساتھ اچھا خیال نہیں رکھتا اس کی خدمت آقا کے لئے تکلیف دہ بن جائے گی اور ایک ملازم ہے کہ دل سے محبت کرتا ہے مگر بے وقوف ہے۔ رات دن غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ آقا کہتا ہے اسے کچھ نہ کہو یہ میرا اپنا ہے۔ غلطی ہوئی تو کیا ہوا بندہ بشر ہے۔ غلطی ہوا ہی کرتی ہے۔ اس کی غلطی سے بھی راضی ہیں۔ تو اصل چیز قلب کا رخ اور قلب کا معاملہ ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے بندے! قیامت کے دن اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے زمین وآسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں تو میں اتنی ہی بڑی رحمت ومغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے قلب کے اندر ہو۔ (1) ہر بندہ دیکھ لے کہ اللہ کی کتنی عظمت اور بڑائی میرے دل میں ہے۔ آیا دولت کے مقابلے میں، میں دولت کی عظمت کو جانتا ہوں یا اللہ کی عظمت کو؟ اسے حاجت روا سمجھتا ہوں یا اللہ کو حاجت روا سمجھتا ہوں؟ جب کوئی معاملہ آتا ہے تو پہلے میری نگاہ اسباب کی طرف جاتی ہے یا مسبب الاسباب کی طرف۔ اسباب کو محض حکم برداری کے اِتباع کے لئے اختیار کرتا ہوں۔

اس لئے کہ نظر ہماری اسباب پر ہے۔ مگر چونکہ ہمارا عقیدہ بھی یہ ہے کہ کرنے والا وہی ہے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ کرنے دھرنے والے تو اللہ میاں ہیں۔ اسباب اختیار کئے جائیں گے۔ مگر اطمینان اسباب پر ہے مسبّبُ الاسباب پر نہیں ہے۔ اور ایک یہ کہ مسبّبُ الاسباب پر اطمینان ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ اسباب نہ بھی اختیار کریں تب بھی وہی نتیجہ نکلے گا۔ مگر حکمِ الٰہی ہے اس لئے ہم اسباب اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ تابعداری کے لئے اسباب اختیار کرتے ہیں۔ اسی ایک کسوٹی سے پتہ چل جائے گا کہ ہم اسباب سے کتنے اور مسبّبُ الاسباب سے کتنے راضی ہیں۔ اسی نے اللہ سے معاملہ سمجھ لیجئے کہ ویسا ہی برتاؤ ادھر سے ہوگا۔ غرض ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ'' ''جیسی آپ راہ اختیار کریں گے ویسی راہ ادھر سے اختیار کی جائے گی''۔

---

(1) الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم، ج: ۱۲ ص: ۴۵۵ رقم: ۴۶۷۴.

مومن کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے کافر کو نہیں......اس کو فرمایا گیا: ﴿اِرْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ﴾ ① اے نفس لوٹ کر آ یعنی ہم نے تجھے دنیا میں امتحان کے لئے بھیجا تھا۔ تو دنیا کی چیز نہیں تو آخرت کی چیز ہے۔ اب تو نے اپنی رضا واطمینان کا امتحان دے دیا اس لئے مقصد پورا ہو گیا۔ اس لئے اب واپس لوٹ کر ہماری طرف آ جا اس حالت میں کہ تو ہم سے راضی، ہم تجھ سے راضی۔

اب جو بندہ مطمئن نہیں ہے اسے ''اِرْجِعِیْ'' کہ ''لوٹ کے آ'' کا خطاب نہیں کیا جائے گا تو دنیا کا تھا، دنیا ہی میں رہ۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کافر کی روح جب چڑھتی ہے ملائکہ اسے لے جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس پر نفرین ولعنت کی جاتی ہے۔ وہیں سے اس کو پٹخ دیتے ہیں اور وہ جہنم کے طبقے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے۔ شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ اس آسمان سے نیچے نیچے جتنا علاقہ ہے وہ سب جہنم کا ہے۔ آسمان سے اوپر جتنا علاقہ ہے وہ سب جنت کا ہے۔ گویا ہم اور آپ اس وقت جہنم میں موجود ہیں۔ اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ایک رسی ٹانگ دی ہے کہ اس کو جو پکڑ لے گا وہ اس قید خانہ سے نکل کر ہم تک پہنچ جائے گا۔ اور وہ رسی کیا ہے؟ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ ② ''اللہ کی رسی کو مضبوط تھامو''۔

حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ'' ③ ''یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اللہ نے آسمان سے ٹانگ دی ہے۔ جو اس کو تھام لے گا اسے جہنم سے نکال کر اپنے تک پہنچا دیں گے''۔ گویا مومن اس جہنم سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کفار نے ایمان اختیار نہیں کیا۔ وہ جہنم میں موجود ہیں۔ جہنم میں ہی رہیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ وہ اب بھی جہنم میں ہیں۔ نکلنے والے نکل جائیں گے جو رہ گئے وہ رہ جائیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس عالم میں مومن کو اس لئے بھیجا ہے کہ اپنا امتحان دے کر لوٹ کر آئے۔ کافر کو اس لئے بھیجا ہے کہ تو جا رہا ہے تو اَبدالآباد تک وہیں رہے گا۔ اسی کو ہم جہنم کی شکل دے دیں گے۔ اس لئے کافر کو دنیا سے نکلنا نہیں ہے۔ مومن کو نکل بھاگنا ہے اس لئے ''اِرْجِعِیْ'' رجوع کرو۔ تو پہلے بھیجا گیا ہے۔ بعد میں رجوع کرایا گیا ہے کہ ہم نے برائے چند دن بھیجا تھا اب لوٹ آؤ۔

علت رجوع......اور کس حالت میں لوٹ آؤ؟ یہ گویا رجوع کی علت ہے کہ کیوں لوٹ کے آؤ؟ کیوں ہم اپنی طرف بلا رہے ہیں کہ تم ہم سے راضی ہو چکے ہو۔ جو ہم سے ناراض ہے۔ اسے ہم اپنے پاس نہیں بلانا چاہتے۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸۔

② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳۔

③ کنز العمال ج: ۱ ص: ۱۸۳۔ رقم: ۹۲۴۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۵ ص: ۲۳ رقم: ۲۰۲۴۔

تو ﴿ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ﴾ ① اس لئے کہ تم ہم سے اور ہم تم سے راضی ہو چکے اور جب تم ہم سے راضی اور ہم تم سے راضی، تو تمہاری جگہ ہمارے قرب میں ہے اس بعد کے عالم میں نہیں ہے۔ جس کو ہم دنیا کہتے ہیں۔ بعینہ یہی جہنم ہے۔ مومن کو اس سے نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس لئے کہ وہ ایمان قبول کر چکا کافر نکلنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ اس نے ایمان قبول نہیں کیا۔

جو بندہ نہیں بننا چاہتا، حق تعالیٰ اسے بندہ بنانا نہیں چاہتے ...... اور جو ایسا بندہ ہو کہ وہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی، بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا۔ حقیقی بندہ وہی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ﴿ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴾ ② میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو میرے بندگان خاص ہیں۔ انہوں نے بندگی کا انکار کر دیا جنہوں نے میرا دین نہیں مانا تو میں بھی انہیں بندہ نہیں کہتا جب وہ بندے بننا نہیں چاہتے ہم بھی انہیں بندہ بنانا نہیں چاہتے۔

جیسے حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کا مقولہ ہے کہ جب انہیں دفن کر دیا گیا تو جیسے حدیث میں ہے کہ دو فرشتے آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں "مَنْ رَّبُّکِ" تیرا رب کون ہے؟ ان کے پاس بھی منکر نکیر آئے۔ انہوں نے کہا "مَــنْ رَّبُّکِ" تیرا پروردگار کون ہے؟ تو رابعہ بصریہ تو ولیہ اور عارف باللہ تھیں۔ انہوں نے کہا مجھ سے پوچھتے ہو؟ رب سے پوچھو کہ وہ مجھے بندی سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ میں اسے رب جانتی ہوں یا نہیں اس لئے کہ اگر میں پچاس دفعہ کہوں کہ وہ میرے رب ہیں اور وہ یوں کہہ دیں کہ ہم تجھے بندی بنانا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ میرے کہنے سے کیا ہوگا؟ تو ان سے پوچھو کہ وہ مجھ کو اپنی بندی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ بعد میں مجھ سے پوچھنا۔ وہ فرشتے حیران ہوئے کہ یہ کس قسم کا بندہ ہے کہ جو ہم سے ہی سوال کرنے لگا۔ تو بات وہی ہے کہ بندہ وہی ہے جسے وہ بندہ بنالیں اور جسے وہ کہہ دیں کہ تو ہمارا بندہ ہی نہیں ہے۔ وہ نہ بندہ ہے نہ اس کا کہیں ٹھکانہ ہے۔ تو کافر نے صفائی سے کہہ دیا کہ میں آپ کا بندہ نہیں بننا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا غلام اور مطیع بننا نہیں چاہتا ہوں نہ آپ کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہوں وہ بھی فرما دیتے ہیں کہ یہ خود ہی اپنا ذمہ دار ہے۔ بے شک اسی عالم میں رہ جس پر تو راضی ہے ہم سے راضی ہوتا، ہماری طرف آتا تو ہم سے بعد پر راضی ہے تو اسی بعد کے عالم میں رہ۔ اور مومن کہتا ہے کہ امنّا باللہ ہم ایمان لے آئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آپ کی ہر چیز پر راضی ہیں۔ اس کو فرماتے ہیں کہ جب تو راضی ہے تو پھر ہم بھی راضی ہیں۔ پھر وہاں ٹھہرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اس لئے چلے آؤ۔ اس لئے "اِرْجِعِیْ" کا لفظ رکھا کہ لوٹ کر آ اور جب راضی و مرضی بن کر لوٹ کر آ گیا تو ﴿ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴾ ③ میرے عباد میں دخل ہو جا صحیح معنوں میں تو ہی بندہ ہے اور تو ہی میری جنت کا وارث اور مستحق ہے اور تو ہی اس قابل

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۳۰.

③ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۳۰.

ہے کہ تو اس مقام کریم وقرب میں پہنچ جائے۔

اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ویسے تو یہ آیت بہت سے علوم پر حاوی ہے۔ اس میں صبح سے شام ہو جائے، پورے نہ ہوں۔ لیکن میں نے موٹے موٹے تین مقصد اختیار کئے ایک واقعہ کے متعلق جو نزع کا پیش آتا ہے۔ ایک بشارت سے متعلق ہے جو اللہ کی طرف سے اس بندہ محتضر کو دی جائے گی کہ ﴿اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً﴾ ① اور تیسرا انعام ہے ﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ﴾ سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ تو میرے بندگان خاص میں داخل ہو جا اور اس مقام قرب میں تجھے داخل کرنے کی نوبت آ گئی جو شہر مطلوب ہے۔ جو ہمارے باپ کو دیا گیا تھا۔ پھر ایک لغزش کی وجہ سے وہ وہاں سے الگ کئے گئے ہم اور تم یہاں پیدا ہوئے وہاں پیدا ہوتے وہیں کے وارث ہو جاتے اور یہاں آ گئے۔ مگر آدم علیہ السلام سے کہہ دیا گیا کہ آپ کے اندر اس شہر مطلوب کی طلب موجود ہے۔ جہاں سے آپ کو نکالا گیا ہے اب وہاں تک پہنچنے کے لئے اس دنیا کی گھاٹیوں میں سے گزرنا ضروری ہے اور اس کے لئے میں اپنا قانون بھیجوں گا۔ جو اس قانون پر چل پڑے گا اسے واپس بلا لیں گے اور جو نہیں چلے گا وہ وہیں رہ جائے گا۔

اس واسطے میں نے یہ آیت پڑھی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا عرض کروں رات میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ کیا عرض کروں۔ جنہوں نے کہا تھا کہ کچھ بیان کرنا چاہئے میں نے کہا کہ بھئی! میں نے تو مکہ مکرمہ سے لکھا تھا کہ آکر اس مسجد میں نماز پڑھوں گا۔ تقریر کا نہیں کہا تھا۔ میرا مقصد تو صرف ملنا اور ملاقات کرنا ہے۔ وعظ وتقریر کرنا مقصد نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اعلان کر دیا۔ جب اعلان کر دیا میں نے کہا اب کوئی بات تو بتائی جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس پر ہمارے ایک دوست نے کہا اللہ کی رضا کے بارے میں کچھ کہہ دیا جائے کہ اللہ کی رضا اختیار کرنی چاہئے اس سے کچھ ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہوا۔ یہ گویا انہی کی رہنمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق عمل عطا فرمائے اور ہم کو راضی و مرضی بنائے اور اپنے عباد خاص میں داخل فرمائے اور اپنے مقام قرب میں ہمیں پہنچائے اور ہم سب کو اس مقام کریم میں جمع فرمائے۔ آمین

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ. بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ."

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸.

تعارف اہل حق

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ: ...... فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ○ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

کچھ اپنے بارے میں ...... بزرگانِ محترم! اس مجمع خیر و برکت میں جس میں بہت سے حضرات کی نورانی شکلیں اسٹیج سے نیچے بھی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ بھی ہیں کہ انکے چہرے مہرے سے دین ٹپک رہا ہے۔ دین کی علامتیں نمایاں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے باہر تک وہ دین کے دِلدادہ ہیں۔ انہیں حضرات میں ممکن ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں، جو ہم سے کچھ حسنِ ظن نہ رکھتے ہوں، کچھ خیالات کا تفاوت رکھتے ہوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرادوں۔ تاکہ اشتباہ باقی نہ رہے اور جسے ہماری بات سننی اور ماننی ہو، بصیرت کے ساتھ مانے اور نہ مانے تو نہ مانے۔ مگر ہم اشتباہ میں نہ ڈالیں۔

اس سپاسنامے میں یا نظم میں، یا حضرت العلامہ دام ظلہٗ کی زبان پر جو چیزیں بطور تعارف کہی گئی ہیں۔ وہ حقیقت میں میرا تعارف نہیں تھا۔ انہوں نے یہ اپنا تعارف کرایا ہے اس ناکارہ کے لئے اپنی عالی ظرفی، اپنی عالی حوصلگی، اپنی اُولوالعزمی اور اپنی ذرہ نوازی و خورد نوازی کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ان کا تعارف تھا۔ میرا تعارف نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرادوں۔

معیارِ تعارف اہل حق ...... لیکن تعارف سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تعارف کا کوئی معیار تو ذکر کیا جائے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جائے کہ یہ آدمی سچ کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے۔ ہمارے لئے کوئی کسوٹی ہونی چاہئے۔ جس پر پرکھ

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱-۳۲.

کر ہم یہ کہیں کہ فلاں کی بات سچی ہے یا غلط؟ تو پہلی چیز تعارف اور تعارف سے بھی پہلی چیز تعارف اور کسوٹی ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی ہے جس میں حق و باطل کا معیار ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جا سکتا ہے کہ کس کا قولِ حق ہے کس کا قول غلط ہے۔ کون سچی بات کہہ رہا ہے اور کون بات ہی بنا رہا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کے سامنے اس آیت کا ترجمہ کر دوں۔ اس کے بعد پھر اس کی تشریح عرض کر دوں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ① ''اے پیغمبر! اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آپ کی طرف وحی کی، علم قطعی بھیجا اور اپنی کتاب آپ کے اوپر اتاری''۔ تو اللہ نے جو کتاب کی صورت میں آپ کی طرف جو وحی کی ہے۔ سچی وہی ہے۔ وہ کسی کے حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ لوگ سامنے ہوں یا گرد و پیش میں ہوں ان کو اگر کچھ پرکھنا ہے تو رائے سے نہ پرکھا جائے، محض عقل سے نہ پرکھا جائے۔ بلکہ اس کسوٹی پر پرکھا جائے جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی ﴿هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ② یہ ہماری کتاب ہے، جو حق اور سچی ہے اور تمہارے سامنے اور تمہارے گرد و پیش کے حالات کی تصدیق اور تکذیب کا معیار ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ کتاب بھی آ گئی اور پیغمبر بھی آ گئے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں وہ تعلیم دے کر پردہ فرما گئے۔ تو کیا آگے دین ختم ہو گیا؟ اس لئے فرمایا ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ③ ہم نے اس پر بس نہیں کی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے لوگوں کو وارث بنایا کہ جن کو وراثت میں یہ کتاب اللہ ملی اور وراثت میں یہ حق ملا اور جنہوں نے اس حق کو قبول کیا اور وہ بھی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک کا وعدہ دیا کہ وہ آتے رہیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَاوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ. ④ ہمیشہ سلف کے بعد خلف کھڑے ہوں گے، جو اس علم کو لیتے رہیں گے، جو سلف صالحین لے کر آئے تھے اور اس علم کی روشنی سے غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ دروغ بافوں کی دروغ بافیوں کا پردہ چاک کریں گے۔ جاہلانہ اور رکیک تاویلات کا پردہ چاک کریں گے۔ تو قیامت تک یہ دین اصل حالت میں باقی رہے گا اور اسی طرح چلتا رہے گا۔

ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی کہ: ''اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا'' ⑤ ہر قرن کے بعد جب دوسرا قرن شروع ہوگا۔ تو اللہ ایسے لوگ بھیجے گا، جو دین کی

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱. ③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲. ④ مشکل الآثار للطحاوی، باب بیان مشکل ماروی یحمل ھذا العلم...... ج: ۸، ص: ۳۷۳، رقم: ۳۲۶۹. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مشکاۃ المصابیح بالتعلیق للالبانی کتاب العلم ج: ۱ ص: ۵۳. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی القرن المائۃ، ج: ۱۱ ص: ۳۶۲ رقم: ۳۷۴۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۹ ص: ۲۹۱ رقم: ۴۲۹۱.

تجدید کریں گے، اس کو نکھار دیں گے اور جتنی رکیک تاویلیں تھیں، ان کو کھول کر الگ کر دیں گے اور دین پھر اصل حالت میں آ جائے گا۔ ہر قرن پر ایسے لوگ آئیں گے جن کا نام مجدد ہے۔

قرن کی قید اس لئے لگائی کہ قرن عموماً سو سال کی مدت کو کہتے ہیں اور سو سال میں ایک نسل ختم ہو جاتی ہے۔ اگلی نسل شروع ہوتی ہے نئی نسل آتی ہے تو کچھ نئے نظریات بھی آتے ہیں، نئے افکار پیدا ہوتے ہیں، نئے حوادث اور واقعات سے دنیا دوچار ہوتی ہے۔ اس وقت ممکن تھا کہ نئے نظریات اور نئے افکار کی وجہ سے دین دب جائے یا ختم ہو جائے یا مشتبہ ہو جائے اس لئے اللہ نے ہر قرن پر ایک مجدّد رکھا۔ تاکہ ان نئے نظریات کے اندر دین کو پھر نکھار دے اور انہی نظریات کے مطابق ایسے دلائل کو پیش کرے، کہ دین پھر تازہ تازہ ہو جائے اور نئے افکار کا کوئی اثر دین کے اوپر نہ پڑے تو ہر قرن پر وعدہ دیا۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: ’’لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّھُمْ مَّنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللہِ‘‘ ① ’’میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت باقی رہے گی، جو وہی چیز کہے گی جو میں نے کہی، وہی عمل کر کے دکھلائے گی جس نوع کا عمل میں نے کیا ہے۔ انہیں رسوا کرنے والے رسوا نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا امر آ جائے اور دنیا ختم ہو جائے‘‘۔ دین اسی رنگ میں باقی رہے گا۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا تو پوری امت کے لئے وعدہ دیا کہ ایک جماعت حقّہ قائم رہے گی۔ ہر قرن پر وعدہ دیا کہ مجدّد آئیں گے پھر قرن کے اندر وعدہ دیا کہ سلَف کے بعد خلَف آئیں گے، جو علم لیتے رہیں۔ گے اور سلسلۂ علم کا منقطع نہیں ہوگا تو فرمایا کہ: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ② نبی کے بعد اور کتاب کامل اتر آنے کے بعد ہم ایسی قوم اور ایسے افراد کو وارث بنائیں گے، جن کو ہم منتخب کریں گے اور پسند کریں گے۔ لوگوں کی رائے پر نہیں ہوگا کہ وہ کہیں یہ مجدد ہیں، یہ معلم ہیں۔ ہم قلوب میں براہ راست ڈالیں گے کہ حق کہنے والے یہ ہیں۔

دین نقلی ہے عقلی اور اختراعی نہیں ہے...... بہرحال اس سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ دین نقلی اور روایتی ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ یعنی دین اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہے۔ کسی پارٹی یا مجلس کا ریزیویشن نہیں ہے۔ جنہوں نے بیٹھ کر دین بنا لیا ہو، بلکہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آیا ہوا ہے۔ عقلی اختراعات دین کی بنیاد نہیں ہیں۔ نقل و روایت دین کی بنیاد ہے۔ اس لئے دین کی جب بھی کوئی بات سامنے آئے گی تو پہلا مطالبہ یہ نہیں ہوگا کہ تم عقل سے اس کو کیا سمجھے؟ تم نے اپنے فکر سے کیا جانا؟ اللہ کی وحی کے مقابلے میں ہمارا فکر کیا چیز ہے؟ اور ہماری عقل نارسا کیا ہے کہ اس معیار پر دین کو پرکھا جائے، دین معیار ہے جس پر ہماری عقلوں کو پرکھا جائے گا کہ یہ عقل ناقص

---

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة رسول الله ﷺ ج: ۱، ص: ۱۲، رقم: ۱۰۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج: ۱ ص: ۸۷ رقم: ۸۷۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲۔

ہے یا کامل، اس میں کھوٹ ہے یا اصلیت تو دین معیار بنے گا، عقل معیار نہیں بنے گی۔ عقل کو دین اور وحی خداوندی کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دین روایتی اور نقلی ہے۔ عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔

نقلی کے معنی یہاں وہ نہیں جو ہماری اردو میں بولے جاتے ہیں۔ اردو میں نقلی اصلی کے مقابلے میں آتا ہے کہ یہ چیز اصل ہے۔ اور یہ چیز نقل ہے۔ اس میں اصلیت ہے اور اس میں ملمع سازی ہے نقلی کے یہ معنی نہیں ہیں۔ نقلی کے معنی روایت سے منتقل ہونے والی چیز کے ہیں۔ تو دین روایت کے ذریعے سے منتقل ہونے والی چیز ہے۔ عقل کی تجویز سے دین نہیں بنا۔

دین ایک غیبی حقیقت ہے عقل اس کی موجِد نہیں ہوسکتی...... وجہ اس کی یہ ہے کہ دین ”اَلطَّرِیْقُ الْمُوْصِلُ اِلَی اللّٰہِ...... “ کا نام ہے، وہ راستہ جو بندے کو اللہ تک پہنچائے، ظاہر ہے کہ بندہ جب اللہ کی طرف جائے گا تو راستہ اتنا لمبا اتنا کٹھن ہے کہ جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ یہ اس راستے کو نہیں سمجھ سکتا۔ حق تعالیٰ نے اپنا راستہ خود بتلایا کہ یہ میرا طریق ہے: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ج وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾ ① یہ میرا سیدھا راستہ ہے، اس کی پیروی کرو اور بعد میں جو عقلی اختراعات سے نئے نئے راستے نکلیں ان کی پیروی مت کرو۔ ورنہ تشتت، پراگندگی اور پارٹی بازی میں پڑ جاؤ گے۔ اصل دین کی تلاش کرو۔ تو ”اَلطَّرِیْقُ الْمُوْصِلُ اِلَی اللّٰہِ“ جو اللہ تک پہنچانے والا راستہ ہو۔ اللہ ہی بتائے گا جب اس کی مرضیات معلوم ہوں گی تو خدا کی مرضی عقل سے نہیں سمجھ سکتے اور محض گریبان میں منہ ڈال کر ہم پتہ نہیں چلا سکتے کہ اللہ کس چیز سے راضی ہے اور کس چیز سے نہیں۔

دو حقیقی بھائی ہوں جنہوں نے ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ہوں۔ وہ سینہ سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے قلب کی بات دوسرے کے قلب میں نہیں آئے گی۔ جب تک وہی خود نہ بتائے کہ میرے ضمیر میں یہ بات چھپی ہوئی ہے تو دو انسان ایک نوع، ایک جنس اور ایک اصل کی دو شاخیں، ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے۔ لیکن جب تک ایک ظاہر نہ کرے، دوسرا اس کے باطن کی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ تو اللہ ربّ العزّت کے باطن سے جو بات چلی ہے۔ اسے محض دور بیٹھ کر ہم کیسے سمجھ لیں گے؟ جب تک وہ خود نہ ظاہر کرے تو اس کی مرضی و نامرضی کا پتہ اسی کے کلام سے چل سکتا ہے ہماری عقل سے پتہ نہیں چل سکتا۔ عقل زیادہ سے زیادہ اس آگ پانی کے گھروندے میں کام کرے گی محسوسات تک پہنچے گی اور محسوسات تک پہنچتی ہوئی بھی ٹھوکریں کھائے گی جو عقل محسوسات کے دائرے میں بھی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ وہ غیب کی چیزیں کس طرح سے جان لے گی۔ وہ اس کا دائرہ ہی نہیں۔ وہ اپنے دائرہ کی بات کرے گی۔

آپ کی آنکھ ہے، وہ شکلیں اور صورتیں دیکھ سکتی ہے۔ کان ہیں، وہ آواز سن سکتے ہیں۔ زبان ہے جو ذائقے

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۳.

چکھ سکتی ہے اور یہ سب چیزیں دو تین انچ کے اندر جمع ہیں۔لیکن آنکھ کے دائرے میں کان قدم نہیں رکھ سکتا کہ کان یوں چاہے، میں صورتیں دیکھ لوں، نہیں ہوسکتا آنکھ چاہے کہ میں آوازیں سن لوں، تو کان کی طرف آنکھ کو رجوع کرنا پڑے گا۔آنکھ صورتیں دیکھنے کے لئے ہے، آوازیں سننے کے لئے نہیں اگر آپ ذائقہ چکھیں گے تو آنکھ لاکھ کوشش کرے کہ میں کھٹا میٹھا سمجھ لوں، نہیں سمجھ سکے گی۔تو اس چہرے میں دو انچ کے فاصلے پر ساری قوتیں جمع ہیں۔مگر ایک قوت دوسری قوت کے دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتی۔اسی دائرے میں جانا پڑے گا۔اس سے اوپر عقل کا درجہ ہے تو اگر آپ عقل سے یہ چاہیں کہ غیب کی چیزیں معلوم کروں۔تو عقل کی دوڑ صرف محسوسات تک ہے، وہ مغیبات تک نہیں پہنچ سکتی۔وہ علم کی موجد و ایجاد کنندہ نہیں ہے. وہ دریافت کنندہ ہے کہ علم سامنے آئے تو اس سے کچھ اصول نکال لے۔کچھ جزئیات سامنے آئیں تو کلیات نکال لے۔لیکن خود اصول و جزئیات بنالے یا واقعہ بنادے تو عقل موجد نہیں ہے جو واقعات کی ایجاد کرے۔ پیدا شدہ واقعات میں عقل غور کرسکتی ہے، مگر واقعات کو پیدا نہیں کرسکتی۔دین اللہ کی خبر اور حقیقت غیبی ہے۔اسے نہ عقل بناسکتی ہے نہ اس میں اختراع کرسکتی ہے۔اس کا تو اسے ساتھ دینا پڑے گا غلامی کرنی پڑے گی۔

عقل کو مغیبات میں وحی کا اتباع ضروری ہے...... عقل کو اسلام نے بیکار نہیں ٹھہرایا، یہ بہت کارآمد ہے۔اللہ نے عقل کے فضائل بیان کئے اور فرمایا، ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ'' (1) سب سے پہلے اللہ نے عقل کو پیدا کیا اور فرمایا، ''اَقْبِلْ'' سامنے آ، وہ سامنے آئی فرمایا، ''اَدْبِرْ'' پشت پھیر اس نے پشت پھیری۔فرمایا: تو ہی ہے جس کے ذریعے سے میں بہت لوگوں کو عزت دوں گا اور بہت کو ذلیل کروں گا۔تو عقل کوئی بے کار چیز نہیں لیکن اپنے ہی دائرے میں کام دے گی۔آنکھ بے کار چیز نہیں۔مگر صورت ہی مین کام دے گی، آوازیں نہیں سنے گی، کان بے کار نہیں ہیں۔مگر خوشبو نہیں سونگھیں گے۔اپنے دائرے میں کام کریں گے۔عقل سے بالاتر جب مغیبات کی چیزیں آئیں گی۔وہاں وحی اور خدا کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ اللہ جو غیب کی چیزیں بتلائے وہ ہم مانیں گے۔آپ کی عقل دنیا کی چیزوں میں اختراعات کرسکتی ہے لیکن یہ پتہ نہیں دے سکتی کہ عرش عظیم کیسا ہے یہ نہیں بتاسکتی کہ کرسی کی شان کیسی ہے۔جس کی قرآن کریم نے خبر دی۔ جنت کی نعمتیں کیا ہیں؟ جہنم کے عذاب کی کیا کیفیت ہے۔یہ عقل کا دائرہ ہی نہیں ہے جو لوگ عقل سے اس دائرے کو سمجھنا چاہتے ہیں، وہ ایسے ہیں جیسے آنکھ سے خوشبو سونگھنا چاہیں۔کان سے صورتیں دیکھنا چاہیں۔انکی عقل کے اوپر ماتم کیا جائے گا اس طرح ان کی عقلوں پر بھی ماتم کیا جائے گا جو غیبی چیزوں کے دائرے میں عقل کو لڑائیں جہاں اس کی رسائی نہیں ہے۔اس لئے لامحالہ

---

(1) ذکر هذا الحديث الصغاني في الموضوعات له، والسخاوي في الموضوعات و المقاصد الحسنة. و ابن الجوزي في تذكرة الموضوعات و اصحاب أُخر في كتب الموضوعات ولا يصح الحديث ولا الرواية به الا مع صراحة البيان لوضعه، نعم ذكره الرازي في تفسيره ولم يذكر قوله. حدیث موضوع (من گھڑت) ہے۔دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۷۵، وغیرہ.

عقل کو غیبی امور میں اتباع کرنا پڑے گا۔ وہاں اس دائرہ میں رہ کر پھر عقل موشگافیاں کرے گی۔ طرح طرح کے نکتے پیدا کرے گی۔ لیکن مقصد کو پیدا کر دے یہ کام عقل کا نہیں۔ یہ تو مقصد معلوم کر کے اس کی تشریح کرے گی۔ اس میں سے نئے نئے علوم پیدا کرے گی۔

قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے علیٰ وجہِ البصیرت ماننے کی دعوت دی ہے...... بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دین روایتی اور نقلی چیز ہے۔ جو منتقل ہو کر آیا ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی دین کا دعویٰ کرے گا۔ تو سب سے پہلے سند کا مطالبہ کیا جائے گا کہ یہ چیز تم تک کیسے پہنچی؟ کس راستے سے پہنچی؟ روایت کرنے والے کون ہیں؟ ان کا کردار اور کیریکٹر کیا ہے قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اس کے باوجود حق تعالیٰ نے اس کی سند کا اہتمام فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا کلام ہے۔ ہم دباؤ ڈالتے ہیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ بلکہ فنی طور پر اس کی سند بیان کی کہ سند کے ساتھ جب یہ ثابت ہوگا کہ یہ کلام خداوندی ہے، پھر ماننا فرض ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم دباؤ سے منوالیں یہ اللہ کا کلام ہے۔ لہٰذا مانو، ہم یہ زور نہیں ڈالتے، ہم فنی طور پر سمجھائیں گے۔ اس قرآن کریم کے اللہ سے آنے تک سند کے دو مرتبے ہیں۔ ایک اللہ سے رسول تک اور ایک پھر رسول سے ہم تک سند کے دو دائرے ہیں، دونوں دائروں میں حق تعالیٰ نے ہماری تسلی فرمائی ہے کہ سندِ متصل کے ساتھ پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ ہمارا کلام ہے پھر ماننے کا فیصلہ کرو۔ محض عقل اور خود رائی سے فیصلہ مت کرو۔

پہلی سند کہ اللہ سے کس نے کلام سنا ہے؟ اور کون ہے جو نبی تک لے کر آیا؟ اس سند کو حق تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا اور تفصیل بھی فنی طور پر کی۔ یعنی راویوں کے جو اوصاف ہیں۔ جن سے ان کی روایت معتبر ہوتی ہے۔ ان کا کردار جس سے بات سچی سمجھی جائے وہ بیان کی یہ نہیں کہا کہ ہمارا کلام ہے۔ تم ماننے کے لئے مجبور ہو۔ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام بیچ میں واسطہ ہیں۔ جو اُولوالعزم فرشتوں میں سے ہیں۔ سیّدالملائکہ ان کا لقب ہے۔ وہ واسطہ ہیں تو اللہ کا نام امین ہے، جبرئیل علیہ السلام کا لقب امین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب بھی امین ہے۔ تو امین سے کلام چلا، امین کے واسطے سے آیا، امین پر اُترا۔ یہ جو بیچ میں امین ہے۔ اس کے اوصاف کیا ہیں؟ حق تعالیٰ نے اسے ظاہر فرمایا اور سورۃ ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ میں اس کی تفصیل فرمائی۔ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ ① جبرئیل علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک رسولِ کریم کا قول اور اس کا پڑھایا ہوا ہے۔ تو اوّل تو رسول کا لفظ استعمال کیا کہ جو کلام لے کر آیا، وہ ہمارا قاصد ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سفیر یا قاصد، حکومت اسے بناتی ہے جس پر پورا اعتماد اور اطمینان ہو اس میں بغاوت کی بُو تک نہ ہو۔ حکومت کی ساری پالیسیوں کا دِلدادہ اور ان کا امین ہو۔ اگر گورنمنٹ کو ذرا بھی یہ شبہ ہو جائے کہ جس کو سفیر بنا کر دوسرے ملک میں بھیجا جا رہا ہے، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے یا اس کے اندر کچھ سرکشی کی خو بو ہے۔ وہ کبھی بھی

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹.

سفیر نہیں بنایا جائے گا۔ تو اللہ کی گورنمنٹ نے بھی اپنے کلام کے لئے ایسا سفیر و قاصد بنایا، جس کے اوصاف خود حق تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اَمین اور کون ہوگا۔ اس سلسلے میں پہلا لفظ تو یہ فرمایا کہ یہ کلام رسول کا ہے۔ رسول کے معنی ہی پاکباز کے ہیں۔ قاصد خداوندی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ پاکیزہ ہیں۔ اس کے اندر سرکشی کی بو نہ ہو، بغاوت کا رنگ ذرہ برابر نہ ہو۔ اس لئے اوّل رسول کہنا، یہ خود ان کی تصدیق اور توثیق ہے۔ جو شخصیت ہمارا قرآن لے کر آئی ہے یہ باوثوق ہے۔

پھر رسول کے آگے "کَرِیْمٍ" کا لفظ بھی بولا کہ رسول کرامت اور بزرگی والا ہے۔ دیکھا جائے تو رسول کے لفظ میں ہی ساری بزرگیاں آجاتی ہیں اور جب آگے یہ بھی فرمایا کہ کریم النفس ہے تو دو وصف جمع ہو گئے کہ اللہ کا قاصد اور اپنی ذات سے کریم النفس، اس کے اندر کوئی خدشہ نہیں، بغاوت کی بو نہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص کہے کہ رسول بھی ہو، قاصد بھی ہو، کریم النفس بھی ہو، لیکن دبّو قسم کا ضعیف آدمی ہو، پیام لے کے آیا۔ قوم نے جھڑ جھڑا کے کہا: کیا کہا تو نے؟ اپنی بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ڈر کے کہہ دے کہ جی میں یہ نہیں کہہ رہا تھا، تو ہوسکتا ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل علیہ السلام تو رسول تھے اور کریم النفس بھی تھے۔ مگر ضعیف اور دبّو قسم کے آدمی تھے۔ کیا اعتبار ہے۔ انہوں نے کلام کو بدل دیا ہو۔ اس لئے ایک جملہ آگے بڑھایا فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّةٍ﴾ ① طاقت ور فرشتہ ہے۔ ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اسے دبالے کوئی اسے دھمکی دے اور جو چاہے کہلوا لے تو کریم النفس رسول کا قول ہے جو طاقت ور ہے۔

جیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قوم لوط پر جب عذاب خداوندی نازل ہوا تو مجھے امر فرمایا گیا: میں نے ان کی ساری بستیاں ہتھیلی پر اوپر لے جا کر پلٹ دیں اور پوری قوم تباہ ہوگئی۔ یہ اس فرشتے کی طاقت ہے۔ ایسا آدمی دب کر کلام بدل سکتا ہے۔ جس کی یہ طاقت ہو؟ یہ عقلی طور پر بھی ناممکن ہے کہ وہ کسی سے دب کر کلام کہہ دے۔ جیسے بعض لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ نیک تو تھے۔ مگر ضعیف قسم کے تھے۔ انہوں نے آکر کہا کہ بھئی! سچی بات یہ ہے تو دوسرے نے لاٹھی اٹھائی۔ اس نے کہا نہیں نہیں میرا مطلب تو یہ تھا، یہ نہیں تھا جان بچانے کے لئے بات بدل دی۔ تو جبرئیل علیہ السلام ان میں سے نہیں ہیں۔

اس کے بعد ممکن ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل رسول بھی ہیں، کریم النفس بھی ہیں، طاقت ور بھی ہیں۔ مگر اللہ کا کلام بہت دور سے سنا، معلوم نہیں صحیح سنا ہے یا غلط سنا، کچھ کا کچھ سمجھ گئے ہوں۔ کچھ کی کچھ بات کان میں پڑ گئی ہو۔ تو ایسے راوی کی روایت کا کیا اعتبار، چاہے وہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو۔ مگر دس میل سے بات سن رہا ہے۔ کیا خبر پوری بات کان میں پڑی بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹-۲۰.

مَکِیْنٍ ﴾ ① ان کا مقام عرش والے کے پاس ہے کہیں دور نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہمارا کلام قریب سے سنتے ہیں، کہیں دور سے نہیں سنتے کہ آواز کے سننے میں فرق پڑ جائے۔ اگر کوئی راوی روایت کرے اور اسے اپنے شیخ سے ملاقات نصیب نہ ہو۔ اس کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی یا ملاقات ہو مگر دور سے ایک آواز سنی، دس احتمال ہیں کہ صحیح آواز پہنچی یا نہیں پہنچی۔ اس لئے راوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ کے قریب ہوتا کہ پوری طرح سے سن کر آئندہ روایت کر سکے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔

اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم نے مان لیا کہ جبرئیل رسول بھی ہیں، بہت پارسا ہیں، کریم النفس بھی ہیں، ان پر کریمی برستی ہے، طاقت ور بھی ہیں اور عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں، کہیں دور سے نہیں سنا۔ لیکن ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے۔ اس لئے ان کا وقار اور حیثیت عرفی کچھ نہیں ہے۔ لوگ اعتماد کیسے کریں؟

اس لئے کہ کلام میں حیثیت عرفی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہی بات میں کہوں اور وہی بات آپ کو انگلستان کی ملکہ کہے اس کا اور اثر ہوگا۔ بادشاہ یا وزیر اعظم اگر بات کرے تو عالم کی سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے۔ اس کے معنی نکلتے ہیں، حکومتیں اس سے نتائج مرتب کرتی ہیں وہی کلام میں بولوں، کوئی اثر نہیں کہ ہاں بھئی! اچھی بات ہے ایک نیک آدمی نے کہا ہے۔ ٹھیک کہا ہوگا۔ تو وہی کلام صاحب حیثیت کہے اور وہی کلام بے حیثیت کہے۔ اثرات میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس بنا پر جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں کوئی یوں کہے کہ ان کی کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے۔ اس لئے آگے فرمایا، ﴿مُطَاعٍ ﴾ ② وہ ''سَیِّدُ الْمَلٰئِکَہ'' ہیں۔ سارے ملائکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ آسمانوں میں ان کی سرداری مسلّمہ ہے۔ تو سارے ملائکہ جن کی شان یہ ہے کہ ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ ﴾ ③ اللہ کے پاکیزہ بندے ہیں۔ ﴿ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ﴾ ④ وہ عمل کرنے کے لئے اللہ کے قول کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔ منشاء دیکھتے ہیں کہ منشاءِ خداوندی کیا ہے اور اطاعت میں جھک پڑتے ہیں اور ﴿ وَلَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴾ ⑤ کبھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی۔ جو امر کیا جاتا ہے اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے اضافہ و کمی نہیں کرتے۔ تو سارے ملائکہ کمال امانت و کمال دیانت کے پیکر ہیں۔ ان ملائکہ کے سردار جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ تو اتنے پاکباز بندے کسی کی سرداری کو کیسے مان سکتے تھے جب تک کہ اس کی حیثیت اعلیٰ نہ ہو۔ آپ ذرا سا ایک امیر بنائیں تو اس کی خصوصیت دیکھتے ہیں۔ امیر حکومت اور بادشاہ الگ چیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امامت کے سلسلے میں دیکھیں کہ کسی کو آپ امام بنائیں گے تو خیال کریں گے کہ اس میں کوئی ایسی خصوصیت ہونی چاہئے کہ مقتدی اس کی اقتدا

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱۔

③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۶۔ ④ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۷۔

⑤ پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶۔

کرتے ہوئے کراہت نہ کریں۔

جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَاُھُمْ لِکِتَابِ اللّٰہِ'' ''امام اسے بناؤ جو سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو''۔''فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَآءَ ۃِ سَوَآءً'' اگر قرآن دانی اور قرآت میں سب برابر ہیں۔تو ''فَاَعْلَمُھُمْ بِالسُّنَّۃِ'' ① جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے امام بناؤ اور اگر قرآن اور سنت میں سب برابر ہیں، پھر اسے بناؤ جو مسائل صلوٰۃ سے پورا واقف اور کامل العلم ہو۔حتیٰ کہ لکھتے ہیں اگر اس میں بھی سب برابر ہوں، علم اور اخلاق میں بھی سب یکساں پھر اسے بناؤ جو زیادہ خوبصورت اور حسین وجمیل ہو۔مقصد یہ ہے کہ اقتدا کرنے والوں میں کوئی گریز اور اعراض پیدا نہ ہو۔تو جس کو آپ نماز کا امام بنائیں گے، اس میں بھی خصوصیات کا خیال کریں گے۔اگر آپ کسی کو ملک اور قوم کا امام بنانے لگیں۔تو اس میں کیا کسی خصوصیت کی رعایت نہیں کی جائے گی؟ سب سے زیادہ رعایت کی جائے گی۔حق تعالیٰ نے تمام ملائکہ کا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سردار بنایا اور ملائکہ وہ ہیں کہ عفت، عصمت اور پاکدامنی میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔اگر جبرئیل علیہ السلام کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی۔ملائکہ ان کی اقتدا نہ کرسکتے یہ اس کی دلیل ہے کہ جبرئیل صاحبِ حیثیت ہیں۔اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا، مطاعِ وہ واجبُ الاطاعت بھی ہیں۔یہ نہیں کہ ایرا غیرا اہم نے اپنا نائب یا سفیر بنا دیا۔ایسا نہیں، بلکہ تمام آسمانوں میں واجبُ الاطاعت ہیں سیّد الملائکہ ہیں۔تو اب گویا جبرئیل امین، رسول، کریم النفس، طاقت ور، عرش کے پاس مقیم اور واجبُ الاطاعت بھی ہیں۔لیکن اب کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ ساری باتیں مان لیں۔مگر بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وصف امانت میں کوئی خرابی ہوتی ہے ان تمام اوصاف کے باوجود یہ کمی ہے کہ رازداری کے اندر کچھ زیادہ کامل نہیں۔بعض لوگ نیک اور صالح ہوتے ہیں۔مگر پیٹ ان کا ذرا ہلکا ہوتا ہے۔ان سے کوئی رازداری کی بات کہو، وہ چند دن میں دنیا جان لیتی ہے اور راز فاش ہو جاتا ہے، نیکی اور بزرگی میں کلام نہیں۔مگر پیٹ کا ہلکا ہونا اور چیز ہے۔

جیسے ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا حبیبُ الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مجھ سے پہلے مہتمم تھے۔وفات کے دن چند باتیں بطور وصیت مجھ سے فرمائیں۔ایک بزرگ کا نام لے کر فرمایا، جو ہمارے استاذوں میں ہیں۔نہایت، پارسا، متقی اور صالح فرمایا ان کو راز کی بات کبھی مت کہنا۔اگر راز فاش کرنا ہو، تب تو کہنا اور اگر چھپانا ہو، تو ہرگز مت کہنا تو ساری خوبیاں تھیں۔مگر پیٹ کے ہلکے تھے۔جس چیز کا افشاء کرانا ہو۔بس ان سے کہہ دو۔اگلے دن وہ سارے بازار میں مشہور۔وہ ایک ایک کے کان میں ڈال دیتے تھے۔غرض سارے اوصاف کے باوجود پیٹ کا ہلکا ہونا ہوسکتا ہے۔اس لئے ایک جملہ اور فرمایا: ﴿ثَمَّ اَمِیْنٍ﴾ وہ امانت میں بھی کامل ہیں، گھٹیا درجے کے نہیں۔تو رسول، کریم، واجبُ الاطاعت، عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں اور ساتھ ساتھ امانت دار بھی ہیں حتیٰ کہ ان کا لقب ہی جبرئیل امین ہے۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ، ج:۳ص:۴۲۸ رقم:۱۰۸۷۔

اب ظاہر بات ہے کہ جب راوی میں یہ اوصاف ہوں کہ رسالت و بزرگی الگ صلاح وتقویٰ الگ اور قربِ خداوندی الگ تو کیا وجہ ہے کہ ان کی روایت کو نہ مانا جائے اور ٹھکرایا جائے۔ اگر پھر بھی کوئی ٹھکرائے۔ اس کے اوپر عقل خود ملامت کرے گی کہ یہ عقلی اصول کے خلاف ہے۔ روایت کے بارے میں رواۃ کے کیریکٹر اور کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ جب کردار صحیح ثابت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روایت پر اعتبار نہ کیا جائے۔

تو اللہ ربّ العزّت کلام کے نازل کرنے والے اور اللہ کی ذات بے عیب ذات ہے وہاں ادنیٰ نقص و کمی کی گنجائش نہیں۔ مصدر خیر و برکت ہے۔ ''اَلْخَیْرُ کُلُّہٗ مِنْکَ وَاِلَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ'' ① حدیث میں فرمایا گیا کہ اے اللہ! خیر ساری تیری ہے اور تیری ہی طرف لوٹ جانے والی ہے اور شر و برائی تیرے پاس نہیں پھٹک سکتی۔ حق تعالیٰ شانہٗ جو کلام فرمادیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں کسی قسم کے تامل کی گنجائش ہوتی تو راوی کی وجہ سے ہوتی کہ راوی میں خدانخواستہ کھوٹ ہے تو راوی کے فنی طور پر اوصاف بیان کئے کہ محض ہماری خدائی کی وجہ دبَ کر مت مانو جس کے ذریعے سے روایت کو بھیج رہے ہیں۔ اس کے اوصاف کو فنی طور پر پرکھو۔ کیا وجہ ہے کہ تم اس کی روایت نہ مانو جس کے یہ کامل اوصاف ہیں۔ تو اللہ بھی امین اور واسطہ بھی امین۔

اب آگے پیغمبر ہیں پیغمبر تو کہتے ہی اس کو ہیں جو معصوم ہو۔ جو ہر برائی سے بری اور بالاتر ہو۔ جو ہر وقت حق تعالیٰ شانہٗ کے اندر فانی ہو۔ ہر وقت رضائے خداوندی کے اندر مستغرق ہو کہ ذرہ برابر شائبہ بھی نہ ہو کہ وہ اللہ کی نارضگی کو لے سکتے ہیں۔ جن کی شان فرمائی گئی ہے۔ ''کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ'' ② حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت آپ کے قلب مبارک میں یاد، زبان سے ذکر الگ، قلب مبارک سے الگ، روح پر فتوح سے الگ، جسمانی حرکات سے الگ کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت حضوری اور جلال و جمال کا مشاہدہ ہے تو جو دربار خداوندی میں ہر وقت حاضر ہو۔ کیا اس کے متعلق یہ گمان ہوسکتا ہے کہ معاذ اللہ وہ غلط گوئی کرے گا؟ اور غلط گوئی بھی اللہ کے اوپر؟ عقل اس سے گریز کرتی ہے اور نہیں مانتی تو نازل کرنے والا اللہ، کلام کو لے کر آنے والے جبرئیل امین اور جن پر نازل ہوا، وہ پیغمبر اور نہ صرف پیغمبر بلکہ خاتم پیغمبراں، خاتم الانبیاء اور خاتم المرسلین۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نبوّت کے جتنے کمالات ہیں۔ وہ سب اس ذات پر لاکر مکمل کر دیئے گئے۔ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں کہ کسی اور نبی کو لاکر اس درجہ کو پورا کر دیا جائے۔ سارے کمالات، علمی، اخلاقی اور عملی ان سب کا منتہی ایک ذات کو بنادیا گیا۔

خاتم الدیانت والامانت کی روایت کی تکذیب ممکن نہیں...... اس لئے آپ کا نام خاتم ہے کہ خاتم الرسل اور خاتم الانبیاء ہیں۔ تو خاتم کے معنی یہ نہیں کہ نبوت کو ختم کر دیا اور نبوت قطع ہوگئی۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ

① الصحیح لمسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب الدعاء فی صلاۃ اللیل ج:۴ ص:۱۶۹ رقم:۱۲۹۰.

② الصحیح لمسلم، کتاب الحیض، باب ذکر اللہ فی کل حال، ج:۲ ص:۲۹۷ رقم:۵۵۸.

نبوت کی ایسی تکمیل ہوگئی کہ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے جو آپ کی ذات پر لا کر پورا نہ کر دیا گیا ہو تو خاتم کے معنی منتھائے کمالات کے ہیں جس پر آ کر کمالات منتہی ہو جائیں۔ اس لئے خاتم نبوت کے معنی قاطع نبوت کے نہیں ہیں کہ نبوت قطع کر دی بلکہ خاتم کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ ایک ذات کے اوپر تمام مراتب نبوّت کے ختم کر دیئے گئے۔ اب اس کا نور قیامت تک کافی ہے کوئی درجہ ایسا نہیں ہے کہ کسی نبی کو لا کر اس درجے کو پورا کر دیا جائے۔ ایک ہی آفتاب کا نور ہے۔ جو آخر تک جائے گا۔

جب رات میں آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ ایک ستارہ نکلا، دوسرا، تیسرا، اربوں کھربوں ستارے نکلے۔ سارے ستارے مل کر کتنا ہی نور پھیلائیں۔ وہ دن نہیں بنتا رات ہی رہتی ہے لیکن جب آفتاب کی آمد شروع ہوئی۔ ابھی نکلا نہیں صبح صادق ہوتی ہے کہ ستارے ایک ایک کر کے غائب ہونا شروع ہو گئے اور جب آفتاب نکل آیا تو ایک ستارہ بھی نظر نہیں پڑتا۔ اب آفتاب اگر یوں کہے کہ انا خاتم الانوار میں سارے انوار کا ختم کرنے والا ہوں۔ تو کیا یہ مطلب ہوگا کہ آفتاب نے نور ختم کر کے اندھیرا پھیلا دیا؟ خاتم کا مطلب یہ ہوگا کہ سارے ستاروں کے جتنے انوار تھے وہ تنہا میری ذات کے اندر جمع ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں ہے جب تک میرا دور باقی ہے میں ہی تنہا کافی ہوں۔ چاند مشتری اور زہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی سارے انوار کے پھیلانے کے لئے کافی ہوں۔ تو خاتم کے معنی مکمل کے ہیں نہ کہ قاطع کے۔ خاتم الانوار کے معنی قاطع الانوار کے نہیں کہ انوار قطع کر کے اندھیرا پھیلا دیا بلکہ تکمیل انوار کے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جو وصف کسی پر ختم ہوتا ہے۔ اس سے شروع بھی ہوتا ہے۔ وہی فاتح بھی ہوتا ہے، وہی خاتم بھی ہوتا ہے۔ مثلاً آپ یوں کہیں کہ آفتاب خاتم ہے۔ یعنی سارے انوار اس پر ختم ہو گئے۔ تو فاتح انوار بھی وہی ہے کہ اسی کے نور سے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ سارے فلاسفر لکھتے ہیں کہ چاند اور دوسرے ستاروں میں کوئی ذاتی روشنی نہیں ہے آفتاب کی روشنی پڑتی ہے، وہ چمک اٹھتے ہیں۔ ذات میں اگر روشنی ہے تو آفتاب کے ہے آفتاب اگر خاتم الانوار ہے تو فاتح الانوار بھی ہے۔ اس نے نور کی ابتدا کی ہے اسی پر آ کر انتہا ہوگئی۔

آپ یوں کہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام خاتم الآباء ہیں۔ یعنی آپ بھی باپ ہیں۔ آپ کے باپ بھی باپ تھے۔ ان کے باپ بھی باپ تھے ایک لمبا سلسلہ ہے تو سب کا باپ ہونا آدم علیہ السلام کے اوپر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ آگے کوئی باپ نہیں نکلتا جو خاتم الاباء ہیں وہی فاتح الاباء بھی ہیں۔ وہیں سے باپ ہونے کی رسم چلی ہے؟ اگر وہ نہ ہوتے۔ اگلے بھی باپ پیدا نہ ہوتے۔ اس لئے جو کسی وصف کا خاتم ہے وہی اس وصف کا فاتح بھی ہوگا۔

آپ یوں کہیں کہ حق تعالیٰ شانہ خاتم الوجود ہیں۔ آپ کا وجود میرا وجود، زمین و آسمان کا وجود سارے وجود اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ آگے کوئی نہیں ہے کہ وجود کا سلسلہ چلے، وجود کے سارے مراتب اللہ پر منتہی ہو گئے تو فاتح الوجود بھی وہی ہیں۔ وہیں سے وجود چلا جس سے ہم اور آپ موجود ہوئے اگر وہ وجود نہ دیتے۔ ہم

آپ کہاں سے موجود کہلاتے؟

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبوّت کہا گیا یعنی وصفِ نبوّت کے سارے کمالات آپ پر ختم کر دیئے گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جیسے آپ خاتم ہیں فاتح بھی آپ ہیں۔ نبوّت کی ابتداء بھی آپ سے ہی ہوئی ہے جس کو آپ فرماتے ہیں کہ "اَنَا اَوَّلُهُمْ خَلْقًا وَاٰخِرُهُمْ بَعْثًا" ① میں سب سے پہلا ہوں بلحاظ تخلیق کے اور سب سے آخری ہوں بلحاظِ بعثت کے کہ میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے آپ خاتم النبوّت اور آپ ہی فاتح النبوّت بھی ہیں۔

بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر نبوّت کے مراتب ختم کر دیئے گئے۔ اس لئے نہ جدید نبی آ سکتا ہے نہ اس کی ضرورت ہے۔ کوئی درجہ ہی باقی نہیں کہ نبی کے ذریعے اس کی تکمیل کرائی جائے۔ تنہا آپ کی ذات بابرکات کافی ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ نبوّت کے اوصاف میں امانت، دیانت، راست بازی، سچائی، عفت وعصمت اور پاکدامنی علیٰ وجہ الکمال ہونی چاہئیں۔ تو جب آپ خاتم النبوّت ہیں، تو پھر خاتم الحیاء بھی ہیں کہ حیاء کے مراتب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم الشجاعت بھی ہیں کہ بہادری کے مراتب بھی آپ کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم السخاوت بھی ہیں کہ سخاوت کے سارے مراتب آپ کے اوپر ختم ہیں۔ گویا آپ تمام کمالات پاکیزہ کا منتہی ہیں۔ اس واسطے جب آپ کو خاتم النبوّت کہا گیا تو خاتم الامانات بھی کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر امین بھی کوئی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دشمن کفارِ مکہ بھی آپ کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ تو امین کی طرف سے وحی آئے، امین لے کر آئے، امین کے اوپر اتری۔ جب ایک خبر تین امینوں کے بیچ میں ہے تو اس کے نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے انکار کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ دنیا ایسی ایسی چیزوں کو مان رہی ہے کہ سند کا بھی پتہ نہیں کہ اللہ سے کب چلی؟ کون لے کر آیا؟ کس نے لکھا؟ کہاں پہنچایا؟ تو جس کی سند اللہ سے لے کر نبی تک متصل ہے۔ اس کو بدرجہ اولیٰ ماننا چاہئے۔ پھر اس کے بعد آگے جو سند چلی ہے۔ وہ یہ نہیں ہے ایک دو نے قرآن کریم پڑھ لیا۔ لاکھوں کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سینے میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک ایک حرف اس کا محفوظ ایک ایک اعراب اس کا گنا ہوا، ایک ایک تشدید، جزم، زبر، زیر اور پیش اس کا گنا ہوا۔ اسی طرح رکوع، سورتیں سب گنی ہوئی ہیں۔

اِمتیازی حفاظت...... اور حفاظت اللہ نے کہاں کرائی؟ محض کاغذ سے نہیں کرائی۔ کاغذ کو سمندر میں ڈال دو، نوشتہ بھی گل جائے گا۔ کاغذ بھی گل جائے گا۔ کاغذ کو زمین میں دفن کر دو، زمین کھا جائے گی، کاغذ اور حروف بھی گم ہو جائیں گے۔ محض کاغذ ہو، اس کو دیمک بھی کھا سکتی ہے حروف ختم ہو جائیں گے۔ یہ سب آفات کاغذ اور تختی پر

① علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه البزار ورجاله موثقون الا ان الربيع بن انس قال عن ابى العالية اوغيره فتابعيه مجهول، دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱ ص: ۷۱-۷۲.

ممکن تھیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے ذریعے حفاظت نہیں کرائی بلکہ فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① یہ آیات بیّنات وہ ہیں جو ہم نے اہلِ علم کے سینے میں محفوظ کی ہیں۔ تو کاغذ کو دیمک کھا سکتی ہے مگر مومن کے دل کو دیمک نہیں کھا سکتی۔ وہاں آگ پہنچ سکتی ہے، یہاں آگ نہیں پہنچ سکتی۔ اس کو پانی گلا سکتا ہے۔ قلب پر پانی اثر نہیں کر سکتا۔ اس لئے قلب کے اندر محفوظ کیا گیا۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا کہ۔ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ② ''ہم نے ہی یہ ذکر مبارک اتارا۔ ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ پچھلی کتابوں کے بارے میں اللہ نے ذمہ داری نہیں لی تھی بلکہ اقوام کے اوپر ذمہ داری ڈالی تھی۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ﴾ ③ تورات ہم نے اتاری۔ اَحبار اور رُہبان پیدا کئے۔ جن کو تورات سکھلائی گئی: ﴿بِمَا اسْتُحْفِظُوْا﴾ اَحبار اور رُہبان کو حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ تمہیں اس کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا تم اس کی حفاظت کرو۔ تو وہ نہیں کر سکے، اصلیت باقی نہ رہی۔ قرآن پاک کے بارے میں یہ نہیں کہا اس لئے کہ یہ آخری کتاب تھی۔ اس کے بعد کوئی کتاب نہیں آنے والی تھی۔ آخری دین تھا اس کے بعد کوئی دین آنے والا نہیں تھا۔ آخری پیغمبر تھے۔ کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا۔ اگر اس کی حفاظت ہمارے اور آپ کے سپرد ہوتی تو وہی حشر ہوتا، جو پچھلی امتوں نے اپنی کتبِ سماویہ کا کیا، قرآن میں ردوبدل بھی ہوتا، محفوظ بھی نہ رہتا۔ آخری کتاب کی حفاظت اللہ نے اپنی ذمہ لی ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ④ ہم نے اسے اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اس حفاظت کو اللہ نے واقعی کس عجیب طریق سے پورا کیا۔ یعنی عموماً حفظ کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی اکثر حفظ نہیں کرتے اور کرتے بھی ہیں تو کچا رہتا ہے۔ بچے ایسا محفوظ کرتے ہیں، جو پورا پکا یاد ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اگر بڑے حفظ کیا کرتے، تو کہا جا سکتا تھا کہ بھائی یہ قرآن کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں اس ذمہ داری کو جانتے ہیں۔ سمجھ دار، دانا اور عالم ہیں۔ قرآن کریم کی حفاظت کر رہے ہیں۔ تو حفاظت اللہ کی طرف منسوب نہ ہوتی، لوگوں کی طرف منسوب ہو جاتی کہ بڑے علماء اور بوڑھے مشائخ مکتبوں میں بیٹھ کر یاد کر رہے ہیں۔ لیکن مکتبوں میں ایک بوڑھا نہیں ملے گا۔ پانچ پانچ چھ چھ برس کے بچے ہیں اور دس سال کی عمر میں قرآن کریم محفوظ۔ انہیں یہ خبر نہیں کہ یہ قرآن ہے کیا؟ انہیں یہ خبر نہیں کہ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ ان کے ذریعے جو حفاظت کرائی جا رہی ہے۔ یہ حفاظت خداوندی کہلائے گی۔ بچے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت نہیں کر رہے۔ اگر بوڑھے

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔
③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۴۴۔ ④ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

کرتے تو حفاظت ان کی طرف منسوب ہوتی۔ بچوں کے ذریعے سے حفاظت کرائی گئی۔ اس واسطے اللہ کی حفاظت کہی جائے گی۔ اور ہر قرن میں لاکھوں کی تعداد میں حافظ موجود رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص عیاذاً باللہ سارے قرآن کریم خرید کر دریا برد کر دے، قرآن مٹ نہیں سکتا ایک دن میں پھر لکھا جائے گا۔ وہ سینوں میں لکھا ہوا ہے۔ لکھے ہوئے سے ہم اپنی یاداشت کی حفاظت کرتے ہیں کہ کوئی متشابہ لگ گیا، کوئی غلطی ہوئی حافظ نے لکھا ہوا دیکھ لیا۔ مگر مدارِ حفاظت لکھا ہوا نہیں ہے۔ مدار حفاظت اہلِ علم کے سینے ہیں۔

پھر روایت تواتر کی ہے اور تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین تین آدمی بھی روایت کرتے چلے آئیں۔ وہ خبر متواتر کہلاتی ہے۔ یہاں تین تین سو اور تین ہزار نہیں بلکہ ہر دور میں لاکھوں روایت کرتے آرہے ہیں۔ تو لاکھوں کی تعداد میں جب حافظ موجود ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ وہ کلام ختم ہوسکے۔ یا اس کے اندر کوئی ردوبدل ہوسکے۔ بہر حال قرآن کریم کی اس شان سے حفاظت کرائی گئی کہ نازل کرنے والے نے خود حفاظت کی۔

مرادِ خداوندی اپنی رائے اور عقل سے متعیّن نہیں کی جاسکتی...... اب ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم دستورِ اساسی ہے۔ اس میں اصول بیان کر دیئے گئے۔ ساری جزئیات اس میں نہیں بیان کی گئی۔ اصول کلیہ ہیں ان سے جزئیات نکالتے رہو۔ ان کی شرح کرتے رہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث پاک سے آیتوں کی شرح کی۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ، مرادِ ربانی یہ ہے تو حدیث درحقیقت مبین ہے۔ اللہ کی مراد کو بیان کرتی ہے۔ محض اپنی رائے سے ہم سمجھ لیں کہ یہ مراد ہوگی۔ یہ ممکن نہیں ہے جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ میری مراد یہ ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے لغت عرب سے الفاظ لئے ہیں۔ ایک لفظ کے لغت میں اور معنی ہیں۔ قرآن نے اس میں دوسرے معنی ڈالے۔ وہ مراد ہوں گے لغوی معنی مراد نہیں ہوں گے مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ لغت میں اس کے دعا کرنے کے معنی ہیں تو آپ گھر بیٹھ کر دعا مانگ لیا کریں بس نماز ہوگئی۔ شریعت نے صلوٰۃ کا لفظ لغت سے لیا اور معنی اس میں اپنے ڈالے اس طرح نیت کرو، اس طرح ہاتھ باندھو، اس طرح رکوع وسجود کرو۔ یہ صلوٰۃ ہے تو صلوٰۃِ لغوی محض دعا مانگنا ہے اور صلوٰۃ شرعی وہ خاص افعال ہیں جو اللہ کے رسول نے بتلائے اگر رسول خود نہ بتلائیں کہ صلوٰۃ سے اللہ کی یہ مراد ہے، وہ مراد نہیں ہے جو تم نے لغت میں پڑھی تو صلوٰۃ کے معنی ہم کیسے سمجھیں گے؟ بس لغت میں جو لکھا ہے، وہ سمجھ لیں گے۔

یا مثلاً حج کے معنی لغت میں قصد کرنے کے ہیں۔ بس گھر بیٹھ کے آپ نے قصد کر لیا اور حاجی ہوگئے۔ یہ ہزاروں روپے خرچ کرنا اور ہوائی جہازوں سے مکہ پہنچنا اور عرفات میں جانا، یہ سب ضائع اور دوراز کار ہو جائے گا۔ شریعت نے جب اس لفظ کو لیا تو اس کے معنی مرادی بیان کئے کہ حج سے مراد ہماری یہ ہے کہ یوں احرام باندھو، طواف کرو، عرفات جاؤ، منیٰ اور مزدلفہ جاؤ، ذبیحہ کرو، اس سارے مجموعہ کو کہا کہ اللہ کی حج کے لفظ سے مراد یہ ہے اگر کوئی شخص محض لغت کے بل بوتے پر قرآن کا حج کرنے لگے اور حدیث کو ترک کر دے۔ جو اس کی شرح اور بیان

ہے تو مرادِ ربانی تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ اس کی نفسانی مراد ہوگی اور دنیا کو دھوکہ دے گا کہ اللہ نے یہ کہا حالانکہ لفظ اللہ کے لے رہا ہے اور معنی اپنے نفسانی بیان کر رہا ہے۔ یہ تلبیس اور دھوکہ دہی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن کریم نازل ہوتا تو آپ کبھی یہ نہیں فرماتے کہ اس آیت کے ایک معنی یہ بن سکتے ہیں، ایک معنی یہ بن سکتے ہیں اور زمانے کے مناسب حال یہ معنی ہیں۔ لہٰذا اللہ کی یہ مراد ہے۔ جس طرح اللہ نے لفظ نازل کئے اللہ ہی نے اس کی مراد اور اس کا علم آپ کے قلبِ مبارک پر اُتارا جس کو آپ نے کھولا۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جب وحی آتی تھی تو آپ رٹنا شروع کر دیتے تھے تاکہ الفاظِ خداوندی میرے سینے میں محفوظ ہو جائیں، کہیں بھول نہ جاؤں۔ حق تعالیٰ نے روکا، فرمایا ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① ''اے نبی! اپنی زبان کو حرکت مت دو۔ تم اسی لئے تو جلدی کرتے ہو کہ بھول نہ جاؤں''۔ فرمایا ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ''یہ ہمارا ذمہ ہے کہ تمہارے سینے میں محفوظ کر دیں گے تمہاری زبان سے پڑھوا دیں گے تم اس کی فکر مت کرو''۔

﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ جب ہم قرات کرنے لگیں، تمہارا کام یہ ہے کہ تم سنتے رہو۔ جمع و محفوظ کر دینا اور زبان سے پڑھوا دینا یہ ہمارے ذمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا اللہ جیسے لفظوں کا نازل کرنے والا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح معانی کا بھی ذمہ دار ہے۔ نبی کے قلب کے اوپر معانی بھی خود ہی نازل فرماتا ہے۔ چنانچہ اگلا جملہ یہ ہے۔ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ④ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا اور اس کو بیان کر دینا۔ قرات پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق زبان سے ہے اور بیان کہتے ہیں کھول دینے کو۔ اس کا تعلق سینے اور قلب سے ہے۔ تو لفظ زبان سے پڑھے جائیں گے اور معنی سینے سے سمجھے جائیں گے۔ حق تعالیٰ نے الفاظ کی حفاظت میں جو لفظ استعمال کیا وہ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ﴾ کہ ہم پر لازم ہے ہم حفاظت کریں گے۔ وہی لفظ معانی کے لئے بھی استعمال فرمایا کہ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ⑤ ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کرنا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ ⑥ ''اے نبی! ہم نے تم پر یہ قرآن نازل کیا تا کہ تم کھول کھول کر مخلوق کو سمجھا دو کہ اس لفظ سے اللہ کی یہ مراد ہے، اس لفظ سے یہ مراد ہے''۔ جب مراد وحی سے متعیّن ہوگئی۔ اب اس میں غور و تدبر کرو۔ تو وہ علوم و معارف کھلیں گے جو اللہ کی مراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مراد کو عقل اور فکر سے متعین نہیں کریں گے مراد علم الٰہی اور کلامِ پیغمبر سے متعین کریں گے پھر اس میں عقل سے غور و فکر کریں گے۔ اس میں نئے نئے علوم پیدا ہوں گے۔ وہ

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔
③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔ ④ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔
⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔ ⑥ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

قرآنی علوم ہوں گے اور اگر مراد ہی عقل سے متعین کرو، وہ نفسانی مراد ہوگی، خدائی مراد نہ ہوگی، لغت کی مراد ہوگی شریعت کی مراد نہیں ہوگی۔ حاصل یہ کہ سنتِ نبوی مرادِ ربانی کو متعین کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلے میں بھیجا کہ ان سے جا کر مناظرہ کرو، تو یہ نصیحت فرمائی کہ خوارج کے مقابلے میں قرآن سے کوئی دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے پیش کرنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے امیر المومنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی ہے کہ: ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْـهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' ① ''اے اللہ! ابن عباس کو کتاب کا علم اور حکمت دے''۔

تو میرا خاص مضمون کتاب اللہ کے علوم ہیں اور انہی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں ان سے دلیل نہ پکڑوں۔ سنت سے دلیل پیش کروں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ ''اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ وُجُوْهٍ'' ② قرآن کے جملے بلیغ ہیں اور کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر خوارج کے مقابلے میں ایک آیت سے ایک معنی بیان کرو گے۔ وہ اسی آیت سے دوسرے معنی بیان کریں گے اور تم پر حجت قائم کریں گے۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں، وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو حق و باطل واضح نہیں ہوگا۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے مراد متعین کرو گے۔ اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں۔ مراد متعین ہو جائے گی تو سنت درحقیقت مرادِ ربانی کو متعین کرتی ہے کہ اللہ کے یہ معنی مراد ہیں۔

اور سنت میں بھی اگر عموم ہو تو پھر اس کی مراد مجتہد فقہ سے متعین کرتا ہے جو ائمہ مجتہدین ہیں وہ آیتوں میں غور وفکر اور تدبر کرتے ہیں۔ رات دن ان کا اوڑھنا بچھونا قرآن کی آیتوں میں تفکر وتدبر کرنا ہے اور قرآن میں سے وہ ایسے مسائل نکال لیتے ہیں کہ ہمارا فہم وہاں تک نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ علم کے درجات ہیں۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ③ سارے عالم ایک ہی درجے کے نہیں ہوتے بعضے ادنیٰ، بعضے اوسط، بعضے اعلیٰ اور بعضے افضل ہیں۔ جب انبیاء میں بھی درجات قائم ہیں۔ ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ④ بعض رسولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ تو علماء تو بعد کی چیز ہیں ان میں بھی تفاضل موجود ہے، بعض ادنیٰ واوسط درجے کے اور بعض اعلیٰ مرتبے کے۔ تو اعلیٰ مرتبے کے علماء قرآن کریم سے جو اس کے حقائق سمجھیں گے ادنیٰ و اوسط مرتبے کے نہیں سمجھیں گے اور ان سب سے اوپر جن کو اللہ نے ملکہ اجتہاد دیا ہے وہ جو سمجھیں گے، وہ عوام علماء بھی نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب ایک فقہ کا مسئلہ سامنے آ جائے گا کہ واقعی یہ آیت سے نکل رہا ہے تو ہماری بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ اس لئے وہ شریعت سے الگ نہیں ہوتا۔ تو قرآن کریم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کنواں ہو، اس سے

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباس رضی اللہ عنہما، ج: ۱۲ ص: ۱۰۰ رقم: ۳۴۷۳. ② الدر المنثور ج: ۱ ص: ۱۰. ③ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۱۱. ④ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۳.

پانی جاری ہے اور اجتہاد ایسے جیسے ڈول رسی تو آپ ڈول ڈال کر پانی نکالیں گے تو وہ پانی جو ڈول دے رہا ہے۔ وہ کوئی الگ پانی نہیں ہے۔ اس کنویں میں سے نکل کر آیا ہے ڈول اس کے نکالنے کا ذریعے بن گیا۔ اسی طرح امام مجتہد کا اجتہاد قرآن کے مخفی علوم نمایاں کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ قرآن پر کسی خاص قسم کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ زیادتی کمی کا کسی کو حق نہیں ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ: ''اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَا مُثْبِتٌ'' ''قیاس کسی مسئلے کو ثابت نہیں، ظاہر کر سکتا ہے، قرآن میں چھپا ہوا تھا قیاس کرنے والے مجتہد نے اسے نکال کر سامنے رکھ دیا''۔ بہرحال اوّل کتابُ اللہ، پھر سنتِ رسول اللہ۔ سنت رسول اللہ کے بعد مجتہد کا اجتہاد ہے۔ اس کے بعد اجماعِ اِمّت ہے۔ تو ہم جس مسئلہ کو بھی دیکھیں گے پہلے قرآن میں تلاش کریں گے، پھر قرآن کی شرح جو حدیث ہے، اس میں تلاش کریں گے۔ پھر اس کی شرح میں جو فقہ ہے، تلاش کریں گے۔ اس کے بعد پھر امّت کا تعامُل دیکھیں گے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور ائمہ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم کا کیا عمل رہا، اس سے کٹ نہیں سکتے، جہاں ایک طرف علمی دائرہ ہے۔ وہ محض لفظوں تک محدود ہے لیکن اس کے ساتھ ایک عملی دائرہ ہے کہ تمام سلفِ صالح اجماع کر چکے ہیں اور وہ ایک ہی چیز سمجھتے آرہے ہیں۔ تو تعامل اور عمل امت کو معتبر سمجھا جائے گا اور امّت کے عمل کا مطلب زید، عمرو، بکر اور میرا تمہارا عمل نہیں۔ ان علماء ربانی اور صلحاء و مشائخ حقانی کا عمل ہے۔ جنہوں نے قرآن و حدیث کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ علیہ، تبع تابعین رحمہم اللہ علیہ، مجتہدین رحمہم اللہ علیہ، محدّثین رحمہم اللہ علیہ وفقہاء رحمہم اللہ علیہ ہیں۔ یہ اجماع کریں اور عمل کا راستہ ڈال دیں تو یقیناً اس عمل کا ماخذ کتاب و سنت میں ہے اور غور کرتے ہیں تو وہ ماخذ نکل آتا ہے یہ نہیں کہ وہ کوئی الگ چیز ہے۔

مسائل دینیہ میں مطالبہ سند اس امّت کا ذوق ہے...... بہرحال اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ادھر تو قرآن کی سندِ متواتر، ادھر حدیث کی سندِ متواتر۔ یعنی کلام رسول کی اس امت نے وہ حفاظت کی ہے کہ دوسری قومیں اپنے کلام خداوندی کی وہ حفاظت نہیں کر سکیں۔ حدیث کا ایک ایک لفظ اور راویوں کی پوری سند علماء بیان کرتے ہیں۔ ''حَدَّثَنَا فُلَانٌ'' مجھ سے فلاں، اور فلاں نے اس سے، اس نے اس سے اور اس سے فلاں نے بیان کیا۔ یہاں تک کہ سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک چھوٹے سے جملے کے لئے بھی یہی طریق کار ہے۔ تو ایک ایک حدیث کی سند محفوظ حتی کہ مسلمانوں نے پچاس ہزار راویان حدیث کا کیریکٹر اور تاریخ مرتب کر دی اور ایک فن بنا دیا۔ جس کو فن اسماء الرّجال کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے نام اور کردار و کیریکٹر جو حدیث کے راوی ہیں ان کا حافظہ ایسا تھا۔ تقویٰ ایسا تھا، خاندانی نسبت ایسی تھی تو ایک ایک چیز لکھی اور اسے تاریخ کا جز بنا دیا۔

تو جب قرآن کی سند متواتر، کوئی حدیث سند سے خالی نہیں، پھر فقہ میں بھی یہی صورت ہے۔ یعنی اس امت کی عادت یہ پڑ گئی کہ بے سند کے کوئی چیز نہ مانے مثلاً ''الهداية'' (جو فقہ کی مستند اور مشہور زمانہ کتاب ہے۔

ایک عرصہ سے داخل درسِ نظامی ہے) اس کی سند دی جاتی ہے کہ ہدایہ کی روایت مصنف ہدایہ سے کس نے کی اور اس سے کس نے اور اس سے کس نے روایت کی ہے؟ ہماری سند صاحبِ ہدایہ تک متصل ہے۔ حتی کہ تصوّف میں جو محققین صوفیاء ہیں۔ انہوں نے کتابیں لکھیں تو تصوف کے مسائل میں بھی اسی طرح سند بیان کرتے ہیں جس طرح سے حدیث کی سند بیان ہوتی ہے۔ کہ ہم سے فلاں نے بیان کیا، ان سے جنید نے اور ان سے شبلی نے بیان کیا، وہ بھی سند سے پیش کرتے ہیں۔ تو اس امّت کا گویا ذوق ہی قرآن نے یہ بنا دیا کہ بے سند کسی چیز کو جو دین کے بارے میں ہو مت قبول کرو۔ آج بھی اگر کوئی دین کا مسئلہ پیش کرے گا۔ پہلا مطالبہ یہ ہوگا کہ بھئی! قرآن و حدیث فقہ اور تعامل اِمّت میں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ علیہ کا عمل اس پر تھا؟ ان میں سے کسی میں بھی موجود نہ ہو، تو بات رد کر دی جائے گی ان سب میں موجود ہوگا تو کہیں گے کہ سر آنکھوں پر، ضرور قبول ہے۔

سندِ صحیح سے کسی مسئلہ کے ثبوت کے بعد اِتبّاع فرض ہے...... اس سے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ جو لوگ قرآن، حدیث، فقہ اور امّت کے اکابر کی سند تک کے محتاج ہیں اور ایک ایک جز میں کہتے ہیں کہ ان کی سند لاؤ۔ یہ دلیل ہے کہ ان کی سب سے پہلی محبت تو اللہ سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت ائمہ مجتہدین سے قائم ہے۔ ان کے بعد علماء ربانی اور مشائخ حقانی سے قائم ہے۔ محبت سے ہی یہ سارا سلسلہ چلتا ہے۔ اگر ائمہ محبوب نہ ہوتے تو ایک ایک جزئی میں ان کی طرف رجوع نہ کرتے۔ اگر مشائخ طریقت محبوب نہ ہوتے۔

تو ان کی کسی بات کی یہ روایت نہ کرتے۔ حالانکہ اسے سر آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں۔ اگر ائمہ مجتہدین محبوب نہ ہوتے، ان کا اجتہاد کبھی نہ قبول کرتے۔ تو اللہ سے الگ محبت، رسول سے الگ محبت، ائمہ، مجتہدین سے الگ محبت، فقہاء امّت اور مشائخ طریقت سے الگ محبت۔ یہ تو سب کی محبت میں گرفتار ہو کے عاشقِ کل ہیں۔ انہیں کوئی یوں کہے کہ ان کے دلوں میں بزرگوں سے محبت ہے ہی نہیں۔ اس سے سے زیادہ دھوکہ دینے والا کون ہے؟ یہ تو اللہ کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔ تو علماء، مجتہدین اور فقہاء تک محبت رکھتے ہیں، مشائخ طریقت سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کی بات کی بھی سند لاتے ہیں کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا، حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا: یہ ہمارے مقتدا ہیں۔ سند سے ایک بات ثابت ہوتی، ہم سر آنکھوں پر رکھتے ہیں تو تصوّف، حدیث، تفسیر سب ان کے سر آنکھوں پر، سب کی محبت کے اسیر ہیں اور یہ سب کے عشاق اور سب کی محبت میں غرق ہیں۔ بہر حال سب سے پہلا مطالبہ سند کا ہوگا اور سند کے بعد جو درجہ رہ جاتا ہے وہ اِتبّاع کا ہے۔ تو جب سند صحیح سے ایک مسئلہ ثابت ہو جائے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی اِتبّاع کریں۔ اب خود رائی یہاں سے ختم ہو جاتی ہے۔ دین میں رائے زنی یا کسی مسئلہ کو رائے سے بنانا، یہ کارخانہ ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ

﴿يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ ① ”کسی مومن مرد وعورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ ورسول کا حکم آ جانے کے بعد وہ اس کے اندر اپنی رائے زنی کرے“۔ اس کا اختیار حکمِ خداوندی آ جانے کے بعد سلب ہو جاتا ہے۔ نہ اس کا ارادہ باقی نہ اختیار باقی، اگر ہے تو اِتباع باقی ہے کہ پیروی کرو کہ جس اللہ سے ایک چیز ثابت ہو گئی۔ تو اب اس میں رائے کی گنجائش نہیں اور فقہ وتعاملِ اِمّت سے ثابت ہو گئی اب اس میں بھی رائے زنی اور ٹال مٹول کرنے کی گنجائش نہیں۔ اب صرف عمل کرنا ہے تو قانون شریعت عمل کے لئے ہے، تجویز کے لئے نہیں ہے۔ تجویز تو اللہ پاک کر چکا۔ ہمارا کام تجویز نہیں بلکہ تفویض ہے کہ اپنے کو سونپ دیں اور حوالے کر دیں کہ جو اللہ نے کہا وہ میرے سر آنکھوں پر ہے۔ اسی میں دنیا وآخرت کی نجات ہے اور اسی میں گروہ بندی اور پارٹی سازی قطع ہوتی ہے۔ پارٹی بندی کبھی نقل، سے نہیں عقل کے گھوڑے دوڑانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیشہ تخیلات سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر نص صریح نصِ فقہ، یا نص حدیث موجود ہے یا امّت کا تعامل موجود ہے تو اختلاف کی کوئی وجہ ہی باقی نہیں رہتی۔

رائے زنی کبھی غلو محبت سے ہوتی ہے کہ کسی بزرگ سے بے حد محبت ہے۔ اس کا کوئی فعل دیکھا۔ اسے قانون کی صورت میں پیش کر دیا کسی سے عداوت ہے، اس کا کوئی قول دیکھا اسے رد کر دیا تو رد وقبول بعض دفعہ غلو محبت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ غلو عداوت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بدفہمی اور بعض دفعہ بد نیتی سے ہوتا ہے کہ نیت ہی خراب ہے کہ دین میں رخنہ ہی ڈالنا مقصود ہے۔ لیکن جب نصِ صریح آ گئی یہ ساری چیزیں قطع ہو جاتی ہیں۔ خیال آرائی کا دین میں کوئی تعلق نہیں، وہ منتقل دولت ہے جو آئی ہے، ہمارا کام اس کے سامنے گردن جھکانا ہے۔

بہر حال یہ معیار ٹھہرا، میں نے عرض کیا تھا کہ میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں تو کوئی چیز نہیں، لاشی محض ہوں۔ نہ کوئی عالم نہ فاضل، علماء کی جوتیاں سیدھی کرنے والا ہوں۔ مگر علماء سے ایک نسبت ہے ان کا ایک ڈھنگ دیکھا ہے۔ یہ جو اکابر دیوبند کہلاتے ہیں۔ ان کا یہی ڈھنگ ہے کہ ہر مسئلہ میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ، فقہ حنفی، یا جس فقہ کا تابع ہے۔ فقہ حنبلی یا شافعی، اس کے بعد تعامل امّت اور امّت کا ذوق کہ کس ذوق پر امّت چل رہی ہے کس ذوق پر سلَفِ صالحین چلے ہیں۔ ان سب کو لے کر ایک مسلک بنتا ہے۔ جس میں قرآن بھی داخل، حدیث، فقہ، تصوّف، طریقت وشریعت بھی داخل ہے۔ ساری چیزوں کا مجموعہ ہے، اس کا اِتباع ہو۔ تو میں تو نہ کوئی عالم، نہ فاضل، دارالعلوم دیوبند کا ایک معمولی سا طالب علم ہوں۔ مگر ان بزرگوں سے نسبت حاصل ہے۔ ذرے کو بھی آفتاب سے نسبت حاصل ہوتی ہے۔ ذرہ چھوٹی اور حقیر چیز ہے۔ مگر جب آفتاب روشنی ڈالتا ہے۔ ایسے چمکنے لگتا ہے جیسے ہیرا۔ حالانکہ وہ چمک اس میں نہیں۔ وہ چمک آفتاب کی ہے۔ ایک نسبت آفتاب سے قائم ہو گئی جس سے وہ چمک رہا ہے۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ ان حضرات نے سپاسنامے میں جو تعارف کرایا۔ وہ میرا تعارف ہی نہیں تھا۔ وہ انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم ایسے عالی حوصلہ ہیں کہ خوردوں کو بڑھا سکتے ہیں، اپنے چھوٹوں کو

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۶.

عزت دے سکتے ہیں۔ اپنے علوحوصلہ اور عالی ظرفی کا تعارف کرایا۔ میرا تعارف صرف یہ ہے کہ میں لاشئی محض ہوں مگر ایک نسبت رکھتا ہوں ۔

گرچہ خوردیم نسبتی است بزرگ ذرّهٔ آفتاب تابانیم

ہم اگرچہ حقیر و ذلیل ہیں۔ مگر نسبت بڑی ہے۔ جن بزرگوں سے وابستہ ہیں۔ وہ بے شک بڑے تھے۔ ان کی وجہ سے کوئی ہمارا نام بھی لے لیتا ہے، ہمیں پوچھ لیتا ہے۔ ورنہ ہم میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز ہمارے سامنے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، تعامل امت، فقہ اسلامی اور اکابرِ طریقت و شریعت کی محبت اور ان کی عظمت، یہ چیزیں ہیں جن پر فی الحقیقت دین کا مدار ہے۔

ادب و عظمت دین کی بنیاد ہے...... دین کی بنیاد ادب پر قائم ہے۔ بے ادبی اور گستاخی پر قائم نہیں ہے ۔

بے ادب محروم ماند از فضل ربّ

جو جسارت اور بے باکی برتے گا، وہ آخرت سے کبھی حصہ نہیں پائے گا۔ کبھی اللہ والوں کا اعتماد نہیں پائے گا۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْآ اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ ① ''اے ایمان والو! نبی کی مجلس میں بیٹھ کر نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو اس جرأت و گستاخی کی وجہ سے تمہارے سارے عمل ضائع کر دیئے جائیں''۔

یہ رسول کا ادب بتلایا۔ قرآن کریم کا ادب بتلایا ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ قرآن کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ جب کہ تم باوضو اور پاک نہ ہو۔ مساجد اللہ کا ادب بتلایا کہ جب مساجد میں آؤ، ادب کے ساتھ آؤ: ''لَا تَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ وَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَمْشُوْنَ'' ﴾ ② مسجد میں دوڑے ہوئے مت آؤ۔ جیسے بچے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ یہ سبک حرکتی ہے۔ متانت، وقار اور سکون کے ساتھ آؤ۔ نیز فرمایا گیا، مساجد کے اندر دنیا کے جھگڑے اور باتیں مت کرو۔ ذکر اللہ کرو، نماز میں مشغول ہو جاؤ، درود شریف پڑھو یا تلاوت کرو۔ جو جھگڑے گھروں میں چھوڑ کے آئے تھے، انہیں مسجد میں بھی لے آئے۔ یہ مسجد کا احترام ہوا یا بے احترامی؟ جس کو فرمایا گیا ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ﴾ ③ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ بدنصیب، بدقسمت اور ظالم کون ہے؟ جو اللہ کی مسجدوں کو ڈھادے۔ مسجد کی ایک صورت ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ صورت اینٹیں ہیں۔ انہیں کوئی ڈھادے، یہ بھی مسجد کا ڈھانا ہے۔ ایک یہ کہ اینٹیں تو نہیں ڈھاتا۔ مگر دنیا کی باتیں اور لغو شغل اتنے زور سے کرتا ہے کہ ذکر اللہ

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۲.

② روح المعانی، سورۃ الجمعۃ، ج: ۲۱ ص: ۹.

③ پارۃ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۱۴.

کرنے والوں کے ذکر کرنے میں خلل پڑ رہا ہے۔نماز پڑھنے والے اور تلاوت کرنے والوں کی نماز وتلاوت میں خلل پڑ رہا ہے۔اس کو بھی فقہاء نے منع لکھا ہے۔ بلکہ تلاوت بھی اتنے زور سے مت کرو کہ دوسرے کے ذکر میں خلل پڑے۔ یہ مسجد کی حقیقت کو ڈھانا ہے۔اس لئے کہ مسجد کی حقیقت ذکر اللہ ہے۔ جب تم ذکر اللہ میں آڑے آ گئے اور دوسرے کو روک دیا تو مسجد کی صورت نہیں ڈھائی مگر حقیقت تم نے ڈھا دی۔

یعنی روایات میں ہے کہ مسجد میں دنیا کی غیر ضروری باتیں کرنا ایسا ہے جیسے مسجد میں خنزیر ذبح کر دیا۔یعنی مسجد کو آلودہ اور گندہ کر دیا۔اس لئے مسجد، بیتُ اللہ، حرم محترم، اولیاء اللہ، انبیاء اللہ اور کتبُ اللہ، ان سب کا ادب بتلایا۔سارے دین کی بنیاد ادب وعظمت کے اوپر قائم ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جن کا ذکر ابھی آپ نے سنا، انہوں نے دارالعلوم دیو بند کی بنیاد رکھی۔سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ہمارا یہ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہما سے گزرتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ان حضرات کے اوپر چشتیت غالب ہے۔گو تربیت قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ طریق پر بھی کرتے ہیں ان کے اذکار بھی بتلاتے ہیں اور جس کی جیسی مناسبت دیکھتے ہیں۔ویسی ہی اس کی تربیت کرتے ہیں۔تو چاروں سلسلے ان کے پاس ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر سال دو سال میں ایک دفعہ ضرور حاضر ہوتے۔تو رُڑکی سے نہر کی پٹڑی پر کنارے کنارے کلیر شریف کو راستہ جاتا ہے۔وہاں سے کوئی پانچ چھ میل ہے۔حضرت جب نہر کی پٹڑی پر پہنچتے، جوتے اٹھا کر بغل میں داب لیتے۔پانچ میل ننگے پیر طے کرتے تھے۔یہ کیا چیز تھی؟ مشائخ طریقت کا ادب کہ جن کی جوتیوں کے صدقے ہم نے اخلاق سیکھے، جن کی بدولت ہمارے نفوس پاک ہوئے۔ان کے احسان کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟ کس طرح انہیں سر پر نہ بٹھلائیں۔ اس لئے پانچ میل کی مسافت ننگے پاؤں طے کرتے۔

حضرت مولانا جب حج کو گئے ہیں تو یہ وہ قافلہ ہے جس میں بڑے بڑے بزرگ تھے۔حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ صاحب وغیرہ۔یہ سارے حضرات ایک ساتھ گئے تھے۔مدینہ منوّرہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) جب قریب آتا ہے تو بیر علی ایک منزل ہے۔اس پر جب اونٹ چڑھتے ہیں تو چڑھتے ہی حرم شریف کے مینارے نظر پڑتے ہیں۔اب موٹروں کی سوراریاں ہیں۔اس زمانے میں اونٹوں کی سواریاں ہوتی تھیں۔یہ سب حضرات اونٹوں پر روانہ ہوئے۔مکہ سے گیارہویں دن مدینے پہنچتے تھے۔ گیارہ راتیں راستے میں لگ جاتی تھیں۔یہ قافلہ جب ''بیر علی'' پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سواری سے ایک دم اچھل کر نیچے کود ے اور ننگے پیر چلنا شروع کیا حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی نوکیلی ہیں کہ ایسی چبھتی ہیں جیسے سوئیاں چبھتی ہیں۔ہر ایک کا بس نہیں ہے کہ وہاں

چل سکے۔ حضرت کی دیکھا دیکھی سینکڑوں آدمی نیچے کود گئے کہ ہم بھی پیدل چلیں گے۔ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بے وقوفی نہیں ہے؟ ان پر تو محبت نبوی کا حال غالب ہے۔ انہیں نہ کانٹوں کی پرواہ نہ چبھن کی پرواہ۔ یہ نقل اُتار رہے ہیں، یہ کہاں تک چلیں گے؟۔ چنانچہ کوئی سو قدم، کوئی ڈیڑھ سو قدم چلا، پھر اونٹ پر بیٹھ گیا اور حضرت مولانا جیسے بالکل محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ربودہ اور غرق ہوتے ہیں۔ اسی حالت میں پیر لہولہان ہو گئے اور انہیں کچھ پتہ نہیں وہ جا رہے ہیں۔ تو ادب کا یہ عالم تھا کہ حرم شریف کے منارے دیکھ کر یہ جرات نہیں ہوئی کہ اونٹ پر بیٹھیں۔ ننگے پیر کنکریوں میں چلے جس سے معلوم ہوتا ہے ان حضرات کے دلوں میں شریعت کا ادب کتنا غالب تھا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہ جو اس پوری جماعت کے شیخ طریقت ہیں۔ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار کے بعد مکہ مکرّمہ میں ہجرت فرمائی لوگوں نے دیکھا کہ سیاہ جوتا نہیں پہنتے پہلے تو اتفاقی بات سمجھے مگر جب کوئی لے کے آیا، اسے رد کر دیا۔ سرخ یا زرد رنگ کا پہنتے۔ اب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ ارادی فعل ہے، اتفاقی نہیں ہے۔ حضرت سے عرض کیا، حضرت کیا سیاہ جوتا ممنوع ہے۔ فرمایا نہیں۔ آپ کیوں نہیں پہنتے؟ فرمایا ادب کے خلاف ہے۔ جو رنگ بیت اللہ کے غلاف کا ہے میں اسے پیروں میں ڈالوں؟ شرعاً سیاہ جوتا پہننا ممنوع نہیں۔ مگر جب ادب غالب ہوتا ہے، آدمی قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرتا ہے۔

ادب میں قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا یہ خود قانون نہیں...... مگر یہ سمجھ لیجئے کہ قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا۔ یہ خود قانون نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں۔ تم بھی سیاہ جوتا پہننا چھوڑ دو، تم بھی ننگے پیر چلا کرو۔ یہ ایک شخص کا حال ہے اگر وہ حال آپ میں پیدا ہو جائے۔ آپ یہ کام ضرور کریں گے۔ آپ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ لیکن اگر نقالی کریں گے پھر پیغمبر کی نقل اصل ہے۔ لوگوں کی نقل اصل نہیں ہے۔ صاحب حال کا مقام اور نقال کا اور نقل کرنے والے سے کہا جائے گا کہ تو فلاں کی نقل مت کر، قانون شریعت کی نقل کر، سب کے لئے جو عام حجت ہے، وہ قانون شریعت ہے طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ وہ قانون نہیں ہوتے کہ دنیا کو پابند کیا جائے، طریقت کے اوراد بتائے جائیں گے اور ادا کرتے کرتے کوئی حال تک پہنچ گیا۔ اس کے لئے مبارک ہو پھر وہ اس حال کے مطابق عمل کرے گا۔ کسی کو ملامت کرنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن قانون بہر حال نہیں بنے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دے۔ منصور رحمۃ اللہ علیہ پر حال غالب ہوا اور غلبہ حال میں کہا کہ ''انا الحق''۔ میں حق ہوں یہ مطلب نہیں تھا کہ خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے۔ انا الحق کا یہ مطلب ہے کہ حق ہی حق موجود ہے۔ میں اپنے اندر دیکھتا ہوں، حق ہی کا جلوہ پاتا ہوں۔ خود میری ذات کوئی چیز نہیں جگہ جگہ حق ہی نظر آتا ہے۔ تو ''انا الحق'' کے معنی یہ لئے کہ حق کا اتنا غلبہ ہو گیا کہ اپنی ہستی گم ہو گئی۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے آپ آفتاب کو دو منٹ ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں۔ اب جو نگاہ ہٹائیں گے

جدھر نظر پڑے گی، آفتاب کی ٹکیا سبز، سرخ اور سیاہ رنگ کی نظر پڑے گی۔ ساری چیزیں اوجھل ہو جائیں گی۔ آفتاب ہی آفتاب نظر آئے گا حتی کہ آپ اپنے آپ کو دیکھیں، وہاں بھی آفتاب ہی نظر آئے گا۔ ایسے میں اگر کوئی یوں کہہ دے کہ میں آفتاب ہوں تو یہ مطلب نہیں کہ میں آفتاب بن گیا۔ بلکہ یہ کہ آفتاب میرے اوپر اتنا غالب آ گیا کہ آفتاب کے سوا مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تو منصور پر فنائیت کا غلبہ ہوا۔ حق تعالیٰ شانہ کی تجلیات اور انوار اتنے غالب ہوئے کہ اپنے اندر دیکھتے، وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا تھا ادھر ادھر دیکھتے تھے، وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا۔ بہر حال منصور کا ایک حال تھا جو انہوں نے ''انا الحق'' کہا۔ کیا یہ قانون ہے کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں کہ تم بھی ''انا الحق'' کہا کرو۔ اگر لوگ کہیں گے تو انہیں پھانسی دی جائے گی قابل گردن زنی ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ منصور نے کہا، ہم کہیں گے۔ منصور کا حال بھی تو پیدا کرو۔ جب حال پیدا ہوگا۔ تم خود بخود اس کو انجام دو گے۔ بلا حال نقل کرو گے تو قانون شریعت کی نقل لازمی رہے گی۔ شخصی حالات قانون نہیں ہوتے۔

مثلاً اگر کوئی بزرگ بیمار ہوا اور اٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ بیٹھ کر نماز پڑھ لی۔ مریدین معتقد تھے۔ انہوں نے سب کو جا کر کہا کہ شیخ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے لہذا سب بیٹھ کر پڑھا کرو۔ سب نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چھوڑ دی کہ شیخ بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں۔ انہیں کہا جائے گا کہ شیخ کی بیماری کا وہ حال بھی اپنے اندر پیدا کرو جب بیٹھنے کی اجازت ہوگی۔ حال کا نشان نہیں اور شیخ کی نقالی کر رہے ہیں یہ حرکات وجدی ہیں۔ وجد جب پیدا ہوتا ہے جب وہ حرکت سرزد ہوتی ہے۔ وجد آپ کے اندر رہے ہی نہیں اور ان کی نقلیں اتاریں۔ وہ نقل بھونڈی ہوگی۔ پھر شریعت اور احکام شرعیہ کی نقل اتاری جائے گی ان احوال کی عظمت کی جائے گی۔ صاحب حال کو سر پر بٹھایا جائے گا۔ ان کی تعظیم کی جائے گی مگر قانون کے طور پر نہیں پیش کریں گے۔

مشائخ طریقت کے ذاتی احوال کو قانون عام بنانے سے نزاع پیدا ہوتا ہے..... مگر یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس کے اندر معرفتِ کامل ہو۔ حق کی پہچان کامل ہو، قربِ خداوندی حاصل ہو، وہ یہ کر سکتا ہے کہ اتنی چیز میرے کرنے کی ہے اتنی چیز میرے قبضے سے باہر ہے۔ میں نہیں کر سکتا کسی کے ذاتی حال کو قانون بنا کر پیش کرنے سے جنگ شروع ہوتی ہے کہ علماء کھڑے ہوں گے، کہیں گے یہ ناجائز ہے، دوسرے کہیں گے یہ بزرگوں کے خلاف کر رہے ہیں، ہم تو بزرگوں کا حال پیش کر رہے ہیں۔ یہ کہیں گے بزرگوں کا حال قانون نہیں۔ قانون شریعت پر عمل کرو۔ عمل کرتے کرتے اس حال پر آ جاؤ، جوان بزرگ کا ہے پھر ہم تمہیں کوئی ملامت نہیں کریں گے بلکہ گردن جھکا دیں گے۔ مگر تم بلا حال کے کرو تو قانون شریعت کی نقالی کی جائے گی لوگوں کے احوال کی نقالی نہیں کی جائے گی۔

بعض احوال شخصی ہوتے ہیں قانون نہیں ہوتے۔ حضرت شیخ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ بہت بڑے اولیائے کاملین میں سے ہیں۔ ایک تو خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاء ہیں۔ دوسرے مولانا نظام الدین ہیں۔ ایک شخص جوان کے مریدین میں سے تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ''حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کو

خواب میں دیکھ لوں۔ کوئی تدبیر بتلا دیجئے''۔

فرمایا ''فرض نماز چھوڑ دو''۔ یہ حیران ہوئے کہ فرض نماز چھوڑنے سے اللہ کا قرب پیدا ہوگا یا بعد؟ نماز پڑھنے سے قرب پیدا ہوتا ہے، نہ کہ نماز چھوڑنے سے؟ حضرت فرمارہے ہیں کہ نماز چھوڑ دو، اللہ میاں کی زیارت ہو جائے گی۔ ادب سے بول کچھ نہیں سکا۔ مگر عمل کرنے کی جرات نہیں کی، اس لئے کہ یہ بالکل خلاف شرع ہے کہ ترک نماز کا حکم دیا جائے۔ مگر وہ جذبہ اندر تھا کہ کسی طرح حق تعالیٰ کی زیارت ہو۔ تین چار دن کے بعد پھر حاضر ہوا کہ حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح سے اللہ کو خواب میں دیکھ لوں، کوئی تدبیر؟ فرمایا۔ بیوقوف بتلا تو دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ اب یہ بے چارہ پھر چپ کہ شیخ کیسے فرمارہے ہیں۔ پھر جرات نہیں ہوئی۔

تیسری دفعہ چند دن کے بعد پھر کہا۔ فرمایا تو احمق میرا وقت ضائع کر رہا ہے۔ تدبیر بتلا دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ ایک دن جا کے یہ جرات تو نہ ہوئی کہ فرض چھوڑ دے۔ فرض پڑھ لئے سنتیں چھوڑ دیں۔ رات کو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ فرمارہے ہیں کہ بھائی! ہم نے کیا قصور کیا تھا جو ہماری سنتیں چھوڑ دیں۔ یہ جلدی سے گھبرا کے اٹھا، وضو کیا، عشاء کا وقت باقی تھا۔ جلدی جلدی سنتیں ادا کیں۔ صبح کو حضرت شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کیا حضرت یہ واقعہ گزرا فرمایا ''اگر فرض چھوڑتا تو اللہ میاں آ کے پڑھواتے تو نے سنتیں چھوڑنے پر قناعت کی''۔

شریعت وطریقت کو محقّق ہی ایک ساتھ لے کر چل سکتا ہے...... اب یہ ایک مسئلہ آیا۔ اس میں دو پہلو نکلتے ہیں۔ بے ادبی کا یہ پہلو ہے کہ مولانا شیخ نظام الدین نے سخت غلطی کی فرض نماز چھڑانے میں۔ اللہ تو نماز فرض کرے، وہ کہیں چھوڑ دو۔ ہم نہیں ان کی بات مانتے۔ ان کی بات کو دیوار پر مارو۔ یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے کہ ایک شیخ وقت کی شان میں گستاخی کی جائے۔ اور ایک راستہ یہ نکلتا ہے کہ بھئی! ہم نہیں جانتے قرآن وحدیث میں کیا ہے۔ نماز فرض ہے یا نہیں؟

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

شیخ وقت جو کہہ دے وہ قرآن ناطق ہے ہم اس پر عمل کریں گے۔ ہمیں خبر نہیں قرآن وحدیث میں کیا ہے۔ یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے۔ کہ شیوخ طریقت کی وجہ سے قرآن وحدیث کو ترک کیا جائے یا قرآن وحدیث کا نام لے کر شیوخ کے طرق کو رد کر دیا جائے۔ دونوں راستے تباہی اور ہلاکت کے ہیں۔ نہ قرآن وحدیث کی بے ادبی جائز نہ اکابر اولیاء اللہ کی بے ادبی جائز۔ معتدل حق راستہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن کا دامن رہے اور ایک ہاتھ میں بزرگوں کا دامن رہے اور جامع راستے پر چلے۔ مگر یہ راستہ محقّق سمجھ سکتا ہے، غیر محقّق کے بس کی چیز نہیں ہے۔

مجھے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں یہی واقعہ پیش کیا گیا بعض نے تو کہا ہم نہیں مانتے۔ یہ قرآن وحدیث کے

خلاف ہے اس بات کو رد کرو۔ بعض نے کہا ہم مانتے ہیں، ہم نہیں جانتے ان کاغذوں میں لکھے ہوئے قرآن و حدیث کو۔ فرمایا یہ دونوں راستے تباہی کے ہیں۔ معتدل اور حق راستہ یہ ہے کہ دونوں کی عظمت قائم رہے اور آدمی بیچ میں سے نکلے۔ فرمایا وہ (معتدل اور حق راستہ) کیا ہے؟

واقعی یہ تحقیق کی بات ہے۔ فرمایا پہلے ایک بات سمجھ لو، اس کے بعد مسئلہ سمجھ میں آ جائے گا۔ فرمایا اولیاء اللہ کے دو طبقے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو اپنی ریاضت، محنت اور مجاہدے کرتے کرتے کسی بڑے مقام پر پہنچ جائے۔ کوئی قطب، کوئی غوث بنا، محنتیں اور ریاضتیں کیں اور بڑے مقام تک پہنچ گئے۔

اور ایک وہ ہے کہ حق تعالیٰ اسے منتخب فرمالیں کہ اسے اس مقام کے اوپر لانا ہے۔ وہ نہیں بھی چاہے گا تو زبردستی ایسے اسباب پیدا ہوں گے کہ وہ اس مقام پر پہنچے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص اپنی محنت، دیانت سے بڑے عہدوں تک پہنچ جائے۔ سپاہیوں میں ملازم ہوا۔ دیانت داری سے کام کیا تو وہ ہیڈ کانسٹیبل بن گیا اور محنت سے کام کیا تو اور اوپر کا عہدہ مل گیا اور محنت سے کام کیا تو وزیر پولیس بن گیا اور اونچے مقام تک پہنچ گیا۔ اور ایک وہ ہے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد ہے اور حکومت نے چاہا کہ یہ ولی عہد ہو اس کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر وہ بھاگے گا بھی، زبردستی تعلیم دی جائے گی تاکہ اس کو نیابت کے عہدے پر لائیں اور ولایت عہد سپرد کریں۔ اولیاء میں یہ دونوں طریقے ہیں۔ بعض اپنی محنت سے مقامات طے کرتے ہیں۔ بعض منتخب ہوتے ہیں کہ وہ نہ بھی آنا چاہیں تو زبردستی انہیں لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا، آپ مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک دم آپ مسکرائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یَارَسُوْلَ اللہِ! ''مَایُضْحِکُکَ''؟ کس چیز نے ہنسایا؟ فرمایا، میں دیکھ رہا ہوں، بعض لوگ جنت میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ ان کے پیروں میں زنجیریں ڈال کر جنت میں لے جانے کے لئے کھینچا جارہا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو منتخب کرلیا جاتا ہے۔

تو صوفیاء کی اصطلاح میں جو اپنی محنت سے مقامات طے کرے اسے مرید کہتے ہیں اور جو اللہ کی طرف سے منتخب ہو اسے مراد کہتے ہیں۔ تو ایک مرید ہے جو اپنی ارادت اور عقیدت سے ترقی کر رہا ہے اور ایک مراد ہے کہ جس کو منتخب کرلیا گیا ہے وہ نہیں چاہے گا تو زبردستی اسے اونچے مقام پر پہنچائیں گے۔

قرآن کریم میں بھی یہ دونوں مقامات بیان کئے گئے مگر قرآن کی اصطلاح دوسری ہے جو لوگ اپنی محنت سے آگے بڑھتے ہیں۔ انہیں قرآن میں مُنِیب کہتے ہیں۔ یعنی ''اِنَابَتُ اِلَی اللّٰہِ'' اور ''رُجُوْعِ اِلَی اللّٰہِ'' کے راستے سے ترقی کر کے پہنچتے ہیں اور جو منتخب کئے جاتے ہیں انہیں مجتبیٰ کہتے ہیں۔ جس کو ارشاد فرمایا: ﴿اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ﴾ ① اللہ جسے چاہتا ہے منتخب کرلیتا ہے، اسے مقامات پر پہنچاتا ہے اور جو ہدایت، اِنابت اور محنت کا راستہ اختیار کرے، اسے ہدایت دیتا ہے۔ اسے مدد دے کر مقامات تک پہنچا دیتے ہیں،

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۳.

تو ایک مجتبین کی جماعت ہے اور ایک منیبین کی جماعت ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں ایک مریدین اور ایک مرادین کی جماعت ہے۔

یہ فرما کر اب حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ بیچ کا راستہ کیا ہے کہ نہ مولانا نظام الدین کی بے ادبی لازم آئے نہ کتاب وسنت کی۔ فرمایا کہ یہ شخص جس نے یہ درخواست کی تھی کہ اللہ کہ کو خواب میں دیکھوں اس بارے میں مولانا نظام الدین نے پہچان لیا تھا کہ یہ مریدین میں سے نہیں ہے، مرادین میں سے ہے اگر یہ نماز ترک کرے گا۔ اس سے زبردستی پڑھوائیں گے۔ کیوں کہ اللہ کے یہاں منتخب کیا جا چکا ہے، اس لئے تدبیر بتلائی کہ فرض نماز چھوڑ دے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ چھوڑ سکتا ہی نہیں۔ اس سے پڑھوائیں گے اور زیارت بھی ہو جائے گی۔ اب اس میں کتاب وسنت کی عظمت بھی اپنی جگہ قائم رہی اور اکابر دین کی عظمت بھی قائم رہی۔

بلا تربیت وصحبت محقق نہیں ہوسکتا...... مگر اسے محقق سمجھے گا غیر محقق نہیں۔ غیر محقق یا مولانا نظام الدین کی توہین کرے گا یا کتاب وسنت کو ترک کر دے گا اور یہ دونوں راستے تباہی وبربادی کے ہیں۔ نجات کا راستہ یہ ہے کہ قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ان کی عظمت بھی اور کتاب اللہ کی عظمت بھی دل میں جاگزیں ہو۔ مگر اس کے لئے ضرورت ہے کہ تربیت ہو، محققین کی صحبت میسر ہو۔ اولیائے کاملین کی زیارت کے ساتھ ساتھ ان کا معالجہ نصیب ہو۔ تب آدمی کہیں محقق بنتا ہے۔ محض کتاب دیکھ لینے اور بزرگوں کا کلام سن لینے سے محقق نہیں بنتا جب تک کہ محنت کر کے تربیت نہ پائے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ

ماہ ہا باید تا یک پنبہ دانہ بعد کشت   جامہ گرد و شاہدے رایا شہیدے را کفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ ایک بنولے کا دانہ منوں مٹی کے اندر جائے۔ اپنی ہستی کو فنا کرے اس میں سے پودا پیدا ہو۔ اس میں سے روئی نکلے، اس سے لباس بنے پھر کہیں جا کے کسی محبوب کا لباس بنے اور دنیا اس کی قدر کرے۔ تو بنولہ کا دانہ اگر اپنی ہستی کو مٹا کر روئی کی صورت میں اپنے کو نہ پیش کرتا۔ نہ شہید کے لئے کفن میسر آتا اور نہ محبوب کے لئے لباس اور کہتے ہیں کہ

قرنہا باید تا یک سنگ خاراز آفتاب   لعل گرد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

قرنہا قرن کی مدت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک ٹکڑا آفتاب کی گرمی سہتے سہتے صدیوں میں جا کے لعل بدخشان بنے اور بازار میں لاکھوں روپے اس کی قیمت اٹھے۔ مگر جب تک وہ سنگِ خارا آفتاب کی گرمی اور آفتاب کی تپش کو نہیں سہے گا اور اپنے کو جلا کر پھونک نہیں دے گا لعل بدخشانی نہیں بنے گا۔ اور اسی طرح سے کہا ہے کہ

سالہا باید تا یک کود کے از درس علم   عالمے گردد نکو ، یا شاعرِ شیریں سخن

سالہا سال کی مدت ومحنت چاہئے کہ ایک نادان بچہ سات آٹھ برس میں جا کے عالم بنے یا شاعر شیریں سخن بنے۔ گھر بیٹھے علم کی دولت نہیں ملتی۔ بلا محنت کے باتیں بنانے سے یہ مقام میسر نہیں آتا اپنی جان کو سوہان لگانی

پڑتی ہے، جان کو جلانا پڑتا ہے، تب جا کے وصل کا مقام میّسر آتا ہے۔

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

باطن کے بادشاہ......اور ۔

مبین حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم ۔ شہان بے کمر و خسروان بے کلاہ اند

یہ ملاّ نے اور درویش بے چارے، انہیں حقیر مت سمجھو یہ بادشاہ ہیں گو سر پہ تاج نہیں ہے۔ یہ بادشاہ ہیں گو کمر میں سونے کا پٹکا بندھا ہوا نہیں ہے۔ مگر سلاطین ان کے آگے جھکے ہیں۔ یہ سلاطین کے آگے نہیں جھکے ان کو اللہ نے بڑی دولت دی ہے۔ جو باطن کی دولت ہے ظاہری دولت والے نہیں جانتے کہ انہیں کیا دولت میسر ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ محدث ہیں۔ جلیل القدر عالم اور امامت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ جب کوئی فقہ کا مسئلہ حاصل ہوتا تو بعض دفعہ وجد میں آ کے کہتے کہ ''اَیْنَ اَبْنَآءُ الْمُلُوْکِ مِنْ ھٰذِہِ النِّعْمَۃِ'' کہاں ہیں بادشاہ زادے کہ ہماری اس دولت کو دیکھیں اچھا ہوا کہ یہ اندھے ہیں اگر یہ اس دولت کو سمجھ لیتے تو شاید اس دولت کو چھیننے کے لئے تلواریں لے کر ہم سے جہاد کرتے۔ مگر ان کی آنکھیں بند ہیں اس لئے ہماری دولت محفوظ ہے۔ تو ایک باطنی دولت کے اور ایک ظاہری دولت کے بادشاہ ہیں۔ ظاہری دولت والے باطن والوں کے آگے جھکے ہیں۔ بشرطیکہ، ارباب باطن ہوں، ارباب بطن نہ ہوں۔ محض پیٹ کے بندے نہ ہوں کہ کھا پی لیں۔ ارباب باطن ہوں تو ارباب ظاہر ان کے آگے جھکتے ہیں۔

اہل اللہ کے قدموں میں دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی آتی ہے..... حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اکابر مشائخ میں سے ہیں۔ ان کے ہاں تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار مہمانوں کا روزانہ دونوں وقت ہجوم رہتا تھا۔ نواب میر خاں جو ریاست ٹونک کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کے دل میں فکر پیدا ہوئی، میرے شیخ کے ہاں ہزار دو ہزار مہمان رہتے ہیں بڑی پریشانی رہتی ہوگی۔ شیخ کی کوئی جائداد نہیں اور تجارت و ملازمت نہیں ہے۔ بڑے پریشان رہتے ہوں گے کہ مہمانوں کو کہاں سے کھلاؤں تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک پورا ضلع جس کی سالانہ آمدنی کئی لاکھ روپے تھی۔ پیتل کے پترے پر لکھ کر بھیجا کہ حضرت کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تاکہ آپ کو مہمانوں کی مہمانی میں دشواری نہ ہو۔ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ نے اس پیتل کے پترے پر جواب لکھا۔ عجیب جواب تھا۔ لکھا کہ ۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ۔ با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو نہیں کھونا چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے آسمان سے آ رہی ہے۔ تیرے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے حکومتوں کو ٹھکرا دیا ہے اور حکومت والے پیش پیش ہیں۔

اسی مقام کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اللہ و رسول کا ہو جاتا ہے تو ''اَتَتِ الدُّنْیَا

وَهِيَ رَاغِمَةٌ '' دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی قدموں میں آ کر پڑتی ہے، وہ ٹھکراتے ہیں اور وہ زبردستی قدموں میں گرتی ہے۔ دنیا کے بندے خود دنیا کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ ٹھوکریں مارتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک غنی بن کے کماتا ہے ایک محتاج بن کے کماتا ہے۔ اہل اللہ بھی کماتے ہیں مگر غنی بن کر۔ اہل دنیا بھی کماتے ہیں مگر محتاج وفقیر بن کر ایک فقیر الی اللہ ہے، ایک فقیر الی الدّنیا ہے۔ جو اللہ کا فقیر ہے دنیا سے وہ بھی محروم نہیں رہتا۔

اس دنیا کا حاصل یہی ہے کہ آدمی پیٹ بھر لے، لباس سے تن ڈھانپے کون سا اللہ والا ہے جسے کھانے کو میسر نہیں؟ اب رہا یہ کہ انکے پاس بڑی کوٹھی بنگلہ نہیں۔ وہ چاہتے ہی کب ہیں کوٹھی بنگلے کو؟ وہ تو ایک جھاڑ کے نیچے گزر بسر کرنے کو بہت سمجھتے ہیں۔ یہ تو جب ہو جب وہ آپ کے بنگلوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ آپ انہیں لالچی کہیں مگر انہیں کوئی لالچ نہیں۔

اہل اللہ تارک الدنیا ہیں...... حقیقت میں یہ لوگ تارک الدنیا ہیں کہ دنیا پر قابو پاتے ہیں اور پھر ترک کرتے ہیں اور جس کے ہاتھ میں ہی دنیا نہ ہو اور وہ کہے کہ میں ترک کر رہا ہوں وہ متروک الدنیا ہے، تارک الدنیا نہیں ہے دنیا نے اسے ترک کر دیا۔ دل میں اس کے ہے کہ دنیا آئے مگر دنیا اس کو چھوڑ چکی۔ اسلام نے لوگوں کو تارک الدنیا بنایا ہے، متروک الدنیا نہیں بنایا۔ دنیا پر قابو پا کر، پھر اس کو ترک کرو۔ خواہ ہاتھ سے خواہ قلب سے اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم دولت مندمت بنو اور بھک منگے بنو۔ مسلمان بھک منگا اور سائل بننے کے لئے نہیں آیا۔ وہ دنیا کو دینے کے لئے آیا ہے، دنیا سے مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کماؤ: ''كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ '' ① نیک اور پاک کمائی ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے اور اللہ اس میں برکت دے دے تو یہ نہیں کہ جا کے سمندر میں ڈبو دے۔ اپنے مصرف میں خرچ کرو، دولت مند بھی بنو۔ خدا اگر کروڑ پتی بنائے بن جاؤ اسے ضائع مت کرو۔ مگر قلب کا تعلق اس سے نہ رکھو۔ قلب کا تعلق اللہ سے رکھو، ہاتھ پیر کا دنیا سے رکھو۔ دنیا ترک نہیں کرائی کہ تم بھک منگے بن کے بیٹھ جاؤ۔ دنیا کو قلب سے ترک کرایا۔ ان کی شان یہ ہے کہ ۔

دل بیار دست بکار

ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہو یہ اسلام کی تعلیم ہے نہ یہ کہ تم دنیا ترک کر کے پہاڑوں میں جا کے بیٹھ جاؤ اس کو رہبانیت فرمایا۔ اسلام میں گوشہ گیری نہیں دنیا کے اندر کماؤ بھی۔ چاہے خدا کروڑ پتی بنائے، اس کی قدر کرو اور اسے اپنے مصارف میں خرچ کرو۔ مگر دل کا تعلق اللہ سے ہو۔ اولیاء اللہ کا یہی کردار اور کیریکٹر تھا۔ یہی ہیں وہ علمائے دیوبند جو ان اکابر اولیاء اللہ کے جانشین ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ، مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے۔

---

① مشكوة المصابيح، كتاب البيوع، باب الكسب وطلب الحلال، ج: ٢ ص: ١٢٨ رقم: ٢٧٨١. حدیث ضعیف ہے لیکن معناً درست ہے اور اس کے شواہد موجود ہیں۔ دیکھئے: کشف الخفاء ج: ٢ ص: ٤٦ .

حضرت عبداللہ ابن مبارک تقریباً دو ہزار اشرفی ہر وقت پاس رکھتے اور بعض دفعہ مجلس میں بیٹھ کر انہیں خوب اُچھالا کرتے۔ لوگوں نے عرض کیا، حضرت آپ یہ اشرفیاں اس طرح اچھال رہے ہیں؟ فرمایا: ''لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوْكُ'' ① اگر یہ درہم اور دنانیر روپیہ پیسہ ہاتھ میں نہ ہو یہ بادشاہ زادے تو ہمیں ناک پوچھنے کا رومال بنالیں۔ ہم بتلا دیتے ہیں جو تمہیں میسر ہے، وہ ہمیں بھی میسر ہے ہم تمہارے محتاج نہیں۔ لیکن جو ہمیں میسر ہے وہ بقدر ضرورت بھی تمہیں میسر نہیں۔ تم ہر حالت میں محتاج ہو کہ ہم سے آ کر سیکھو۔

تو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سائل و مفلس بنانا مقصود نہیں، غنی بنانا مقصود ہے۔ ''وَخَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ'' غنی اور امیری قلب کی امیری ہے۔ ہاتھ پیر میں چاہے لاکھوں روپے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بیٹھ کر ایک ایک دن کے اندر کئی کئی لاکھ روپے اپنے دست مبارک سے تقسیم کئے ہیں۔ تو یہ شان بتلائی گئی کہ دنیا قبضے میں بھی کرو۔ پھر قلب سے ترک کرو اور اگر دنیا ملتی نہیں اور کہا ہم تارک الدنیا ہیں، تو تارک الدنیا نہیں متروک الدنیا ہو دنیا نے تمہیں ترک کر رکھا ہے۔ جیسے نامرد اور عنین یوں کہے کہ میں بڑا پارسا ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ لوگ کہیں گے تجھ میں جانے کی طاقت کہاں ہے؟ تو کہاں سے متقی بن گیا۔ متقی وہ ہے کہ جانے کی طاقت ہے پھر بھی نہیں جاتا۔ اللہ کے خوف سے ڈرتا ہے نہ کہ نامرد ہونے کا نام متقی ہے۔ بہر حال تارکُ الدنیا وہ ہے کہ دنیا قبضے میں ہے پھر ترک کر رہا ہے۔ وہ تارکُ الدنیا نہیں کہ دنیا ہاتھ میں نہیں، للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے کہ میں تارکُ الدنیا ہوں۔

اَدب و عظمت کے حامل کتابُ اللہ کے سچے وارث ہیں...... بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ دین کی بنیاد ادب و تادب پر ہے، عظمت شریعت کا ادب، اولیاء اللہ اور علماء ربانی کا ادب، کتابُ اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، مدارسِ دینی اور خانقاہوں کا ادب۔ ان سارے ادبوں پر دین کا مدار ہے۔ بے ادبی اور گستاخی میں آدمی کا دین نہیں بنتا۔

پھر ادب کے بعد اِتباع ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ، اجماعِ امّت کا اِتّباع اور اس ذوق کا اِتباع جس کے اوپر پوری امّت کے صلحاء چل رہے ہیں اس سے الگ ہو کر خیال آرائی اور تخیّل سے کوئی پگڈنڈی بنانا، اسلام نے ان سب کو رد کیا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین وہی ہے کہ نقل صحیح، ذوق سلیم کے ساتھ اِتباع اور ادب کے ساتھ اسے قبول کیا جائے اسی کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا کہ حق و باطل کا معیار یہ ہے کہ ﴿وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ② ''اے پیغمبر! جو ہم نے آپ کی طرف کتاب کی وحی کی ہے۔ وہی ہے حق، وہی مصدّق ہے۔ اس کی تصدیق اور تکذیب سے آدمی سچا اور جھوٹا سمجھا جائے گا''۔ اور فرمایا: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ③ ہم نے ایک جماعت کو اس کتاب اللہ کا وارث بنایا۔ کن لوگوں کو بنایا؟ جن کو ہم

① مشکوۃ المصابیح، کتاب الرقاق، باب استحباب المال والعمر للطاعة، الفصل الاول، ج: ۳ ص: ۱۴۷ رقم: ۵۲۹۱.

② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱. ③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲.

نے منتخب اور پسند کیا تھا کہ ان میں سے ہمیں دین کا کام لینا ہے، اس میدان میں ان سے کام لینا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وارثت تو باپ سے ہی ملتی ہے کوئی پیدا تو نہیں کرتا۔ پیدا شدہ کمائی کو وراثت نہیں کہتے۔ وراثت تو وہ ہے جو باپ کا ترکہ ہو اور مل جائے۔ اور ترکہ کب ملے گا؟ جب نسب نامہ ثابت ہو۔ یعنی باپ کا بیٹا ہونا ثابت ہو، تبھی ترکہ ملے گا اور اگر یہی ثابت نہ ہو کہ یہ مرنے والے کا بیٹا ہے تو اجنبی آدمی کو کبھی بھی ترکہ نہیں ملے گا۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا روحانی ترکہ علم اور کمال ہے۔ وہ جب ملے گا، جب روحانی نسب نامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہوا ہو کہ میرا شیخ یہ ہے، اس کا شیخ یہ۔ اس کا آگے شیخ وہ، سلسلے سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ثابت ہو، تو ترکہ ملے گا اور اگر بیچ میں کوئی کڑی کٹ گئی اور سلسلہ متصل نہ پہنچا تو وہ ایسا ہے جیسے بے باپ کی اولاد ہو کہ بیچ میں باپ ہی ندارد ہے۔ پھر ترکہ کہاں سے مل جائے گا؟ اس لئے کہ یہ علمی وراثت نسبت سے ملتی ہے۔ جیسا کہ مال و دولت کی وراثت نسب سے ملتی ہے۔ یہ نسب مادی ہے، وہ نسب روحانی ہے۔ اس کو فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ① ''پھر ہم نے کتاب اللہ اور علم کا ان لوگوں کو وارث بنایا، جن کو ہم نے اس کام کے لئے چن لیا تھا''۔

اب فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ ② بعض ان میں گندے انڈے نکل گئے کہ انہوں نے یا کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یا کتاب اللہ کو اپنی رائے کے تابع کیا یا تھوڑے تھوڑے حیلے کر کے معنوی تحریف شروع کی فرمایا یہ اپنے نفس پر ظالم ہیں۔ ان کو اس کی جزا اور صلہ ملے گا۔

اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ ③ بعض ان میں وہ ہیں کہ درمیانی راہ سے اللہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ ادھر ادھر نہیں ہٹتے، بٹیہ اختیار کر لی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے وہ بھی نجات پائیں گے۔ اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ④ بعض وہ ہیں جو اس راستے پر دوڑ رہے ہیں اور دین کی کوئی جزئی چھوڑنا نہیں چاہتے، ہر حیثیت سے دین کو مضبوط تھامے ہوئے ہیں اور دین کی طاقت ہاتھ میں لے کر فراٹے بھر رہے ہیں وہ سابق خیرات ہیں۔ جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں گھوڑا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس روحانی میدان میں کوشش کرتے ہیں کہ ہم آگے نکل جائیں۔ اس طرح سے دوڑنے میں مصروف ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے اس لائن پر لگا دیا ہے تو کوئی دوڑ رہا ہے، کوئی لپک رہا ہے، کوئی معمولی چال چل رہا ہے، کوئی اِدھر اُدھر ہٹ کر اس بٹیہ سے ہٹ گیا وہ منزل مقصود سے رہ گیا۔ لوگوں کی انواع و اقسام ہیں۔ اس لئے ہمارے اور آپ کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحیح معنی میں کتاب اللہ کے وارث بنیں انہی معنی پر چلتے رہیں جو روایت ہو کر چلے آ رہے ہیں۔ جس میں سلف کا ذوق اور سلف کا تعامل شامل ہے اور جس میں وہ مذاق دینی شامل ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲. ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲.
③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲. ④ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۲.

علیہ وسلم نے تربیت کی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن وحدیث کے محض الفاظ ہی منقول نہیں ہیں معنی بھی منقول ہیں اور معانی ہی منقول نہیں بلکہ تربیت کا وہ ذوق بھی سلسلہ وار چلا آ رہا ہے۔ جس ذوق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا کہ اسی نمونہ کے عمل پر رہو۔ اس لئے آپ کے بارے میں فرمایا گیا کہ آپ کی چار شانیں ہیں۔ ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ﴾ ① اللہ کی آیتیں بامانت الفاظ آپ نے پہنچادیں۔ ﴿وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② پھر تعلیم کے ذریعے ان کی مرادات ربانی بیان کیں۔ ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ پھر عملی اُسوہ بھی پیش کیا کہ یوں عمل کرو یہ نمونہ ہے جس کو میں کر کے دکھلا رہا ہوں اور فرمایا: ﴿وَیُزَكِّیْهِمْ﴾ ④ دلوں کو مانجھ کر اس میں استقامت بھی پیدا کی۔ کجی نکال دی اور زیغ نکال دیا۔ ان مجاہدات اور محنتوں کے بعد استقامت نصیب ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ آدمی نے چند حرف دیکھ لئے۔ کسی کی بات سن لی اور رائے دینی شروع کر دی۔ یہ چھچھورپن ہے یہ کوئی سنجیدگی کی بات نہیں ہے۔ جس کا آدمی علم نہیں رکھتا اس میں کبھی رائے نہ دے۔ مثلاً سنار کا کوئی مسئلہ آئے گا، اگر آپ سے کوئی کہے کہ زیور کیسے بنتا ہے؟ آپ کہیں گے میں جانتا نہیں سنار کے پاس جاؤ یا لوہاری کی بات ہو۔ آپ یہ کہتے ہوئے عار نہیں کریں گے کہ بھئی! میں لوہار نہیں۔ اگر آپ کو لوہا کٹوانا ہے تو لوہار کے پاس جاؤ۔ مگر جب دین کی بات آتی ہے تو لوگوں کو اپنے کو جاہل کہتے ہوئے عار آتا ہے۔ اس میں رائے زنی کے لئے تیار ہیں۔ گویا دین ایک کھلونا ہے۔ جس کا جی چاہے اس میں رائے زنی کرے۔

اس واسطے میں نے یہ عرض کیا جزئیات پیش کرنے کا موقع نہیں۔ میرے پاس بھی وقت کم ہے، آپ کے پاس بھی۔ اس لئے اصول میں نے عرض کر دیا۔ ایک کسوٹی پیش کر دی۔ اس سے آپ جزئیات کو عمر بھر پرکھتے رہیں اس سے آپ جزئیات کا فیصلہ کر سکیں گے۔ یہ چند ضروری باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ وقت میں نے زیادہ لے لیا۔ خود میں اتنی ہمت اور طاقت بھی نہیں تھی۔ مگر شاید ان بزرگوں نے کوئی قلبی زور لگایا ہو۔ جس سے کچھ بات چل گئی ورنہ اپنے اندر تو طاقت تھی نہیں۔ بہر حال اب میں اس بات کو ختم کرتا ہو۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم وعمل کی توفیق عطا فرمادے، صحیح وسیدھے راستے پر چلائے۔ زیغ اور کج راہوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور اِدھر اُدھر کے تخیلات سے بچا کر صرف انہی روایات پر رکھے، جو سند صحیح کے ساتھ منقول ہوتی آ رہی ہیں۔ (آمین)

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ."

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

③ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲. ④ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

تسکین فطرت

''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ:......

تین فطری سوال...... بزرگانِ محترم! ابھی آپ کے سامنے میرے ایک عزیز نے چند سوالات نقل کئے جو انسان کی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ اور اس آنے اور جانے کے درمیان ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ جب تک ان تینوں سوالوں کا جواب شفا بخش طریقے سے نہیں مل جاتا۔ انسان میں بے چینی رہتی ہے سکون قلب پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تین سوال جو انسان کی فطرت کا تقاضا ہیں۔ اس سلسلے میں اس وقت جو ہمارے محترم قاری صاحب نے رکوع تلاوت کیا۔ ان تینوں سوالات کا جواب اس رکوع کے اندر موجود ہے۔ تو فرق اتنا ہو گیا کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے سوال کیا جاتا ہے بعد میں اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ یہاں ایسا ہو گیا (۲۱ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ) کہ پہلے جواب پڑھا گیا بعد میں سوال کیا گیا۔

یہ جو پورا رکوع ہمارے محترم قاری صاحب نے پڑھا ہے، یہ دس احکام پر مشتمل ہے۔ دس ہدایتیں اس میں حق تعالیٰ نے دی ہیں اور پھر ایک ایک ہدایت بہت سی چیزوں پر مشتمل ہے۔ تو مجموعے کے لحاظ سے یہ چیزیں بہت ہو جاتی ہیں۔ لیکن اصولاً اس میں دس باتیں بیان کی گئی ہیں اور وہ دس باتیں انہی سوالات کے جوابات ہیں کہ ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ اس کے کیا اصول ہیں؟ کس کی رضامندی اور کس کو خوش کرنے کے لئے ہم زندگی گزاریں اور وہ مبدا کیا ہے جس سے ہماری ابتداء ہوتی ہے۔ پھر اس زندگی کا انجام کیا ہوگا۔ تو اسی رکوع میں انجام بھی بتا دیا گیا ہے۔

غرض مذہب کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ ایک مبدا، ایک معاد، ایک میعاد۔ مبدا کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء کہاں سے ہوئی۔ معاد کا مطلب یہ کہ لوٹ کر کہاں جانا ہے۔ میعاد کا مطلب یہ کہ درمیان میں کس طرح زندگی گزاری

جائے۔تو اس رکوع میں مبدا کا بھی ذکر ہے کہ وہ کون سی ذات ہے جو تمہاری اصل ہے۔معاد کا بھی ذکر ہے کہ تمہارا انجام کیا ہونا ہے اور اس کا بھی ذکر ہے کہ درمیان کی زندگی کس طرح گزارنی ہے۔اس لئے اس وقت کسی تقریر کے کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تفسیر کی ضرورت ہے کہ اس رکوع کی تفسیر کر دی جائے۔ترجمہ وشرح میں تقریر بھی ہو جائے گی۔

اِنسان کا مبدا کیا ہے؟......تو ابتدا یہاں سے کی گئی ہے کہ ﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ ① برکت والی وہ ذات ہے جس نے آسمان میں برج قائم کئے،منزلیں قائم کیں اور ان منزلوں میں سے سورج اور چاند کو گزارا،جس سے رات اور دن پیدا ہونے لگے،موسم بننے لگے، سردی گرمی اور برسات آنے لگی۔یہ گویا مبدا کا ذکر ہے کہ اصل ابتداء جس ذات سے ہے۔اس کی قدرت آسمانوں،زمین میں کام کر رہی ہے۔آسمان بنا دیئے،چاند،سورج پیدا کر دیئے اور ان میں حرکت پیدا کر دی۔

رحمان کے بندوں کی چال......اس کے بعد دس احکام شروع کئے کہ اس کی رضا کے لئے کس طرح زندگی گزاری جائے ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ② رحمٰن کے بندوں کا دنیا میں کیا ڈھنگ ہونا چاہئے؟

رحمٰن لغت میں اور شریعت میں بھی اس ذات کو کہتے ہیں جو ساری نعمتوں کا مالک ہو۔ظاہری اور باطنی تمام نعمتیں دینے پر قادر ہو۔ہر نعمت اس کے قبضے میں ہو۔ساری نعمتوں کا والی،وارث اور مالک ہو۔تو اس رحمٰن کے بندے کس طرح سے دنیا میں زندگی بسر کریں۔فرمایا،رحمٰن کے بندوں کا ڈھنگ یہ ہونا چاہئے کہ جب وہ زمین میں چلیں تو نرم چال چلیں۔اس میں ہدایت دی گئی کہ زندگی کی بنیاد تواضع اور خاکساری پر رکھی جائے۔کبر ونخوت پر نہ رکھی جائے۔تکبّر اور اپنے کو بڑا بنانا یہ نہیں بلکہ چال سے واضح ہو کہ کوئی خدا کا بندہ جا رہا ہے۔یہ نہ معلوم ہو کہ کوئی جبار قہار جا رہا ہے۔انسان کی شان نہیں ہے اور انسان کی شان یہ کیوں نہیں ہے؟

اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ: ”کُلُّکُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ“ ③ ”تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو۔آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا ہے“۔مٹی کا یہ کام نہیں ہے کہ اچھل اچھل کر اوپر جائے یہ جب تک پست اور پامال رہے گی جبھی تک اس کی قدر ہوگی۔مٹی جوتوں میں روندی جاتی ہے مگر چوں نہیں کرتی۔جبھی تک اس کی قدر ہے کہ جس طرح ہم تصرف کریں بلا چون وچرا اس تصرف کو قبول کرے،اگر مٹی اوپر اڑی،کسی کی آنکھ میں پڑی،وہ لعنت کرے گا۔کسی کے کپڑے پر گرے گی وہ کپڑے کو جھٹک دے گا۔کہے گا کہ کمبخت گرد کہاں سے آ گئی تو مٹی نے ذرا ابھرنے کا نام لیا تو اس پر لعنتیں برسنا شروع ہو گئیں۔

---

① پارہ:۱۹، سورة الفرقان،الآیة:۶۱. ② پارہ:۱۹، سورة الفرقان،الآیة:۶۳. ③ مسند بزار، ج:۷ ص:۴۲۱ رقم:۲۵۵۱. حدیث حسن ہے،دیکھئے:صحیح وضعیف الجامع ج:۷ص:۱۱۵ رقم:۲۶۶۸.

تو جس مٹی سے انسان پیدا کیا گیا، اگر وہ اینٹھنے لگے، غرور کرنے لگے، کبر ونخوت اختیار کرنے لگے۔ ہر شخص اس انسان کو برا کہے گا اور جو تواضع وخاکساری اختیار کرے اور مٹی بن کر رہے، سب اس کو سر پر بٹھائیں گے کہ یہ بڑی کیمیا معلوم ہوتا ہے۔ کسی بھی مجلس میں جو بڑا بول بولتا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ وہیں اس کو سزا مل جاتی ہے اور جو تواضع کا کلمہ بولتا ہے، سب اس کی قدر کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کی عادتِ کریمہ بھی یہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی بندہ عبادت کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! میرے سے کچھ نہیں بن پایا۔ میرے بس میں تو کچھ نہیں۔ تیرا فضل ہے کہ یہ کام تو نے مجھ سے کرا دیا۔ میرے اندر یہ طاقت نہیں تھی۔ حق تعالیٰ شانہ فوراً فرماتے ہیں کہ نہیں عمل تو نے ہی کیا تھا۔ مسجد کی طرف چل کر تو ہی گیا تھا۔ حج کے لئے بیت اللہ کی طرف تو نے ہی سفر کیا تھا۔ تو نے سب کچھ کیا اور اگر کوئی کبر ونخوت سے یوں کہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی، میں نے عبادت کی، میں نے یہ کام کیا۔ فرماتے ہیں کہ نالائق! تو نے کیا کیا؟ ارادہ ہم نے تیرے اندر پیدا کیا بدن، روح اور طاقت ہم نے دی۔ تو نے کیا کیا؟ جو خود دعوے کرتا ہے اسے پست کر دیتے ہیں اور جو دعویٰ چھوڑ کر کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسے فرماتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا۔ اس لئے سنت اللہ یہ ہے کہ جو آدمی خاکساری برتے، عجز ونیاز برتے، بندگی کی شان سے آئے۔ اسے اونچا اٹھاتے ہیں، اسے عزت دیتے ہیں اور جو خود ابھرنے لگے اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ۔

پستی سے ہو سربلند اور سرکشی سے پست   اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

تو انسان کی فطرت یہی بنائی گئی کہ تیرے سامنے مٹی ہے۔ اگر وہ ابھرتی ہے تو تو لعنت بھیجتا ہے۔ یہ جوتیوں کے نیچے رہتی ہے تو تو عزت کرتا ہے۔ تو جس چیز سے تو بنا ہے تیرا مزاج بھی ایسا ہی ہونا چاہئے کہ جتنی تو خاکساری برتے گا تیری عزت ہوگی۔ جتنا تو غرور کرے گا، اتنا ہی تجھے پست کر دیا جائے گا۔ تو پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ رحمٰن کے بندوں کی زندگی کا ڈھنگ کیا ہونا چاہئے۔ جب گھر سے باہر نکلیں اور چلیں تو زمین پر ہلکی چال چلیں نخوت وکبر کی چال نہ چلیں اس کو دوسرے موقع پر قرآن کریم نے فرمایا ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ﴾ ① اپنی چال میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور زیادہ زور سے چلا کر مت بولو حسبِ ضرورت آواز بلند کرو۔ بہت زیادہ شور مچا کر بولنا، کبر ونخوت کی علامت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی کی آواز ہی خلقۃً بلند ہو، وہ دوسری بات ہے۔ لیکن ارادہ کر کے آدمی چلائے، یہ سمجھ کر کہ دوسرے کے اوپر میری آواز کا دباؤ پڑے یہ ممنوع ہے۔ بس ضرورت کے وقت اعتدال کے ساتھ آواز بلند کرے۔ تو بولنے اور چلنے دونوں میں اعتدال ہونا چاہئے۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۹.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال مبارک کا جو نقشہ حدیث میں آتا ہے کہ "اذا مشی تکفا کانما ینحط من صبب" ① آپ اس طرح چلتے تھے کہ عجیب شان تھی۔ اس طرح کہ گردن تو جھکی ہوئی جس کو خاکساری کی چال کہتے ہیں۔ مگر ساتھ میں قوت اتنی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا زمین کو کھود کر اندر گھس جائیں گے۔ اتنی قوت سے قدم پڑتا تھا۔ تو قوت بھی ہو، شجاعت بھی ہو اور خاکساروں کی طرح نیاز مندی بھی ہو، وقار بھی اور تواضع بھی ہو۔ نہ بیماروں کی چال چلے جیسے کوئی مریض جارہا ہے کہ ذرا کوئی تھپڑ ماردے تو گر پڑے، یہ بھی نہیں اور نہ ابھر کر چلے جیسے کوئی متکبر جارہا ہے۔ بیچ کی چال ہو کہ اس سے خودداری اور خاکساری بھی ٹپکے ﴿یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا﴾ ② کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ چلے، بلکہ یہ کہ تواضع سے چلے چاہے تیز چلے گویا یہ پہلا نقشہ بتلایا گیا کہ جب گھر سے نکلو تو ایسی چال چلو۔ اس لئے کہ مسلمان بے فکرا نہیں پیدا کیا گیا کہ جس طرح اس کا جی چاہے چل پڑے۔ قدموں پر نگاہ ہونی چاہئے کہ یہ کس طرح سے چلیں اس لئے کہ مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔

قران کریم میں فرمایا گیا: ﴿مَایَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَاکَانُوْا﴾ ③ تم تین آدمی تنہائی میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ سرگوشی کرو گے تو چوتھا خدا وہاں موجود ہوگا۔ یہ نہیں ہے کہ تمہاری باتوں کا سننے والا کوئی نہیں۔ تم چار ہو گے پانچواں خدا ہوگا۔ تو زیادہ ہو گے تب خدا موجود، کم ہو گے تب خدا موجود۔ جب اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور موجود ہے تو آدمی کو ہر جگہ ادب سے چلنا پڑے گا۔ بے ادبی وہ کرے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ مسجد میں خدا ہے اس لئے میں ادب کرتا ہوں اور سڑک پر گویا خدا نہیں تو میرا جی جس طرح چاہے چلوں۔ یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے۔ ہر جگہ کے مناسب ادب ہوگا اور عجز و نیاز مندی اختیار کی جائے گی۔ تو زندگی گزارنے کی پہلی بات یہ ہے کہ ہم زندگی میں قدم قدم پر نگاہ رکھیں کہ ہماری چال ڈھال کیا ہے۔

رحمٰن کے بندوں کا قال...... اس کے بعد آگے فرمایا، چلتے چلتے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ تو اس میں اچھے بھی ملتے ہیں اور برے بھی بعضے تو ایسے ملتے ہیں جو بڑے مہذب اور شائستہ ہیں۔ آپ نے سلام کیا، انہوں نے جواب دیا انہوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا، آپ نے ان کا شکریہ ادا کیا، محبت بڑھ گئی۔ اور بعض ایسے بھی ملتے ہیں جو جھگڑے اور فساد کی بات اٹھاتے ہیں کہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ لیا یا کسی پر پھبتی کس دی۔ ایسے موقع پر ہماری رفتار کیا ہونی چاہئے اس پر فرمایا: ﴿وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ ④ "اگر جاہل ملیں اور جاہلانہ حرکتیں کریں تو تم ان کے ساتھ جاہل مت بنو"۔ تم سلام کہو۔ یعنی جب وہ جاہلانہ بات کریں۔ بس ان سے کہہ دو کہ بھئی!

---

① الجامع للترمذی، کتاب المناقب، باب ماجاء فی صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱۲ ص: ۸۹.

② پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآیة: ۶۳. ③ پارہ: ۲۸، سورة المجادلة، الآیة: ۷. ④ پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآیة: ۶۳.

ہمارا اسلام ہم یہ باتیں نہیں جانتے تمہارے لئے بھی زیبا نہیں، ہمارے لئے بھی اور اگر آپ بھی جھگڑے میں لگ گئے تو وہاں اچھی خاصی لاٹھی چل جائے گی۔ جھگڑا اٹھ جائے گا اور جھگڑا اٹھانا بہت آسان ہے۔ مگر اس کا مٹانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے صبر وتحمل کرنا پڑتا ہے۔ تو فرمایا گیا جب چلو تو چال میں نرمی پیدا کرو۔ نرم چال رکھو کہ ہر ایک آدمی محبت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ آپ سے کوئی جھگڑا نہیں کرے گا۔ جھگڑا جب کرے گا جب آپ متکبرانہ انداز سے جائیں اور جب تواضع سے گئے تو اول تو سب عزت کریں گے۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی بے وقوف آدمی مل جائے اور جاہلانہ باتیں کرے، تو آپ کہیں گے: قَالُوْا سَلَامًا بھئی! ہم یہ بات نہیں جانتے، ہمارا اسلام ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔

سلام کی برکات اور آداب...... اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام ایک ایسی عظیم چیز ہے جو جھگڑوں کو ختم کر دیتی ہے۔ سلام آدمی نہ کرے تو برا سمجھا جاتا ہے اور اگر سلام کرلے تو جاہل بھی ہوں گے، وہ بھی جھک جائیں گے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے سلام کر رہا ہے۔ اس واسطے فرمایا گیا اگر باہم دشمنیاں بھی ہوں، عداوتیں بھی ہوں۔ اگر دشمن کو آپ سلام کریں گے دشمنیاں ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ وہ ''وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ'' کہنے پر مجبور ہوگا۔ جس کا مطلب ہے کہ تمہارے لئے بھی سلامتی ہو۔ جب سلامتی کی دعا دے گا تو جھگڑا اٹھائے گا کیوں؟ خود کہہ رہا ہے کہ اللہ تمہیں صحیح سلامت رکھے۔ تو دعا بھی دے اور اوپر سے جھگڑا بھی اٹھائے؟ اس سلام نے ساری دشمنی ختم کردی۔

اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''تقرأ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ'' ① ''سلام کرنے کی عادت ڈالو، خواہ تعارف ہو یا نہ ہو''۔ آج کے زمانہ کا تمدن یہ ہے کہ جب تک تیسرا آدمی تعارف نہ کرائے نہ بول نہ چال نہ سلام نہ کلام۔ یہ متکبرانہ تمدن ہے۔ یہ اسلام کا تمدن نہیں ہے۔ اسلام کا تمدن یہ ہے کہ جب ہم میں اور تم میں اسلام کا رشتہ مشترک ہے، اسلامی اخوت اور بھائی بندی پھیلی ہوئی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ کوئی تیسرا تعارف کرائے۔ پہلے سے ہی تعارف حاصل ہے۔ یہ ہمارا بھائی مسلمان ہے۔ اس میں اسلام بھرا ہوا ہے۔

ہمارا تعارف بھی اسے حاصل ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ میں مسلمان ہوں جب دونوں کے اندر ایک رشتہ مشترک ہے، پھر تیسرے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ تعارف کرائے۔ اگر گھر میں دو حقیقی بھائی موجود ہوں وہ دونوں یوں کہیں کہ کوئی تیسرا محلے والا آکر تعارف کرائے کہ یہ آپ کے حقیقی بھائی ہیں اور یہ آپ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ تب ہم کلام کریں گے۔ آپ کہیں گے کہ میری رشتہ داری ہے۔ مجھے کیا مصیبت ہے کہ میں تیسرے آدمی کو بلاؤں کہ بھئی! میرا تعارف کرادو۔ یہ تکلف اور بناوٹ ہے تو نسبتی رشتے سے زیادہ قومی رشتہ اسلام کا ہے۔ دو حقیقی بھائی اتنے قریب نہیں ہوتے۔ جتنے دینی رشتہ کی وجہ سے دو مسلمان قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ کوئی چوتھا تیسرا آدمی تعارف کرائے۔

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب اطعام الطعام من الاسلام، ج: ١ ص: ١٩۔

ہاں البتہ اس زمانے ایک مصیبت پڑ گئی کہ ہم صورت سے یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمان ہے بھی یا نہیں؟ بعض اوقات سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔لیکن سوچتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے یا عیسائی ہے یا یہودی ہے۔ یہ مصیبت آکے پڑ گئی اس سے معلوم ہوا کہ ہیئت اور وضع بھی ایسی ہو جس سے دور سے سمجھ لیا جائے کہ مسلمان آرہا ہے تاکہ سلام و کلام کی نوبت آجائے۔

بہر حال اس حدیث میں ہدایت کی گئی کہ پہچان پہچان کر سلام نہ کرو۔اس واسطے کہ تعارف کرانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی ہوا۔اس کا تو تعارف ہو گیا اور اگر کوئی چھوٹا موٹا آدمی آئے تو اس کا کوئی تعارف نہیں کراتا۔گویا آپ کا سلام بڑے آدمی کو تو ہوگا چھوٹے کو نہیں ہوگا، یہ خود ایک تکبر ہے کہ چھوٹوں کو منہ نہ لگایا جائے اور بڑوں کے سامنے جھکے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی سواری پر سوار جا رہا ہو اور لوگ سڑک پر سامنے بیٹھے ہوں۔تو سوار ہونے والے کا فرض ہے کہ وہ بیٹھنے والوں کو سلام کرے۔اپنے اندر خاکساری پیدا کرے۔ایسی صورت نہ پیدا ہونے دے جس میں یہ انتظار ہو کہ یہ مجھے سلام کریں۔ کیونکہ یہ میرے سے چھوٹے ہیں یہ چھوٹائی بڑائی کہاں کی؟ آدمی خود ہی چھوٹا ہے۔ بڑا اللہ ہے۔سب سے بڑی ذات وہ ہے۔اس کے سامنے سب چھوٹے ہیں۔اس لئے ہر شخص یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں اور وہ بڑا ہے جب یہ سمجھے گا تو سلام کی ابتداء کرنے کی کوشش کرے گا۔اس لئے سلام کے آداب میں سے یہ ہے کہ جب دو آدمی ملیں تو یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرا مجھے سلام کہے کوشش کرے کہ پہلے میں سلام کہوں۔یہ زیادہ افضل ہے نہ کہ انتظار کرے کہ دوسرا مجھے سلام کرے۔اسی کو فرمایا گیا: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ① رحمٰن کے بندے جب چلیں تو خاکساری کی چال چلیں اور جب لوگوں سے ملیں تو سلام کی عادت ڈالیں۔اگر نیک لوگ ہیں تو سلامتی کی دعا ہوگی۔اگر برے اور جھگڑالو لوگ ہیں۔ تو یہ سلام رخصت کا ہوگا کہ بھئی! ہمارا سلام ہم جاتے ہیں۔ہم ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔تو سلام ہر صورت میں انسان کے لئے لازم رہا۔

پھر یہ اتنی پاکیزہ چیز ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا: ''لاتسلموا تسليم اليهود والنصارى فان تسليمهم بالاكف والرؤس والاشارة'' ② یہودیوں کا سلام انگلیوں سے ہے، نصاریٰ کا سلام ہتھیلی سے ہے اور مسلمانوں کا سلام ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ'' ہے۔تو یہود و نصاریٰ کا سلام اشارہ محض ہیں اور مسلمانوں کا سلام ایک مستقل و عام ہے کہ تم پر سلامتی ہو۔اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں، برکتیں تم پر نازل ہوں۔ ہر مسلمان جو دوسرے کو دعا دے۔اس سے اس کی خیر خواہی اور محبت ظاہر ہوگی۔تعلق بھی مضبوط ہو جائے گا۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۳. ② الجامع للترمذی، کتاب الاستئذان والآداب، باب ماجاء فی کراھیۃ اشارۃ الید بالسلام ج: ۹ ص: ۳۱۷.

وہ مثل مشہور ہے کہ کسی آدمی کے سامنے کوئی جن آ گیا۔ تو اسے خطرہ لاحق ہو گیا کہ یہ تو کھا جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا ماموں جان! سلام۔ اس نے کہا بھانجے وعلیکم السلام اور کہا کہ میرا ارادہ تجھے کھانے کا تھا۔ لیکن تو نے ماموں کہا اور سلام کہا۔ میرے دل میں رحم آ گیا۔ میں نے چھوڑ دیا اب تو آزاد ہے جہاں چاہے جا چلا جا۔ تو سلام نے جان بچائی یہی صورت دشمن کی بھی ہے۔ اگر کسی سے پکی دشمنی ہے اور آپ کہیں السلام علیکم وہ پسیج جائے گا دشمنی ڈھیلی پڑ جائے گی تو یہ بہت بڑی نعمت اور عظیم دعا ہے۔

تو زندگی گزارنے کے طریقے میں پہلی چیز چال ہے دوسری چیز قال ہے کہ قال میں دعا ہو، چال میں تواضع ہو اور جھگڑالوؤں سے بھی جب کلام کرو، سلام کے ساتھ کرو کہ ﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ﴾ ① ہمارا سلام ہو، ہم ان باتوں میں نہیں پڑتے۔ گویا اسلامی شریعت نے رہن سہن کے لئے ابتدائی دو چیزیں بتلائیں۔ ایک زبان کو قابو میں رکھو، دوسرے قدم کو قابو میں رکھو۔ بے ڈھنگا چلو بھی مت اور کلام بھی مت کرو۔

رحمٰن کے بندوں کی تنہائی ...... یہ تو لوگوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ اب آگے اور چلے تو آ گئی مسجد۔ یا تنہائی آ گئی یا رات کا وقت آ گیا جس میں لوگوں کے ساتھ اختلاط نہیں، پھر کیا کرے آگے اس کی ہدایت دی ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ ② رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ رات گزارتے ہیں تو سجود اور قیام کے ساتھ گزارتے ہیں کہ کبھی سجدے میں ہیں، کبھی قیام اور رکوع میں ہیں، اللہ کی یاد کرتے ہیں، اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ گویا مخلوق کے آگے مہذب بن کر آتے ہیں اور خدا کے سامنے عابد بن کر آتے ہیں، یہاں عبادت کی ضرورت ہے، وہاں شفقت کی ضرورت ہے۔ شفقت کا اثر یہ ہے کہ سلام کرے اور عبادت کا اثر یہ ہے کہ سجدہ و رکوع کرے۔ ناک اور پیشانی کو اللہ کے سامنے سجدے میں رگڑے۔

یہ گویا جانی عبادت بتلائی گئی کہ جب تم اپنے گھر میں آؤ۔ یعنی مسجد میں تو سبھی عبادت کرتے ہیں، اس کو تو ساری دنیا جانتی ہے ہے۔ لیکن اگر گھر میں مبیت (رات گزارنے) کے لئے آؤ۔ مبیت کہتے ہیں رات گزارنے کو۔ رات گزارنے میں ہر انسان تنہا ہوتا ہے جب سو گیا تو وہ تن تنہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ جاگتا ہوا ہوگا، مجلس کرے گا۔ دوستوں میں بیٹھے گا، باتیں بھی کرے گا اور جب سو گیا تو ایک لاکھ آدمی اگر ایک جگہ سوئے ہوئے ہیں، ہر ایک ان میں سے تن تنہا ہے۔ اس وقت ہر ایک کا سابقہ اللہ کے ساتھ ہے۔ بندوں کے ساتھ نہیں۔ اس واسطے اس موقع کا ادب بتلایا کہ جب تم تن تنہا ہو اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔ اس وقت سجود و قیام اور طاعت و عبادت کو اپنا شیوہ بنا لو تا کہ تمہاری بندگی نمایاں ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں کہ "ثَلٰثُ دَرَجَاتٍ" تین چیزیں ہیں جن سے انسان کے

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۵.

② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۴.

درجات بلند ہوتے ہیں۔عنداللہ بھی اس کا رتبہ اونچا ہے اور خلقت کے نزدیک بھی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔''اِفْشَآءُ السَّلَامِ وَ اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَالصَّلٰوۃُ بِالَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ'' ① سب سے پہلی چیز افشاء السلام ہے۔یعنی مخلوق کو سلام کرنا ہے۔اس سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں اور اتنی بلندی کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ ہوگا اسے اللہ جانے یا بندہ آخرت میں جانے گا۔دنیا میں یہ ہے کہ کثرت سلام سے لوگوں کے دلوں میں عزت ووقار پیدا ہوجاتا ہے۔

دوسری چیز فرمائی:''اِطْعَامُ الطَّعَامِ......'' حاجت مندوں کو کھانا کھلانا۔اس میں مسکین، غریب، سائل، مسافر، مہمان سبھی آتے ہیں۔کھانا کھلانا سب کے لئے عام ہے۔یعنی حقوق قائم کردیئے گویا یہ فرمایا گیا کہ اس سے درجات بلند ہوتے ہیں۔خواہ کوئی سائل بن کر آئے مہمان بن کر آئے یا ان میں سے کوئی نہ ہو۔آپ کو معلوم ہے کہ فلاں حاجت مند ہے۔ازخود آپ اس کو کھانا کھلائیں۔اس سے بھی درجات بلند ہوتے ہیں۔

تیسری چیز رات کو نماز پڑھنا، جب کہ دنیا پڑی سورہی ہو۔اس لئے کہ یہ نماز انتہائی خلوص کی ہوگی۔نہ اس میں نام ونمود کا جذبہ ہوگا نہ ریاء وشہرت پسندی کا جذبہ ہوگا نہ لوگوں کو دکھلاوے کے لئے ہوگی۔دکھلاوے بھی کس کو؟ سب تو سورہے ہیں، لوگوں کو کچھ خبر نہیں۔اس وقت جو نماز پڑھتا ہے تو بجز اس کے کہ اللہ ہی کی محبت اس کو اٹھا کر جگائے اور کچھ نہیں۔علماء لکھتے ہیں کہ جس کو بھی جو کچھ ملا ہے وہ رات کی نماز سے ملا ہے۔دنیا بھی ملی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔آخرت بنی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا﴾ ② سکون وآرام کا وقت وہ رات ہی کا وقت ہوتا ہے۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تہجد آداب صالحین میں سے ہے کیونکہ دن میں ریاکاری اور دکھلاوے کا وہم ہوسکتا ہے۔رات کی نماز میں دکھلاوے اور ریاکاری کا کوئی دخل نہیں۔غرض جس کو جو ملا وہ رات کی نماز سے ملا۔

حدیث میں ہے کہ چند باتیں ایسی ہیں کہ ان سے اللہ کو ہنسی آتی ہیں جیسی ہنسی اس کی شان کے مناسب ہے۔یہ ایسی ہنسی نہیں جیسے ہم اور آپ ہنستے ہیں۔اس لئے کہ وہ جسم سے پاک ہے مگر ہماری جسمانی ہنسی کی حقیقت یہ ہے کہ جب دل میں کوئی خوشی پیدا ہو جب ہنسی آتی ہے۔غم دل میں بھرا ہوا ہو تو کون ہنسا کرتا ہے۔تو رونا غم کی اور ہنسنا خوشی کی علامت ہے۔غرض خوشی ایک کیفیت ہے۔اسے ظاہر کرنے کے لئے اللہ نے ہنسی رکھ دی چونکہ ہمارے پاس بدن ہے۔تو جب اندر خوشی ہے تو باہر بدن پر ہنسی آتی ہے۔حق تعالیٰ چونکہ بدن وصورت سے پاک ہیں۔اس لئے جب اس کو بیان کریں گے تو کہیں گے، ہنسی درست ہے مگر ہنسی کا وہ مطلب نہیں ہوگا جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

تو حدیث میں ہے کہ تین موقعوں پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔ایک میدان حج میں جب ننگے سر، ننگے پاؤں، گرد پڑا ہوا، بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، نہ خوشبو اور نہ زینت اور لبیک لبیک کہتے ہوئے بندے پھر

① الصحیح للبخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغیر المعرفة ج: ۱۹ ص: ۲۵۲ رقم: ۵۷۶۷.

② پارہ: ۲۹، سورة المزمل، الآیة: ٦.

رہے ہیں۔ حق تعالیٰ کو اس موقع پر ہنسی آتی ہے کہ کیا چیز ان کو ان کے گھروں سے نکال کر لائی ہے۔ بیوی بچے چھوڑے، وطن چھوڑا۔ آخر یہ کیوں فقیروں کی طرح سے بے وطن ہوئے ہیں؟ میری محبت میں ہی تو پھر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ ہنستے ہیں اور ملائکہ سے کہتے ہیں کہ تمہیں گواہ کرتا ہوں میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ یہ میری محبت میں گھر وبار، بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ میں کریم ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ گھر بار چھوڑ دیں اور میں توجہ نہ کروں۔ میں نے ان سب کی مغفرت کی تو خوش ہو کر مغفرت فرماتے ہیں۔ اس خوشی کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری ہنسی کب آتی ہے؟ جب مکبّر تکبیر کہے اور لوگ دوڑ دوڑ کے آرہے ہیں کہ صف اول میں جگہ ملے۔ ہر ایک کہتا ہے مجھے ملے گویا ایک قسم کا جھگڑا ہے اور آگے پیچھے ہونے کی دوڑ ہے۔ حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ جو اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے یہاں کوئی مٹھائی روٹی نہیں مل رہی؟ یہ آخر کیوں دوڑ رہے ہیں؟ یہ میری محبت میں دوڑ رہے ہیں، یہ میرا دربار جان کر آئے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے جتنا بھی قریب ہو جائیں گے اتنے ہی ہمارے درجات بلند ہوں گے۔ اس سے خوش ہو کر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

اور تیسرا موقع کون سا ہے؟ فرمایا گیا کہ خاوند اور بیوی پڑے ہوئے سو رہے ہیں۔ اچانک خاوند کی آنکھ کھلی اور اس کا جی چاہا کہ تہجد پڑھوں۔ اس نے بیوی کے منہ کے اوپر پانی کا چھینٹا مارا وہ ہڑ بڑا کے اٹھی اس نے کہا کیا مصیبت آئی ہے۔ خاوند نے کہا دو رکعت نفل پڑھ لے تہجد کا وقت ہے حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ اس کی محبوبہ ہے اس کے پاس لیٹی ہوئی ہے۔ آرام سے میٹھی نیند سو رہی تھی ایک دم گھبرا کے اٹھی کہ بارش تو نہیں آگئی۔ خاوند نے کہا۔ بارش تو نہیں مگر دو رکعت پڑھ لے تو یہ آگے سے کہتی ہے کہ میں شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے دو رکعت پڑھنے کی توفیق ہوگئی۔ اس نے بھی کھڑے ہو کے دو رکعتیں پڑھیں یا بیوی نے خاوند کے منہ پر چھینٹا مار دیا اور وہ ہڑ بڑا کے اٹھا تو یہ موقع بھی حق تعالیٰ کی ہنسی کا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تینوں چیزیں درجات کے بلند ہونے کا باعث ہیں اور اللہ کی انتہائی رضا کا وقت ہے۔ اس واسطے اس کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا۔

تو یہ جو فرمایا گیا کہ: ﴿وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ ① کہ جب رات تنہائی میں گزارتے ہیں تو کبھی سجدہ رکوع میں اور کبھی تلاوت میں ہیں۔ اس پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ کسی کو یوں نہیں کہہ سکتے کہ دیکھو میں بڑا عابد زاہد ہوں۔ کسی کو دکھلانے کے لئے یہ نہیں اٹھا۔ یہ صرف مجھے دکھلانے اور میری رضا کیلئے اٹھا ہے۔ میں کریم ہوں۔ میں بخشتا ہوں اور مغفرت کرتا ہوں۔ اب گویا تین باتیں ہوئیں گھر سے نکلو تو تواضع کی چال چلو، قال ہو تو سلامتی کا کلمہ ہو، برے کلمات نہ ہوں، جاہلانہ باتیں نہ ہوں اور رات گزارو تنہائی میں جب کہ کسی انسان سے سابقہ نہیں، تو سجود و قیام اور اللہ کے ذکر و اطاعت کرو۔

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۴۔

رحمٰن کے بندوں کی زبان سے عبادت...... یہ تو عمل ہے کہ قیام کرلیا، سجدہ کرلیا اور قلب کے جذبات کیا ہونے چاہئیں؟ ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ﴾ ① دل میں خوف بھرا ہوا ہو، زبان پر اس کو ادا کرے اور یہ دعا کرے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب ہٹا دے اس کو ہمارے سے دور رکھ۔ ﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ ② اس لئے کہ یہ عذاب گلے کا ہار ہے۔ جب لٹک جائے گا تو اس کا جدا ہونا مشکل ہوگا۔ کسی کے بس میں نہیں ہوگا کہ اس عذاب کو دور کرے۔ اللہ کی طرف سے جب عذاب آتا ہے تو کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے۔ آخرت تو آخرت دنیا میں بھی حق تعالیٰ اگر کسی کو عیاذاً باللہ مبتلا کردیں کہیں پناہ کی جگہ نہیں ملتی۔ جب تک اللہ ہی پناہ نہ دے کسی قوم کو گھیرے تو چاروں طرف سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ بجز اس کے اللہ ہی پناہ دے اور مخرج پیدا کردے اور آخرت میں تو اسباب کا ذکر ہی نہیں۔ وہاں تو سارا کارخانہ مسبّبُ الأسَباب کا ہے۔ اس لئے بڑا ڈر وہاں کا ہے۔ اس لئے کہ یہاں اگر آدمی مبتلا سو جائے تو کم سے کم خیال تو باندھ لے گا کہ شاید کل کو چھٹکارا ہو جائے، شاید پرسوں کو وہاں تو خیال پر بھی پابندی ہوگی کہ راحت کا آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو انتہائی قید و بند ہے کہ دل بھی گرفتار، زبان بھی گرفتار، ہاتھ پیر بھی گرفتار کوئی پناہ کی جگہ نہیں یہ ہے عذاب جہنم۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تم ایک تو بدن سے عمل کرو۔ یعنی سجود اور قیام کرو اور ایک زبان سے یہ دعا پڑھو۔ ﴿رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ ③

غرض پہلے قدموں کو لیا کہ انہیں ٹھیک ڈالو کہ چال درست ہو۔ پھر بدن کو لیا کہ سجدے اور قیام میں لگو۔ پھر زبان کو لیا کہ سلامتی کی بات کرو۔ اللہ سے دعائیں کرو ﴿اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾ ④ اس لئے کہ جہنم جسے کہتے ہیں وہ بدترین ٹھکانا ہے اللہ اس سے پناہ دے اور نجات عطا فرما دے۔ اب گویا قول، بدن اور قدم کی سب عبادتیں آگئیں۔

مالیات کے سلسلہ میں رحمٰن کے بندوں کی شان...... اب اس سے آگے انسان کے وسائل اور اسباب ہیں جن کو مالیات کہتے ہیں۔ نقد، سامان، گھر بار یہ سب اموال کہلاتے ہیں۔ جب ہم اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو ہمارا سامان بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ جان اور بدن سے عبادت کریں مال سے نہ کریں، مال اسی کی چیز ہے اس نے ہمیں دیا۔ یہ اس کا فضل ہے مگر اصل مالک وہ ہے۔ تو فرمایا جب بدن سے فارغ ہو گئے۔ بدن کا، قدموں کا، زبان، ہاتھ، پیر اور سونے جاگنے کا ڈھنگ معلوم ہو گیا۔ اب ایک چیز رہ جاتی ہے جو مالیات ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ ⑤ رحمٰن کے

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵.
③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۵. ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۶.
⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۷.

بندوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ ان کو مال و دولت دے تو وہ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ تو بخیل بنیں کہ ایک پائی بھی ان کے ہاتھ سے نہ نکلے نہ فضول خرچ کریں کہ بے جا اپنی دولت خرچ کر کے محض اپنے نفس کی راحتوں میں گنوادیں۔ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ اسراف کریں نہ تقتیر کریں۔ اسراف فضول خرچی کو کہتے ہیں۔ ''تَقْتِیْر' اِمساک'' اور ''بُخل'' کو کہتے ہیں۔ جس طرح اور جگہ فرمایا گیا ﴿ وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴾ ① نہ تو اپنے ہاتھ کو اتنا سکیڑو کہ تمہارا ہاتھ مونڈھے کو لگ جائے کہ دینے کے لئے کچھ نہیں اور نہ اتنا پھیلاؤ کہ جو کچھ ہے سب دے ڈالو کل کو بھیک مانگنے لگو۔ دونوں چیزیں ممنوع ہیں۔ درمیانی چال یہ ہے کہ دو بھی اور نہ بھی دو۔ یعنی یہ پہچان کر کہاں دینا جائز ہے کہاں ناجائز ہے۔ کہاں موزوں ہے کہاں ناموزوں ہے کہاں دینا حق ہے۔ کہاں دینا ناحق ہے۔ لہو ولعب' کھیل تماشے میں مت دو۔ وہاں بخیل بن جاؤ۔ یہی بہتر ہے اور اگر عمل خیر ہو یہاں دینا بہتر ہے جب آدمی اعتدال کے ساتھ خرچ کرے گا تو حدود معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی کہ کہاں خرچ کروں کہاں نہ کروں؟

اسلام کا اصول ہی اعتدال ہے، عمل میں بھی اعتدال ہو۔ چنانچہ یہ اسراف ہے کہ آدمی نفل پڑھنے پر آئے تو ساری رات پڑھتا رہے اور جب چھوڑ کے بھاگے تو فرضوں کی بھی خیر نہیں۔ یہ اچھی چیز نہیں، عبادت کرے، نفل پڑھے۔ مگر اس طرح کہ پھر عمر بھر اس کو نبھائے۔ اسی کو فرمایا گیا: '' خَیْرُ الْاُمُوْرِ مَادِیْمَ عَلَیْہِ ② آدمی کا بہترین عمل وہ ہے، جس پر وہ ہیشگی کر سکے۔ مثل مشہور ہے کہ ''نہ دوڑ کے چلے نہ اکھڑ کے گرے'' چلے تو آدمیوں کی طرح چلے۔ نہ دوڑے نہ بالکل ضعیف بن جائے بیچ کی چال چلے۔ اسی کو فرمایا گیا کہ نفل، تلاوت، ذکر کرنے میں اعتدال ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ ایک قرآن روز ختم کیا کروں؟ فرمایا: ہرگز نہیں! یہ نبھ نہیں سکے گا کم کرو، عرض کیا: یا رسول اللہ! دو دن میں ایک ختم کر لیا کروں گا؟ فرمایا: نہیں! یہ نبھ نہیں سکے گا۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں چاہتا ہوں کہ دس پارے روز پڑھوں اور ہر تیسرے دن ختم کروں؟ فرمایا: نہیں! نبھ نہیں سکے گا۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک منزل روزانہ پڑھ لیا کروں؟ آپ نے زیادہ خوشی سے اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ مگر جب اصرار دیکھا تو فرمایا اچھا۔ عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب میرا بڑھاپے کا زمانہ آیا۔ اب مجھے قدر ہوگئی کہ پانچ پارے روز بھی نہیں پڑھ سکتا تھا تو میں کہتا تھا کہ اگر میں روز کا ایک قرآن شریف شروع کر دیتا۔ تو چھوڑتے بن پڑتی اور محرومی اختیار کرتا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی سچی بات فرمائی تھی۔ کیسی پاک نصیحت فرمائی تھی۔ یہ بھی منشاء نہیں تھا کہ پانچ پارے روزانہ پڑھوں مقصد نبھانا تھا۔ اب ان پانچ کا نبھانا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ اس لئے آدمی کام اتنا کرے جو نبھ سکے۔ ③

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۹. ② الحدیث اخرجہ الامام الترمذی ولفظہ: کان احب العمل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مادیم علیہ، کتاب الادب، باب ماجاء فی الفصاحۃ، ج: ۱۰، ص: ۷۸، رقم: ۲۷۸۳.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب بیان تفاضل الاسلام... ج: ۱ ص: ۱۴۷.

حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہیں، یہ مسجدِ نبوی میں عبادت کیا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن تشریف لائے دیکھا کہ چھت میں ایک رسی لٹک رہی ہے۔ فرمایا: یہ رسی کیسی ہے؟ عرض کیا گیا کہ امّ سلمہ رضی اللہ عنہا عبادت کرتی ہیں۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہیں، اونگھ آنے لگتی ہے تو رسی کا سہارا لے کر بیٹھتی ہیں، پھر عبادت کرنے لگتی ہیں۔ فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آئے پڑ کے سو جاؤ۔ جب سو کر اٹھو بشاشت ہو۔ پھر اللہ کو یاد کرو۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ نیند آ رہی ہے، اونگھ آ رہی ہے۔ کہیں رسی کی آڑ، کہیں دیوار کی آڑ۔ اس تصنع اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ اتنا کام کرو جتنا نبھ جائے۔ تو اقتصاد یعنی عمل میں میانہ روی یہ معتبر ہے۔ خواہ جان کے خرچ کرنے کا عمل ہو یا مال کے خرچ کرنے کا، اعتدال ہونا چاہئے۔

رحمٰن کے بندوں کی قلبی عبادت...... یہاں تک گویا اعمال آ گئے۔ چال ایسی ہو، سلام کرنا ایسا ہو وغیرہ۔ یہ گویا ہاتھ، پیر اور زبان کی عبادت آ گئی۔ آگے قلب کی عبادت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس مبداء اور معاد کے درمیان میں جو زندگی گزارو تو دل کیسا ہونا چاہئے۔ دل کی عبادت کیا ہو؟ تو فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ اللہ کو پکاریں تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، کسی کو ساجھی نہ ٹھہرائیں، نہ اس کی ذات میں نہ صفات میں اور نہ ہی افعال میں۔ ذات بھی اس کی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں۔ صفات و کمالات بھی اس کے یکتا ہیں کہ کوئی اس جیسا نہیں۔ افعال میں بھی وہ یکتا ہے کہ کوئی اس جیسا نہیں۔

ذات لامحدود ہے پس اس کی حد نہیں اس کے سوا جو بھی ہے اس کی ایک حد ہے۔ سب سے بڑی مخلوق انسان ہے۔ مگر اس کی ایک حد ہے۔ ڈیڑھ گز کے اندر ہے اس سے باہر نہیں ہے۔ ہم ایک حد میں ہیں اس سے آگے نہیں ہیں۔ آپ اپنی حد میں ہیں اس سے باہر نہیں۔ میں اپنی حد میں ہوں اس سے باہر نہیں ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جہاں جاؤ وہ موجود، کہیں پہنچ جاؤ وہ موجود ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور ان کی تہوں میں گھس جاؤ تب اللہ موجود ہے، اس کے وجود کی کوئی حد نہیں ہے۔ تو اللہ کے سوا کون ہے کہ اس کے وجود کی حد نہ ہو۔ جسے دیکھو اس کی ایک حد ہے۔ پہاڑ ہیں گو کتنے بڑے ہیں، مگر ایک حد میں ہیں۔ سمندر ہیں ان کی ایک حد ہے۔ جہاں کنارہ آ گیا سمندر ختم ہو گیا آگے زمین شروع ہو گئی۔ یہ نہیں کہ سمندر ہر جگہ موجود، آسمانوں، زمینوں، فضا میں بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے اپنے دائرے کے اندر ہے۔ زمین اپنے دائرے میں ایک حد میں ہے۔ حد سے آگے کچھ نہیں ہے اور اللہ کی ذات اس کی کہیں حد نہیں ہے کسی عالم میں پہنچو اللہ کی ذات موجود ہے۔ اس جیسی دوسری ذات نہیں۔ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔

اسی طرح اس کی صفات بھی یکتا ہیں۔ مثلاً: اس کی صفت علم ہے۔ آپ کا علم ہوگا کہ سو مسئلے معلوم ہوں گے، ہزار ہوں گے، دس ہزار معلوم ہوں گے۔ اس کے بعد پھر جہالت آگے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اللہ کی ذات کا علم لامحدود ہے کوئی ذرہ نہیں ہلتا کہ اسے علم نہ ہو۔ کوئی پتہ نہیں حرکت کرے گا کہ اس کے علم میں نہ ہو۔ آپ کی اور ہماری قدرت

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸.

ایک حد میں ہے۔ ہم یہ لاؤڈ اسپیکر اٹھالیں گے، جائے نماز تہہ کر کے اٹھالیں گے۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ مسجد کو اٹھالو۔ آپ ہم کہہ دیں گے کہ یہ ہماری قدرت میں نہیں ہے ہمارے بس میں نہیں ہے۔ ایک جن مسجد کو اٹھالے گا لیکن اس کو اگر کہا جائے کہ ساری زمین کو اٹھالے وہ کہے گا میرے قبضے میں نہیں۔ ملائکہ علیہم السلام زمین کا ایک ٹکڑا اٹھا کے پھینک دیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں الٹ دیں۔ لیکن ان سے کہا جائے کہ آسمانوں کو پلٹ دو۔ وہ کہیں گے میری قدرت ہی نہیں۔ غرض بڑے سے بڑے طاقت والے کی طاقت کی ایک حد ہے۔ مگر اللہ کی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے، قدرت، علم، سماعت، بصارت ساری صفات اس کی ایسی ہیں۔

ایسے ہی وہ اپنے افعال میں بھی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ماں کے پیٹ میں بچے کو بنا دیتا ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس نے چاند، سورج بنائے ہمارے آپ کے بس میں نہیں ہے۔ ساری زمین کے حکماء ملیں تو چاند تو بڑا اونچا ہے زمین کا ایک ذرہ بنا دیں۔ جس میں وہ خاصیتیں ہوں جو اللہ کی زمین میں ہیں۔ زمین کے ٹکڑوں کو جوڑ توڑ کر کچھ بنالیں گے لیکن خود زمین کی ایجاد کریں ایک ذرہ بھی نہیں کر سکتے۔ ساری دنیا کے فلاسفر جمع ہو جائیں سورج کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے اور اللہ نے بنایا ہے۔ معلوم ہوا اس جیسا فعل کوئی نہیں کر سکتا۔

تو ذات، صفات اور افعال سب کچھ یکتا اور بے مثل ہے۔ اس لئے جب جھکیں گے تو اس کے آگے جھکیں گے۔ اگر اس کا کوئی شریک اور ساجھی ٹھہرالیں تو یہ کیسے درست ہوگا؟ کیوں کہ جب اس کی ذات وصفات اور افعال میں کوئی شریک نہیں تو عبادت میں کون شریک ہو سکتا ہے؟ سب عبادتیں اسی کے لئے ہوں گی۔ سجدہ، رکوع اور فریاد اسی کے سامنے کریں گے۔ رزق، اولاد اسی سے مانگیں گے اس کی ذات کے سوا دینے والا کوئی نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام اتنے مقدّس بندے ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ افضل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ساری کائنات سے آپ برتر ہیں۔ لیکن عبدیت کا یہ حال ہے کہ آپ سے یہ فرمایا گیا کہ تم خود اپنی زبان سے کہو ﴿قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ ''اے پیغمبر! اعلان کرو کہ میں نہ تمہارے نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا''۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کر کے فرمایا: ''یَا فَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ لَا اُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا'' ① ''اے فاطمہ! بیٹی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے قبضے میں کچھ نہیں ہے تیرے اندر ایمان اور عمل ہوگا تو نجات پا جائے گی میں نجات نہیں دلا سکوں گا۔ نہ دنیا میرے قبضے میں ہے نہ آخرت''۔ جب سیدّ الاوّلین والآخرین یہ فرمائیں کہ میرے بس میں کچھ نہیں تو میں آپ کیا چیز ہیں؟ پوری مخلوق کیا چیز ہے؟ جو اس سے نمٹ لے۔ بالکل کسی کے بس میں کچھ نہیں۔ تو اسی کو مانو، جس کے بس میں سب کچھ ہے وہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الوصایا، باب ھل یدخل النساء والولد فی الاقارب ج: ۹ ص: ۲۹۱. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج: ۸ ص: ۲۱۸ رقم: ۳۷۱۸.

اللہ کی ذات ہے۔

ہارون الرشید کی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ اس وقت قحط پڑا۔ ایک دیہاتی آیا کہ میں بھی جا کر بادشاہ سے کچھ مانگوں۔ تا کہ میری اصلاح حال ہو بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ میں جا کر بادشاہ سے کہوں کہ اپنے خزانے سے مجھے کچھ دے۔ جب آیا تو دیکھا کہ ہارون الرشید نماز میں مصروف ہے۔ تو چوب دار نے کہا ذرا ٹھہر جا۔ یہ دیہاتی بے چارہ ٹھہر گیا۔ ہارون الرشید جب سلام پھیر چکے اور دعا مانگ چکے تو ہارون الرشید نے پوچھا کہ چودھری صاحب کیوں آئے؟

چودھری صاحب نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ کیوں آیا پہلے یہ بتا کہ تو کر کیا رہا تھا یہ کیا بات تھی۔ اس نے کہا میں اپنے اللہ کے آگے جھک رہا تھا۔ اس نے کہا اچھا تیرے سے بھی کوئی بڑا ہے؟ اس نے کہا میرے سے بڑے اللہ میاں ہیں۔ میں ان سے مانگتا ہوں۔ بس دیہاتی وہیں سے لوٹا کہ مجھے تجھ سے مانگنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے کیوں نہ مانگوں، جس سے تو مانگ رہا ہے۔ جب تو بھی اس کا محتاج ہے تو میں محتاج کا محتاج کیوں بنوں؟ حقیقت یہی ہے کہ سب اس کے سامنے بے بس ہیں۔ وہی سب کے کام کرتے ہیں۔ نہ کوئی کسی کو دے سکتا ہے نہ چھین سکتا ہے۔ وہی دیتا ہے، اسی کو چھیننے کی قدرت ہے۔ آدمی کو اگر کچھ لینا ہے تو اپنے معاملے کو اللہ میاں سے درست کرے سب کچھ مل جائے گا۔ ان سے بگاڑ لی تو ملا ملایا بھی چھن جائے گا۔

ہارون الرشید ایک دفعہ دربار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہی کا جوش جو آیا تو ہارون الرشید نے کہا آج جس کا جو جی چاہے مانگے اسے وہی دوں گا۔ بس لوگ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دو۔ اس نے کہا دے دیا کسی نے کہا مجھے فلاں صوبے کی گورنری دے دیجئے اس نے کہا دے دی۔ کسی نے کہا، مجھے وائسرائے بنا دیجئے۔ اس نے کہا بنا دیا۔ کسی نے کہا مجھے قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا دے دیا۔ جو جس نے مانگا۔ ہارون نے حکم دیا کہ وہ اسے دے دیا جائے۔ ہارون الرشید کی پشت پر باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے گردن پھیر کر باندی سے کہا کہ تو نے کچھ نہیں مانگا۔ سب درباری مانگ رہے ہیں۔ باندی نے کہا ان بے وقوفوں سے نمٹ لیجئے۔ بعد میں میں بھی مانگوں گی۔ اس نے کہا۔ اچھا! یہ میرے وزراء، امراء سب بے وقوف، پاگل اور احمق ہیں۔

ہارون الرشید کو برا معلوم ہوا کہ اس نے میرے سارے وزراء، امراء کو پاگل بنا دیا۔ ان امراء کو بھی برا لگا۔ مگر امیر المومنین کی باندی تھی اس لئے کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال اس نے کہا کہ پہلے یہ احمق لے لیں۔ اس کے بعد میں بھی آپ سے مانگوں گی۔ جب سب درباروالوں کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ ہارون نے کہا، اب مانگ کیا مانگتی ہے؟ اس نے کہا، جو کچھ میں مانگوں گی آپ دے سکیں گے۔ ہاں میں دوں گا۔ میرا اعلان ہے ضرور دوں گا۔ اس نے ہارون الرشید کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا کہ میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔ جب آپ میرے ہو گئے تو ملک، قلعے، دولت اور خزانے سبھی کچھ میرے ہیں۔ یہ سارے بے وقوف تھے۔ اس لئے کہ جس نے خزانہ لیا۔ اسے خزانہ

مل گیا آگے کچھ بھی نہیں قلعہ مانگا، قلعہ مل گیا۔ باقی کچھ نہیں کسی نے گورنری مانگی، گورنر بن گیا باقی کچھ نہیں۔ تو انہوں نے ایک ایک چیز مانگی اور میں نے وہ چیز مانگی کہ ساری چیزیں میرے قبضے میں آجائیں۔

یہی شان اہل اللہ اور اہل دنیا کی ہے۔ مثلاً اہل دنیا مانگتے ہیں کہ یا اللہ! مجھ کو لکھ پتی بنا دیجئے یا کروڑ پتی بنا دیجئے۔ تو وہ بنا دیئے گئے۔ کسی نے کہا کہ مجھے جاگیر دے دیجئے۔ فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ دے دی۔ اللہ والے کہتے ہیں کہ آپ میرے ہو جائیے تو سب کچھ میرے قبضے میں ہے۔ وہ کروڑ پتی بھی ہے، لکھ پتی بھی ہے۔ تو دانش مندی کی بات یہ ہے کہ جڑ اور بنیاد کو آدمی پکڑے۔

اس لئے آدمی کو اگر مانگنا چاہئے تو اللہ سے مانگے۔ اس سے کیا مانگے جو خود مانگنے والا اور محتاج ہو۔ اسی لئے فرمایا گیا ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو تنہا اللہ کی ذات کو پکارتے ہیں کسی کو بھی ساجھی نہیں سمجھتے، اس لئے کہ اللہ کا کوئی اور مددگار تو نہیں ہے۔ جب انھوں نے آسمان بنایا تھا تو کسی سے کہا تھا کہ اتنا کام تم کر دو، اتنا کام میں کرلوں گا۔ جب پیٹ میں بچے کو بنایا تھا تو کیا کسی سے مدد مانگی تھی کہ آ تو بھی شریک ہو جا۔ مجھ اکیلے سے نہیں بنتا، تو شریک ہو جائے گا تو بن جائے گا۔ جب کسی کام کی تخلیق میں کوئی شریک نہیں ہے تو عبادت میں کیسے شریک ہو گئے؟ وہ تنہا بناتا ہے تو تنہا وہ معبود بھی ہوگا۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ② ''تنہا آپ ہی کی عبادت کریں گے۔ تنہا آپ ہی سے مدد مانگیں گے''۔ مسلم کو اللہ نے یہ شان دی ہے کہ اس کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھکتا۔ یہ ذلت پیش کرے گا تو اللہ کے سامنے کرے گا۔ بندہ بندہ کے آگے ذلیل ہونے کے لئے دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ اسی واسطے شریعت نے بھیک مانگنے سے ممانعت فرمائی ہے۔ کوئی کسی کے آگے بھیک نہ مانگے۔ اس لئے کہ مانگنے سے زیادہ ذلت کسی چیز میں نہیں ہے۔ بھیک مانگنا اپنے کو بے آبرو کرنا ہے۔ بندہ کو حق نہیں ہے کہ اپنے جیسے بندے کے آگے بے آبرو بنے۔

ایک دوستی میں مانگنا ہے۔ جیسے آپ کسی سے بے تکلفی میں یوں کہیں کہ بھئی! یہ چیز مجھے دے دو۔ یہ تعلق کو بڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ﴾ ③ فرماتے ہیں اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ تم اپنے گھروں میں جس طرح تمہارا جی چاہے کھا سکتے ہو۔ ماں کے گھر سے مانگ کے کھا سکتے ہو۔ نہ مانگنا تکبر اور مانگنا تعلق کی علامت ہوگا۔ باپ، حقیقی بھائی، بہن، چچے، پھوپھی، ماموں، خالہ یا ایسے گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھر سے بھی مانگ کر کھا سکتے ہیں کوئی حرج نہیں۔ ان سے مانگ کر لوگے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ جب انہوں نے اپنا سمجھا، جب مانگا۔ کوئی دنیا کے آگے تو

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔ ② سورۃ الفاتحۃ، الآیۃ: ۵۔ ③ پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱۔

یہ مانگنا نہیں پھرتا۔اس طرح بے تکلفی سے اگر کوئی مانگ لے تو یہ بجائے بے آبروئی کے آبرو کا ذریعہ بنتا ہے اور تعلق کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے۔اس کی اجازت دی گئی ہے۔ایک ہے بھیک مانگنا یعنی محتاج ومفلس بن کے کسی کے آگے آنا کہ تم ہمارا کام پورا کردو۔ہم تو کچھ بھی نہیں کرسکتے۔اس ذلت کے اظہار سے ممانعت کی گئی ہے۔وقار کے ساتھ مانگنا جو ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔بہرحال سوال میں چونکہ ذلت تھی کہ ایسی ذلت صرف اللہ کے آگے اختیار کی جاسکتی ہے، غیر کے آگے نہیں۔اس لئے اس کی ممانعت کی گئی ہے اور مانگو تو صرف خدا سے مانگو۔فریاد اس سے کرو۔اولاد، رزق، صحت سب کچھ اس سے مانگو۔

اس لئے کہ ہر چیز کے خزانے اس کے قبضے میں ہیں۔اس لئے فرمایا:﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ① رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو اللہ کے سوا کسی کو شریک نہیں مانتے۔تنہا اسی کو پکارتے ہیں۔

حقوق العباد کے بارے میں رحمٰن کے بندوں کے طرزِ عمل......تو یہاں تک چال ڈھال، زبان، ہاتھ، پیر، مال ودولت اور روح کی سب عبادت آ گئی۔اب آگے دوسرے کے ساتھ معاملہ، دوسرے کے حقوق کو بتلایا گیا اس بارے میں رحمٰن کے بندوں کی کیا شان ہے؟﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ② ''رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو ناحق قتل نہیں کرتے''۔کہ کسی کی جان لے لی، کسی کی گردن اڑادی۔یہ رحمٰن کے بندوں کی شان نہیں ہے۔یہ فُسّاق وفُجّار کی شان ہے کہ دوسروں کو اِیذا پہنچائیں۔اپنی بڑائی جتلانے کے لئے دوسروں کی حقارت چاہیں معاملات میں دوسروں کو حقیر سمجھیں۔یہ متکبروں کی شان ہے ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔وہ دنیا میں اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ہیں۔لیکن دنیا ہی میں ایسے لوگوں کا انجام برا ہوجاتا ہے۔جو دوسروں کی تحقیر کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

ہاں اللہ ہی حکم دیں کہ قتل کرو، پھر قتل کرنا فرض ہے جیسے قصاص میں قتل کریں۔کسی نے ناحق قتل کیا تھا تو سزا میں اس کا قتل کرنا یہ جائز ہے۔یا کوئی اپنے دین سے مرتد ہوجائے۔اس کا قتل کردینا جائز ہے یا اسی طرح سے کوئی زنا کار ہو پتھروں سے سنگسار کردینا۔یہ اس کا قتل کردینا ہے یہ بھی جائز ہے۔اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے پتھروں سے قتل کیا جائے۔غرض زنا کاری یا قاتلوں کو دنیا سے پاک کرنے کے لئے یا مرتدین جو دین کی کوئی اہمیت نہ سمجھیں اور اپنے دین کو بدل ڈالیں۔ایسے لوگوں سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے قتل کرنا جائز ہے یہ قتل حق ہے۔ناحق وہ قتل ہے کہ قتل کا کوئی استحقاق نہیں تھا اور چار پیسے کی خاطر گردن ماردی یا ڈاکہ ڈالنا تھا جا کے قتل کردیا۔یا جذبہ آیا، لڑائی شروع ہوئی۔اِدھر سے بھی چھری نکل آئی، اُدھر سے بھی نکل آئی۔قتل وغارت شروع ہوگیا اس کا کوئی حق نہیں۔تو یہی فرمایا گیا جن کی نسبت رحمٰن کی طرف ہوگی اور وہ رحمانی ہوں گے وہ یہ کام نہیں کریں گے۔یہ فسّاق وفجّار کا کام ہے کہ وہ

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔

بیلوں کی طرح پھرتے ہیں۔ بیل کا کام یہی ہے کہ جو سامنے آ گیا اس کے سینگ مار دیا یا شیر کے کے آگے کوئی گیا تو وہ دانت کھول کر پھاڑ کر کھانے کے لئے جا پڑا۔ غرض یہ بہائم کا کام ہے۔ انسانوں کا کام نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ مومن کون ہے؟ مومن کی علامت کیا ہے؟ فرمایا: ''اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اٰمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَآئِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ'' ① مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے اپنی جان، اپنے مال اور اپنی آبرو کے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ یہ مومن ہے کہ یہ ہماری جان نہیں لے سکتا۔ یہ ہمارے مال کو ضائع نہیں کر سکتا اور ہماری آبرو کو خراب نہیں کر سکتا۔ لوگوں کو اتنا اطمینان پیدا ہو جائے۔ پھر سمجھا جائے گا کہ یہ مومن ہے۔

پھر ''اٰمِنَهُ النَّاسُ'' میں لفظ بھی عام ہے کہ لوگ مطمئن ہوں۔ خواہ مسلم یا غیر مسلم ہوں۔ ہر ایک کو اطمینان ہو جائے کہ بھئی! یہ مومن ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ مار دھاڑ کرتا پھرے یا آبروریزیاں کرتا پھرے۔ دنیا اس سے مطمئن رہے کہ یہ صالح آدمی ہے۔ اس سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور اگر آپ کسی سے کھٹکتے رہیں کہ بھئی کہیں یہ چھری نہ مار دے۔ یہ مومن کیا یہ اچھا خاصا بیل ہے، بیل جب سڑک پر چلتا ہے تو آپ دامن بچا کے چلتے ہیں کہ کہیں پیشاب نہ کر دے کہ کوئی چھینٹ نہ آ جائے، کہیں سینگ نہ مار دے تو اگر مومن سے بھی کوئی یوں بچنے لگے کہ بھئی جیب بچاؤ کہیں جیب نہ کتر لے، کہیں جیب سے فونٹین پین نہ نکال لے جائے تو یہ مومن کیا ہوا۔ مومن کا یہ کام نہیں ہے۔

اس لئے فرمایا کہ: رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو نفس انسانی کے درپے نہیں ہوتے۔ قتل و غارت کرتے نہیں پھرتے۔ ہاں خدا کا حکم آ جائے حکم کی تعمیل کے لئے قصاص لے لیں تو قتل کر دیں۔ ویسے ان کا کام نہیں۔

﴿وَلَا یَزْنُوْنَ﴾ ② آبروریزی نہیں کرتے۔ سب سے بڑی آبروریزی زنا کاری ہے کہ ایک عورت کی آبرو ختم کر دی اور اس درجے ختم کر دی کہ عمر بھر کے لئے بے آبرو ہو گئی۔ اس سے اگر بچہ پیدا ہوا وہ ولد الزنا ہوگا۔ تو پوری برادری کہے گی کہ یہ حرام کا بچہ ہے اس کو بیٹی مت دو۔ اس سے معاملہ مت کرو۔ تو کتنا عظیم اس نے گناہ کیا کہ ایک عورت کی پوری زندگی برباد و تباہ کر دی۔ سوسائٹی میں اس کی کوئی وقعت اور آبرو باقی نہ رہی ایسا شخص قابل گردن زدنی ہے۔

پھر آبروریزی ایک کی کی اور امن ساری سوسائٹی سے اٹھا دیا۔ دوسروں کو جرأت ہو گی کہ وہ بھی یہ حرکت کریں، تو دنیا کے اندر بدامنی پھیل گئی۔ آبرو باقی نہ رہی تو ایک کی آبرو جائے گی اور دوسرے کو اس نے آبروریزی کرنے کی جرأت دلائی۔ اس واسطے فرمایا گیا کہ زانی کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ تو فقط یہ نہیں ہے کہ قتل کیا جائے۔ بلکہ اس کا نصف حصہ زمین میں گاڑ کر پبلک اکٹھی ہو اور پتھر مار مار کر اسے سنگسار کیا جائے۔ ظاہر میں تو یہ سزا بڑی سخت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وحشت والی سزا ہے۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ جرم کی نوعیت کو دیکھو کہ ایک

---

① السنن للترمذی، ابواب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون...... ج: ۹ ص: ۲۱۵ رقم: ۲۵۵۱۔

② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸۔

شخص کی آبرو ضائع کی۔ سوسائٹی برباد کی، دنیا سے اس نے امن اٹھادیا۔ ایسے شخص کو تو اس سے زیادہ سزا دینی چاہئے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ: رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ نہ وہ کسی کی جان گنواتے ہیں نہ کسی کی آبرو گنواتے ہیں۔ دونوں کی حفاظت کرتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا﴾ ① ''پھر بھی اگر کوئی یہ حرکت کرے گا اسے اثام میں ڈالا جائے گا''

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''اَثَام'' ایک وادی اور جہنم میں جنگل ہے۔ اس میں شدید عذاب ہے کہ جہنم بھی اس سے پناہ مانگتی ہے اس میں اس کا ٹھکانا بنایا جائے گا۔ ﴿يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ﴾ ② دوگنا تگنا عذاب اس کے اوپر بڑھتا ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ جیسے اس نے دنیا میں آبرو ریزی کر کے آبرو کو تہ و بالا کیا کہ پھر آبرو ابھر ہی نہ سکے۔ اس طرح عذاب بھی تہہ بہ تہہ ڈالا جائے گا تا کہ وہ ابھر ہی نہ سکے۔ اسے بھی وہاں امن نہیں ہوگا۔ ﴿وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا﴾ ③ اور ایک لمبی مدت تک ذلت و رسوائی کے ساتھ یہ عذاب بھگتے گا۔

توبہ کرنے والوں سے حق تعالیٰ کا معاملہ...... ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ﴾ ④ سوائے اس کے کہ کوئی توبہ کرے، اس سے آخرت کا عذاب ٹل جائے گا۔ دنیا میں تو عذاب آ گیا کہ اسے سنگسار کر دیں گے، لیکن ابھی آخرت کی توبہ باقی ہے، اگر توبہ کر لی، وہاں کا عذاب ختم ہو جائے گا: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ ⑤ جو توبہ کرے اور توبہ کے بعد نیک راستے پر چلنے لگے۔ فضول حرکتوں کو ترک بھی کر دے۔ پھر فقط گناہ معاف ہی نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس کی نیکیاں بدیوں کو بھی مٹا دیں گی اس کی نیکیاں غالب آ جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی برائیاں نیکیوں سے بدل دے گا اور اس تبدیلی کا ظہور آخرت میں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص میدانِ محشر میں حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ اسے بلائیں گے وہ بے چارہ یا تو توبہ کر کے گیا ہوگا یا توبہ نہ کی ہوگی تو حق تعالیٰ کا فضل متوجہ ہوگا۔ اسے فرمائیں گے قریب ہو جا، وہ قریب ہوگا۔ فرمائیں گے اور قریب ہو جا۔ یہ بے چارہ لرز رہا ہے، کپکپا رہا ہے، ہیبت زدہ اور ڈر رہا ہے، فرمائیں گے اور قریب ہو جا، اتنا قریب آئے گا کہ حدیث میں ہے اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ بات چیت ہوگی۔ حق تعالیٰ اس کو اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ یاد دلائیں گے۔ فرمائیں گے یہ حرکت کیوں کی؟ اس کا دل اچھل اچھل کر منہ کو آ رہا ہوگا کہ اب میری نجات کی کوئی صورت نہیں اور حکم ہوگا جاؤ جہنم میں۔ اس لئے کہ ابھی تو چھوٹی چھوٹی برائیاں پوچھ رہے ہیں۔ جو میں نے بڑی بڑی حرکتیں کی ہیں۔ ان کی نوبت آ گئی تو کیا ہوگا؟ یہ معمولی باتیں تھیں ان کو پوچھ لیا ہے۔

عذر کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی عرض کرے گا اللہ میاں! میں نے اپنی بدبختی سے ایسی حرکتیں کیں۔ بہت سی بدیاں گنوانے کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے ان سب کے بدلے ہم تجھے نیکیاں دیتے ہیں اور تیرے نامہ اعمال میں وہ لکھی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۸. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۹. ③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۹. ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۰. ⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۰.

جاتی ہیں۔اب وہ حیران ہوگا کہ یہ تو دوسرا قصہ ہے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے لئے ہلاکت ہے۔ یہاں تو بدیوں کو نیکیوں سے بدلا جارہا ہے۔اب خود ہی کہے گا اللہ میاں وہ جو بہت بڑی بدی میں نے کی تھی وہ تو آپ نے پوچھی ہی نہیں۔فرمائیں گے حق تعالیٰ وہ کیا تھی؟ بندہ عرض کرے گا وہ یہ تھی۔فرمائیں گے اس کے بدلہ میں اتنی نیکیاں دیں۔تو رحمت متوجہ ہو جائے تو ہلاکت کی کوئی صورت نہیں اور غضب خدانخواستہ متوجہ ہو جائے تو نجات کی کوئی صورت نہیں۔آگے فرمایا ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا﴾ ① اس سے پہلے تو وہ گناہگاروں سے معاملہ تھا۔اب آگے اصول بیان کیا جس سے جو بھی قصور ہو وہ توبہ ورجوع کرے،توبہ کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں۔مومن کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ سے مایوس نہ ہو۔توبہ کا دروازہ اس وقت بند ہوگا جب آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا اور قیامت کی بڑی علامت نمایاں ہوں گی اور دنیا کا خاتمہ قریب ہوگا۔اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہوگا۔اسی لئے اگر ستر برس سے بھی معصیت میں مبتلا ہو اور آج دل سے سچی توبہ کر لے۔آج بھی معافی مل جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے زنا کیا اور اس کے دل میں ندامت اور شرمندگی آئی۔اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اے میرے پروردگار! فرماتے ہیں کہ ابھی اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے بخش دیجئے۔حق تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔ ''اَيَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا ''یعنی یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کو پکڑ کرے گا۔فرماتے ہیں جب یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے۔اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔اور حدیث میں ہے کہ مغفرت مانگ کر گیا اور اب پھر زنا کیا پھر ندامت ہوئی پھر آیا یَا رَبِّ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے اچھا اب بھی سمجھ گیا کہ ہے رب؟ پھر مغفرت مانگنے سے پہلے مغفرت کر دیتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔لیکن اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے مگر اس کی رحمت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔تو اس لئے یہ اصولاً فرمادیا کہ ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا﴾ ② اس کے بعد ایک دوسرا معاملہ ارشاد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ ③ رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب ان سے کوئی معاملہ پڑتا ہے تو وہ جھوٹ میں نہیں پڑتے۔زور کے معنی جھوٹی گواہی دینے کے ہیں۔تو رحمٰن کے بندے جھوٹی گواہیوں اور جھوٹی مقدمہ بازیوں میں نہیں پڑتے اور جب وہ لغو اور فضول مجلسوں سے گزرتے ہیں تو سادگی اور صفائی سے گزر جاتے ہیں،ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔کرام بن کے گزر جاتے ہیں۔

اور ان کی دعا ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا﴾ ④ ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں جو ہماری بیویوں سے اولاد دے وہ صالح اور پاک اولاد دے اور ہمیں صالح اور

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۱. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۱.
③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۲. ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۴.

پاک لوگوں سے آگے چلنے والے بنا کہ ہم خود اپنی اولاد اور بیویوں کو راہ دکھلائیں'۔ اور یہ بھی فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا﴾ ① اور ان کے دلوں پر دینی سمجھ اور علم اتنا ہوتا ہے کہ جب قرآن کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہوں تو فوراً قلب کی سلامتی کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے ان میں سمجھ پیدا کر دی جاتی ہے۔ وہ ان آیات کو اندھے بہروں کی طرح قبول نہیں کرتے بلکہ سمجھ داری کے ساتھ شنوا و بینا ہو کر قبول کرتے ہیں۔ وہ مطلب سمجھتے ہیں جو اللہ کا مطلب ہے۔

رحمٰن کے بندوں کی معاد...... آگے فرماتے ہیں: ﴿أُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ﴾ ② یہی وہ لوگ ہیں جن کو بالائی منزلوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ بلڈنگیں عالم آخرت میں عطا کی جائیں گی مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ محلات اور باغات ان کو عطا کئے جائیں گے اور ان کو اَبدی زندگی دی جائے گی گویا یہ ہمارے مقامات معاد ہیں جہاں ہم کو جانا ہے اور ایک وہ جگہ ہے جہاں سے ہم آئے تھے۔ یعنی اللہ کی ذات بابرکات اور اس کا حکم وہ ہمارے لئے مبدا تھا جس سے ہماری ابتداء ہوئی اور یہ (جزاء غرفات) ہماری معاد ہوگی۔ اور بیچ میں زندگی گزارنے کا یہ طریقہ ہے کہ زبان، ہاتھ، پیر، روح اور مالیات کی بھی حفاظت ہو اور ہر چیز اللہ کے حکم کے مطابق صرف کرنے کا جذبہ ہمارے اندر ہو اور یہ جبھی ہوگا جب شریعت سامنے آئے اس کا علم اور تعلیم ہمارے سامنے آئے، جس کے ذریعے ہم ہاتھ، پیر، قلب، دماغ، روح وغیرہ کو اس راستے پر ڈال سکیں۔

تو یہ جو ابتداء میں کہا گیا تھا کہ تین سوال ہیں اور فطرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ کہاں سے آئے؟ کہاں جائیں گے؟ کس طرح زندگی گزاریں؟ تو جہاں سے ہم آئے وہ اللہ ربّ العزّت کی ذات بابرکات ہے جس کے امر سے آئے۔ اس کے وجود سے ہمیں پرتو (عکس) ملا تو ہمارا وجود ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہو جا، ہم ہو گئے۔ تو اصل اللہ کا حکم اور امر ہے اور کہاں جائیں گے؟ یہ معاد ہے کہ لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ وہیں جا کر راحت مل سکتی ہے۔ اور بیچ میں ہم اس کے کہے کے مطابق زندگی گزاریں اور اس کا کہا ہوا کیسے سامنے آئے؟ اس کے رسول اس کا فرمایا ہوا لے کر آئے ہیں۔ جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ جس پر ہم کو چلنا ہے۔ جب ان تینوں چیزوں پر آ جائیں۔ جبھی فطرت کو تسلی ہوتی ہے۔ اتنا آدمی اندھا رہے کہ اسے راستہ ہی نہ ملے جس کے اوپر وہ چلے اور نہ یہ پتہ ہو کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ بس یہ کہ دنیا یوں ہی چلتی آئی ہے۔ اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں سکون کبھی نہیں ہوگا۔

اسی طرح سے اگر کوئی یوں کہے کہ بس ایسے چلتے رہیں گے نہ آخرت آئے گی نہ قیامت آئے گی نہ یہ عالم ختم ہوگا تو پھر یہ الجھن پیدا ہوگی، کہ جس چیز کی ابتداء ہوتی ہے اس کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ جب اس عالم کی ایک ابتداء

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۵۔

ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ عالم کے ہر ہر جز کی ابتداء ہے تو کل کی بھی ابتداء ہے۔ جب ابتداء ہے تو انتہا بھی ہوگی۔ گویا عقل اسے مجبور کرتی ہے کہ مان اور اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ نہ مان، تو سکون پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر مان لیتا ہے تو سکون قلب پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی ایک راستے پر لگ گیا اسے پھر طمانیت اور بشاشت حاصل ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس رکوع کی میں نے تفسیر کی۔ بس یہی تقریر تفسیر بھی تھی اس میں میں نے وہ جوابات عرض کئے جس سے فطرت کو تسلی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنی بھیجی ہوئی راہ پر لگا دے اور انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی ہمیں نصیب فرما دے۔ آپ کی زندگی پر ہماری زندگیوں کو منطبق بنا دے۔ ظاہر و باطن ہمارا ایسا بنا دے جس سے اللہ راضی اور خوش ہو۔ ہمارے قلوب کے اندر اطمینان اور سکون پیدا فرما دے اور انجام ہمارا بخیر فرمائے۔ آخرت ہماری درست فرمائے۔ دنیا ہماری صالح فرمائے۔ ہر مصیبت کو دفع فرمائے۔ جن مشکلات میں ہم مبتلا ہیں، ان سے رہائی نصیب فرما دے۔ (آمین)

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ."

ادب اور اختلاف رائے

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ:

شعائر اللہ کا ادب...... بزرگانِ محترم! دین کے لئے ادب ایک بنیادی چیز ہے۔ جس حد تک ادب اور تادّب بڑھتا جائے گا۔ اسی حد تک انسان کا دین قوی ہوتا جائے گا اور جس قدر بے ادبی گستاخی، جرات و جسارت اور بے باکی بڑھتی جائے گی۔ انسان دین سے ہٹتا جائے گا۔ خواہ علم ہو یا غیر علم ان میں شریعت نے آداب کی رعایت رکھی ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ ① "اے ایمان والو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کر بیٹھ کر بلند آواز سے گفتگو مت کرو، اپنی آوازوں کو پست کرو اور ایسی آواز نہ ہو کہ نبی کی آواز سے بڑھ جائے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ نہ اس پر اجر مرتب ہوگا نہ ثواب"۔

حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلقی طور پر بلند آواز اور جہری الصّوت تھے۔ آواز ہی اس طرح بلند تھی کہ آہستہ بولتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ زور سے بول رہے ہیں۔ لیکن اس آیت کے اترنے کے بعد اتنا آہستہ بولنے لگے کہ بعض دفعہ کان لگا کر سننا پڑتا اور فرماتے "مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں میری آواز بلند ہو جائے اور میرے اعمال حَبط نہ ہو جائیں"۔ ②

اس سے مسئلہ نکل آیا کہ ادب سب سے بڑی چیز ہے۔ حقیقتاً تو ادب حق تعالیٰ شانہٗ کا ہے۔ عظمت والی ذات اللہ ہی کی ہے۔ اس واسطے کہ اس کی بارگاہ میں ادب اور تواضع چاہئے۔ پھر جس جس کو اللہ سے نسبت ہوتی جائے گی، اس کا ادب قائم ہوتا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم کا ادب قائم کیا گیا کہ ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ ③

---

① پارہ: ۲۶ ،سورۃالحجرات ،الآیۃ: ۲. ② السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجرات، ج: ۱۲ ص: ۹۱. ③ پارہ: ۲۷ ،سورۃالواقعۃ،الآیۃ: ۷۹.

اگر حالت جنابت تک نجاست پہنچ گئی تو تلاوت بھی ناجائز ہوگئی گویا زبان بھی پاک نہ رہی۔ یہ قرآن کا ادب سکھلایا گیا کہ اس کلام کی نسبت اللہ کی طرف ہے جس کا نام کلام اللہ ہے۔ اللہ کا ادب ضروری ہے تو یہ تو کاغذوں کا مجموعہ ہے جو حروف ونقوش لکھے ہیں یہ کلام کی علامات ہیں۔ کلام وہ ہے جس کا تکلم کیا جائے۔ پھر وہ حروف ونقوش جن کاغذات میں درج ہیں انہیں بے وضو ہاتھ لگانے سے منع کیا گیا، وہ کاغذات جس جلد میں سی لئے جائیں وہ بھی واجب التعظیم بن جاتی ہے۔ حقیقت میں یہ کلام کا ادب بتلایا گیا لیکن جو چیزیں اس کی طرف منسوب ہوتی گئیں، ان کا ادب بھی واجب ہوتا چلا گیا۔ کلام کی وجہ سے نقوش اور نقوش کی وجہ سے کاغذ اور جلد درجہ بدرجہ سب کی تعظیم ضروری ٹھہرتی گئی۔ اگر ادنیٰ درجہ بھی گستاخی ان میں سے کسی چیز کی کی جائے۔ تو اعمال کے ضبط وحبط ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ بے ادبی کے ساتھ دین قائم رہ نہیں سکتا۔

اسی طرح جب اللہ کا ادب واجب ہے تو بیت اللہ کا ادب بھی واجب ہوگیا۔ ''اللہ کا گھر'' یہ نسبت جب آ گئی تو ادب لازم ٹھہرا۔ حالانکہ حق تعالیٰ حیز اور جسم ومکان سے بری ہیں۔ لیکن نسبت جب آتی ہے کہ وہ تجلیات ربانی کا مرکز ہے تو اس گھر کا ادب ضروری ہوگیا۔ جب بیت اللہ کا ادب واجب ہوا، تو جس مسجد حرام میں بیت اللہ واقع ہے وہ مسجد بھی واجب التعظیم ہوگئی اور اس درجہ بابرکت بن گئی کہ اگر ایک نماز یہاں پڑھی جائے، تو ایک لاکھ نماز کا ثواب ملتا ہے۔ یہ اس کی نسبت کی برکت ہے۔

مسجد حرام جس محل میں واقع ہے، وہ مکہ مکرمہ ہے۔ تو مکہ مکرمہ بھی واجب التعظیم ہوگیا اور اس کا ادب ضروری ہوگیا اور مکہ مکرمہ واقع حجاز میں ہے تو حجاز اور سارے عرب کا ادب واجب ہوگیا۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِيْمَانِ وَبُغْضُ الْعَرَبِ مِنَ النِّفَاقِ '' ① ''عرب سے محبت کرنا ایمان اور بغض رکھنا، نفاق کی علامت ہے''۔ غرض درجہ بدرجہ سارے آداب واجب ہوتے چلے گئے۔ اگر بے ادبی اور گستاخی کسی ایک میں بھی آ گئی، تو دین کا باقی رہنا مشکل ہوجائے گا۔

غیر اختیاری کمالات کا ادب...... اس لئے تادب اور توقیر وتعظیم لازم قرار دی گئی۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا '' ② ''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا، اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہوگا''۔ اکابر کی تعظیم وتوقیر واجب قرار دی گئی اور دھمکی دی گئی کہ اگر اسے نہ انجام دو گے، ہماری جماعت میں شمار نہیں ہوگا اور یہ توقیر ادب عمر کی بڑائی کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی علم رکھتا ہے تو علم کی وجہ سے ادب ہوگا۔ علم کے ساتھ زہد وقناعت کے جذبات اور اخلاق رکھتا ہے، تو ان کا ادب واجب ہوگا

---

① المستدرک ، کتاب معرفة الصحابة رضی الله عنهم، باب ذکر فضائل القبائل ج: ۱۶ ص: ۳۱۹. امام حاکم فرماتے ہیں: هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه.

② السنن للترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبيان، ج: ۷ ص: ۱۵۵ رقم: ۱۸۴۲.

لیکن اگر کوئی بھی کمال نہ ہو، صرف عمر کی بڑائی ہو، اس وجہ سے بھی اس کا ادب ضروری ہوگا۔

حدیث میں ارشاد فرمایا کہ: جو شخص کسی بوڑھے کی تعظیم اس کے بوڑھا ہونے کی وجہ سے کرے تو وہ اس سے پہلے نہیں مرے گا کہ حق تعالیٰ اس کے لئے چھوٹے پیدا کردیں گے جو اس کی تعظیم کریں گے۔ حدیث میں فرمایا کہ جو شخص سفید داڑھی والا ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مجھے حیاء آتی ہے کہ اسے خالی واپس کر دوں تو یہ اس کی داڑھی کا عنداللہ وقار ہے۔ جو محض عمر کی بڑائی کی وجہ سے اسے حاصل ہو گیا ہے۔ اگر اس بڑائی کے تحت اور بڑائیاں بھی جمع ہو جائیں۔ علم، اخلاق تو ادب بھی بڑھتا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ہنر نہ ہو تو خلقی کمال پر بھی ادب کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً حدیث میں ارشاد ہے: ''یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَاُهُمْ لِکِتَابِ اللہِ۔ '' امامت کرنے کا حق اس کا ہے، جو سب سے صحیح قرآن پڑھنے، سب سے زیادہ قرآن کا علم ہو۔ ''فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَآءَ ۃِ سَوَاءً فَاَعْلَمُھُمْ بِالسُّنَّۃِ '' ① (پھر) جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے بڑھایا جائے، اگر سنت کے علم میں بھی سب برابر ہوں تو مسائل صلوٰۃ سے جو زیادہ واقف ہو اسے آگے بڑھاؤ۔ اگر سارے کے سارے حسین وجمیل جمع ہوں۔ فرمایا جس کا نسب اونچا ہو اسے آگے کرو۔ تو کوئی خصوصیت مقدم کرنی چاہئے کہ مقتدیوں کو عار لاحق نہ ہو۔ اگر بڑے بڑے اہل کمال جمع ہیں اور کسی جاہل کو امامت کے لئے بڑھایا، انہیں عار لاحق ہوگا کہ کسے بڑھا دیا؟ اگر سب حسین وجمیل ہوں اور کسی اندھے بہرے کو بڑھا دیا انہیں حقارت پیدا ہوگی کہ یہ کہاں سے آگے بڑھ گیا؟

جب اور کمالات میں سب برابر ہوں پھر خوبصورتی کو آگے رکھا گیا حالانکہ یہ کوئی اختیاری کمال نہیں، خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ لیکن غیر اختیاری چیز بھی بعض اوقات خصوصیت کا سبب بن جاتی ہے۔ تقدم وتقدیم کے لئے آداب کی ضرورت ہے اور ان آداب میں بعض دفعہ تکوینی چیزیں بھی داخل ہو جاتی ہیں۔ باوجودیکہ عمر یا حسن اللہ کی دی ہوئی چیز ہے مگر اس کے باوجود فرمایا، اس کا ادب کرو۔ حاصل یہ نکلا ہر بڑھائی تعظیم کی مستحق ہے۔ خواہ وہ تکوینی ہو یا تشریعی، اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔ اگر توقیر نہ کی گئی تو فرمایا کہ ممکن ہے تمہارے اعمال اور دین پر اثر پڑ جائے۔

نسبت کا اَدب...... یہاں تک کہ نسبتوں کا ادب سکھلایا گیا، یہ جو اللہ والوں کے ہاں نسبتوں کی توقیر کی جاتی ہے کہ شیخ کی عظمت کرتے ہیں۔ شیخ کی اولاد اور وطن کا بھی نسبت کی وجہ سے ادب کرتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا: ''فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِّنِّیْ مَنْ اٰذَاھَا فَقَدْ اٰذَنِیْ '' ② ''فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ جس نے اسے ستایا اس نے مجھے ستایا''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی توقیر کی، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی توقیر کی۔ یہ توقیر شرفِ صحابیت کی وجہ سے نہیں سکھلائی گئی، یہ تو اور صحابہ میں بھی ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

① الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ، ج:۳ص:۴۲۸رقم: ۱۰۷۸۔

② الحدیث اخرجه الامام مسلم فی صحیحه ولفظه: یوذینی ماآذاها، کتاب فضائل الصحابه باب فضائل فاطمة بنت النبی علیه الصلوٰة والسلام۔

اولاد ہونے کی جو نسبت ہے اسی کا ادب سکھلایا گیا۔ اس لئے فرمایا کہ فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے صحابہ میں داخل ہے۔ صحابیت کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی جمع ہو گئیں۔ جو اولاد رسول ہوتا ہے کہ یہ جزو ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو جب قلب میں رسول کا ادب ہوگا، تو اولادِ رسول کا بھی ہوگا۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم دیوبند کے متعلق سنا کہ ان کی عادات میں ادب کا لحاظ بے حد ہوتا۔ اگر سادات کا کوئی نابالغ بچہ بھی آ جاتا تو سرہانہ چھوڑ کر پائنتی کی طرف بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ دنیا مخدوم زادوں کی عزت کرتی ہے۔ یہ سارے عالم کے مخدوم زادے ہیں۔ سارے عالم پر ان کی تعظیم واجب ہے۔ حالانکہ بچہ نابالغ ہے مگر فرماتے یہ مخدوم زادہ ہے۔ یہ اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سبق آموز واقعہ...... ایک دفعہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مراد آباد تشریف لے گئے اور جانا آگے تھا۔ مراد آباد بھی ٹھہرے، پروگرام میں حضرت نے صرف ایک دن رکھا تھا لوگوں نے اصرار کیا، مگر آپ نے انکار فرما دیا تو علماء کا طبقہ جمع ہو کر آ گیا کہ ٹھہر جائیں انکار کر دیا کہ نہیں ٹھہروں گا۔ پھر بعض امراء جمع ہو کر آ گئے۔ امراء سے کہا کہ جب علماء کی نہ سنی، تو آپ کی کیسے مانوں؟ مراد آباد کے لوگوں کے دل میں ٹھن گئی کہ کسی نہ کسی طرح ٹھہراؤ، تو ایک نے مشورہ دیا کہ ان کو ٹھہرانے کی ایک ہی صورت ہے۔ فلاں دفتر میں ایک کلرک لڑکا چودہ پندرہ سال کا ہے، اسے بلا لاؤ، وہ ٹھہرا سکے گا۔ جب وہ آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ادب سے اپنی مسند چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ جھک کر مصافحہ کیا اور اپنی جگہ پر اس کو بٹھا دیا خود مؤدب ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا کہ حضرت جی چاہتا ہے کہ کچھ ٹھہر جائیں، فرمایا بہت اچھا۔ ٹھہر گئے اور اتنے ٹھہرے کہ ایک ہفتہ تک ٹھہر گئے۔ لوگوں نے سوچا کہ حضرت اس وقت تک نہیں جائیں گے، جب تک وہ لڑکا نہیں کہے گا۔ تب آ کر اس نے اجازت دی۔

وہ بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ حضرت کے شیخ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شیخ میاں جی نور محمد جھنجھانوی اعلیٰ اللہ مراتبہ تھے اور یہ لڑکا میاں جی مرحوم کا نواسہ لگتا تھا، تو شیخ کی نسبت کا اتنا ادب تھا کہ ان کے حکم کی وجہ سے وہیں رک گئے، کسی کا حکم نہ مانا۔ یہ نسبت کا ادب تھا۔ شیخ کے بھی نہیں شیخ الشیخ کے نواسے تھے اور یہ ادب تب ہوتا ہے۔ جب اصل شیخ کا ادب دل میں ہو۔ حتیٰ کی وطن کی نسبت کی وجہ سے شیخ کے وطن کے ساتھ شریف لگاتے ہیں۔ دیوبند شریف، نانوتہ شریف، مکہ شریف۔ تو وہ شریف کا لفظ تعظیم کی وجہ سے لگاتے تھے۔ نسبت کا ادب اور عظمت یہ کوئی غیر شرعی چیز نہیں۔

اہل اللہ نے نسبتوں کا اس درجہ ادب کیا ہے کہ شیخ کی اولاد اگر جاہل اور کندہ ناتراش بھی ہوتی، پھر بھی حد درجہ ادب کیا۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرہٗ جو مشائخ چشتیہ میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے پوتے ہیں شاہ ابوسعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو سلسلہ چشتیہ کے مشائخ میں سے ہیں۔ شاہ ابوسعید کا ابتدائی زمانہ بہت آزادی کا تھا۔ نہ نماز، نہ روزہ، نہ پابندی، لباس کے شوقین، ہر وقت پر تکلف کپڑے، بس اسی میں لگے رہتے۔ نہ علم

سیکھنے کی طرف توجہ، نہ اعمال کی اصلاح کی طرف، جوانی کا زمانہ تھا، رنگ رلیوں میں پڑے رہتے۔ وہ ایک دن گنگوہ میں کسی گلی میں جا رہے تھے۔ بھنگن نے ٹوکرہ کباڑہ کا کہیں پھینکا اور سارا گرد ان کے کپڑوں کو لگ گیا، تو غضبناک ہو گئے اور کہا حرام زادی، بے حیاء، تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ بھنگن تھی بوڑھی اور اس نے حضرت شیخ عبدالقدوس کا زمانہ پایا تھا تو اس نے تان کر کہا کہ کس برتے پر اکڑتا ہے؟ دادا کی میراث کمائی تھی، جو آج اتنے فخر سے بولتا ہے؟ بس وہ دن تھا، اسی وقت واپس ہوئے اور گھر میں آ کر والدہ سے کہا کہ اب میں گنگوہ اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک کہ دادا کی میراث نہ سنبھال لوں، اور پوچھا کہ اس وقت حضرت شیخ کے خلفاء میں سے کون کون سے لوگ ہیں؟ معلوم ہوا کہ اجلاء خلفاء میں سے شیخ نظام الدین بلخی ہیں۔ انہوں نے خلافت لے کر بلخ کا سفر کیا تو بتلایا گیا کہ بلخ میں بڑی خانقاہ ہے۔ لاکھوں کی اصلاح اور افادہ ہو رہا ہے تو شیخ نظام الدین کو اطلاع دی کہ میں آ رہا ہوں۔ شیخ کو صاحبزادہ کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو جو پہنچنے کا دن تھا۔ اس زمانے میں موٹر کاریں تو نہ تھیں مہینہ دو مہینہ قطع مسافت کے بعد کہیں جا کر پہنچے اگرچہ صاحبزادہ جاہل ہیں نہ علم نہ ہنر اور شیخ وقت کے ہزاروں متوسل، ہزاروں مرید اور ہزاروں کو علم اور دین کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ مگر اسی نسبت کے ادب کی وجہ سے کئی میل آگے جا کر استقبال کیا اور جب شیخ نکلے تو تمام بلخ، امراء بلخ حتی کہ شاہ بلخ بھی ساتھ نکلے۔ دور سے دیکھا کہ صاحبزادے گھوڑے پر آ رہے ہیں تو حضرت نظام الدین آگے بڑھے اور قدموں پر ہاتھ رکھا۔ صاحبزادے گھوڑے سے اترنے لگے۔ فرمایا نہیں آپ نہ اتریں، اوپر رہیں۔

اب اس شان سے صاحبزادے چلے آ رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہیں اور قدموں پر شیخ نے ہاتھ رکھا ہے اور جب شیخ نے ہاتھ رکھا تو دوسری رکاب پر خود شاہ بلخ نے ہاتھ رکھا۔ اس شان سے بلخ آئے مہمانداری بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تمام علماء و مشائخ اور امراء کو صاحبزادہ کے احترام میں دعوتیں دیں۔ جب تین دن گزر گئے اور شیخ کا یہ عالم کہ دوزانو بیٹھے ہیں۔ صاحبزادہ کو مسند پر بٹھا رکھا ہے۔ پھر پوچھا صاحبزادے! اتنا لمبا چوڑا سفر کیسے کیا؟ کہاں ہندوستان اور کہاں بلخ، کیا ضرورت پیش آئی؟ صاحبزادے نے کہا کہ دادا کی میراث لینے آیا ہوں، جو آپ لے کر آئے ہیں۔ اور یہ وہ نسبت اور تعلق مع اللہ کی میراث ہے۔ فرمایا، اچھا یہ غرض ہے۔ کہا جی ہاں۔ فرمایا کہ وہاں جوتیوں میں جا کر بیٹھ جاؤ اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔ اب نہ وہ ادب ہے نہ وہ تعظیم اور بیعت کر کے تزکیہ نفس کے لئے کچھ اعمال بتلائے۔ خدمت یہ سپرد کی کہ مسجد میں بیٹھ کر استنجاء کے لئے ڈھیلے توڑیں تاکہ نمازی آئیں تو تکلیف نہ ہو۔ سال بھر اسی حالت میں گزر گیا کہ کوئی پرسانِ حال نہیں یا تو شاہ بلخ رکاب تھامے آئے تھے یا آج صاحبزادے کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

جب ایک برس گزر گیا تو شیخ نے امتحان لینا چاہا کہ کس حد تک نفس کی اصلاح ہوئی۔ کبر، غرور رفع ہوا یا نہیں۔ تواضع لِلّٰہیت پیدا ہوئی یا نہیں نفسانیت ختم ہوگئی یا نہیں۔ تو بھنگن کو حکم دیا کہ کوڑا کباڑ کا ٹوکرہ لا کر

صاحبزادے کے قریب ڈال دے۔ تاکہ تھوڑا سا گرد صاحبزادے کے اوپر پڑ جائے اور جو کچھ کہے۔ وہ ہم سے آ کر کہہ دے۔ بھنگن نے جا کر ٹوکرا زور سے ڈال دیا تو سارا گرد صاحبزادے پر پڑا تو اس نے آنکھیں لال پیلی کر کے کہا کہ ''بے حیاء! نہ ہوا گنگوہ کہ تجھے بتلاتا'' اس نے آ کر شیخ سے عرض کیا کہ وراثت نہیں ملی۔ ابھی نفسانیت کافی موجود ہے۔ اگلے دن پھر حکم ہوا، استنجے کے ڈھیلے توڑنا تو خیر ہے ہی مگر نمازی نماز پڑھ کر نکلیں تو جوتے سامنے رکھو، ان کی حفاظت بھی کرتے ہو۔

اب اس خدمت پر لگ گئے۔ جب ایک برس گزر گیا تو بھنگن کو پھر حکم دیا کہ قریب ہی نہیں بلکہ جا کر صاحبزادے کے اوپر سارا کوڑا کرکٹ ڈال دو۔ اس نے سارا ٹوکرہ جا کر ڈال دیا۔ تو صاحبزادے نے کہا ''ارے بی، کیوں اس کباڑ کو تو نے مجھ پر ڈال دیا۔ یہ مجھ سے زیادہ افضل ہے تو نے اس کباڑ کو بھی عیب لگایا۔ میں ایسی ناپاک ہستی ہوں کہ یہ کباڑ بھی میرے اوپر گرنے سے ناپاک ہو گیا۔ میرے اندر تو کوئی خوبی نہیں'' بھنگن نے جا کر شیخ سے یہ سب کچھ عرض کیا۔ فرمایا اب دادا کی وراثت مل چکی ہے۔ اس کے بعد اگلے دن شیخ نے حکم دیا کہ ہم شکار کے لئے جائیں گے۔ صاحبزادے سے فرمایا تم ہمارے ساتھ چلو۔ شیخ گھوڑے پر سوار ہوئے اور حکم دیا کہ تم رکاب تھام کے چلو جب وہ آئے تھے تو شیخ نے رکاب تھامی تھی اور اب حالت یہ ہے کہ گرتے پڑتے شیخ کے ساتھ دوڑتے جارہے ہیں، لہولہان ہو گئے، پیروں میں زخم آئے، خون نکل آیا مگر کیا مجال کہ یہ رکاب سے الگ ہو جائیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ شیخ حکم دیں اور اطاعت نہ کی جائے؟ اسی شان سے سارا دن بسر ہوا، شام کو واپس پہنچے تو صاحبزادہ کو حکم دیا کہ غسل کرو، صاحبزادے نے غسل کیا، کپڑے وغیرہ بدلوائے۔ اس کے بعد مجمع کیا اور بھرے مجمع میں صاحبزادے کو کھڑے کر کے جوتا ہاتھ میں دیا اور فرمایا۔ یہ غلام حاضر ہے، سر حاضر ہے، یہ جوتا ہے۔ میں اسی طرح خانہ زاد غلام ہوں۔ دادا کی میراث مل نہیں سکتی تھی اگر یہ محنت اور ریاضت نہ ہوتی۔ نفس کا کبر رفع نہ ہوتا۔ اب تمہیں دادا کی میراث مبارک ہو، خلافت دی اور پگڑی سر کے اوپر باندھی۔ وہ گویا بے ادبی نہیں تھی بلکہ مجاہدہ تھا کہ اس کے بغیر نفس کی اصلاح نہیں ہوسکتی تھی تو ریاضت اور مجاہدے اس لئے ہوتے ہیں کہ ادب کا مضمون قلب میں پیدا ہو جائے۔ تو اللہ اور اس کے نیک بندوں کا بھی ادب کرو، ہر بڑی چیز کا ادب کرو، جس میں کوئی بڑائی اور خوبی ہو۔ فرمایا: ''مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا'' (1) ''جو ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے۔ اس کا ہمارے سے کوئی تعلق نہیں''۔

ادب میں محتملات کا لحاظ...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا میں نے واقعہ اپنے بزرگوں سے سنا کہ کلیر شریف جب کبھی حاضر ہوتے۔ عرس وغیرہ سے یہ حضرات بچتے تھے کہ بدعات ہیں۔ لیکن بہر حال اللہ والوں کی قبروں پر جاتے تھے، استفادہ بھی کرتے تھے۔ کلیر شریف حاضر ہوتے تو کلیر شریف رڑکی سے پانچ چھ

(1) السنن للترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبیان، ج:۷ ص:۱۵۵ رقم:۱۸۴۲.

میل کے فاصلہ پر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے تو چلتے وقت جوتے نکال دیتے تھے۔ ننگے پیر چھ میل کا فاصلہ طے کرتے۔ یہ محض ادب کا غلبہ حال تھا۔ آپ اگر پوچھیں کہ کیا شرعاً ایسا کرنا ضروری تھا؟ تو شرعاً تو ضروری نہیں ہے کسی جگہ حکم نہیں ہے کہ جاؤ تو ننگے پیر جایا کرو۔ لیکن ادب جب غلبہ حال کے درجہ میں آتا ہے تو ادب وتادب کے وہ وہ محتملات سامنے آتے ہیں کہ ظواہر شریعت میں نشان بھی نہیں ہوتا۔ مگر قلب شہادت دیتا ہے کہ یہ بھی ادب ہے اور اس پر عمل ضروری ہے۔ وہ قانونی عمل نہیں ہوتا، وہ اخلاقی عمل ہوتا ہے۔ قانون کی رو سے اسے واجب یا مستحب نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن قلب اور محبت کے قانون کے لحاظ سے وہ واجب ہوتا ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عمر بھر سیاہ جوتا نہیں پہنا سرخ یا زرد رنگ کا پہنا کرتا تھے۔ فرمایا سیاہ رنگ کا جوتا ممنوع نہیں۔ مگر بیت اللہ کا غلاف سیاہ ہے۔ تو پاؤں میں اس رنگ کا جوتا کیسے پہنوں؟ اس ادب کی وجہ سے سیاہ رنگ کا جوتا پہننا چھوڑ دیا۔ پگڑی تو باندھتے سیاہ رنگ کی کہ یہ تو ادب کا مقام ہے مگر قدموں میں نہیں۔

اب اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! کسی روایت، کسی حدیث میں تو نہیں آیا تو حدیث میں تو ادب کا حکم آیا ہے۔ لیکن ادب جب رچ کر غلبہ حال کے درجہ میں آجاتا ہے تو بعید سے بعید چیز بھی ادب کے درجہ میں آتی ہو، انسان اس کا لحاظ رکھتا ہے اور عمل کرتا ہے جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ بعض چیزیں بڑی محتملات ہوتی ہیں۔ لیکن آداب شرعیہ کے لحاظ سے وہ ضروری قرار پاجاتی ہیں۔

الغرض اس طرح سے یہ آداب سکھائے گئے کہ اس کے بغیر دین کا تحفظ نہیں ہوسکتا اگر دل میں ذرا سا بھی ان چیزوں کے لئے تمسخر واستہزاء کا مادہ موجود ہے تو دین اس کا صحیح سالم نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے ضروری ہے کہ قلب کے اندر سنجیدگی وقار اور احترام ہو۔ آیات اور روایات کا اور ان شخصیتوں کا جن سے آیات وروایات اور دین کا تعلق ہے۔ جن کا ادب واحترام ضروری ہے جس کے بغیر دین محفوظ نہیں رہ سکتا۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا غایت درجہ ادب...... حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حرم مکہ میں سیلاب آیا اور حرم شریف میں پانی بھر گیا تو مقام ابراہیم، یعنی وہ پتھر جس پر کھڑے ہوکر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کی تھی بیت اللہ کی، وہ اب بھی محفوظ ہے اور اس پر ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نشان بھی ہے۔ اس کے لئے ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہے۔ اس کے اندر وہ نشان محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ ① جب طواف کر کے دوگانہ ادا کرتے ہیں تو مقام ابراہیم کو بیچ میں لینا مسنون ہے۔ الغرض سیلاب جو آیا تو مقام ابراہیم پر بنی ہوئی عمارت کا برج گر پڑا اور وہ مقام ابراہیم کے اوپر آ گیا تو اس کا ایک کنارہ ٹوٹ گیا اور وہ کنارہ اسی وقت شریف مکہ کے خزانے میں پہنچا دیا گیا وہ چیز

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۵.

مقدس تھی۔ شریف مکہ، علماء ومشائخ کو وقتاً فوقتاً اس پتھر کی زیارت کراتے تھے۔ خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ اس کے دو تین ٹکڑے ہو گئے۔ اس میں سے ایک چھوٹا ٹکڑا، شریف مکہ نے ہدیہ کے طور پر بعض مشائخ کو دیا اور وہ کسی نہ کسی طرح منتقل ہو کر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ گیا۔ مولانا کی عادت یہ تھی کہ اس مقام ابراہیم کے ٹکڑے کو نکال کر پانی میں ڈالتے اور وہ پانی اہل مجلس میں تقسیم کیا جاتا۔ اس ٹکڑے میں سے کچھ ریزے گر گئے۔ حضرت نے فوراً ریزوں کو جمع کر کے آنکھوں کے سرمہ میں شامل کر لیا۔ جب آنکھوں میں سرمہ لگاتے تو وہ حل کیا ہوا پتھر بھی آنکھوں میں جاتا تو یہ ادب کی بات تھی۔ طبی اصول پر دیکھا جائے، تو آنکھوں کے اندر مٹی یا پتھر کا ریزہ ڈالنا بینائی کے لئے نقصان دہ ہے مگر اس چیز کی پرواہ نہ تھی۔

بینائی کیا چیز ہے؟ اس شرف کے مقابلہ میں جو مقام ابراہیم کی مجاورت اور قرب سے نصیب ہوتا ہے۔ بہر حال دین کی بنیاد ادب وتوقیر اور تعظیم کے اوپر ہے۔ اللہ اور شعائر اللہ کی تعظیم، بیت اللہ، کتاب اللہ، اہل اللہ کی تعظیم، غرض جو بھی اللہ کی طرف سے منسوب ہو جائے۔ اس کی عظمت وتوقیر کرنا یہ دین کی بنیاد ہے۔

اختلافِ رائے...... مشائخ لکھتے ہیں اگر کوئی شخص کسی شیخ سے بیعت ہو اور فرض کیجئے کہ اس کی سنت کے خلاف کوئی بات دیکھے اور ارادہ کیا کہ کسی متبع سنت سے بیعت ہو جائے۔ تو مشائخ بالاجماع لکھتے ہیں کہ اس شیخ سے بیعت ترک کر دینی چاہئے۔ جس سے سنت کے خلاف اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن بے ادبی کا کلمہ کبھی نہیں کہنا چاہئے۔ گستاخی کا کلمہ کبھی نہ کہے۔ اس کے حق میں کبھی جائز نہیں کہ اس کی بے ادبی کرتا پھرے۔ ورنہ معنویت اور روحانیت کو نقصان پہنچے گا۔ یہ وہی احترام کی بنیاد ہے کسی عالم سے فرض کیجئے کہ آپ کسی مسئلہ میں مختلف ہو جائیں یا دوسرا عالم آپ سے مختلف ہو جائے۔ تو مسئلہ میں اختلاف کرنا تو جائز ہے، جب اپنے کو "دِيَانَةً عَلَى التَّحْقِيْق" سمجھے، لیکن بے ادبی اور تمسخر کرنا کسی حالت میں جائز نہیں ہے، کیونکہ بے ادبی اور تمسخر کرنا دین کا نقصان ہے اور اختلاف کرنا محبت سے، یہ عین دین ہے۔ دین جائز ہے اور خلاف دین جائز نہیں۔ اختلافِ رائے کا حق حاصل ہے حتیٰ کہ اگر ذاتی رائے اور مشورہ ہو تو انبیاء علیہم السلام سے بھی آدمی رائے میں مختلف ہو سکتا ہے احکام اور اوامر کا جہاں تک تعلق ہے، اختلاف اور رائے زنی جائز نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ ① "کسی مومن اور مومنہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ جب حکم آ جائے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو پھر اس کے سامنے چوں وچرا کی جائے"۔

تو جہاں تک احکام دین کا تعلق ہے رسول تبلیغ فرما دیں تو تامل بھی جائز نہیں۔ چہ جائیکہ قبول نہ کرے۔ لیکن اگر رسول یہ فرمائیں کہ میری ذاتی رائے یہ ہے۔ اگر آدمی نہ مانے تو اس پر کوئی الزام وملامت نہیں۔ حدیث میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان ہوا، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باندی تھیں۔ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ، بریرہ

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۶.

رضی اللہ عنہا کے سو جان سے عاشق تھے اور بریرہ رضی اللہ عنہا کو نفرت تھی۔ اس دوران میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو آزاد کر دیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ باندی اور منکوحہ اگر آزاد ہو جائے تو نکاح کا باقی رکھنا نہ رکھنا، اس کے اختیار میں ہو جاتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ فلاں شخص غلام ہے تو جائز ہے کہ نکاح فسخ کر دے۔ اب حضرت مغیث رضی اللہ عنہ پریشان ہیں، وہ سو جان سے عاشق اور بریرہ رضی اللہ عنہا کی طبیعت کو مناسبت نہیں اور بات آ گئی حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ۔ تو لکھا ہے حضرت مغیث رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کی گلیوں میں پھر رہے ہیں، رو رہے ہیں، آنسو داڑھی پر گر رہے ہیں، اور ہر ایک کے پاس جاتے ہیں کہ تم سفارش کر دو کہ بریرہ رضی اللہ عنہا نکاح کو فسخ نہ کرے، آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور کہا یا رسول اللہ! آپ بریرہ کو فرمائیں کہ وہ نکاح نہ توڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے بریرہ! نکاح کو فسخ مت کرو۔ مغیث کا برا حال ہے۔ اسے محبت اور تعلق ہے۔ مگر بریرہ رضی اللہ عنہا بہت دانش مند تھی۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا حضور کی ذاتی رائے ہے؟ فرمایا نہیں مشورہ ہے، حکم شرعی نہیں، عرض کیا میں تو نہیں مانتی، فرمایا تجھے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کا حق ہے۔ یعنی کوئی ملامت اس میں نہیں۔ نہ انبیاء کی نہ شریعت کی، یہ الگ چیز ہے کہ ادب کی وجہ سے ہم حضورؐ کے منشاء کو بھی سوائے حکموں سے زیادہ سمجھیں گے۔ بریرہ رضی اللہ عنہا نے پہلے پوچھ لیا کہ یا رسول اللہ! یہ حکمِ خداوندی ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے؟ جب معلوم ہوا، فرمایا کہ میں نہیں مانتی۔ ذرہ بھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر گرانی نہیں ہوئی، لیکن رائے کے نہ ماننے کی وجہ سے کیا یہ جائز تھا کہ بریرہ رضی اللہ عنہا معاذ اللہ، ادنیٰ درجہ کی شان رسالت میں بے ادبی کرے۔ اگر ذرہ بھی بے ادبی ہوتی دین ختم ہو جاتا۔ ادب اور عظمت کو اسی طرح برقرار رکھا۔ لیکن شریعت نے جو حق دیا، اس کو استعمال کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں تو نہیں مانتی یہ میرا خانگی معاملہ ہے اور اگر حکم شرعی ہے تو سر جھکا ہوا ہے۔ اسے سے اندازہ ہوا کہ اختلاف رائے اگر اہل اللہ اور علماء میں ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن بے ادبی یا تذلیل کسی حالت میں جائز نہ ہوگی۔ اس لئے کہ وہ بہر حال عالم دین ہے۔ جس سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا مقام و منصب بطور نائب رسول کے ہے اس کی عظمت واجب ہوگی۔

ہم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پچاسیوں مسئلوں میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ مگر ادنیٰ درجہ کی بے ادبی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قلب میں نہیں آتی۔ اور جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ واجبُ التعظیم ہیں، ویسے ہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی۔ دونوں ماہتاب و آفتاب ہیں دونوں سے نور اور برکت حاصل ہو رہی ہے۔ کسی طرح جائز نہیں کہ ادنیٰ درجہ کی گستاخی دل میں آ جائے۔

گستاخی جہالت کی علامت ہے...... گستاخی و استہزاء کرنا جہالت کی بھی علامت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو نصیحت کی اور فرمایا کہ فلاح مقتول زندہ ہو جائے گا اگر بقرہ (گائے) کو ذبح کر کے اس کا گوشت میت

سے ملا دیا جائے۔ تو بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ﴿اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ ① آپ کیا مذاق کرتے ہیں؟ اس بات میں کیا تعلق ہے کہ گوشت کو مردہ سے ملا دیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ② میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں، یعنی دل لگی، تمسخر جاہلوں کا کام ہے، عالموں کو مناسب نہیں کہ تمسخر کریں۔ اس لئے کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ تو ایک ہے رائے کا اختلاف اور کسی عالم سے مسلک کا اختلاف اور ایک ہے بے ادبی، بے ادبی کسی حالت میں جائز نہیں۔ اختلاف جائز ہے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد رضا خاں (مرحومان)...... میں نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم سے بہت سی چیزوں میں اختلاف رکھتے ہیں۔ قیام، عُرس، میلاد وغیرہ مسائل میں اختلاف رہا۔ مگر جب مجلس میں ذکر آیا تو فرماتے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب۔ ایک دفعہ مجلس میں بیٹھنے والے ایک شخص نے کہیں بغیر مولانا کے احمد رضا کہہ دیا۔ حضرت نے ڈانٹا اور خفا ہو کر فرمایا کہ عالم تو ہیں، اگر چہ اختلاف رائے ہے۔ تم منصب کی بے احترامی کرتے ہو، کس طرح جائز ہے؟۔ رائے کا اختلاف اور چیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کو خطا پر سمجھتے ہیں اور صحیح نہیں سمجھتے۔ مگر ان کی توہین اور بے ادبی کرنے کا کیا مطلب؟ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مولانا'' نہ کہنے پر برا مانا، حالانکہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقابل جو مولانا تھے وہ انتہائی گستاخی کیا کرتے تھے۔ مگر مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اہل علم میں سے تھے۔ وہ تو نام بھی کسی کا آیا، تو ادب ضروری سمجھتے تھے۔ چاہے بالکل معاند ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ادب کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہئے۔

کفر کا فتویٰ لگانے والوں کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلوک...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ سنا کہ دہلی کا قیام تھا، حضرت کے خدّام میں سے چند مخصوص تلامذہ ساتھ تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن رحمۃ اللہ علیہ امروہی، حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم یہ بھی وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب نے اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر فرمایا کہ بھی! لال کنویں کہ مسجد کے جو امام ہیں، ان کی قرات بہت اچھی ہے۔ کل صبح کی نماز ان کے پیچھے پڑھ لیں۔ تو شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے غصے میں آ کر فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی، بے غیرت، وہ ہمارے حضرت کی تکفیر کرتا ہے۔ ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور بڑا سخت لہجہ اختیار کیا۔ یہ جملے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پہنچے۔ اگلے دن حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ ان سب شاگردوں کو لے کر اسی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کی خاطر پہنچے اس امام کے پیچھے جا کر نماز پڑھی۔ سلام پھیرا، چونکہ یہ اجنبی تھے۔ نمازیوں نے دیکھا کہ ہیں تو علماء صورت، تو پوچھا کون ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ مولانا محمد قاسم ہیں اور وہ ان کے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود احسن اور یہ مولانا احمد حسن محدِث امروہی، ان کے تلمیذ ہیں۔ امام کو سخت حیرت ہوئی کہ میں رات دن انہیں کافر کہتا ہوں اور یہ

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۷۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۷۔

نماز کے لئے میرے پیچھے آ گئے۔امام نے خود بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا کہ حضرت میں آپ کی تکفیر کرتا تھا، میں آج شرمندہ ہوں۔آپ نے میرے پیچھے نماز پڑھی۔حالانکہ میں آپ کو کافر کہتا رہا۔حضرت نے فرمایا کوئی بات نہیں۔ میرے دل میں آپ کے اس جذبے کی قدر ہے اور زیادہ عزت دل میں بڑھ گئی ہے کیوں؟ اس واسطے کہ آپ کو جو روایت پہنچی کہ میں توہین رسول کرتا ہوں۔تو آپ کی غیرت ایمانی کا یہی تقاضا تھا۔ہاں البتہ شکایت اس کی ہے کہ روایت کی تحقیق کرنی چاہئے تھی۔مگر بہر حال تکفیر کی بنیاد توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو مسلمان کرے گا، تکفیر واجب ہوگی، دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔تو فرمایا کہ میرے دل میں آپ کی غیرت ایمانی کی قدر ہے۔ہاں شکایت اس لئے ہے کہ ایک بار تحقیق کر لیتے کہ خبر صحیح ہے یا غلط، تو میں یہ عرض کرنے آیا ہو کہ یہ خبر غلط ہے اور میں خود اس شخص کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں جو ادنیٰ درجہ میں بھی نبی کی توہین کرے۔اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ کے ہاتھ پر ابھی اسلام قبول کرتا ہوں۔''اَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ......''اب امام بے چارہ قدموں پر گر پڑا، بچھا جاتا ہے۔

تو بات صرف یہ تھی کہ ان حضرات کے دلوں میں تواضع للہ اور ادب مع اللہ اس درجہ رچا ہوا تھا کہ نفسانیت کا شائبہ نہ رہا تھا۔استہزاء اور تمسخر تو بجائے خود ہے اپنے معاندوں کی بھی بے قدری نہیں کرتے تھے۔بلکہ صحیح محمل پر اتار کر یہ کہتے ہیں کہ جو ہمیں کافر کہتے ہیں۔یہ ان کی قوت ایمانی کی دلیل ہے۔البتہ یہ تحقیق کر لینی چاہئے کہ واقعہ ہم توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں؟ ہم معاذ اللہ دشمنان رسول ہیں یا دوستان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟ اس کی تحقیق ان کو واجب تھی بلا تحقیق حکم نہیں لگانا چاہئے۔تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور تادب دین کی بنیاد ہے۔جس کو عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

از خدا خواہیم توفیق ادب   بے ادب محروم گشت از فضل رب

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں اس کا کوئی مقام نہیں جو گستاخ اور بے ادب ہے۔

بے ادبی کی وجہ سے علمی فیض سے محرومی......بہت سے ایسے فضلاء ہماری نگاہوں میں ہیں۔جنہوں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔اچھے اور ذی استعداد تھے۔مگر اساتذہ سے بے ادبی کا معاملہ تھا۔وہاں سے فارغ ہونے کے بعد علم کی خدمت سے محروم رہے، کوئی دکانداری کر رہا ہے، کوئی گاڑی چلا رہا ہے۔یہ نصیب نہیں ہوا کہ محدث یا مفسر بن کر بیٹھیں اور ایسے بھی ہماری نگاہوں میں ہیں کہ استعداد اور علمی قوت بہت محدود تھی۔لیکن تادب اور خدمت اتنی تھی کہ رات دن اساتذہ کی خدمت میں ادب کے ساتھ لگے رہتے، اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اتنی خدمت کر رہے ہیں کہ بڑے بڑے ذی استعداد فضلاء اتنی نہیں کر رہے ہے، تو مقبولیت ان کے اندر ادب کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تادُّب کا دوسرا واقعہ.....حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک رسالہ خود لکھا اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ کو جو انکے مرید ہیں، دیا کہ اس کی نقل کر کے لاؤ، اس کے

اندر ایک جگہ اِملاء کی غلطی تھی، عین کے بجائے ہمزہ لکھا ہوا تھا۔ حضرت مولانا نے ازخود صحیح نہیں لکھا بلکہ وہ جگہ چھوڑ دی اور حضرت سے آ کر کہا کہ یہ لفظ سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیا ہے؟ تو اِشتباہ کا راستہ اختیار کیا تلقین کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ شیخ کو جا کر یوں کہیں کہ آپ نے غلط لکھا یہ جرأت نہ تھی کہ یوں کہیں کہ یہ غلطی ہوگئی۔ گویا صورتاً بھی بے ادبی نہ کر سکے۔ حقیقتاً بے ادبی کیا کرتے؟

اَدب سے غفلت برتنے کا نتیجہ...... بہرحال دین کا دارومدار تادبات اور آداب پر ہے۔ یہ شریعت کا مستقل باب ہے، جہاں احکام ہیں وہاں اس کے ساتھ کچھ آداب ہیں۔ ادبیات پر اگر آدمی قادر نہ ہو تو وہ اصل احکام سے بھی کورا اور محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے آداب کی ضرورت ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے غالباً ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ پوری طرح یاد نہیں، نقل کئے دیتا ہوں۔ تفسیر فتح العزیز میں ہے۔ ''مَنْ تَهَاوَنَ فِي الْاٰدَابِ حُرِمَ مِنَ السُّنَّةِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالسُّنَّةِ حُرِمَ مِنَ الْوَاجِبَاتِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالْوَاجِبَاتِ حُرِمَ مِنَ الْفَرَائِضِ وَمَنْ تَهَاوَنَ بِالْفَرَائِضِ حُرِمَ مِنَ الْمَعْرِفَةِ۔'' ''جس نے آداب پر عمل کرنے میں سستی دکھلائی، وہ سنت سے محروم ہوگیا جس نے سنت پر عمل سے سستی کی وہ واجبات سے محروم ہو جائے گا اور جس نے واجبات پر عمل سے سستی دکھلائی وہ فرائض پر عمل سے محروم ہو جائے گا اور جس نے فرائض کی ادائیگی میں سستی کی وہ اس کی پہچان سے محروم ہوگیا''۔ فرائض پر عمل کرے گا تو معرفت بڑھے گی۔ اس واسطے سنتوں کو مکمل فرائض کہا گیا تو جس نے آج سنتیں چھوڑ دیں، صرف فرائض کو پڑھ لیا کل وہ بھی نہ پڑھے گا۔ رفتہ رفتہ محروم ہو جائے گا۔

سدِ ذرائع اور اس کی امثلہ...... شریعت میں احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ماموراتِ یعنی کرنے کی چیزیں اس کے لئے آداب رکھے گئے کہ انہیں کرو گے، تب جا کر مامورات پر عمل کرنا نصیب ہوگا اور ایک منہیات ہیں، روکنے کی چیزوں میں مکروہات رکھے گئے کہ مکروہات سے بچو گے، تب حرام سے بچنا نصیب ہوگا اور اگر مکروہات میں ڈوبے رہو گے تو ایک نہ ایک دن حرام میں پڑ جاؤ گے اور اس چیز کو شریعت کی اصطلاح میں سدِ ذرائع کہا جاتا ہے۔ یعنی ذرائع اور وسائل سے بچانا تا کہ اصل ممنوع سے بچ جائے اور واجبات میں وسائل کو اختیار کرنا تا کہ فرائض پر عمل نصیب ہو۔ اسے کہتے ہیں سدِّ ذرائع۔

مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''مَآ اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ'' ① ''جس چیز کے زیادہ حصہ میں نشہ ہو اس کا کم حصہ بھی ناجائز ہے''۔ شراب کے ایک گھونٹ میں نشہ ہے۔ ایک قطرہ میں تو نہیں، لیکن قطرہ پینا بھی اس طرح حرام ہے، جس طرح گھونٹ پینا حرام ہے۔ حالانکہ حرمت تو سکر کی وجہ سے ہے اور ایک قطرہ میں ظاہر ہے کہ سکر نہیں۔ مگر سدِ ذرائع کے لئے ایسا کیا گیا کہ جو ایک قطرہ شراب پی لے گا، کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، پرسوں پورا

① السنن لابی داؤد، کتاب الاشربة، باب النهی عن المسکر، ج: ۱۰، ص: ۱۰۶، رقم: ۳۱۹۶. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۸ ص: ۱۸ رقم: ۳۶۸۱.

جام پیئے گا اور شرابی بن جائے گا۔ تو شرابی بننے سے بچانے کے لئے قطرہ کو حرام کیا گیا تا کہ وہاں تک پہنچنے نہ پائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''مَنْ اَتٰی عَرَّافًا فَقَدْ کَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) ① ''جو کسی جادوگر یا کاہن کے پاس گیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے ساتھ کفر کیا''۔

حالانکہ جادوگر کے پاس سے جانے سے توحید و رسالت اور قیامت کا انکار نہیں ہوتا، کوئی عقائد کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی فرماتے ہیں کہ اس نے شریعت اسلام کے ساتھ کفر کیا۔ اس لئے کہ آج جادوگر کے پاس گیا تو سحر کی برائی اس کے دل سے نکل گئی۔ تو کل کو سحر سیکھے گا اور پرسوں پورا جادوگر بن جائے گا۔ تو اسی جادو کے کفر سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے سے ممانعت کر دی گئی۔ اس کو کہتے ہیں سدِ ذرائع اصل مقصود کو کبیرہ گناہ کہتے ہیں اور وسائل کو صغیرہ گناہ تو وسائل سے روکتے ہیں تا کہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔

مثلاً چوری کرنا گناہ کبیرہ ہے کہ کسی کے مال معصوم کو آدمی بلا اسی کی مرضی کے اٹھالائے۔ لیکن یہ تو ہے اصل خرابی۔ مگر اس کی وجہ سے کسی کے مال کو تاک جھانک کرنا، نقب لگانا، دیوار سے جھانکنا، یہ سب صغائر ہیں اور اسی لئے ناجائز ہیں کہ جب یہ کرے گا، تو ایک دن اصل بھی کر بیٹھے گا۔ گو اپنی ذات سے کسی کے سامان کو دیکھنا، کسی کی دیوار کو تاک لگانا ممنوع چیز نہیں۔ مگر اس لئے ممنوع ہوئے کہ یہ چوری کا وسیلہ بنتے ہیں۔ یا مثلاً زنا کے سلسلہ میں اصل ممنوع وہ فعل (حرام) ہے مگر اس سے بچانے کے لئے نامحرم عورت سے تخلیہ کرنا، اس پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھرنا، ہاتھ سے چھونا، سب ممنوع قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ چیزیں اصل حرام فعل کے ذرائع بنتی ہیں۔ تو شریعت نے چاہا کہ گناہ سے بچنے کے لئے دواعی سے بھی بچو یہ سب شریعت کے آداب ہیں۔

عبادات کے وسائل بھی عبادت ہیں...... مامورات میں نماز فرض ہے۔ اس فرض کو بجالانے کے لئے کچھ چیزوں کا اہتمام کیا گیا کہ اذان جب سنو تو اس کا جواب دو تا کہ اذان سنتے ہی فکر پیدا ہو جائے کہ اب مجھے نماز کو جانا ہے۔ اس کے بعد وضو کا اہتمام کرو۔ پھر ترغیب دی گئی کہ مسجد میں جاؤ گے تو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک بدی مٹا دی جائے گی۔ حالانکہ قدم رکھنا اپنی ذات سے کوئی عبادت نہیں۔ لیکن نماز کے لئے قدم رکھنا عبادت قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ قدم نماز پڑھنے کا ذریعہ بنے گا۔ تو اس اذان کا جواب دینا، قدم اٹھانا، وضو، استنجا اور طہارت وغیرہ کی فضیلت آئی۔

اہل اللہ کو نیکی کی حرص...... حتی کہ بعض اہل اللہ کی یہ شان سنی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ اپنے بزرگوں سے سنا کہ اگر مسجد کے دو راستے ہوں۔ ایک ذرا لمبا راستہ اور ایک مختصر راستہ، تو لمبا راستہ اختیار کرتے اور فرماتے، جتنے قدم زیادہ پڑیں گے، اتنی بدیاں مٹیں گی۔ تو کیا ہم محروم رہیں اور ساتھ میں قدم بھی چھوٹے چھوٹے رکھتے۔ یعنی بالطبع چال سے کم چال سے چلتے کیونکہ قدم اٹھانے پر اجر کا وعدہ ہے تو یہ ہمارے

① مسند احمد، ج:۱۹، ص:۲۱۴، رقم:۹۱۷۱۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترھیب ج:۳ص:۹۸۔

اختیار میں ہے کہ جتنے چاہیں قدم رکھیں تا کہ نیکیاں اتنی لکھی جاویں۔ سو قدم سے اگر مسجد تک پہنچتے تو آہستہ آہستہ چل کر انہیں دو سو قدم بنا دیتے۔ اور یہ حضرات نیکیوں پر حریص ہوتے ہیں جیسے دنیا والے دنیا کے بارے میں کہ انہیں سو مل جائے تو ہزار اور ہزار مل جائے تو لاکھ اور لاکھ مل جائے تو کروڑ کی تمنا اور حرص ہوتی ہے۔ اللہ والے دین کے بارے میں ایسے ہوتے ہیں۔ اگر ایک ثواب ملتا ہے تو اس پر قناعت نہیں، دو مل جائیں تو تیسرے کی خواہش۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... امام ابوداؤد بہت بڑے محدث ہیں۔ وہ دریا کے کنارے کھڑے تھے اور کنارے پر پانی کم تھا۔ ایک جہاز دو تین سو قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا کنارے تک آ نہیں سکتا تھا۔ جہاز میں ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہا اور اتنے زور سے کہا کہ ان کے کان میں آواز آئی تو مسئلہ یہ ہے کہ اس کا جواب ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ'' کہہ کر دینا چاہئے۔ مگر یہ مسئلہ مجلس سے متعلق ہے۔ یہ نہیں کہ اگر کوئی بازار میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو تم گھر سے جواب دینے جاؤ۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کی آواز پڑی۔ یہ لوگ چونکہ نیکیوں کے حریص تھے۔ چھوٹی سی نیکی ملنے کا امکان ہو تو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ نیکی اور خیر کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاز دور تھا، آواز پہنچ نہیں سکتی تھی۔ تین درہم میں کشتی کرایہ پر لی۔ اس میں بیٹھ کر جہاز کے اوپر چڑھے۔ وہاں جا کر کہا ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ''۔ ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ غیب سے آواز کان میں آئی کہ اے ابی داؤد! آج تین درہم میں تو نے جنت کو خرید لیا۔ حالانکہ امام کتنے برے محدث، کتنی حدیثیں لکھیں، کتنے تہجد پڑھے، کتنے جہاد کئے ہوں گے مگر جنت کی خریداری میں بڑے بڑے اعمال کا ذکر نہیں بلکہ ذکر آیا تو ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ'' کہنے کا، جو بظاہر بہت چھوٹا اور معمولی سا عمل تھا مگر کیوں آیا؟ اس لئے کہ ایسے اخلاص سے عمل کیا کہ اس چھوٹے سے عمل میں اتنا وزن پیدا ہوا کہ بڑے سے بڑے عمل میں اتنا نہ ہوگا اور اللہ کے ہاں عمل کی صورت نہیں، وزن دیکھا جاتا ہے۔ کشتی لے کر جہاز پر جا کر ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ'' کہنا نہ فرض تھا نہ واجب مگر یہ لوگ آداب پر عمل کے حریص ہوتے ہیں تا کہ فرائض پر عمل کی کوتاہی نہ آئے۔ تو تادب مع اللہ اتنا ضروری ہے۔

اس زمانے میں چونکہ بے ادبی اور گستاخی کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔ فرقہ بندی زیادہ ہو گئی۔ ایک دوسرے کے حق میں زبان طعن وملامت اور زبان تضحیک کھولنا بہت معمولی بات بن گئی۔ اس واسطے میں نے یہ سمع خراشی آپ لوگوں کی کی، کہ اگر بالفرض کسی عالم سے اختلاف آ بھی جائے۔ تو اگر آپ خود عالم ہیں، تب آپ پر فرض ہے کہ دوسرے کا احترام کریں اور اگر آپ متبع ہیں اور وہ اقتدی کر رہا ہے دوسرے عالم کی، تو عمل اپنے مقتدی ومتبوع کی تحقیق پر کریں۔ مگر دوسرے کے ساتھ تمسخر کرنا آپ کے حق میں بالکل جائز نہیں۔ بلکہ آپ یہ تاویل کریں کہ اس کے ہاتھ میں بھی حجت ہے، جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو وہ کہتا ہے عند اللہ وہ بھی مقبول ہے۔ ہر مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ اگر خطا ہو جائے تو بھی اسے اجر ملتا ہے اور آپ اس پر عقاب اور عذاب بھیجنے لگیں، یہ تو خدا کا مقابلہ ہو گیا۔ حق تعالیٰ کے ہاں اجتہاد کی خطا پر بھی ملامت نہیں۔ آج کل فروعی اختلاف کی

وجہ سے مسخرہ پن بڑھ گیا ہے یہ دین کے منافی ہے۔ بے شک آدمی عمل اپنی تحقیق پر کرے اور دوسرے کو معذور رکھے۔ ادب اور احترام میں کمی نہ آنے دے، یہ دانائی کی بات ہے۔

ائمہ مجتہدین کا باہمی طرزِ عمل...... آئمہ مجتہدین کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ایک دوسرے سے ظاہری اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ادب اور عظمت میں کمی نہیں کرتے۔ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لائے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوئے، تو امام کا مسلک ہے، نماز میں فاتحہ کے بعد آمین آہستہ سے کہنا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں زور سے کہنا افضل واولیٰ ہے۔ مگر جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مزار والی مسجد میں نماز پڑھی، تو آمین کو آہستہ سے پڑھا اور فرمایا مجھے حیا آتی ہے اس صاحب مزار سے کہ اس کے قریب آ کر اس کے اجتہاد سے خلاف کروں۔ یہ ادب اور تادب ہے۔ یعنی جس حد تک گنجائش ہو ایک تو حرام وحلال اور جائز و ناجائز کا فرق ہے کہ ایک کے ہاں جائز، دوسرے کے ہاں حرام، اس میں تو دوسرے کے مسلک پر عمل نہیں کر سکتے۔ مگر جہاں اولیٰ اور غیر اولیٰ کا فرق ہے وہاں ادب ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے افضل پر عمل ترک کر دیا اور غیر افضل پر عمل کیا امام کی رعایت سے، حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مزار میں ہیں، سامنے نہیں ہیں۔ مگر یہ ادب کا عالم تھا اور یہ ادب اور تادب کی بات تھی۔

مسائل اور جذباتِ نفسانی...... حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان بھی اختلافات تھے، آئمہ مجتہدین میں اجتہادی مسائل میں جو اختلافات ہیں وہ صحابہ میں بھی تھے۔ لیکن باوجود اس کے ادب واحترام اور عظمت وتعظیم میں ذرہ برابر کمی نہ کی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں جھگڑوں کی وجہ کے لئے مسائل کی خاصیت نہیں ہے، بلکہ ہمارے نفسانی جذبات ہیں۔ ہم نے اپنے جذبات کو نکالنے کے لئے مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔ اگر یہ مسائل کی خاصیت ہوتی تو سب سے پہلے صحابہ لڑتے کیوں کہ ان کے ہاں بھی اختلاف تھا۔ اس کے بعد آئمہ مجتہدین کے ہاں لاٹھی چلتی۔ پھر علماء ربانیین آپس میں لڑتے، مگر اختلاف بھی ہے اور ادب بھی۔ یہ دراصل اختلاف رائے کے نام سے ہم اپنے جذبات نکالتے ہیں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ لڑنے کی چیز اصل میں جائیداد ہے، مکان ہے، جاگیر ہے۔ جب مسلمانوں کے پاس یہ چیزیں نہ رہیں۔ نہ جائیداد، نہ مکان، نہ سلطنت، سوچا کہ بھئی! دین کو لڑنے کا ذریعہ بناؤ اور مسائل کو آڑ بناؤ تو یہ مسائل کی خاصیت نہیں۔ اختلاف کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر لڑنے جھگڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے فروعی اختلاف پر عیسائی جج کا طنز......ایک عرصہ پہلے ایک یورپین عیسائی کلکٹر تھا۔ اس کے زمانہ میں احناف اور اہل حدیث میں لڑائی ہوئی اور لڑائی ''آمین'' کہنے پر ہوئی۔ حنفیوں نے آہستہ پڑھی۔ اہل حدیث نے زور سے کہی تو لاٹھی چل گئی۔ بہت لوگوں کا سر ٹوٹ گیا۔ مقدمہ کلکٹر کے ہاں گیا۔ فریقین کے وکلاء نے کلکٹر کو مقدمہ سمجھایا تو اس نے کہا کہ بھئی! آمین کوئی جائیداد ہے یا بلڈنگ ہے کہ اس پر لڑتے ہیں؟ وکلاء نے کہا،

نہیں آمین ایک قول ہے جو زبان سے نکالتے ہیں۔ یہ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر سے حدیث آئی ہے کہ آمین زور سے پڑھو، دوسرے کہتے ہیں کہ حدیث آئی ہے، آہستہ پڑھو اس نے کہا، جس کو جو حدیث معلوم ہے اس پر عمل کرے۔ تم لڑتے کیوں ہو؟ اور اس کی سمجھ میں بات نہ آئی اور سمجھ میں آنے کی بات بھی نہ تھی۔

بہر حال اس نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ لکھا کہ میں مقدمہ کی مثل دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک "آمِین بِالْجَھر" زور سے پڑھنا، ایک "آمِین بِالسِّر" آہستہ پڑھنا اور ایک "آمِین بِالشَّر" یعنی جھگڑنے، لڑنے کے لئے پڑھنا اس لئے کہ پہلے دونوں کے بارے میں حدیث موجود ہے ایک کو ایک امام نے، دوسرے کو دوسرے امام نے اختیار کر لیا۔ اس میں لڑائی کی بنیاد ہی نہیں۔ یہ آمین بالشر کی لڑائی ہے۔ لہٰذا میں دونوں کو سزا دیتا ہوں۔ گویا اس نے بتایا کہ اختلافی مسائل نہ لڑائی کے لئے ہوتے ہیں نہ باہمی نزاع کے لئے، وہ دیانتاً حجت سے رائے قائم کرنے کے لئے ہوتے ہیں تو یہ ہمارے قلوب کا فساد ہے کہ ہم نے مسائل کو اپنے دل کے جذبات نکالنے کے لئے آڑ بنا لیا ہے اور ہر دین کا مسئلہ جھگڑا ڈالنے اور گروہ بندیوں کے لئے رہ گیا ہے۔

اختلافی مسائل میں راہ صواب...... اگر اجتہادی مسئلہ ہے تو اسے بیان کرو مگر لڑنا کیوں ہے؟ وہ اپنی قبر میں جائے گا اور تم اپنی قبر میں جاؤ گے کیونکر اس سے مسخرہ کرو اور اسے کیا حق ہے کہ تمہارا استہزاء کرے۔ آپ نے بیان کیا امر بالمعروف کا حق ادا ہو گیا۔ اب اگر کوئی نہیں مانتا، نہ مانے۔ اگر اس کے پاس کوئی حجت ہے تو وہ عنداللہ جواب دے گا تم ذمہ دار نہیں، نہ تم سے آخرت میں پوچھا جائے گا اور پھر دین منوانا (یعنی اصول دین پر کسی کو مجبور کرنا) بھی ضروری نہیں۔ چہ جائیکہ فروعی اور اجتہادی مسائل کا منوانا بھی ضروری ہو۔ بہر حال آج کل ذرا ذرا سے اختلافی مسائل پر لوگ نزاع کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی قوت زائل ہو رہی ہے۔

شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت...... حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ فلاں مقام پر جا کر دین کی تبلیغ واشاعت کرو، چلتے چلتے مرید نے عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمایئے مجھے شیخ نے فرمایا کہ دو باتوں کی نصیحت کرتا ہوں کہ خدائی کا دعویٰ مت کرو اور نبوت کا دعویٰ مت کرو۔ وہ حیران ہوا کہ حضرت! میں برسہا برس آپ کی صحبت میں رہا۔ کیا اب بھی یہ احتمال اور خطرہ تھا کہ میں خدائی اور نبوت کا دعویٰ کروں گا؟ فرمایا کہ خدائی اور نبوت کے دعویٰ کا مطلب سمجھ لو، پھر بات کرو۔ خدا کی ذات وہ ہے کہ وہ جو کہہ دے وہی اٹل ہو اس سے اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو انسان اپنی رائے کو اس درجہ میں پیش کرے کہ وہ اٹل ہو۔ اس کے خلاف نہ ہو سکے۔ کوئی بندہ اپنی رائے پر اتنا اصرار کرے، تو اس سے بڑھ کر خدائی کا دعویٰ کیا ہو گا؟ اور نبی وہ ہے کہ جو زبان سے فرمائے وہ سچی بات ہے، کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنے قول کے بارے میں کہے کہ یہ

اتنی سچی بات ہے کہ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ وہ در پردہ گویا نبوت کا مدعی ہے کہ میری بات غلط نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس کی رائے ہے۔

فساد یا اصلاح ؟...... تو ایک شخص اجتہادی رائے کے بارے میں اتنا جمود کرے کہ کسی کو معذور بھی نہ سمجھ سکے۔ یہ درحقیقت عوام کی اصلاح نہیں فساد ہے۔ تو ایک چیز کو چلانے کی ضرورت نہیں کہ بار بار کہے۔ بس ہو گیا ایک مسئلہ کا اعلان، ماننے والے مانیں گے۔ تم ذمہ دار اور خدائی ٹھیکہ دار نہیں ہو۔ ایک مسئلہ کا ضد اور اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہنا اور چباتے رہنا، اس سے خوانخواہ عوام میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے والا تو بچ گیا اور مصیبت عوام پر آ گئی۔

تبلیغی اور ترجیحی مسائل میں فرق...... ہاں ایک ہیں دین کے اصول، نماز فرض ہے، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ آپ زور سے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فروعی اور اجتہادی چیزوں میں آپ زور دیں۔؟ تو یہ تبلیغی چیزیں ہی نہیں، آپ زور کہاں سے دیتے ہیں۔ مثلاً حنفی مسائل ہیں جو تبلیغی مذاہب ہی نہیں آپ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہیں کہ لوگو! تم حنفی بن جاؤ اور شافعی مت بنو۔ یا شافعی کہے کہ لوگو! شافعی بن جاؤ، حنفی مت بنو یہ ترجیحی مذاہب ہیں، تبلیغی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں عمل واجب یا افضل ہے اور فلاں عمل نہیں۔ تو ترجیحی مذاہب کو تبلیغی مذاہب مت بناؤ کہ اگر کسی عالم کو کوئی جزئی تحقیق ہو۔ خوانخواہ اس کی تبلیغ پر ضد اور اصرار کیا جائے۔ بہر حال آج کل یہ چیز پیدا ہو گئی ہے۔ بہت گستاخی، جسارت اور جرات ہو رہی ہے اس واسطے یہ چند باتیں عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرماوے عمل کی۔

"اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَیْرِ وَاخْتِمْ لَنَا بِالْخَیْرِ"

حقوقِ مالیہ

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّـــا بَعْـــدُ:...... فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بدن اور اس کی ضروریات کا خالق...... بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی لمبی چوڑی تقریر کرنا نہیں ہے۔ مختصر طریق پر چند کام کی باتیں آپ حضرات کے سامنے گذارش کروں گا اور اس میں بھی کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔ بلا تمہید جو اصل مقصود کی باتیں ہیں، وہی کہنی ہیں۔ اتنی بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ ہمارا خالق اور مالک اللہ رب العزت ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا، ہمارے بدن کو بھی اور ہماری روح کو بھی اور روح و بدن کے لئے جن سامانوں کی ضرورت ہے، ان سامانوں کو بھی اس نے پیدا کیا۔ بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت تھی۔ تو زمین سے لے کر آسمان تک ان ضروریات کو پھیلا دیا۔ زمین میں طاقت رکھ دی کہ ہماری غذائیں اگائے۔

اس میں طاقت رکھ دی کہ ہمارا لباس بھی اگائے۔ گویا زمین کو اللہ نے غذاؤں کا گودام بنا دیا۔ یہ گیہوں چنے، چاول، پھل پھول اور فروٹ سب اسی سے نکلتے ہیں۔ پھر اپنی حکمت سے زمین ہی کو سڑک بنا دیا۔ ہم اس پر چلتے پھرتے ہیں۔ پھر زمین ہی میں ہمارے لئے پانی کا سامان رکھا اور دریا جاری کر دیئے، زمین ہی کے اوپر ہوائیں پھیلا دیں کہ ہم سانس لے سکیں۔ تو زمین گودام، واٹرورکس، اور ہمارے کپڑوں کا صندوق بھی ہے، جس سے روئی اور جانوروں کی اون نکلتی ہے۔ ساری بدنی ضروریات اس میں مہیا کی ہوئی ہیں۔

بدن کو روشنی کی ضرورت تھی تو پہلے آسمان کی چھت قائم کی۔ اس میں چاند سورج اور ستاروں کے انڈے

---

① پارہ:۸،سورۃ الاعراف،الآیۃ:۵۴.

لٹکا دیئے پھر ایک ہی چیز سے بہت سے کام لئے سورج ہمیں روشنی بھی بخشتا ہے۔ گرمی کی ضرورت ہے تو حرارت بھی بخشتا ہے۔ ٹائم اور وقت کی ضرورت ہو تو اچھی خاصی گھڑی بھی ہے۔ جس سے ہم اوقات بھی معلوم کرتے ہیں۔ ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ① ستاروں سے لوگ راستے بھی پاتے ہیں سمندروں میں جہاز رانی ہوتی ہے وہاں سڑکیں بنائی ہوئی نہیں ہوتی سمتوں سے چلتے ہیں اور سمتیں ستاروں سے متعین کرتے ہیں۔ تو ستاروں سے راہ، سورج سے روشنی اور گرمی ملتی ہے۔ نیز ستاروں سے جڑی بوٹیوں میں خاصیتیں اور تاثیر پیدا ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کی نلیوں میں گودا اور روغن پیدا ہوتا ہے۔ غرض انسان کے لئے جتنی بدن کی ضروریات درکار ہیں۔ وہ سب زمین اور آسمان کے وسط میں رکھ دی ہیں تو وہ ہمارے بدن کا بھی خالق ہے اور بدن کی ضروریات کا بھی۔

روح اور اس کی ضروریات کا خالق...... اسی طرح وہ ہماری روح اور اس کی ضروریات کا بھی خالق ہے۔ جیسے بدن کی ضروریات ہیں، بدن کے لئے غذا کی بھی ضرورت ہے تو روح کے لئے بھی ضرورت ہے۔ بدن کو اگر راحت کی ضرورت ہے تو روح کو بھی سکون وتسکین کی ضرورت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بدن مادی چیز ہے اس کے سامان بھی مادی ہیں روح ایک پاکیزہ اور لطیف چیز ہے اس کے سامان بھی لطیف ہیں روح کی غذا علم ومعرفت، اخلاق ربانی اور ملکیت ہے۔ یعنی ملائکہ کی صفات اپنے اندر پیدا کی جائیں۔ اس سے روح کو سکون ملتا ہے۔ روح کو آپ کے اس روٹی اور کپڑے کی ضرورت نہیں ہے اس کا روٹی کپڑا اس کے مناسب حال ہے جو علم کمال دین ودیانت اور اخلاق ہے۔

جس طرح پانی کے لئے بادل مقرر کئے جو اپنے وقت پر آ کر برس جاتے ہیں، جس سے آپ کی زمین سیراب ہوتی ہے اس طرح علم کے بادل پیدا کئے وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں جن کے ذریعے وحی کی بارش ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ اَصَابَ اَرْضًا الخ'' ② میری اور میرے دائرہ علم وکمال ایسی مثال ہے جیسے بہت زور کا بادل اٹھا اور گھٹا اٹھی اس میں سے بارش برسنی شروع ہوئی موسلا دھار پانی پڑا تو زمین کی تین قسمیں ہو گئیں۔ ایک زمین وہ ہے جو پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور پھل پھول اگا کر باغ وبہار بنا دتی ہے، ایک وہ کہ باغ وبہار اور پھل پھول نہیں نکالتی لیکن پانی کو جمع کر لیتی ہے گہرے تالاب ہیں ان میں پانی بھر جاتا ہے پھر لوگ وہاں سے پانی لے کر پیتے ہیں۔ کھیتوں کو سیراب بھی کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ وہ جو بالکل چٹیل میدان ہے جس میں نہ اگانے کی صلاحیت ہے نہ پانی کے جمع کرنے کی، پانی آیا اور بہ کر نکل گیا۔ نہ جمع کیا کہ دوسرے فائدہ اٹھائیں نہ کوئی پھل پھول ہی اگایا کہ خود اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دلوں کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک قلوب وہ ہیں کہ جب وحی کا پانی آتا

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۶۔

② الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۷۷۔

ہے تو وہ اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور اس سے طرح طرح کے علم وحکمت کے پھل پھول نکال کے پیش کرتے ہیں۔ جس سے روحانیت میں باغ و بہار آ جاتی ہے۔ یہ ہیں فقہاء کہ دین اور علم پہنچا، انہوں نے اجتہاد کیا مسائل نکال نکال کر دنیا کے آگے رکھ دیئے تا کہ لوگ عمل کریں۔

ایک قلوب کا وہ طبقہ ہے، جو پھل پھول تو نہیں اگا سکتا مگر امانت داری کے ساتھ وحی کے پانی کو جمع کر لیتا ہے۔ لوگ آتے ہیں، کوئی اس سے پیتا ہے، کوئی کھیتی کو دیتا ہے۔ یہ ایسے ہیں جیسے مُحدثین اور حُفاظ قرآن حکیم کہ وحی آئی اور انہوں نے اسے اپنے سینے میں جمع کر لیا۔ ان میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس میں سے مسئلہ نکال لیں۔ مگر جو آئے گا، اسے پانی پہنچا دیں گے وہ اس میں سے مسائل نکال لے گا۔

تیسرا طبقہ گمراہ کہا گیا وہ ہے کہ وحی کا پانی برسا لیکن اس کے دل ایسے ہیں جیسے اونچی زمین ہوتی ہے کہ آیا اور بہہ گیا۔ نہ اس میں جمع ہوا نہ پھل پھول نکلے۔ جیسے مادی پانی کے لحاظ سے زمین کی تین قسمیں ہیں اسی طرح وحی کے پانی کے اعتبار سے بھی قلوب کی تین قسمیں ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے جیسے بدن کے لئے غذائیں پیدا کی گئیں روح کے لئے بھی پیدا کی گئیں، بدن کی غذا بھی ہر ایک نہیں نکال سکتا۔ کسی کے اندر ایجاد کا مادہ ہے کہ زمین میں سے معدنیات نکالے، سونا چاندی اور سیسہ نکال کر طرح طرح کے سامان بنائے۔ ایک وہ مزدور ہیں جن میں یہ صلاحت نہیں ہے کہ وہ ایجاد کریں وہ سونا چاندنی نکال نکال کے پیش کریں۔ تا کہ دوسرے اس سے کام لیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن میں نہ عقل ہے نہ ہمت نہ ایجاد کر سکتے ہیں نہ وہ کوئی چیز جمع کر سکتے ہیں بلکہ دونوں باتوں سے خالی ہیں۔ غرض جیسے وہاں تین قسمیں ہیں۔ یہاں بھی تین ہی قسمیں ہیں۔

روح و بدن کو صحیح کر کے اس کے مالک کو سونپنا ہے...... تو بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت ہے۔ روح کے لئے روحانی غذاؤں علم وکمال وغیرہ کی ضرورت ہے اور یہ سارے سامان اللہ میاں نے پیدا کئے۔ تو ہم بھی، ہماری جان بھی، ہمارا مال بھی سب خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اور ہم اللہ کی ملک ومملوک ہیں۔ نہ ہمارا بدن ہماری ملک ہے نہ روح۔ ہم امانت دار ہیں مالک نے پیدا کیا ہمارا فرض ہے کہ ہم امانت داری کے ساتھ اسے سونپ دیں اور صحیح کر کے اسے سونپیں تو ہم اس بدن کے خود مالک نہیں ہیں۔ یہ سرکاری مشین ہے۔ اس لئے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔

اس لئے اگر بدن پر بیماری آ جائے تو سنت ہے کہ علاج کیا جائے۔ اس کی حفاظت کی جائے۔ اس لئے کہ ہماری ملک ہوتو چاہے اپنے کو ختم کر دیں، چاہے قتل کر دیں، خودکشی کر لیں۔ مگر یہ ہماری ملک نہیں، مالک کی چیز ہے۔ ہمیں امانت داری کے ساتھ اسے سونپنا ہے اس واسطے اس کے کہنے کے مطابق ہم بدن میں تصرف کرتے ہیں، بدن بیمار ہو تو علاج کرتے ہیں۔ پھوڑا پھنسی ہو تو مرہم لگاتے ہیں اندر کا زخم ہو تو آپریشن کراتے ہیں، دوائیں پیتے ہیں تا کہ صحت ہو جائے اسی طرح روح کے اندر بھی پھوڑے اور پھنسیاں نکلتی ہیں۔ بیماریاں بھی آتی

ہیں۔ اخلاق کی بیماریاں ہیں اگر بداخلاقی پیدا ہوگئی۔ حرص، حسد، بغض، تکبر اور غرور پیدا ہوگیا دوسرے کو ایذاء پہنچانے کا جذبہ پیدا ہوگیا یہ روح کی بیماریاں ہیں۔

جیسے بدن کی بیماریوں میں علاج کے لئے آپ ڈاکٹروں اور اطباء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ روح کی بیماریوں کے لئے روحانی ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ اس کی تدبیر جانتے ہیں، مادی ڈاکٹر نہیں جانتے۔ وہی بتاسکیں گے کہ تکبر کو کیسے دور کریں، لالچ کو کیسے چھوڑیں، حسد کو کیسے دور کریں۔ اس کے علاج اور تدبیر کے لئے کتابیں ہیں علوم وفنون ہیں۔ جو قرآن وحدیث میں سب بیان کردیئے گئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہم نہ اپنے بدن کے مالک نہ روح کے مالک اور جب ہم اپنے بدن اور روح کے مالک نہیں ہیں۔ تو ظاہر بات ہے کہ ہم آسمان اور زمین کے مالک کیسے ہوئے؟

روح اور بدن کو اپنے خالق کی بندگی کے سوا چارہ نہیں ہے...... اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اگر آپ بدن وروح کے مالک ہوتے تو جان آپ کے قبضے میں ہوتی۔ کوئی بھی نہ مرا کرتا، کسی کا انتقال نہ ہوا کرتا، کوئی مارتا تو فوراً کہتے کہ میں مالک ہوں۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ میری جان نکال سکے تو ملک الموت سے بڑی لڑائیاں ہوا کرتیں کہ صاحب! آپ کو کیا حق حاصل ہے۔ کہ آپ جان نکالنے آگئے جان تو میری ہے۔ مگر جب جان نکلنے کا وقت آتا ہے تو ایک منٹ کے لئے نہیں روک سکتے۔ پیدا بھی ہونا ہی پڑتا ہے، مرنا بھی پڑتا ہے، نہ جینا اپنے قبضے میں نہ مرنا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ نہ ہم جان کے مالک ہیں نہ بدن کے مالک اگر بدن پر ہمارا تسلط ہوتا، ہم کبھی بیمار نہ ہوتے۔ کون کہتا ہے کہ میرا بدن خراب ہو، یا میرا بدن کمزور پڑ جائے۔ لیکن جب بیماری آتی ہے، بیمار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جب کوئی آفت آتی ہے تو سہنی ہی پڑتی ہے۔

اس لئے جیسے بدن دوسرے کا ہے، اسی طرح اس پر عوارض آتے ہیں، وہ دوسرے کی طرف سے آتے ہیں۔ تو جب اسی طرح سے ہم بے بس ہیں کہ نہ آنا ہمارے قبضے میں، نہ جانا ہمارے قبضے میں۔ قضا لاتی ہے، آنا پڑتا ہے قضا لے جاتی ہے، جانا پڑتا ہے۔ جب ہم اپنے مالک نہیں تو اس زمین وآسمان کے مالک کیسے ہوئے؟ اسی طرح رات دن، اس کے بھی مالک نہیں۔ یہ ہمارے قبضے میں نہیں کہ رات کو لمبا اور دن کو چھوٹا کردیں۔ یہ اس کے قبضے میں ہے جو رات دن کو پیدا کررہا ہے۔ جب ہر صورت میں خالق ومالک وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہوگا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بدن کو پیدا تو وہ کرے۔ عبادت ہم دوسرے کی کریں، حکم دوسرے کا مانیں، گردن دوسرے کے سامنے جھکائیں۔ اسی کے آگے گردن جھکے گی، جس نے گردن کو بنایا ہے، اسی کے آگے ہماری روح اور بدن جھکے گا، جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جب مالک وخالق وہ ہے۔ ہم اس کے غلام ہیں، تو غلام کا کام یہ ہے کہ بے چون وچرا مالک کے حکم پر گردن طاعت سے جھکادے۔ سرکشی کرے گا تو غلامی سے نکل جائے گا۔ اسی لئے قرآن

کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اورانسانوں کومحض اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری بندگی کریں''۔اس لئے کہ جب ہم پیدا کرنے والے ہیں، ہم مالک ہیں،تو کون ہے جو ہماری بندگی نہ کرے ہمارے سامنے نہ جھکے۔

بندے کا کام ارادہ سے ہمہ قسم عبادت ہے...... آپ ارادہ کریں نہ کریں، جھکنا تو پڑتا ہے موت آئے گی تو آپ جھکیں گے؟ یا یہ کہیں گے کہ ہم نہیں موت کو قبول کرتے ، مجبور ہونا پڑے گا۔صحت و بیماری آئے گی۔مجبور ہو کے اسے قبول کرنا پڑے گا مالک کے آگے جھکنا ہی پڑے گا۔محتاج کا کام یہ ہے کہ غنی کے آگے جھکے۔اگر آپ غنی ہیں، جھکنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر غنی نہیں محتاج ہیں،تو پھر محتاج ہوئے تو جھکنا ہی پڑے گا۔تو بجائے اس کے کہ آدمی مجبوراً جھکے، رضامندی سے کیوں نہ جھکے۔مجبوراً تو آسمان، زمین اور پہاڑ بھی جھک رہے ہیں۔یہ ان پر قہر ہے۔لیکن انسان کوعقل وارادہ اور اختیار دیا گیا۔تو اور چیزیں بلا ارادہ جھکتی ہیں۔انسان کا کام یہ ہے کہ ارادہ سے جھکے،عقل سے سوچ کر جھکے، اپنے اختیار سے جھکے۔اسی کا نام عبادت ہے تو بندے کا کام بندگی کرنا ہے اور بندگی کا معنی غایت تذلل کے ہیں۔پوری طرح اپنے مالک کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا، یہ عبادت ہے۔یہ کیوں اختیار کرے۔؟اس لئے اللہ کی اتنی عزت ہے کہ عزت کا کوئی درجہ ایسا نہیں ہے، جو اس کے ہاں نہ ہو۔تو بندہ اس کے سامنے انتہائی ذلت ایسے پیش کرے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔انسان کے اندر سب سے بڑی چیز عزت کی اس کی ناک اور پیشانی ہے۔نماز میں زمین پر اس کو ٹیکا جاتا ہے کہ اے اللہ! میں اپنی سب سے زیادہ عزت کی چیز کو تیرے آگے پامال کرتا ہوں۔کیونکہ تیری عزت سب سے بلند ہے۔غرض بندے کا کام بندگی کرنا ہے۔جان سے بھی، مال سے بھی اور آبرو سے بھی۔اس لئے کہ عزت کی ضرورت پڑے تو وہ وہاں سے آئے گی۔ مال و جان کی ضرورت پڑے، وہ وہاں سے آئے گا۔اس لئے کہ بندہ نہ اپنی جان کا مالک نہ اپنی آبرو اور مال کا مالک۔تو بندگی کا حاصل یہ نکلا کہ مال، جان، آبرو، سامان سب سے عبادت کرے۔

اس لئے اللہ نے عبادتوں کی قسمیں رکھ دی ہیں۔ایک جانی عبادت ہے، وہ جان سے ادا کی جاتی ہے۔جیسے آپ نماز پڑھتے ہیں بدن کو، روح کو جھکاتے ہیں اور حج کرتے ہیں اس کے لئے سفر کرتے ہیں۔ایک مالی عبادت ہے۔جیسے صدقہ اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور غرباء کی خدمت کرتے ہیں۔تو تینوں قسموں کی عبادتیں فرض کردی گئیں۔ بندے کا کام یہ کہ جان، مال آبرو سے بھی جھکے۔جان سے نماز میں اور آبرو سے حج میں جھکتا ہے۔

آبرو سے عبادت...... اس لئے کہ جتنے وقار اور ظاہری عزّت کے سامان ہیں، سب کو ختم کرنا پڑتا ہے۔اپنے وطن میں آدمی آبرو اور وقار جتلاتا ہے۔تو ملک چھڑوادیا، تو جو وقار گھر کا تھا وہ ختم ہوگیا۔اب مسافر بن کے چلا جارہا ہے۔پھر لباس آبرو اور وقار پیدا کرتا ہے. نیا لباس پہنا ہے، اکڑ کے چلتا ہے۔تو حکم دیا گیا کہ لباس اتارو، کفنی

① پارہ:۲۷،سورۃ الذاریات،الآیۃ:۵۶.

پہنو، اور ننگے سر رہو۔ پھر آدمی بدن کی زینت سے اور چہرے کے بنانے سنوارنے سے وقار حاصل کرتا ہے۔ یہاں حکم یہ ہے کہ جب احرام باندھ لیا، بال، ناخن کتروانے کی اجازت نہیں، بدن میں جوئیں پڑ جائیں تو مارنے کی بھی اجازت نہیں، شکار کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ بندہ عاشق بن کر جاتا ہے، عاشق کا زینت سے کیا کام؟ عاشق اگر اپنی زینت اور آرائش کرے گا تو محبوب کی طرف کیسے متوجہ ہوگا؟ وہ پکا عاشق نہیں اس لئے یہ سب کچھ چھڑوایا گیا محبوب کے گھر آیا تو پروانوں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے، طواف کر رہا ہے۔ محبوب نے کہا کہ منیٰ جا، وہاں چلا گیا کہ سر منڈا، سر منڈا دیا۔ پھر کبھی آدمی چال سے وقار حاصل کرتا ہے کہ بن بن کر چلتا ہے۔ تو سارا وقار نکال دیا گیا۔ جب بیت اللہ کا طواف ہوتا ہے۔ تو جس طواف کے بعد سعی کرنی ہوتی ہے، اس میں رَمل بھی ضروری ہوتی ہے۔ کہ چار پھیروں میں اکڑ کے چلے۔ اب کوئی عالم ہو، لمبی داڑھی ہو، وہ جھک کر چلتا، مگر اب اکڑ کے چل رہا ہے جیسے پہلوان جا رہے ہوں۔ پھر رمل کا حکم دیا گیا جب تم رمل کرو اور پہلوانوں کی طرح چلو تو اِحرام کی چادر کو دائیں مونڈھے کے نیچے رکھ کے بائیں مونڈھے پر ڈال لو، تو سارا بدن کُھل گیا۔ جو لوگ اپنا بدن کھولنا وقار کے خلاف سمجھتے ہیں، وہ وقار بھی ختم ہو گیا اسی طرح صفا و مروہ میں دوڑنے سے وقار ختم ہوتا ہے۔

غرض وقار کی جتنی چیزیں تھیں۔ وہ سب ممنوع قرار دے دیں۔ تو حج میں آبرو ختم کر کے اسے مٹا کر عبادت کرائی جاتی ہے۔ نماز کا قصہ برعکس ہے کہ گھر سے نکلو تو دوڑ کے مت چلو فرمایا گیا: ''لَاتَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ وَاْتُوْهَا وَاَنْتُمْ تَمْشُوْنَ.'' ① ''مسجد میں آؤ تو وقار کے ساتھ چلو۔ ایسے دوڑ کے مت چلو جیسے بچے دوڑا کرتے ہیں''۔ وہاں یہ حکم تھا کہ لباس اتار کر کفنی پہنو۔ یہاں یہ فرمایا کہ پورا لباس پہن کر ننگے سر بھی نہیں، پورے وقار کے ساتھ نکلو۔ حج میں فرمایا کہ: خبردار! اگر تم نے خوشبو لگائی۔ نماز کے بارے میں فرمایا، خود بھی خوشبو لگاؤ اور مسجد کو بھی معطر کرو۔ تو بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ نماز میں جان سے اور حج میں آبرو سے عبادت کرائی جاتی ہے۔

عبادتِ مالی ...... اب مال رہ گیا تھا تو زکوٰۃ و صدقات کی عبادت رکھ دی کہ اس میں سے غرباء کا حق نکالو۔ پہلی امتوں کو حکم یہ تھا کہ اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد جو بچے وہ صدقہ کر دو ایک پائی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر تم نے رکھا تو تمہاری روحانیت نہیں بنے گی۔ اخلاق درست نہیں ہوں گے۔ بس کھا لیا، پی لیا اور پہن لیا۔ باقی جو زائد ہے، صدقہ کر دیا اور اگر کوئی صدقہ لینے والا نہ ملے، تو حکم یہ تھا کہ اس مال کو آگ لگا دو ''تَاْكُلُهُ النَّارُ.'' آگ اس کو کھا لیتی تھی۔ یہ علامت تھی کہ صدقہ قبول ہو گیا، لیکن یہ امت ضعیف ہے۔ اس واسطے رعایت کی گئی کہ کھاؤ بھی، پیو بھی۔ اگر بچ رہے تو یہ نہیں ہے کہ سب دے ڈالو۔ اس میں کچھ حقوق مقرر کر دیئے کہ اس طرح سے اپنے مال کو خرچ کرو اور اس میں فرائض مقرر کئے۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوة، باب السعی الی الصلوة، ج: ۲، ص: ۱۸۴، رقم: ۴۸۵. حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۲ ص: ۷۲ رقم: ۵۷۲.

جس مال کے حاصل کرنے میں آدمی کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔اس میں اللہ نے اپنا حق کم کر دیا، تاکہ دینے میں آسانی ہو۔جو مال کم محنت سے حاصل ہوتا ہے، اس میں اپنا حق بڑھا دیا کیونکہ دینے میں سہولت رہے۔جس مال میں بالکل محنت نہ پڑے تو حصہ اور بھی بڑھا دیا۔جسے حاصل کرنے میں آسانی تھی، تو دینے میں بھی آسانی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا: اگر کسی کو دفینہ یا خزانہ مل جائے۔مثلاً لاکھ دو لاکھ کا زمین سے مل جائے۔تو یہ بلا محنت کے ملا کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑی اتفاق سے جنگل میں گئے زمین کو کھودنے لگے تو ایک بڑی بھاری دیگ نکل آئی یہ بلا محنت ملا۔اس میں حق تعالیٰ نے پانچواں حصہ رکھا ہے۔اگر سو روپے ہیں تو پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرے گا۔یعنی بیس روپے غرباء کا حق ہے اور اسی روپے تمہارا حق ہے۔اس لئے کہ سو میں سے بیس دینا مشکل نہیں ہوگا۔جبکہ اسی بھی بغیر محنت و مشقت کے مل رہے ہیں۔چونکہ اس میں محنت کم تھی تو اللہ نے اپنا حق بڑھا دیا۔

اگر کھیتی باڑی کی، تو کھیتی میں محنت کرنی پڑتی ہے۔اس میں اپنا حق گھٹا دیا۔دفینے میں پانچواں حصہ تھا۔یہاں فرمایا گیا کہ دسواں حصہ دینا پڑے گا۔یعنی سو روپے میں سے دس روپے دینے پڑیں گے۔یہ بیت المال کا حق ہوگا جو غریبوں پر خرچ ہوگا۔نوے روپے تمہارے اپنے ہیں تو کھیتی میں اللہ تعالیٰ نے اپنا حق گھٹا دیا۔

اور اگر آدمی تجارت کرنے لگے تو تجارت میں زیادہ محنت ہوتی ہے تاجر کا دماغ صبح سے شام تک لگا رہتا کہ مال بھی باقی رکھوں، سامان میں بھی کمی نہ ہو۔ایسا نہ ہو کہ گاہک آئے اور میری دوکان میں چیز نہ ہو تو صبح سے شام تک دماغ لڑاتا ہے گویا محنت زیادہ کرتا ہے۔یہاں سے مال منگواؤ، وہاں سے مال منگواؤ، کہیں بکنگ کا قصہ ہے، کہیں لاٹری کا سسٹم ہے۔غرض دنیا بھر کے جھگڑے ہیں اور اس میں پھر ہر ایک کو خوش رکھنا، گاہک سے بھی معاملہ نرمی سے کرنا، اگر گاہک نے کوئی بے تمیزی کی، پھر بھی تاجر کا فرض ہے کہ اخلاق سے پیش آئے۔بد اخلاقی برتے گا تو گاہک دوکان چھوڑ کے چلا جائے گا۔

غرض یہاں بھرپور محنت کرنی پڑتی ہے۔اللہ نے اپنا حق اور کم کر دیا کہ تم بجائے خمس وعشر کے چالیسواں حصہ دے دو۔سو میں سے اڑھائی روپے دے دو۔تو سو روپے میں سے اڑھائی روپے دینے کوئی مشکل نہیں ہوتے۔اور اس میں یہ آسانی کر دی کہ جس دن سو ہوئے، زکوٰۃ تو واجب ہوگئی، لیکن ادا کرنا واجب نہیں جب تک کہ ایک برس نہ گذرے ایک برس میں اگر اور کمائے گا، تو سو سے زیادہ ہو جائیں گے۔پھر اڑھائی روپے دینا کچھ مشکل نہیں ہوں گے۔تو اللہ نے یہ عجیب اصول رکھا کہ جس میں بندے کی محنت بڑھتی ہے۔اتنا اپنا حق گھٹا دیتے ہیں، جتنا بندہ بے محنت کمائے، اپنا حق بڑھا دیتے ہیں تاکہ دینے کے اندر اسے عار نہ پیدا ہو، مشکل نہ پیش آئے۔

تو زکوٰۃ میں غریبوں کا حق رکھ دیا گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کمانے میں آپ اپنے کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کو بھی۔غریب بھی اسی طرح آپ کی اولاد ہے۔اگر یہ آپ کی نسبی اولاد ہے تو حیثیت کے لحاظ سے وہ آپ کی معنوی اولاد ہے۔ان کو اگر نہ دیا، آپ کے لئے پھر دوسری مشکلات پیدا ہوں گی۔جب غریبوں کو حقوق

نہیں پہنچیں گے۔ پھر سرمایہ اور مزدور کا سوال پیدا ہوگا۔ وہ سارے کھڑے ہو جائیں گے کہ ان سرمایہ داروں کو نکالو یہاں سے اس میں زیادہ مصیبت پڑے گی۔

میں تو کہاں کرتا ہوں کہ اللہ میاں نے سو روپے میں اڑھائی روپے رکھے تھے۔ جب اس کے دینے میں پس وپیش کیا اور نہ دیا۔ تو اتنے بڑے بڑے ٹیکس لگوائے کہ اسی فیصد گورنمنٹ کا اور بیس فیصدی تمہارا۔ اگر اڑھائی روپے دیتے رہتے، تو ساڑھے ستانوے روپے تمہارے ہوتے لیکن اب سو کماؤ گے تو اسی حکومت لے گی، بیس تمہارے ہاتھ میں رہ جائیں گے۔ یہ کفرانِ نعمت کا نتیجہ ہے۔ اگر خدا کا حق پورا دیتے رہتے اور اس کے اصول پر قائم رہتے۔ دوسرا غلبہ نہیں پا سکتا تھا۔

بہرحال شریعت نے یہ ایک اصول رکھا کہ جتنی محنت اور مشقت زیادہ ہے اللہ میاں اپنا حق گھٹا دیتے ہیں اور جب بندے کی محنت کم ہو، اپنا حق بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً بکریاں ہیں، اگر تجارت کی ہوں تو چالیس بکریوں پر ایک بکری دینی پڑتی ہے اور گائے بیل ہوں، تو بیس گائے پر ایک گائے کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ بدن بڑھ گیا۔ تو اس کی تعداد گھٹا دی اور اگر اونٹ ہیں، پانچ اونٹ ہوں گے تو ایک اونٹ کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ اونٹ گائے سے دوگنا تین گنا ہے۔ بدن بڑھ گیا، تو عدد کم کر دیا۔ تو عجیب حکمت سے ایک نظام قائم کیا ہے۔

عبادتِ مالی سے مقصود امیر وغریب میں توازن قائم کرنا ہے...... اور مقصد یہ کہ امیر اور غریب کے اندر قرب پیدا ہو۔ یہ نہ ہو کہ امیر آسمان کے اوپر ہو اور غریب زمین کے اوپر ہو۔ کچھ وہ نیچے اترے، کچھ غریب کو اوپر چڑھا دیا تا کہ توازن پیدا ہو جائے۔ یہ تو شریعت نے پسند نہیں کیا ایسی کہ مساوات کرو کہ بالکل ایک ہی جیسی روٹی لباس اور ایک ہی سب کی آمدنی ہو اور جبر کر کے امیر سے ساری آمدنی لے لی جائے تا کہ غریب میں بانٹ دی جائے۔ اس لئے کہ اس میں امیر اور غریب کو مضرت پہنچے گی۔

اوّل تو یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ایک آدمی میں اتنی عقل اور ہوشیاری ہے کہ وہ سو روپیہ لے جاتا ہے۔ تو ہزار روپے کما کے لاتا ہے۔ اور ایک اتنا احمق ہے کہ ہزار روپے لے جاتا ہے وہ بھی کھو کے آتا ہے۔ یہ دونوں کیسے برابر ہو جائیں گے؟ تو جو محنت کرے گا، اس کا حق زیادہ ہوگا۔ جو نہیں کرے گا، اس کا حق کم ہوگا۔ شریعت یہ نہیں کہتی کہ دونوں برابر ہو گئے۔ بلکہ صراحۃً فرمایا: ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''ہم نے اپنے بندوں پر معاش تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے سے بڑھایا ہے۔ کوئی اونچا، کوئی نیچا، کوئی امیر، کوئی غریب تا کہ ایک دوسرے کے کام آنے والا ہو اور تمدّن پیدا ہو''۔ اگر سارے ایک جیسے ہوتے تو آپ صدقہ کسے دیتے۔ جسے دیتے وہ کہتا، میرے گھر میں بہت سا پڑا ہوا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ تو تعاون اور ایک دوسرے

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۳۲۔

کی خدمت گذاری ختم ہو جاتی۔ اور اگر سارے کے سارے ہی بھک منگے ہوتے تو نہ آپ اسے دیتے، نہ وہ آپ کو دیتا۔ وہ آپ سے بے تعلق، آپ اس سے بے تعلق۔ بالکل سارے مفلس ہوں جب بھی تعاون اور تمدن نہیں پیدا ہوتا اور سارے امیر بن جائیں، جب بھی پیدا نہیں ہوتا۔ تمدّن جبھی پیدا ہوگا جب کچھ امیر ہوں، کچھ غریب، امیر کی حاجت غریب اور غریب کی حاجت امیر سے اَٹکی ہوئی ہو۔ اس واسطے حکمتِ باہمی اور تعاوُن باہمی کے لئے اللہ نے فرق پیدا کیا۔ تو فرق کو مٹا دینا یہ فطرت کے خلاف ہے۔

اس لئے اگر مال کا فرق مٹانا ہے تو پھر عقلوں کا فرق بھی مٹانا چاہئے۔ ایک بڑا ہوشیار ہے، اسے تو بے وقوف بنانے کی کوشش کریں اور جو بیوقوف ہے اسے عقلمند بنانے کی کوشش کریں۔ یہ آپ کے قبضے میں نہیں۔ فہموں میں اختلاف ہے، رنگوں میں اختلاف ہے۔ کوئی کالا، کوئی گورا۔ زبانوں میں اختلاف ہے۔ کسی کی عربی، کسی کی انگریزی، تو زبانوں، صورتوں، سیرتوں کا اخلاق کا اور عقل کا اختلاف ہے، تو جب مختلف عقل سے کمائیں گے، اس میں بھی اختلاف ہوگا۔ کوئی زیادہ کمائے گا، کوئی کم کمائے، اب اگر آپ جبر کر کے ایک امیر سے کہیں کہ ساری کمائی دے۔ اگر تیرے پاس پانچ ہیں تو یہ سب کو بانٹ دے تا کہ سب برابر ہو جائیں۔ اس کا نقصان یہ پہنچے گا کہ امیر کے دل میں مزدور سے بعد پیدا ہوگا کہ محنت تو میری اور جبراً سب کچھ اس نے لے لیا۔ میں اور یہ برابر ہو گئے فرق کیا رہا۔ میں رات دن محنت کروں اور اسے بے محنت دے دوں اس کا جی نہ چاہے گا فطرت کے خلاف ہے اور غریب یہ سمجھے گا، جب بے محنت مجھے بھی حصہ مل رہا ہے تو مجھے محنت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ معطل ہو جائے گا غرض اگر آپ نے جبری طور پر معاش کے اندر مساوات اور برابری قائم کی تو نہ امیر باقی رہے گا نہ غریب نہ دونوں ایک دوسرے کے کام آسکیں گے۔ اس واسطے مساوات فطرت کے خلاف ہے۔ ہاں توازن ہے، یعنی ایک دوسرے سے بالکل بعید نہ ہوں کہ ایک آسمان پر اور دوسرا زمین پر۔ حق رکھ دیئے کہ کچھ وہ نیچے اترے، کچھ یہ اوپر ہو جائے تا کہ محبتیں پیدا ہوں۔

مثلاً رمضان شریف آیا اور فرض کیجئے آپ ایک لاکھ کے مالک ہیں۔ اور چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا واجب ہوا۔ ایک لاکھ کا چالیسواں حصہ اڑھائی ہزار ہوگا۔ تو اڑھائی ہزار غریبوں کے لئے ہوگا۔ غریب نے کیا سمجھا کہ میں غریب ہوں ہی میرے سر پر ایسے امیر موجود ہیں۔ جو میری خدمت کرتے ہیں۔ میں غریب نہیں ہوں، میں بھی دولت مند ہوں۔ تو وہ شکر گزار ہوگا کہ یہ اولاد کی طرح مجھے پال رہے ہیں۔ اس کے دل میں محبت بڑھے گی۔ رمضان شریف میں آپ نے دس ہزار روپیہ بانٹا اور فرض کیجئے کہ دس بیس آدمی ہیں، انہوں نے بھی اتنی ہی مقدار میں تقسیم کیا۔ اب یہ لاکھ دو لاکھ غریب کے پاس جو پہنچے گا۔ تو اس کے دل میں ممنونیت پیدا ہوگی کہ انہوں نے میری خبر گیری کی۔ یہ درحقیقت جتنے امراء ہیں، میرے ماں باپ کی جگہ ہیں، میں ان کی اولاد کی جگہ ہوں، مجھے ان کا حق پہچاننا ہے۔

امیر نے یہ سوچا کہ میرے سے خدا نے کام لیا، میرے سے ان کی خدمت کرائی۔ میری دنیا بھی بنی آخرت

بھی بنی۔ وہ غریب کا ممنون ہوگا کہ اگر یہ غریب نہ ہوتا تو میں صدقہ وزکوٰۃ کسے دیتا۔ خدا نے میرے سے ادا کرا دیا، میری دنیا وآخرت بن گئی۔ غریب اپنی جگہ خوش، امیر اپنی جگہ خوش اور دونوں میں محبت پیدا ہوگئی۔

لیکن اگر غریب آدمی کہے، جو کچھ امیر کے پاس ہے سب پر قبضہ کرلوں۔ تو امیر کے دل میں یہ ہوگا کہ اگر میں نے نہ بھی دیا یہ کم بخت اسے اٹھالے جائے گا اور غریب کے دل میں کیا آئے گا۔ وہ کہے گا، امیر کے ذمہ ہے ہمیں دینا۔ ہمیں کوئی شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امیر کہے گا اگر میرا بس چل جائے تو میں سارے غریبوں کی گردن ماردوں۔ کمائی میری ہے، مزے یہ اُٹھارہے ہیں اور غریب اس فکر میں رہے گا کہ جتنے امیر ہیں سب تباہ ہوں۔ میرے پاس حکومت آئے، میں آج ہی سب کو ختم کردوں۔ جو برسرِ اقتدار آئے گا، وہ دوسرے کو ختم کرنے کی فکر میں رہے گا۔ یہ تو اسلام نے ایک توازن قائم کیا کہ غریب امیر کا محبّ اور عاشق بن جائے گا۔ امیر غریب پر شفیق اور مہربان بن جائے گا۔ تو تعاون، تمدن بھی بنا، محبتیں بھی بڑھیں لیکن جبری تقسیم اور مساوات وبرابری سے غیض وغضب پیدا ہوتا ہے۔ اس واسطے اسلام نے پہلی چیز تو یہ رکھی کہ محبتِ باہمی اور خلوص سے امیر غریب کو دے۔ ایک حصہ پر جبر کیا گیا کہ چالیسواں حصہ بھائی کو ضرور دو۔ ورنہ وہ بھائی ہی نہیں۔ اگر آخرت پیش نظر ہو تو خوش ہوگا کہ میری آخرت بن گئی۔ تو رمضان میں تو آپ نے یہ دیا۔

اب رمضان گزرا تو عیدُ الفطر آئی، تو اسلام نے صدقہ فطر واجب کردیا۔ ہر بچے کی طرف سے خواہ وہ عید سے پہلے ہی پیدا ہو، اس کی طرف سے بھی دینا پڑے گا۔ اب اگر ایک گھر میں بارہ آدمی ہیں تو بارہ روپے مثلاً نکلے اور سو آدمی ہیں تو سو روپے گھر سے نکلے۔ تو غریب کہے گا کہ رمضان میں انہوں نے مجھے نوازا تھا۔ عید آئی اب بھی انہوں نے مجھے نواز دیا۔ ان سے بہتر میرا اور کوئی خیر خواہ نہیں، اب محبت اور بڑھ گئی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غریب پروری...... جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ یہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے اور یہ نہیں کہ ایک آدھ دکان تھی کہ کپڑا بکوادیا۔ جگہ جگہ کپڑے بننے اور سپلائی کرنے کے کارخانے تھے اور اتنی بڑی دولت تھی کہ جب امام ابوحنیفہ کی وفات ہوئی ہے تو کچھ امانتیں بھی تھیں۔ مگر چھپن کروڑ روپیہ خزانے کے اندر موجود تھا۔ جو انہوں نے چھوڑا۔ مگر ان چھپّن کروڑ سے کیا ہوتا تھا؟ یہ سب غریبوں خرچ ہوتا تھا۔

ان کی تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ کوفے میں جتنے غریب، بیوائیں اور یتیم تھے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سب کی فہرستیں بنی ہوئی تھی اور ان کے قد وقامت بنے ہوئے تھے۔ کہ فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں جوان ہے، فلاں بچہ ہے۔ غریبوں کے ہر گھر کیلئے رمضان شریف میں کپڑے تیار ہوتے تھے۔ بڑے آدمی کے بڑے کپڑے، چھوٹے کے چھوٹے کپڑے عورتوں کے لئے ان کے مناسب اور جہاں عید کا دن آیا صبح صبح سب غریبوں کے گھر کپڑے پہنچ جاتے تھے۔ تو غریب کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ جیسی عید امیروں کی، ویسی عید ہمارے بچوں کی بھی ہے۔ بہتر سے بہتر کپڑا ملا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس قائم کی۔ بڑے بڑے علماء و آئمہ اس میں جمع تھے۔ وہ فقہ کے ہر ہر مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ جس کو آپ آج فقہ حنفی کہتے ہیں۔ یہ بہت سے اماموں کے دماغ کا نچوڑ ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، بڑے بڑے آئمہ علم و فضل ان کی ایک کمیٹی بیٹھتی۔ ایک ایک مسئلے پر ایک ایک ہفتہ بحث ہوتی تھی۔ جب چھن چھنا کر بحث کرنے کے بعد ایک چیز صحیح طور پر واضح ہوتی تھی تب وہ لکھی جاتی۔ تو بیس جلدوں میں فقہ حنفی مرتب ہوا۔

یہ جو پچاس کی کمیٹی تھی، ان سب کو تنخواہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے خزانے سے دیتے تھے۔ کسی کو پانچ سو ماہوار، کسی کو ہزار۔ یہ لاکھ روپے کا خرچ تھا جس سے ان حضرات کی خدمت ہوتی تھی۔ غریبوں کے لئے الگ ہر عید میں سلے سلائے کپڑے موجود ہوتے تھے۔

پھر اس کے ساتھ یہ صورت بھی ہوتی تھی کہ ہزاروں آدمی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے لاکھوں روپے قرض لے جاتے تھے۔ ہزاروں کا کام قرض سے چلتا تھا اور اس میں بھی یہ سخاوت کا جذبہ تھا کہ مورخین لکھتے ہیں کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیس ہزار روپے قرض لیا اور مدت متعین کر دی کہ برس دن میں ادا کر دوں گا۔ مدت گزر گئی، اس کے پاس دینے کو نہ ہوا یا بخل کیا نہیں دیا۔ جب وقت گذر گیا اور نہیں ادا کیا۔ وہ اب امام صاحبؒ سے کترانے لگا کہ سامنے آؤں گا، تو شرمندگی پیدا ہوگی۔ جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آ رہے ہیں، اس گلی میں گھس گیا، اس کوچے میں چلا گیا تا کہ سامنا نہ ہو۔ ورنہ مجھے جھوٹا کریں گے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خیال پیدا ہوا تو ایک دن آپ جا رہے تھے، ادھر سے وہ آ رہا تھا۔ وہ دیکھ کر ایک گلی میں گھسا، دوڑ کر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس گلی میں گھسے اور جا کر پیچھے سے اس کا دامن پکڑا اور کہا کہ بھائی تو نے تعلقات کیوں خراب کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو تم نے بیس ہزار لئے تھے وہ دینے کو نہیں تھے، اس لئے شرمندہ نہ ہو۔ میں نے تمہیں معاف کیا، تعلق بڑی چیز ہے روپیہ بڑی چیز نہیں ہے۔ تم ایک پائی دینے کی تکلیف مت گوارا کرو۔ تعلق کو کیوں ختم کیا''۔ ہزاروں کے اس طرح قرضے معاف کر دیئے۔ دیکھا کہ یہ نہیں دے سکتا بس اسے معاف کر دیا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تجارت میں تقویٰ...... پھر اس میں تقویٰ کا یہ حال تھا کہ۔ آخر مسلمانوں کے امام ہیں انہوں نے کپڑا بنوا کر سپلائی کیا، کئی لاکھ روپے کا کپڑا اور ایک تاجر کو فروخت کرنے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس وقت کپڑے کے دام ذرا سستے ہیں اور دو مہینے کے بعد دام چڑھ جائیں گے، کپڑا روک لیا تا کہ ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول ہوں چنانچہ یہی ہوا۔ جب یہ میعاد گزر گئی۔ اب لوگوں کی ضرورت بڑھی تو انہوں نے دام بڑھا دیئے تو ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول کئے اور جا کر بڑی خوشی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رکھے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حساب سے تو ایک لاکھ ہونا چاہئے۔ یہ دو لاکھ کیسے ہوگئے؟ اس نے کہا

کہ میں نے دو مہینے کے لئے کپڑا روک لیا تھا کہ جب ضرورت بڑھ جائے گی، تب فروخت کروں گا۔ فرمایا، معاذ اللہ اسی کا نام اِحتکار ہے کہ لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ کہہ کر خفا ہوئے اور فرمایا یہ دو لاکھ غریبوں کے اوپر صدقہ کرو۔ یہ مال میرے کام کا نہیں ہے۔ اس میں تم نے غریبوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ جب ضرورت کا وقت تھا، تمہیں مقررہ قیمت پر بیچنا چاہئے تھا۔ تو کمانے میں یہ تقویٰ تھا اور خرچ کرنے میں یہ سخاوت تھی۔

تو ایسے سخی کے سامنے غرباء کا دل کیسے ٹوٹ سکتا تھا۔ ہر غریب کہتا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ میں غریب نہیں رہا۔ نہ میری بیوی، بچے اور گھر غریب ہے، کھانے پینے کو آ رہا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یوں شکر گزار کہ اللہ نے مجھے توفیق دی، میں نے غریبوں کی خدمت کی مجھے اَجر ملا، آخرت بنی اور غریب یوں خوش کہ ہماری سرپرستی ہوئی۔ اس لئے وہ غریب اتنے عاشق تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پسینے پر خون بہانے کے لئے تیار تھے۔ بہرحال اسلام نے خرچ رکھا اور تقسیم رکھی، مگر خوش دلی کے ساتھ، جبری طور پر نہیں رکھی گئی۔ جہاں جبر کیا، وہاں ایسی صورتیں رکھی ہیں کہ خرچ کرنا ناگوار نہ ہو۔ سو پر اڑھائی روپے اور اڑھائی روپے بھی فوری نہیں، سال بھر کی مدت رکھی تاکہ دینے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس طرح سے اسلام نے خرچ کرایا۔

اسلام نے مالیات کی بنیاد تقسیم کے اصول پر رکھی ہے جمع کے اصول پر نہیں...... اسلام نے مالیات کی جو بنیاد رکھی ہے وہ تقسیم کے اصول پر رکھی ہے، جمع کے اصول پر نہیں رکھی۔ یعنی روپے کو رکھا ہے کہ چلتا رہے، گھومتا رہے۔ جمع ہو کر ایک جگہ نہ پڑا رہے۔ زکوٰۃ آئی تو ادا کی۔ پھر صدقہ فطر کا وقت آیا، پھر خرچ کروایا، تو رمضان میں دیا۔ عید الفطر پہ دیا اب بقر عید آئی۔ اس میں قربانی واجب ہوئی۔ قربانی میں مستحب یہ ہے کہ چوتھا حصہ غریبوں پر صدقہ کرو، اپنے رشتہ داروں کو دو، خود بھی کھاؤ اس موقع پر غریبوں کے گھر گوشت پہنچ گیا، سامان پہنچ گیا۔ اس سب کچھ کے بعد پھر فرمایا: ''اِنَّ فِیْ مَالِ الْمَرْءِ حَقٌّ سِوَی الزَّکٰوۃِ''، ''آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی کچھ حقوق ہیں۔ جو ضرورت کے وقت ادا کرے''۔

اس کو اسلام نے یوں سہل بنایا کہ اخلاقی حالت درست کی اور کہا کہ سخاوت افضل ہے اور بخل اللہ کے ہاں مبغوض ہے اس سے بغض وعداوت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلسَّخِیُّ حَبِیْبُ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰہِ وَالْبَخِیْلُ عَدُوُّ اللّٰہِ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰہِ'' ① ''سخی اللہ کا دوست ہے اور اس کے قریب ہے بخیل اللہ کا دشمن اور اس سے بعید ہے''۔

اس لئے کہ سخاوت اللہ کی صفت ہے، بخل اللہ کی صفت نہیں ہے دوست ہو دشمن، سب کو مل رہا ہے۔ سورج چمکاتے ہیں، دشمن بھی فائدہ اٹھاتے ہیں دوست بھی، مسلم بھی، کافر بھی، زمین پر غذا اگتی ہے، مومن بھی لیتا ہے کافر

① الحدیث اخرجه الامام الترمذی فی سننه بطریق ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم ولفظه: السخی قریب من الله قریب من الجنة، قریب من الناس، بعید من النار، والبخیل بعید من الله، بعید من الجنة، بعید من الناس، قریب من النار...... ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی السخاء، ج: ۵ ص: ۲۲۲ رقم: ۱۸۸۴.

بھی، دوست بھی حصہ پا رہا ہے دشمن بھی۔ دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہے بخل نہیں ہے۔

البتہ مومن کے لئے خصوصی رحمت ہے کہ اسے دولت کے ساتھ اسلام ایمان، علم اور آخرت کا عقیدہ بھی دیا۔ یہ خصوصی توجہ ہے۔ مگر دنیا کے اعتبار سے دوست، دشمن، مسلم و کافر سب برابر ہیں۔ تو جود وسخا اللہ کا خاص وصف ہے۔ اس کے خزانوں میں سے رات دن خرچ ہو رہا ہے۔ جو سخی ہوگا، اس نے گویا اللہ کی یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لی۔ بخل اللہ کی صفت نہیں ہے اگر کوئی بخیل ہوگا تو اللہ سے دور ہو گیا۔ اسے اللہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس لئے جہاں خرچ کا حکم دیا۔ وہاں سخاوت کی فضیلت بیان کی تا کہ دینے پر آمادہ ہو۔ طبیعت میں گھٹن پیدا نہ ہو۔

قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں جذبہ سخاوت......اور یہ اتنا بڑھایا کہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں دینا اتنا محبوب تھا کہ روکنا اتنا محبوب نہیں تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ گھر بار لٹا دیں۔ صحابہؓ میں حضرت عبدالرحمان ابن عوف رضی اللہ عنہ یہ بہت زبردست تاجر تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجارت میں برکت کی دعا کی تھی۔ تو یہ کیفیت تھی کہ روم، شام اور مصر جگہ جگہ ان کا مال جاتا تھا اور نفع جو آتا تھا تو وہ یہ نہیں تھا کہ دو چار آدمی لے کر چلے جائیں۔ نوٹوں کو گڈی ڈالی اور لے کے چلے آئے۔ بلکہ ایسا تھا کہ اونٹوں پر لد کر روپیہ، سونا، چاندی آتا تھا اور کثرت یہ تھی کہ جب گھر میں رکھنے کو جگہ نہیں رہتی تھی، تو عاجز آ کے کہتے تھے کہ گھر کے کونے میں ڈھیر لگا دو۔ تو روپیہ اور اشرفیوں کا چھت تک ڈھیر لگ جاتا تھا۔ یہ دولت کی کیفیت تھی۔ گویا کروڑ پتی لوگوں میں سے تھے مگر اس کے ساتھ معاملہ کیا تھا؟ فرماتے کہ اصحاب حدیبیہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور معاہدہ کیا تھا۔ ان کی تعداد کتنی ہوگی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ چودہ سو۔ تو ایک خاص برتن منگوایا جاتا۔ اس میں روپیہ اور اشرفیاں بھر بھر کر چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر گھر بھجوائی جاتیں کہ یہ میری طرف سے ہدیہ ہے۔ آپ اسے قبول کر لیں۔ پھر پوچھتے کہ اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کتنے ہیں۔ جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی معلوم ہوا تین سو تیرہ۔ پھر ان تین سو تیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس اشرفیاں بھجوائی جاتیں کہ یہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔ جن کے ہاں پہنچتیں، وہ کہتے کہ اتنا مال ہم کیا کریں گے؟ وہ بھی آگے غریبوں میں بانٹتے۔ تو روپیہ پیسہ ادھر سے چل رہا ہے، ادھر سے نکل رہا ہے۔ سب سے زیادہ دولت کی محبت عورتوں کو ہوتی ہے۔ ان میں بھی سخاوت کا جذبہ اتنا بھر گیا تھا کہ دینا انہیں عزیز بن گیا تھا، رکھنا عزیز نہیں تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں۔ ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما انہوں نے ایک بوری اشرفیوں کی بھر کر اپنی حکومت کے زمانے میں اپنی خالہ کے گھر پہنچائی۔ جب یہ بوری پہنچی، صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اتنا کیا کروں گی؟ خادمہ کو حکم دیا کہ اسے غریبوں میں تقسیم کر دو۔ اس نے تقسیم کرنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک تقسیم کی ساری بوری ختم ہو گئی۔ باندی نے کہا، ام المومنین! تین دن سے آپ کے اوپر فاقہ ہے۔ غذا میں کچھ میسر نہیں تھا۔ آپ نے بھی کچھ رکھ لیا ہوتا، فرمایا: ''جا بے وقوف!

پہلے سے کیوں نہ یاد دلایا دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی"۔ گویا یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اوپر فاقہ ہے اور گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اس درجہ غنا اور سیر چشمی پیدا ہوگئی تھی کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ کچھ ہے بھی یاد نہیں۔ عورتوں کے دلوں میں سخاوت کا اتنا جذبہ اور اتنی بے تعلقی، یہ اسی تعلیم اور فیض اور صحبت کا اثر تھا کہ جس میں آپؐ نے اخلاق سکھلائے سخاوت کی فضیلت اور بخل کی مذمت بیان کی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب شام کے اوپر قابض ہوئے اور پوری خلافت ان کے ہاتھ میں آ گئی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا۔ گو خلافت کا استحقاق میرا ہے۔ مگر میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتا ہوں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں سخاوت غیر معمولی ہے۔ تو ایک سادہ کاغذ لے کر اس پر دستخط کر کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا کہ جتنا چاہو لکھ دو۔ اتنا ہی آپ کو سالانہ اور ماہانہ دیا جائے گا۔ اس پر انہوں نے لکھ دیا کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ دیا جائے۔ وہ آتا اور تین دن میں ختم ہو جاتا۔ غربا، یتیموں اور فقیروں کو دینے میں ہی خوشی تھی جس پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ "لَاخَیْرَ فِی الاِسْرَافِ..... " "اسراف اور فضول خرچی میں خیر نہیں ہے۔ ڈھنگ سے دینا چاہئے۔ یہ نہیں کے ایک لاکھ آیا تو دو دن میں لٹا کے برابر کیا"۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھ بھیجا کہ "لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ..... " "اسراف خیر کے اندر ہوتا ہی نہیں"۔ ① جب اللہ کے لئے دیتے ہیں تو اس میں ایک لاکھ دو لاکھ سب برابر ہیں۔ اس میں کوئی اسراف نہیں۔ غرض یہ کیفیت تھی اور یہ فیض صحبت کا اور اس تعلیم کا اثر تھا تو دینے کے کا قانون بھی بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی قلوب میں دینے کے جذبات بھی پیدا کئے گئے۔

سخاوت مسلمانوں کا قومی مزاج ہے...... یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں قومی حیثیت سے سخاوت موجود ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی فرد یا شخص بخیل پیدا ہو جائے۔ لیکن قوم کا مزاج جمع کا نہیں ہے۔ خرچ کرنے کا ہے۔ غریب امیر سب کے اندر جذبہ موجود ہے کہ دینے کی عظمت دل کے اندر موجود ہے، جمع کرنے کی عظمت نہیں ہے۔ کوئی واقعہ پیش آ جائے، رکاوٹ پیدا ہو جائے، تو الگ بات ہے۔ لیکن قوم کا مزاج قومی حیثیت سے سخاوت کا ہے، بخل کا نہیں ہے۔ مہمان نوازی ہوگی، تو اپنے آپ کو بچھا دیں گے۔ دینا ہوگا تو دینے میں کمی نہیں کریں گے۔ یتیموں کی خبر گیری کریں گے۔ اور اقوام میں دیکھنے میں آتا ہے کہ قومی طور پر یہ مزاج نہیں ہے۔ افراد بڑے بڑے سخی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں غریب ہو وہ بھی سخی ہے۔ اس لئے کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج دیا ہے۔ امیر سخی ہے، غریب سخی ہے حتی کہ جو پیشہ ور لوگ تھے، ان میں سخاوت کا جذبہ ہے۔

معبد جُہَنی ایک بہت بڑا گویا تھا اور فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ منصور کے زمانے میں یہ گزرا ہے۔ اس کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ جا کے غزل سنائی۔ تو چالیس ہزار روپیہ اس کی ایک دفعہ کی فیس تھی اور امراء اس کو دیتے تھے۔ شاہی

① تفسیر روح المعانی، ج: ۱ ص: ۱۰۹۔

خزانے سے دس ہزار روپیہ روزانہ مقرر تھا، خواہ وہ سنانے کے لئے آئے یا نہ آئے۔ گویا اس کی روزانہ دس ہزار روپے تنخواہ تھی۔ اندازہ کیجئے مہینے میں کتنا پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے باروچی خانے کے لئے تین بکرے مقرر تھے۔ دو ذبح کئے ہوئے، ایک صحیح سالم زندہ۔ یہ تین بکرے روز پہنچتے تھے۔

اور کیوں پہنچتے تھے؟ تھا تو گویا مگر مہمان داری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو مہمان اس کے دستر خوان پر ہوتے تھے۔ امراء آئے تھے، کوئی گانا سیکھنے کے لئے کوئی اس کی مجلس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور وہ مہمانداری کرتا تھا۔ اس کا بیٹا کہتا ہے کہ میرے باپ نے اتنا کمایا کہ اگر ہم چاہتے تو سونے چاندی کی اینٹوں کے محل بنا لیتے۔ لیکن جب انتقال ہوا تو نوے لاکھ روپے قرضہ چھوڑا جو بیٹے کو ادا کرنا پڑا۔ اس لئے کہ مہمانداری پر اور غریبوں، یتیموں، ناداروں پر خرچ کرتا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں رکھتا تھا۔

تو اسلام میں گویوں اور پیشہ وروں کی یہ حالت تھی۔ یہ اس تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج بنا دیا تھا۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں ایک دفعہ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے چلے تو سفر مینا کی پلٹن بارہ میل آگے رہتی تھی جو جا کے بادشاہ کے خیمے نصب کرتی تھی اور وہاں دو تین دن قیام ہوتا تھا جب وہاں سے روانہ ہوتا او وہ سفر مینا کے لوگ آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور آگے جا کر خیمے وغیرہ لگاتے تو یہ جو پلٹن تھی جو خیمے وغیرہ لگاتی تھی اس کے انچارج آفیسر کا نام منعم تھا۔ ایک موقع پر جا کر اس نے خیمے نصب کئے، عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو چوتھے پانچویں دن وہاں پہنچنا تھا۔ سامان سب مرتب ہو گیا۔ ایک فقیر کو پتہ چلا کہ یہ بادشاہ کا کیمپ پڑا ہوا ہے، تو اس نے کسی سے معلوم کیا کہ انچارج آفیسر کا نام کیا ہے اسے پتہ چلا کہ اس کا نام منعم ہے تو اس نے آ کر بڑی خوش آوازی سے طرز سے ایک شعر پڑھا:

منعم بدست کوہ و بیاباں غریب نیست ہر گاہ کہ رفت خیمہ زد بارگاہ ساخت

منعم کسی جنگل میں بھی غریب نہیں، جہاں جاتا ہے، شہر بنا ہوا تیار ہے، خیمے، شامیانے تیار۔ منعم کو خدا نے ایسی دولت اور انعام دیا ہے کہ وہ پہاڑوں میں جائے جب بھی غریب نہیں، جنگل میں جائے جب بھی غریب نہیں۔ جہاں بھی جائے گا، خیمے لگ جائیں گے، بارگاہیں بن جائیں گی۔ اس نے اس خوشی آوازی سے جو پڑھا۔ اس کی آواز سارے کیمپ میں پھیل گئی۔ تو منعم کو بڑا پسند آیا۔ حکم دیا، اس فقیر کو حاضر کرو۔ تو تین لاکھ درہم اس کو دیئے۔ ایک غریب اور بھک منگے کو ایک دم تین لاکھ روپے مل گئے۔

اگلے دن صبح کے بعد اس نے آ کر پھر اسی خوشی آوازی سے شعر پڑھا۔ اسے نے پھر بلایا اور تین لاکھ روپے اور دے دیئے۔ تیسرے دن اس نے پھر شعر پڑھا۔ تو تین لاکھ اور دیے دیئے۔ تین دن میں نو لاکھ روپیہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ چوتھے دن نہ آیا۔ اب منعم انتظار میں بیٹھا ہوا ہے کہ وہ آئے تو میں دوں۔ مگر وہ نہ آیا۔ حکم دیا کہ اسے پکڑ کر لاؤ، آج کیوں نہیں آیا۔ سپاہی اور پیادے دوڑے اور اسے پکڑ کے لائے۔

منعم نے کہا کہ تو کیوں نہیں آیا؟ اور تو بڑا بے وقوف ہے مجھے تو یہاں دس دن ٹھہرنا ہے اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دس کے دس دن تجھے روزانہ تین لاکھ روپے دوں گا، بڑا احمق ہے۔ اس نے کہا، حضور بات یہ ہے کہ تین دن میں مجھے نو لاکھ روپے ملے ہیں یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ میری سات پشتوں کے لئے کافی ہے۔ میں نے یہ سمجھا یہ میرے لئے کافی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ حضور بادشاہ ہیں۔ جذبے میں آ کر دے دیا اور اگر کہیں یہ جذبہ آ گیا کہ چھین لو اس سے، تو پھر ایک پائی بھی میرے پاس نہیں بچے گی۔ اس لئے قناعت بھی نہ آنے کی باعث ہوئی، کہ میرے لئے کافی تھے اور خوف بھی باعث ہوا کہ کہیں چھین نہ لیں۔ اس واسطے نہیں آیا۔

اس نے کہا کہ یہ تیرا عمل تھا۔ مگر میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ دس دن میں روزانہ تجھے تین لاکھ دوں گا۔ تو ایک ایک افسر گویے' پیشہ ور، اور ایک ایک عورت کا اسلام نے یہ مزاج بنا دیا تھا۔ سخاوت کے فضائل سنا کر، قانون کی فضیلت بتلا کر کہ کس طرح خرچ کریں۔ مگر اس میں جبر نہیں تھا۔ دل کے داعئے اور جذبے سے آدمی دیتا تھا۔ اس لئے کہ اگر یہ چیزیں جبراً دلوائی جاتیں، آدمی دینے سے بیزار ہو جاتا کہ کون اس قانون کے تحت اپنی دولت کو کھوئے کہ میں محنت کروں اور جبراً دوسرے کو دلوا دیا۔ اس لئے جبر کرنے کی بجائے دلوں میں ایسا جذبہ پیدا کیا۔ خود اپنی خوشی سے دیں اور جو حصہ جبری تھا، جیسے زکوٰۃ، صدقہ فطر اور قربانی ہے۔ اس میں آخرت کے اتنے فضائل بیان کئے کہ وہ بھی دل کے جذبے سے آدمی دیتا ہے۔ اسلام نے کہا کہ تو ایک حصہ قربانی کر۔ اس نے کہا، نہیں میں تو پورا اونٹ دوں گا۔ ساتوں حصے میری طرف سے ہوں گے۔ بلکہ لوگ کئی کئی قربانیاں کرتے ہیں تاکہ غریبوں کو فائدہ پہنچے۔ یہ جذبہ پیدا کر دیا۔ تو ایک مسلم دولت مند بن کر خوش دلی سے دیتا ہے۔

تقسیمِ دولت میں اسلام اور کمیونزم میں فرق...... کمیونزم اور اسلام میں یہی فرق ہے کہ کمیونزم دلواتا ہے مگر جبری طور پر اس سے غصہ اور غیض و غضب ہوتا ہے۔ امیر کہتا ہے کہ اس فقیر کو کسی طرح تباہ کر دو۔ یہ کمائی میری ہے، لوٹ کر یہ لے جاتا ہے۔ غریب کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کو تباہ کر دو، جنہوں نے ہمارے حقوق مار رکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تاک میں ہیں۔ یہ غالب آئے گا، اسے ختم کر دے گا۔ وہ غالب آئے گا اسے ختم کر دے گا۔

آپ کے سامنے روس اور امریکہ کا مسئلہ ہے۔ ایک جگہ سرمایہ ہے ایک جگہ مزدوری کا دعویٰ ہے۔ یہ اس فکر میں ہے اور وہ اس کی فکر میں ہے دونوں کے ایٹم بم تیار ہیں وہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں، یہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں۔ یہ درحقیقت ایک دوسرے کا ردعمل ہے۔ یہ وہی جبر و تعدی کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں اسلام ہے۔ اسلامی قانون آ جائے تو دونوں کی صلح ہو سکتی ہے اور یہ نہیں ہو گا تو دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل ٹھہریں گے۔

اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنایا...... اسلام اعتدال کامل پر ہے کہ دلواتا بھی ہے اور اتنا دلواتا ہے کہ غریب کا گھر بھروا دیا۔ مگر مساوات اور برابری قائم نہیں کی۔ بلکہ توازن پیدا کیا کہ امیر کو نیچے اتار دیا کہ

اگر تیرے پاس ایک لاکھ ہے تو اپنے دل کے جذبے کے ساتھ غریبوں کو تیس چالیس ہزار دے تو اسے نیچے اتار اور غریب کو اونچا کر دیا کہ وہ اس درجے پر نہ رہے کہ وہ یہ سمجھے کہ میری پیدائش ہی اس لئے ہے کہ میں جوتیاں اٹھایا کروں، تکلیف اٹھایا کروں۔ حدیث میں ہے کہ جو غلام جنگ میں پکڑے ہوئے آتے تھے۔ لوگوں کو ان کو بیچ دینے کا حق تھا، یہ قانون تھا۔ لیکن تعلیم یہ دی کہ ''خَوَلُکُمْ اِخْوَانُکُمْ'' یہ غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جو تم کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ۔ جو تم پہنتے ہو، انہیں پہناؤ۔

حدیث میں فرمایا گیا: اگر کسی شخص کے ہاں باندی آ گئی تو باندی کا نام برا ہوتا ہے، ایک حقیر لفظ ہے۔ باندی کی اگر اولاد ہو جائے۔ اسے بھی لوگ حقیر سمجھتے ہیں کہ یہ باندی کا بچہ ہے، سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ اسلام نے تعلیم دی کہ جس شخص نے اپنی باندی کو تعلیم دی، تربیت کی، اسے شائستہ اور مہذب بنایا پھر اس سے نکاح کر لیا تو اس کو دوگنا اجر قیامت کے دن دیا جائے گا۔

مثلاً فرمایا کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کیا، تو اسے اجر ملے گا جیسے کہ بنی اسماعیل میں سے اس نے سو غلام آزاد کر کے خاندان نبوت کو آزاد کر دیا۔ یہ اجر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاد میں جتنے غلام آتے تھے اس سے زیادہ وہ آزاد ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اجر کمانے کے لئے لوگ آزاد کرتے تھے، تعلیم دیتے تھے، جو خود کھاتے تھے انہیں کھلاتے، جو خود پہنتے، انہیں پہناتے۔ تو وہ ان کے عاشق، یہ ان کے عاشق۔ تمدن بنا ہوا تھا۔ اس درجہ اسلام نے گویا غلاموں کے حق میں تعلیم دی۔

تو باندی کے بارے میں فرمایا کہ جس نے اپنی باندی کو تعلیم دی۔ ''فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَهَا.'' اچھی تعلیم دی ''وَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبَهَا......'' اس کو ادب سکھلایا، تہذیب سکھلائی، تربیت دی اور بہت عمدہ تربیت کی اور پھر اس سے خود نکاح کر لیا، گویا اس کو برابر بٹھلا لیا۔ وہ بے چاری باندی تھی۔ اس کو حر بنا کر اپنے برابر بٹھلا لیا۔ فرماتے ہیں اس کو دوگنا اجر ملے گا اور قیامت کے دنِ اس کو اجر و ثواب ہے۔ تو ہزاروں لوگوں نے باندیوں کو تعلیمیں دیں، تہذیبیں سکھلائیں۔ ①

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری چوتھی صدی میں جتنے بڑے بڑے علماء اور اکابر تھے، وہ سب غلام ہی تھے۔ سب جہاد ہی سے آئے ہوئے تھے ان کو آزاد کیا گیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ غلام ہی تھے۔ آزاد کر کے تعلیم دی گئی، تو مسلمانوں کے امام بن گئے اور صوفیاء کے اندر عظیم الشان شیوخ میں سے ہیں۔ سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ جہاد سے پکڑے ہوئے غلام بن کے آئے تھے۔ لیکن آزاد کر کے تعلیم دی تو اب بہت بڑے امام ہیں۔ عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ غلاموں میں سے تھے۔ لیکن بہت بڑے امام بنے۔ غرض اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غلاموں میں اتنے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے کہ ہر ہر فن میں انہوں نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا۔ تو یہ اس تعلیم ہی

① الصحيح للبخاري، كتاب العلم، باب تعليم الرجل أمته واهله: ج: ١ ص: ٠٧١۔

کا نتیجہ ہے بہر حال اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنا دیا ہے اور اس درجہ پر شفیق بنا دیا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ غریبوں کو مقدم سمجھتے ہیں۔ جو وہ فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ انہیں بھی وہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جان بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ ہماری روح بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ مال خدا کی ملک ہے تو مالی عبادت بھی رکھی گئی۔ آبرو خدا کی بخشی ہوئی ہے تو آبرو کی عبادت رکھی گئی۔ تو اللہ کے سامنے مال، جان اور آبرو کی کوئی پرواہ مت کرو۔ اس لئے کہ ہر چیز اس کی ملک ہے۔ اس لئے اس کے نام پر لٹاؤ۔

اسلام نے خرچ کرنے میں حدود بتلائی ہیں...... ہاں اس کی حدود بتلا دیں کہ حد کے اندر خرچ کرو، نہ اسراف کرو اور نہ فضول خرچی کرو کہ آج جذبے میں آ کے سب کچھ لٹا دیا۔ کل کو بھیک مانگنے کے قابل ہو گئے۔ لوگوں کے آگے ہاں پھیلائیں اور اور نہ اتنا بخل کرو کہ ہاتھ ہی سکیڑ لو۔ ﴿وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ ① ”نہ اتنا پھیلاؤ کہ سارا دے ڈالو اور کل کو بھیک مانگو۔ نہ ہاتھ اتنا سکیڑو کہ ہاتھ سے کچھ نہ نکلے“۔

درمیان میں جو اعتدال کا راستہ ہے وہ اسلامی تعلیم ہے کہ دو بھی اور روکو بھی۔ مگر مصرَف کو دیکھ کر کہ یہاں دینا صحیح ہے، یہاں اجر ہے لہٰذا دینے میں دریغ نہ کرو۔ برا مصرف ہے تو دینے میں بخیل بن جاؤ۔ یہاں نہ دینا زیادہ بہتر ہے، یہاں نہ دینا ثواب ہے۔ مثلاً آپ نے تھیٹر اور سینما پر خرچ کر دیا ناجائز چیزوں پر تو مال بھی گیا اور اوپر سے گناہ بھی سر پر۔ دنیا بھی ختم ہوئی، آخرت بھی برباد ہوئی۔ اور اگر آپ نے غریبوں یتیموں، کو دیا تو گو وہ ہیں نہیں گیا۔ اس لئے کہ غریب کو دیا۔ تو وہ آپ کا خادم ہو گیا وہ آپ کے کام آئے گا۔ اس لئے گویا وہ اپنے ہی گھر میں رہا اور اپنے بھائی کو دیا، تو اپنے گھر میں رہا اور آخرت الگ بن گئی۔ اللہ کے کہنے کے مطابق دینے سے دنیا بھی بنتی ہے، آخرت بھی بنتی ہے، اور اللہ سے کٹ کر دینے میں دنیا بھی جاتی ہے اور آخرت بھی جاتی ہے۔ غلط راستے پر خرچ کرنا ظاہر بات ہے، یہ غلط ہی ہوگا۔ اس کے نتائج بھی غلط نکلیں گے۔

مالِ حرام غلط مصرف میں ہی جاتا ہے...... بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو مال غلط طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ غلط ہی مصرَف میں خرچ بھی ہوتا ہے۔ جو جائز طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ مقدار میں تھوڑا ہوتا ہے، مگر جائز راستہ پر خرچ ہوتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ محض مال کے مصَرف کو دیکھ کر کہ کہاں خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس سے ماخذ کا پتہ چلا لو کہ یہ آیا کہاں سے ہے۔ جب برے راستہ پر جا رہا ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کر برے ہی راستے سے آیا ہے۔ حرام مصرَف میں جا رہا ہے۔ تو سمجھ لیتا ہوں کہ کمانے میں ضرور کوئی ناجائز صورت پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے یہ برے مصرف میں گیا۔ اگر خالص حلال کی کمائی ہوتی تو برے مصرف میں نہ جاتا۔ تو حلال کی کمائی مقدار میں تھوڑی ہوتی ہے۔ مگر بدن کو بھی لگتی ہے۔ روح میں بھی بشاشت پیدا کرتی ہے اور اس سے آخرت

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۹.

بھی بن جاتی ہے۔اور ناجائز کمائی اگر بہت بھی ہو جائے،تو نہ روح میں تسکین آتی ہے۔نہ بدن کو لگتی ہے نہ دوسرے کے کام آتی ہے۔ناجائز طریق پر ہی جاتی ہے۔اس لئے جائز ہی طریق پر کمایا جائے گا۔وہی کارآمد ثابت ہوگا۔

لقمۂ حلال قرب خداوندی کی شرطِ اوّل ہے......اسلام میں لقمۂ حلال اللہ کے قرب ہونے کی سب سے پہلی شرط ہے۔حرام لقمے سے کبھی قرب پیدا نہیں ہوتا۔توفیق چھن جاتی ہے۔دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ جائز کمائی استعمال کرتے ہیں۔ان کے قلب میں نور ہوتا ہے نیک کام کرنے کو ان کا جی چاہتا ہے۔ناجائز کمائی کھا کر توفیق چھن جاتی ہے اور سرکشی کرنے اور برے کام کرنے کو جی چاہتا ہے بڑا فرق پڑتا ہے۔

ہمارے ہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے۔شاہ جی عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کو کہتے تھے۔بالکل بے پڑھے لکھے تھے،مگر صاحبِ نسبت تھے۔ذکر وشغل ان کا مشغلہ تھا۔اللہ والے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے معاش کا یہ سلسلہ کر رکھا تھا کہ گھاس کھود کر بیچتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی کے چھ پیسے متعین تھے۔نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے اور نہ زیادہ اور لوگوں کا دیوبند میں یہ حال تھا کہ جنہیں جانوروں کے لئے گھاس خریدنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ان کی ایک قطار کھڑی رہتی تھی۔اور بھی بہت سے مرد وعورت گھاس بیچنے والے تھے۔ان کی گٹھڑیاں رکھی ہیں۔مگر کوئی نہیں ان سے لیتا تھا۔ہر ایک کا جذبہ یہ تھا کہ شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے گھر میں برکت ہو جائے گی۔اس لئے سب انتظار میں کھڑے رہتے تھے اور جہاں دیکھا کہ شاہ جی گٹھڑی لے کر آئے۔لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے۔بس جس نے پہلے ہاتھ لگا دیا شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے کہ بس لے جاؤ۔اسی کی گٹھڑی ہو جاتی تھی اور چھ پیسے متعین تھے۔سردی ہو،گرمی ہو یا برسات ہو نہ ایک پائی کم نہ زیادہ۔

اس کا مصرف ان کے ہاں یہ تھا کہ دو پیسے اسی وقت صدقہ کر دیتے۔اس زمانے میں پیسوں کے کچھ تابنے کے ٹکڑے آتے تھے۔جنہیں منصوری پیسہ کہا جاتا تھا۔ایک پیسے کے بہت سے ٹکڑے آجاتے تھے۔تو دو پیسوں کے بہت سے ٹکڑے لئے اور وہ ٹکڑے غریبوں میں تقسیم کر دیئے۔اور دو پیسے روزان کے گھر کا خرچ تھا۔ایک پیسے میں ادھیلہ کا آٹا اور کچھ تیل وغیرہ لے لیا۔بہر حال گھر کی ضرورت دو پیسے میں پوری کرتے۔

اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔سال بھر میں جب اس کے کچھ چھ سات روپے بن جاتے۔تو اس رقم سے ہمارے ان بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ،مولانا رفیع الدین رحمہ اللہ تعالیٰ،مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی،مولانا محمد یعقوب صاحب اعلیٰ اللہ مراتبہم جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کبھی دارالعلوم آتے۔ان کی بھی دعوت کرتے سال میں ایک دعوت ہوتی تھی۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہٗ یہ فرماتے تھے کہ سال بھر ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دعوت کا وقت آئے اور شاہ جی کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا،جس دن ان کے گھر کا کھانا

کھاتے۔ چالیس دن قلب میں نورانیت رہتی اور جذبہ اٹھتا کہ نماز پڑھو، تلاوت بھی کرو، ذکر اللہ میں مشغول رہو، یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں سال بھر دعوت کا ہمیں انتظار رہتا۔

ایک دفعہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ بے چارے بیمار ہو گئے۔ تو مولانا محمد یعقوب صاحب سے کہلا کے بھیجا کہ میں تو مریض ہوں آ نہیں سکتا یہ سات آٹھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ میری طرف سے ان بزرگوں کو کھلا دیں۔ یہ پیسے جب مولانا محمد یعقوب صاحب کے پاس پہنچے تو غسل کیا، کپڑے بدلے، زمین کو پاک کیا، اس پر بیٹھ کر خود کھانا پکایا اور ان سب بزرگوں کی دعوت کی، تو حلال کے لقمہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دلوں میں نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ عبادت وطاعت کا جذبہ اٹھتا ہے۔

حلال کمائی ہی میں برکت ونورانیت ہے...... آج جو ہماری کیفیت چھن گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری کمائیاں مشتبہ ہو گئیں۔ إلّا ماشاء اللہ۔ اللہ کے نیک بندے ہزاروں، لاکھوں ہیں۔ وہ اپنے نزدیک اپنی ہمت صرف کرتے ہیں کہ جائز طریق سے کمائیں، لیکن ہمارے بھائی بہت سے ایسے ہیں کہ انہیں پرواہ نہیں ہے۔ جائز ہو، ناجائز ہو۔ بس پیسہ آنا چاہئے۔ اس میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے بلکہ بہت سے تو مال کی وجہ سے ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتے، پیسہ آنا چاہئے۔ لیکن انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پیسے میں برکت نہیں ہوتی اس قسم کی ناجائز کمائی اپنے کو بھی ضرر پہنچاتی ہے اور بعض اوقات پورے خاندان کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ ناجائز کمائی بچتی نہیں ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''مَاخَالَطَتِ الصدقة مَالًا قَطُّ اِلَّا اَهْلَكَتْهُ.'' ① ''جس مال میں زکوٰۃ ملی رہ جاتی ہے، وہ راس المال کو بھی لے ڈوبتی ہے''۔

زکوٰۃ ملے ہوئے رہ جانے کی دوصورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زکوٰۃ فرض ہوئی اور نہ دی، وہ راس المال کسی نہ کسی دن تباہ ہوگا۔ ایک یہ ہے کہ دوسرے نے زکوٰۃ دی کہ غریبوں کو دے دینا۔ اس نے خود رکھ لی، حالانکہ خود امیر تھا اسے اپنے مال میں ملا لیا تو یہ اس کے راس المال کو تباہ کر کے رہے گی۔ غرض جس مال میں زکوٰۃ ملی ہوئی رہ جاتی ہے۔ وہ غنی کے مال کو لے ڈوبتی ہے۔ تو وہی بچتا ہے، جو بالکل جائز اور حلال طریقے سے کمایا جائے اس میں برکت بھی ہوتی ہے، دل میں نورانیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اور ویسے مال بڑھ جائے فائدہ نہیں پہنچاتا۔ زکوٰۃ دینے اور نہ دینے کی مثال بالکل ایسی ہے زکوٰۃ اگر نہیں دے گا تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے۔ ایک لاکھ میں سے اڑھائی ہزار روپے دیئے جاتے، جب نہیں دے گا تو ایک لاکھ پورے ہیں اور جو زکوٰۃ دے رہا ہے، بظاہر اس کا مال گھٹ رہا ہے۔ مگر حقیقتاً بڑھ رہا ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص وہ ہے جس نے صحت حاصل کرنے کے لئے مسہل لیا، تو بالکل

---

① شعب الایمان للبیهقی، فصل فی الاستعفاف عن المسائلة ۴/ ۱۵۹. علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواه البیهقی وابن عدی عن عائشة بسند ضعیف ج: ۲ ص: ۱۸۸۔

لاغر اور کمزور ہو گیا۔ مگر وہ کمزوری صحت کی علامت ہے کہ مادہ فاسد نکل گیا۔ چار دن کے بعد قوت آئے گی اور صحت مند و توانا ہو جائے گا۔ یہاں بظاہر بدن گھٹ گیا مگر حقیقتاً بڑھ گیا۔ کیونکہ چار دن کے بعد صحت بحال ہونے والی ہے اور اگر خرچ نہ کیا اور مال رہ گیا۔ یہ ایسا ہے جیسے بدن میں رول پڑ گئی۔ تو دیکھنے میں تو پہلوان معلوم ہو رہا ہے۔ مگر صحت ساری برباد ہو رہی ہے۔ چند دن کے بعد یہ صحت ساری ختم ہو جائے گی۔ جو دے کر مال گھٹتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مسہل سے بدن گھٹتا ہے، وہ صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اور نہ دینے سے جو مال بڑھا ہوا نظر آتا ہے وہ ایسا ہے جیسے رول چڑھ گیا کہ دیکھنے میں آدمی بہت موٹا نظر آتا ہے اور حقیقت میں اندر سے جان نکل رہی ہے۔ تو یہ ظاہری توانائی اور ظاہری زیادتی قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔ اصلیت جس سے بدن میں توانائی اور نور پیدا ہوتا ہے وہ حلال اور جائز کمائی سے ہوتی ہے۔

بہر حال اسلام نے جہاں مال کے خرچ کرنے کا طریقہ بتلایا۔ اس کی درآمد طریقہ بھی بتلایا کہ اس طرح سے کماؤ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور ملازمت وغیرہ اور ایسے پیشوں سے روک دیا ہے۔ جو مخلوق کے لئے ضرر پہنچانے والے ہوں۔ چوری، ڈکیتی سے روک دیا، سود، سٹے سے روکا، جوئے سے روکا، قمار بازی سے روکا، کہ ان میں ظاہر میں بڑھنا ہے، حقیقت میں گھٹنا ہے۔ عموماً دیکھا ہے کہ سودی لین دین کرنے والوں کا ابتداء میں مال بڑھ جاتا ہے لیکن جب دیوالیہ ہوتے ہیں۔ تو ایسے ہوتے ہیں کہ بھک منگے بن جاتے ہیں۔ ہزاروں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ کسی کا ہارٹ فیل ہو گیا، کوئی گر پڑا تو اس قسم کا مال بچانے کی بجائے اور زیادہ وبال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اوّل تو یہ ہے کہ اس قسم کی ناجائز کمائی ظاہر میں تو آدمی خود کھاتا ہے اور جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو فقیر کو تھوڑا دینا پڑتا ہے، بادشاہ اور افسران کو زیادہ دینا پڑتا ہے۔ بس رات دن ہزاروں روپے اسی میں لگا رہے ہیں۔ کچھ کسی نے چوری کر لیا تھا، کسی نے ڈکیتی کر لی اور گورنمنٹ نے ٹیکس بھی لگا دیئے اور اب پریشان ہو رہا ہے کہ اتنی مشکل سے کمایا۔ لیکن اگر اعتدال کے ساتھ کمائے اور اعتدال کے ساتھ خرچ بھی کرے۔ اس کا یہ برا اثر نہیں پڑے گا۔ اسلام نے کمانے اور خرچ کرنے کا بھی ڈھنگ بتلایا۔ دونوں میں اعتدال پیدا کیا۔ اور قانونی طور پر جبر نہیں کیا۔ جبر کیا بھی تو بہت معمولی کہ دینا آسان ہو۔ اخلاقی طور پر زیادہ زور دیا ہے۔ لاکھوں نظیریں موجود ہیں کہ قانونی طور پر زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ دیتے ہیں اور اس کے بعد بھی دینا اور دے کر خوش ہونا، مہمانداری وغیرہ، یہ مسلم کا گویا ایک پیشہ اور شعار ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لئے قرآن کا طرزِ اُسلوب...... اس طرح سے اسلام نے مالی عبادت بھی سکھلائی اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا تو کیسے پیارے انداز میں حکم دیا کہ واقعی دینے کو جی چاہے۔ فرمایا ﴿وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ﴾ ① ''خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے''۔ یعنی تم کہاں سے لے کر

① پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰۔

آئے ہو، مال تو ہمارا دیا ہوا ہے۔ پھر اس میں سے خرچ کرتے ہوئے تمہیں کیوں دکھ ہوتا ہے، کیوں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ اگر یوں فرماتے کہ اپنی کمائی دے ڈالو۔ تو آدمی کو ذرا دکھ ہوتا کہ بھئی! کماؤں میں اور دوسرے کو دے ڈالوں۔ اس لئے عنوان یہ اختیار کیا کہ: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ﴾ ① جو ہم نے دیا تھا اس میں سے دو۔ آدمی سمجھے گا کہ میرا تو ہے ہی نہیں، انکا ہے۔ وہ مانگ رہے ہیں، میں دے دوں۔

یہ ایسا ہے جیسے آپ کا ایک بچہ ہو اور اسے آپ دو روپے دیں۔ اس کے بعد کہیں کہ بیٹا دو پیسے ہمیں بھی دے دے ظاہر بات ہے کہ بچہ جو دے گا۔ وہ خود کما کے تھوڑا ہی لایا ہے، وہ تو باپ نے اس کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ اسے دینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ وہ یہ سمجھے گا کہ باپ ہے اور پھر مجھ سے مانگ رہا ہے۔ اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ تو دینے والے حق تعالیٰ خود ہیں۔ پھر کہتے ہیں بھئی! جو ہم نے تجھے دیا تھا۔ اس میں سے ہمیں بھی کچھ دے دے۔ تو دینے والے کو بھاری نہیں گزرے گا کہ دینے والے اور مالک بھی خود ہیں، وہ مانگ رہے ہیں۔ پھر یہ مانگنے کے بعد جو تم نے دے دیا۔ پھر یہ نہیں کہ تمہارا تعلق اس سے ختم ہوا نہیں، فرماتے ہیں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ② ''کوئی ہے جو اللہ میاں کو قرض دے''۔

دنیا میں تو قرض کے اوپر سود حرام قرار دے دیا کہ جتنا قرض لو، اتنا ہی دو۔ قرض دینے والا اوپر سے زیادتی لے، وہ سود ہے، ناجائز ہے اور خود سود دیتے ہیں۔ بلکہ سود در سو کہ اگر کسی نے دس روپے ہماری راہ میں دیئے تو تمہیں دس کے ستر دیں گے۔ یہاں قرض کے اوپر سود دے رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانوں میں سود اس لئے حرام قرار دیا کہ کمائی محدود ہے، تھوڑی سی کمائی ہے۔ اس کے اوپر ہم نے دس روپے قرض پر پانچ اور بڑھا دیئے تو دینے والے پر بڑا گراں گزرتا ہے کہ اس کی دولت محدود تھی۔ جب ظلم کے طور پر اس سے پانچ اور لیں گے تو کیسے دے گا؟

اور اللہ میاں کی دولت لامحدود ہے۔ اس کے خزانے میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ تو اپنے حق میں سود کا سلسلہ جائز رکھا، انسانوں کے حق میں ناجائز رکھا اور فرمایا: ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ ③ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے، جیسے گیہوں کا ایک دانہ زمین میں ڈال دیا جائے، گیہوں کا درخت اگا۔ تو سات بالیاں اس میں سے نکلیں اور ہر بالی کے سو دانے تو ایک دانہ ڈالا تھا اور سات سو دانے نکل آئے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ آپ نے اللہ کو ایک دانہ قرض دیا اور سات سو دانے وصول کئے۔ تو سات سو گنا کون سود دیتا ہے۔ یہ تو اللہ میاں ہی دیں گے۔

اور آگے یہ بھی فرمایا کہ: سات سو پر بس نہیں۔ اللہ اگر بڑھانا چاہیں تو کون روکنے والا ہے۔ وہ لاکھوں گنا سود دے دے، جب بھی اس کے ہاں کمی نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص چھوہارے کی ایک گٹھلی صدقہ

① پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰۔ ② پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۱۱۔ ③ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۱۔

کرتا ہے۔ تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اسے پالتے ہیں اور ایسے پالتے ہیں، جیسے تمہارے ہاں گھوڑے کا کوئی بچہ ہو تو تم اسے دودھ پلا کر پال لو۔ چند دن کے بعد ہی وہ گھوڑی بن جائے اور سواری کے قابل بن جائے۔ فرمایا، جو ایک گٹھلی بھی صدقہ دیتا ہے ہم اسے پال کر جبل اُحد کے برابر کر دیتے ہیں۔ آخرت میں جب یہ اجر کے ڈھیر سامنے آئیں گے۔ تو بندہ حیران ہوگا کہ میں نے کون سا ایسا صدقہ کیا تھا۔ جس کے بدلے میں یہ پہاڑ جیسا اجر سامنے ہے۔ فرمائیں گے، تو نے گٹھلی صدقہ کی تھی۔ لیکن ہم نے تیرے خلوص کے وجہ سے اس کو پال کر پہاڑ کے برابر کر دیا۔ اندازہ کیجئے ایک پہاڑ میں سے چھوہارے کی کتنی گٹھلیاں نکل سکتی ہیں۔ ایک گٹھلی اس نے صدقہ کی اور اربوں کھربوں گٹھلیوں کے برابر اس نے اَجر لے لیا۔ تو اللہ کے ہاں نہ سود سے کمی، نہ سود در سود سے کمی۔ وہ دردنیا ستر در آخرت، کا مقولہ مشہور ہے کہ دنیا میں دس دے دو، آخرت میں ستر مل جائیں گے۔

ایمان اور سکونِ قلب دنیا کی کروڑوں سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں...... اور آخرت تو آخرت دنیا میں بھی مل جاتا ہے، اللہ کی راہ میں دینے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں کہ اس نے دیا۔ مگر اس کے بدل میں کچھ نہ ملا۔ مگر جو قلب میں ایمان اور سکون کی دولت ہوتی ہے۔ وہ کروڑوں سلطنتوں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے جو اس پر عطا کی جاتی ہے۔

ایک بزرگ جا رہے تھے بزرگوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ لباس کی کچھ زیادہ خبر نہیں ہوتی۔ بس جیسا مل گیا، پہن لیا۔ کبھی شاہانہ لباس، کبھی پھٹے پرانے کپڑے وہ بزرگ پھٹے پرانے کپڑوں سے چلے جا رہے تھے ایک شہر سامنے آیا تو سارے شہر کے دروازے بند۔ اب ہزاروں گاڑیاں اندر جانے والی، وہ باہر رکی ہوئیں، اور اندر کی اندر۔ تجارت و کاروبار بھی سب بند۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھئی! یہ دروازے کیوں بند ہو گئے۔ لوگوں نے کہا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا باز کھو گیا باز ایک پرندہ ہوتا ہے جس سے چڑیوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ کھو گیا ہے۔ تو بادشاہ نے کہا، چونکہ باز کھو گیا۔ شہر کے دروازے بند کر دو اور اسے کہیں سے پکڑ کے لاؤ۔

انہوں نے کہا، کیسا احمق بادشاہ ہے بھئی! پرندے کو اس سے کیا کہ دروازے بند کئے ہیں۔ وہ اڑ کے باہر چلا جائے گا۔ اسے دروازے کی کیا ضرورت ہے ایسا احمق آدمی ہے۔ پرندے کو اگر پکڑنا تھا تو شہر پر جال لگوا دیتا کہ اوپر سے اڑ کے نہ نکلے۔ دروازے بند کرانے کی کون سی تک ہے اور اس بزرگ نے کہا۔

یا اللہ! یہ آپ کی عجیب قدرت ہے کہ اس کندہ ناتراش کو تو بادشاہ بنا دیا جس کو یہ بھی تمیز نہیں کہ باز کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے یا شہر کے دروازے بند کرانے چاہئیں اور مجھ جیسے فاضل، عالم کو بھک منگا بنا رکھا ہے کہ جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں۔ عجیب آپ کی قدرت ہے اور آپ کا نظام کہ اس احمق کو سلطنت دے دی اور مجھے جوتیاں چٹخانے کے لئے چھوڑ دیا۔ اس بزرگ کے دل میں یہ وسوسہ گذرا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کہ کیا تم اس کے لئے تیار ہو کہ تمہارے دل کی، ایمان کی دولت اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی سلطنت تمہیں دے

دیں۔ تھرّا گئے عرض کیا۔ نہیں، یا اللہ! میں ایمان نہیں دینا چاہتا۔ فرمایا اتنی بڑی دولت دے دی۔ پھر بھی بے وقوف اپنے کو بھک منگا سمجھ رہا ہے، یہ دولت ظاہری جس کے پاس ہے وہ کل کو ختم ہوگی، جس کے پاس ایمان ہے وہ دولت ہے جو ابدالآباد تک چلنے والی ہے۔ تو تجھے اَبدی دولت دی اور اسے عارضی دولت دی، تو نے اس کی قدر نہ کی۔

پھر توبہ کی اور کہا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر۔ واقعی تو نے مجھے دولت مند بنا دیا۔ جس کے پاس ایمان کی دولت ہے۔ اس سے بڑھ کر کون دولت مند ہے۔ یہ دولت آگے تک جانے والی ہے۔ مسلمانوں کو اگر مادی دولت ملے تو شکر ادا کرنا چاہئے کہ ایمان کی دولت الگ دی اور دنیا کی دولت بھی دی۔

مسلم کو دنیا بطورِ حق نہیں بلکہ خدمات کے صلہ میں ملتی ہے ...... میں تو کہا کرتا ہوں، دنیا میں جتنی دولت ہے۔ مسلمان اس کا قطعاً حقدار نہیں ہے یہ کفار کا حق ہے۔ اس لئے کہ ان کی آخرت نہیں ہے۔ انہیں دنیا میں ہی سب کچھ دیا جاتا ہے اور یہ کتنی زیادتی کی بات ہے کہ ایک مسلم یوں کہے کہ آخرت بھی مجھے ملے، دنیا بھی مجھے ملے اور کافر غریب کو کچھ بھی نہ ملے۔ دوسرے کے حق کو ساقط کر دینا، اسے محروم کر دینا، یہ کونسی دانش مندی کی بات ہے؟ مسلمانوں کو جو دولت ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے۔ جہاد کرے گا، حکومت مل جائے گی۔ جدوجہد کرے گا، دولت مل جائے گی۔ غرض مسلمانوں کو دولت اور دنیا جو ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے اس کا حق نہیں ہے۔ کافر کو خدمت کے صلے میں نہیں ملتی ہے۔ اس کا حق ہے اس لئے کہ آگے اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ تو یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ آپ یوں چاہیں کہ اس دنیا کی دولت بھی میرے ہی پاس آجائے۔

پھر بھی یہ اللہ کا فضل ہے کہ اگر خدمت کرتا ہے تو مسلم کو دولت دنیا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ مقصودِ اصلی نہیں ہوتی، مقصودِ اصلی آخرت ہی ہوتی ہے۔ یہ دولت بھی اس کے لئے وسیلہ بنتی ہے۔ حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلا کے موقع پر جب آپ کی ازواجِ مطہرات نے نان ونفقہ طلب کیا اور گھیراڈال کر بیٹھیں کہ ہمیں بھی تو کچھ دینا چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کنارہ کشی کر کے اوپر ایک حجرہ تھا اس میں بیٹھ گئے اور بول چال بند کر دی۔ چہرہ مبارک پر بشاشت نہیں رہی کہ میرے گھر والے مجھ سے دولت طلب کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوپر بیٹھ گئے۔

تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پریشان تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اوپر آنے کی اجازت چاہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ اور ایک چمڑے کا چھوٹا سا برتن۔ جس میں تھوڑا سا شہد تھا۔ یہ کل سامان تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنے پر اُٹھ بیٹھے تو کمر مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہا کہ یا رسول اللہ! قیصر وکسریٰ جو بادشاہ ہیں۔ یہ بڑے بڑے تخت، نرم بستروں اور محلات میں آرام کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور اس حالت میں کہ بدن مبارک

کے اوپر چٹائی کے نشان اتر آئے ہیں۔کوئی چیز بچھانے کی میسر نہیں تھی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔آپ نے فرمایا:''اَوَفِیْ هٰذَا اَنْتَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟'' ''اے ابن خطاب! کیا تو ابھی تک حیرت میں پڑا ہوا ہے؟''''اُولٰئِکَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَیِّبَاتُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔'' تو نے قیصر وکسریٰ کا نام لیا ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور تیرے اندر علم و ایمان اور دین کی دولت ہے۔پھر بھی تجھے حرص پیش آئی اور اس قوم کی جس کے لئے انجام میں کچھ نہیں ہے۔گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا۔یہ مت کرو۔یہ حرص ٹھیک نہیں۔شکر کی چیز یہ ہے کہ دولت ایمان عطا کر دی۔ جس کے پاس ایمان ہے، وہ کبھی مفلس نہیں ہو سکتا۔اللہ دولت دنیا دے تو شکر کا مقام ہے اور نہ دے تو تب بھی دولت مند ہے۔اس لئے کہ بڑی دولت میسر ہے۔ (۱)

بندے اور خدا میں صرف غلامی کی نسبت ہے......اس لئے چونکہ جان بھی اللہ کی دی ہوئی ہے، روح بھی اللہ کی دی ہوئی ہے مال بھی اللہ کا دیا ہوا ہے اور یہ چیزیں نہ صرف دی ہوئیں بلکہ اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔تو وہی مالک بھی ہے جو پیدا کرنے والا ہے۔اس لئے یہ چیزیں اسی کے کہے کے مطابق لٹائی جائیں گی اور خرچ کی جائیں گی۔کیونکہ مالک وہ ہے اگر وہ یوں کہے کہ سب مال لٹا دو، لٹا دینا چاہئے۔اگر وہ یوں کہے کہ بخیل بن جاؤ، بخیل بن جانا چاہئے۔اگر یوں کہے کہ جان دے دو، دے دینی چاہئے۔وہ کہے ہرگز مت دو، روک لینی چاہئے۔

اصل میں عبادت اسی کا نام ہے کہ اطاعتِ محض کی جائے۔جو حکم ہو اس کی تعمیل کر دی جائے۔یہی عبادت ہے۔ظاہر میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا نام عبادت ہے۔یہ عبادت نہیں ہے یہ جزئیات ہیں، عبادت کی مثالیں ہیں۔کہنا ماننے اور زندگی کے ہر گوشے میں اطاعت کرنے کا نام عبادت ہے۔پانچ وقت مؤذن اعلان کرتا ہے کہ نماز پڑھو۔نماز پڑھنا عبادت ہے۔پانچ وقتوں میں نماز فرض ہے۔نماز ادا کی جائے گی اور تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔جب آفتاب طلوع وغروب ہو رہا ہو یا سر کے اوپر آ گیا ہو، ان تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔اگر پڑھے گا تو قبول نہیں ہو گی۔معلوم ہوا نماز کا پڑھنا عبادت ہے، نہ چھوڑنا عبادت ہے۔کہنا ماننا عبادت ہے۔جب ہم کہیں پڑھو، جب ہم کہیں رک جاؤ، یہی بندہ کا کام ہے۔رمضان شریف میں روزہ رکھنا فرض ہے۔اگر نہیں رکھو گے تو گنہگار ہو گے اور عید کے دن روز رکھنا حرام ہے۔اگر رکھو گے تو گنہگار ہو گے۔معلوم ہوا روزہ رکھنا نہ رکھنا عبادت نہیں کہنا ماننا عبادت ہے۔جب ہم کہیں کہ مت رکھو، پھر چھوڑ دینا عبادت ہے۔

خودکشی حرام ہے۔کسی کو حق نہیں ہے کہ اپنی جان کو خود ختم کر لے۔لیکن اگر وہ حکم دیں کہ میدان جہاد میں جا کے خود بھی شہید ہو جاؤ۔اب یہی عبادت ہے معلوم ہوا نہ جان رکھنا عبادت، نہ گنوانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے۔جب کہیں کہ دے دو، تو عبادت اور جب کہیں کہ ہرگز مت دو تو روک لینا عبادت ہے۔یہی صورت مال کی بھی ہے۔اگر

---

(۱) الصحیح للبخاری، کتاب المظالم و الغصب، باب الغرفة العلیة المشرفة، ج:۸، ص:۳۵۷ رقم:۲۲۸۸.

یوں کہیں کہ ہرگز مت خرچ کرو۔ یہ مصرف بہت برا ہے۔ تو روک لینا اور بخیل بننا ہی عبادت ہے اور اگر یوں کہیں کہ خرچ کرو، تو خرچ کرنا عبادت ہے۔ مطلب یہ کہ بندہ جان، مال، آبرو، طاقت وقوت سب کے لحاظ سے بندہ ہے اور بندے کو یہ معلوم ہے کہ جو مالک کو حق ہوگا، غلام وہی انجام دے گا غلام اپنی تجویز سے کچھ نہیں کرے گا۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنادے کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام لے لے۔ اس نے کہا تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا، اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو غلام ہی کیوں بنتا؟ آقا کیوں نہ بن جاتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ میری مرضی، میرا ارادہ، میری خواہش بھی غلام۔ یہی غلام ہونے کے معنی ہیں۔ اگر یہ چیزیں میری اپنی ہوتیں، تو میں آقا ہوتا، غلام کیوں ہوتا؟ تو ایک انسان، انسان کا غلام بن جائے، جس نے نہ اسے پیدا کیا، نہ روزی دی۔ محض ایک نسبت پیدا ہوگئی کہ خرید لیا اور غلام بن گیا۔ اس کی یہ کیفیت کہ آقا کے مقابلے میں نہ مرضی نہ ارادہ نہ خواہش کچھ بھی تو نہیں۔

اور اللہ ربّ العزت جس نے پیدا کیا، جان دی، روح دی، ہر چیز کا مالک اس کے سامنے بندگی کا دعویٰ کرے اور بندگی کے خلاف بھی کرے؟ وہاں تو یہ ہونا چاہئے کہ ہماری مرضی بھی اللہ کی غلام ہے۔ ہماری خواہش بھی اللہ کی غلام ہے۔ وہاں آکر آدمی بنتا ہے، یہاں آقائی میں آتا ہے۔ شریعت کا حکم آئے تو اس میں رائے زنی کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ گویا اللہ میاں معاذ اللہ تابع ہیں اور یہ ان کے متبوع ہیں۔ خدا اور رسول کو اپنی مرضی پر چلانا، اس سے زیادہ گستاخی کی کیا بات ہوگی۔ بندہ اس لئے آیا تھا کہ اللہ ورسول کی مرضی پر چلے نہ یہ کہ اپنی مرضی پر انہیں چلانے کی کوشش کرے۔ تو دین میں لوگ ترمیمیں پیش کیا کرتے ہیں کہ صاحب! یوں نہیں، یوں ہونا چاہئے۔ گویا آپ پارلیمنٹ ہیں اور شریعت آپ کے مشورہ سے بن رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں کو جب دین اتارنا تھا، تو ہمیں بلا لیتے۔ ہم سے مشورہ لے لیتے کہ یہ حکم کیسے اتاروں؟ یہ کتنی بڑی گستاخی کی بات ہے بندے اور خدا میں نسبت صرف غلامی کی ہے کہ بندہ غلام ہے اور وہ آقا ہیں اس کی مرضی بھی غلام اور خواہش بھی غلام۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو فرمایا ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ﴾ ① ''اے ابراہیم مسلم بنو''۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ اب تک آپ مسلمان نہیں تھے۔ اب مسلمان ہو جاؤ۔ اسلام کے معنی گردن نہاد ہونے کے ہیں۔ اپنے آپ کو سونپ دینے کے ہیں۔ یعنی اے ابراہیم! اپنے کو ہمارے حوالے کردو۔ جو چاہیں ہم تمہارے اندر تصرف کریں اور تمہیں بولنے کی مجال نہ ہو۔ جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں بے اختیار ہوتا ہے، جدھر کو چاہے کروٹ دے دے۔ مردہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ادھر کیوں کروٹ دی۔ اسی طرح شریعت کے ہاتھ میں آدمی مثل مردہ کے ہو جائے کہ شریعت جدھر بھی تصرف کرے، بلا چوں وچرا آدمی عمل کرے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱۔

ایک آدمی گورنمنٹ کا ملازم ہو جاتا ہے۔ تو جب سرکاری آرڈر ہوتا ہے پھر چون و چرا کی گنجائش نہیں دیتا۔ کوئی چون و چرا کرے تو لڑنے کو تیار کہ سرکاری آرڈر ایسے ہی ہوتا ہے۔ اللہ میاں کا آرڈر آئے تو وہاں رائے زنی کرنے کو تیار کہ یہ آرڈر اور حکم کیوں آیا؟ ایسا کیوں نہ ہو گیا اور ویسا کیوں نہ ہو گیا یہ غلط کاروائی ہے۔ بہر حال جان ہو، مال ہو، آبرو ہو۔ یہ سب مخلوق ہیں اور مخلوق کا کام یہ ہے کہ خالق کے آگے جھکے اس جھکنے ہی کا نام طاعت و عبادت ہے۔ اس لئے فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے''۔ یعنی بندہ دنیا میں خدائی کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے۔ خدائی کے لئے خدا کی ذات کافی ہے۔ تمہیں تو بندہ بننے کے لئے بھیجا گیا ہے اور بندگی کے یہی معنی ہیں کہ بے چون و چرا اطاعت کرو۔

ہمارے ضلع سہارن پور کے قریب پنجاب کا ایک ضلع انبالہ ہے۔ اس میں عبداللہ پور ایک گاؤں ہے۔ سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے عارف باللہ اور شیخ کامل تھے، صاحب نسبت بزرگ تھے۔ وہاں وہ رہتے تھے۔ جمنا کے کنارے یہ گاؤں آباد تھا۔ ایک دفعہ برسات میں جمنا میں پانی چڑھا اور اور اتنا چڑھا کہ گاؤں کی جو چہار دیواری تھی اس تک آدھا پانی آ گیا۔ اگر گز بھر اور بڑھ جاتا۔ تو پورا گاؤں غرق ہو جاتا۔ وہاں ایک بزرگ شاہ دولہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے تھے۔

لوگوں نے جب دیکھا کہ پانی بہت چڑھ گیا اور دیوار اگر ٹوٹ گئی۔ تو پھر گاؤں کی خیر نہیں ہے۔ تو سارے گاؤں والے جمع ہو کے شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضور دعا کیجئے جمنا کا پانی چڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گاؤں ڈوب جائے۔ یہ ذرا دیوار کھڑی ہے۔ اس سے پانی رک رہا ہے۔ فرمایا، اچھا پانی بڑھ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا، ''جی ہاں'' فرمایا، پھر پھاوڑا اٹھا کے چلو۔ پھاوڑا لایا گیا۔ تو شاہ دولہؒ نے پھاوڑا لیا۔ اب شاہ دولہ آگے آگے، پیچھے پیچھے سارا گاؤں۔ وہ جو دیوار کھڑی تھی۔ جس سے پانی رک رہا تھا۔ شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دیوار کو توڑنا شروع کر دیا۔ اب وہ ٹوٹ رہی ہے اور پانی اندر آنا شروع ہوا۔ لوگوں نے کہا، حضرت یہ کیا کر رہے ہو؟ اس دیوار کی بدولت تو گاؤں بچ رہا ہے۔ دیوار توڑ دیں گے تو پانی نہیں آ جائے گا؟

فرمایا۔ ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' نامعقولو! تم مجھے اس لئے لائے تھے کہ میں اللہ سے مقابلہ کروں۔ وہ چاہیں کہ بستی غرق ہو۔ تو میں بھی چاہتا ہوں کہ بستی غرق ہو۔ میں اللہ سے مقابلے کے لئے نہیں آیا۔ میں اطاعت کے لئے آیا ہوں۔ ان کا منشاء یہ ہے کہ یہ بستی غرق ہو، تو میرا منشاء بھی یہی ہے کہ اس بستی کو غرق ہونا چاہئے۔

کسی بزرگ سے کسی نے کہا تھا۔ کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا، اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو۔ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا آپ اس درجہ کے ہیں۔ فرمایا،

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

الحمدللہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے! فرمایا یہ اس طرح سے ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں۔

اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کردیا۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو جو بھی عالم میں ہوتا ہے، وہ میری مرضی کے خلاف ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی پیدا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمدللہ پیدا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اگر کوئی مرتا ہے، میں کہتا ہوں الحمدللہ اسے مرنا ہی چاہئے تھا۔ میں کون ہوں۔ جو اللہ کا مقابلہ کروں کہ وہ موت دے، میں کہوں نہیں۔ موت نہیں آنی چاہئے۔ انسان بندگی کے لئے آیا ہے اور بندگی کے معنی اطاعت کے ہیں کہ جو ان کی مرضی وہ میری مرضی ۔

مرضی مولی از ہمہ اولیٰ

تو بندہ وہ ہے کہ اپنی مرضی کو مال جان اور روح کو فنا کردے۔ اس کو فرمایا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① اس میں میں نے جان کی تفصیلات کو چھوڑ کر مالیات کو بیان کیا۔ اس لئے کہ جب اللہ نے دولتیں دی ہیں۔ تو دولت کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ جہاں دولت کے حقوق پہچانے جائیں۔ وہاں غربا کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ غریب بھی آپ کے اور ہمارے ہی بھائی ہیں۔ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔ بہت سے مسلمان غریب ہیں سب کی یکساں حالت نہیں ہے۔ ان کی طرف توجہ دیں۔

اجتماعی طور پر غرباء کی خدمت کی ضرورت ہے...... ایک تو یہ ہے کہ شخصی طور پر آپ نے دے دیا۔ بے شک عبادت انجام دی۔ جس غریب کو بھی دیں گے آپ نے عبادت ادا کی۔ زکوٰۃ دیں، صدقات دیں، وہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر دیں۔ مثلاً آپ فنڈز بنائیں جس میں لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع ہو۔ بہت سے پس ماندہ غریب ہوتے ہیں کہ ان کے قرض لینے کا سامان ہوجاتا ہے، بہت سے بھک منگے ہوتے ہیں، کھانے پینے کو نہیں۔ انہیں قرض دے کر تجارت کرائی جائے۔ کوئی کاروبار لگادیا جائے کہ بھئی! تم پانچ برس میں ہمارا قرض ادا کردینا۔ مگر اب اپنا کام چلاؤ۔

ہندوستان میں بہت سی ایسی بستیاں ہیں کہ انہوں نے فنڈز جمع کئے اور ان سے غریبوں کو قرضہ دیتے ہیں۔ پہلے یہ صورت تھی کہ لوگ ساہوکاروں سے قرضہ لیتے تھے۔ تو مسلمانوں کی لاکھوں کی جائیدادیں تباہ ہو گئیں۔ وہ ساری سود ہی میں نکل جاتی تھیں۔ اس لئے مسلمانوں میں جو دولت مند تھے انہوں نے فنڈز قائم کئے اور اس میں بلاسود کا قرضہ دیا۔ اس میں کچھ ضمانتیں، یا لکھت پڑھت بھی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سینکڑوں آدمی کام سے لگ گئے۔ جو پریشان حال تھے ان کی پریشانی رفع ہوگئی۔ تو شخصی طور پر زکوٰۃ دی جائے بے شک ضروری ہے۔ فرض و عبادت ہے ثواب و اجر بھی ملے گا۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر فنڈز مقرر کئے جائیں کہ ہم اپنے

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

غریب بھائی کو غریب نہیں رہنے دیں گے۔ جتنا ہم سے بن پڑے گا۔ اس میں تعلیم کا بھی بندوبست ہوسکتا، پیسہ کا بھی بندوبست ہوسکتا ہے، غریبوں کی خبر گیری بھی ہوسکتی ہے۔ ایک کا کام ایک ہی کا ہوتا ہے۔ جماعت کا کام جماعت ہی کا ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر خدمت کی جائے تو قوم کی زیادہ خدمت ہوسکتی ہے۔ تعلیم وتربیت اور معاشرت ومعاش کے سلسلہ میں خدمت کے بہت بہتر نتائج ظاہر ہوسکتے ہیں۔ غریبوں کے حقوق بھی امیروں کے اوپر عائد ہوتے ہیں۔ یہ غریب بھی اپنے بھائی ہیں کوئی الگ نہیں ہیں۔ جیسا کہ دولت مند بھائی ہیں یہ بھی ہیں۔ تو دولت مندوں کا یہ بھی فرض ہے کہ زکوٰۃ، صدقات اور لِلّٰہ فی اللہ سے اپنے بھائیوں کی خبر گیری کریں۔ شخصی طور پر بھی اجتماعی طور پر بھی۔ یہ بھی ایک مستقل عبادت اور طاعت ہوگی اور اس کا اجر جماعتی طور پر ہوگا۔ اس سے قوم کی ترقی ہوگی،، بہبود وفلاح بھی ہوگی۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے''۔ کہ وہ بندگی کریں۔ ﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ﴾ ②۔ ''ہم نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ ہم تم سے روزی چاہیں''۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ③ ''روزی کا ذمہ ہم لیتے ہیں تم مت گھبراؤ''۔

تو ایک کام ہمارے سپرد کیا اور ایک اپنے ذمہ لیا۔ اپنے ذمہ روزی دینا لیا۔ آپ کے ذمہ طاعت وعبادت کرنا ہے۔ جتنا آپ طاعت وعبادت کریں گے، ادھر سے روزی آئے گی اور روزی کے معنی فقط روٹی کے نہیں ہیں۔ رزق، عزّت، آبرو، اِقتدار سب چیزیں اس میں داخل ہیں۔ تو ہم روزی دیں گے، تم طاعت وعبادت کرو۔

اب مسلمانوں نے جو اپنے ذمے لیا تھا اسے ترک کر دیا اور جو اللہ نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس کا مطالبہ قائم ہے۔ اگر روزی میں کمی ہوئی تو بس اللہ میاں کی شکایت شروع ہوگئی کہ صاحب! بس روزی بند کرنے کو میں ہی رہ گیا تھا کفار کہاں چلے گئے تھے۔ میرے ہی اوپر بلا آتی ہے۔ گویا انہوں نے جو روزی کا ذمہ لیا تھا۔ معاذ اللہ اسے پورا نہیں کیا اور آپ جو ذمہ لے کے آئے تھے کہ میں طاعت کروں گا۔ وہ آپ نے کب پورا کیا؟ اپنے کو دیکھتے نہیں، شکایت اللہ میاں کی شروع کر دی۔ اس واسطے اپنا بھی حق ادا کرو اور اللہ نے جو اپنے فضل وکرم سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ وہ ادا کریں گے تم کمی کرو گے، ادھر سے بھی کمی ہوجائیگی۔ تم پورا حق ادا کرو گے، ادھر سے بھی روزی دی جائے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ④ ''روزی کی فکر نہ کرو ہم دیں گے''۔ اپنے کام کی فکر کرو۔ جو تمہارے ذمے ڈالا گیا ہے اور وہ طاعت وعبادت ہے۔ یہ چند باتیں میں نے بلا تمہید عرض کیں کسی علمی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو طاعت وعبادت کی، جھکنے کی توفیق عطا فرماوے۔ (آمین)

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶. ② پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۷.
③ پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸. ④ پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸.

”اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَا سِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.“

خطبہ طیبہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، أَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. أَمَّــا بَعْــدُ:

تمہید...... حضرات محترمین! اس عظیم اجتماع کی صدارت مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم کا کام نہ تھا۔ اس لئے اس مقام پر آتے ہوئے ایک قسم کی بے ادبی اور خجالت وندامت محسوس ہو رہی ہے اور حیران ہوں کہ اپنے بزرگوں کے اس اقدام (تفویض صدارت) پر ان کا شکریہ ادا کروں یا شکوہ کروں؟

تاہم "اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبِ......" کے تحت جب کہ بزرگوں کے امر کی تعمیل کر رہا ہوں اور جہاں بٹھلا دیا گیا ہوں، وہاں بیٹھ چکا ہوں۔ اس لئے شکریہ کے سوا چارہ کار بھی نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس اظہار کے ساتھ کہ حقیقی معنی میں صدر وہی حضرات ہیں جو بے بضاعتوں تک کو بھی صدارتیں بانٹ سکتے ہیں۔ میں صرف ان کے حکم کے ایک تعمیل کنندہ کی حیثیت سے اس مقام پر حاضر رہوں گا اور یہ تعمیل ارشاد ہی اس خجالت وندامت کا تدارک بن سکتی ہے۔ جو مجھے اس مقام پر بیٹھ کر ہو رہی ہے۔ حق تعالیٰ ان بزرگان علم وتعلیم کے منشاء کی تعمیل کی توفیق دے اور ان کے فیوض وبرکات کو تا دیر قائم رکھے، یہ دعا میرا شکریہ ہے۔

منّت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی ۔۔۔ منّت شناس از و کہ بہ خدمت گذاشتت

تعین موضوع...... حضرات کرام! یہ عظیم اجتماع چونکہ علمی اور تعلیمی ہے اور ایک موقر تعلیم گاہ کے انتساب سے منعقد ہو رہا ہے۔ اس لئے اس خطبہ افتتاحیہ کا موضوع قدرتی طور پر خود وہی متعین ہو جاتا ہے۔ جو جلسہ اور تعلیم گاہ کا موضوع ہے اور وہ علم وتعلیم اور تربیت ہے۔ اس لئے میں اس موضوع کے دائرہ میں محدود رہ کر ذیل کی چند سطور عرض کرنے کی جرات کروں گا۔

دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت...... میرے اس سارے خطبہ افتتاحیہ کا حاصل دو لفظوں میں یہ ہے کہ انسانی زندگی میں دینی تعلیم انتہائی اہم اور ضروری ہے اور اس سے پیدا شدہ علم وعمل اور اس علم وعمل سے مربوط زندگی ہی حقیقی زندگی اور اعلیٰ ترین حیات ہے۔ جس کی اشاعت وترویج اس نازک ترین یا تاریک ترین دور میں پورے

جان و مال کی قربانیوں کے ساتھ اہم ترین ضرورت ہے۔

دینی تعلیم پر مبنی چند سوالات...... دینی تعلیم کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے مبادی و آثار اور لوازم کیا ہیں؟ پھر دینی تعلیم کے تقابل سے جو دنیوی تعلیم مفہوم ہوتی ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے اور پھر اس علم دنیا اور علم آخرت کے ثمرات و نتائج میں کیا فرق ہے؟ چند قدرتی سوالات ہیں۔ جو دینی تعلیم کے لفظ سے آپ کے ذہنوں میں ابھر رہے ہوں گے انہی کے جوابات پر یہ تحریر مشتمل ہے مگر جوابات کی تقریر اور تفہیم قدرے طویل ہوگئی ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ موضوع ہی قدرتاً طویل الذیل ہے۔ دوسرے اس بناء پر کہ یہ سطور ایک طالب علم کے قلم سے نکل رہی ہیں اور وہ بھی ایک تعلیم گاہ میں اور اوپر سے ایک تعلیمی اجتماع کے موقعہ پر اور طالب علم کے لئے ایسے مواقع میں یہ موضوع نقد زندگی اور لذیذ ترین موضوع ہے اس لئے محبوب مشغلہ میں کچھ ارادی طول بھی ہو جاتا ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ان ارادی اور غیر ارادی طوالتوں کے لئے میں اپنے بزرگوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر ساتھ ہی کوشش کروں گا کہ طوالت کو کم کرنے کے لئے ان حقائق کو خالص اصولی رنگ سے پیش کر دوں۔ واقعات و حوادث سامعین کے ذہنوں میں خود موجود ہیں بلکہ مجھ سے کہیں زیادہ۔ اس لئے عرض کردہ اصول پر واقعات کو وہ خود منطبق فرما کر ان حوادث کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا فیصلہ فرمالیں۔ یہ اصول قرآن حکیم کی روشنی سے اَخذ کئے گئے ہیں۔ جو کائنات کے سارے حوادث کی صحت و سقم کو تولنے کا واحد میزان ہے ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ① ''ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر''۔ اس لئے ان پر منطبق شدہ واقعات کا حکم بھی قطعی ہوگا۔ جس کی تعمیل میں کسی خدا پرست کو کوئی کلام نہ ہونا چاہیے۔

[1] **انسان ایک حقیقت جامعہ کی تخلیق**...... حضراتِ کرام! حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی صنعت متقنہ سے انسان کو حقیقت جامعہ بنایا، اس کے باطن میں قوائے کمال ودیعت کئے اور اس کے ظاہر کو مختلف اعضاء جمال سے سنوارا۔

اعضاء کے خلقی وظائف اور ان سے ایک قرآنی اِستدلال...... پھر ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال وظیفہ عمل سپرد فرمایا۔ آنکھ بنائی کہ وہ دیکھے، کان دیئے کہ وہ سنیں، ناک دی کہ وہ سونگھے، زبان دی کہ وہ چکھے، ہاتھ دئے کہ وہ پکڑیں، پیر دیئے کہ وہ چلیں، جلد بدن دی کہ وہ چھوئے، زبان دی کہ وہ کھائے پیئے اور بولے، دماغ دیا کہ وہ عقل سے سوچے اور فکر کرے۔ غرض ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال وظائف عمل سپرد فرمائے۔ تا کہ وہ انہیں ادا کرتا رہے جس سے مقاصد تخلیق پورے ہوتے رہیں۔

اعضاء انسانی کے یہ فرائض جیسے بدیہی اور مشاہد ہیں۔ جنہیں تجربۃً اور بداہتاً ہر شخص دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ایسے

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۵.

ہی وہ شرعی بھی ہیں کہ ایماناً بھی انہیں تسلیم کرتا ہے۔ جب کہ انکے خالق نے ہی یہ وظائف ان کے لئے تجویز فرمائے اور اس کی اطلاع بھی دی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے کفار کو مخاطب فرماتے ہوئے ان کے فرضی معبودوں (بتوں اور مورتیوں) کے بے حس و بے شعور اور بے بس ہونے کو اس سے ہی واضح فرمایا کہ وہ اپنے ان مصنوعی اعضاء سے وہ کام ہی نہیں لے سکتے۔ جو قدرت نے ان اعضاء کے لئے رکھے تھے۔ تو یہ بے حس و معطل اور ناکارہ کیا خدا ہوتے؟ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۚ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۚ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۚ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ ① ''جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر (ان بتوں کو) پکارتے ہیں وہ انہی کی طرح خدا کی مخلوق ہیں۔ (خدا نہیں) پس چاہئے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو، کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں؟ (اور جب یہ بھی نہیں کہ وہ مخلوقاتی فرائض ہی انجام دے لیں تو وہ خالق کا کام کیا انجام دے سکیں گے کہ انہیں پکارا جائے''۔

اس آیتِ کریمہ سے جہاں اور بہت سے علوم برآمد ہوتے ہیں۔ وہاں یہ بھی بداہتاً واضح ہے کہ اعضاء انسانی میں ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال کچھ فرائض اور وظائف خلقتاً سپرد کئے گئے ہیں جیسے پاؤں کے لئے چلنا ہاتھوں کے لئے پکڑنا، آنکھوں کے لئے دیکھنا اور کانوں کے لئے سننا اور ان اعضاء کی زندگی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے خلقی فرائض کو انجام دیتے رہیں۔

[2] اعضاء کا عمل اور کائناتی عدل ...... اگر ہر ہر عضو سے وہی کام لیا گیا جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ تو مقاصد خلقت پورے ہوتے رہیں گے اور یہ کائنات انسانی عدل پر قائم رہے گی۔ جس کا نام احسان ہے۔ لیکن اگر کسی عضو کو معطل چھوڑ کر بے کار کر دیا گیا۔ تو یہ سفاہت و بدعقلی ہوگی۔ جس کا نام حرمان ہے اور اگر کسی عضو کو غیر کام پر لگا دیا گیا۔ تو یہ ظلم ہوگا جس کا نام خسران ہے اور ان دونوں کا مجموعہ تعدی یعنی حدود سے تجاوز ہوگا۔ جس کا نام کفران ہے۔

اس اِضاعت نعمت کو خواہ وہ ترکِ نعمت سے ہو۔ جس میں انتفاع کو عدم انتفاع سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو حرمان ہے یا بے محل استعمال سے ہو کہ اس میں صحیح مصرف کو غلط مصرف سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو خسران ہے۔ قرآن حکیم نے تبدیلی نعمت کہہ کر کفرانِ نعمت سے تعبیر فرمایا ہے اور فیصلہ یہ دیا ہے کہ: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ○ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ ② ''کیا آپ نے نہیں دیکھا ان کو جنہوں نے بدلہ اللہ کے احسان کا ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں۔ جو دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے''۔

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۹۴، ۱۹۵۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۸، ۲۹۔

عمل اعضاء کی غرض وغایت...... پھر قدرتی بات ہے کہ ان اعضاء کے طبعی وظائف واعمال کی کوئی غرض و غایت بھی ہونی چاہئے۔ ورنہ بے مقصد عمل لغو اور عبث ہوتا ہے۔ اس لئے ان تمام اعضاء کے مفوضہ کاموں کی بھی بلاشبہ ایک غرض وغایت ہے اور وہ حق طلبی اور پیروی حق ہے جس کا پروگرام شریعت ہے۔ اگر یہ تمام اعضاء اپنے اپنے وظائف عمل میں اسی غرض وغایت کے لئے حرکت کریں گے۔ تو اسی میں ان کی سلامتی اور دارین کی نجات ہے۔ ورنہ اگر انہوں نے اپنے یہ خلقی وظائف بجائے محبت حق کے عداوت حق کے مظاہرہ کے لئے بصورت بغاوت انجام دیئے۔ تو باوجود اپنے پورے وظائف خلقت انجام دے لینے کے۔ چونکہ وہ صحیح غرض وغایت کے لئے انجام نہیں دیئے گئے۔ اس لئے وہ ان کے حق میں وبالِ جان اور موجب ہلاکت وعذاب بن جائیں گے اور یہ اعضاء بجائے اس کے کہ اپنے نفس کے حق میں قیامت کے دن کوئی اچھی شہادت پیش کر سکتے اُلٹے اس کے خلاف گواہ بن کر مدمقابل آ جائیں گے اور عذاب کے لئے مضبوط حجت بن جائیں گے۔

قرآن کریم نے اعضاء بدن کی اس تبدیلی غرض یا مخالف غرض کام کرنے پر ان اعضاء کا مخالف نفس گواہ بن جانا اور اس کے عذاب کے لئے مُمد ومعاون ہو جانا ان الفاظ میں واضح فرمادیا ہے: ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ٥ حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۔ قَالُوْآ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ ① ''اور (ان کو وہ دن بھی یاد دلایئے) جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کفار) دوزخ کی طرف جمع کر (نے) کے (لئے موقف حساب میں) لائے جائیں گے۔ پھر وہ روکے جائیں گے (تاکہ بقیہ بھی آ جائیں) یہاں تک کہ جب وہ اس کے قریب آ جائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے اعمال کی گواہی دیں گے اور (اس وقت) وہ لوگ (متعجب ہو کر) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ اعضاء جواب دیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی؟ اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو''۔

بہرحال آیت کریمہ سے کائنات انسانی کے عدل واحسان پر قائم رہنے کی دو بنیادیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اعضاء بدن اپنے اپنے خلقی وظائف انجام دیں۔ معطل نہ رہیں کہ یہ حرمان ہے اور دوسرے یہ کہ صحیح غرض و غایت یعنی طاعت حق میں انجام دیں۔ مخالف غرض کاموں میں نہ لگیں کہ یہ خسران ہے اور ان کی جنس جس میں دونوں شریک ہیں، کفران ہے۔

سلطانِ بدن قلب کا عمل...... بہرحال جب کہ اس تمام اقلیم بدن میں ہر ہر عضو ایک صحیح وثابت غرض کے لئے اپنے وظائف عمل ادا کرنے کے لئے بنا ہے۔ تو ناممکن ہے کہ قلب جو اس ساری اقلیم بدن کا سلطان اور حکمران ہے

① پارہ: ۲۴، سورۃ فصلت، الآیۃ: ۱۹ تا ۲۱۔

اس کی کارفرمائی کی کوئی غرض وغایت نہ ہو۔ بالخصوص جب کہ اس کے جنود وعساکر اور خدمہ یعنی اعضاء بدن میں سے کوئی عضو بھی بے کار یا بلاوظیفہ کے نا کارہ، معطل اور بے مقصد نہیں بنایا گیا۔ تو یہ مَلِکُ الاعضاء کب بے کار بنایا گیا ہوگا اور کس طرح اسے بلاکسی وظیفہ کے معطل اور بغیر کسی صحیح غرض وغایت کے مہمل مان لیا جائے؟ مگر اس کا وظیفہ وہی ہوسکتا ہے جو سلاطین وملوک کا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بادشاہ کا کام محنت مزدوری نہیں۔ بلکہ رعایا اور اپنے خدمہ یا عمال حکومت کی نقل وحرکت پر نظر رکھنا، ہمہ وقت ان سے باخبر رہنا اور اس علم وخبر کی روشنی میں اقلیم کی تدبیر اور نگرانی کرتے رہنا ہے، کہ وہ اپنے اپنے مفوضہ فرائض پر لگے رہیں اور راست بازی کے ساتھ اپنے وظائف عمل کی غرض وغایت پوری کرتے رہیں۔

پس قلب کا سب بڑا کام اپنی اقلیم سے باخبر رہنا اور عملی طور پر اندرونی اور بیرونی امور میں جو باتیں اس کائنات بدن کے لئے مفید ہیں۔ انہیں فراہم کرنا اور جو اس کی غرض وغایت کے لئے مضر ہیں۔ انہیں دفع کرتے رہنا ہے تاکہ یہ اقلیم تن نہ اندرونی طور پر مفاسد اور تشویشات کا شکار ہو اور نہ بیرونی طور پر کسی غنیم کے حملہ کا ہدف اور نشانہ بنے۔ اس لئے قلب کے فوائد کا مختصر لفظوں میں خلاصہ یہ نکلا کہ وہ اندر اور باہر اور انفس وآفاق میں توجہ کر کے ان سے معلومات حاصل کرتا رہے اور اس علم کی طاقت پر اپنی اقلیم تن کو چلاتا رہے۔ اگر اس نے یہ فریضہ صحیح طور پر انجام دیا تو یہ تنہا اسی کی نہیں بلکہ ساری اقلیم تن کی صلاح وفلاح ہوگی۔ ورنہ وہ بھی فاسد ہو جائے گا اور اس کی ساری اقلیم بھی تباہی وبربادی کی آماجگاہ بن جائے گی۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: ''وَفِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ'' ''بدن (انسانی) میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور وہ جب فاسد ہوتا ہے۔ تو سارا دبدن فاسد ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ وہ قلب ہے''۔ ①

3 **قلب کا وسیلہ علم تفکر وتدبر**...... پھر جس طرح کانوں کے سننے کا لئے اِستماع یعنی سننے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ بغیر اس توجہ کے وہ سننے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے اور آنکھ کے دیکھنے کے لئے جس طرح استبصار یعنی دیکھنے کی طرف متوجہ ہو کر اپنی پتلیاں گھمانا ضروری ہے تاکہ وہ گرد وپیش کو دیکھ سکے کہ اس توجہ کے بغیر وہ بینائی کا وظیفہ ادا نہیں کرسکتی۔ اسی طرح قلب کو علم حاصل کرنے کے لئے استعلام یعنی علم کے لئے توجہ کرنی ضروری ہوگی کہ بغیر اس توجہ کے جس کا نام حرکت فکری یا تفکر وتدبر ہے۔ وہ علم آشنا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ناگزیر طریقہ پر قلب کو عالم خلق اور عالم امر کی طرف اپنی قوّتِ فکریہ کو دوڑانا پڑے گا اور تفکرّ وتدّبر کے وظائف انجام دینے ہوں گے۔ جب ہی وہ ظاہر وباطن کا علم حاصل کر کے کائنات بدن کی صحیح تدبیر کرسکے گا۔ اسلئے قرآن حکیم نے ان دونوں عالموں خلق اور امر کی طرف قلوب کو توجہ دلائی۔ عالم خلق میں اَنفُس کے بارے میں فرمایا ﴿وَفِي

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ج: ١ ص: ٩٠.

﴿ أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ ① ''اور تمہاری ذات میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا؟'' اور عالم خلق میں آفاق کے بارے میں فرمایا: ﴿أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ ''کیا وہ آسمان اور زمینوں کی پیدائش میں غور نہیں کرتے؟'' اور عالم امر کے بارے میں فرمایا: ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ ② ''تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے''۔

گو یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حرکت فکری اور توجہ کے بعد قلب کو علم حاصل ہو ہی جائے اور وہ صحیح علم تک پہنچ ہی جائے۔ جیسا کہ بعض اوقات کان توجہ کریں اور سنائی نہ دے، ہلال دیکھنے کے لئے آنکھ نظریں لڑائے اور نظر نہ آئے۔ جیسا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات اچانک نظر ڈالتے ہی آنکھوں کو ہلال نظر آ جائے اور کانوں میں اچانک کوئی بات پڑ جائے اور وہ سن لیں۔ اسی طرح قلب کے لئے توجہ اور فکر شرط ہے خواہ علم حاصل ہو یا نہ ہو۔ گو بعض اوقات کبھی ادنیٰ توجہ ہی سے قلب میں علوم القاء ہو جاتے ہیں اور بے محنت پکی پکائی مل جاتی ہے۔ مگر قانونی عادت یہی ہے کہ توجہ ہی سے علم کا ثمر شیریں سامنے آتا ہے۔ جو حصول علم کی شرطِ اوّلین ہے۔

④ بدن کا ہر ہر عضو صاحبِ ادراک وشعور ہے...... اس موقعہ پر یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس سلطان الاعضاء (قلب) کے حاکم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کائنات بدن میں اور کوئی عضو عالم نہیں۔ بلکہ ''اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ'' کے طبعی اصول پر اس کائنات بدن کا ہر ہر حصہ اور ہر ہر عضو علم واحساس سے بہرہ ور ہے اور اقلیم بدن کا ریشہ ریشہ احساس وادراک کا ذخیرہ درجہ بدرجہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

آنکھ کے دیکھنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسے صورتوں کا علم ہو جائے۔ کان کے سننے کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ اسے آوازوں کا علم وادراک ہو جائے، زبان کے چکھنے کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہیں کہ اسے ذائقوں کا علم ہو جائے، ناک کے سونگھنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے خوشبو یا بدبو کا ادراک ہو جائے، ہاتھ، پیر اور عام جلد بدن کے چھونے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ انہیں کسی جسم کی سختی، نرمی اور گرمی، ٹھنڈک کا ادراک ہو جائے وغیرہ۔ جس سے واضح ہے کہ کائنات بدن کا ذرہ ذرہ ادراک وشعور اور علم کی مختلف قوتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور اپنی اپنی معلومات کی فراہمی میں مشغول ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ سارے کا سارا انسان علمی قوتوں سے لبریز اور اندر باہر سے باشعور ہے۔ جب کہ ان کا حکمران (قلب) علوم ومعارف کا سرچشمہ ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ان میں کس کا علم اصلی ہے اور کس کا فرعی اور جزوی۔ لیکن بہر حال جب کہ ان سب میں ادراک کسی نہ کسی شان سے موجود ہے۔ تو کسی بھی عضو کے علم وادراک سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اعضاء کے ادراک کی تین قوتیں...... بنا بریں ان اعضاء ادراک کی ان مختلف نوعیتوں کو سامنے رکھ کر کہا

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۲.

جا سکتا ہے کہ ظاہر نظر انسان کے علم و ادراک کی تین قوتیں ہیں۔ جو ان اعضاء میں حسب مناسبت پھیلی ہوئی اور منقسم ہیں۔ ایک حس جو مختلف نوعیّتوں کے ساتھ مختلف بدن میں فرق مراتب کے ساتھ قائم ہے اور اپنے اپنے دائرہ محسوسات میں مختلف اشیاء کو اپنے اپنے رنگ احساس سے محسوس کرتی ہے۔

دوسری عقل جو دماغ میں رچی ہوئی ہے اور امُو رِ معقولہ کو ایک خاص شعور کے ساتھ اَخذ کر کے اپنے اپنے مواقع پر صرف کرتی ہے۔

تیسری قوت وجدان ہے۔ جو قلب میں جا گزیں ہے اور ماوراء طبعیات تک اس کی رسائی ہے کہ وہاں سے بھی وہ علوم کھینچ لاتی ہے۔ جہاں حواس و عقل گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

پہلی دو قوتوں (حس اور عقل) کے عمل کا میدان یہ محسوس جہاں ہے۔ جس سے انہیں معلومات کا ذخیرہ ملتا ہے۔ حس کو جزئیات کا اور عقل کو کلیات کا اور آخرت کی قوت یعنی وجدان صحیح کے عمل کا میدان غیب کا جہان ہے۔ جس پر وہاں سے علوم کا ترشح ہوتا ہے اور آیاتِ خداوندی اترتی ہیں خواہ وہ جزئیاتی ہوں یا کلیاتی۔

اگر جزئی ہیں تو ان کے مظاہر عمل حس کے ادراک میں بھی آ جاتی ہیں اور اگر کلیاتی ہیں تو ان کی علمی صورتیں عقل پر بھی منکشف ہو جاتی ہیں اور خالص وجدانی اور غیبی ہیں تو قلب کے زاویوں میں بامانت جا گزیں رہتی ہیں۔ علم اور حظ سے قلب ہمہ وقت و معمور اور مسرور ہوتا ہے۔ لیکن سرچشمہ ان سب کا غیبی ہی جہاں ہے۔ جس سے یہ علوم کبھی سماع سے قلب میں آتے ہیں کہ کوئی ہاتف غیبی خبر دے، کبھی الہام خداوندی سے قلب پر وارد ہوتے ہیں کہ قلب اچانک انہیں محسوس کرنے لگے۔ کبھی علم اور عرفانی تجربات سے خود بخود دل میں ابھر آتے ہیں کہ دل ان کا مورد ہو جائے۔ کبھی تربیت یافتہ عقل باطن کی روشنی سے ان کی انواع متمیز ہو جاتی ہیں۔ جس کی صورت ملکہ اجتہاد، و استنباط ہے اور کبھی عقل ظاہر کی سوچ بچار اور فکر و تدبر سے منکشف ہو جاتے ہیں جیسے عام علمی لطائف و نکات وغیرہ۔ مگر بہر حال یہ سب وجدانی علوم کہے جائیں گے جن کا تعلق حواس یا عقل طبعی سے براہ راست نہیں ہوتا۔

قرآن کریم سے وسائل ادراک کی تعیین...... قرآن حکیم نے ان سب صورتوں کی بنیادیں خود ہی قائم فرمائی ہیں اور ان مختلف الانواع آیاتِ الٰہی سے کچھ سیکھنے اور لینے کے لئے انہی مذکورہ وسائل سماع، فکر، علم اور عقل و انکشاف کا ذکر فرمایا ہے کہ یہی وہ وسائل ہیں۔ جو آیات الٰہیہ سے کچھ سبق لیتے ہیں اور علم کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً انسان ہی میں سے انسان کا جوڑا نکل آنے اور ان میں اچانک انس و مودت قائم ہونے کی قدرتی نشانیوں کو سمجھ لینے کا ذریعہ فکر کو بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ ① ''اس میں بہت پتہ کی باتیں ہیں ان کے لئے جو دھیان کرتے ہیں یا مثلاً زمین، آسمان کی پیدائش اور انسانوں کی زبانوں کے اختلاف اور رنگوں کے تفاوت سے جو سبق لیں اور ان میں قدرت کی نشانیاں دیکھیں، اس کا ذریعہ علم کو فرمایا گیا: ﴿اِنَّ فِیْ

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

﴿ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ﴾ ① ''اس میں بہت نشانیاں ہیں جانکاروں کے لئے''۔

یا مثلاً دن اور رات میں انسان کے سونے جاگنے کا انقلاب اور روزانہ قدرتی خزانوں سے اپنا رزق ڈھونڈھ نکالنے میں قدرت کی جو نشانیاں مخفی ہیں۔ ان تک پہنچنے کا ذریعہ سماع قبول بتلا دیا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ﴾ ② ''اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو بات سنتے ہیں''۔

یا مثلاً بجلی کی کڑک اور اس سے خوف وطمع کا دلوں میں من اللہ ورود، پھر آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دکھانے کی نشانیوں سے عبرت پکڑنا عقل کا کام بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ ③ ''اس میں بہت پتے ہیں عقل والوں کے لئے''۔

یا مثلاً قرون ماضیہ اور پچھلی امتوں کی تباہی اور باوجود ان کی عظیم طاقت وقوت کے برے دن آنے پر انہیں پناہ نہ مل سکنے کی عبرت ناک صورتوں سے درس عبرت لینا قلب کا کام بتلایا گیا ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ﴾ ④ ''اس میں سوچنے کی جگہ ہے۔ اس کو جس کے اندر دل ہے یا لگائے کان دل لگا کر''۔ بہر حال فکر، علم، سمع، عقل، وجدان ہی وہ اسباب شمار کر دیئے گئے ہیں جن سے مخفی علوم کا انکشاف ہوتا ہے۔ جو اوپر کے دعویٰ کیلئے ایک واضح اور قطعی دلیل ہے۔ غرض انسان میں عموماً علم آنے کے یہی تین راستے ہیں یا تین قوتیں ہیں۔ (حس، عقل، وجدان) جو اعضاء ادراک کے ذریعہ ادراک واحساس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مگر جبکہ ظاہر نظر میں ادراک، کا عمل ان کے اعضاء ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے عالم ومدرک ان اعضاء ہی کو کہا جاتا ہے اور انہی پر اس علم واحساس کی صحت وسقم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ دیکھنے والا آنکھ ہی کو کہا جائے گا۔ مخفی طور پر دیکھنے کا کام قوت باصرہ کا ہے اور سننے والا کان ہی کو کہا جائے گا۔ حقیقتاً سننے والی طاقت قوتِ سامعہ ہے وغیرہ۔

اعضائے اِدراک کا باہمی فرقِ مراتب...... البتہ علمی کمال ونقصان کے اعتبار سے ان اعضاء کے علم وادراک میں یکسانی نہیں۔ بلکہ تفاوت اور فرق مراتب کافی ہے، کوئی عضو وسیع العلم ہے اور کوئی ناقص العلم، کوئی عمیق العلم ہے اور کوئی سطحی العلم جس کا معیار یہ ہے کہ جو عضو اپنے علم وادراک سے شئی معلوم کی ذات اور اصلیت وحقیقت کا پتہ چلا سکتا ہے۔ اس کے علم کو کامل اور عمیق کہا جائے گا اور یہی علم صحیح معنی میں علم حقیقی کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اور جس کا ادراک شئی کے محض ظواہر رُسوم اور عوارض تک محدود رہ جانے سے شے کی تمام حقیقت سامنے نہ آسکے، تو اس کے علم کو ناقص، سطحی اور ظاہری کہا جائے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شے کے ان رسوم وعوارض اور خواص وآثار میں جو عوارض حقیقت سے قریب ہوں گے۔ اسی حد تک ان کا علم ادراک علم حقیقت سے اقرب اور اس سے

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۳۔ ③ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۴۔
④ پارہ: ۲۶، سورۃ قٓ، الآیۃ: ۳۷۔

اشبہ کہلائے گا اور اسی درجہ میں اس عضو کی شرافت دوسرے اعضاء پر تسلیم کی جائے گی اور جس حد تک یہ عوارض کا علم، علم حقیقت سے بعید ہوگا۔ اسی حد تک اسے ناتمام، ناقص اور غیر حقیقی علم کہا جائے گا۔

اسی صوری و حقیقی اور سطحی و عمیق علم کا عنوان سامنے رکھ کر یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ صورت جیسے ایک کھلی چیز ہے۔ جو سب کے سامنے ہوتی ہے ایسے ہی حقیقت ایک باطنی اور مخفی چیز ہے۔ جو ان ظاہری حواس سے محسوس نہیں ہوتی اور سب جانتے ہیں کہ حقیقت صورت سے افضل ہوتی ہے کہ صورت کے وجود کا سرچشمہ ہی حقیقت ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکال لینا آسان ہے کہ علم حقیقت یا علم ارواح یا علم باطن اور اس کے متعلقات کا علم، علم اعلیٰ ہوگا اور علم صورت یا علم اجسام یا علم رنگ و بو اور ان کے متعلقات کا علم، علم ادنیٰ ہوگا اور اسی تناسب سے ان علوم کے ادراک کرنے والے اعضاء میں بھی اعلیٰ ادنیٰ کا فرق ہوگا۔

پھر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظروں سے اوجھل نہ رہنی چاہئے کہ ظواہر اور صور اشکال چونکہ محدود اور بہت سی حد بندیوں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے۔ بلکہ صورت نام ہی حد بندی کا ہے۔ اس لئے ہر ایک شکل اپنی حد میں رہ کر ہی دوسری شکلوں سے ممتاز اور متعارف ہوتی ہے۔ اس لئے ان ظواہر کے علم حاصل کرنے میں بھی حد بندی اور قیود و شرط ناگزیر ہیں کہ انہی حدود میں یہ اعضاء ادراک، ان کا ادراک واحساس کر سکتے ہیں۔ اگر یہ قیود و حدود توڑ دی جائیں تو علم واحساس ہی کا وجود ناممکن ہو جائے گا۔ جیسا کہ آئندہ ان قیود کی تشریح آ رہی ہے۔

اس لئے یہ اصولی دعویٰ بآسانی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جس عضو کے علم و ادراک میں ظواہر کی قیود و شروط بڑھتی جائیں گی۔ اتنا ہی اس کا علم رسمی، سطحی، جزوی اور محدود ہوتا چلا جائے گا۔ جس کا نفع بھی محدود اور ادنیٰ ہوگا اور اسی حد تک یہ عضو بھی ادنیٰ الاعضاء شمار ہوگا اور جتنا کوئی عضو اپنے علم و ادراک میں رسمی قیود و حدود سے آزاد ہوتا چلا جائے گا۔ اتنا ہی اس کا علم بھی وسیع، گہرا اور حاوی و شامل ہوتا جائے گا اور اسی حد تک یہ عضو بھی اشرف الاعضاء شمار ہوگا۔

[5] اعضائے اِدراک کے علم کا باہمی تفاوُت...... اس معیار کو سامنے رکھ کر جب ہم اس انسانی ہیکل یا کائنات بدن پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں علم و ادراک کے لحاظ سے سب اعضاء یکساں نہیں ہیں۔ کوئی ذکی الحس ہے اور کوئی غبی اور بلید الحس ہے۔ کسی کا علم اونچا ہے اور کسی کا علم پست، کسی کا وسیع ہے اور کسی کا تنگ اولاً محسوسات ہی کو لیا جائے۔ تو ان میں بھی یہ تفاوت کافی نمایاں ہے۔

مثلاً چھونے کی قوت جسے قوّتِ لامسہ کہتے ہیں۔ سب سے زیادہ بلید اور غبی قوت ہے۔ جس کا علم بہت سی قیدوں کے ساتھ مقید اور بہت سی حدود میں جکڑا ہوا ہے۔ اس میں اولین شرط تو یہی ہے کہ وہ جس شے کی ادراک کرے وہ جسمانی ہو، روحانی یا معنوی نہ ہو کہ روحانیت کا علم و ادراک اس کی دسترس سے باہر ہے۔

دوسرے یہ کہ اس جسم کو بھی وہ دور سے معلوم نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ اس سے آ کر لگ نہ جائے اور یہ اسے چھو نہ دے یعنی اس کے لئے اپنے معلوم سے محض قرب و اتصال کافی نہیں۔ بلکہ الصاق اور مل جانا ضروری

ہے اور پھر اس نہائی اتصال یعنی ٹکراؤ کے باوجود بھی اسے کسی شے کا شخصی تمیز حاصل نہیں ہوتا صرف جنسی یا نوعی امتیاز کا ادراک ہوتا ہے، اور وہ بھی مبہم اور اجمالی یعنی کسی چیز کو چھو کر اس چیز کی سختی، نرمی، گرمی، ٹھنڈک کا احساس ہوسکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ لکڑی ہے یا پتھر، لوہا ہے یا مٹی یعنی زیادہ سے زیادہ اس کی نوعیت کا علم ہوسکتا ہے۔ اس کی شخصیت کا مشخص اور ممتاز علم نہیں ہوسکتا کہ وہ شخصی طور پر کیا ہے اور کون ہے؟

یعنی نوع کے ان عوارض سے بھی وہ کسی فرد کی تشخیص کر کے اس کی ذات کے بارے میں کوئی غیر مبہم علم حاصل نہیں کر سکتی۔ حالانکہ کسی شئے کا جسم ظاہر ترین اشیا ہے۔ جس میں کوئی خفا نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود اس موٹے اور نمایاں جسم کو بھی یہ قوت بغیر ٹٹولے اور بغیر اس سے لگے لپٹے اسے یا اس کے بعض عوارض کو محسوس نہیں کر سکتی۔ تو اس سے زیادہ غبی اور بلید اور کون سی قوت ہوگی۔

پس علم کی وہ حقیقت جس کا نام تمیز بین الاشیاء ہے۔ اسے بہت ہی معمولی درجہ کی نصیب ہوئی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ یہ قوت انسانی مدرکات میں نہایت کم رتبہ اور حقیر قوت ہے۔ جس کے علم کو نام ہی کے درجہ میں علم کہہ سکتے ہیں ورنہ وہ لاعلمی اور جہل سے ہی زیادہ قریب ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ قوت لامسہ کے ذریعہ کسی چیز کو چھو کر احساس کر لینا کوئی خاص کمال نہیں، ایک غبی سے غبی اس قوت کے ذریعہ موٹے موٹے مادوں کا ادراک واحساس کر سکتا ہے۔ جس میں صلاحیت بھی نہ ہو کہ چھو کر بھی کسی شئے کو کسی حد تک معلوم کر لے۔ تو اس سے زیادہ احمق اور جاہل اور کون ہوسکتا ہے؟ اسے تو جاندار کے بجائے پتھر اور لکڑی کہا جائے گا۔ تو یہی اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔

چنانچہ قرآن کریم نے کفار کا قرآن کے ساتھ عناد اور انکار ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ”یہ منکر ایسے بلید الحس اور غبی الفہم ہیں کہ اگر وہ کتاب الٰہی کو دیکھ بھی لیں اور اسے ہاتھ سے چھو بھی دیں۔ تب بھی وہ اس کا انکار ہی کریں گے“۔ ظاہر ہے کہ کسی شے کے ظہور وشہود کا اس سے آگے اور درجہ ہی کون سا ہے کہ اسے دیکھ بھی لیا جائے اور چھو بھی دیا جائے اور پھر بھی وہ شے دماغ میں نہ اترے تو انہیں حیوان بھی نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ انسان کہا جائے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ (۱) ”اور اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرماتے۔ پھر یہ لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے۔ تب بھی یہ کافر لوگ یہ ہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے۔ قرآن کے اس بیان تنزل سے واضح ہوا کہ اس کی نظر میں قوت لامسہ غبی ترین قوت ہے جس کا ادراک نہایت ہی گھٹیا درجے کا علم ہے۔ جو محض جسم کو نوع اور جسم کے اوپر نمایاں عوارض، طول وعرض اور عمق کے ادراک سے آگے نہیں بڑھتا اور وہ بھی ٹٹول کر جس میں پورا ابہام رہتا ہے۔ کوئی خاص تمیز حاصل نہیں ہوتی۔ تا کہ کسی نوع کے اشخاص وافراد متمیز ہو جائیں۔ اس لئے اس کے علم کو علم کہنا درحقیقت علم سے لاعلمی کا اظہار کرنا ہے۔ اور اس

---

(۱) پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷.

لئے اس کے ذریعے ایسے مبہم علم کا حاصل کرنے والا اہلِ علم میں شمار نہیں ہوسکتا۔

6 قوتِ ذائقہ...... دوسری قوت ذائقہ ہے جس کا محل زبان ہے۔ وہ کھٹے میٹھے کا پتہ چلا لیتی ہے جو ایک باطنی خاصہ ہے۔ لیکن یہ قوت بھی اس وقت تک کسی چیز کے مزے کا ادراک نہیں کرسکتی۔ جب تک کہ ذائقہ دار چیز کو زبان سے ملا نہ دیا جائے۔ اس لئے یہاں بھی وہی اِتصال تام بلکہ الصاق اور شئے کے لگ جانے کی شرط ہے جو قوتِ لامسہ میں تھی کہ یہ بھی بغیر اپنے محسوس سے لگے ہوئے ذائقہ کا ادراک نہیں کرسکتی اور جتنا بھی کرتی ہے وہ شے کے عوارض کھٹے میٹھے تک ہی محدود ہے۔ جس سے شے کی حقیقت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے اسے بھی قوت لامسہ کا ایک فرد سمجھنا چاہیئے۔ فرق اتنا ہوگا کہ لمس ومس کی قوت جب ہاتھ پیر اور جلد بدن کے ذریعہ اپنا کام کرتی ہے تو جسم کی سختی اور نرمی اور گرمی، ٹھنڈک کا احساس کرتی ہے اور جب زبان کے ذریعہ کام کرتی ہے تو ذائقے اور مزے کا احساس کرلیتی ہے بلکہ اسی کا ایک فرد قوت شہوانی بھی ہے۔ جو حقیقتاً قوتِ لامسہ ہی ہے کہ بغیر اپنے محسوس سے لگے ہوئے لذت کا احساس نہیں کرسکتی ہے۔ پس یہی لامسہ جب اعضاء شہوت پر ظاہر ہوتی ہے تو شہوانی لذتوں کا ادراک کرلیتی ہے۔ لیکن لامسہ کی ان سب قسموں میں قدرِ مشترک یہی ہے کہ وہ کسی جسم سے لگیں اور چمٹیں تب ہی ادراک کرسکیں گی بغیر اس کے یہ جسمانی خواص وعوارض ان کے احساس میں نہیں آسکتے۔ فرق اگر ہے تو قوت کا نہیں محل کا ہے۔ یعنی جس محل میں لگنا اور چھونا واقع ہوگا اسی محل کے عوارض احساس میں آجائیں گے کہیں سختی نرمی کہیں مزہ اور ذائقہ اور کہیں لذات شہوت وغیرہ البتہ ان میں سے بعض ظاہر بدن کے عوارض ہیں اور بعض باطن بدن کے اور بعض باطن بدن سے بھی گذر کر نفس کے اور اسی لحاظ سے ان میں فرق مراتب ہے کہ بعض اس سے اعلیٰ ہیں۔ جیسے مزہ اور ذائقہ کہ وہ فی الجملہ باطن جسم سے متعلق ہیں اور بعض اس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ جیسے لذت شہوت کہ وہ بدن کی گہرائیوں میں نفس کے عوارض سے متعلق ہیں اور بعض اس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ جو ایک باطنی کیفیت ہے مگر اس فرق کے باوجود ان سب میں قدرِ مشترک وہی لمس ومس (لگنا اور چھونا) ہے۔ اس لئے یہ سب قوت لامسہ ہی کے افراد شمار کئے جائیں گے۔ جنہیں کسی شے کی حقیقت وماہیئت کی دریافت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس قوت لامسہ کے لمس ومس یعنی لگنے چھونے کو بعض جگہ ذوق سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی رو سے بھی قوت لامسہ ذائقہ ہی کا ایک فرد ہے۔ چنانچہ روز قیامت عذاب نار اور عذاب سقر (جہنم) میں بدن سے مس کرے گا۔ جب ہی اس کی اذیت محسوس ہوگی۔ لیکن اس مس کو قرآن حکیم میں چکھنے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ (۱) ''سقر (عذاب جہنم) کے چھونے کا مزہ چکھو''۔

جس سے لامسہ اور ذائقہ کا ایک دوسرے سے قریب ہونا معلوم ہوا یا جیسے موت ایک چھونے کی چیز ہے جس

(۱) پارہ: ۲۷، سورۃ القمر، الآیۃ: ۴۸۔

کے لگنے سے روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے لگنے ہی کو قرآن نے چکھنے سے تعبیر فرمایا۔ جیسے ارشاد حق ہے۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ① ''ہر نفس کے لئے موت کا مزہ (چکھنا) ہے''۔

پس چیز چھونے کی تھی، جس کا تعلق لمس اور مس سے تھا اور اسے تعبیر کیا گیا ذائقہ سے۔ یا جیسے قرآن کریم نے جہاں ایک بستی کے کفرانِ نعمت پر جسے رزق ہر طرف سے دیا جارہا تھا۔ اس کا نتیجہ بدظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ ② ''اللہ نے انہیں لباس جوع وخوف کا مزہ چکھادیا''۔

ظاہر ہے کہ عذاب مس کرنے کی چیز ہے اسی لئے تو اسے لباس فرمایا گیا کہ جیسے لباس بدن سے چپک جاتا ہے۔ ایسے ہی عذاب بھی اس بستی کے تن پر لباس کی طرح چست ہو گیا کہ نہ وہ اسے جلدی سے اتار سکتے تھے نہ اس کی اذیت سے بچ سکتے تھے۔ لیکن اس اذیت اٹھانے کو قرآن نے چکھنے سے تعبیر فرمایا کہ اللہ نے اس بستی کو عذاب جوع وخوف کے لباس کا ذائقہ چکھادیا۔

جس سے واضح ہے کہ وہ لباس کا چھونا تو بدن سے لگنے اور چمٹنے کی چیز ہے، مگر چونکہ وہ تاثر کے لحاظ سے چکھنے سے اَقرب ہے۔ اس لئے اسے ذائقہ سے تعبیر فرمایا گیا۔ جس سے قرآنی روشنی میں بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ کہ ذائقہ کی قوت لامسہ کی قوت سے الگ نہیں بلکہ اسی کا ایک فرد ہے یہ الگ بات ہے کہ قوت ذائقہ، لامسہ کا ایک اونچا فرد ہے۔ مگر جب کہ وہ لامسہ ہی ہے اور لمس ومس ہی پر اس کے ادراک کا دارومدار ہے تو اسے لامسہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور جو حکم لامسہ کا ہوگا، وہی اس کا بھی ہوگا۔ سو لامسہ کسی شے کی حقیقت کا انکشاف نہیں کرسکتی بلکہ صرف اس کے بعض بدنی عوارض ہی کے ادراک تک محدود ہے۔

ایسے ہی ذائقہ بھی خواہ زبان سے چکھنے کا ہو یا اعضاء شہوت سے چکھنے کا رہے گا عوارض بدن کی کے پہچان کی حد تک' اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے قوت ذائقہ کا علم بھی ادنی ہی درجہ کا علم ثابت ہوا۔ جسے علم کی فہرست میں کوئی اونچا مقام نہیں دیا جاسکتا اور اس کے مدرک و عالم کو اقلیم تن کے علماء کی فہرست میں شمار نہیں کیا جائے گا کہ یہ کوئی معتد بہ علم ہی نہیں۔

⑦ قوتِ شامّہ...... رہی قوت شامّہ (سونگھنے کی قوت) سو وہ بلاشبہ اپنی کارفرمائی میں بظاہر لامسہ اور ذائقہ کے طرح لمس ومس کی محتاج نہیں۔ بلکہ جسم سے ملے بغیر دور ہی سے خوشبو یا بدبو کا احساس کرلیتی ہے۔ اس لئے اس قوت کو قوت لامسہ کی طرح بلید الحس اور ضعیف الاحساس نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ذکی الحس باور کیا جائے گا، کیونکہ وہ کسی شے کی خوشبو، بدبو سونگھنے میں اس کی محتاج نہیں کہ خوشبو دار چیز کو ناک سے رگڑا جائے۔ جب ہی وہ اس کی خوشبو کا ادراک کرے۔ بلکہ وہ دور سے بھی خوشبو کو محسوس کرلیتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی قوت لامسہ سے کچھ دور

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۵۷. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۱۲.

نہیں۔ کیونکہ اس میں خوشبودار شے کا ناک سے لگ جانا ضروری ہے۔ خواہ اسے ہوا ہی لا کر لگائے۔

چنانچہ پھول کہیں رکھ دیئے جائیں۔ تو سارا مکان مہک جاتا ہے اور ہر ناک اسے دور سے ہی سونگھ لیتی ہے یا کسی پھول دار درخت کے پھولوں کی خوشبو بعض اوقات بیسیوں گز دور سے محسوس کر لی جاتی ہے جو ہوا کا کرشمہ ہے گو درخت ناک کے قریب نہیں۔ لیکن اس سے سونگھنے کی قوت کی کوئی فوقیت یا لطافت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہوا کہ لطافت ثابت ہوتی ہے کیونکہ ناک کی قوت درخت تک نہیں جاتی بلکہ ہوا اس کی خوشبو کو ناک تک کے لے آتی ہے، اور ناک اسے جب ہی سونگھتی ہے کہ وہ خوشبو اڑ کر ناک تک آ جائے اور اسے لگ جائے۔ فرق اتنا ہے کہ لامسہ اور ذائقہ میں ذائقہ دار چیز کا مزہ اور ذائقہ زبان تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کہ خود اس چیز کو زبان سے نہ ملا دیا جائے۔ لیکن خوشبو ذائقہ اور مزہ سے اس حد تک ضرور لطیف ہے کہ اپنے محل یعنی پھول وغیرہ سے الگ ہو کر اور اڑ کر ناک تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر ناک اسے جب ہی محسوس کرے گی کہ وہ ناک سے آ لگے پس لامسہ میں خود جسم آ کر لگتا ہے۔ تب ہی وہ احساس کرتی ہے اور شامہ میں جسم کے یہ عوارض یعنی خوشبو یا بدبو آ کر ناک کو لگتے ہیں۔ تب وہ ان کا احساس کرتی ہے۔ خواہ وہ ہوا ہی کے ذریعہ آئیں مگر مس کرنا بہر حال ضروری رہا۔ ورنہ سونگھنے کی قوت ادراک سے عاجز رہ جائے گی۔ اس لئے سونگھنے کی قوت بھی چھونے کے قوت سے اپنی کارکردگی میں کچھ زیادہ فائق نہیں ثابت ہوئی۔ فوقیت اگر ہے تو ان کے محسوسات میں ہے کہ ایک کا محسوس کثیف ہے اور ایک کا لطیف لیکن حاسے دونوں کے یکساں ہیں۔ پر اس میں بھی یہ چھونے اور چکھنے کی قوتیں یکساں ہی ہیں کہ شے کی حقیقت کا ادراک ان میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتی صرف عوراض شے کا احساس کرتی ہے۔ اس لئے گو بعض جہات سے قوت لامسہ اور ذائقہ پر کچھ فائق سہی۔ مگر شرائط ادراک اور نوعیت ادراک میں سب قریب ہی قریب ہیں۔

پھر یہ سب قوتیں صرف اجسام ہی میں اپنا کام کر سکتی ہیں نہ کہ ارواح و حقائق میں۔ چنانچہ روح نہ چھوئی جا سکتی ہے نہ ٹٹولی جا سکتی ہے اور نہ ہی چکھی جا سکتی ہے۔ اور پھر سب میں وہ اتصال اور لگنے کی شرط بھی مشترک ہے کہ جب ان کا محسوس ان سے آ کر ملے جب ہی وہ ادراک کر سکتی ہیں ورنہ نہیں اور ادھر ان سب کی سب کا ادراک پھر بھی عوارض جسم ہی تک محدود ہے، ذات تک ان میں سے کسی کی بھی رسائی نہیں کہ اسے معلوم کر لیں۔ اس لئے اس سونگھنے کی قوت کا علم و ادراک بھی کچھ زیادہ معتد بہ اور قابل شمار ثابت نہ ہوا۔

8 قوتِ شامّہ کے جزوی علم پر قرآنی استشہاد...... قرآن حکیم سے بھی اس کی طرف راہنمائی ملتی ہے کہ محض سونگھ لینا کوئی خاص اور امتیازی شان کا علم نہیں۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خوشبوئے یوسف سونگھ لینے کی حکایت سے جو قرآن نے کی ہے۔ اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ﴿اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ ① ''میں (یعقوب علیہ السلام) یوسف کی خوشبو پاتا ہوں کہیں تم مجھے جھٹلا نہ دو''۔

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۹۴۔

آیت میں ریح یوسف فرمایا گیا ہے محض ریح اور خوشبو نہیں کہہ دیا گیا ہے یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ایک خوشبو پاتا ہوں۔(معلوم نہیں کس کی ہے؟) بلکہ یہ فرمایا کہ میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں۔جس میں خوشبو والے کا علم بھی شامل تھا۔جو ایک مشخص اور واقعاتی علم ہے۔تو انہیں اس کی بھی فکر ہوئی کہ کہیں اسے جھٹلا نہ دیا جائے۔جو ایک حقیقت واقعہ کی تکذیب ہوگی۔ورنہ اگر مطلقاً کسی خوشبو سونگھ لینے کی بات ہوتی تو جھٹلانے کی فکر نہ ہوتی۔کیونکہ مطلقاً کوئی خوشبو ناک میں آجائے تو خود سونگھنے والے کو بھی تردد لاحق ہوسکتا ہے کہ یہ کس چیز کی خوشبو ہے۔اس لئے اگر دوسروں کو بھی اس میں تردد لاحق ہو اور وہ اسے جھٹلا دیں تو جھٹلا دینے کی کوئی بھی فکر سونگھنے والے کو نہیں ہوتی، کہ وہ خود بھی کسی متمیز حیثیت تک پہنچا ہوا نہیں جھٹلانے کی یہ فکر جب ہی ہوتی ہے کہ ناک میں معین شئے کی خوشبو آئے اور اس علاقہ کے ساتھ آئے کہ یہ فلاں کی خوشبو ہے، کسی اور کی نہیں تو یہ ایک متمیز اور معتد بہ علم ہوتا ہے جسے جھٹلانے کا کوئی واقعہ نہیں۔

پس آیتِ کریمہ سے صاف واضح ہے کہ خوشبوئے معین جس میں خوشبو والا بھی مشخص ہو علم ہے جو قابل تکذیب نہیں۔اس کا اقتضائی نتیجہ یہ نکل آتا ہے کہ مطلقاً خوشبو سونگھ لینا جس میں خوشبو والا ذہن میں مشخص نہ ہو۔کوئی معتد بہ علم نہیں اور ظاہر ہے کہ ناک کا علم اتنا ہی ہے کہ وہ خوشبو سونگھ لے نہ کہ اس کے ساتھ خوشبو والے کو بھی مشخص کرے کہ یہ ناک کا کام نہیں، ذہن کا کام ہے۔تو قرآن سے بطور اقتضائے نص واضح ہوگیا کہ ناک کا علم جس میں صرف خوشبو ذہن میں حاضر ہوتی ہے خوشبو والا مشخص نہیں ہوتا۔کوئی اعلیٰ علم نہیں کیونکہ ناک بنائی ہی گئی ہے، صرف خوشبو کا ادراک کرنے کے لئے نہ کہ خوشبو والی اشیاء کی تشخیص کے لئے۔

قوت لامسہ، ذائقہ اور شامہ کا علم کوئی معتد بہ علم نہیں ہے......اس لئے جیسے چھونے اور چکھنے کا علم نصوص قرآنی کی روشنی میں کوئی اعلیٰ علم ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس پر دور رس نتائج و ثمرات مرتب ہوں بلکہ محض ایک جزوی علم تھا۔ایسے ہی سونگھنے کا علم بھی اس آیتِ قرآنی کی روشنی میں کوئی اونچا علم نہیں نکلتا کہ اس پر دین و دنیا کے کچھ دور رس اور اہم ثمرات مرتب ہوں۔بلکہ ایک جزوی علم ثابت ہوتا ہے جس سے نہ کسی شے کی تمام حقیقت واضح ہوتی ہے اور نہ خود شے ہی متمیز ہوتی ہے۔اس لئے ناک بہر حال پھر اپنے ہی جزوی علم کے مقام پر آکر ٹھہر گئی اور اسے کوئی اصولی فوقیت ہاتھ، پاؤں اور زبان پر حاصل نہ ہوسکی، اس پر ثمرات بھی جزوی مرتب ہوں گے جو قابل شمار نہ ہوں گے۔اب جب کہ چھونے، چکھنے، سونگھنے یعنی قوتِ ذائقہ، قوتِ شامہ اور بالفاظ دیگر ہاتھ، پیر، زبان اور ناک کا علم معتد بہ نہ رہا۔بلکہ ایسا جزوی ثابت ہوا کہ ان پر انسان کے حق میں کچھ دور رس نتائج مرتب نہیں ہوتے۔

معتد بہ علم آنکھ کان اور قلب ہی کا ہے......اس لئے مدرک اعضاء میں اب تین ہی بنیادی اعضاء رہ جاتے ہیں کہ ان کے علم کو ان مذکورہ اعضاء کی نسبت سے معتد بہ علم کہا جائے۔آنکھ، کان اور قلب یعنی دیکھنے کا علم، سننے کا علم اور سمجھنے کا علم جن کے علم کو علم شمار کیا جائے اور وہ اہمیت کے ساتھ قابل ذکر ہوں اور پھر ان معلومات پر دنیا و آخرت

کے دوررس نتائج مرتب ہوں سوغور کیا جائے تو یہ تینوں اعضاء اوران کی یہ علمی قوتیں حقیقتاً ایسے علم وادراکات کی حامل ہیں۔ جن کا علم بہت حد تک امتیاز وتمیز کی شان بھی ہے جوعلم کی حقیقت ہے اوراسکے نتائج بھی دوررس انداز میں انسان پر مرتب ہوتے ہیں۔ بلکہ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات بدن کی بقاء وترقی کا راز کچھ انہی تین اعضاء کے علم میں مضمر ہے، اورانسان سے مواخذہ اوردنیاوآخرت میں پرسش وجواب کی ذمہ داری زیادہ تر انہی تین قوتوں سمع، بصر اورفہم پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم میں جہاں انسان کے قابل ذکر اور موجب مسئولیت ومواخذہ علم و ادراک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہاں خصوصی طور پر انہی تین قوتوں سمع، بصر اور سمجھ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

سمع، بصر اور قلب کی عطا...... ایک موقع پر جہاں انسان پر علم دیئے جانے کے احسان کو جتلایا گیا ہے وہاں انہی تین قوتوں کے عطاء فرمانے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ انسان میں قابل اعتناء اور قابل ذکر یہی تین علمی قوتیں ہیں۔

سمع، بصر اور قلب کا اِحساناً ذکر فرمایا گیا...... چنانچہ بطن مادر میں انسان کی ان ہی قوتوں کے رکھے جانے کا احسان ذیل کے الفاظ میں جتلایا گیا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ''پھراس (نفس) کو درست کیا اوراس میں اپنی روح ڈالی اور تمہارے لئے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں رکھیں مگر تم کم ہی شکر کرتے ہو''۔ پھر بطنِ مادر سے نکالتے ہوئے بھی انسان پر انہی تین قوتوں کی ایجاد وعطا کا احسان جتلایا گیا ہے۔ ارشادِ حق ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ② ''اوراللہ نے نکالا تم کو تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیئے تم کو کان آنکھیں اوردل تا کہ تم احسان مانو''۔

انسانی گمراہی کے ذمہ دار بھی یہی اعضاءِ ثلاثہ ہیں...... پھر آدمی کی ذمہ داری بھی انہی قوتوں کی بدراہی اورمسخ ہوجانے پر عائد ہوگئی ہے ارشاد الٰہی ہے: ﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً﴾ بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرالیا اپنا حاکم اپنی خواہش کو اور راہ سے بچلا دیا اسکو اللہ نے جانتا بوجھتا، اور مہر لگادی اس کے کان پر اور دل پر اور ڈال دی اس کی آنکھ پر اندھیری۔

انہی اعضاء ثلاثہ کو مسئول بھی قرار دیا گیا ہے...... پھر انسانی بدراہی کے موقعہ پر انہی تین قوتوں کی بے راہ روی پر دنیوی اوراُخروی مسئولیت بھی عائد کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ ③ ''اورنہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو بے شک کان اور آنکھ اوردل ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی''۔

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۹.
② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.
③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۶.

اعضاء ثلاثہ کا غلط مصرف ہی عذابِ جہنم کا سبب ہوگا......اور آخر جب آدمی اپنی جاہلانہ اور عاصیانہ حرکتوں کے مسلسل اِرتکاب سے دنیا میں حیوان صفت اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہوگا۔ تو اس کی کل ذمہ داری انہیں تین عملی قوتوں پر ڈالی گئی ہے کہ جب یہ معتد بہ قسم کے تین علم تمہیں دیئے جاچکے تھے اور تم نے عواقب اور نتائج کو ان قوتوں کی بدولت سمجھ لیا تھا۔ تو پھر ان سے حق جوئی کا کام کیوں نہیں لیا؟ اور کیوں ان ناشائستہ حرکتوں میں مبتلا رہے؟ اس سے واضح ہوا کہ علمی زندگی کے بننے بگڑنے کا تعلق زیادہ تر انہی تین علوم و ادراکات سے ہے۔ ارشادِ حق ہے: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ① ''اور ہم نے پیدا کئے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور آدمی ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ، وہی لوگ ہیں غافل''۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ ② ''مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''۔

اعضاء ثلاثہ کے علم پر ہی ثمرات دنیا و آخرت کا مدار ہے......بہر حال ان نصوصِ کریمہ سے واضح ہے کہ ان تین اعضاء آنکھ، کان اور قلب کا علم ایک بنیادی اور اساسی علم ہے اور اسی پر دنیا اور آخرت کے ثمرات زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ اگر یہ تین علم غلط ہو جائیں۔ تو دنیا کا علم اور آخرت کا سکون کسی طرح بھی حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر یہ صحیح ہیں اور اپنے صحیح آثار دکھلا رہے ہوں تو انہی سے آخرت و دنیا دونوں بن جاتی ہیں۔

اس موقعہ پر ہاتھ، پاؤں، ناک یعنی لامسہ، ذائقہ اور شامہ کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ ان کا علم ایسا بنیادی اور معتد بہ قسم کا نہیں۔ جو دنیا و آخرت کے بننے بگڑنے کا مدار کار ہو۔ بلکہ بہت حد تک یہ تینوں علم انہی بعد کے تینوں علموں کے تابع اور انکے زیر اثر ہیں پس اصل علم یہی تین علوم ٹھہر جاتے ہیں۔ عینی علم جو آنکھ سے حاصل ہو، سمعی علم جو کان سے حاصل ہو اور فہمی علم جو قلب سے ابھرے۔

9 **کثرتِ قیود و شرائط وسعتِ علم کے لئے مانع ہیں**......لیکن باوجود ان تینوں عملی قوتوں کے معتد بہ اور قابل ذکر ہونے کے پھر بھی اسی معیار کی رو سے کہ جس علم کے لئے ادراک کی قیدیں اور شرطیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ علم وسیع نہیں رہتا اور جس پر قیدیں اور شرطیں کم ہوں۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

اعضائے ثلاثہ میں آنکھ کا دائرہ علم سب سے تنگ ہے......ان تینوں علوم میں بھی تفاوت اور فرق مراتب ہے۔ جو قرآن ہی کا مقتضاء ہے مثلاً آنکھ کے علم میں چونکہ قیود و شروط بہت ہیں اور کان کے علم میں کم۔

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۷۔

اس لئے آنکھ کے علم کا دائرہ کان کی بہ نسبت تنگ اور محدود ہے۔ چنانچہ آنکھ کا علم اول تو صرف جسمانیات تک محدود ہے وہ مادیات کو تو دیکھ سکتی ہے۔ روحانیت کو نہیں۔ اس نے آج تک خود اپنی روح کو بھی باوجود انتہائی قرب کے نہیں دیکھا جس سے واضح ہے کہ معنویات اور لطائف کے ادراک سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ آنکھ سے اگر انسان کی صورت پوچھو تو بتا دے گی۔ لیکن اگر اس کی حقیقت اور معنویت پوچھنے لگو تو وہ معذور رہ جائے گی۔ پھر بلحاظ زمانہ جسمانیات کے دائرہ میں بھی اسے ماضی و مستقبل کے دیکھ لینے سے کوئی واسطہ نہیں جو چیزیں جا چکی ہیں یا جو آنے والی ہیں۔ آنکھ ان کے دیدار سے محروم ہے اور ان کی صورت، شکل یا جسم کا کوئی بھی پتہ نہیں دے سکتی۔ اس لئے اس کا دائرہ عمل صرف حال رہ جاتا ہے کہ وہ صرف موجوداتِ وقت پر نظر ڈال لے اور ماضی و مستقبل کے دیدار سے محروم رہے۔ پھر موجوداتِ وقت کے دائرہ میں بھی اس کے دیکھنے کے لئے تقابل شرط ہے کہ وہ چیز آنکھ کے سامنے ہو۔ دائیں بائیں یا پس پشت ہوئی تو وہ پھر ادراک سے عاجز رہ جائے گی۔ پھر تقابل میں بھی اتصال معتدل کی شرط ہے کہ قابل دید شے آنکھ سے نہ زیادہ دور ہو نہ زیادہ نزدیک۔ بہت دور ہو تب بھی آنکھ بے کار ثابت ہوتی ہے اور بہت نزدیک ہو حتیٰ کہ آنکھ سے ملا دی جائے تو پھر بھی وہ دیدار سے عاجز رہ جاتی ہے۔

پھر اس معتدل فاصلہ کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ بیچ میں کوئی حائل اور حجاب بھی نہ ہو۔ اگر ذرا سا پردہ بھی بیچ میں آ جائے تو آنکھ دیدار سے معذور رہ جاتی ہے۔ پھر بلا حائل ہو کر بھی دیکھنے کی چیز کا سکون شرط ہے۔ اگر وہ متحرک ہو تو پھر بھی اس پر نگاہ نہیں جم سکتی کہ دیدار ہو جائے اور بینائی اپنا صحیح کام کر جائے۔ پھر بھی خواہ مخواہ نگاہ جما دی جائے گی تو گو دیدار ہو جائے گا۔ مگر غلط ہو گا کہ شئے کچھ سے کچھ دکھائی دینے لگے گی۔ جیسے ایک گول پہیہ حرکت کرتا ہوا دیکھا جائے تو اس کے درمیان کا قطر اور اس کی کڑیاں سب نگاہوں سے غائب ہو جائیں گی اور پہیہ بجائے درمیانی خلاؤں کو دکھانے کے متصلِ واحد ایک ٹھوس جسم دکھائی دے گا۔ جو اس کی واقعی ہیئت نہیں ہے۔

بہرحال آنکھ کی کارفرمائی میں ایک دو نہیں بہت سی شرطیں ہیں۔ جن کے بغیر وہ اپنی کارفرمائی نہیں کر سکتی۔ یعنی شے کا جسمانی ہونا، مقابل ہونا، حال ہونا، متصل ہونا، بلا حائل ہونا، ساکن ہونا وغیرہ کہ ان شرطوں کے بغیر وہ علم حاصل نہیں ہوتا، اس لئے آنکھ کے علم کا دائرہ بہت ہی محدود اور تنگ ثابت ہوا اور اس سب کے باوجود جتنا بھی علم ہو گا وہ سطحی ہو گا وہ سوائے اوپر اوپر کی صورت اور رنگ و نقش کے کچھ اور نہیں دیکھ سکے گی۔ حتیٰ کہ اگر کسی جسم کا جگر تک چاک کر کے اسے دکھایا جائے تب بھی اسے سطح اور رنگ ہی نظر آئے گا۔ کوئی گہری حقیقت ہرگز منکشف نہ ہو گی۔

بندگانِ عقل کا علم بصر پر غلط اعتماد...... اس لئے یہ علم اصلی ہونے کے باوجود پھر بھی سطحی اور غیر معتد بہ ثابت ہوتا ہے۔ جس پر آج دنیا میں بے حد فخر و غرور کا اظہار کیا جا رہا ہے اور عینی مشاہدہ ہی کو اصل الاصول اور یقین کی بنیاد باور کرایا جا رہا ہے۔ حالانکہ کسی شے کا علم جو اس کے بارے میں یقین و اطمینان کی بنیاد بن سکتا ہے۔ وہ اس کی حقیقت کا مشاہدہ ہے نہ کہ اوپری صورت اور نقش و نگار کا معائنہ ہے۔ پس آنکھ کے مشاہدہ کا جب کہ حقائق سے تعلق

ہی نہیں جو کسی شے کی حقیقت کے بارے میں یقین واطمینان کی بنیادیں مستحکم کر سکے۔ تو اس کے علم کو کسی درجہ میں علم حقیقی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود پھر بھی ہر دور کے دہریئے اپنے عینی مشاہدات ہی کو اصل سمجھ کر معنویات میں بھی عینی مشاہدہ کے طلب گار رہے ہیں۔ حتیٰ کہ لطیف وخبیر خدائے برحق کے بارے میں بھی عینی مشاہدہ ہی کا مطالبہ کر کے ایمان کو اس پر معلق کر چکے ہیں یہود نے کہا تھا کہ ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ① ''(اے موسیٰ) ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں''۔ یا مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ ﴿اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا﴾ ② ''(اے پیغمبر) ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، یا لے آ، اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے''۔

لیکن ان بندگان عقل کو اس کا شعور نہ ہوا کہ آنکھ معنویات اور لطائف کے احساس کے لئے بنائی ہی نہیں گئی۔ جیسا کہ کان صورتیں دیکھنے کے لئے اور ناک آوازیں سننے کے لئے نہیں بنائی گئی۔ اس لئے جیسے کان سے صورتیں دیکھنے اور ناک سے آوزیں سننے کا مطالبہ لغو اور بے عقلی ہے۔ ایسے ہی آنکھ سے علم واخلاق، یا روح یا حق تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ بھی خلاف فطرت اور کج عقلی ہے۔ پس دیکھنے کا تعلق صرف رسوم ونقوش اور سطوح وخطوط سے ہے نہ کہ شئے کی ذات اور حقیقت سے اور یقین کی بنیادیں رسوم ونقوش پر قائم نہیں ہوتیں۔ بلکہ شے کی ذات اور اس کے حقائق کے ادراک پر قائم ہوتی ہیں۔ اس لئے آنکھ کا علم ان تینوں آلات علم آنکھ، کان قلب میں سے اپنی ذات میں قلیل ترین اور محدود ترین علم ثابت ہوتا ہے جسے آج سب سے اونچا علم ظاہر کیا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نتائج اس کے دوررس ہوں۔

⑩ **کان اور قلب کا دائرہ علم آنکھ سے وسیع ہے**...... بخلاف کان اور قلب کے کہ ان دونوں کا علم آنکھ سے کہیں زیادہ وسیع اور حقیقی ہے۔ وہ ٹھوس جسم کے بجائے اس کے لطیف ترین عوارض کا ادراک کر لیتے ہیں جو آنکھ کے بس کی بات نہیں پھر ان میں زمان ومکان کی بھی قید نہیں کہ کان صرف وقت پر ہی بات سنیں۔ بلکہ وہ ماضی اور مستقبل کے واقعات کا بھی ادراک کر لیتے ہیں اور زمانہ بیچ میں حائل نہیں ہوتا۔ پھر کان کے سننے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ آواز سنانے والا کان کے متقابل ہو کر ہی آواز لگائے تو سنی جائے ورنہ نہیں۔ بلکہ دائیں بائیں، آگے پیچھے جہاں سے بھی آواز آئے گی کان سن لیں گے اور دل اسے کچھ نہ کچھ سمجھ لے گا۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آواز دینے والا کان سے مل کر یا بہت قریب آ کر ہی آواز دے تو سنی جائے ورنہ نہیں۔ بلکہ میلوں دور کی آوازیں بھی کانوں میں سما جاتی ہیں اور سنائی دیتی ہیں اور دل ان کا شعور حاصل کر لیتا ہے۔

پھر ان دونوں کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ درمیانی حائل ان کی سماعت میں رکاوٹ پیدا کر دے کہ بلا حائل تو آواز سنی جائے، ورنہ نہیں بلکہ پس دیوار اور مقفل مکانوں کی آوازیں بھی کانوں میں فوراً آ جاتی ہیں اور وہ ادراک کر

① پارہ: ۱، سورة البقرة، الآية: ۵۵. ② پارہ: ۱۵، سورة الاسراء، الآية: ۹۲.

لیتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کان صرف امور حاضرہ ہی کا ادراک کریں۔ بلکہ امور غائبہ اور مخفی واقعات بھی آواز کے ذریعہ کانوں کے پردوں میں اتر آتے ہیں۔ اس لئے کان اور قلب یا سمع اور فہم کا علم بلاشبہ آنکھ کے علم سے کہیں زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور گہرا ثابت ہوتا ہے۔ جس میں آنکھ کی بہ نسبت قیدیں اور شرطیں آدھی بھی نہیں ہیں۔

کان اور قلب کے واقعاتِ گذشتہ کے ادراک کرنے پر قرآنی استشہاد...... چنانچہ قرآن کریم نے جہاں نگاہوں سے اوجھل اور ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے امور کا ذکر عبرت وموعظت کے لئے کیا ہے۔ وہاں آنکھ کا ذکر نہیں فرمایا وہ اس میدان میں کام کر سکتے ہیں۔ ارشاد حق ہے ﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا﴾ ① کیا سیر نہیں کی ملک کی، جو اس کے دل ہوتے جن سے سمجھتے، یا کان ہوتے جن سے سنتے۔ کیوں کہ ہزاروں برس قبل کی ماضی کی سرگذشتوں اور سرکشوں کا انجام بد آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ کان ہی اسے سچی خبروں سے سن سکتے تھے اور دل ہی اسے سمجھ کر عبرت پکڑ سکتے تھے۔

چنانچہ جو لوگ حق کے بارہ میں نہ سننے سے کام لیتے تھے نہ سمجھنے سے، نہ کانوں کو متوجہ کرتے تھے نہ دلوں کو قرآن حکیم نے انہیں ڈھوروں اور ڈنگروں سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کے انہی دو اعضاء کان اور قلب کے بگڑ جانے کا ذکر فرمایا کہ ان دو کے معطل ہو جانے سے سارا نفسِ انسانی انسانیت سے نکل کر اور معطل ہو کر حیوانوں کی لائن میں چلا گیا فرمایا: ﴿أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾ ② ''کیا آپ کو گمان ہے کہ ان میں کے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو چوپایوں کی مانند ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ بھٹکے ہوئے ہیں''۔

اس طرح تذکیر موعظت کے موقعہ پر کانوں اور دلوں ہی کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ماضی بعید کی داستانیں کانوں سے سن کر دلوں کا ان سے نصیحت وعبرت پذیر ہونا، کان اور قلب ہی کا کام ہو سکتا تھا نہ کہ آنکھ کا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَحِيصٍ ۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ ③ ''اور کتنی تباہ کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ ان کی قوت زبردست تھی ان سے پھر لگے کریدنے شہروں میں۔ کہیں ہے بھاگ جانے کو ٹھکانا۔ اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہو یا لگائے کان دل لگا کر۔''

اسی لئے کفار بھی قیامت کے دن اپنی انہی دو قوتوں سے دنیا میں کام نہ لینے پر حسرت کریں گے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ ④ ''اور کہیں گے اگر ہم ہوتے سنتے یا سمجھتے تو نہ ہوتے، دوزخ والوں میں سے''۔

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۴۴.
③ پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۳۶، ۳۷. ④ پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۰.

کان کا دائرہ اِدراک بھی قلب کے مقابلہ پر محدود ہے...... لیکن غور کیا جائے تو کان باوجود اس وسعت علم کے جو ابھی ذکر کی گئی۔ پھر بھی بہت سی قیود اور حدود کا پابند اور محتاج ہے اور کم سے کم یہ قید تو اس پر بہر حال عائد ہے ہی کہ وہ جسمانیات سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اور جسمانی دائرہ میں بھی آواز ہی کی حد تک اس کا دائرہ علم کام کر سکتا ہے، اور وہ بھی اس شرط سے کہ وہ زیادہ دور کی آواز نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ بیرونی آلات اس کی مدد کر کے اسے بہت دور کی آوازیں سنوا دیں۔ مگر یہ اس کی قوت کا کرشمہ نہ ہوگا بلکہ آلات کی قوت وطاقت کا مظاہرہ ہوگا۔ کان کی تو بہر حال درماندگی اور محتاجگی ہی ثابت ہوگی۔ مذکورہ شرطوں کے علاوہ آلات کی اس پوری امداد کے باوجود پھر بھی کان مادی ہی آوازیں سن سکتا ہے۔ روحانی یا غیبی آوازیں سن لینا پھر بھی اس کے بس کی بات نہیں اور پھر مادی آوازیں سن کر وہ سن لینے ہی کا کام کر سکتا ہے۔ آواز والے کو تمیز کے ساتھ پہچان لینا کان کی استعداد نہیں۔ یعنی شنوائی کے سوا اس میں کوئی شعور یا فہم اور تمیز نہیں۔ اس لئے کان کا ادراک بھی ان تینوں اہم اعضاء میں کوئی تام ادراک نہ نکلا کہ تنہا اسے کوئی اونچا علم کہہ دیا جائے۔

[11] احساس بھی قلب ہی کی خصوصیت ہے...... بہر حال انسانی علوم میں ابتدائی علم یہی حواس خمسہ کا علم ہے جن کے ذریعہ سے قابل احساس جزئیات کا ادراک کیا جاتا ہے اور کم از کم ان کے ظواہر صورت وشکل، رنگ، بو، یا عوارض وغیرہ کی جزئیات کا پتہ چل جاتا ہے۔ جو عالم میں مختلف انواع میں بٹی ہوئی چہار طرف پھیلی پڑی ہیں۔ اس لئے گویا یہ پانچوں علم بلحاظ باطن قابل ذکر نہ سہی کہ حواس خمسہ ادراک باطن اور حقیقت نمائی کے لئے بنائے ہی نہیں گئے۔ لیکن بلحاظ ظاہر درجہ بدرجہ ایک گونہ اہمیت رکھتے ہیں جن کا فرق مراتب کے ساتھ ذکر قرآن حکیم کی روشنی میں آپ کے سامنے آچکا ہے۔

غور کیا جائے تو گو ظاہر نظر میں ان محسوسات کا ادراک اعضاء حواس کرتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہ احساسات قلب کے ہیں آنکھ، ناک، کان کے نہیں بظاہر آنکھ دیکھتی ہے۔ لیکن حقیقت میں آنکھ نہیں دیکھتی، دل دیکھتا ہے۔ یہی حال سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کا بھی ہے کہ بظاہر یہ احساس کان، ناک، زبان اور ہاتھ پاؤں کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ سارے ادراکات قلب کے ہیں، ان اعضاء کے نہیں پس انسانی کائنات میں حقیقی مدرک اور اصلی عالم قلب ہی ٹھہر جاتا ہے۔

اور یہ تمام مختلف اعضاء ادراک اپنے اپنے ادراکات میں اس کے خدام ہیں۔ اس نے اپنے ظاہری علم کی حد تک یہ ہرکارے، اور جاسوس عالم حسیات میں اس لئے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ مختلف قسم کے محسوسات اور معلومات لا لا کر اس کے سامنے رکھتے رہیں اور وہ اس علم کی روشنی میں کائنات بدن کی تدبیر کرتا رہے۔ اس لئے ان محسوسات کا کوئی شعور خود ان اعضاء حواس کو نہیں ہوتا، آنکھ کچھ سوچ سمجھ کر نہیں دیکھتی کان کچھ غور وفکر کر کے نہیں سنتے اس کی نہ ان میں صلاحیت ہے نہ وہ اس کام کے لئے بنائے گئے ہیں۔ وہ محض دیکھ اور سن لیتے ہیں، سمجھتے ہیں۔ اس

احساس کے مبادی واغراض کو سمجھنا صرف اسی صنوبری مضغہ گوشت کا کام ہے۔ جس کا نام دل ہے۔ پس احساس کی پالیسی دل بناتا ہے اور اس باشعور پالیسی کے تحت مزدوروں کی طرح احساس کا ظاہری فعل یہ اعضاء حواس انجام دیتے ہیں۔ پس احساس ظاہر نظر میں ان کا ہے اور شعور احساس دل کا ہے۔

حقیقتاً اعضاء کا احساس بھی قلب ہی کا فیض ہے..... مزید غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ احساس بھی در حقیقت یہ اعضاء نہیں کرتے۔ بلکہ وہ بھی تنہا قلب ہی کرتا ہے جب کہ ان عضاء کا یہ ظاہری احساس صرف اسی کی توجہ پر موقوف ہے۔ بغیر اس کی توجہ کے یہ سب اعضاء احساس بھی معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بازار کے ہنگامے، شور وشغب، باجے گاجوں کی نوع بنوع آوازیں کان ہی میں نہیں آتیں۔ اگر دل کا دھیان ادھر نہ ہوں، خوش منظر چیزیں، بلڈنگوں کے دیدہ زیب رنگ وروغن اور ان کی فلک پیا بلندی ورفعت کچھ بھی نگاہوں میں نہیں سماتی۔ اگر دل کا دھیان دوسری طرف ہو۔ بدن پر چوٹیں آ جائیں اور زخم لگ جائیں اور لمس ومس کی ساری ضربیں بدن پر پڑتی رہیں۔ لیکن اگر قلب کی توجہ ادھر نہ ہو تو ذرہ برابر ان مصائب کا اثر آدمی کو محسوس نہیں ہوسکتا۔ ہزار خوشبوئیں ہوا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ لیکن قلب اگر اپنے کسی اور غم میں منہمک ہو تو وہ ناک میں پہنچ کر بھی محسوس نہ ہوں گی۔ چہ جائیکہ کسی فرحت کا اثر پیدا کریں۔

بے تحاشا لذیذ کھانے دسترخوان پر چنے ہوئے ہوں۔ لیکن قلب کسی اور فکر میں مستغرق ہو تو کسی ایک چیز کا ذائقہ بھی زبان پر نہ آئے گا۔ خواہ آدمی کا پیٹ ناک تک بھی بھر جائے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ سننا، دیکھنا، چھونا، سونگھنا اور چکھنا، کان، آنکھ، ہاتھ، ناک اور زبان کا کام نہیں بلکہ دل کا کام ہے۔

اگر یہ احساسات بذاتِ خود ان اعضاء کے ہوتے تو آنکھ، ناک، کان میں آئے ہوئے محسوسات کے یہ نقشے بھی انہیں کے گوشت پوست میں سمائے ہوئے ہوتے، لیکن بجائے اس کے کہ اعضاء ان محسوسات کو اپنے اندر محفوظ رکھیں۔ یہ کام بھی قلب ہی کا ہے کہ وہی ان کی حفاظت کا خزانہ بھی ہے۔ اس لئے اگر آنکھ، ناک، کان بند بھی ہو جائیں۔ تب بھی ان محسوسات کے سارے نقشے، آوازیں اور ذائقے وغیرہ قلب ہی میں ہمہ وقت حاضر ملیں گے۔ نہ کہ ان اعضاء میں دل جب چاہے اور تصور میں لائے جب ہی فوراً بلا آنکھ، ناک، کان کے واسطہ کے ان سب کو عیاناً دیکھ اور سن سکتا ہے آنکھ، ناک، کان ہرگز ان نقشوں کو دیکھ، سن نہ سکیں گے کہ ان محسوسات کے نقشے ان میں محفوظ ہی نہیں۔

آدمی کہا کرتا ہے کہ میں نے فلاں وقت ایسا کھانا کھایا تھا کہ آج تک اس کا ذائقہ میرے منہ میں ہے۔ حالانکہ یہ مزہ اس کے منہ یا زبان میں نہیں ہے ورنہ ہر نئی کھائی ہوئی چیز کا ذائقہ اس پہلے ذائقہ سے خلط ملط ہو کر کبھی بھی خالص نہ رہتا اور کھانوں کے خالص مزے اس اختلاط سے ختم ہو جاتے، بلکہ یہ سارے مزے دل کے ظرف میں محفوظ رہتے ہیں اور دل جب بھی چاہتا ہے ان گذشتہ ذائقوں کو اپنے تصور میں لے آتا ہے اور ان کے ادراک سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جو اس کی واضح دلیل ہے کہ ان اعضاء کے یہ احساسات خود اپنے نہیں بلکہ صرف

دل کے ہیں۔اس لئے محفوظ بھی دل ہی میں ہیں ان میں نہیں بنا بریں تن انسانی میں حقیقی مدرک اور عالم صرف قلب ہی ثابت ہوتا ہے اور یہ اعضاء صرف آلات ہی آلات باقی رہ جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے ایک شخص آنکھ پر چشمہ لگا کر دیکھے تو کیا یہ بینائی کی عملی قوت چشمہ میں مانی جائے گی یا آنکھ میں اور یہ دیکھنا آنکھ کا کام ہوگا یا چشمہ کا؟ سب جانتے ہیں کہ یہ بینش (دیکھنا) کا عمل آنکھ کا کام ہوگا نہ کہ چشمہ کا کہ اس میں یہ قوت بینائی سرے سے ہے ہی نہیں ورنہ آنکھ سے اتار کر بھی چشمہ اشیاء کو دیکھ سکتا۔ یا مثلاً کسی شخص نے کان پر آلہ لگا کر سنا تو کیا یہ شنوائی کا عمل اس آلہ کا ہوگا؟ ہرگز نہیں بلکہ کان کا ہوگا۔ ورنہ کان سے الگ رہ کر بھی اس آلہ سے سن سکتے اور ادھر یہ صورت ہے کہ اگر آنکھ سے چشمہ اتار دیا جائے تو وہ بلا اس کے بھی دیکھ سکے گی۔ بشرطیکہ بیمار نہ ہو اور کان سے آلہ جدا کر دیا جائے۔ تب بھی کان سے سنے گا اگر مبتلائے مرض نہ ہو۔ کیونکہ قوت بینائی وشنوائی آنکھ اور کان میں ہے، آلہ میں نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ آنکھ دل کا ایک چشمہ ہے اور کان دل کا ایک آلہ سماع ہے۔ اس لئے حقیقتاً قوت بینائی وشنوائی آنکھ کان میں نہیں بلکہ قلب میں ہے۔ اس لئے آنکھ تو قلب سے جدا ہو کر نہیں دیکھ سکتی۔ مگر دل آنکھ سے جدا ہو کر دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ آلہ اصل کا محتاج ہوتا ہے اصل آلات کی محتاج نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ وہ اصل پر رہے اور بیمار اور ضعیف نہ ہو جائے۔ بہر حال جب کہ یہ چشم وگوش آلات دل ہیں اور دل اصل ہے تو قوت بینائی اور قوت شنوائی اسی کی ہوگی نہ کہ آنکھ کان کی۔

قلب جیسے بحالت نومِ مدرک ہے ایسے ہی بعد الموت بھی رہتا ہے...... یہی وجہ ہے کہ آدمی نیند میں جو موت کی چھوٹی بہن ہے وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے۔ جو بیداری میں آنکھ کان سے دیکھتا سنتا ہے حالانکہ اس وقت آنکھ کان سوئے ہوئے اور معطل ہوتے ہیں جس سے صاف نمایاں ہے کہ دیدار کی قوت دل میں ہے آنکھ میں نہیں ہے۔

اس لئے اگر ہم آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ دیں۔ بلکہ عقیدہ رکھیں کہ حقیقی موت کے بعد جب کہ آنکھ، ناک، کان کے اعضاء سرے سے باقی نہ رہیں گے پھر بھی آدمی اپنے اس لطیفہ قلب سے وہ سب کچھ دیکھتا سنتا رہے گا۔ جو آنکھ کان سے دیکھتا سنتا تھا اور عالم برزخ کے وہ تمام عجائبات اس کی قوت بینائی اور قوت شنوائی پر منکشف ہوتے رہیں گے جن کو صاحب شریعت نے کھول کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ تو اس میں بھی کسی انکار واستعجاب کا موقعہ نہیں، فرق ہے تو صرف اتنا کہ نیند ایک عارضی اور ہنگامی موت ہے جس میں روح حیات بدن سے کلیتہً جدا نہیں ہوتی۔ صرف اعضاء حواس معطل ہو جاتے ہیں مگر قلب بیدار رہتا ہے، ورنہ خواب کے عجائبات کیسے منکشف ہوتے اور موت اصلی موت ہے جس میں روح بدن کو چھوڑ دیتی ہے اور اعضائے بدن سرے سے ہی باقی نہیں رہتے۔ مگر قلب پھر بھی بیدار رہتا ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہتا ہے۔ جو عالم برزخ میں سامنے آئے گا۔

پس جیسے وہ خواب میں بلا آنکھ کان کے سب کچھ دیکھتا اور سنتا تھا۔ ایسے ہی برزخ میں بھی بلا اس ظاہری آنکھ، کان کے سب کچھ دیکھتا سنتا رہے گا۔ اس سے صاف نمایاں ہے کہ یہ اعضاء حواس درحقیقت خود مخزن احساس نہیں اور

نہ ہی یہ خود احساس کا کام انجام دیتے ہیں۔ بلکہ یہ ساری کارگزاریاں درحقیقت صرف قلب ہی کی ہیں۔ جو نیند اور موت میں بلا اعضائے ظاہری کے یکساں حساس رہتا ہے۔ بہر حال واضح ہو گیا کہ احساس بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعضائے حواس کا نہیں وہ اپنا احساس نہیں رکھتے۔ بلکہ صرف دل کے احساس کو ظاہر بینوں کے سامنے نمایاں کر دیتے ہیں۔

محسوسات سے تاثر پذیر بھی قلب ہی ہوتا ہے اعضائے اِحساس نہیں...... اس سے بھی آگے کی ایک بات یہ بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان محسوسات سے کسی اچھی بری کیفیت کا اثر لینا اور ان کیفیات سے بلحاظ حظ و کرب شعور کے ساتھ متاثر ہونا بھی ان اعضائے حواس کا کام نہیں کہ ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں بلکہ تن تنہا دل ہی کا کام ہے۔ اگر کوئی دردناک بات کان میں پڑ جائے تو درد آشنا دل ہوگا نہ کہ کان اور اگر کوئی خوش منظر چیز آنکھوں میں آ جائے تو متفرح قلب ہوگا نہ کہ آنکھ جس سے واضح ہے کہ یہ اعضاء صرف ان محسوسات کے رطب و یابس کو بٹورنے کے ذمہ دار ہیں اور وہ بھی قلب ہی کی توجہ اور تصرف سے اس کی خاصیات و آثار کو سمجھنے اور ان سے اثر لینے کے ذمہ دار نہیں۔ اس لئے قلب نہ صرف ان محسوسات کا تن تنہا مدرک ہی ہے۔ بلکہ ان کے طبعی آثار و خواص اور کیفیات سے باکیف بھی وہی تن تنہا ہوتا ہے یہ اعضاء اس بارے میں کسی درجہ میں بھی اس کا وسیلہ نہیں بنتے۔ اس لئے ان کی حیثیت آلات و وسائل احساس سے زیادہ کچھ نہیں جس سے کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ قلب دیکھنے سننے میں بھی ان اعضاء حواس کا محتاج نہیں اور کیفیات احوال کا اثر لینے میں بھی حواس کا دست نگر نہیں۔ جو اس کے حقیقی عالم و مدرک اور حقیقی باکیف اور صاحب حال ہونے کی واضح دلیل ہے۔

قلب اپنی قوت تصوریہ کے ذریعہ ایک حد تک موجد محسوسات بھی ہے...... پھر یہی نہیں کہ وہ محسوسات میں صرف انہی چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جو پہلے سے موجود ہوں۔ جیسا کہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ صرف انہی چیزوں کو محسوس کر سکتی ہیں جو خارج میں موجود ہوں۔ خواہ وہ صورتیں شکلیں ہوں یا آوازیں اور خوشبوئیں وغیرہ۔ لیکن قلب اپنے احساسات میں اس کا بھی محتاج نہیں کہ صرف انہی اشیاء کا ادراک کر لیا کرے جو پہلے سے موجود ہوں بلکہ وہ اپنے تصور کی طاقت سے غیر موجود اشیاء کو ذہن میں خود وجود دے کر بھی ان کا ادراک کر سکتا ہے۔ پس وہ محسوسات کا مدرک ہی نہیں بلکہ ایک حد تک موجد بھی ہے کہ جب چاہے خود ہی عالم تصور میں شہر کے شہر اور باغ کے باغ بنا لے اور پھر اپنے ہی اندر ان کی سیر بھی کرتا رہے، لطف بھی اٹھاتا رہے اور آنکھ، ناک، کان کو خبر بھی نہ ہو۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ   تو زغنچہ کم نہ میدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

اعضائے احساس کے بالمقابل قلب کی جلالتِ قدر...... پس قلب نہ صرف یہ کہ احساس میں ان اعضائے حواس کا محتاج نہیں بلکہ محسوسات کے کسی سابق وجود خارجی کا بھی محتاج نہیں۔ جس سے قلب کی علمی عظمت و جلالت اور ان اعضاء حواس کی بے مائیگی کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ ادراک و

احساس بھی قلب ہی کا کام ہے اور محسوسات کی ایجاد و اختراع بھی اس کا حوصلہ ہے۔
فرق اتنا ہے کہ کہیں وہ ان اعضاء ظاہری کی وساطت سے ادراک کرتا ہے اور کہیں ان کے توسط کے بغیر اور کبھی وہ خارجی موجودات کو محسوس کرتا ہے، اور کبھی اپنے اندر تصوری موجودات بنا کر انہیں محسوس کرنے لگتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کا علم تابع معلوم ہوتا ہے اور دوسری صورت میں معلوم تابع علم نیز پہلی صورت میں علم انطباعی ہوتا ہے کہ باہر کی صورتیں شکلیں اس میں آکر چھپ جاتی ہیں اور وہ انہیں دیکھتا رہتا ہے، اور دوسری صورت میں علم ایجادی ہوتا ہے کہ صورتیں بھی اندر ہی بنتی ہیں اور محسوس بھی اندر ہی ہوتی ہیں۔
خلاصہ یہ کہ یہ آفاقی محسوسات ہوں یا انفسی، امام علم بہر حال قلب ہی رہتا ہے اور اسی کے احساس کے صحت وسقم پر اس کائنات بدن کا سارا صحت وسقم موقوف ہے۔ اندریں صورت اگر احساس میں غلطی ہوئی تو اس میں ان اعضاء حواس کا براہ راست قصور نہ ہوگا کہ یہ محض آلاتِ کار تھے۔ بلکہ جرم وقصور فی الاصل دل ہی کا ثابت ہوگا کہ اس احساس وادراک میں وہی اصل تھا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان احساسات اور حواس کے علم میں قلب ہی کو اصل قرار دیتے ہوئے ان لوگوں کو جو حق بینی سے آنکھ پھیر لیں یا حق نیوشی کی سمجھ کو غیر کام پر لگا کر کبھی بھی نصیحت وعبرت قبول نہ کریں۔ آنکھ اور عقل کا اندھا نہیں بتلایا بلکہ دل کا اندھا کہا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ ① ”کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں (کہ آنکھوں سے دیکھ کر ان کے دل (حق کو) سمجھتے یا کانوں سے (کوئی سچی بات) سن لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ سینوں میں دل ہی اندھے ہیں“۔
بہر حال قرآن حکیم کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اعضاء احساس اپنے احساس وادراک میں اصل نہیں۔ بلکہ دل اصل ہے اور نہ ہی ان کا یہ تنہا علم کوئی مستقل اور معتد بہ علم ہے اور اگر آنکھ، کان اور دماغ کا علم کچھ معتد بہ اور کسی حد تک بنیادی اور نتائج وآثار کا حامل بھی ہے۔ تو ان میں بھی باہم فرق قوت وضعف کے ساتھ انجام کار علم صرف قلب ہی کا رہ جاتا ہے۔ جس پر کائنات انسانی کے صلاح وفلاح اور عدل کا دارومدار ہے۔ بحوائے ارشاد سید الاولین والاخرین صلوات اللہ علیہ وعلیٰ الانبیاء جمیع اخوانہ من المرسلین۔ ”وَفِی الْجَسَدِ مُضْغَۃٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ“ ② ”بدن انسانی میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور جب وہ فاسد ہوتا ہے تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے آگاہ رہو کہ وہ قلب ہے“۔
حسیاتی علوم کی طرح دماغی علوم بھی حقیقتاً قلب ہی کا فیضان ہیں...... انسانی علوم کا ان پانچ ہی حواس

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرء لدینہ، ج: ۱، ص: ۹۰۔

میں انحصار نہیں۔ بلکہ ایک اہم اور دوررس قسم کا علم اور بھی ہے۔ جو بلحاظ باطن بھی ایک حد تک علم کہلائے جانے کا مستحق ہے اور رتبہ بھی ان پانچوں حسیاتی علوم سے اونچا ہے۔ یہ علم قوائے دماغ سے سرزد ہوتا ہے جہاں آنکھ، ناک، کان بے کار رہ جاتے ہیں۔ صرف دماغ اور اس کی ابتدائی قوت ہی کام کرتی ہے۔

نیز یہ علم حواس کے جزئیاتی علم سے زیادہ وسیع اور گہرا بھی ہے۔ جو اشیاء کی صورتوں شکلوں سے گزر کر ان کی کلی اور اصولی بنیادوں تک کا بھی پتہ چلا لیتا ہے اور ایک ایسی امتیازی شان لئے ہوئے ہے۔ جو اعضاء احساس میں سے کسی کو میسر نہیں کیونکہ یہ اعضائے حواس محسوسات کی صورتوں، آوازوں وغیرہ کا ادراک تو ضرور کر لیتے ہیں۔ لیکن کسی شعور کے ساتھ نہیں کرتے۔ لیکن دماغ اپنے خاص قوائے ادراک کی وجہ سے اپنے احساس میں باشعور بھی ہے کہ یہ محسوسات کیا ہیں؟ اور انکے اندرون میں کیا کیا کلی نوعیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ جس سے اس محسوس کو وجود مل رہا ہے۔ پس اس کا ادراک محسوسات کی صورتوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے مفہوم و مراد اور معنوی خصوصیات تک کو بھی جوں کا توں قبول کر کے اپنے اندر اتار لیتا ہے۔ جس سے ذہن میں شئے محسوس کی صورت و سیرت اور ہیئت و معنویت دونوں ہی کا نقشہ پورے کا پورا اتر آتا ہے۔ جو شعور کا ابتدائی مقام ہے اور دماغ کو حاصل ہے۔ قرآن حکیم نے اس شعوری جوہر کو فقہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جس کے معنی یہاں فہم معنویت کے ہیں۔

تفقہ بھی درحقیقت قلب ہی کا وصف ہے..... غور کیا جائے تو حواس خمسہ کے علم کی طرح یہ فہم و بصیرت کا علم بھی درحقیقت قلب ہی سے نکلتا ہے۔ جو قلب کے سامنے بواسطہ دماغ ظاہر ہوتا ہے چنانچہ کفار کے سمع و بصر وغیرہ کو جو کان، آنکھ سے ہوتا ہے۔ قرآن نے بے ثمر بتلاتے ہوئے ان کے قلوب سے فقہ و فہم کی نفی فرمائی ہے نہ کہ دماغ سے کہ جب ان میں دل کی سمجھ ہی نہیں اور وہ صرف ظاہری ہیئت یا سطحی معنویت ہی کو دیکھ لیتے ہیں۔ اندر کی بات ان کے دلوں میں نہیں اترتی تو ان کا یہ دیکھنا سننا سب بیکار اور عبث ہے چنانچہ فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا﴾ ① ''ان کے دل ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے''۔ یہاں منکروں کے دیکھنے سننے کی نفی سے جو اس آیت کے شروع میں کی گئی ہے۔ درحقیقت دل کے فہم و فقہ کی نفی مقصود ہے۔ جس سے واضح ہے کہ قلب کی اصلی صفت محض دیکھنا سننا نہیں، بلکہ سمجھنا ہے جس کا شرعی لقب فقہ ہے۔ جو قلب کا ایک طبعی جوہر ہے اور عام اعضاء کے طبعی وظائف کی طرح اس میں ودیعت کیا گیا ہے۔

قلب کا وصف امتیازی تعقل ہے..... لیکن اس طبعی احساس و شعور سے اوپر قلب کی ایک خاص شان اور بھی ہے۔ جس میں اور کوئی عضو اس کا کسی درجہ میں بھی سہیم و شریک نہیں اور وہ یہ کہ قلب نہ صرف محسوسات کی صورت معنویت کو جوں کا توں سمجھ لیتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں تصرف کر کے ان کے تجزیہ بھی کرتا ہے اور بات سے بات پیدا کر کے اس ایک علم سے متعدد علوم کے دروازے بھی اپنے اوپر کھول لیتا ہے یعنی وہ اس

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۹.

ایک محسوس جزئی کی معنویت سے آگے بڑھ کر اس میں سے اس کی علت نکال کر ایک کلیہ بھی بنالیتا ہے، جس سے ہزاروں جزئیات کا فیصلہ اسی ایک محسوس جزئی سے کر دیتا ہے۔ جو شعور وفہم سے آگے کا مقام ہے۔ قرآن حکیم نے قلب کی اس خاص صفت کا نام تعقل یا عقل ارشاد فرمایا ہے۔ جس کے معنی طبعی عقل کے نہیں بلکہ حقیقی عقل کے ہیں۔ جو اشیاء کی حقیقت تک جا پہنچتی ہے اور شئے کی جزئی صورت سے اس کی معنویت سے کلی نوعیت کا پتہ چلا لیتی ہے۔ جو بلاشبہ قلب ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن نے اسے بھی قلب ہی کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ارشاد قرآنی ہے کہ: ﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا﴾ (۱) ''کیا سیر نہیں کی ملک کی، جوان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے''۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ ان منکروں نے زمین کی سیاحت بھی کی ہوگی اور اس کے عجائبات بھی دیکھے ہوں گے جن کی صورتیں اور معنویتیں ان کے دلوں میں اتری ہوں گی جس سے وہ بات کو سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن سمجھ کر جب انہوں نے عقل سے کام نہ لیا، نہ ان عجائبات کے منشاء اور انجام کو سوچا نہ کوئی عبرت وموعظت اس سے حاصل کی اور نہ ہی اپنے مالک حقیقی کو پہچان کر اس کی طاعت وذکر کا کوئی جذبہ ان میں ابھرا۔ تو یہ سمجھنا، بوجھنا سب بے کار اور اکارت ہے۔

ادراک قلب کی دو نوعیتیں...... اس سے واضح ہوا کہ قرآن حکیم نے قلب کے ادراک کی دو نوعیتیں بیان فرمائیں۔ ایک قوت فقہ وفہم جو ایک انفعالی قوت ہے کہ بات کو اس کی صورت ومعنویت سمیت جوں کا توں ظرف قلب میں اتار لیتی ہے اور ایک قوت عقل وکیاست کہ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں فاعلانہ تصرف کر کے انہیں آگے بڑھا دیتی ہے۔ مجمل کو مفصل، مشکل کو مفسر اور خفی کو ظاہر کر کے من بھر علم کو ہزار من کر دکھاتی ہے اور پھر اس میں سے جامع علت نکال کر اس کی جزئیت کو اس جامع علت سے کلیہ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جس سے علم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ پس قلب کی سب سے بڑی اور امتیازی قوت یہی قوت عاقلہ یا صفت عقل ہے۔ جو اپنی ابتدائی بنیاد اور وضع خلقت کے لحاظ سے تو دماغ سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے عمل میں آخری حکم اور منشاء کے لحاظ سے بالآخر قلب سے متعلق ہے۔ کیونکہ قلب ہی انجام کار تمام اعضائے بدن پر جن میں دماغ بھی شامل ہے یکہ وتنہا حکمران ہے اور اسی کے اشاروں پر دماغ سمیت اعضاء کی یہ کائنات چل رہی ہے۔

قدیم وجدید ارباب دماغ کا منتہائے فکر...... عام طور پر ارباب دماغ یا فلاسفہ زیادہ تر عقل ہی کے بندے بنے رہے ہیں اور ان کی آخری پرواز عقل ہی کی عقیدت پر آ کر رک گئی ہے۔ چنانچہ فلاسفہ قدیم نے تو اسے خدائی کا درجہ اور تخلیق عالم تک میں اسے حصہ دار بنا دیا۔ افلاک کی تخلیق ان کے زعم میں عقلوں میں آئی جن میں سب سے بڑی تخلیق کنندہ عقل فعال ہے جسے عقل اول بھی کہا جاتا ہے۔ فلاسفہ حال جن پر سائنس کا روغن بھی چڑھا ہوا ہے اسے کھلے لفظوں میں خدا تو نہیں مانتے اور اس لئے نہیں مانتے کہ ان میں سے اکثر سرے سے خدا ہی کو نہیں

(۱) پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶۔

مانتے۔ لیکن وہ اسے مدبر کائنات پھر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عالم کے تغیرات کا تعلق زیادہ تر عقلوں ہی سے ہے۔ حتیٰ کہ وہ تکوینیات سے گزر کر وحی الٰہی تک کے اوپر عقل کو حکمران بنا دینے کے منصوبے باندھے ہوئے بیٹھے ہیں، اور شرعی امور میں بھی اپنی انہی جزوی اور ناتمام عقلوں کو حکم کا درجہ دیئے ہوئے ہیں کہ جو کچھ ہماری عقلوں کے حلق میں اتر جائے وہی قابل تسلیم ہے ورنہ نہیں۔

عقل کے بارے میں اہل دل کا نقطۂ نظر...... لیکن جہاں تک ارباب قلوب کا تعلق ہے وہ ان خرافات سے الگ رہتے ہوئے اس سے بہر حال انکار نہیں کرتے کہ عقل ایک شریف ترین آلہ شعور وادراک ضرور ہے۔ جس سے بڑی بڑی پیچیدہ علمی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اور وہ ایسے نازک نظری مقام پر کام کرتی ہے جہاں تک حواس کی رسائی نہیں۔ اس لئے دین و دنیا میں اس کا استعمال ضروری ہے۔ بشرطیکہ اسے اسی کی حدود میں رکھا جائے۔ شریعت نے بھی عقل کی فضیلت اور برتری کو ترقی دنیا و آخرت کے لئے تسلیم کیا ہے۔ جس سے کتاب وسنت کی نصوص اور حکمائے اسلام کے حکیمانہ مقالات بھرے ہوئے ہیں۔

عقل کے حقیقی مرتبہ ومقام کی تعیین...... لیکن جہاں تک اس کی کارگزاری کی نوعیت کا تعلق ہے۔ اس کے لحاظ سے وہ کسی مستقل حجت کا درجہ نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے ادراک وشعور میں بھی مستقل نہیں ہے جب تک کہ علم اس کی مدد نہ کرے۔ بغیر علم کے وہ اپنے ادراک وشعور کا بھی وظیفہ ادا نہیں کر سکتی۔ اس لئے نہ وہ مستقل بالا دراک ہے نہ مستقل بالحجیت حتیٰ کہ ایک حد تک حواس خمسہ کے احساسات سے بھی اس کے ادراک وشعور کی نوعیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ حواس خمسہ تو اپنے ادراک میں اشیاء کے موجود ہونے ہی کی محتاج تھے۔ جہاں کوئی شئے موجود ہوئی اور اس کے مناسب حال کسی حاسہ کی گرفت میں آ گئی۔ تو وہ فوراً ہی محسوس ہو جاتی تھی۔ نگاہ کی بن آئی تو اس کی صورت محسوس ہو گئی، کانوں کی بن آئی تو اس کی آوازیں محسوس ہو گئیں اور ناک کی چلی گئی تو اس کی خوشبو، بدبو کا احساس ہو گیا۔

بہر حال حواس کو ادراک کرنے میں صرف اشیاء کے وجود اور موجودگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ معدوم اشیاء میں ان کا احساس کام نہیں کر سکتا۔ لیکن عقل کے ادراک کے لئے کسی چیز کا محض موجود ہو جانا کافی نہیں۔ جب تک کہ حواس وغیرہ کے ذریعہ اس موجود کا علم بھی ذہن میں نہ آ جائے۔ کیونکہ عقل معلومات اور محسوسات ہی میں اپنے تصرفات دکھلا سکتی ہے۔ مجہولات میں نہیں حتیٰ کہ اگر وہ کسی مجہول چیز کو بھی حاصل کرنا چاہے تو معلومات ہی سے حاصل کر سکتی ہے نہ کہ مجہولات سے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کا کام فکر ونظر ہے۔ جو ایک ذہنی کام ہے اور ذہن کے اندر ہی کیا جا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ذہن کے چھوٹے سے ظرف میں کائنات کے بھاری بھاری اجسام اپنے مادی طول وعرض کے ساتھ نہیں سما سکتے۔ بلکہ ان اجسام کی صرف علمی صورتیں ہی ذہن میں آ سکتی ہیں۔ جو مادی طول وعرض سے خالی ہوں۔ تب

ہی فکری حرکت ان میں کام کرسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ ذہن میں ان آئی ہوئی ذہنی صورتوں ہی کا نام علم ہے۔ جو حواس کے ذریعہ آ کر ذہن میں منتقش ہوجاتی ہیں۔ اشیاء کی ان صورتوں کو ذہن میں لے آنے ہی کا نام احساس و ادراک ہے۔ عقل ان ہی محسوسات یا معلومات کے علمی نقشوں میں ترتیب نظر وفکر اور تصرفات کر کے ان سے بطور نتائج کچھ جدید معلومات پیدا کر لیتی ہے۔ خواہ اس طرح کہ ان جزوی صورتوں کے استقراء وتتبع سے کوئی کلیہ بنالے اور اس سے جدید جزئیات پیدا کرلے، یا کسی جامع علت کی بناء پر ایک جزئی پر دوسری جزئی کو قیاس کر کے ایک کا حکم دوسری جزئیات تک پہنچادے، اور اس طرح کئی اور جزئیات پیدا ہوکر اس کے علم میں جدید اضافہ کردیں یا اس جزئی میں سے علمی نکات ولطائف پیدا کر کے ایک گہرے علم کا اضافہ کردے۔ مگر عقل کے یہ سب علمی اور نظری کام ذہن ہی میں ہوتے ہیں جس میں اجسام خود نہیں اتر سکتے۔ بلکہ ان کی علمی صورتیں اترتی ہیں اور انہی میں حرکت فکری اندرون ذہن کام کرتی ہے جس سے نئی معلومات پیدا ہوتی ہیں۔

عقل نہ مستقل بالا دراک ہے اور نہ مستقل بالحجیت ...... جس سے واضح ہے کہ عقل موجودات اجسام میں اس وقت تک کام نہیں کرسکتی۔ جب تک کہ وہ علمی صورتیں اختیار کر کے ذہن کے خزانے میں نہ پہنچ جائے اور ان صورتوں کا علمی انداز سے ذہن میں پہنچانا حواسِ خمسہ کا کام ہے۔ اس لئے عقل اپنے ادراک وعمل میں حواسِ خمسہ کی محتاج نکلی، بخلاف حواسِ خمسہ کے کہ وہ اپنے ادراک میں عقل کے محتاج نہیں، جانور بھی صورتوں، شکلوں اور آوازوں وغیرہ کا ادراک کرلیتے ہیں حالانکہ ان میں عقل نہیں۔

نیز انسان بھی جب صورتوں، آوازوں وغیرہ کا آنکھ، کان سے ادراک واحساس کرتا ہے تو کسی عقلی استدلال یا ترتیب مقدمات سے نہیں کرتا۔ بلکہ بلاشعور بھی اگر آنکھ کسی صورت پر پڑ جاتی ہے تو وہ بلاسوچے سمجھے اسے فوراً ہی محسوس کرلیتی ہے اسے کسی عقلی دلیل کی اس احساس میں حاجت نہیں پڑتی۔

پس عقل کا علم کتنا بھی بڑا اور شریف ہو۔ مگر موقوف ہے حواس اور ان کے محسوسات پر اور حواس کی علم کتنا بھی عقلی علم سے کم مرتبہ ہو۔ مگر وہ عقل اور عقلی استدلال پر موقوف نہیں اور نہ اس کا محتاج اس لئے عقل ہی اپنے کام میں حواس کا محتاج نکلتی ہے۔ حواس اپنے کام مین عقل کے محتاج نہیں ہوتے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عقل اپنے کام میں علم کی محتاج ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ عقل مستقل بالا دراک نہیں کہ بلا علم کے خود سے اپنا کام کرجائے۔ بلکہ اس میں دومحتاجگیاں ثابت ہوئیں۔ ایک اشیاء کی خارج میں موجودگی کی کہ معدومات میں عقل بیکار ہے اور ایک ذہن میں ان کے معلوم ہونے کی کہ مجہولات میں بھی وہ بے کار ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ خود تنہا عقل جیسے بالا دراک نہیں۔ ایسے ہی مستقل بالحجیۃ بھی نہیں۔ اس لئے حواس کا علم بہ نسبت عقل کے علم کے زیادہ آزاد اور بے قید ثابت ہوا، اور عقل کا علم بہ نسبت حواس کے علم کے تنگ ثابت ہوا کہ حواس کے بغیر عقل کو اپنے کام کا میدان ہی نہیں ملتا۔

اس لئے اس سابقہ اصول کے تحت کہ جس کے علم وادراک میں قیدیں اور شرطیں زیادہ ہوں گی۔ اس کے علم

کا دائرہ تنگ ہوگا۔ عقل کا علمی دائرہ کچھ زیادہ وسیع ثابت نہ ہوا۔ اس لئے عام تمدنی امور اور بالخصوص دینیات میں عقل کو امام مطلق ماننے والے کافی کمزور بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں۔ جو قطعاً پائیدار نہیں۔

پھر اس عقل کی بدولت فلاسفہ کی جہاں تک رسائی بھی ہوئی۔ تو وہ صرف محسوسات ہی محسوسات ہیں جو حواس خمسہ ہی کے ادراک کا دائرہ ہے اور انتہائی طور پر محدود ہے۔ باقی بڑے بڑے جہان سب آگے رہ جاتے ہیں جہاں عقل کے پر بھی نہیں جم سکتے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

عقل خدائی صفت نہیں ہے...... دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ عقل کچھ ہو بہر حال وہ کوئی خدائی صفت نہیں بلکہ انسان کی اندرون ایک طبعی خلقت ہے۔ جو خدائے برتر کی تخلیق سے اس میں ولادت کے وقت پیدا ہوتی ہے اور موت کی وقت موت کے نذر ہو جاتی ہے چنانچہ اس کی مخلوقیت کا دعویٰ شریعت میں صریح موجود ہے۔ ارشادِ نبوی ہے "اَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ." "پہلی چیز جو (انسان کی خلقی قوتوں میں) اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے"۔

جس سے واضح ہے کہ عقل مخلوق اور جب مخلوق ہے تو محدود بھی ہے۔ کیونکہ مخلوق ہونا ہی حد بندی ہے کہ نیز یہ کہ وہ عارضی ہے۔ کیونکہ مخلوق کہتے ہیں اس کو ہی جس کا وجود اپنا نہ ہو، عارضی ہو اور ساتھ ہی یہ کہ وہ ضعیف بھی ہے۔ کیونکہ ہر مخلوق اپنے خالق کے سامنے ضعیف اور ناتواں ہی ہے۔ اس لئے اس کا علم کس طرح ایسا قوی ہو سکتا ہے جیسا اسے فلاسفہ نے قوی کہا ہے۔ اس لئے اس کے کلیات سے ثابت شدہ بات ظنی ہوتی ہے نہ کہ قطعی جو موجب تعیین ہو اور جب حسیات میں اس کا یہ حال ہے تو اسے دینیات میں کیسے مدار کار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ جس کی بنیاد یقین پر ہے۔

علم انسان کی نہیں بلکہ اللہ کی ذاتی صفت ہے...... ادھر علم کو دیکھا جائے تو وہ انسان کی صفت نہیں اور نہ ہی اس کی ذات میں موجود ہے۔ انسان میں اگر پیدائشی طور پر کچھ ہے تو وہ علم کی استعداد ہے علم نہیں۔ اسی لئے جب وہ دنیا میں آتا ہے، تو علم سے کورا آتا ہے۔ جیسا قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا﴾ "اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا کہ تم کسی چیز کا بھی علم نہیں رکھتے تھے"۔

اور جب دنیا سے جاتا ہے تو علم سے پھر کورا ہو کر ہی چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ "پھر (بوقتِ موت انسان) لوٹا دیا جاتا ہے ارذلِ عمر کی طرف کہ جاننے کے بعد انجام یہ ہو جاتا ہے (کہ کسی شئے کا بھی اسے علم نہیں رہتا)"۔

پس علم کا انسان کے اول و آخر نہ ہونا اور درمیان میں آمد و شد کے درمیان ہونا کہ آیا چلا گیا۔ اس کی واضح دلیل ہے کہ علم انسان کی کوئی ذاتی صفت نہیں۔ جس طرح کہ عقل ذاتی خلقت تھی بلکہ علم خدا کی ذاتی صفت ہے۔ جس کا پرتو عارضی اور وقتی طور پر انسان پر پڑ جاتا ہے اور وہ عالم کہلانے لگتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے حق تعالیٰ ہی کو ذاتی طور پر عالم کہا ہے۔ جس کا علم ازلی، ابدی اور لم یزل و لایزال ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے: ﴿وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ "اور

وہ علیم خبیر ہے“۔اور فرمایا:﴿وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ ”اور وہی ہے سینوں (کی چھپی ہوئی کو) جاننے والا“۔اور فرمایا:﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ﴾ ”اور وہی جانتا ہے (ان کے) سامنے اور پیچھے کی باتیں اور لوگ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے“۔اور فرمایا:﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ ”اور کیا وہ نہ جانے گا اسے جسے اس نے پیدا کیا۔جب کہ لطیف و خبیر وہی ہے، وغیرہ وغیرہ“۔

مخلوق (عقلِ انسانی) غیر مخلوق (علم الٰہی) پر حاکم نہیں ہو سکتی...... پس عقل کا مخلوق ہو کر انسان کی صفت ہونا اور علم کا غیر مخلوق ہو کر خدا کی صفت ہونا۔اس کے سوا اور کسی چیز کا مقتضی ہے کہ انسان میں علم خدا ہی کی طرف سے آ سکتا ہے خود سے نہیں ہو سکتا۔اس کا قدرتی ثمرہ یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ جب خالق کی طرف سے کوئی علم آ جائے تو پھر عقل کے لئے چوں و چرا کی گنجائش نہ ہو۔چہ جائیکہ اسے علمِ الٰہی کے سامنے ایک متوازی حاکم کی حیثیت سے لا کر کھڑا کر دیا جائے یا علم پر عقل کو حکمران تسلیم کر لیا جائے۔ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خالق پر مخلوق حاکم ہو جائے یا غنی پر محتاج حکم چلائے اور طاقتور پر ضعیف و ناتواں کا اقتدار قائم ہو جائے جو بداہتہ خلاف عقل ہی نہیں حماقت و جہالت بھی ہے جسے کم سے کم یہ عارف امت تو نہیں برداشت کر سکتی۔جو علم الٰہی پر ایمان لائی ہوئی ہے کوئی جاہل یا بے قید امت مانے تو مانے۔بنابریں عقل کا کام اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ علم الٰہی اور کلام ربانی آ جانے کے بعد اسے سمجھ لے مان لے اور مان کر اسے اس کے دائرہ میں محدود رکھ کر اس میں غور و تدبر کر لے اور استنباط و اجتہاد کے ذریعہ اس کے چھپے ہوئے علمی خزانوں کو واشگاف کر دے اور ساتھ مخلوق کو خالق حکمران بنانے والوں کا انجام بد دیکھ کر عبرت و موعظت حاصل کرے۔

عقل کا سرچشمہ قلب ہی ہے......اور جب یہ عقل بنصِ قرآنی قلب ہی کا ایک آلہ ادراک ہے۔جیسے حواس خمسہ بھی اس کے آلات ادراک تھے۔تو ظاہر ہے کہ حقائق میں یہ عقلی تدبر اور اجتہاد و استنباط بھی قلب سلیم ہی کا کام نکلتا ہے۔جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ عقل کا سرچشمہ بھی آخر کار قلب ہی ہے۔جیسا کہ حس کا سرچشمہ بھی قلب ہی تھا پس جیسے حسیاتی علوم قلب کے تھے۔ایسے ہی عقلیاتی علوم بھی قلب ہی کے علوم ثابت ہوئے۔گو کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ حس اور عقل کی قوتیں دماغ میں ہیں، قلب میں نہیں جیسا کہ ظاہری طور پر ایسا ہی محسوس بھی ہوتا ہے بلکہ انسانوں کا ایک بہت بڑا گروہ یہی یقین رکھتا ہے کہ عقلی اور حواسی قوتوں کا مرکز دماغ ہے۔لیکن یہ ان قرآنی دعووں کے منافی نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ حسی اور عقلی قوتیں دماغ میں ہوں اور دماغ کی باگ ڈور دل کے ہاتھوں میں ہو۔جو قلب کے اشاروں پر چلتا ہو۔اس لئے ان قویٰ کو دماغی مان کر بھی انہیں قلب کی حکومت کے نیچے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔جب کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ عقلی قوتیں بھی جب ہی کچھ سوچ سکتی ہیں۔جب دل ٹھکانے ہو اگر قلب میں تشویش اور اضطراب و بے چینی ہو یا وہ کسی دوسرے مشغلہ میں منہمک ہو تو عقل سوچنے پر بھی قادر نہیں ہوتی۔چہ جائیکہ کچھ

نتائج برآمد کر سکے۔اس سے واضح ہے کہ دماغ اوراس کی عقل دل کے تابع ہے دل جمعی کے ساتھ دل کا اشارہ ہوتا ہےتو عقل اور دماغ بتعمیل قلب سوچ بچار میں لگ جاتے ہیں۔ورنہ معطل رہ جاتے ہیں۔

حقائق اشیاء تک عقل کی بھی رسائی نہیں ہے......اس بحث سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ عقلی علوم بھی کلیتہً باطن شئے اور حقیقت اشیاء تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ عقل کا ادراک حواس اور محسوسات کے تابع ہے اور محسوسات اپنی ذات سے ظاہری چیزیں ہیں۔جن کا یہ ظاہر ہی حواس سے علم میں آتا ہے۔حقیقت نہیں کھلتی تو عقل بھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے گی۔گواس کے علوم کلیاتی ہونے کی وجہ سے ایک حد تک باطنی ہوں۔مگر اپنے منشاء کے لحاظ سے وہ بھی ظاہری ہی کہلائیں گے جنہیں حقیقتہ الامر سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔اسی لئے فلاسفہ روزگار عقل کو امام مطلق ماننے کے باوجود آج تک کسی ایک چیز کی بھی حقیقت نہیں بتلا سکے۔بقول لسان العصر اکبر مرحوم کے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

پس قلب کے یہ تمام علوم جو حواسِ خمسہ یا عقل کے واسطے سے اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔حقیقت کے آئینہ دار نہیں ہیں۔اس لئے ان عقلی علوم کو بھی تمام علم اور کامل علم نہیں کہا جائے گا جس کی حقیقت تمیزٌ بین الاشیاء ہیں۔

پس قلب ان آلات حس وعقل سے جو کچھ بھی دیکھتا سنتا ہے۔وہ اسی ظاہری عالم کی باتیں ہوتی ہیں۔اس لئے اس جہان سے متعلق اس کی یہ معلومات بھی ظاہری ہی کہلائیں گی۔خواہ وہ حسی ہوں یا عقلی جن کا حقائق اصلیہ سے تعلق نہ ہوگا۔پس قلب کا یہ بالواسطہ علم خواہ حسی یا عقلی، علم ظاہر کے سوا کچھ نہیں۔محسوسات کا ظاہری ہونا تو کھلا مشاہدہ ہےاور معقولات کا ظاہر ہونا اس سے نمایاں ہے کہ عقل کی دوڑ دھوپ کا دائرہ یہی حسیات ہیں۔اس لئے اس کے معقولات کو بھی ظواہر ہی کا علم کہا جائے گا نہ کہ علم باطن،اس لئے وہ تمام علم یا مطلقاً علم نافع نہ ہوگا کہ اسے دارین کے بنیادی نتائج وآثار کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے کہ اس سے ساری غیبی حقیقتیں کھل جائیں اس لئے جیسے اعضاء حواس کو حقیقی معنی میں عالم مدرک نہیں کہا جائے گا۔ایسے ہی اعضاء دماغ اوراس میں بھری ہوئی عقل محض کو بھی حقیقی مدرک نہیں مانا جائے گا جبکہ وہ بغیر اس ظاہری علم کی مدد کے اپنا کام ہی نہیں کرسکتی۔

12 **حقیقی علم وادراک صرف قلب کی خصوصیت ہے**......اس لئے اب آخری علم وہ رہ جاتا ہے جو براہ راست اور بلاواسطہ قلب ہی سے متعلق ہو۔جس میں کسی بھی کھلے یا چھپے عضو کا واسطہ نہ ہو۔بلکہ قلب ہی اپنے اندرونی قوت سے اس کا ادراک کرتا ہواور ایک ایسے چھپے ہوئے جہان کی چیزوں کا ادراک کرتا ہو کہ وہ حواس اور عقل کی گرفت سے باہر ہوتو قدرۃً وہاں حس وعقل کام ہی نہیں دے سکتیں۔

سواگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو واضح ہوگا۔قلب کا واسطہ اسباب علم،ان تمام ادراکات حواس وعقل سے بدرجہا بالاتر اور گہرا علم ہے جس کی کرشمہ سازیاں اور شعور وادراک کی رعنائیاں محیّر العقول ہیں۔نہ اس کے علم وادراک میں وہ قیدیں اور شرطیں ہیں۔جو ان اعضاء حواس اور اعضاء دماغ کے علوم میں تھیں اور نہ ہی وہ اپنے

افادہ واستفادہ میں وہ محتاجگی اور پابستگی لئے ہوئے ہے۔ سو اسی مذکورہ اصول کو سامنے رکھ کر کہ جس عضو کے علم و ادراک میں ظواہر کی قیود وشروط زیادہ نہ ہوں گی۔ اسی حد تک اس کا علم وسیع، ہمہ گیر اور کمال تمیز کا حامل ہوگا۔

اگر ہم غور کریں تو واضح ہوگا کہ قلب کا علم ان تمام رسمی قیود سے آزاد ہے۔ جو بدن کے دوسرے اعضاء پر عائد تھی۔ قلب کے علم میں نہ زمان کی قید ہے نہ مکان کی، نہ جسم کی شرط ہے نہ روح کی، نہ حسیات کی پابندی ہے نہ معنویات کی، نہ قرب کی حد بندی ہے نہ بعد کی، نہ تقابل کی ہے نہ جہات اور سمتوں کی، نہ اتصال کی ہے نہ انفصال کی۔ بلکہ اس کے علم کے سوتے شش جہات میں بہتے ہیں اور وہ اگر کسی چیز کے ادراک کرنے پر آجائے تو اس کی صورت سے لے کر مادہ تک اور مادہ سے لے کر حقیقت تک اور حقیقت سے لے کر اس کی وجودی نسبت تک ہر ہر چیز کی حقیقت کھول کر دیتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی کائنات میں حقیقی مدرک اور اصلی عالم قلب ہی ہے۔

وہ محسوسات کا ادراک تو بواسطہ حواس کرتا ہے اور معقولات کا ادراک بواسطہ عقل اور وجدانیات کا ادراک بتوسّطِ وحی خداوندی۔ البتہ محسوس ومعقول میں حس اور عقل کے واسطہ بن جانے کے سبب یہ محسوسات اور معقولات حواس اور عقل کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ وہ قلب ہی کے ادراکات ہیں اور وہی صحیح معنی میں قوت حاسہ اور قوت عاقلہ ہے۔

بہر حال یہ سب دلائل اسی کے ہیں۔ جیسے محسوسات کا علم حقیقتاً حواس کا علم نہ تھا، بلکہ دل کا تھا۔ اسی طرح معقولات کا علم بھی دماغ یا عقل کا نہیں، بلکہ دل ہی کا ہے۔ وہ ان کے واسطوں سے اس سطحی اور ظاہری جہان کو دیکھتا ہے۔ اس میں جزئی اور اصولی طور پر غور کرتا ہے اور اقلیم بدن کی تدبیر کرتا ہے۔ جس سے یہ جسمانی زندگی استوار ہو جاتی ہے اور اس کے تمام وسائل بواسطہ حواس وعقل دوربین مہیا کر کے تمدن کی بنیادیں ہموار کر لیتے ہیں، تاکہ نفس انسانی دنیوی زندگی براحت بسر کر سکے۔

حسیاتی اور عقلی علوم کا منتہا خوبصورت سامان ہیں خوش سیرت انسان نہیں...... لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان ظاہری علوم سے خواہ وہ حواسِ خمسہ کے ہوں یا عقل کے ظاہر آرائی ہی قوت مل سکتی ہے۔ صورت صورت ہی کو جنم دے سکتی ہے نہ کہ حقیقت کو۔ مادہ مادیات ہی کو نمایاں کر سکتا ہے نہ کہ روحانیات کو اور معقول معقول ہی کو سامنے لا سکتا ہے نہ کہ وجدان اور ضمیر کو۔ اس لئے تجربات ومشاہدات اور اصول کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ حواس خمسہ کی صورت آرائیوں کا یہ علم جو سائنس کے مرکب پر سوار ہو کر آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ دماغی عقلیات کا یہ علم جو فلسفہ کے کاندھوں پر چڑھ کر آتا ہے۔ بلاشبہ اچھے اچھے خوب صورت سامان تو پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اچھے اور خوش سیرت انسان نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ حسیاتی علم وضع ہی کیا گیا ہے، صورت آرائی کے لئے نہ کہ حقیقت نمائی کے لئے، اس سے حقیقت نمائی یا سیرت سازی کی توقع باندھنا خلاف موضوع ہے۔ نیز ایسے ہی یہ عقلیاتی علم بنایا گیا ہے تمدنی نظریات قائم کرنے کے لئے نہ کہ حقائق غیبیہ اور یقینیات کو ضمیر میں جمانے کے لئے پس اس سے غیبی اور بنیادی

حقیقتیں کھول دینے کی توقع باندھنا ایسا ہی ہے۔ جیسے چیونٹی سے پہاڑ اٹھا لینے کی امید رکھنا۔

ان ظاہری علوم سے جب ہر وقت اجسام اور ان کی نت نئی صورتیں اور ان ہی کے عوارض رنگ و بو اور جسمانی لذات سامنے آتی رہیں گی۔ تو دل میں رنگینیوں ہی کے جذبات بھی قائم ہوں گے۔ صورتوں کی رنگینی، گوش نواز نغموں کی افراط، رنگ روپ کے چمکدار نمائشی سامان اور اسباب تعیش و آسائش ہی کے جذبات دلوں میں سماسکیں گے، نہ کہ سادگی و بے تکلفی اور قناعت و کفایت کے اخلاق و دواعی ابھریں گے۔

ادھر بھی حواس خمسہ کی ظاہر نمائی کا یہ علم جب دماغ کی ناتربیت یافتہ عقل کی سان پر چڑھتا ہے اور عقل انہی حسیاتی چیزوں کو استدلالی رنگ دینے پر اتر آتی ہے، تو طرح طرح کے طبعیاتی فلسفے نظریاتی ازم اور نمائشی فارمولے کیون اَزم، کیپٹل اَزم، سوشل اَزم وغیرہ وغیرہ دنیا کے دماغوں پر چھاتے ہیں۔ جس سے نمائشی تمدن نظری طور پر ایک معقول انداز کا فلسفہ نظر آنے لگتا ہے۔ خواہ اس کی حقیقت میں معقولیت کا نشان تک نہ ہو۔ جس سے اس مادی قسم کی معاشرت کو علمی رنگ کی تقویت بھی مل جاتی ہے۔ کیونکہ ان مادیاتی سامانوں کو اگر ایک غیر فلسفی محض اپنی صنعتی مہارت سے بناتا رہے۔ تو وہ زیادہ سے زیادہ صناع اور سامان سازی کا ایک کاریگر کہلا سکے گا۔

لیکن انہی چیزوں کو جب فلسفیانہ نظریات کی آب دے کر کوئی بنانے والا بنائے گا۔ تو اسے ڈاکٹر کا لقب ملے گا اور اب وہ مزدوروں یا صنعت کاروں کی لائن سے اوپر ہو کر فلسفیوں کی موقر لائن میں آ جائے گا۔ جس کی بدولت بظاہر دلائل کی قوت سے ایک ایسی ظاہر داری کا روکھا تمدن اور نمائشی معاشرہ دنیا میں ابھرے گا۔ جس میں تصنع، بناوٹ، نمائش اور گندم نمائی، جو فروشی کے جذبات کام کریں گے۔ جس سے مرنا، جینا اور رہنا، سہنا حتی کہ سامان خورد و نوش اور ضروریات لباس و پوشاک تک سب بناوٹی بن جائے گا اور ان ظاہری علوم سے ساری زندگی ہی ظاہر داری کی ہو کر رہ جائے گی۔ جس میں حقیقی اخلاق، فاضلانہ ملکات، صدق و اخلاص، انسانی اخوت، باہمی ہمدردی اور حقیقت پسندی کے جذبات و عزائم ابھر ہی نہ سکیں گے، جس سے تمدن میں خلوص اور محبانہ تعاون و تناصر پیدا ہو جو تمدن کی حقیقت ہے۔

حسیاتی اور عقلی علوم کے طبعی نتائج بد...... اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ان حسیاتی اور عقلیاتی فنون کی بنائی ہوئی صورتیں حقیقتوں اور معنوی قدروں سے خالی ہوں گی۔ جن کے لئے یہ فنون وضع ہی نہیں کئے گئے۔ تو وہ بے جان لاشوں کی مانند ہوں گی اور سب جانتے ہیں کہ بے جان لاشہ کا انجام گلنے، سڑنے، پھولنے، پھٹنے اور عفونت پھیلانے کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جس سے دنیا کا دماغ پراگندہ ہو کر ہزاروں ظاہری اور باطنی مہلک بیماریاں کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جس میں سب کچھ ہوگا۔ مگر سکون و اطمینان ہی نہ ہوگا۔

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج کی دنیا کے خوش منظر اور نظر فریب سامانوں اور ان کی نئے نئے ڈیزائنوں سے اسباب راحت کی بہتات ہے۔ لیکن راحت مفقود ہے۔ اسباب عیش کی کمی نہیں۔ لیکن عیش عنقا ہے، امن و سکون

کے نام پر ہزاروں خوشنما سامان نئے نئے اسباب معیشت، نئے نئے ڈیزائنوں اور نئے نئے روپوں میں مہیا ہیں۔ لیکن امن وسکون ہی ندارد ہے۔ بلکہ عیش کی جگہ تنگ حالی، امن کی جگہ مار دھاڑ، اور چین واطمینان کی جگہ ہمہ وقتی تشویش اور بے چینیوں نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ قلبی راحت وطمانیت اور ضمیر و وجدان کے سکون کا تعلق اخلاقی بلندیوں اور سچے کردار سے ہے۔ نہ کہ صورتوں کی چمک دمک اور سامانوں کی کثرت سے۔

اسی لئے آج کا انسان صورتاً تو یقیناً انسان ہے اور بہت چمکیلا انسان لیکن سیرت وکردار کے لحاظ سے سانپ، بچھو اور گیدڑ، بھیڑیے سے کم نہیں بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ''سَیَخْرُجُ اَقْوَامٌ حَدَثَاءُ الْاَسْنَانِ سُفَهَاءُ الْاَحْلَامِ یَقُوْلُوْنَ بِقَوْلِ خَیْرِ الْبَرِیَّةِ یَقْرَؤُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَا یُجَاوِزُ تَرَاقِیَهُمْ، اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰی مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ الذِّئَابُ...... '' ''عنقریب کچھ قومیں ابھریں گی نوخیز، بدعقل، باتیں بڑی اصول رنگ کی بگھاریں گے، قرآن کا نام بھی زبانوں پر ہوگا۔ لیکن وہ ہنسلیوں سے نیچے اترا ہوا نہ ہوگا۔ ان کی زبانیں تو عربوں جیسی فصیح وشائستہ ہوں گی۔ لیکن دل ان کے بھیڑیوں کے سے ہوں گے''۔

اور جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے دمشق کی جامع مسجد میں اعلیٰ لباسوں میں سجے ہوئے انسانوں کی بابت بڑی حسرت سے فرمایا تھا کہ ''كَانَ النَّاسُ وَرَقًا لَا شَوْكَ فِیْهِ فَصَارُوْا شَوْكًا لَا وَرَقَ فِیْهِ.'' ''لوگ ہرے بھرے پتے تھے جن میں کانٹے کا نشان نہ تھا۔ لیکن ہوگئے ایسے کانٹے، جن میں پتے کا نشان نہیں''۔

چنانچہ آج نہ اس صورت پسند انسان سے انسان کو چین ملتا ہے، نہ غیر انسان کو، انسان ہی نہیں کائنات کی کسی بھی چیز کو امن میسر نہیں۔ عباد اور بلاد دونوں تباہ حال ہیں، ملک ملکوں کے لئے، شہر شہروں کے لئے، دریا دریاؤں کے لئے اور فضاء وخلاء ساری فضاؤں کے لئے آفات ومصائب کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔ جس کی تصویر قرآن حکیم نے اس طرح کھینچ دی ہے کہ: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ ''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھادے تا کہ وہ باز آ جاویں''۔ اس سارے مہل کہ کی بنیاد ان حسیاتی اور مادیاتی علم کی بنائی ہوئی تمدنی صورتوں کا اخلاقی قدروں سے خالی ہونا اور ان کے صناعوں اور اس نمائش کے علمبرداروں کا مصدر اخلاق ومصدر کمالات حضرت حق جل مجدہ کے تعلق اور اس کی یاد سے یکسر غافل ہو جانا ہے۔

جو اخلاقی قدروں کی جڑ بنیاد ہے قرآن حکیم نے انہی دعویداران علم اور ان کی فلسفیانہ مبلغ علم کی قلعی ان الفاظ میں کھول دی ہے ﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ○ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی﴾ ''سو تو دھیان نہ کر اس پر جو منہ موڑے ہماری یاد سے اور کچھ نہ چاہے مگر دنیا کا جینا۔ بس یہیں تک پہنچی ان کی سمجھ۔ تحقیق تیرا رب ہی خوب جانے اس کو جو بہکا اس کی راہ سے اور وہ خوب جانے اس کو جو راہ پر آیا''۔

نیز اس لئے قرآن حکیم نے اس صورت سازی اور صورت بازی کے علم کو ظاہری علم فرما کر اشارہ فرما دیا ہے۔ کہ اس ظاہری علم میں کوئی باطنی حقیقت نہیں۔ جو اس علم کو جاندار بناتی، اس لئے یہ رسمی اور نمائشی علم خواہ سائنس کا ہو یا ریاضی کا، مساحت کا ہو یا فلسفہ کا، جب بھی اخلاقی قدروں سے خالی ہوگا۔ تو وہ انجام میں غفلتوں ہی کا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ''جانتے ہیں اوپر اوپر دنیا کے جینے کو اور وہ لوگ آخرت کی خبر نہیں رکھتے''۔

قلبی ادراک کے دو علمی رخ ...... پس اس اصول پر کہ صورت بغیر حقیقت کے لاشہ اور گندگی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس قلب انسانی کو جہاں یہ علمی رخ عطا فرمایا کہ وہ اس ظاہری علم سے جو حواس وعقل کے راستہ سے اس میں نمایاں ہوتا ہے اور اس سے مادی زندگی کی دل فریب نقشے اور رنگین تمدن کی رنگین صورتیں اور ڈیزائین بنتے ہیں۔ جس میں آنکھ کے لئے دیدہ زیب مناظر، کانوں کے لئے سمع نواز آوازیں، ناک کے لئے پاکیزہ خوشبوئیں، زبان کے لئے خوش ذائقہ غذائیں، ہاتھ پاؤں کے لئے نرم وگداز بدن، چھونے اور پکڑنے کے لئے خوش گوار چیزیں، تن خاکی کے لئے راحت دہ بلڈنگیں ہوں۔ تاکہ نفسِ انسانی کے لئے ان معلومات اور ان محسوسات سے تسکین نفس اور لذت بدن کا سامان میسر آ جائے۔ وہیں اس انسانی قلب کو حق تعالیٰ نے ایک دوسرا علمی، رخ بھی بخشتا ہے۔ جس کی بدولت قلب کے لئے بلاواسطہ حواس وعقل دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے اور سمجھنے کے کچھ معنوی سامان مہیا ہوتے ہیں۔

بالفاظ دیگر اس مجموعہ عجائبات (قلب انسانی) میں ایک دریچہ اگر اس کی سمت اسفل میں کھولا تھا۔ جس سے وہ بتوسّط حواس وعقل اسی حسّی اور نمائشی جہاں کو دیکھتا تھا تاکہ اس کائنات بدن کے لیے اپنے اسی ظاہری علم سے بدنی اور جسمانی سامان فراہم کرے۔ تو دوسرا دریچہ اس کی سمت بالا میں کھولا ہے۔ جس سے وہ اس غیبی جہان کو دیکھتا ہے۔ جہان معارف الٰہیہ، اخلاق ربانی، لذات روحانی اور مقامات باطن مثل محبت والفت، انس وموانست، ہمدردی وخداترسی، اطاعت الٰہی اور بندگی حق کے ذخیرے جمع ہیں۔ تاکہ قلب اپنے اس باطن علم سے بلاتوسط حواس وعقل بالہام ربانی اپنی اخلاقی قدریں درست کرے۔ جس سے دنیا میں امن سکون کی فضا ہموار ہو اور یہ کائنات اطمینان وچین کی زندگی بسر کر سکے۔

قلبؐ کی مادی اور روحانی ادراکات میں مشابہت ...... پس یہاں اگر علم ظاہر کا واسطہ حواس، اور عقل ہیں۔ جن کے راستہ سے یہ حسی علم قلب میں آتا ہے اور اس سے وہ کائنات بدنی کی تدبیر کرتا ہے تو وہاں اس علم باطنی کا واسطہ وحی والہام ربانی ہے۔ جس کے ذریعہ یہ الہیاتی علوم قلب کے وجدان پر مترشح ہوتے ہیں۔ جن سے یہ قلب اپنی کائنات روحانی کی تدبیر کرتا ہے۔ یہاں کا دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا چہرے کی آنکھ، کان، ناک سے ہوتا ہے اور وہاں کا دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا دل کی اندرونی آنکھ، ناک وکان سے ہوتا ہے۔ یہاں سونگھنے سے چکھنے سے تن وجان کو قوت ملتی ہے اور وہاں کے مشاہدہ وسماع سے روح ورواں اور معرفت وایمان کو قوت میسر آتی ہے

یہاں صورتوں کی نمائش ہوتی ہے اور وہاں سیرتوں کی آرائش۔

اگر بدنی زبان کھانے کا مزہ چکھتی ہے۔ جو اس کی مادی غذا ہے تو یہاں دل و جان کی زبان معرفت و ایمان کا مزہ چکھتی ہے۔ جو اس کی معنوی غذا ہے۔ ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: ''ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ مَنْ رَّضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا'' ''ایمان کا مزہ چکھ لیا اور اس شخص نے جو اللہ سے راضی ہو گیا بلحاظ اس کے رب ہونے کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہو گیا بحیثیت رسول ہونے کے اور اسلام سے راضی ہو گیا بلحاظ دین ہونے کے''۔

اگر یہ مادی زبان حلوہ سے مٹھاس کا مزہ چکھ لیتی ہے تو دل کا وجدان ایمان و عرفان کی مٹھاس محسوس کرتا ہے ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: ''مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّجِدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ فَلْيَلْبَسِ الصُّوْفَ تَذَلُّلًا لِّرَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ.'' ''جس کو ایمانی مٹھاس سے لطف اندوزی کا شوق ہو اسے چاہئے کہ اپنے رب کے سامنے اپنی ذلت کے اظہار کے لئے موٹا معمولی لباس پہنے''۔ اگر جسمانی معدہ لذیذ غذاؤں سے سیر ہوتا ہے تو روحانی بطن غیبی لطیف غذاؤں سے سیر ہوتا ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا افطار پے در پے روزے رکھنے پر فرمایا: ''اَيُّكُمْ مِثْلِيْ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ.'' ''تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلا بھی دیتا ہے اور پلا بھی دیتا ہے''۔ اگر پیشانی کی آنکھ خوشنما چہرے، اور اقلیموں کے جمیل مناظر دیکھتی ہے تو دل کی آنکھ رجال غیب (ملائکہ علیہم السلام) کے روشن چہرے اور عجائبات سماوی دیکھتی ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف شمس کے موقعہ پر جنت و دوزخ کو عیاناً دیکھا اور جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں ملاحظہ فرمایا اور شب معراج ایک انتہائی رفیع منزلہ پر پہنچ کر اپنے پروردگار کے جمال کا بھی مشاہدہ فرمایا۔ اگر یہ سر کے کان اس جہان کے حسی نغموں اور آوازوں کو سنتے ہیں۔ تو دل کے باطنی کان اسی جہان غیب کی آوازیں اور روح نواز نغمے سنتے ہیں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملائکہ آکر باتیں کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے یا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کا دور کر کے سنتے سناتے تھے اور بعض اوقات آسمان کے دروازہ کھلنے کا تراقہ بھی سنتے۔

اگر منہ کی ناک ہواؤں کے طفیل پاکیزہ خوشبوئیں سونگھتی ہے تو دل کی اندرونی ناک اس عالم کے روح و ریحان کی خوشبوؤں کا ادراک کرتی ہے۔ جیسے حدیث نبوی میں جھوٹ کی بدبو اور سچ کی خوشبو کا ذکر کر کے فرمایا گیا کہ جھوٹ کی بدبو سے ملائکہ کاتبین عمل دور تک بھاگے ہوئے چلے جاتے ہیں اور جیسے مرنے کے بعد مومن کی روح میں سے مشک کی خوشبو کا مہکنا اور ملائکہ کا اسے سونگھنا بتلایا گیا اور جیسا کہ جان نکالنے کے وقت ملائکہ موت کا مرنے والے کے ہاتھ پاؤں کو سونگھنا کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا وہاں بھی ہے اور یہاں بھی، وہاں حواس سے ہے اور یہاں وجدان

سے، وہاں مادیت سے ہے اور یہاں روحانیت سے، وہاں قلب کے نچلے دریچہ سے اس جہان رنگ و بو کی صورتیں محسوس ہوتی ہیں اور یہاں قلب کے اوپر کے جھروکہ سے اس جہان کی اخلاقی اور روحانی قدریں مشاہدہ ہوتی ہیں، وہاں احساس ہے اور یہاں الہام، وہاں قوائے حساسہ اور عاقلہ ہیں اور یہاں قوائے وجدانیہ، وہ حسیات وعقلیات ہیں اور یہ معنویات، وہاں سائنس اور فلسفہ کی کارگزاری ہے اور یہاں حکمت الٰہی اور وحی ربانی کی۔

حس اور علم کا فرق...... اس سے یہ بھی کھل جاتا ہے کہ فلسفہ وسائنس یا حواس سے جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے اسے حس کہا جائے گا، علم نہیں کہا جائے گا اور یہاں غیبیات کی خبروں سے جو کچھ کھلے گا، اسے علم کہا جائے گا، حس نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ علم کہتے ہی ہیں کسی مخفی اور نگاہوں سے اوجھل چیز کے جان لینے کو، خواہ وہ غیبی اشخاص ہوں یا معنوی امور، علمی جزئیات ہوں یا اصول کلیہ کہ وہ حس سے محسوس نہیں ہوتے۔ اس لئے علم جب بھی ہوگا، مغیبات ہی کا ہوگا نہ کہ حسیات کا اور حس جب بھی ہوگی مشاہدات کی ہوگی خواہ وہ مشاہدہ صورت کا ہو یا مشاہدہ آواز واصوات ہو یا مشاہدہ خوشبو وغیرہ۔ گو توسعاً کبھی حس کو علم یا علم کے احساس سے تعبیر کر دیا جائے۔ بہر حال علم وہی ہے جو حواس سے غائب اور مخفی امور کا ہو اور آلات حس سے اس کا ادراک نہ ہوتا ہو۔ یہ علم جو حقیقی علم ہے اپنی پوری اصلیت اور قطعیت کے ساتھ انبیاء معصومین علیہم السلام پر اترتا ہے اور بطور ظل و فرع کے ان کے اتباع وخدام، اولیاء کرام اور علماء آخرت پر وارد ہوتا ہے

حسیاتی علوم کا سر چشمہ مادہ ہے اور الہامی علوم کا منبع ذات وصفات خداوندی ہے...... بہر حال ظاہری علوم یعنی احساسات اگر مادے کی ذات وصفات سے تعلق رکھتے ہیں کہ مادہ بھی ظواہر میں سے ہے اور یہ علم بھی ظواہر کا ہے۔ تو یہ الہامی علم خدا کی ذات وصفات اور افعال سے متعلق ہے کہ وہی غیب مطلق اور غیب حقیقی ہے اور یہ علم بھی غیب ہی کا ہے۔ پس اگر علم کا شرف معلوم کرے تو جیسے خدا کی ذات وصفات، شرف وعظمت میں سب سے اعلیٰ اور بالا ہے۔ ایسے ہی اس کا علم بھی اور تمام علوم سے اعلیٰ فائق تر اور اشرف تر ہوگا اور جس طرح مادہ کے علم سے مادہ ہی کی ذات وصفات اور اس کے تقاضے کھلتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی ذات وصفات کے علم سے اسی کے اوصاف وکمالات اور انکے تقاضے منکشف ہوں گے۔ اس غیبی علم کے سلسلہ میں چونکہ ذات بابرکات حق کا تعارف حاصل ہوتا ہے جو سارے کمالات وبرکات کا سر چشمہ اور تمام خیرات وحسنات کا منبع ہے اور آدمی مرتے دم تک ذوق وشوق اور محبت الٰہی سے اسی کی طرف دوڑتا اور بڑھتا رہتا ہے اور اسی کی ذات وصفات میں سراپا شوق بن کر گھستا رہتا ہے۔ تو طبعی طور پر اسی کی صفات وکمالات کا اسے انکشاف اور علم یقین بھی حاصل ہوتا رہتا ہے کہ وہ واحد مطلق، علیم وخبیر، حکیم وکریم، رؤف ورحیم، محسن ومنعم، رزاق وفتاح، ہادی برحق اور معلم مطلق ہے۔ تو اس سے قدرتی طور پر انسان میں خدائی اخلاق کے پرتو نمایاں ہوتے ہیں۔ یعنی رحمدلی، سخاوکرم، حیاء وعفت، غیرت وحمیت، جود وعطا، عدل وانصاف، ناداروں کی خبر گیری، مفلسوں کی حاجت برآری، مظلوموں کی دادرسی یتیموں اور بیواؤں کی خدمت گزاری، غریب

الوطنوں کی پشت پناہی، کمزوروں کو قوت رسانی اور عام مخلوق خدا کی خیر خواہی کے ہی اخلاق وجذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے عالم میں چین، ملکوں میں اطمینان، شہروں میں سکون، گھروں میں عافیت، دلوں میں بشاشت اور معاملات میں فرحت ومسرت کے آثار پھیل جاتے ہیں۔ جس سے یہ ظلمت کدہ دنیا جنت نظیر بن جاتا ہے۔ زندگیاں بڑھ جاتی ہے اور آدمی فرشتہ بن کر پردہ دنیا پر نمودار ہوتا ہے۔ جس پر ہمہ وقت رحمت کی بارشیں برستی ہیں اور وہ لوگ بھی اس سے محروم نہیں رہتے، جو اپنی تنگ نظری سے ان بھلوں کو بھی برا بناتے رہتے ہیں۔

ادیم زمیں سفرہ عام اوست ۔۔۔ بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

مادی اور الہامی علوم کے جُدا جُدا آثار وثمرات ..... پھر نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کو بھی سکھ میسر آتا ہے، جس سے وہ اس قسم کے ربانیوں اور حقانیوں کی محبت وعقیدت میں سرشار ہو کر ان کے دعا گو بن جاتے ہیں۔ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں، مچھلیاں اپنے دریاؤں میں اور پرند اپنی فضاؤں میں ایسے انسانوں کی عمر درازی اور اقبال مندی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ملائکہ جیسی مقدس مخلوق ان کے قدموں کے نیچے پر بچھانے لگتی ہے۔

جس کی بنیاد یہ ہے کہ اس علم حقیقی کا پہلا اثر آدمی کے اخلاق میں نمایاں ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ مادہ پرستوں مین مادہ کی ذات وصفات کو رات دن کریدتے رہنے اور اس میں ہمہ وقت گھسے رہنے سے مادیت اور مادی جذبات واخلاق ہی چھاتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے اس امارۃ بالسوء نفس کو قوت ملتی ہے اور وہ اس مادی قوت کے غرور اور وقتی وسائل زندگی کی کثرت کے گھمنڈ میں انجام سے بے خبر ہو کر نفس پروری، خود غرضی، بے حمیتی، طمع نفس، توقیر نفس، تحقیر غیر، نفاق انگیزی، ظلم پروری، قساوتِ قلبی، بے حیائی، دنیا طلبی، تلبیس آمیز آئینی انداز کی چوری، قانونی رنگ کی ڈکیتی اور اپنی حقیر حقیر قسم کی اغراض وخواہشات کی تکمیل کے لئے ہزاروں انسانوں کے جان ومال سے کھیلنے ہی میں لطف محسوس کرتا ہے۔ جس سے دنیا میں بے چینی، بے اطمینانی، باہمی بے اعتمادی، مایوسی، توہم پرستی اور تعصب پسندی کی فضاء بن جاتی ہے۔ جس سے نہ عباد کو چین ملتی ہے، نہ بلاد کو۔ ایسے ہی خدا کی ذات وصفات اور کمالات کی معرفت اور اس میں رات دن گھسنے اور دوڑنے سے اسی کے کمالات کے آثار نفس میں پیوست ہوتے ہیں۔ جس سے وہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اور اس میں خدائی اخلاق رحمت ومحبت، ایثار وغنا، خدمت خلق اللہ، دستگیری ضعفاء اور محبت آخرت وغیرہ کے اخلاق واعمال رونما ہوتے ہیں۔

پھر اسی غیبی علم کے سلسلہ میں ذات وصفات کے علم کے بعد اس کا اہم ترین حصہ اللہ رب العزت کے قانون کے علم کا ہے۔ جس سے اس کی مرضی ونامرضی کا پتہ چلتا ہے اور ان مذکور اخلاق وملکات کو عمل میں لانے کے لئے عمل کے طریقے سامنے آتے ہیں۔ حلال وحرام، جائز ناجائز، روا وناروا کی تمیز پیدا ہوتی ہے اس کے اوامر ونواہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے اور اس کے مخلوق کے حقوق ادا کرنے کے ڈھنگ نمایاں ہوتے ہیں اور اس کے وہ پختہ اور تیر بہدف کے نمونے اور پیغمبری اسوے نمودار ہوتے ہیں، جن سے انسان کی سعادت دنیا اور نجات آخرت رونما ہوتی چلی جاتی ہے۔

علم ربانی کی ساتھ علمِ نفس بھی ضروری ہے...... مگر اسی علم اعلیٰ کا تتمہ ایک اور علم بھی ہے کہ جس کے بغیر آدمی اعلیٰ علم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور وہ خود اپنے نفس کے نشیب وفراز کا علم ہے۔ جس سے نفس کی اصلیت اور اس کی جبلت کے گوشے واشگاف ہوں۔ کیونکہ نفس کی اونچ نیچ کا علم ہو جانے سے واشگاف ہوتا ہے کہ وہ تمام شرور ونقائص اور عیوب وذنوب کا منبع ہے۔ برائیاں اسی سے ابھرتی ہیں اور دینائے اخلاق کو تہہ وبالا کر ڈالتی ہیں۔

چنانچہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کھول دیا ہے کہ انسانی نفس کی ذات میں نہ کوئی کمال ہے نہ ہنر۔ کمال وہنر کی دو ہی بنیادیں ہیں علم اور اخلاق۔ قرآنی روشنی میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ نہ اس کے اول میں علم ہے نہ آخر میں اور درمیان میں جتنا ہے وہ عارضی ہے۔ جو اس کی دلیل ہے کہ اس میں پیدائشی طور پر کوئی علمی کمال موجود نہیں۔ پھر جہاں تک اخلاقی کمال کا تعلق ہے۔ جس سے پاکیزہ اعمال اور خیر وبرکت کی حرکات وسکنات کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ بھی اس میں نہیں، بلکہ ہے تو فتنہ وفساد کے جذبات اور برائیوں کے دواعی جاگزیں ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام کو جب انسان کی خلافت ارضی کا علم ہوا تو انہوں نے جناب باری میں عرض کیا تھا کہ: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ ''کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اور خون بہائے''۔

اِدھر یوسف علیہ السلام کا مقولہ حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ﴾ ''بے شک نفس (امارہ) جو تو سکھلاتا ہے برائی، مگر جو رحم کر دیا میرے رب نے''۔ جس سے صاف واضح ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے جیسے علم لے کر نہیں آیا۔ ایسے ہی کوئی اخلاقی کمال لے کر بھی نہیں آیا۔ ورنہ اسے تعلیم وتربیت کی ضرورت نہ پڑتی اور ظاہر ہے کہ جب اس کے جذبات اس جہل وناتوانی اور بداخلاقی وبدتہذیبی کے ساتھ نمایاں ہوں گے۔ تو وہ سوائے فتنہ وفساد کے اور کیا ہوں گے اور ادھر کمالات علم اور کمالات اخلاق کا سرچشمہ درحقیقت حق تعالیٰ شانہ کی ذات بابرکات ہے۔ جس کے آثار دنیا میں امن وامان اور دیانت وایمان پھیلاتے ہیں۔ جس سے دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جاتی ہے تو ضروری تھا کہ جہاں علم خداوندی انسان کے لئے ضروری ہے۔ وہیں خود اپنے نفس کا علم بھی بتعلیم حق ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے جبلی شر وفساد کو فطرت الہیہ کی خیر وبرکت زائل کر سکے اور اس طرح دنیا بھی اس کے شر سے محفوظ رہ سکے اور وہ خود بھی حفاظت کے دائرہ میں آجائے۔

علم کی دو بنیادی اقسام علم النفس اور علم الرّب...... اس لئے قدرتی طور پر دو علم بنیادی طور پر ضروری ٹھہر جاتے ہیں۔ جو انسان کی صلاح وفلاح کے لئے ناگزیز ہیں۔ ایک علم النفس اور ایک علم الرب پھر دونوں علم جہاں اپنی اپنی خاصیتوں اور تاثیروں کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ وہیں اس وجہ سے بھی فطری ہیں کہ طبعاً انسان سب سے پہلے اپنے قرب کی چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے اور پھر بعید اور دور کی چیزوں کا۔

اور ظاہر ہے کہ انسان کا نفس جس قدر انسان سے قریب ہے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ سو اگر کسی کو اتنے قرب اپنا بھی علم نہ ہو تو اس سے زیادہ جاہل اور کون ہو سکتا ہے اور ادھر اس سے بھی زیادہ قریب تر اس کا رب ہے کہ خود

نفس بھی اپنے سے اتنا قریب نہیں۔ تو اس غیر معمولی قرب پر بھی اگر انسان کو اپنے رب کا علم نہ ہو تو اس سے زیادہ اجہل اور کون ہو سکتا ہے؟

اس لئے قرب و بعد کے لحاظ سے بھی یہ دونوں علم انسان کے حق میں ضروری اور واجب ٹھہر جاتے ہیں۔

قرآن حکیم نے ان دونوں علموں کی ضرورت کی بنیادیں بھی قائم فرما دی ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ○ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِنْ لِقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ﴾ ''ہم دکھلا دیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں اور خود ان کی جانوں میں ہی، یہاں تک کھل جائے ان پر کہ یہ ٹھیک ہے۔ کیا تیرا رب تھوڑا ہے اس چیز پر گواہ ہونے کے لئے خبردار وہ دھوکے میں ہیں اپنے رب کی ملاقات سے، خبردار وہ گھیرے ہوئے ہے ہر چیز''۔ ظاہر ہے کہ یہ ارائت آیات (نشانیاں دکھلانا) ہی علم پہنچانا ہے اور وہ علم نفس کے اندر کا بھی ہوگا اور باہر کا بھی جس سے علم النفس اور علم آفاق کی تحصیل کی طرف صاف اشارہ نکلتا ہے۔

پھر اس علم پر تبین حق مرتب کیا گیا ہے اور تبین کے معنی کھول دینے کے ہیں ظاہر ہے کہ ذہن پر یا قلب حق کا کھل جانا ہی علم ہے۔ جس سے علم الرب کی طرف اشارہ ہے اور ساتھ ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ علم النفس یا نفس کے اندر آیات الٰہیہ کا دکھلایا جانا، ہی حق کے دکھلا دیئے جانے کے مبادی میں سے ہے تو اس کا صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معرفت نفس ہی سے معرفت رب کا دروازہ کھل سکتا ہے، جسے عرفاء اسلام نے بلیغ ترین انداز سے اس حکیمانہ مقولہ سے مزید کھول دیا ہے کہ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ......'' ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا بیشک اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔

علم الرب کی عملی تفاصیل کا نام فقہ ہے اور علم النفس کی تفاصیل کا نام تصوف ہے......علم حق اور اس کے احکام کے لئے فقہ ہے۔ جس میں احکام مکلفین کو کتاب و سنت سے اخذ کر کے جمع کر دیا گیا ہے اور علم النفس اور اس کے جبلی دواعی کے لئے فن تصوف ہے جس میں نفس کے تمام مکائد اور اس کی بداخلاقیوں کے اصول اور پھر ان رذائل کو فضائل سے بدلنے کی تدابیر کتاب وسنت سے جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے جب تک اپنے نفس کی جبلتوں کا علم نہ ہو جائے۔ اس وقت تک حق کی فطرتوں سے استفادہ مشکل ہے۔ اس لئے جہاں علم الرب ضروری ہے۔ وہیں علم النفس بھی ضروری ہے، تاکہ ایک طرف شرور و نقائص کی فہرست سامنے آ جائے اور ایک طرف کمالات و مبرات کی تفصیل نمایاں ہو جائے اور اس طرح دنیا فتنہ و فساد سے بچ سکے۔

یہی دو علم ہیں جن سے انسان فرض شناس بنتا ہے، خوشی اور غمی میں اپنے حقیقی فرائض کو نہیں بھولتا دنیا کو چند روزہ اور اس کی لذتوں کو فانی لذت سمجھ کر اپنے ہر کام اور عمل میں آخرت ہی کو سامنے رکھتا ہے۔ اور اسی کو مقصد زندگی اور اپنی حیات مستعار کا نصب العین قرار دے لیتا ہے اور اس طرح تعظیم حق اور خدمت خلق کو اپنا جوہر نفس بنا

کر خاک ناپاک سے جوہر پاک بن جاتا ہے اعمال صالحہ اس سے اولاً بتکلف اور آخر کار بے تکلف سرزد ہونے لگتے ہیں جس سے مخلوق بھی اس پر اعتماد کرتی ہے اور خالق کی رضاء وخوشنودی بھی میسر آتی ہے اور اس طرح دارین کی فلاح و بہبود اس کا نقد زندگی بن جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اسی علم الرب کے پہنچانے کے لئے آتے ہیں...... یہی وہ قلب کا بلاواسطہ علم ہے۔ جس کے پہنچانے کے لئے فلسفی اور سائنس دان نہیں، بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے۔ اسی علم کو بطون غیب سے اس عالم ظاہر میں اتارنے کے لئے ملائکہ معصومین علیہم السلام آسمانوں سے زمین پر اتارے گئے اور اسی کے عملی نمونے دکھلانے کے لئے پیغمبروں اور ان کے مخلص خدام، آئمہ ہدایت، علماء ربانی اور دوریشان حقانی کو مامور فرمایا گیا یہی وہ علم ہے جس کا تعلق مادہ اور صورت سے نہیں بلکہ حقیقتہ الحقائق ذات بابرکات حق سبحانہ وتعالیٰ سے ہے اور جب کہ حسیاتی اور عقلیاتی علم کا آخری منتہا قلب تھا۔ جو بذریعہ حواس خمسہ اور بذریعہ عقل معاش اسے نظریاتی ازموں کمیون ازم، کیپٹل ازم، سوشل ازم وغیرہ اور مشینی عملوں کی صورت سے اس دنیا میں نمایاں کرتا رہا ہے۔ تو اس معنوی اخلاقی اور شرعی علم کا منتہا تو قلب کے سوا دوسرا عضو ہی ہو نہیں سکتا۔

پس یہ علم بطریق اولیٰ قلب ہی کا ہے جو بلاواسطہ حس وعقل محض وحی الٰہی سے ملتا ہے۔ ان رسمیاتی علوم سے اگر نظریاتی فلسفے نمایاں ہوتے تھے۔ جن سے آدمی مادہ کی گہرائیوں تک پہنچ کر مادیات ہی میں گم ہو جاتا تھا۔ تو س خدائی علم سے دینی حکمتیں، فقہی مسالک اور وصول الی اللہ کے طرق نمایاں ہوتے ہیں جن سے آدمی حق کی گہرائیوں میں پہنچ کر فانی فی اللہ ہو جاتا ہے۔ جو دوامی بقاء ہے وہاں اگر مشینی عملوں کی صورتیں نمودار ہوتی تھیں تو یہاں قلبی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ جن سے عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کی بدولت آدمی بلاتوسط اسباب بڑے بڑے بیبی جہانوں حتی کہ چاند تک ہی نہیں، فوق سماوات تک جا پہنچتا ہے۔

اور جیسے ان نظریاتی ازموں کے علم وعمل سے دنیا میں ہمیشہ فتنہ وفساد اور اخلاقی گراوٹیں سامنے آتی رہیں اور آرہی ہیں اور انسان انسانیت چھوڑ کر حیوانیت کے گڑھے میں گرتا رہا ہے۔ ایسے ہی ان فقہی اور خدائی مسلکوں کے علم وعمل سے ہمیشہ دنیا میں امن وسلامتی، اخلاقی بلندی اور پاکیزہ عزائم واعمال کے نمونے سامنے آتے رہے ہیں۔ جن سے انسان انسانیت سے بھی بالا ہو کر ملکیت کے آسمانوں پر پہنچتا رہا ہے اور اب بھی سعادت مند قلوب برابر پہنچ رہے ہیں۔ مادی قسم کے نظریات اور فارمولوں سے ہمیشہ فرعون وہامان پیدا ہوئے اور ان روحانی قسم کے فکار واعمال سے صدیق رضی اللہ عنہ وفاروق رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

حسیاتی علوم کی طرح ربانی علوم کا ظرف بھی قلب ہی ہے...... قرآن حکیم نے جیسے حسیاتی اور نظریاتی علوم کو قلب ہی کا علم کہا ہے۔ مگر بواسطہ حواس وعقل جس کی تفصیل گزر چکی ہے ایسے ہی خدائی علم کا ظرف بھی قلب ہی کو تلایا ہے۔ جو اس اقلیم تن میں حقیقی مدرک اور عالم ہے اور وہی اس حسی خول میں ایک لطیفہ ربانی ہے جو اس علم کو اپنے

اندر جذب کرتا ہے کہ اس کی اصلی غذا یہی علم ومعرفت ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ "اور یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگار عالم کا، لے کر اترا ہے اس کو فرشتہ معتبر، تیرے دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا کھلی عربی زبان میں"۔

پس جیسے علوم حواس کا سرچشمہ مادہ اور صورت ہے۔ اسلئے اس علم سے مادہ صورت ہی کو قوت ملتی ہے۔ کھانے پینے اور بارام رہنے سہنے سے بدن اور بدنی قوتیں ہی زور پکڑتی ہیں اور اس سے پھر مزید نمائشی صورتوں اور اسباب تعیش کے نئے نئے ڈیزائنوں کی بجائے حقیقی اور سیرت وکردار کے نئے نئے پاکیزہ نقشے سامنے آتے ہیں۔ جن سے درجہ بدرجہ روحانیت کے مقامات ترقی پذیر ہوتے رہے ہیں۔

اب اگر یہ حقیقی علم اور اس کی یہ اخلاقی قدریں اس نمائشی علم اور اس کی حسی صورتوں کے ساتھ لگ کر اسی میں روح کی طرح سما جائیں۔ تو پھر تمدن کے یہ نمائشی نقشے بے جان باقی نہیں رہ سکتے۔ بلکہ زندہ و پائندہ بن جاتے ہیں۔ جس سے دنیا کو حیات ملتی ہے نہ کہ تباہی وہلاکت، دنیا میں امن وسکون پھیلتا ہے۔ نہ تشویش واضطراب اور بے چینی جیسا کہ خلفاء راشدین اور آئمہ عدل وحق نے دنیا کے نقشوں کو مٹائے بغیر انہیں اخلاقی قوتوں سے جاندار بنا دیا تھا اور دنیا کے پردوں میں دینی زندگی بھر کر اس دنیا کو بھی زندہ جاوید دکھایا تھا۔

ربانی اور حسی علوم کے لوازم اور خاصیات...... جس کا راز یہ ہے کہ اس علم الٰہی کے لوازم میں سے پہلی چیز خشیت اللہ اور خوف خداوندی ہے جس کا طبعی اثر نافرمانی اور بغاوت حق سے گریز اور معصیت سے پرہیز ہے۔

پس عالم دین وہی شمار ہوگا جس میں علم کی یہ خاصیتیں سمائی ہوئی ہوں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل حسی اور فلسفیانہ علم کا خاصہ خوف خداوندی کے بجائے، منافع بدنی کے فوت ہونے کا خوف اور فرمانبرداری حق کے بجائے فرمانبرداری نفس ہے۔ جس کا طبعی اثر معصیت، حق تلفی اور طغیان وسرکشی ہے۔ جس سے عالم میں فتنے، فسادات اور ہنگامے پھیلتے ہیں۔ پس ایک مادی اور طبعی علم کا عالم وہی سمجھا جائے گا۔ جو سب سے زیادہ آزاد فکری، بے باکی اور ذہنی غلامی میں مبتلا ہو۔ حلال وحرام کے فرق سے بے نیاز ہو اور اپنے منافع کی خاطر ایک دنیا کی دنیا کو تباہی کے گھاٹ اتار دینے سے بھی دریغ نہ رکھتا ہو۔ کسی عربی کے شاعر نے خوب کہا ہے ۔

رَضِيْعَا لِبَانٍ حِكْمَةٌ وَّتُقًى وَسَاكِنَا وَطَنٍ مَالٌ وَطُغْيَانٌ

"ایک ہی چھاتی کا دودھ پیا ہے علم اور خشیت الٰہی نے کہ ایک سے دوسرا جدا نہیں ہو سکتا۔ جہاں علم ہوگا۔ وہاں خوف خداوندی ضرور ہوگا (بشرطیکہ تربیت صحیح ہو) اور ایک ہی وطن کے باشندے ہیں مال (وسائل عیش) اور سرکشی کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ وسائل دنیا ہاتھ میں آجائیں گے تو تمرد وبغاوت لازمی طور پر آئے گی (جبکہ تربیت صحیح نہ ہو)"۔

چنانچہ اس علم الٰہی کے آثار خشیت وخوف کے بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ

عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ''اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے''۔ اور پھر اسی ربانی علم کے علماء کا مقابلہ غیر علماء سے کرتے ہوئے قرآن نے ان کا فرق مراتب اور عدم مساوات ارشاد فرمایا ہے: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ، اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ ''کیا جو لوگ (اللہ اور اس کے احکام کو) جانتے ہیں وہ برابر ہو جائیں گے ان لوگوں کے جو جاہل ہیں بلاشبہ ذکر و نصیحت پکڑنا عقل والوں ہی کا کام ہے''۔ اور پھر اسی علم کے حاملین کے روز بروز بڑھنے والے درجات کے بارے میں ارشاد فرمایا: کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ''اور جنہیں علم عطا ہوا ہے ان کے درجات ہیں''۔

علم نافع کی حقیقت و وسعت ...... یہی وہ مراتب و درجات والا علم ہے۔ جس کا لقب علم نافع ہے اور جس کا نفع کسی حد پر آ کر نہیں رکتا بلاشہ دنیا کے تمام علوم وفنون خواہ حیاتی ہوں یا نظریاتی، نفع سے خالی نہیں، سائنس ہو یا فلسفہ، ریاضی ہو یا مساحت، معاشیات ہوں یا اقتصادیات اور تمام علوم وفنون کے نافع ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ ان کی بدولت ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں۔ رہائشی مکانات کی تعمیر، ظروف اور اثاث البیت کی تیاری، لباس اور تن پوشی کے سامان خورد و نوش کے ذرائع، نقل وحمل کے وسائل۔ پھر تجارت وصنعت کے اسباب و موادا نہی کے ذریعہ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ جو یقیناً نافع ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا نفع علی الاطلاق نہیں۔ بلکہ ایک حد تک محدود ہے جو قبر کے کنارہ سے آگے نہیں گزرتا۔

آپ ہوائی جہاز سے لندن اور برلن منٹوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن عرش کرسی اور جنت تک یہ سواریاں آپ کو نہیں پہنچاسکتیں۔ آپ ان فنون کی ساختہ پرداختہ غذاؤں سے دنیا میں پیٹ بھر سکتے ہیں لیکن قبر میں شکم سیری کے لئے یہ کارآمد نہیں ہیں۔ آپ نرم گدیلوں اور تکیوں سے یہاں بدن کو آرام پہنچاسکتے ہیں لیکن قبر وحشر میں یہ گدے، تکیے بے کار ہیں۔ اس لئے ان علوم وفنون کا نفع اسی زندگی کے آخری سانس تک محدود ہے۔

لیکن علم شرائع جو سامان بنانے کے لئے نہیں بلکہ انسان بنانے کے لئے آیا ہے اور صحیح الانسانیت انسان کی گزرگاہ محض دنیا ہی نہیں۔ بلکہ برزخ اور حشر بھی ہے۔ اس لئے اس علم کا تیار کردہ انسان جو انسانی کمالات سے بھرپور ہو اور اس کی راحت وطمانیت خود اس کے اندر ہی مہیا کر دی گئی ہو۔ دنیا میں بھی اس علم سے آرام پاسکتا ہے اور وہاں بھی کیونکہ اس کا راحت وآرام مادی وسائل کے تابع نہیں رہتا۔ بلکہ اس کی راحت اس علم کی بدولت اس کے قلب میں ہوتی ہے۔ جسے کسی بھی جہان کی کوئی چیز زائل نہیں کرسکتی۔ اس لئے نافع مطلق یہی علم ہوسکتا ہے جو انسان میں غناء وطمانیت پیدا کر کے دنیا وآخرت کی تمام راحتیں خود اسی کے اندر مہیا کر دیتا ہے۔ اس لئے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کا سکھ اور چین کبھی زائل نہیں ہوتا۔

پس علی الاطلاق جب بھی علم نافع کا لفظ بولا جائے گا۔ تو اس سے یہی علم شرائع اور علم حقائق مراد ہوگا۔ صرف یہ کہ وہ مکدر عیش اور کدورت آمیز زندگی کا سبب بنیں گے، بلکہ تمدن کے وہی بے جان ڈھانچے اور لاشے پیدا

کریں گے، جن میں تعفن اور بدبو ہوگی اور دل و دماغ پراگندہ ہو کر ہلاکتوں کا شکار بن جائیں گے۔ پھر یہی وہ علم ہے جو قلب کے حقیقی فرائض میں ہے۔ جیسے دیکھنا، سننا کان آنکھ کے فرائض میں سے ہے اور جب قلب علم کا وہی وظیفہ ادا کرے گا، جو قدرت نے اسکے سپرد کیا ہے اور اس علم سے وہ اپنی اقلیم تن کا نظام چلائے گا۔ تو بھی کائنات انسانی کا وہ عدل ہوگا۔ جو حرمان وخسران سے بری ہوگا اور کفران کے عذاب سے انسانوں کو محفوظ رکھ سکے گا۔

اگر قلب کو اس کے اس اصلی علم سے ہٹا کر ظاہر داریوں کے علم میں ہمہ تن پھانس دیا جائے گا تو یہی وہ خسران ہے جس کا ذکر ابتدائی اوراق میں آپ پڑھ چکے ہیں اور اگر اسے ان سب سے معطل رکھ کر جہالت کے قعر میں گرا دیا جائے تو یہی وہ حرمان ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ پھر یہی قلب کا وہ علم ہے جسے علم قطعی کہیں گے جس میں شک وشبہ اور تردد و تذبذب کی گنجائش نہ ہوگی۔ کیونکہ حواس خمسہ یا عقلیات جو معلومات اس دنیا سے بٹور کر لاتے ہیں۔ ان میں شک، وہم، تردد اور تذبذب کی آمیزش ہوتی ہے جو جہل کی اقسام میں سے ہے۔ اس لئے یہ دنیوی علوم جہل آمیز ہوتے ہیں، خالص علم نہیں ہوتے کہ ان میں قطعیت ہو۔

لیکن خدائے برتر کا نازل کردہ علم جو انسانی ضمیر پر بلا واسطہ حواس وعقل اترتا ہے، وہ سرچشمہ فطرت سے نازل ہونے کے سبب کمال قطعیت لئے ہوئے ہوتا ہے، جس میں کسی شک وشبہ یا دوہم وتردد کی آمیزش نہیں ہوسکتی۔ اس لئے وہ مورث یقین واطمینان ہوتا ہے۔ جس سے انسان کی بشاشت وطمانیت روبہ ترقی رہتی ہے اور اس میں حقیقی چین اور سکھ پیدا کرتی ہے۔

بہر حال اخلاقی قدریں علم الٰہی کے خواص وآثار میں سے ہیں اور بداخلاقی کی قدریں ان صورتوں شکلوں اور نمائشی ڈیزائنوں کے حسی علم کے خواص وآثار میں سے ہیں۔ اس لئے یہ دونوں علم اپنی نوعیت اور اپنی خاصیت کے لحاظ سے گو بالکل جدا جدا ہیں۔ لیکن اگر ان ظاہری علوم کا مقصد اس حقیقی علم کو ٹھہرا کر آگے بڑھایا جائے اور ان نمائشی نقشوں کو ان حقیقی قدروں سے بھر دیا جائے۔ تو دنیا کے یہ خوشنما نمونے آخرت میں کام دے سکتے ہیں۔

عصری تعلیم گاہوں کے ماحول میں تبدیلی کی ضرورت ہے...... آج دنیا میں اخلاقی قدریں اگر مفقود ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ علم جس کا نام علم الٰہی ہے، ختم کیا جارہا ہے۔ جو اخلاقی قدروں کا سرچشمہ ہے اور اگر بداخلاقیاں دنیا میں وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تو صرف اس لئے کہ ان رسمیات اور صورتوں کے علم کو بالاستقلال موضوع زندگی بنا کر فروغ دیا جارہا ہے۔ جس میں سوائے ظاہر داری کے کسی قلبی حقیقت کی سمائی نہیں ہوتی۔

چنانچہ آج بہتات ہے تو کالجوں کی اور افراط ہے تو یونیورسٹیوں کی جن میں انہی مادی لذات ومنافع کے لئے حلال وحرام سے قطع نظر کر لینے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ خدائی اخلاق اور خدائی احکام کو پس پشت ڈال دینے کے طریقے تعلیم کئے جارہے ہیں۔ جن سے آدمی حیوانیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور انسانیت کا چولہ اتار پھینکنے ہی کو سب سے بڑی معراج ترقی سمجھ چکا ہے۔ پھر بھی اگر ان میں کچھ اخلاق دوست اور دین پسند افراد نظر آئیں۔ تو یہ

ان کی اپنی سلامتی، فطرت یا گھریلو ماحول یا دیندار ماں باپ کی تربیت کا اثر ہو سکتا ہے نہ کہ خالص اس مادی تعلیم کا۔
ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں کے وجود کے خلاف نہیں۔ بلکہ ان کے لادینی ماحول اور مادہ پرستانہ اخلاقی تربیت کے خلاف ہیں۔ کیونکہ یہ لادینی اور اخلاقی انارکی محض کالج اور یونیورسٹی یا محض کسی کتاب کے نوشتوں کا اثر نہیں۔ بلکہ معلموں کی ناتربیتی اور اور پست اخلاقیوں کے ماحول کا اثر ہے اور پھر اس تعلیمی ماحول کے بگڑنے ہی سے پورا معاشرہ بگڑ جاتا ہے۔ ورنہ آج مدارس دینیہ میں بھی فلسفہ اور مبادی سائنس پڑھائے جارہے ہیں۔ لیکن وہ قلب واخلاق اور اعتقاد پر کوئی مضر اثر نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ پڑھانے والوں کا قلب، دیانت وامانت کا ظرف بنا ہوا ہوتا ہے اور نیک ماحول کا وجود قائم شدہ رہتا ہے۔ اس لئے یونیورسٹیاں مضر نہیں، بلکہ ان کا ماحول مضر ہے۔ اگر انہی یونیورسٹیوں میں مادہ پرستی کے بجائے خدا پرستی کے دواعی پیدا ہو جائیں اور مادی ڈھانچوں میں روحانی قدروں کا رنگ بھر دیا جائے۔ تو یہی مادہ ایک صالح تمدن کا جنم دہند بن سکتا ہے۔ پس ضرورت کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مٹانے کی نہیں بلکہ ان کا نظام اور ماحول بدلنے کی ہے۔

مدارسِ دینیہؔ کے قیام کی ضرورت اور غرض وغایت...... لیکن اگر اس پر قدرت نہ ہو تو پھر دوسری مستقل صورت اس کے سوا اور نہیں ہو سکتی کہ الگ سے ایک صحیح اور مستقل خدا پرستانہ ماحول قائم ہو۔ جس میں علوم خداوندی کی تعلیم اور اس کے تحت اخلاقی تربیت پر پورا زور صرف کیا جائے اور دینی مدارس ملک میں زیادہ سے زیادہ پھیلا دیئے جائیں۔ جو بالآخر اپنے کردار وعمل سے ان دوسرے ماحولوں پر بھی موثر ہوں اور ادھر ان دینی اداروں میں ایسے افراد کی بھرتی کی خاص گنجائش رکھی جائے۔ جو سائنس وفلسفہ زدہ ہونے کی وجہ سے مایوس العلاج مریضوں کی صف میں آچکے ہوں مگر اپنا معالجہ چاہتے ہوں۔ کیونکہ آج کی صورت پرستانہ تمدن کی رنگین صورتوں میں اگر اخلاقی قدریں بھری جاسکتی ہیں اور تمدنی جزئیات کی ان خوب صورت مگر مردہ لاشوں کو روح اخلاق سے زندہ کیا جاسکتا ہے، تو وہ صرف اسی علم سے جو پاک قلوب پر بلاتوسط اسباب غیب سے اتارا گیا ہے۔ جس کا مقصد ہی انسان کو انسان بنانا ہے۔ نہ کہ سامان تیار کرنا، اس لئے اگر ایک طرف قوم کو نئی تعلیم کے ذریعہ زندگی کے ڈھانچے بنانے کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔ تو دوسری صرف انہیں اس دین کی قدیم تعلیم کے ذریعہ ان ڈھانچوں میں روح ڈالنے کے لیئے بھی تیار کیا جائے۔ ورنہ یہ تمدنی صورتوں کی مردہ لاشیں ایک نہ ایک دن دنیا کے دماغ کو پراگندہ کر کے رہیں گی اور پھر ان گلے سڑے ڈھانچوں میں روح آنے کی صلاحیت بھی نہ رہ جائے گی۔ اس لئے اگر آج حواس خمسہ کے سائنسی علوم اور عقل معاش کے فلسفیانہ علوم کی ضرورت ہے تو اس سے کہیں زیادہ قلوب کے اس عرفانی علم کی بھی ضرورت ہے۔ جسے حق تعالیٰ نے اپنی روح فرما کر اسی کو جہانوں کا زندہ کنندہ بتلایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے ﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ٥ صِرَاطِ

اللهِ الَّذِیْ لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ ط اَلَآ اِلَی اللهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ﴾ ”اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان، لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی، اس سے سمجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں اور بے شک تو سمجھاتا ہے سیدھی راہ اللہ کی۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام“۔

دورِ حاضر کی بیمار دنیا کا واحد علاج...... بہر حال اگر آج کی دنیا کا گہرا مرض یہی ہے کہ اس کے نمائشی تمدن میں اخلاقی قوتیں باقی نہ رہیں اور اگر دنیا کی عمومی بیماری یہی ہے کہ اسے سب کچھ ملنے کے باوجود جو چیز نہیں مل سکی، وہ سکونِ قلب اور روحی چین و اطمینان ہے۔ تو اس کا واحد علاج یہی اور صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اسے سرچشمہ طمانیت و بشاشت علم دین اور علم اخلاق یا بالفاظ مختصر ”مذہبی تعلیم“ سے روشناس کرایا جائے اور دین و مذہب کے بنائے ہوئے علمی اور اخلاقی نقشوں پر ان کی تربیت کی جائے۔ جس کا مکمل اور مستند سرچشمہ آج کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے سوا اور دوسرا نہیں۔ اس لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ”لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَاصَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا“ ”اس امت کے آخر حصہ کی اصلاح اسی چیز سے ہوسکتی ہے جس سے امت کے اول حصہ کی اطلاح ہوئی تھی“۔ اور وہ وسیلہ اصلاح یہی روح الٰہی قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات اور تشریحات ہیں۔ جو حدیث اور فقہ میں منضبط اور مدون ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ...... میرا مقصد علم عصریہ سے کلیۃً ہٹانا ان سے نفرت دلا کر کلیۃً بے زار بنانا نہیں۔ کیونکہ جب انسان میں روح کے ساتھ بدن بھی لگا ہوا ہے تو روحانی قدروں کے ساتھ بدنی ضروریات کی فراہمی سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی۔ جس میں خورد و نوش، بود و باش، نقل و حمل وغیرہ کے اسباب، نیز تجارت، زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ کے تمام وسائل داخل ہیں۔ جنہیں سائنس و فلسفہ ہی مہیا کرتا ہے۔ اس لئے جب تک روح کا بدن سے انقطاع کلی نہیں ہو جاتا ان وسائل و اسباب اور ان کی تعلیم سے بھی کلی یکسوئی ممکن نہیں۔ لیکن جب کہ اسی طرح بدن کے ساتھ روح بھی لگی ہوئی ہے۔ تو اس کے تقاضوں سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی بالخصوص جب کہ ایک نہ ایک دن نفس انسانی کا اس بدن سے انقطاع ہوگا۔ تو ظاہر ہے کہ اس وقت جو چیز انسان میں باقی رہے گی، وہ روح ہی روح ہوگی۔ اس لئے اس کی ضروریات کی فراہمی بدنی ضروریات کی فراہمی سے بھی زیادہ ضروری اور ناگزیر ہے۔ بلکہ جب بدن اور بدنی زندگی عارضی ہے اور روح اور روحانی زندگی دوامی ہے۔ تو بدنی ضروریات اور ان کے مہیا کرنے والے علوم و فنون اور ان کے منافع بھی بہر حال عارضی ہی ہوسکتے ہیں اور عقلی قاعدہ ہے کہ عارضی ضرورتوں کی فراہمی بقدرِ ضرورت ہی ہوتی ہے۔ عوارض میں مقاصد کے انداز کا انہاک نہیں ہوتا۔ اس لئے ان عصری فنون سے نہ کلیہ قطع نظر ہی کی جاسکتی ہے اور نہ انہیں مقاصد زندگی بنا کر انہیں ترقی کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اس لئے اصولی بات یہی ہوگی کہ انہیں کسی حد تک باقی رکھ کر ان سے معاش پیدا کی جائے۔ لیکن ہمہ وقتی فکر

مقصد زندگی کا رکھا جائے اور وہ دین ہے جو دنیا میں انسان کو انسانیت سکھلانے کے لئے بھیجا گیا ہے اور جس کے حصول کا واحد ذریعہ یہی دینی اور شرعی تعلیم ہے۔

علم دین ترقی کے لئے اور علم دنیا حصول ضروریات کے لئے ہے......اس طرز فکر کا قدرتی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے علم دین ترقی کے لئے رہ جائے اور علم دنیا وقتی ضروریات کے حصول کے لئے اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهَا'' ''دنیا کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے''۔ اس لئے آج شدید ضرورت ہے کہ مسلمان علم دین کو مقصدی حیثیت دے کر آگے بڑھیں اور اپنی نسلوں کو دین اور تعلیم کے فروغ دینے کے لئے تیار کریں۔ اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں اولین درجہ تعلیم دین ہی کو دیا ہے ارشاد فرمایا کہ: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ ''جیسا کہ بھیجا ہم نے تم ہی میں سے رسول جو پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تمکو اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اولین......اور اس لئے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی بعثت کا اولین مقصد تعلیم دین کو ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''

بعثت کا مقصد ثانی......اس تعلیم کا طبعی اثر اصلاح عمل ہے۔ جس کی اصلاح اور پاکیزگی ہے بغیر علم بھی کار آمد ثابت نہیں ہوتا بلکہ الٹا وبال جان بن جاتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دوسری اہم غرض و غایت اسوہ حسنہ بتلائی گئی ہے۔ جسے قرآن نے تعلیم حکمت سے تعبیر فرمایا ہے اور تیسری غرض تکمیل اخلاق ہے کہ اس کے بغیر عمل صالح کے وجود پذیر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کو تزکیہ سے تعبیر فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ''میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق فاضلہ کی تکمیل کردوں'' فرما کر خلق عظیم کا وہ نمونہ پیش فرمایا کہ دنیا مسخر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر جھکنے کے لے مجبور ہوگئی۔ علم محض کی عظمت و وقعت ضرور کی جاتی ہے۔ لیکن سر نیاز اخلاق و عمل ہی کے آگے جھکایا جاتا ہے۔

پس اخلاق بمنزلہ تخم کے ہیں۔ ان سے پھوٹنے والی شاخیں اعمال صالحہ ہیں۔

بعثت کا مقصد ثالث......پھر اگر کسی تخم پر برگ و بار نہ آئیں تو یہ اس کے سوخت ہو جانے کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے دینی زندگی کا تیسرا بنیادی اور اہم شعبہ تربیت اخلاق نکلتا ہے۔ جس سے اعمال شاخوں کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں اور آدمی اس کے بغیر معیاری انسان نہیں بن سکتا۔ جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ دنیا میں کون ہے جو اپنے قول اور بیان کو خوش نما بنا کر پیش کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جس کا عمل اس کے قول کے موافق

پڑ جائے، تو ٹھیک ہے ورنہ محض قول سے وہ کھینچ کھینچ کر اپنے نفس کو خواہ مخواہ ہلاک کر رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "هَتَفَ الْعِلْمُ بِالْعَمَلِ فَاِنْ اَجَابَ وَاِلَّا ارْتَحَلَ" "علم نے عمل کو پکارا (کہ میرے ساتھ چل) اگر اس نے قبول کر لیا (یعنی اگر وہ ساتھ ہو لیا تو یہ علم عمل کی سواری پر سوار ہو کر اپنے عامل کو عرش تک پہنچا دے گا) ورنہ (یعنی اگر عمل ساتھ نہ ہوا) تو علم کوچ کر جاتا ہے (یعنی کہتا ہے کہ پھر میں بھی نہیں ٹھہرتا)"۔

علم وعمل کی باہمی وابستگی...... اس سے واضح ہے کہ جب تک انسانی زندگی علم واخلاق اور عمل کے ساتھ وابستہ نہ ہو کہ انسان اس میں بند جائے۔ اس وقت تک اس کی زندگی معیاری نہیں بن سکتی کہ لوگ اسے نمونہ سمجھ کر اپنی زندگیاں اس کے حوالہ کر سکیں اور اس کے قول وعمل سے اپنی زندگیاں بنائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے تعلیم کتاب کے ساتھ تزکیہ اخلاق اور تعلیم حکمت کو جس کا دوسرا نام تربیت اور ذہن سازی ہے۔ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے قائم فرمایا اور اپنے رسول کے بنیادی فرائض میں انہیں شمار فرمایا۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت ہی بحیثیت مجموعی نبی کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اس لئے نبی کا یہ فریضہ تعلیم وتربیت اب امت ہی پر عائد ہے۔ امت جب تک اس بنیادی فریضہ کو صحیح طور پر نہیں سنبھالے گی، اس وقت تک وہ صحیح معنی میں امت کہلائے جانے کے قابل نہ بنے گی۔ جس کے لئے وہ کتاب وسنت کی رو سے مامور کی گئی ہے۔

ان صریح احکام قرآن وحدیث کے بعد جس کی تائید عقل وفطرت بھی کر رہی ہیں، آخر امت کو اب اور کسی دلیل کا انتظار ہے؟ اور وہ اس کے سوا آخر کون سی حجت چاہتی ہے۔ جو معاذ اللہ کلام خداوندی سے بھی آگے کی ہو۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ "کیا وہ اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں اور فرشتے، طے ہو جاوے قصہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام"۔

مسلمانہ زندگی کے تین بنیادی شعبے...... بہر حال ایک مسلمان کی دینی زندگی کے تین بنیادی شعبے نکل آتے ہیں۔ علم، اخلاق اور عمل، علم نہ ہو تو راستہ ہی نہیں مل سکتا کہ راہ روی ممکن ہو۔ اخلاق نہ ہوں تو عمل کی قوت میسر نہیں آسکتی کہ آدمی راہ مستقیم پر رواں دواں ہو اور عمل نہ ہو تو معطل قوم کا کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا کہ وہ عزت سے دنیا میں باقی رہے۔

قومی بربادی کے تین اسباب...... اس سے طبعی طور پر کسی قوم کی تباہی اور بربادی کے بھی تین ہی بنیادی اصول نکل آتے ہیں۔ جن سے ایک قوم قعر مذلت میں گر کر دم توڑ دیتی ہے۔ ایک جہالت کہ راستہ ہی دکھائی نہ دے، ایک بدخلقی کہ تہذیب وشائستگی کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جائے اور انسان کی بجائے حیوان بن جائے اور ایک بےعملی کہ سست اقوام کا نتیجہ ہمیشہ ذلت، خواری اور پستی وغلامی نکلا ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی ہلاک ہوئی ہے وہ ان ہی تین بنیادی بیماریوں سے ہلاک ہوئی ہے۔

قومی ترقی کے تین وسائل......اس لئے اس کے بالمقابل یہی مذکورہ تین بنیادی اصول ہمیشہ قوموں کے عروج وارتقاء کا راستہ ثابت ہوئے ہیں۔ایک علم نافع جس سے دارین کی ترقی اور سرخروئی کی راہیں نظر آئیں، دوسرے اخلاق حسنہ جن سے ان راہوں پر چلنے کی قوت ملے اور تیسرے عمل صالح جس سے زندگی کی برتری اور عزت ممکن ہو۔اس لئے مسلمان غور کریں کہ وہ ان تین بنیادی معیاروں کے لحاظ سے آج کس مقام پر ہیں؟ وہ قوم جس کے اسلاف میں بزمانہ خلافت فاروقی تجارت تک کا لائسنس بھی اس وقت تک نہیں ملتا تھا۔ جب تک کہ تاجر بیع وشراء کے پورے مسائل اور فقہ درونی سے واقف نہ ہو جائے، چہ جائیکہ عبادات ومعاملات۔

دور حاضر اور ملت اسلامیہ......اسی قوم کے افراد آج پہچانے ہی جاتے ہیں، جہل ونادانی سے انا اللہ آج علاقے کے علاقے اور بستیوں کی بستیاں ہیں، جن میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی آبادی ہے۔لیکن عالم دین کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔اسی لئے جگہ جگہ وہ بدعات وخرافات اور رسوم ورواج کے بندھنوں میں بندھے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی جہالت سے انہی رسوم ورواج کو دین باور کر کے اپنی دنیا وآخرت خراب کر رہے ہیں۔نہ ان میں قابل ذکر طریقہ پر دینی شعور ہے، نہ دنیوی احساس، تمدنی لائنوں میں صنعتی، تجارتی، سیاسی اور اقتصادی شعور سے بھی عامہ بے بہرہ ہیں۔کیونکہ یہ ساری بنیادیں علم سے قائم ہوتی ہیں۔جب علم ہی صفر کے درجہ میں ہو تو یہ بنیادیں کہاں قائم ہو سکتی ہیں اور جب بنیادیں نہ ہوں تو تعمیر اٹھنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اقوام کی تباہی کی طبعی ترتیب......عملی زندگی میں عامہ منکرات اور فواحش دلوں پر مسلط ہیں۔عمل کی خودساختہ صورتیں مرغوب ہو گئی ہیں اور سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی غیر مرغوب۔گویا مرض جہالت کا بحران اس حد پر آ چکا ہے کہ ذہن کا ذائقہ ہی بدل چکا ہے، کڑوی چیزیں شیریں محسوس ہونے لگی ہیں اور شیریں چیزیں تلخ، جو نتیجہ ہے پیہم بدعملی کی مشق کا اور جب برے افعال عادت ثانیہ بن جاتے ہیں تو قدرتاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو جاتا ہے اور جب اس ترک نصیحت کی بھی عادت جزونفس ہو جاتی ہے، تو نصیحت بھی پھر برائیوں کی ہونے لگتی ہے اور بھلائیوں سے روکا جانے لگتا ہے اور اس کا قدرتی انجام یہی ہوتا ہے کہ بھلائی برائی نظر آنے لگتے اور برائی بھلائی دکھلانے لگے۔العیاذ باللہ جس سے فہم اور ذوق ہی بدل جاتا ہے اور ایک خاص مزاج اور مخصوص ذوق کی قوم ذوق کے تبدیل ہو جانے پر گو نام کے لحاظ سے وہی پرانی قوم کہلائی جاتی رہے۔لیکن حقیقتاً وہ قوم نہیں رہتی بلکہ کوئی دوسری قوم بن جاتی ہے اور بدقسمتی سے آج یہی منظر سامنے ہے۔

اور میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ ان تمام اعضاء بدن کے علمی وعملی فرائض کے ساتھ قلب کو جو فریضہ بخشا گیا ہے۔وہ علم نافع، اخلاق فاضلہ اور افکار صادقہ ہیں۔اگر وہ ان فرائض کو سرے سے ترک کر دیتا ہے تو یہ حرمان ہے اور اگر کچھ دوسرے مصنوعی فرائض اپنے سر لگا لیتا ہے، جس سے اصل فرائض رہ جائیں تو یہ خسران ہے۔آج اگر دیکھا تو دنیا حرمان وخسران دونوں ہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔قلب آج نہ صرف اپنے حقیقی علم کے فرائض سے

محروم ہی ہو چکے ہیں بلکہ علم کے نام سے ایسے مصنوعی فلسفوں اور ازموں کو انہوں نے اپنے اندر بھر لیا جو علم نما جہل ہیں اور جن سے انسان نہ جاہل ہی رہتا ہے اور نہ عالم ہی بنتا ہے۔ بلکہ جہل مرکب کا شکار ہو جاتا ہے۔

پس آج کا انسان جب کہ اپنے تن خاکی کی حکومت اور اس کے عملہ کو قانون الٰہی سے ہٹ کر لاقانونیت کے ساتھ چلا رہا ہے اور علم کی نعمت کو جہالت سے تبدیل کر کے زندگی بسر کر رہا ہے۔ تو بلاشبہ وہ اپنے کو دار البوار (جہنم) کا مستحق بناتا جا رہا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۚ وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ ”تو نے نہ دیکھا کہ جنہوں نے بدلا اللہ کے احسان کو ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں جو دوزخ ہے، داخل ہوں گے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے“۔ ان حالات میں دینی مدارس کا قیام جس طرح اہم واجبات میں سے ہے ایسے ہی ان حضرات کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی بھی اہم فرائض میں سے ہے جو اس دور فتن والحاد میں دینی مدارس لئے بیٹھے ہیں۔

جامعہ اشرفیہ بھوجپور اس سلسلہ کی ایک سنہری کڑی ہے۔ جس کے بانیوں، مدرسوں اور منتظموں نے اپنی جان و مال کی قربانی دے کر اس علمی درسگاہ کو پھر سے زندہ کیا اور اسے بام عروج پر پہنچانے کی سچی تڑپ اور آرزو لئے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ یہ اسی آرزو اور تڑپ کا اثر ہے کہ آج جامعہ اشرفیہ ایک نئی روح کے ساتھ سامنے ہے اور اس میں ارباب کمال جمع ہیں اور اسی قلب کے علم کو اور اس علم سے قلب کو پھر سے زندہ و پائندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ حضرات درحقیقت انہی اسلاف کے اخلاف ہیں۔ جنہوں نے انگریزی تسلط و اقتدار کے وقت جب کہ برطانوی حکومت نے اسلامی علوم وفنون کے سوتے ہر طرف سے بند کر دیئے تھے۔ ان بزرگوں نے اپنی نگاہ دوربین سے مستقبل کا صحیح اندازہ لگا کر آزاد دینی مدارس کا ایک جال ہندوستان میں بچھا دیا تھا، اور اس طرح ناسازگار ماحول میں دین کی ہزاروں شمعیں روشن کر دی تھیں۔ جن کا چاندنا آج تک پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے آج کتنا بھی ناسازگار ماحول کیوں نہ ہو۔ ان کے اخلاف عزائم اور ہمتیں ہارنے والے نہیں ہیں اور توقع ہے کہ یہ حضرات اسی طرح اسلامی علوم وفنون، اور اسلامی معاشرہ کو جوں کا توں باقی رکھیں گے۔ جس طرح ان کے بزرگوں نے اسے باقی رکھا تھا۔

اگر اب بھی جامعہ اشرفیہ سے فیض و برکات کا فائدہ نہ اٹھایا جائے اور دوسرے مریضوں کو بھی اس کا راستہ نہ دکھایا جائے تو انتہائی بدقسمتی ہوگی۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان حضرات کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اس درس گاہ کو علوم قلب کی آبیاری کا وسیلہ ثابت فرمائے۔ علوم نبوت اس سے زندہ ہوں اور سرشاران عمل افراد اس سے ابھرابھر کر دین کے مناد بنیں اور قوم میں دینی انقلاب آئے اور انجام بخیر ہو۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم — روز گارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس — بر رسولاں بلاغ باشد و بس

”وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ۔“

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ

خطباتِ حکیم الاسلام

جلد — ۴

آیات واحادیث پر مکمل اعراب اور تخریج وتحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب ونظر کو بالیدگی اور فکر وروح کو بصیرت وتازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی ومدیر: دارالعلوم رحیمیہ ملتان

تخریج وتحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم ونگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

مقصودِ بعثت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَـا وَسَنَـدَنَـا وَمَوْلَانَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّـــا بَعْـــدُ:...... فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :"إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ① وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :"بُعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ مَکَارِمَ الْأَخْـلَاقِ" ② أَوْ کَمَا قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ. صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ.

احادیث کا مفہوم...... بزرگانِ محترم! یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں ہیں، جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہیں۔ان دونوں احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تشریف آوری، بعثت اور اپنی رسالت و نبوت کی غرض وغایت بیان کی ہے کہ مجھے دنیا میں کیوں بھیجا گیا؟ اور میں کیوں مبعوث کیا گیا؟

تو آپ نے اپنی بعثت کی دو غرضیں ارشاد فرمائیں۔ایک فرمایا:"إِنَّمَـا بُعِثْتُ مُعَلِّمًـا" ③ اور دوسری حدیث میں فرمایا: "بُعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ مَکَارِمَ الْأَخْـلَاقِ" ④

پہلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میں دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ تعلیم دوں اور دوسری حدیث میں فرمایا: میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ پاکیزہ اخلاق کو مکمل بنا کے پیش کروں۔دنیا کے اخلاق کی تکمیل کروں اور دنیا کو خلیق بنادوں۔پہلی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ دنیا کو عالم بنادوں اور دوسری حدیث کا حاصل یہ ہے کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ دنیا کو با اخلاق بنادوں۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم اور تربیت کے لئے دنیا میں تشریف لائے۔تعلیم کے ذریعے علم پھیلتا ہے اور تربیت کے ذریعے اخلاق درست ہوتے ہیں۔تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی دو غرضیں ہوئیں۔ایک علم پہنچانا اور ایک اخلاق درست کرنا۔اس کے بغیر دنیا کی کوئی قوم نہ باقی رہ سکتی ہے نہ ترقی کر سکتی ہے۔

①③ السنن لابن ماجہ، المقدمۃ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، ج:۱، ص:۲۶۵. یہ حدیث ضعیف ہے الضعیفۃ ۱/۸۸، رقم ۱۱۔ ② ④ حدیث صحیح ہے مجمع الزوائد باب حسن معاشرتہ ۴/ ۶۱۔

اگر ایک شخص عالم ہے اور اس کا بہت بڑا علم ہے۔ لیکن بداخلاق ہے، تو اس کا علم کبھی مؤثر نہیں ہوگا، وہ دوسروں کو فائدہ کبھی نہیں پہنچا سکتا اور اگر بہت بااخلاق ہے، نیک خلق ہے، لیکن جاہل ہے، تو محض اخلاق سے وہ دنیا کو تربیت نہیں دے سکتا۔

انسان کی ذات میں علم نہیں ہے...... علم انسان کی ذات میں نہیں ہے، وہ باہر سے لایا جاتا ہے۔ اخلاق اندر موجود ہیں لیکن انہیں درست کیا جاتا ہے۔ تو ایک چیز انسان کے گھر کی ہے، اس کی اصلاح کی جاتی ہے اور ایک چیز سرے سے نہیں ہے۔ اس کو انسان کے اندر ڈالا جاتا ہے۔ تو خلقی طور پر انسان جاہل پیدا ہوا ہے۔ اس میں کوئی علم نہیں تھا۔ حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا اور نکالا۔ کس حالت میں؟ ذرہ برابر تمہیں علم نہیں تھا۔ جاہل مطلق پیدا ہوئے تھے۔ نہ سیاہ وسفید کی تمیز تھی، نہ اچھے برے میں امتیاز تھا، نہ حلال وحرام کا پتہ تھا، بالکل جاہل مطلق تھے، ماں کے پیٹ سے کوئی ہنر لے کر نہیں آئے اللہ نے اپنا فضل کیا۔ ﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ﴾ ② تم میں سننے کی طاقت رکھی، دیکھنے کی طاقت رکھی، سمجھنے اور بوجھنے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات تم سن کر حاصل کرتے تھے۔ کچھ دیکھ کر اور کچھ سنی ہوئی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور وفکر کر کے علم نکالتے تھے۔ اللہ نے یہ طاقتیں تمہارے اندر رکھیں تاکہ علم پیدا کرو، علم کے اندر آؤ۔ علم بھی تمہارے اندر گھسے۔

اس آیت سے معلوم ہوا، انسان کی ذات میں علم نہیں ہے۔ خالی ہے۔ مگر ہاں صلاحیت ہے کہ اگر علم سیکھنا چاہے تو علم آ سکتا ہے۔ اسی لئے انسان کو جاہل کہا گیا ہے۔ جاہل اسے کہتے ہیں جو علم نہ رکھتا ہو، مگر علم لینے کی اس میں صلاحیت ہو۔ اس دیوار کو ہم جاہل نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ اس میں عالم بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس لاؤڈ اسپیکر کو ہم جاہل نہیں کہیں گے، اس لئے کہ یہ عالم بن ہی نہیں سکتا یہ شامیانہ اور زمین وآسمان جاہل نہیں ہیں، کیونکہ ان میں عالم بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ انسان ہی کو جاہل کہا جائے گا، کیونکہ اس میں عالم ہونے کی صلاحیت ہے، اس میں استعداد موجود ہے۔

تعدیل اخلاق بلا علم ممکن نہیں...... اسی طرح انسان کے اندر اخلاق تو ہیں، مگر جب تک اس میں علم نہیں ہے وہ معتدل اخلاق نہیں ہیں بلکہ انسان یا ایک کنارے پر رہتا ہے یا دوسرے کنارے پر، جب تک علم نہیں آتا وہ درمیان میں اعتدال پر نہیں ہے۔ افراط اور تفریط کے لئے جہالت کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن عدل اخلاق کے لئے ان کو معتدل بنانے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔

مثلاً صبر ایک خلق ہے، تو صبر کا ایک کنارہ جزع فزع ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آئے تو آپے سے باہر

① ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

ہوجائے، گریبان پھاڑ دے، بال نوچ ڈالے، رخسارے پیٹ ڈالے، منہ نوچ لے۔ یہ خلقِ صبر کا ایک کنارہ ہے یعنی انتہائی بے صبری۔ اور دوسرا کنارہ یہ ہے کہ کتنی ہی مصیبتیں آئیں، کوئی اثر ہی نہ ہو۔ اس کے اندر سرد مہری ہو کہ کوئی فوت ہو جائے تو اس کی آنکھ سے آنسو ہی نہ نکلے، دل میں غم تک نہ آئے، جیسے اپنے کام میں لگ رہا تھا، لگا رہے۔ پتھر کی مانند ہو جائے، اس کی طبیعت میں کوئی اثر نہ ہو۔ تو ایک کنارہ جزع فزع ہے کہ اتنا بے صبر بن جائے کہ آپے سے باہر نکل جائے، ایک کنارہ سرد مہری کا ہے کہ اس پر کوئی اثر ہی نہ ہو۔ وہ بھی صبر نہیں، یہ بھی نہیں۔ صبر درمیان میں ہے کہ اثر تو لے، مگر حدود کے اندر رہے، آپے سے باہر نہ ہو، اسے صبر کہیں گے۔ تو نہ جزع فزع صبر ہے نہ سرد مہری صبر ہے۔ بیچ کا درجہ صبر ہے کہ حدود کے اندر رہے اور حدود جب تک معلوم نہ ہوں، صبر نہیں کر سکتا۔ اخلاق کے لئے علم کی ضرورت پڑی۔ اگر حدود کا علم نہ ہو آدمی صابر نہیں بن سکتا، لیکن افراط و تفریط یعنی رخسارے پیٹنا، منہ نوچ ڈالنا، آپے سے باہر ہونا، اس کے لئے کسی علم کی ضرورت نہیں، جہالت کی ضرورت ہے۔ جتنا ہی جاہل ہوگا، اتنا ہی بے صبرا پن بھی ہوگا، اتنا ہی ماتم نوحہ کرے گا، بین کر کے روئے گا۔ اس لئے کہ اسے حدود کا علم ہی نہیں اور بالکل اثر نہ لے، کتنی ہی اموات ہو جائیں، کتنے ہی غم آ جائیں، اسے فکر ہی نہیں۔ یہ بے فکرا ہے، تو بے فکری کے لئے بھی علم کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے جہالت کافی ہے، لیکن صبر بھی کرے اور حد کے اندر رہے، اس کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام آئے ہیں تاکہ اخلاق کے اندر درمیان کا راستہ بتلائیں۔

خلقِ صبر کی حقیقت...... مثلاً حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور فرمایا: ''وَاِنَّا بِفِرَاقِکَ یَا اِبْرَاهِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ۔'' (1) اے ابراہیم! تمہاری جدائی اور فراق سے ہم غمزدہ ہیں، ہمارا دل متاثر ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ تو فرماتے تھے کہ صبر کرنا چاہئے، حالانکہ آپ رو رہے ہیں۔ فرمایا: رونا قلب کی رحمت کی علامت ہے۔ میں نے جو کہا تھا صبر کرو، اس کا مطلب یہ تھا کہ بین کر کے مت روو۔ نوحے مت کرو، ماتم مت کرو، رخسارے مت پیٹو، گریبان مت چاک کرو۔ اس لئے کہ یہ بے صبری ہے۔ یہ حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار ہے کہ معاذ اللہ آپ نے یہ فعل ٹھیک نہیں کیا کہ فلاں کو موت دے دی۔ میں آپے سے باہر ہوں، تو میں نے حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کے اظہار سے روکا تھا، اس سے نہیں روکا تھا کہ تم آنسو مت نکالو۔ تمہارے دل میں بھی شفقت نہ آئے۔ یہ تو رحمت کی علامت ہے۔ جس مومن کے قلب میں رحمت نہ ہو اس میں ایمان ہی کہاں ہوا؟

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک شخص حاضر ہوا۔ اور زمانۂ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ لوگ بیٹیوں کو زندہ دفن کر

---

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا بک لمحزونون، ج: ۱، ص: ۴۳۹، رقم: ۱۲۴۱۔

دیتے تھے۔ سینکڑوں بچیاں زندہ دفن کر دیں، اس عار میں کہ ہم کسی کے سسر نہ کہلوائیں، کوئی ہمارا داماد نہ کہلوائے۔ وہ شخص آیا، اسلام قبول کیا۔ کسی نے کسی کی موت کی خبر دی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس شخص نے کہا: یارسول اللہ! آپ روتے ہیں۔ میں نے تو اپنی گیارہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا ہے اور وہ چلاتی رہیں۔ اے باپ، اے باپ پکارتی رہیں، مجھے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ فرمایا: تیرے اندر دل ہے یا پتھر ہے؟ یہ قساوت قلب کی بات تھی۔ مومن اور انسان وہ ہے جس کے اوپر غم کا اثر ہو، جو اثر ہی قبول نہ کرے، وہ دل نہیں، وہ پتھر ہے۔

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی کہ صابر بنو۔ اور صابر بنا کسے کہتے ہیں کہ غم کا اظہار بھی کرو مگر حدود سے مت گزرو۔ یہ جبھی ہوگا جب حدود کا علم ہو گا کہ کہاں تک ہمیں رونا جائز ہے، کہاں تک جائز نہیں ہے۔ کہاں تک غم کرنا جائز ہے، کہاں تک جائز نہیں ہے۔ تو جائز و ناجائز کی حدود بتلانا یہ تعلیم ہے۔ غرض اخلاق درست نہیں ہو سکتے جب تک علم نہ آئے۔

حقیقتِ تواضع ...... اسی طرح تمام اخلاق ہیں۔ مثلاً تواضع ہے، اس کا ایک کنارہ تو تکبر ہے کہ آدمی فرعون بن جائے، بڑے بول بولے، اکڑ کر اینٹھ کر چلے۔ دوسرا کنارہ یہ ہے کہ ذلت نفس پیدا ہو جائے۔ بس ہر کس و ناکس کے آگے جھکتا پھرے۔ یہ بھی تواضع نہیں، وہ بھی تواضع نہیں۔ وہ دونوں کنارے ہیں، ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بیچ میں تواضع ہے کہ اپنے نفس کو ذلیل بھی نہ بنائے اور متکبر بھی نہ بنائے۔ ذلت بھی نہ ہو یعنی وقار ہو۔ تکبر بھی نہ ہو یعنی تواضع ہو۔ یعنی اللہ کی خاطر اور اللہ کے سامنے جھکے۔ کسی بڑے کی تعظیم کرے تو لوجہ اللہ کرے۔ خوشامد اور غرض مندی سے نہ کرے، خوشامد اور غرض مندی سے جو تعظیم کرے گا، وہ تواضع نہیں ہوگی، وہ تملق اور چاپلوسی ہوگی۔ اور اگر کسی باکمال کے آگے اللہ کے لئے جھکے وہ تواضع للہ ہو جائے گی، تو نہ تکبر جائز، نہ ذلت نفس جائز۔ دونوں کے بیچ میں تواضع ہے مگر تواضع کے لئے حد کی ضرورت تھی کہ اس حد تک جھکو، اس حد تک مت جھکو اور یہ حدوں کا معلوم ہونا بغیر تعلیم اور انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کے نہیں ہوتا۔

مثلاً سلام کرنا ہے یہ مسلمان کا حق رکھا گیا ہے کہ اسے سلام کرے، لیکن سلام کرنے میں اگر جھک جائے اور اتنا جھکے کہ رکوع کی کیفیت پیدا ہو جائے، یہ مکروہ تحریمی ہے۔ اس لئے کہ رکوع یہ عبادت کا جز ہے اور غیر اللہ کی عبادت نہیں کی جاتی۔ غیر اللہ کے آگے اتنا جھکنا جائز نہیں ہے کہ عبادت کی صورت پیدا ہو جائے۔

سجدہ کرنا عبادت ہے، غیر اللہ کے آگے سجدہ کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ عبادت خدا کے لئے مخصوص ہے۔ بندوں کے لئے عبادت نہیں ہوتی، حدیث میں ہے اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کرو۔ مگر اللہ کے سوا کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں اس لئے میں نے روک دیا۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آکر سجدہ کیا۔ آپ

نے فرمایا: یہ کیا حرکت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے قیصر اور کسریٰ کا دربار دیکھا وہ بادشاہ اپنے آگے سجدہ کراتے ہیں، وزراء سجدہ کرتے ہیں، ان کی رعیت کے لوگ سجدہ کرتے ہیں۔ یا رسول اللہ! قیصر اور کسریٰ سجدہ کرائیں تو اللہ کے رسول بہت باعظمت ہیں، خلق اللہ میں سب سے زیادہ بلند ہیں۔ آپ زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار آئندہ ایسا مت کرنا، سجدہ صرف اللہ کے لئے زیبا ہے۔ کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں۔ اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ (۱)

تو رکوع وسجود کرنا اور جو بھی عبادت کی چیزیں ہیں، وہ غیر اللہ کے لئے حرام اور ناجائز ہیں۔ اس لئے جو ہیئت عبادت کے قریب بھی آ جائے وہ بھی ممنوع قرار دی گئی۔ تو مخلوق کے آگے ذلیل النفس بننا جائز نہیں ہے۔ اور ایک ہے تکبر کہ مخلوق کے اوپر آدمی اپنی بڑائی جتلانے لگے یہ بھی ممنوع ہے۔ یعنی تکبر بھی ممنوع اور تذلل بھی ممنوع۔ ذلیل بننا بھی جائز نہیں۔ متکبر بننا بھی جائز نہیں۔ ان دونوں کے درمیان میں تواضع ہے۔ تو آدمی جھکے مگر لوجہ اللہ جھکے اور اتنا نہ جھکے جس سے عبادت کی شان پیدا ہو جائے۔ انہی حدود کے بتلانے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔

اتباعِ شریعت...... اس سے معلوم ہوا نہ ہم تکبر میں آزاد ہیں نہ تواضع اور وقار میں آزاد ہیں۔ ہم شریعت کی تعلیم کے پابند ہیں۔ وہ جتنا ہمیں جھکا دے گی، اتنا جھک جائیں گے۔ جتنا کہے گی گردن اونچی کر لو، ہم گردن اونچی کر لیں گے۔ جتنا کہے گی ذلت اختیار کرو ہم ذلت اختیار کر لیں گے جہاں کہے گی یہاں بڑائی کی صورت بنالو، ہم بڑائی کی صورت بنالیں گے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ (۲) اے بندو! خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ مونڈھے ہلا کے، چھاتی ابھار کر متکبروں کی چال مت چلو۔ تم دنیا میں بندگی کرنے کے لئے آئے ہو، خدائی کرنے کے لئے نہیں آئے۔ خدائی کے لئے ایک خدا کی ذات کافی ہے۔ جب ہم بندے ہیں تو بندگی کی چال چلیں۔

اور فرمایا گیا کہ ﴿إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾ (۳) تم جو اکڑ کر چل رہے ہو تو زمین کو پھاڑ نہیں ڈالو گے اور پہاڑوں کی بلندیوں کو نہیں پہنچو گے۔ اتنی جگہ میں رہو جتنی جگہ میں ہو۔ کیوں خواہ مخواہ مصیبت بھر رہے ہو؟ کیوں اپنے نفس کو تعب میں ڈال رہے ہو؟ اس لئے روک دیا گیا کہ اکڑ کر مت چلو۔ تو دین یہی ہے کہ آدمی اس حکم کو مان کر چلے۔ لیکن اگر کہیں یوں کہیں کہ اکڑ کر چلو تو ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔ اس لئے کہ ہم حکم بردار بندے ہیں۔ فرمایا گیا جس طواف کے بعد سعی ہو تو ابتداء کے چار پھیروں میں اکڑ کر چلے،

---

(۱) حدیث صحیح ہے۔ مجمع الزوائد للامام الهيثمي، باب حق الزوج على المراة، ج:۲، ص:۲۱۳.

(۲) (۳) پارہ:۱۵، سورة الاسراء، الآية:۳۷.

سینہ ابھار کر مونڈھے ہلاتا ہوا، پہلوانوں کی طرح چلے۔تو یہاں اس طرح چلنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔اگر نہیں چلے گا تو گنہگار ہوگا اور عام اوقات میں اکڑ کر چلنے کی ممانعت ہے، اگر چلے گا تو گنہگار ہوگا۔اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو حکم بردار رہنا چاہئے۔جو شریعت حکم دے، اس کی اتباع کرے۔اگر کہے کہ اکڑ و تو اکڑ لے۔اگر کہے کہ جھک جاؤ تو جھک جائے۔اسلام کے یہی معنی ہیں۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدود بتلانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے۔مادے انسان میں موجود ہیں، ان کی قدریں بتلانے کے لئے آئے کہ یہ قدر اختیار کرو۔

اسلام نے اخلاقی جواہر کو باقی رکھا ہے...... انسان میں تکبر کا مادہ بھی ہے اور تذلل کا مادہ بھی ہے۔ذلیل بننے کا بھی ہے، ابھرنے اور اکڑنے کا بھی ہے۔شریعت نے کسی مادے کو ضائع نہیں کیا، بلکہ کہا کہ باقی رکھو اور جہاں ہم بتلائیں وہاں استعمال کرو۔تکبر کا مادہ بھی کام آئے گا کہ جب کفار کے مقابلہ پر جاؤ تو خوب اکڑ کر پہلوانوں کی سی ہیئت بناؤ تا کہ ان کے اوپر رعب پڑے۔اور جب ایمان والوں کے سامنے آؤ تو جھک کر چلو تا کہ تمہاری رحیمی اور کریم النفسی واضح ہو۔تو دونوں مادوں کو باقی رکھا، ضائع نہیں کیا۔ٹھکانہ اور مصرف بتلا دیا کہ اس طرح سے استعمال کرو۔تو اسلام اس لئے نہیں آیا ہے کہ کسی مادے کو ضائع کر دے۔جو اللہ نے پیدا کیا اور خلقی طور پر رکھا ہے، اسے کھودے، بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آیا ہے۔مثلاً غصہ ہے، حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا: ”عِظْنِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَاَوْجِزْ“ ① یارسول اللہ! کچھ وعظ فرمایئے مگر مختصر۔فرمایا: اِیَّاکَ وَالْغَضَبَ۔وعظ ختم ہوگیا۔لوگو! غصے سے بچتے رہنا۔اس لئے کہ غصے میں سے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔جتنے جذبات بھڑکتے ہیں، اتنا ہی فتنہ پھیلتا ہے۔جب جذبات میں کوئی آپے سے باہر ہوگا، لڑائی ہو جائے گی۔اور قرآن کریم نے فرمایا ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ﴾ ②

”اے پیغمبر! کفار اور منافقین کے مقابلہ میں جہاد کرو اور شدت اور غیظ وغضب ان کے مقابلہ میں دکھلاؤ“۔

یہاں غیظ وغضب اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔تو شریعت اس لئے نہیں آئی کہ غصے کے مادے کو نکال دے، اس لئے آئی ہے کہ غصے کو باقی رکھو مگر ٹھکانے پر استعمال کرو۔جہاں ہم بتلائیں وہاں استعمال کرو، جہاں ہم روکیں وہاں رک جاؤ۔یہ ہمارے بخشے ہوئے جوہر ہیں۔تمہیں حق نہیں ہے کہ تم انہیں کھودو یا نکال دو۔

اسی طرح شہوت کا مادہ رکھا۔شریعت اس لئے نہیں آئی کہ اس کو کھودو۔اگر کھودی گئی تو نسل کیسے چلے گی؟ مگر یہ فرمایا کہ اس شہوت کو زنا میں مت استعمال کرو، نکاح میں استعمال کرو۔تو مصرف اور ٹھکانہ بتلا دیا کہ اس طرح استعمال کرو۔

اخلاقی جواہر میں انسان امین ہے..... حاصل یہ نکلا کہ انسان میں اللہ نے جوہر اور مادے پیدا کئے۔مگر یہ اس کی

① احمد حدیث ابی ایوب انصاریؓ ۴۷/۵ ۴۹۵. حدیث صحیح ہے۔الصحیحۃ ۱/۴۰۰ رقم ۴۰۱۔

② پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۷۳.

دی ہوئی امانتیں ہیں۔انسان ان مادوں میں امین ہے۔اسے یہ حق نہیں ہے کہ اپنے اختیار وارادے اور اپنی تجویز سے استعمال کرے۔جس کی دی ہوئی امانت ہے اسی کی تجویز معتبر ہوگی۔اسی کے کہنے کے مطابق استعمال کرنا پڑے گا۔

اگر آپ کے پاس کوئی شخص روپیہ امانت رکھوا دے تو آپ کو استعمال جائز نہیں، جب تک کہ وہ اجازت نہ دے۔اور اجازت دینے والا جو مالک ہے، اگر وہ یوں کہے کہ تم استعمال کر سکتے ہو مگر فلاں چیز میں، مکان خرید سکتے ہو، دوسری جگہ میں اجازت نہیں دیتا۔ جہاں اجازت دے وہیں استعمال کریں گے، اگر وہ استعمال سے روک دے تو آپ کو کوئی حق نہیں۔مسئلہ یہی ہے کہ امانت جب رکھوائی جاتی ہے تو اس اصل امانت ہی کا واپس کرنا واجب ہے۔ یعنی مثلاً آپ کے پاس سو روپیہ رکھوایا، تو جو روپیہ رکھوایا ہے، وہی بعینہ واپس کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہے کہ آپ نے خرچ کر کے سو اس کی جگہ رکھ دیئے۔ یہ جائز نہیں ہے۔تو امانت میں عین کا واپس کرنا واجب ہے۔اگر آپ خرچ کریں گے تو مالک سے اجازت لینی پڑے گی۔وہ اجازت دے گا کہ تم خرچ کر سکتے ہو۔ جب میں مانگوں واپس کر دینا۔اس وقت عین کو بدلا جائے، اس کی جگہ آپ کوئی دوسری چیز دے دیں یہ آپ کے لئے ناجائز ہے۔

غرض یہ بدن، روح، قوتیں اور مادے ان سب کے مالک حق تعالیٰ شانہ ہیں، آپ نہیں ہیں۔اگر آپ ہوتے تو خود بنے بنائے موجود ہوتے۔ پھر اس کی کیا ضرورت تھی کہ اللہ میاں آپ کو بنائیں جب آپ وجود میں ان کے محتاج ہیں تو مالک وہ ہیں۔ جب وہ مالک بدن ہیں اور بدن میں جتنے جوہر ہیں ان کے بھی، روح میں جتنے ملکات اور قوتیں رکھی ہیں ان کے بھی، سب کے مالک وہ ہیں۔تو آپ کو ان کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ جب تک ان سے اجازت نہ لیں اور جہاں کی وہ اجازت دے دیں وہیں استعمال کرو۔ جب وہ مانگیں گے تو بعینہ اسی طرح سے واپس کرنا پڑے گا۔ یہ جائز نہیں ہوگا کہ آپ یوں کہیں کہ صاحب! وہ بدن تو میں نے استعمال کر لیا۔ میں نے خودکشی کر لی تھی، اب آپ دوسرا بدن بنا لیں، یہ نہیں ہے، اسی بدن کو واپس کرنا پڑے گا۔

اس واسطے خودکشی کو حرام قرار دیا گیا، یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سرکاری مشین ہے۔آپ کو کیا حق ہے کہ آپ اس کو کھو دیں؟ یا خراب کر دیں؟ آپ امانت دار ہیں۔ بعینہ آپ کو واپس کرنا پڑے گا۔ جب ملک الموت آئیں تو سپرد کر دینا پڑے گا کہ روح بھی حاضر ہے، نفس بھی حاضر ہے اور یہ بدن بھی حاضر ہے۔اس لئے کہ کوئی چیز میری نہیں ہے۔تو جب اصل روح، بدن اور نفس کے بھی آپ مالک نہیں ہیں، تو ان کے افعال کے آپ کیسے مالک ہو جائیں گے؟ اور جو ان کے اندر مادے اور جوہر رکھے ہوئے ہیں، ان کے مالک آپ کب ہوں گے؟ ان کے مالک بھی حق تعالیٰ ہیں۔غرض آپ کے نفس میں شہوت کی قوت رکھ دی، غصہ اور غضب کی قوت رکھ دی، تواضع اور جھکنے کی قوت رکھ دی، اکڑنے اور اینٹھنے کی قوت رکھ دی، امانتداری کی قوت رکھ دی اور اس کی کہ دوسروں سے چھین جھپٹ کرو۔ یہ سارے مادے ہیں۔آپ کو اجازت لینی پڑے گی کہ کہاں کہاں استعمال کروں۔شہوت وغضب کو کہاں؟ امانت داری اور چھین جھپٹ کے مادے کو کہاں استعمال کروں؟

انسانی جواہر میں تجویز شریعت کا اعتبار ہے......وہ اجازت دیں گے کہ شہوت کے مادے کو استعمال کر سکتے ہو، مگر نکاح کے ذریعے سے جائز مصرف میں۔ پھر تجویز بھی شریعت ہی بتلائے گی کہ نکاح بھی اگر کرو، تو ماں سے جائز نہیں، بہن سے جائز نہیں، پھوپھی سے جائز نہیں۔

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ﴾ ① ’’تم پر تمہاری مائیں حرام کر دی گئیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری حقیقی بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری حقیقی بھتیجیاں، تمہاری حقیقی بھانجیاں، یہ تم پر حرام کی گئیں الخ‘‘۔ جس وقت شریعت نے اجازت دی کہ اس شہوت کو نکاح کے ذریعے استعمال کرو، تو ساتھ ہی مصرف بھی بتلایا کہ فلاں فلاں جگہ نکاح مت کرنا، ورنہ نکاح نہیں ہوگا۔ جہاں شریعت بتلائے گی وہیں آپ نکاح کر سکو گے۔

اسی طرح غصے اور غضب کی قوت ہے۔ آپ اس میں مختار نہیں ہیں کہ جس پہ آپ چاہیں اکڑ، پھونک دکھانے لگیں۔ جس پہ چاہیں غصہ کرنے لگیں۔ آپ کو شریعت سے مشورہ کرنا ہوگا کہ میں غصے کو کہاں استعمال کروں؟ چنانچہ باپ کے مقابلے میں یہ جائز نہیں کہ آپ غصہ دکھلائیں۔ وہاں فرما دیا گیا ہے: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِیْ صَغِيْرًا﴾ ② ماں باپ جب آئیں تو نیاز مندی کے ساتھ گردن جھکا دو، عجز و نیاز کے ساتھ ان کے سامنے جھکو اور محض جھکنا ہی نہیں، بلکہ زبان سے کوئی کلمہ ایسا مت نکالو جس سے ان کا دل دکھے یا ان کا دل پکڑا جائے، ایسا کلمہ نکالنا جائز نہیں۔

اور پھر یہی نہیں یہ تو اسی وقت کیا جائے گا، جب ماں باپ سامنے ہوں گے کہ ادب سے جھکیں گے بھی اور کلمہ بھی ادب سے کہیں گے۔ غائبانہ بھی ہوں تو اس وقت بھی ان کا ادب و عظمت کرو۔ ﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِیْ صَغِيْرًا﴾ ③ اے اللہ! میرے ان ماں باپ پر رحم فرما، جیسے انہوں نے میرے بچپن میں مجھ پر رحم کیا۔ مجھے اتنے سے اتنا بنایا۔ اس وقت جب میں عاجز اور بے بس تھا، ان کے رحم و کرم پر پل کر آج میں اس قابل ہوا کہ چل پھر کر میں اپنا کام کاج کر سکوں۔ تو جنہوں نے مجھے اس قابل بنایا، بے کسی کی حالت میں مجھ پر رحم کھایا۔ اے اللہ! تو ان کی بے کسی کی حالت میں ان پر رحم کھا۔ تو غائبانہ بھی دعاء کرو۔ سامنے آؤ تو برا کلمہ مت کہو، عمل ایسا مت کرو جس سے ان کا دل دکھے۔ تو فرمایا کہ یہ تکبر و بڑائی اور غصے کا اظہار، اس کا مصرف ماں باپ نہیں ہیں۔ اسی طرح استاذ ہو، اس کے سامنے جائز نہیں کہ آپ اکڑیں یا اینٹھیں یا کبر و نخوت دکھائیں۔

عظمت استاذ......حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’’اَنَا عَبْدُ مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفًا، اِنْ شَاءَ بَاعَ وَاِنْ شَاءَ عَتَقَ‘‘ ④

① پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۲۳۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسرآء، الآیۃ: ۲۴۔

③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسرآء، الآیۃ: ۲۴۔ ④ روایت ضعیف ہے۔ کشف الخفاو مزیل الالباس، للعجلونی، ج: ۲، ص: ۲۶۵۔

”میں اس کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی تعلیم دی۔ چاہے وہ مجھے بیچ دے، چاہے مجھے آزاد کر دے“۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں، انہیں فقہی مسائل میں خنزیر کے بارے میں تحقیق کرنی تھی کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ ایک مسئلہ میں خنزیر کا ذکر کیا، تو اس کی تحقیق کرنی تھی۔ اس کی تحقیق بھنگی سے زیادہ کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتی۔ وہی خنزیر پالتے ہیں، تو حضرتؒ کے گھر کا بھنگی آیا۔ اس سے پوچھا کہ فلاں بات خنزیر کے بارے کس طرح سے ہے؟ اس نے کہا صاحب! یہ ہے۔ اس وقت سے یہ کیفیت تھی کہ جب وہ سامنے آتا اگر بیٹھے ہوئے ہوتے تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کو ہدایا بھیجتے تھے۔ اس کی خدمت کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ”فلاں مسئلے کی تحقیق مجھے اس بھنگی سے ہوئی“۔ وہ بمنزلہ استاذ کے بن گیا عمر بھر اس کا ادب کیا۔ تو اسلام نے استاذ کی عظمت یہ بتلائی ہے کہ اگر ایک حرف سکھلا دے، تمہیں آنکھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔

علمی احسان...... اس واسطے کہ اگر کوئی کسی کو چار پیسے دیتا ہے تو آدمی اس کا احسان مانتا ہے۔ اولاد کو آدمی وصیت کر جاتا ہے کہ فلاں آدمی نے میری خدمت کی تھی۔ تم اس کے نیاز مند رہنا۔ چار پیسے کا احسان مانتا ہے، تو علم کا ایک مسئلہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، علم اللہ کی صفت ہے۔ اس سے زیادہ باعظمت چیز کونسی ہو سکتی ہے؟ تو کوئی کسی کو علم سکھلائے اور اس کی عظمت ضروری نہ ہو؟ ایسا محسن کوئی نہیں۔ جو آدمی کو ایک مسئلہ بھی بتلا دے۔ اس نے دنیا و مافیہا اور آخرت کا راستہ درست کر دیا۔ پیسے سے اگر کوئی کام نکلے گا تو دنیا کا نکلے گا۔ لیکن علم سے آخرت میں، قبر و برزخ میں، حشر میں اور دنیا میں بھی کام نکلے گا۔ ہر جگہ علم کا سکہ چلتا ہے۔ وہاں آپ کے یہ سونے چاندی کے سکے نہیں چلیں گے مگر مسائل کا سکہ چلے گا۔ حتیٰ کہ جنت میں بھی جا کر مسائل کی ضرورت رہے گی، وہاں بھی آپ علم کے محتاج ہوں گے۔ تو جو شخص آپ کے ہاتھ میں علم کا سکہ دے۔ اس سے بڑھ کر کون محسن ہے؟ جب چار پیسے کا احسان کرنے والے کا آپ احسان مانتے ہیں۔ تو ایک مسئلہ بتلانے والے کا احسان کیوں نہیں مانیں گے؟ اس نے آپ کو زیادہ سے زیادہ بڑی دولت دی ہے۔ علم کی دولت چاندی اور سونے کے دولت سے بدرجہا بہتر ہے۔

علم اور مال میں فرق...... حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ علم اور مال میں فرق ہے، وہ یہ کہ مال جتنا خرچ کرو، گھٹتا ہے، علم کو جتنا خرچ کرو، بڑھتا ہے۔ اگر علم کہیں گھٹ جایا کرتا، تو جو حافظ قرآن شریف پڑھانے بیٹھتا، تو جتنی آیتیں بچوں کو سکھلایا کرتا، خود بھول جایا کرتا۔ اس کا علم دوسرے کے پاس منتقل ہو جایا کرتا۔ حالانکہ جتنا پڑھاتا ہے تو استاذ پرانا ہو جاتا ہے، اس کا علم ترقی کر جاتا ہے۔ غرض علم کو جتنا خرچ کرو، بڑھتا ہے، دولت کو جتنا خرچ کرو، گھٹتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ مال کی حفاظت مالک کو کرنی پڑتی ہے۔ چار پیسے ہوں گے تو آپ کو فکر ہے کہیں چور نہ لے جائے۔ تالا لگاؤں، تجوری میں رکھوں، گھر کی کوٹھڑی میں رکھوں اور سو رہے ہیں تو فکر ہے کہ رات کو کوئی چور نہ

آئے۔ تو آپ کو خود مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور علم عالم کی حفاظت کرتا ہے، عالم کو ضرورت نہیں۔ علم خود بتلائے گا کہ یہ خطرے کا راستہ ہے، یہ نجات کا۔ تو علم اپنے عالم کی خود حفاظت کرتا ہے مگر مال اپنے مالک کی حفاظت نہیں کرتا، مالک کو حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ مال آئے گا تو سو مصیبتیں ساتھ لے کر آئے گا کہ حفاظت کرو چور سے اور اس سے وغیرہ وغیرہ۔ اور علم آئے گا تو وہ احسان جتلاتا ہوا آئے گا کہ میں تیرا محافظ ہوں، میں تیری خدمت کروں گا، میں تجھے نجات کا راستہ بتلاؤں گا۔ تو علم جیسی چیز اگر کوئی سکھلائے تو وہ سب سے بڑا محسن ہے کہ اس نے دنیا اور آخرت کا راستہ کھول دیا۔

مال بلا علم......دولت سے راستے نہیں کھلتے۔ اس سے تو آدمی بھکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہاں بھی علم ہی کام آتا ہے۔ اگر یہ علم کے مطابق کمائے اور علم کے مطابق خرچ کرے تو دولت کام دے گی اور اگر جاہلانہ طریق سے کمائے، حلال وحرام کا امتیاز نہ کرے اور خرچ کرنے میں حلال وحرام کا امتیاز نہ ہو، تو دولت مصیبت بن جاتی ہے۔

اب تک تو ہم عقیدے سے سمجھتے تھے کہ بھئی دولت کو بے جا طریق سے کماؤ تو مصیبت بن جاتی ہے، مگر آج تو دنیا میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔ یعنی جن کے پاس ناجائز طریق سے کمائی ہوئی دولت تھی، آج وہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا کے لئے دولت نکلے، جان تو ہماری بچ جائے۔ کوئی پہاڑوں میں چھپا رہا ہے، کوئی سمندر میں ڈال رہا ہے۔ مگر گورنمنٹ ہے کہ کھوج نکال کر ان چیزوں کو نکال رہی ہے۔ تو مالداروں پر ایک عجیب مصیبت گزر رہی ہے۔

یہ اللہ میاں کا فضل ہے کہ اس وقت ہم جیسے لوگ جو یہ کہا کرتے تھے کہ بھئی تھوڑے پیسے کافی ہیں۔ جو غریب یا زاہد تھے، آج انہیں امراء سے کہنے کا موقع ہے کہ بھئی آرام میں تو ہم ہیں۔ تمہاری دولت نے تمہیں فائدہ نہیں دیا۔ ہماری غربت نے ہمیں فائدہ دیا۔

کس نیاید بخانۂ درویش   کہ خراج زمین و باغ بدہ

درویش کے گھر گورنمنٹ کا کوئی آدمی نہیں آئے گا کہ خراج اور ٹیکس ادا کرو۔ وہ کہے گا کہ میرے ہاتھ پلے ہی کچھ نہیں۔ میں کہاں سے ادا کروں۔ وہ آرام سے ہے اور جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ مصیبت میں مبتلا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ۔

ماہیچ نداریم ، غم ہیچ نداریم   دستار نداریم ، غم پیچ نداریم

ہم کچھ نہیں رکھتے، اس لئے غم بھی کچھ نہیں رکھتے۔ ہم دستار بھی نہیں رکھتے، پیچ کا غم کہاں سے رکھتے؟ جس پہ دستار ہوگی وہ پیچ وخم کی فکر کرے۔ یہاں تو دستار ہی ندارد ہے۔

جامہ ندارم، دامن از کجا آرم

یہاں کپڑا ہی ندارد ہے تو کلی اور دامن کی فکر کیوں ہوگی؟ بہر حال جو لوگ آج کم یعنی بقدر ضرورت رکھتے

ہیں، وہ آرام میں ہیں اور جو زیادہ رکھتے ہیں، وہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ مگر کیوں مبتلا ہیں؟ محض زیادہ رکھنے کی وجہ سے نہیں۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تم مفلس اور قلاش بنو۔ ناجائز طریق پر زیادہ رکھتے ہو، اس لئے پریشان ہو۔ جس کے پاس جائز طریق سے ہے، وہ آج بھی پریشان نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا جائز راستے پر چلنا ہمیشہ راحت کا باعث ہوتا ہے۔ ناجائز راستہ پر چلنا مصیبت کا موجب ہوتا ہے۔ خواہ وہ قانوناً ناجائز ہو یا شرعاً ناجائز ہو؟ جب کسی ناجائز چیز کا آدمی ارتکاب کرے گا، مصیبت میں مبتلا ہوگا اور جائز و ناجائز کیسے معلوم ہوگا؟ علم و تعلیم سے۔ قانون ہی یہ بتلائے گا کہ یہ چیز جائز ہے یہ ناجائز ہے۔ اس طرح مت کماؤ، قانون اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح کماؤ قانون اجازت دیتا ہے۔ تو اس بات کو علماء بتلائیں گے کہ اس طرح کمانا حلال، اس طرح کمانا حرام، اس طرح دولت رکھنا جائز اور اس طرح دولت رکھنا ناجائز ہے۔ تو دونوں قوانین کے وکلاء اور علماء ہیں۔ وہ سمجھائیں گے، وہی بتلائیں گے اور جب آدمی سمجھ جائے گا اور اس قانون کے مطابق چلے گا، اسے کوئی فکر نہیں۔ اس پر نہ گورنمنٹ اعتراض کرے گی نہ اللہ میاں اعتراض کریں گے۔ معلوم ہوا جان بچانے کا ذریعہ علم ہی ہے، دولت نہیں ہے۔ دولت میں جب علم کا دخل آئے گا تو وہ بچانے کی ذمہ دار ہوگی اور اگر جاہلانہ طریق پر ناجائز کمائی ہو تو وہ مصیبت بن جائے گی تو اصل میں نجات دینے والی چیز علم ہے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' (1) میں تمہیں علم دینے کے لئے آیا ہوں۔ کیونکہ علم ہی نجات دینے والا ہے، دنیا میں اگر تمہیں علم آ گیا اور علم نے بتلایا کہ یہ راستہ ٹھیک ہے اور یہ غلط ہے اور تم اس کے اوپر چلے تو کبھی تمہارے اوپر آفت نہیں ہے، نہ دنیا میں آفت آئے گی نہ قبر و آخرت میں۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دینے کے لئے تشریف لائے۔ آپ نے علم پہنچایا اور علم ہی وہ ہے جس سے دولت کی اصلاح ہوتی ہے، نفس کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ آبرو بھی محفوظ رہتی ہے اور علم نہ ہو تو دولت اور نفس بھی کارآمد نہیں۔

جذباتِ نفسانی بلا علم...... اگر آپ نفسانی جذبات کو بلا علم کے استعمال کریں گے، مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ آپ بازار میں جا رہے ہیں اور حلوائی کی دکان پر نہایت عمدہ تازہ مٹھائیاں بنی رکھی ہیں۔ جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ میں ہاتھ مارلوں، منہ مارلوں۔ اگر علم ہے تو وہ بتلائے گا کہ غیر کے مال پر ہاتھ ڈالنا جائز نہیں، جب تک اس کی رضامندی نہ ہو۔ لیکن اگر علم نہیں جذبات ہی جذبات ہیں، تو یا آدمی چوری کرے گا یا جھپٹا مار کر وہاں سے بھاگے گا اور دکاندار اس کے پیچھے گالیاں دیتا ہوا اور وہ آگے آگے اس کے ہاتھ میں چار لڈو ہیں۔ دو منہ میں، دو جیب میں رکھ کر بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دکاندار نے آ کر گردن ناپی اور فوراً پولیس آ گئی معلوم ہوا کہ اس نے ڈکیتی کی اور یہ دکان کے اوپر سے سامان اٹھا کر بھاگا تھا۔ پولیس نے فوراً چالان کیا۔ مقدمہ قائم ہوا، جو مل رہا ہے وہ تھو

(1) السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۶۵ . حدیث ضعیف ہے الضعیفۃ ۱/۸۸ رقم ۱۱۔

تھوکر رہا ہے کہ بڑا نالائق بڑا نابکار آدمی تھا۔

تو یہ جتنی ذلتیں اٹھائیں کہ گورنمنٹ الگ ناراض، پولیس الگ ناخوش، پبلک الگ ناخوش، دکان والے الگ ناخوش اور گالیاں پڑ رہی ہیں۔ یہ ذلت و رسوائی کیوں ہوئی؟ اس لئے کہ نفسانی جذبات پر عمل کیا تھا اور علم آپ کو تھا نہیں، جاہلانہ طریق پر ایک چیز کو لے گئے۔ لیکن اگر علم کے ساتھ اس سے بھاؤ طے کرتے کہ بھائی کتنے میں دیتے ہو؟ وہ قیمت کہتا۔ قانونی طور پر آپ اسے کہتے کہ بھائی! اتنی نہیں، اتنی قیمت لے لو۔ پھر آپ لیتے تو نہ دکاندار برا کہتا نہ پولیس برا کہتی نہ گورنمنٹ ناخوش ہوتی۔ کوئی آپ کو مشکل نہ ہوتی، پریشانی نہ ہوتی۔ معلوم ہوا محض نفسانی جذبات آدمی کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں۔ لیکن اگر صحیح علم کے ساتھ صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے، یہ جذبات کارآمد ہو جاتے ہیں۔ تو اصل میں علم نجات دینے والا ٹھہرا۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ.'' (1) سب سے بڑا عیار دشمن وہ ہے، جو تمہارے دو پہلوؤں کے بیچ میں بیٹھا ہوا ہے۔ جو تمہارا نفس ہے۔ اس کو اگر قابو کرنے میں تم کامیاب ہو گئے ہو تو پھر کوئی مصیبت نہیں۔ لیکن اگر وہ آزاد ہے، تو ہر جگہ وہ مصیبت میں مبتلا کرے گا۔

اس واسطے کہ انسان کا نفس بالطبع جاہل ہے۔ پیدائشی طور پر جاہل ہے اگر آدمی علم حاصل نہ کرے، جاہل ہی پیدا ہوا ہو تو جاہل ہی رہے گا اور جاہل ہے تو جاہلانہ حرکات ہی کرے گا، وہ عالمانہ حرکات کہاں سے کرے گا؟ جب جاہلانہ حرکات کرے گا اور اپنے جذبات پر چلے گا، جبھی ذلت و رسوائی آئے گی۔ تو جس کے ذریعے سے رسوائی پہنچے، وہ دوست ہوتا ہے یا دشمن ہوتا ہے؟ سب سے بڑا دشمن وہی ہے جس کے ذریعے سے آدمی ذلیل ہو، جس کے ذریعے سے مصائب میں مبتلا ہو۔ اس لئے اگر نفس انسانی کو عالم نہ بنایا جائے، اس کے جذبات کو خود رو چھوڑ دیا جائے، تو وہ ہمیشہ گڑھے اور کھائی میں ڈالے گا، آدمی مصیبت میں مبتلا ہوگا۔

نفس انسانی کی مثال...... اسی واسطے نفس انسانی کی مثال محققین سرکش گھوڑے سے دیتے ہیں کہ جب سرکش گھوڑے پر سوار ہو تو لگام سنبھال کر بیٹھنا چاہئے۔ اگر لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور گھوڑا اچھل پڑا۔ معلوم نہیں کس کنویں میں لے جا کے گرائے؟ پھر جان بچانی مشکل ہو جائے۔ تو انسان کا نفس بھی جب تک جاہل ہے، اس وقت تک سرکش ہے۔ اس کی لگام سہارنی چاہئے۔ مگر لگام وہی سہارے گا جس کو یہ پتہ ہو کہ لگام کس طرح پکڑنا چاہئے؟ کس طرح سہارنا چاہئے۔ پھر آخر میں علم ہی آ جاتا ہے۔ تو بغیر علم کے نفس سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

اس واسطے تمام انسانوں کے نفس گویا سرکش گھوڑوں کی طرح سے ہیں۔ جب تک ان کے منہ میں لگام نہ ڈالی جائے آدمی آدمی نہیں بنتا۔ بس وہی لگام شریعت ہے، آدمی کو سہار کر چلاتی ہے۔ اگر وہ لگام نکال دی جائے

(1) حدیث ضعیف ہے۔ کشف الخفاء ۲/ ۱۷۰.

اور آدمی اس نفس کے اوپر سوار ہو جائے، تو یہ کسی کنویں اور ذلت کے گڑھے میں لے جا کے گرائے گا۔ تو علم انسان کو عزت کی راہ چلاتا ہے اور جہالت ذلت کی راہ پر چلاتی ہے۔ علم وہ دولت ہے جو بڑھتی دولت ہے، اور جہل و نفسانی جذبات یہ وہ ہیں، جو انسان کو گھاؤ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام سے زیادہ محسن کوئی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو علم سکھلانے کے لئے آتے ہیں اور جہالت مٹانے کے لئے آتے ہیں۔

علوم دنیوی کا نفع ...... علم دنیا میں بہت سے ہیں اور ہر علم کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ جوتا گانٹھنے کا علم، اس کی بھی ضرورت ہے، کپڑے سینے اور پہننے کا علم ہے، اس کی بھی ضرورت ہے۔ جب تک انسان دنیا میں موجود ہے، اسے کپڑوں کی بھی حاجت ہے، اسے جوتے کی بھی ضرورت ہے۔ جب آدمی دنیا میں رہے گا، کاروبار کرے گا، اسے سواری کی بھی ضرورت ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ تجارت کا مال و اسباب لے جانے کی بھی ضرورت ہے، اس کے لئے ریل بھی چاہئے۔ ہوائی جہاز بھی چاہئے تو ایسی چیزوں کا علم یعنی سائنس کا علم وہ بھی کارآمد ہے، اس کے بغیر گاڑی نہیں چلتی۔

اسی طرح سے ایک انسان کو صنعت و حرفت کی بھی ضرورت ہے۔ اگر برتن نہ ہوں تو کھائیں کیسے؟ اگر کرسی نہ ہو تو بیٹھیں کیسے؟ اگر چار پائی نہ ہو تو لیٹیں کیسے؟ غرض ان تمام علوم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سارے علوم کہاں کارآمد ہیں؟ موت سے پہلے پہلے کارآمد ہیں اور جب انتقال ہوا، اب نہ ہوائی جہاز کارآمد ہے نہ چار پائی نہ کرسی، کوئی چیز بھی کام کی نہیں رہی۔ بیکار ہیں، اس لئے کہ ان تمام چیزوں کا نفع انسان کے بدن کو پہنچتا ہے۔ اگر ہوائی جہاز منتقل کرے گا۔ تو آپ کے بدن ہی کو منتقل کرے گا، وہ یہاں سے کراچی پہنچا دے گا۔ روح کو ہوائی جہاز کی حاجت نہیں ہے۔ اگر آپ روح کو آزاد چھوڑ دیں وہ پل بھر میں عرش پر پہنچ جائے گی۔ یہ بدن کی مصیبت ہے جس کی وجہ سے یہ ساری چیزیں ایجاد کرنی پڑتی ہیں۔ جوتا ہے تو آپ کے بدن کی حفاظت کرے گا، کپڑا ہے تو آپ کے بدن کی حفاظت کرے گا۔ غرض یہ چیزیں اس وقت تک کارآمد ہوں گی جب تک بدن موجود ہے اور جب روح نکل گئی، بدن لاشہ بن گیا۔ اب یہ ساری چیزیں آپ کے حق میں بےکار ہیں۔

آپ ہوائی جہاز سے اڑ کر لندن، کراچی جا سکتے ہیں۔ لیکن ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آپ جنت میں پہنچ جائیں یا عرش عظیم کی سیر کر لیں، آسمانوں کی سیر کر لیں، یہ نہیں ہو سکے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ تمام چیزیں کارآمد اور نافع ہیں، مگر صرف بدن کی حد تک نافع ہیں، روح کو نفع پہنچانے والی نہیں ہیں۔ روح کے اندر پاکیزہ اخلاق پیدا کر دیں۔ یہ ہوائی جہاز کا کام ہی نہیں۔ آپ عمدہ سے عمدہ کپڑا پہن لیں، وہ کپڑا آپ میں صبر، علم اور حیاء پیدا کر دے۔ یہ کپڑے کا کام نہیں ہے۔ آپ اعلیٰ طریق پر پگڑی باندھ لیں اور اس کو خوب نمایاں کریں کہ آپ بڑے باوقار ہیں۔ لیکن قلب میں وقار پیدا نہیں ہوگا۔ پگڑی کا یہ کام نہیں کہ آپ کے قلب میں وقار بھی پیدا کر دے۔ یا پگڑی، جوتا بنانے والا آ کر آپ کے اخلاق کی اصلاح کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا، اس کا کام جوتا بنانے کا ہے۔ جوتا

بنانے سے اخلاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور آدمی اخلاق کا نام ہے تو آخر اخلاق کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے؟ ان تمام چیزوں سے بدن کی اصلاح ہوگئی، مگر روح کی اصلاح کیسے ہو؟

تو جو چیز روح کی اصلاح کرنے والی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کا علم ہے جو اللہ کی طرف سے آتا ہے، جو اخلاق کی حدود بتلاتا ہے، اخلاقی قدریں سکھلاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کے بغیر آدمی، آدمی نہیں بن سکتا۔ آدمی حیوان بن جائے، بکری بن جائے، کوا بن جائے، یہ ممکن ہے۔ لیکن انسان بن جائے، یہ بغیر تعلیم انبیاءؑ کے ممکن نہیں۔

مثلاً آپ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اڑ گئے اور سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ گئے۔ تو کوے، چڑیا اور کرگس بھی تو اڑتے ہیں۔ آپ نے کونسا کام کیا؟ زیادہ سے زیادہ آپ نے کرگس کے ساتھ مشابہت پیدا کر لی۔ یہ کوئی انسانی ترقی نہ ہوئی، حیوانیت کی ترقی ہوئی۔ آپ نے اعلیٰ ترین غذائیں کھا کر بدن کو پال لیا۔ تو کتے بلی بھی بدن کو پال لیتے ہیں۔ شیر بھیڑیئے بھی پال لیتے ہیں۔ یہ کونسے کمال کی بات ہوئی؟ زیادہ سے زیادہ آپ نے ذرا عمدہ غذا کھالی اور کوّا ایسی غذا نہیں کھا سکا، مگر عمدہ اور لذیذ تو آپ جب کہیں، جب کوّا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے کہ اوہو! انسان تو پلاؤ کھا رہا ہے اور میں ہڈیاں کھا رہا ہوں۔ اس کو آپ کی غذا سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی آپ کو اس کی غذا سے ہے۔ ہر ایک اپنے مناسب حال غذا کھاتا ہے، آپ بھی ایک حیوان ہیں، وہ بھی حیوان ہے، وہ اپنے مناسب غذا کھا رہا ہے۔ آپ اپنے مناسب کھا رہے ہیں۔ تو کھانے میں دونوں برابر اور شریک ہیں۔ اچھی اور بری غذا، یہ خصوصیات کی بات ہے، لیکن غذا کھانا یہ حیوانیت ہے۔ اس لئے آپ اعلیٰ سے اعلیٰ چیز بھی کھالیں گے، جب بھی آپ حیوان رہیں گے۔ عمدہ سے عمدہ سرائے میں آپ منتقل ہو جائیں، بدن منتقل ہوگا۔ وہ ایک مادی چیز ہوئی، لیکن اخلاق درست ہو جائیں، ان میں سے کوئی چیز درست نہیں کرے گی؟

علم شرائع...... اخلاق کی درستگی کے لئے تو اللہ نے انبیاء علیہم السلام ہی بھیجے ہیں کہ وہ آدمیوں کو آدمی بنائیں۔ تو سائنس اور فلسفہ اچھے اچھے سامان پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اچھے انسان نہیں پیدا کر سکتا۔ اچھے انسان پیدا کرنے والی چیز انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے۔ تو علم سب نافع ہیں۔ مگر ایک نافع مطلق ہے، جو ہر جگہ نفع دے۔ ایک نافع خاص ہے، جو یہاں تو نفع دے، وہاں نفع نہ دے۔ مادی علوم نافع ہیں، مضر نہیں۔ لیکن ایک خاص حد تک نافع ہیں کہ اس دنیا میں نفع دیں گے یا بدن کی حد تک نفع دیں گے۔ آگے نفع نہیں دیں گے۔ لیکن دین کا علم یہاں بھی نفع دے گا، قبر اور آخرت میں بھی نفع دے گا۔ اس لئے کہ اس کا تعلق نفس انسانی سے ہے۔ نفس ہر جگہ قائم ہے۔ یہاں بھی نفس موجود، برزخ و آخرت میں بھی موجود، ہر جگہ نفس ہے، تو اسے ہر جگہ علم کی ضرورت ہے۔ اس لئے جو علم سارے جہانوں میں کارآمد ہو۔ وہ انبیاء علیہم السلام کا علم ہے، وہ دین اور شرائع کا علم ہے جو حلال و حرام بتلائے۔ اس علم کے سکھلانے کے لئے انبیاء علیہم السلام آئے ہیں۔

باقی جو صنعت و حرفت کا علم ہے یا مادیات کا علم ہے۔ یہ انبیاء کے آنے پر موقوف نہیں ہے۔ اگر ایک بھی

پیغمبر نہ آتا تو آپ کھیتی کرسکتے تھے۔ مکان بناسکتے تھے، جیسا بھی بناتے۔ آخر یہ جانور جو گھونسلہ بناتے ہیں کیا ان کو کسی نبی نے آکر تعلیم دی ہے؟ یہ جو شیر، بھیڑیئے اپنے بھٹ بناتے ہیں، تو کیا کسی اسکول میں پڑھ کرآتے ہیں کہ بھٹ یوں بنانا چاہئے؟ سانپ جو اپنی بِل بناتا ہے تو کیا اس کو کسی مدرسہ میں تعلیم دی تھی کہ یوں بنانی چاہئے؟ اس کی طبیعت کا تقاضا ہے، اس کی فطرت نے راہنمائی کی ہے، اسی طرح انسان کی طبیعت میں بھی راہنمائی ہے کہ وہ اپنے مناسب حال مکان بنالے۔ اگر پیغمبر نہ آئیں وہ پھر بھی مکان بناسکتا تھا۔ یہ طبعی علوم ہیں اور علوم طبعیہ کے اندر نبوت کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انبیاء علیہم السلام شریعت کی تعلیم دینے کے لئے آئے ہیں۔ شریعت انسان کی طبیعت سے نہیں ابھرسکتی۔ اس لئے کہ شریعت کے معنی ہیں، ''اللہ کی رضا اور نارضا کا پتہ چلانا''۔ کہ اللہ اس سے خوش ہیں، اس سے ناخوش ہیں اور کسی کی خوشی و ناخوشی اس کے بتلائے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی۔

دو حقیقی بھائی ہوں، ایک ماں کے پیٹ میں دونوں نے پاؤں پھیلائے ہوں اور دونوں پاس بیٹھ جائیں، بلکہ ایک دوسرے کے سینے سے سینہ ملاکر بیٹھ جائیں۔ ایک کے دل میں چھپی ہوئی چیز دوسرے کے دل میں نہیں جائے گی جب تک دوسرا خود ظاہر نہ کرے یا بتلائے۔ تو جب دو حقیقی بھائی، ایک نوع کے دو فرد، ایک دوسرے کے باطن کا پتہ نہیں چلاسکتے، جب تک کہ دوسرا اظہار نہ کرے۔ تو اللہ اور بندے میں تو بون بعید ہے۔ وہ نور مطلق یہ ظلمت محض، یہ اللہ کے اندر چھپی ہوئی مرضی، اور نامرضی کا کیسے پتہ چلاسکتا ہے؟ جب تک کہ حق تعالیٰ خود نہ ظاہر فرمادیں۔

قانون شریعت انسانوں تک کیسے پہنچے؟ ......اور خود ظاہر فرمانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ میاں خود گھر گھر اعلان کریں کہ دیکھو اس سے میں خوش ہوں یہ کرو۔ اس سے ناخوش ہوں یہ نہ کرو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ان کی شان سے بعید ہے۔ ایک معمولی بادشاہ ایک حاکم، ایک معمولی ضلع کا کلکٹر جو ہم ہی جیسا انسان ہے۔ اس میں کوئی خصوصیت ہم سے زائد نہیں ہے، اس کو تو عار آتی ہے کہ گورنمنٹ کا کلکٹر خود گھر گھر کہتا پھرے کہ یہ میرا حکم، یہ میرا قانون ہے۔ وہ اپنے نائبین کو تحصیلداروں اور نائب تحصیلداروں کو حکم دیتا ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیتے ہیں کہ منادی کرو۔ اس طرح سے قانون عام ہوجاتا ہے اور جو احکم الحاکمین اور بادشاہوں کا بادشاہ ہو، اس کی شان کے ذرا مناسب نہیں کہ وہ گھر گھر کہتا پھرے کہ یہ میرا قانون ہے۔ وہ اپنے نائبین کو قانون بتلائے گا، جو اس کے اپنے مقربان بارگاہ ہوں، وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیں گے۔ پھر وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیں گے، قانون عام ہوجائے گا۔

انبیاء علیہم السلام نائبین خداوندی ہیں، جو مقربان بارگاہ ہیں۔ اخلاق میں اللہ سے مناسبت رکھتے ہیں۔ قرب کی اپنے اندر استعداد اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ بالطبع مقدس اور برگزیدہ پیدا کئے جاتے ہیں۔ ان کی فطرتوں میں پارسائی اور پاکیزگی بھری ہوئی ہوتی ہے۔ تو پاک افراد ہیں۔ اس لئے اللہ جو پاک ذات ہے، اس سے قرب کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حق تعالیٰ ان پر اپنا الہام فرماتے ہیں۔ ان پر اپنا علم نازل فرماتے ہیں، وہ اپنے نائبین تک پہنچاتے ہیں پھر وہ اپنے نائبین کو، وہ اپنے ماتحتوں کو، اس طرح سے علم پھیل جاتا ہے۔ تو دین کا علم انبیاء علیہم السلام

کے ذریعے سے اس لئے آیا کہ انبیاء علیہم السلام ہی مقرب تھے۔ وہی بارگاہِ حق سے مناسبت رکھتے تھے، ان پر علم اتارا گیا، ان کے ذریعے سے بالواسطہ ہم تک علم پہنچا۔

ضرورتِ مذہب...... بہرحال اس علم کا حاصل کیا جانا، یہ ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر آدمی کی نہ روحانیت جاگ سکتی ہے نہ روحانی مراتب طے ہو سکتے ہیں اور نہ اخلاق درست ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اخلاق کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات ہے اور جب تک مذہب و دین نہ ہو، آدمی کے اخلاق کبھی تربیت نہیں پا سکتے۔ مادیات سے تربیت نہیں ہوتی۔ اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا**" (۱) میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ دنیا کو جہالت سے نجات دلاؤں اور لوگ علم میں آئیں، اس کے بغیر انسان کی زندگی نہیں سنور سکتی۔

آج دنیا میں جو دین اور مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات پھیلے ہوئے ہیں، یہ اصل میں سب جہالت کے کرشمے ہیں۔ جب آپ کے اندر علم نہ ہو، جہالت ہو، جس کا جی چاہے، آپ کو بہکا دے، جو چاہے کہہ مارے۔ آپ مجبور ہیں، اس لئے کہ خود اپنے اندر کچھ نہیں رکھتے۔ تو ضرورت اس کی ہے کہ علم حاصل کر کے آپ آگے بڑھیں تا کہ جائز و ناجائز عقیدے کا اچھا برا ہونا آپ کے اندر آ جائے۔ اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی کہ سب سے ضروری چیز تعلیم ہے یہ اگر ہے تو سب چیزیں درست ہیں۔ تعلیم نہیں جہالت ہے تو سب چیزیں خراب ہوں گی۔ وقت چونکہ ختم ہو چکا ہے۔ اس واسطے میں ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ شانہ ہم اور آپ سب کو توفیق علم وعمل عطاء فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۶۵.
یہ حدیث ضعیف ہے الضعیفۃ ۱/ ۸۸ رقم ۱۱۔

یادِ حق

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَعْــدُ:...... فَقَدْقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "مَثَلُ الذَّاکِرِ فِی الْغٰفِلِیْنَ کَمَثَلِ الْحَیِّ فِی الْاَمْوَاتِ ① اَوْکَمَاقَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ.

احوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! پہلے سے کوئی علم بھی نہیں تھا اور ارادہ بھی نہیں تھا کہ بیان بھی کرنا ہوگا۔ لیکن حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا کہ نماز سے پہلے کچھ نہ کچھ بیان ہوگا۔ ان کی تعمیل حکم کے طور پر میں آپ حضرات کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ کوئی لمبی تقریر یا وعظ اس وقت نہیں ہو سکے گا، بلکہ محض تعمیل ارشاد کے طور پر چند کلمات، اس حدیث کی روشنی میں گزارش کروں گا جو اس وقت میں نے پڑھی۔

تمہید...... یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "مَثَلُ الذَّاکِرِ فِی الْغَافِلِیْنَ کَمَثَلِ الْحَیِّ فِی الْاَمْوَاتِ" اس کی تفصیل سے پہلے اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک پیکر، بدن اور جثہ ہے اور ایک اس کی روح، زندگی اور حیات ہے۔ یہ ظاہری بدن جو آپ کو دیا گیا ہے۔ یہ خود مستقلاً انسان نہیں ہے۔ یہ انسان کی محض صورت اور علامت ہے۔ انسانیت اس جثہ کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جو روح اور حقیقت کی صورت میں ہے۔ یہ اس حقیقت کی جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہے، محض نمائش اور نمود ہے۔ فی الحقیقت ہماری انسانیت وہی ہے اور اسی کا نام زندگی ہے۔

اگر وہ انسان کے بدن میں سے نکال دی جائے تو بدن کا کوئی وجود نہیں چند دن روح کے پچھلے اثرات کے تحت رہے گا۔ جہاں دو تین دن گزریں گے اور زندگی کے جو تھوڑے بہت اثرات سیرایت کئے ہوئے تھے، وہ زائل ہو

---

① مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوۃ، باب المساجد ومواضع الصلوۃ، ج:۳، ص:۱۹۵. حدیث صحیح ہے امام بخاریؒ نے بھی اس کے مثل روایت کی ہے۔ دیکھئے: صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ج:۲۰ ص:۲۳ رقم: ۵۹۲۸.

جائیں گے یہی بدن گلنا سڑنا اور پھٹنا شروع ہوگا۔ اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ مٹی، مٹی میں مل جائے گی، پانی پانی میں، آگ آگ میں اور ہوا ہوا میں مل جائے گی۔ شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس بدن کی شیرازہ بندی اگر کر رکھی ہے تو روح نے کر رکھی ہے۔ روح نکلتے ہی بدن کی کوئی اصلیت نہیں۔ باطل محض ہے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ زندگی صورت کا نہیں حقیقت کا نام ہے۔ صورت اس زندگی کی محض نمائش و مظاہرہ اور دکھلاوا ہے۔

روحِ کائنات...... یہی صورت سمجھ لیجئے اس پوری کائنات کی ہے۔ یہ جو ہمارا مختصر بدن ''کائنات'' ہے وہ روح سے زندہ ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے یہ پوری کائنات بھی کسی روح سے زندہ ہے۔ جب تک یہ روح اس کائنات میں موجود ہے، یہ کائنات زندہ کہلائے گی۔ جب روح نکال لی جائے گی، ساری کائنات کا خیمہ آپڑے گا، درہم برہم ہو جائے گا، ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ یہ روح کیا چیز ہے؟ جو روح انسان کے بدن میں ہے، وہی روح کائنات میں ہے۔ انسانی روح کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ ① اے پیغمبر! آپ سے لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟

﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ ② کہہ دیجئے روح اللہ کا ایک امر ہے۔ ایک حکم اور لطیفۂ خداوندی ہے اس سے یہ کثیفۂ جسمانی سنبھلا ہوا ہے۔ وہ نکل جائے تو کثیفہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح سے پوری کائنات کی روح بھی درحقیقت لطیفۂ ربانی ہے اور اس کا نام ذکر اللہ ہے۔ یادِ حق سے یہ کائنات کھڑی ہوئی ہے۔ جب اس سے ذکرِ خداوندی منقطع ہو جائے گا۔ جبھی یہ خیمہ آپڑے گا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ۔'' ③

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک اس کائنات میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا اور سارے شرار الناس رہ جائیں گے جن کے دل میں نہ یادِ حق ہوگی نہ ذکرِ خداوندی ہوگا نہ ان کی زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہوگی۔ قلوب یکسر بھلا بیٹھیں گے۔ نہ صرف بھلا بیٹھیں گے بلکہ خالی ہو جائیں گے، ذکر مٹ جائے گا یعنی شرار الناس اور بدترین خلائق رہ جائیں گے جن کے بارے میں فرمایا گیا ''لَا يَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَّلَا يُنْكِرُوْنَ مُنْكَرًا'' ④ ''نہ اچھائی کو اچھائی جانیں گے نہ برائی کو برائی''

سڑکوں پر اس طرح سے بدکاری ہوگی جیسے جانور اور بہائم پھرتے ہیں۔ نہ حیا ہوگی نہ غیرت ہوگی۔ جب ساری کائنات اور سارے انسان ایسے بن جائیں گے۔ اسی وقت قیامت قائم کردی جائے گی۔ تو قیامت اس عالم

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسرآء، الآیۃ: ۸۵۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسرآء، الآیۃ: ۸۵۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب ذھاب الایمان فی آخر الزمان، ج: ۱ ص: ۱۳۱ رقم: ۱۴۸۔

④ المستدرک علی الصحیحین للامام الحاکم، کتاب الفتن والملاحم، ج: ۴ ص: ۴۸۱ رقم: ۸۳۴۱۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب توقیر الکبیر ورحمۃ الصغیر، ج: ۳ ص: ۳۶۴۔

کو ذرّہ ذرّہ کر کے بکھیر دینے کا نام ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، پانی میں مٹی اور مٹی میں پانی، ہوا میں آگ اور آگ میں ہوا سب گڈمڈ ہو کر قصہ درہم برہم ہو جائے گا اور سارا خیمہ دنیا کا آ پڑے گا۔ جس طرح روح کے نکلنے سے بدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، اسی طرح پوری کائنات کا شیرازہ اس روح کے نکل جانے سے بکھر جائے گا جس کا نام ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس کائنات کی روح ذکر خداوندی ہے یادِ حق جب تک موجود رہے گی۔ کائنات کا خیمہ کھڑا ہوا ہے، جب یہ نکل جائے گی کائنات درہم برہم ہو جائے گی، تو ظاہر ہیں کائنات ہم سے اور آپ سے سنبھلی ہوئی ہے، حقیقت میں اللہ کے ذکر کرنے والوں سے سنبھلی ہوئی ہے، جب تک یہ موجود ہیں کائنات موجود ہے۔ جب یہ ختم ہو جائیں گے کائنات ختم ہو جائے گی۔ غرض اس ساری کائنات کا خیمہ یادِ حق اور ذکر کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ حق میں مصروف ہے...... یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام بتلاتی ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ذکر خداوندی میں مصروف ہے، ہر وقت یادِ حق کرتا ہے اور جب یاد منقطع ہوتی ہے وہی اس ذرّے کے مٹنے اور ختم ہو جانے کا وقت ہوتا ہے حدیث میں ہے کہ ہری ٹہنی اللہ کا ذکر کرتی ہے، جب ذکر ختم ہو جاتا ہے۔ ٹہنیاں خشک ہو کر پتے جھڑ جاتے ہیں تو روح نباتی فی الحقیقت یاد خداوندی ہے جب تک موجود ہے درخت موجود ہے، یادِ حق نہیں ہوگی تو ختم ہو کر مٹ جائے گا۔ اس کے پتے جھڑ جائیں گے، یہ اس کی موت کا وقت ہوگا۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ ذرّہ ذرّہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① کائنات کا کوئی ذرّہ نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو مگر تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ تمہاری زبان اور ہے کائنات کے ذرے کی زبان اور ہے۔ پرندے کی زبان اور ہے۔ وہ اپنی اپنی زبان میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ تم ان کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ اور تم ان کی زبان کو کیا سمجھو گے تم اپنے ہی بہت سے بھائی بندوں کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ ایک پنجاب کا رہنے والا بنگلہ زبان نہیں جانتا۔ بنگال کا رہنے والا پشتو زبان نہیں جانتا۔ ایک پختونستان کا رہنے والا ترکی زبان نہیں جانتا۔ ترکی کا رہنے والا عربی زبان نہیں جانتا۔ تو جو اپنے بھائیوں کی زبان نہ سمجھے۔ وہ کنکریوں اور پرندوں کی زبان کیا سمجھے گا؟ لیکن زبان سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر آپ نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بنگلہ میں اللہ کو کوئی یاد نہیں کر رہا اور اگر آپ پشتو نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ پشتو میں کوئی اللہ کا نام لینے والا نہیں ہے وہ نام لے گا، ذکر کرے گا آپ بیٹھے ہوئے منہ دیکھیں گے اس لئے کہ آپ اس کی زبان نہیں سمجھتے۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے آپ ٹیلیگراف کے دفتر میں گئے ہوں گے۔ وہاں جا کے آپ نے تار دیا۔ دو تین روپے فیس کے ادا کئے، تار بابو نے پیتل کی کھونٹی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ کھٹ کرنا شروع کر دیا۔

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴۔

آپ نے کہا کہ میں نے تو یہ مضمون دیا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو آ رہا ہوں۔ یہ بیٹھا ہوا کھٹ کھٹ کر رہا ہے، اس کھٹ کھٹ کو اس مضمون سے کیا تعلق ہے۔؟ لیکن آپ کے سامنے تو وہ کھٹ کھٹ آ رہی ہے۔ حقیقت میں اسی کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر میں علوم پہنچ رہے ہیں۔ مگر آپ اس فن سے واقف نہیں اس لئے آپ نہیں سمجھتے یہ اصطلاحات ہیں جن سے ایک شہر سے دوسرے شہر کو مضمون چل رہا ہے۔ اگر آپ اس فن کو سیکھے ہوئے ہوتے اس کھٹ کھٹ کی اصطلاحات سے واقف ہوتے تو آپ کو فوراً پتہ چل جاتا کہ کراچی سے لاہور کی طرف اور لاہور سے ڈھاکہ کی طرف کیا مضمون جا رہا ہے۔ مگر آپ کو اصطلاحات کا علم نہیں اس لئے آپ حیرانی سے دیکھتے ہیں کہ یہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے میرا ابتلایا ہوا مضمون کس طرح پہنچے گا، مگر مضمون آپ کا ہے، اصطلاح اس کی ہے اور وہ دوسری جگہ جا رہا ہے۔

اسی طرح سے ایک پرندہ جب سیٹی بجاتا ہے آپ سمجھتے ہیں وہ سیٹیاں بجا رہا ہے حقیقت میں وہ ذکر اللہ کر رہا ہے، آپ اس کی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ طوطا بولتا ہے وہ اللہ کی یاد کرتا ہے۔ آپ اس کی زبان سے واقف نہیں جیسا کہ آپ اپنے یورپ والے بھائی کی زبان سے واقف نہیں ہیں جو اپنی زبان میں خدا کو یاد کرے گا۔ آپ بیٹھے ہوئے منہ کو دیکھیں گے۔ تو کوئی پرندہ، درندہ، چرندہ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو، مگر زبان اس کی ہے، فہم آپ کا نہیں ہے۔ ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو ورنہ وہ تسبیح میں مشغول ہیں۔

حدیث میں ہے کہ سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے، جب میل آنا شروع ہوتا ہے ذکر اللہ بند ہو جاتا ہے۔ وہی وقت اس کی فنا کا ہوتا ہے آپ نفرت سے بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں جب تک دھوبی اس کو پاک صاف کر کے نہ لا دے، جب سفید ہو جائے گا پھر ذکر میں مشغول ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ جس شخص کو مسجد کا امام بنایا جائے، وہ میلے کپڑوں سے نماز نہ پڑھائے، یعنی ایسے میلے کپڑے جن سے بدبو اٹھنے لگے۔ یوں تو کپڑا اگلے ہی دن میلا ہو جاتا ہے۔ علماء عربیت لکھتے ہیں کہ: "لَــذَّةُ الثَّوْبِ لِيَوْمٍ" کپڑے کی لذت ایک دن کی ہوتی ہے۔ اگلے دن سے میل آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو تھوڑا بہت میل تو فوراً شروع ہو جاتا ہے، لیکن ایسا میلا پن کہ پسینہ جذب ہوتے ہوتے زرد رنگ بن جائے، اس میں سے بدبو آنے لگے، اس کا رنگ بھی متغیر ہو جائے، شکل بھی بدل جائے۔ اس وقت امام کو ان کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھانا مکروہ ہے۔

اس کی ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ امام فی الحقیقت اللہ کی بارگاہ میں تمام مقتدیوں کا وکیل ہے وہ قابل تعظیم ہے اس میں نفرت کی وجوہ نہ ہونی چاہئیں کہ مقتدی متنفر ہونے لگیں۔ اگر کپڑے غیر معمولی طور پر میلے ہوئے تو مقتدیوں کو خلجان پیدا ہوگا کہ کس بے ڈھنگے آدمی کو آگے لا کے کھڑا کر دیا گیا۔

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴.

تو جو مقتدی اس کے بے ڈھنگے پن کے خیال میں مشغول ہوں گے اللہ سے انکا کیا رابطہ قائم ہوگا؟ وہ تو امام کی مذمت میں لگے ہوئے ہیں کہ امام عجیب بے ڈھنگا ہے۔ امامت کے لئے کھڑا ہوگیا، بدبو اس میں سے آرہی ہے، رنگ اس کا صحیح نہیں، یہ ہمیں خدا تک کیا پہنچائے گا۔؟ تو امام کے لئے ضروری ہے کہ صاف ستھرا ہو۔ کپڑے بھی صاف ہوں۔ تو ظاہری وجہ تو یہی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو باطنی وجہ یہ ہے کہ سفید کپڑا ذکر اللہ میں مشغول ہوتا ہے امام کے کپڑوں کا ذکر خود امام کی طبیعت کو ذکر اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جب اس کے ارد گرد ذکر اللہ کی آوازیں آرہی ہیں اگر چہ وہ کانوں سے نہ سنی جائیں، ان آوازوں سے خود امام کے قلب میں ذکر اللہ کی رغبت پیدا ہوگی اور یادحق تازہ ہوکر وہ اللہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا تو مقتدی بھی اتنے ہی متوجہ ہوجائیں گے۔

آپ نے تجربہ کر کے دیکھا ہوگا کہ جب آدمی غسل کر کے صاف کپڑے پہنتا ہے تو بے اختیار دل سے الحمدللہ نکلتا ہے طبیعت میں شگفتگی ہوتی ہے اور جب کپڑے میلے ہوتے ہیں تو انقباض اور تشتت دل میں پیدا ہوتا ہے، اللہ کا نام لینا بھی چاہتا ہے تو زبان سے نہیں نکلتا، طبیعت میں انقباض ہے۔ یہ حقیقت میں کپڑے کے ذکر کا اثر ہوتا ہے جو انسانی قلب پر پڑتا ہے۔

اگر سبزے میں بیٹھیں گے ذکر اللہ کی زیادہ توفیق ہوگی جھاڑ پھنکار میں بیٹھیں گے، کم ہوجائے گی۔ اس لئے کہ سبزہ خود تسبیح میں مشغول ہے۔ اکثر اہل اللہ کو دیکھا گیا ہے کہ دریا کے کنارے سبزے پر جا کر ذکر اللہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول کا ذکر ان کے قلوب کے اوپر موثر ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب رک جاتا ہے تسبیح بند ہوجاتی ہے۔ چلتا ہوا پانی ذکر کی حیات کی وجہ سے درحقیقت زندہ ہے اور جب ٹھہر گیا جسے ماء راکد کہتے ہیں اس میں تغیر آجاتا ہے وہ سڑ جاتا ہے خراب ہوجاتا ہے، تسبیح بند ہوجاتی ہے، تسبیح کا بند ہونا ہے کہ لطافت کی روح اس میں سے کھنچ جاتی ہے، اس کے اندر کثافت پیدا ہوجاتی ہے بہر حال چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے، سبز ٹہنیاں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے، کنکریاں تسبیح کرتی ہیں۔ بہر حال تمام چیزیں ذکر میں مشغول ہیں ہم آپ سمجھتے نہیں ہیں۔

مخلوقات کی تسبیح کے بارے میں اہل باطن کا ادراک...... اہل باطن کو کبھی کبھی علم دیدیا جاتا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کی تسبیح کو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے یہ علم دیا جاتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ یہی تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔

سلیمان علیہ السلام کا مقولہ قرآن حکیم میں نقل کیا گیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ① ''اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلائی گئی ہیں''۔

① پارہ: ۱۹ سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶.

سلیمان علیہ السلام بتلا دیتے تھے کہ یہ دو کوّے آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں اور یہ دو چڑیاں کیا کہہ رہی ہیں۔ احادیث میں تقریباً مختلف جانوروں کی اٹھارہ انیس مثالیں دی گئی ہیں اور ان کی تسبیح ذکر کی گئی ہے۔ تیتر یہ کہتا ہے اور مور یہ کہتا ہے۔ فلاں کی یہ تسبیح ہے، فلاں کا یہ ذکر ہے۔ تیتر کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اس کی تسبیح یہ ہے کہ کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ. ① ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے''۔ یہ ایک نصیحت ہے جو اس کی زبان سے ہر وقت نکلتی رہتی ہے۔

بعض کی یہ تسبیح ہے کہ ''سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَزَیَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَآئِبِ'' ② پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھیوں سے زینت دی اور عورتوں کو مینڈھیوں اور چوٹیوں سے زینت دی۔ مختلف عبرتیں اور نصیحتیں پرندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں مگر ﴿وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ ③

کس زبان مرانمی دند با عزیزاں چہ التماس کنم

لوگ میری زبان نہیں پہچانتے تو میں دوستوں سے کیا کہوں۔ پرندہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں تو نصیحت پیش کر رہا ہوں۔ مگر انسان میری زبان نہیں پہچانتے، جن کو حق تعالیٰ علم دیتے ہیں وہ زبان پہچانتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کی بولیوں کا علم جان لیا تھا۔ مگر کسی کالج یا مدرسہ میں پڑھ کر نہیں، اللہ کے الہام سے یعنی بطور معجزے کے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جانوروں کی گفتگو...... جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ جانوروں کی زبان سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے معاملات اور جھگڑوں کا فیصلہ فرماتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا اور اپنی زبان میں بڑبڑاتا ہوا حاضر ہوا اور اس شان سے آیا کہ بول رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں اپنا منہ ڈال دیا۔ فرمایا اس کے مالک کو بلاؤ۔ اونٹ والا بلایا گیا۔ وہ آیا۔ فرمایا۔ یہ شکایت کر رہا ہے تو اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ لادتا ہے اس نے اقرار کیا۔ یا رسول اللہؐ! بے شک میں اس جرم کا مجرم ہوں۔ فرمایا۔ آئندہ ایسا مت کرنا۔ اونٹ خوش ہوتا ہوا واپس ہو گیا۔ تو اونٹ کی زبان کو سمجھ کر اس کی فریاد سنی اور اس کے حق میں فیصلہ دیا۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے کہ کسی دیہاتی کے مکان کے قریب سے گزر ہوا، وہ کہیں پہاڑ میں سے کوئی ہرنی پکڑ لایا تھا۔ اس کے گلے میں رسی باندھ رکھی تھی، وہ کھونٹی سے بندھ رہی تھی۔ اس نے دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد شروع کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیہاتی تجھے پکڑ لایا ہے تو اس کی ملک ہو گئی ہے اس لئے کہ پہاڑ میں جو چیز

---

① تفسیر القرطبی ج:۱۳ ص:۱۶۵. ② علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواہ الحاکم عن عائشة وذکرہ فی تخریج احادیث مسند الفردوس للحافظ ابن حجر فی اثناء حدیث بلفظ. ملائکة السماء یستغفرون لذوائب النساء ولحی الرجال ویقولون سبحان الذی زین الرجال باللحی والنساء بالذوائب. اسندہ عن عائشة دیکھئے: کشف الخفاء ج:۱ ص: ۴۴۴. ③ پارہ:۱۵، سورة الاسراء، الآیة:۴۴.

ہوتی ہے، جو اس پر قبضہ کرے وہ اس کی ملک ہو جاتی ہے۔ تو اس کی ملک ہو گئی، میں تجھے کیسے چھوڑ دوں؟

اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! پہاڑی میں میرے دو بچے بلبلا رہے ہیں اور بھوکے ہیں۔ میں ہی انہیں دودھ پلاتی تھی، میرے بچے مر جائیں گے آپ مجھے چھوڑ دیں۔

فرمایا: وعدہ کر کہ تو دودھ پلا کر پھر یہاں آ جائے گی۔ اس نے وعدہ کیا اور حلف دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گلے میں سے رسی کھول دی اس نے جونہی جا کر دودھ پلایا، واپس آ کر پھر وہیں کھڑی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر رسی اس کے گلے میں ڈال دی۔

جب دیہاتی آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا تو نے زیادتی کی ہے؟ اس کے بچے بلبلا رہے ہیں تو نے جا کے قبضہ کیا۔ اس کو چھوڑ دے۔ اس نے نصیحت قبول کی اور ہرنی کو آزاد کر دیا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کی بولیوں پر مطلع ہوتے تھے۔ تو انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے زبانوں کا علم دیا گیا حتی کہ پرندوں کی زبانوں کا بھی۔

نوعِ انسان کے سوا دنیا کی ہر نوع کی ایک ہی زبان ہے...... جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام انسانوں کی زبانوں کا علم دیا گیا تھا۔ یہ جو قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھلا دیئے گئے۔ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا يَعْنِيْ عِلْمَ اللُّغَاتِ كُلِّهَا."

آدم علیہ السلام کو ساری لغتیں سکھلا دی گئی تھیں جو قیامت تک انسانوں کے اندر بولی جائیں گی وہ ہر زبان سکھلا دی تھی۔ ان کی پہلی نسل ان تمام زبانوں کو جانتی تھی لیکن جب نسل مختلف ہوئی اور دنیا میں منتشر ہوئی، کوئی قبیلہ کہیں آباد ہوا کوئی کہیں آباد ہوا۔ تو وہاں کی زمینوں کی خصوصیات تھیں۔ ایک ایک قبیلے کے اوپر ایک ایک لغت کا غلبہ ہو گیا۔ اس طرح زبانیں الگ ہو گئیں۔ تو ایک نے دوسرے کی زبان کو سمجھنا چھوڑ دیا اور سمجھنے سے محروم ہو گیا۔ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی ظاہر فرمایا ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾ ② اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش۔ اور تمہاری زبانوں کا اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ یعنی بنی آدم اس میں مختلف ہیں حالانکہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ایک جنس، ایک نوع، لیکن ایک سے دوسرے کی صورت نہیں ملتی، رنگ نہیں ملتا، زبان نہیں ملتی۔ ایک پنجابی بولتا ہے، ایک بنگلہ بولتا ہے، ایک ہندی اور ایک انگریزی بولتا ہے۔ دنیا کے جتنے جاندار ہیں ہر نوع کی ایک زبان ہے خواہ وہ کسی ملک کا ہو۔ مثلاً طوطا ٹیں ٹیں کرے گا۔ وہ ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا، عربستان کا ہو یا ترکستان کا۔ مور ایک بولی بولے گا چاہے یورپ کا ہو یا ایشیاء یا افریقہ کا ہو۔ کبوتر ایک ہی طرح بولے گا کہیں کا ہو۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲.

لیکن انسان بھانت بھانت کی بولیاں بولتا ہے۔ ترکی اور طرح سے یورپین اور ایشین اور انداز سے۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک جنس کے سارے افراد ہیں اور زبان الگ الگ ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ یہ قدرت خداوندی کی نشانی ہے۔

انسان کی غفلت...... بہرحال ہر ہر چیز اپنی زبان میں تسبیح کرتی ہے مگر ہم ان کی زبانوں کو نہیں سمجھتے جیسا کہ ہم ایک دوسرے کی زبانوں کو نہیں سمجھتے، غرض کنکریاں تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا تسبیح کرتا ہے، چلتا ہوا پانی تسبیح کرتا ہے، ہری ٹہنیاں تسبیح و ذکر کرتی ہیں۔ لیکن نہیں ذکر کرتا تو انسان نہیں کرتا، غافل ہے، تو انسان اللہ کی یاد سے غافل ہے، حالانکہ سب سے زیادہ اس کو ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اللہ نے جو نعمتیں اس پر مبذول کی ہیں، کائنات میں اللہ نے وہ کسی کو نہیں عطاء کیں۔ جتنا چہیتا اور پیاری مخلوق انسان ہے۔ کوئی مخلوق کائنات میں اللہ کو اتنی پیاری نہیں ہے۔ تو ساری مخلوقات ذاکر حق ہیں، مگر یہ حق تعالیٰ سے غافل ہے حالانکہ سب سے زیادہ ذاکر اس کو ہونا چاہئے تھا۔ اس کے اوپر انعامات کی بارش ہے۔

ساری کائنات انسان کی غذا ہے...... ہر چیز کا لباس اس کی کھال ہے۔ اس کو الگ لباس دیا گیا۔ رنگ برنگ کا لباس، رنگ برنگ کے کپڑے۔ ہر نوع کی غذا ایک ہے۔ کوئی نوع گھاس کھاتی ہے، کوئی نوع دانہ کھاتی ہے، کوئی پتے چباتی ہے، کوئی مٹی کھاتی ہے، کوئی ہوا چوستی ہے۔ لیکن انسان کو ہر چیز پر قادر کیا گیا ہر چیز اس کی غذا ہے۔ گھاس یہ کھائے، پھونس یہ کھائے، پتے یہ کھا جائے، چونا یہ کھائے، مٹی یہ کھائے، چاندی یہ کھائے، سونا یہ نگل لے، جواہرات اس کے پیٹ میں جاتے ہیں۔ غرض جمادات، نباتات اور حیوانات ساری چیزیں اس کی غذا ہیں۔ تانبے اور سونے کے ورق نگل جائے گا، چاندی سونا کا کشتہ کھا جائے گا۔ یاقوتیاں اس کی طاقت کے واسطے بنتی ہیں۔ مٹی یہ کھاتا ہے۔ یہ چونا آخر مٹی پتھر نہیں تو اور کیا ہے؟ کتھ یہ کھائے، پتے یہ کھائے، سبزیاں یہ کھائے۔ دنیا بھر کی چیزیں اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ تو کائنات کی ہر نوع کی ایک غذا اور پوری کائنات اس کی غذا۔

ساری کائنات انسان کی سواری ہے...... ہر چیز اپنے پیروں سے چلتی ہے۔ اس کو سواریوں پر اٹھا کے چلایا گیا۔ حیوانات اس کی سواری میں ہیں، ریلیں جو چلتی ہیں وہ حیوانات کی قسم میں سے نہیں ہیں وہ جمادات میں سے ہیں اس کی سواری بنتی ہیں، گھوڑا، اونٹ، بیل یہ سب اس کی سواری بنتی ہیں تو حیوانات کے سروں پر یہ سوار جمادات کے سروں پر یہ سوار اور نباتات اس کی سواری میں ہیں۔

سمندروں میں یہ سواری کر جائے، ہوا میں یہ سواری کر جائے، زمین کی پشت پر یہ سواری کر جائے۔ کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کو سواری دی گئی ہو۔ ہر ایک اپنے پیر سے چلنے پر مجبور ہے اس کو مقرب اور معظم بنایا گیا ساری کائنات اس کی سواری بن گئی۔

ساری کائنات انسان کا لباس ہے......اور ساری کائنات اس کا لباس کہ درختوں کی چھال سے یہ لباس

بنائے، روئی سے یہ لباس بنائے، جانوروں کی کھال کھسوٹ کر یہ لباس بنالے۔اب سنا ہے کہ شیشے کے کپڑے چلنے والے ہیں۔لکڑی اور کھال کے کپڑے بننے لگے ہیں۔غرض ساری کائنات اس کا لباس، ساری کائنات اس کی غذا، ساری کائنات اس کی سواری۔اللہ کے یہاں اتنا چہیتا اور پیارا انسان کہ ساری کائنات کو اس کی خدمت پر لگا رکھا ہے کہ کھانے کو آئے تو سر تسلیم خم کردے کہ کھا لینے دو۔لباس بنائے تو چپ ہو کر بیٹھ جاؤ۔اس کو لباس بنانے دو۔سواریاں بنائے تو سر جھکا دو کہ سوار ہو کر جائے،تو ساری چیزوں سے زیادہ اس کو ذاکر بننا چاہئے تھا مگر سب چیزوں سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے پتھر بھی ذکر میں لگ جاتا ہے۔

انعامات کا تقاضا کیا ہے؟......پتھروں کی شان یہ ہے کہ ﴿يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهٰرُ﴾ ① اور کچھ نہیں تو پتھر رو پڑتے ہیں۔ان سے پانی بہہ پڑتا ہے اور کچھ نہیں تو پتھر اوپر سے نیچے آپڑتا ہے یہ اس کی تواضع اور انکساری کی بات ہے۔لیکن اگر فرعونیت اور کبر بھرا ہوا ہے تو انسان میں بھرا ہوا ہے کہ نہ اس کی آنکھوں سے آنسو تک ٹپکتا ہے نہ یہ تواضع سے نیچے جھکتا اور گرتا ہے۔حالانکہ پتھر گر بھی پڑتا ہے اور پانی بھی بہا دیتا ہے تو سب سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے حالانکہ اس کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہئے تھا۔اس لئے کہ اس پر انعامات کی بارش ہے۔

حقیقتِ زندگی......اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ ذکر اللہ چونکہ حیات ہے،تو ذکر کرنیوالا غافلوں میں ایسا ہے جیسے مردوں میں زندہ بیٹھا ہو۔اگر ایک بھرا مجمع غافلوں کا ہو،ایک اللہ کی یاد کرنے والا موجود ہے وہ ایسا ہے جیسے مردوں کے مجمع میں ایک زندہ بیٹھا ہوا ہو۔اس لئے کہ زندگی نام بدن کا نہیں ہے بلکہ قلب کی زندگی زندگی ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مرجائے   کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

زندگی نام دل کی زندگی کا ہے اور دل کی زندگی اللہ کی یاد سے ہوتی ہے۔روٹی اور ٹکڑے سے نہیں ہوتی۔یہ بدن کی زندگی ہے جو روٹی سے ہوتی ہے۔یہ اتنی عارضی ہے کہ روٹی ملنے میں دیر ہو جائے بدن مرجھانے لگتا ہے اور منقطع ہو جائے تو بدن چھن جاتا ہے۔لیکن قلب کی زندگی دوامی ہے۔اس لئے کہ ذکر اللہ جو زندگی پیدا کرتا ہے وہ دوامی زندگی ہوتی ہے وہ نفس کے اندر قائم ہو جاتی ہے۔

ذاکر انسان کا مقام......تو فرمایا گیا ذکر کرنے والے کی مثال غافلوں کے اندر ایسی ہے جیسے مردوں کے اندر کوئی زندہ بیٹھا ہوا ہو تو انسان اگر ذاکر بنے گا تو سارے ذاکروں پر بڑھ جائے گا اور اگر غافل بنے گا تو سب سے زیادہ بدتر ہو جائے گا۔حق تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذکر کرتا۔اور یہ غافل بن گیا پھر پتھر بھی اس سے اچھا، جانور بھی اس سے اچھے، درخت کی ٹہنیاں بھی اس سے اچھیں کیونکہ سب ذکر میں مشغول ہیں۔یہ سب سے زیادہ ذلیل اور بدتر ہے اور اگر ذکر پر آجائے تو ہر ذاکر اس سے نیچے ہے اس لئے کہ اس کا ذکر جامع ہوگا جو اور انواع کو میسر نہیں ہے۔تو ذکر فی الحقیقت روح کی غذا ہے اور ذکر ہی فی الحقیقت انسان کی زندگی ہے غذائے روحانی ذکر اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۷۴.

زندگی کی حقیقی غذا...... انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی غذائیں قلیل ہوتی ہیں اور قوتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ قوت ان میں یادِ خداوندی سے پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے امت کو ممانعت فرمائی کہ صوم وصال مت رکھو یعنی بلا افطار کئے روزہ پر روزہ مت رکھو۔ سحر بھی کھاؤ، افطار بھی کرو، کھا پی کر اگلا روزہ رکھو۔ بلا کھائے پیئے روزے پر روزے رکھتے چلے جانا اس کو صوم وصال کہتے ہیں اس سے آپ نے ممانعت فرمائی۔ اور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صوم وصال رکھتے تھے پندرہ پندرہ دن آپ کا مسلسل روزہ ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمیں تو آپ نے ممانعت فرمائی اور خود حضور صوم وصال رکھتے ہیں۔ فرمایا: ''اَیُّکُمْ مِثْلِیْ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ'' ① تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا اور پلاتا ہے، یہ کھانا اور پلانا کیا تھا؟ یہ پلاؤ اور زردے کے دسترخوان آسمان سے نہیں اترتے تھے۔ یہ ذکر اللہ اور یادِ حق غذا تھی جو روح میں پیوست تھی۔ اس سے روح زندہ تھی اور روح سے بدن زندہ تھا تو اللہ کا ذکر جب رگ وپے میں سما جاتا ہے تو غذاؤں کی حاجت کم ہو جاتی ہے تو زندگی کا دارومدار ذکر پر ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں کہ اخیر عمر میں انتقال سے چند ماہ پیشتر یہ فرمایا کہ: ''اب بحمد اللہ بقائے حیات کے لئے مجھے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی ہے۔ محض اتباع سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں۔ زندگی باقی رکھنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی''۔ غرض جب ذکر اللہ رگ وپے میں رچ بس جاتا ہے تو پھر زندگی کا دارومدار روٹی پر نہیں ہوتا ذکر پر رہ جاتا ہے۔ ذکر اللہ سے آدمی زندہ ہوتا ہے۔ قوت روحانی سے اس کی حیات اور بقاء ہوتی ہے تو اصل زندگی فی الحقیقت یادِ حق کا نام ہے۔

محبوب کے فراق و وصال کے آثار...... بلکہ یوں کہنا چاہئے زندگی نام ہے نام محبوب اور وصال محبوب کا۔ محبوب کا نام آتا ہے تو محب اور عاشق میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص کسی کی محبت میں گرفتار ہے اور رات دن اس کے دھیان میں غرق ہے اور محبوب اس سے جدا ہو جائے۔ یہ فراق میں پڑا ہوا گھل رہا ہے گھلتے گھلتے چارپائی کو لگ گیا ہلنے جلنے کی سکت نہیں رہی کھانا بھی چھوٹ گیا، پینا بھی چھوٹ گیا، چارپائی پر پڑا ہوا ہے فکر محبوب میں ہر وقت گرفتار ہے ایسے وقت کوئی آ کر کہہ دے کہ وہ آ گیا تیرا محبوب۔ ایک دم اٹھ بیٹھے گا کہاں ہے؟ کس نے کہا؟ یہ جان اس کے اندر کہاں سے آئی؟ کیا اس نے کوئی روٹی کھائی یا کوئی یاقوتی کھائی؟ محبوب کا نام ہی تو آیا مردہ اٹھ کر زندہ ہو گیا۔ معلوم ہوا زندگی نام ہے کسی محبوب چیز کے وصال کا۔

اب اگر کسی کو روپے پیسے سے محبت ہو گئی۔ جب تک اس کے سامنے روپے پیسے کا نام آتا رہے گا اس میں زندگی ہے اگر منقطع ہو جائے تو اس کی جان پہ بن جائے گی، بعض آدمی جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو ہارٹ فیل ہو جاتا

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب التنکیل لمن اکثر الوصال، ج: ۲ ص: ۶۹۴ رقم: ۱۸۶۴.

ہے۔اس لئے کہ محبوب چھن گیا۔زندگی ختم ہوگئی۔

یا اگر کسی کو کسی عورت سے محبت ہوجائے جب تک وہ پاس موجود ہے وہ زندہ ہے، جب چلی جائے تو فراق میں گھل کر جان دیدے گا۔غرض وصالِ محبوب کا نام زندگی ہے۔کسی کا محبوب دولت، عورت یا عزت ہے۔جن کا محبوب اللہ رب العزت ہے وہ اس کے نام سے زندہ ہیں جب تک ذکرِ حق ہے، ان میں زندگی ہے۔جب ذکر ان سے منقطع ہوجائے، ان کی موت ہوجاتی ہے۔جن کا دل پروردگارِ حقیقی سے اٹک چکا ہے ان کی زندگی جبھی ہے کہ وہ ہر وقت ذکر اللہ کئے جائیں، نامِ حق لئے جائیں۔جب اس میں کمی آجائے گی، یوں محسوس ہوگا کہ ہم ختم ہوگئے ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　　گرز باغ دل خلال کم بود

سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں، غم کا پہاڑ اس کے دل پر ٹوٹ پڑتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ باغِ دل میں سے ذکر اللہ کا کوئی خلال کم ہوگیا ہے تو ایک ذاکر کے لئے موت کے برابر ہوجاتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ اب میں زندہ نہیں ہوں۔

ذاکرین کے اوپر بعض اوقات قبض طاری ہوتا ہے اس قبض کا اثر یہی ہوتا ہے کہ وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اب ہمارے اندر ذکر اللہ باقی نہیں ہے اور حق تعالیٰ سے جو تعلق تھا اس میں کمی آگئی۔تو بعض اوقات قبض زدہ لوگوں نے خودکشی کر لی۔اگر سنبھالنے والے موجود نہ ہوں مربی نہ سنبھالے تو قبض کی حالت میں خودکشی کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز فرمادیئے گئے اور پہلی وحی آئی کہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ ① اس کے بعد میں وحی منقطع ہوگئی۔ایک عرصہ وحی کا انقطاع رہا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر ایک غم اور گھٹن طاری ہوئی۔آپ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات میرا جی چاہتا تھا کہ خودکشی کرلوں، کہ اب زندگی کس کام کی جب وہ شے باقی نہیں جس سے محبت ہے۔حتیٰ کہ یہ ارادہ کرکے پہاڑ کے اوپر آئے کہ اپنے کو نیچے گرادوں، تو پیچھے سے کسی نے ہاتھ پکڑلیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ گر پڑوں تو پیچھے سے کسی نے آواز دی یا محمد! آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا کوئی موجود نہیں تھا۔یہ قبض کی کیفیت جب طاری ہوتی ہے تو موت کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔سالک یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی ختم ہوگئی۔غرض زندگی ذکر اللہ، یادِ حق اور یادِ خداوندی کا نام ہے۔ہم چونکہ رات دن اس کھانے پینے اور پہننے میں مشغول ہیں۔اس لئے ہم نے زندگی اسی کو سمجھ لیا ہے، ہم اس کوچے سے نابلد ہیں جو حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہے جو اس کے اندر آگئے ان کی سمجھ میں آگیا کہ حقیقی زندگی یہی ہے۔

تو اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مَثَلُ الذَّاکِرِ فِی الْغَافِلِیْنَ کَمَثَلِ الْحَیِّ فِی الْاَمْوَاتِ" ② ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے جیسا کہ ایک زندہ مردوں کے اندر بیٹھا ہوا ہو تو غفلت مردنی ہے اور ذکر زندگی ہے۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱. ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوۃ، باب المساجد ومواضع الصلوۃ، ج: ۳، ص: ۱۹۵.

ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ...... پھر اس کا عجیب اور عظیم ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قانون مکافات ہے، جیسے انسان خود کرتا ہے، ویسا ہی ادھر سے معاملہ ہوتا ہے۔ فرمایا گیا ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ① اگر تم اللہ کی مدد کرو گے، اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور فرمایا: مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَآءَهٗ ② جسے یہ پسند ہے کہ میں جلد اللہ سے جاملوں۔ اللہ کو یہ پسند ہے اور انتظار ہے کہ کب میرا بندہ مجھ سے آکر ملے گا، جو ادھر سے معاملہ وہ ادھر سے معاملہ۔ اور فرماتے ہیں ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ③ مجھے یاد کرو میں تمہاری یاد کروں گا۔ اگر تم ذکر اللہ کرو گے تو میں تمہارے نفس کا ذکر کروں گا۔

حدیث (قدسی) میں فرمایا گیا کہ: اگر بندہ تنہائی میں مجھے یاد کرتا ہے، میں اپنے نفس میں اسے یاد کرتا ہوں جو بھرے مجمع میں مجھے یاد کرتا ہے، میں اسے ملائکہ کے مجمع میں یاد کرتا ہوں جس نوع کا یہ ذکر کرے گا اسی نوع کا وہاں ذکر ہوگا۔ تو ذاکر جب ذکر کرتا ہے، انجام کار مذکور بن جاتا ہے۔ ادھر سے اس نے ذکر کیا ادھر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا تو مذکور بن گیا۔ اس لئے اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اللہ کے ہاں میرا تذکرہ رہے تو یہ اللہ کا تذکرہ شروع کر دے۔ جتنا یہ یاد کرے گا اتنا ہی وہ یاد کریں گے۔

دیکھئے اگر کسی بڑے حاکم، وزیر اعظم یا پریذیڈنٹ کے یہاں آپ کا تذکرہ آجائے اور آپ سن پائیں کہ آج پریذیڈنٹ نے میرا ذکر کیا تھا تو عزت و افتخار سے سر اونچا ہو جاتا ہے۔ اخباروں میں چھاپتے ہیں کہ آج پریذیڈنٹ نے ہمارا تذکرہ کیا ہے۔ اس لئے کہ ایک بڑی ذات جو عزت والی کہلاتی ہے مجھے یاد کر لے تو یہ بڑے فخر کی بات ہوگی۔ حق تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کے یہاں کسی کا تذکرہ ہو تو یہ تھوڑے فخر کی بات ہے؟ یہ تھوڑی عزت کی چیز ہے کہ اللہ کسی کو یاد کرے؟ اور حق تعالیٰ کب یاد کریں گے جب تم یاد کرو گے؟ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ④ غرض اگر کوئی یوں چاہتا ہے کہ میری یاد وہاں قائم ہو جائے، وہ اس کی یاد کو اپنے اندر قائم کر لے۔ اگر یہ ہر وقت ذکر کرے گا۔ وہاں بھی ہر وقت ذکر ہوگا یہ غافل بن جائے گا تو وہاں بھی غفلت برتی جائے گی۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ ⑤ تم ایسے مت بنو کہ اللہ کو بھلا دو۔ تو تم اپنے نفس کو بھلا دو گے تو اللہ بھی تمہیں بھلا دے گا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جو لوگ قرآن کریم یاد کر کے اسے بھول جائیں تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس بندے کو نابینا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا ﴿رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا﴾ ⑥ اے رب! مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دنیا میں بینا تھا؟ میں تو دیکھنے والا تھا؟ ﴿قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ ⑦ ہم نے اپنی آیتیں تیرے سینے میں ڈالی

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ: ۷. ② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب من احب لقاء اللہ...... ج: ۲۰، ص: ۱۲۵، رقم: ۶۰۲۶. ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲. ④ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲.
⑤ پارہ: ۲۸، سورۃ الحشر، الآیۃ: ۱۹. ⑥ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۵. ⑦ پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۶.

تھیں تو نے انہیں بھلا دیا، ہم نے تجھے بھلا دیا تو اگر یہ نسیان کا برتاؤ کرے گا، ادھر سے بھی نسیان کا برتاؤ ہو جائے گا۔ یہ ذکر کا برتاؤ کرے گا، ادھر سے بھی ذکر کا برتاؤ ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ شانہ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ:

اے بندے! تو اپنی تندرستی کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ تیری بیماری کے زمانے میں میں تجھے یاد رکھوں۔ تو اپنی تونگری کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ تیری مفلسی کے زمانے میں میں تجھے یاد رکھوں۔ تو صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ بیماری کے وقت میں تجھے یاد رکھوں جب کوئی تیرا یاد کرنے والا نہیں ہوگا۔ تو اپنی دنیا میں مجھے یاد رکھ تا کہ قبر میں میں تجھے یاد رکھوں۔ جو یہاں یاد کرے گا، یہ یاد وہاں کام دے گی۔ جو یہاں بھول جائے گا، وہ وہاں بھی کسمپرسی کے عالم میں ہوگا۔

یادِ حق کا احساس...... اس لئے ذکر اللہ نہ صرف کائنات کی روح ہے بلکہ انسان کی بھی روح ہے بلکہ انسان کی روح کی روح ہے۔ اگر ذکر منقطع ہو جائے تو روح پر مردنی چھا جاتی ہے اگر احساس ہو فرق یہ ہے کہ سیاہ کپڑے پر ہزاروں دھبے ڈال دو احساس نہیں ہوگا کہ اس پر بھی کوئی دھبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تو ہے ہی سیاہ اور سفید کپڑے پر ذرا سا دھبہ لگا دو، وہ نمایاں ہوگا اور محسوس ہوگا۔ تو جن کے قلوب میں غفلت رچ چکی ہے۔ ان میں اگر دس غفلتیں بڑھ جائیں احساس نہیں ہوگا۔ کیونکہ دل غفلتوں میں رنگا ہوا ہے، لیکن یاد کرنے والا منٹ بھر غافل ہوا سے احساس ہوگا کہ پتہ نہیں کیا چیز میرے اندر سے چھن گئی۔

اس لئے ذکر اللہ کا احساس پیدا کرنا چاہئے زندگی یہی ہے۔ زندگی فی الحقیقت شیرازہ بندی کا نام ہے، اور موت شیرازہ بکھر جانے کا نام ہے اس بدن میں آج پانی مٹی ہوا آگ جمع شدہ موجود ہیں کہا جائے گا کہ زندہ ہے۔ قبر میں جا کے ریزہ ریزہ ہو کر اجزاء بکھر جائیں گے کہا جائے گا کہ مردہ ہے تو ذکر اللہ روح کو بدن سے ملائے رکھتا ہے اور بدن کے اجزاء کو جمع رکھتا ہے۔ تو ذکر اللہ انسان کی روح اور زندگی ہے یہ نہ ہو تو آدمی کی زندگی ختم ہے۔

یادِ حق کا اصل طریق...... اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی اور مقصد یہ نہیں تھا کہ کوئی لمبی تقریر کی جائے مقصد صرف اس حدیث کی تشریح اور ترجمہ تھا کہ ذکر اللہ کی عادت ڈالی جائے اور اس کے تین طریقے ہیں۔ سب سے پہلا طریقہ جو اصل اور بنیادی ہے وہ فرائض کی ادائیگی ہے۔ سب سے بڑا ذکر، اللہ کے فرائض میں نماز ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ ① نماز قائم کرو میری یاد کے لئے۔ معلوم ہوا کہ نماز ذکر اللہ اور یادِ حق ہے۔

حج کے بارے میں جگہ جگہ فرمایا گیا ﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ﴾ ② حج کے ایک ایک رکن پر کہیں ذکر اللہ، کہیں استغفار، کہیں توبہ، کہیں یادِ حق ان سب کا

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۹۸، ۱۹۹۔

مقصد ذکر ہے نماز کا مقصد بھی ذکر ہے۔

زکوٰۃ اور صدقات کا مقصد بھی فی الحقیقت ذکر ہے فرمایا ﴿لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُ هَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ ① جو تم قربانیاں کرتے ہو اس کا گوشت پوست اللہ تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ تقویٰ ذکر اللہ یاد حق پہنچتی ہے جو قربانی کے وقت نام لیتے ہو اور قلب میں نیت کرتے ہو۔ وہ چیز اللہ تک جاتی ہے۔ یہ اس کی علامت ہے۔ بہر حال قربانی ہو، زکوٰۃ ہو، حج ہو، نماز ہو ان سب کی روح ذکر بتلائی گئی ہے تو ذکر کرنے کا بنیادی طریق فرائض شرعیہ کی ادائیگی ہے۔ یہ اصل ذکر ہے۔

ذکرِ مؤقت...... لیکن اصل ذکر کے ساتھ ساتھ امر کیا گیا ہے کہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا﴾ ② اے لوگو! اللہ کی یاد کرو ذکر کثیر کے ساتھ۔ تو ایک ذکر اصل ہے وہ فرائض ہیں اور ایک ذکر زائد اور ذکر کثیر ہے، وہ اس سے اوپر ہے۔ اس کے دو طریقے ہیں ایک موقت، ایک غیر مؤقت۔ مؤقت تو یہ ہے کہ صبح اور شام کا وقت مقرر کر کے کچھ تسبیح اور تہلیل کر لیا کرے۔ صبح کی نماز کے بعد بیٹھ گئے۔ فرض کیجئے آپ نے سو مرتبہ کلمہ تمجید پڑھ لیا۔ ”سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ“ سو مرتبہ استغفار پڑھ لیا، سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا۔ اسی طرح شام کو پڑھ لیا: ﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ ③ فرمایا! اللہ کی تسبیح کرو کچھ صبح کو، کچھ شام کو کچھ دوپہر کو ﴿وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا﴾ ④ صبح اور شام اللہ کی تسبیح کرو۔ تو یہ مؤقت طریق ہے کہ ایک وقت باندھ کر آدمی کچھ تسبیح پڑھے، سو مرتبہ نہ ہو تینتیس مرتبہ پڑھ لے اتنا نہ ہو کچھ کم کر لو۔ مگر ایک عدد اور وقت معین کر کے اس کو نبھا دے۔

حدیث میں ہے ”خَیْرُ الْاُمُوْرِ مَادِیْمَ عَلَیْهِ“ ⑤ بہترین عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی اور دوام برتا جائے۔ جو قلب میں جڑ پکڑ لیتا ہے رسوخ پیدا کر لیتا ہے۔ پہاڑ کی ایک چٹان ہے اس پر گرد پڑ گئی ہے۔ آپ نے لاکھوں من پانی بہا دیا۔ گرد دھل گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر چڑھ جائے گی۔ تو منوں پانی بہا دینے سے ظاہری صفائی آ جاتی ہے۔ مگر چٹان کے اندر نمی نہیں پہنچتی، لیکن اگر آپ ایک قطرہ برس دن تک گراتے رہیں تو پتھر میں بھی سوراخ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو تھوڑا تھوڑا عمل ہو۔ اس سے قلب میں جڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ نے ایک دن پچاس نمازیں پڑھ لیں لیکن پھر ایسے غائب ہوئے کہ برس دن تک غائب رہے تو گرد دھل جائے گی، اجر مل جائے گا لیکن قلب میں کوئی ملکہ، کوئی بنیاد، کوئی جڑ قائم نہیں ہوگی۔ تو تھوڑا عمل ہو مگر دوام کے ساتھ ہو وہ کارآمد ہوتا ہے دل میں

---

① پارہ: ۱۷، سورة الحج، الآیة: ۳۷. ② پارہ: ۲۲، سورة الاحزاب، الآیة: ۴۱.

③ پارہ: ۲۱، سورة الروم، الآیة: ۱۷، ۱۸. ④ پارہ: ۲۲، سورة الاحزاب، الآیة ۴۲.

⑤ الحدیث اخرجه الامام الترمذی ولفظه: کان احب العمل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم مادیم علیه، کتاب الادب، باب ماجاء فی الفصاحة، ج: ۱۰ ص: ۸۷ رقم: ۲۷۸۳. امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے حوالہ ہذا۔

ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جڑ قائم ہوجاتی ہے۔ بہر حال سو مرتبہ نہ ہو بالکل تھوڑا ہی عدد ہو مگر ایک وقت مقررہ پر نام حق لیا جائے، کچھ تلاوت کرلی، کچھ تسبیح، کچھ تہلیل خواہ دس منٹ ہو مگر آدمی اس کا پابند ہوجائے، چالیس دن کے بعد خود محسوس ہوگا کہ میرے قلب کے اندر کیا اثر قائم ہوا۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کسی عمل کو چالیس دن خلوص کے ساتھ مسلسل کرے تو قلب میں سے حکمت کا چشمہ بہہ پڑتا ہے۔ یادِ حق کی ایک بنیاد قائم ہوجاتی ہے جس کی جیسی مناسبت ہے ویسی معرفت اس کو شروع ہوجاتی ہے تو ذکر کثیر کی ایک صورت یہ ہے کہ مقررہ وقت پر آدمی کچھ اللہ کا نام لے۔

ذکر غیر مؤقت...... دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مقررہ طریق پر آدمی یہ عادت ڈالے کہ اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام نکلتا رہے۔ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ سُبْحَانَ اللّٰـهِ، اَللّٰـهُ اَكْبَرُ وغیرہ اٹھتے بیٹھتے ہوئے چلتے ہوئے کھڑے، وضو سے بے وضو کوئی قید نہیں۔ مہینہ دو مہینہ تو تکلف کر کے عادت ڈالنی پڑے گی۔ جب عادت پڑ جائے گی تو بے اختیار اللہ کا نام زبان سے جاری ہوگا۔ کوئی حادثہ پیش آئے گا۔ (خدانخواستہ) مثلاً آپ گر پڑے فوراً اِلَّا اللّٰهُ، بِسْمِ اللّٰهِ کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان سے نکلے گا۔ یہ نہیں نکلے گا کہ لوگو دوڑو، مجھے بچاؤ، اللہ کا نام نکلے گا۔ ابتداً تکلف کرنا پڑے گا۔ جب عادت پڑ جائے گی تو پھر بغیر ارادہ ذکر حق زبان سے شروع ہوجائے گا۔

ذکر غیر مؤقت کا ثمرہ......اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرتے وقت بھی بلا ارادہ اللہ کا ذکر زبان سے جاری ہوگا۔ خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: "تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ كَمَاتَحْيَوْنَ." "تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی ہوگی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے"۔

اگر اللہ کے نام کی مشق پر زندگی گزاری ہے تو موت کے وقت یقیناً اللہ کا نام زبان پر جاری ہوگا اور جب آدمی اللہ کا نام لیتا ہوا مرے گا تو قبر سے جب اٹھے گا وہی نام اس کی زبان پر جاری ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میں درحقیقت موت میں ہوں اور اللہ کا نام لے رہا ہوں بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ تو میدان حشر ہے۔

آدمی کو جب عادت پڑتی ہے تو غیر ارادی طور پر وہ چیز جاری ہوجاتی ہے جس کی عادت ہوتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہر عبادت ابتداء میں ریاکاری ہوتی ہے دکھلاوا ہوتا ہے۔ بعد میں عادت بنتی ہے، اخیر میں عبادت بنتی ہے۔ اور حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا "مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا وَاضْرِبُوْهُمْ اِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا." ① بچہ جب سات برس کا ہو، اس کو نماز کی تاکید کرواسے مسجد میں ساتھ لاؤ۔ اگر دس برس کا ہوجائے اور نہ مانے تو اس کو مار کر نماز پڑھاؤ۔

ظاہر بات ہے کہ سات برس کے بچے کو جب آپ نماز پڑھائیں گے وہ نماز اللہ کی تھوڑا ہی ہوگی وہ باپ کی ہوگی۔ وہ مار پٹائی کے ڈر سے نماز ہوگی کہ مسجد میں جائے گا تو کن آنکھوں سے دیکھے گا کہ باپ دیکھ رہا ہے کہ نہیں۔

---

① المصنف لابن ابی شیبة، ج: ۱ ص: ۳۸۲.

اگر دیکھا کہ کھڑا ہوا ہے تو بڑے خشوع سے سجدہ کرے گا اور دیکھا کہ باپ چلا گیا تو وہ بھی تھوڑی دیر میں کھسک جائے گا۔ یہ باپ کی نماز ہے۔ حقیقی نماز نہیں ہے آٹھ نو برس کی عمر تک یہ ریا کاری رہی۔ دس برس کی عمر میں آ کر عادت پڑ گئی کچھ سمجھ بوجھ نہیں۔ نماز کی حقیقت منکشف نہیں۔ بس ایک عادت پڑی ہوئی ہے کہ گھر سے نکلے مسجد تک آ گئے۔ جماعت میں کھڑے ہو گئے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں اس کے اندر حقیقت کیا ہے؟ یا یہ کوئی عبادت یا طاعت ہے۔ بس ایک عادت ہے تو ابتداءً ریا کاری تھی کرتے کرتے عادت پڑ گئی پندرہ بیس برس کے بعد جب آثار و کیفیات طاری ہوں گے تب سمجھے گا یہ کوئی عبادت ہے۔ اب آ کر عبادت بنے گی۔ تو ہر عبادت ابتداء میں ریا کاری ہوتی ہے، بعد میں عادت بنتی ہے، پھر عبادت بنتی ہے۔

مگر اس کے باوجود شریعت نے حکم دیا کہ ریا کاری ہی سہی مگر نماز پڑھو اور عادت کے طور پر ہی سہی مگر نماز پڑھو تا کہ عبادت بن جائے۔ تو اگر کوئی ذکر اللہ کرنے آئے اور دل میں خیال ہو کہ یہ تو ریا کاری ہے۔ لوگ کہیں گے کہ بڑے صوفی بن گئے، بڑے نمازی آئے، بڑے ذکر کرنے والے آئے، تو سمجھے کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ دکھلاوے کے لئے ہی تم ذکر اللہ کرو، کرتے رہو۔ یہ ذکر خود کھینچ لے گا اور آپ کے قلب کے اندر رچ جائے گا۔

تو ابتداءً ؎

بہر دین و بہر دنیا و بہر نام　　　اللہ اللہ کردہ باید والسلام

دین کے لئے ہو، دنیا کے لئے ہو یا دکھلاوے کے لئے ہو، اللہ کا نام لیتے رہو۔ یہ نام آپ کو اپنی طرف خود کھینچ لے گا۔

امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں جن کا محدثین میں عظیم رتبہ ہے: ''طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَاَبٰى اَنْ يَّكُوْنَ اِلَّالِلّٰهِ.'' ① ہم نے دنیا کے لئے علم حاصل کیا تھا کہ علم پڑھ کر شہرت کمائیں گے۔ کچھ نام و نمود ہوگا۔ ممکن ہے کچھ پیسے بھی مل جائیں، سیکھا تو دنیا کے لئے تھا، مگر جب علم آ گیا تو علم نے انکار کیا کہ میں دنیا کے لئے نہیں میں تو اللہ ہی کے لئے ہونا چاہتا ہوں۔ آخر اس نے ہمیں بھی اللہ سے جا ملایا۔ تو علم آدمی چاہے دنیوی غرض سے سیکھے مگر سیکھ لے، علم آخر وہیں پہنچاتا ہے جو اس کا مقام ہے۔ تو علم پست رہنا نہیں چاہتا، علم بلندی کی چیز ہے۔ آپ کتنا ہی پست رہیں گے۔ مگر وہ آپ کو پکڑ کر اوپر لے جائے گا۔

یہی حقیقت ذکر اللہ کی بھی ہے کہ اللہ بلند ہے، اس کا نام بھی بلند ہے، اس کا ذکر بھی بلند ہے۔ بلند چیز کو جب آپ زبان پر رکھیں گے۔ چاہے اس کی غرض دنی اور پست ہو مگر انجام کار وہ رفعت کی طرف جائے گا اور اپنے ساتھ آپ کو بھی لے جائے گا اس واسطے صبح اور شام کچھ نہ کچھ اللہ کا نام لینا چاہئے۔

تسبیح مذکرہ ہے...... اگر ویسے یاد نہ آئے تو آدمی تسبیح ہاتھ میں رکھ لے۔ تسبیح مذکرات میں سے ہے۔ یاد دلاتی

---

① مرقاة المفاتيح، المقدمة، ج: ۱ ص: ۲۰.

ہے۔ تسبیح دیکھ کر خواہ مخواہ ہی سُبْحَانَ اللّٰہِ، سُبْحَانَ اللّٰہِ جاری ہوجاتا ہے۔ یہ تسبیح مذکرات میں سے ہے۔ یاد دہانی کرادیتی ہے۔

جوابِ شبہ: اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ لوگ کہیں گے بڑے صوفی بنے ہیں تو حضرت جنید بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیال کی وجہ سے ذکر کا چھوڑ دینا یہ شرک میں داخل ہے۔ اس واسطے اس کی پرواہ مت کرو لوگ کیا کہیں گے۔ اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ کرلو۔ ضمیر سے معاملہ ہے حق تعالیٰ کا لوگوں سے نہیں ہے۔ آپ جب اپنے قلب میں خالص اللہ کے لئے ذکر اللہ کررہے ہیں، تو یہ وسوسہ اگر آئے کہ میں دکھلاوے کے لئے کررہا ہوں تو یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اس پر لَاحَوْلَ پڑھ لے۔

عشق کامل ہو تو ملامت کارگر نہیں ہوتی...... اگر کوئی ملامت کرے تو کرنے دیجئے، اس لئے کہ ملامت جبھی کارگر ہوتی ہے جب عشق ناتمام ہوتا ہے۔ جب محبت کامل ہوتی ہے۔ پھر ملامت گروں کی ملامت کوئی اثر نہیں کرتی۔ حضرت حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، جب ایران فتح ہوا تو حضرت حذیفہ ایران پہنچے، اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو ایران کا ملک بڑا متمدن ملک تھا۔ اس زمانے میں دو ہی بڑی حکومتیں تھیں، ایک قیصر کی حکومت یعنی رومیوں کی حکومت جو عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، ایک کسریٰ کی حکومت جو فارسیوں کے ہاتھ میں تھی۔ باقی ساری حکومتیں یا ان کے ماتحت تھیں یا ان کے زیر اثر تھیں جو صورت آج روس اور امریکہ کی ہے وہی اس زمانے میں ان کی تھی۔ تو حذیفہ ابن یمانؓ کھانا کھانے بیٹھے اور ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ پانی اس کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں سے زمین پر لقمہ گر پڑا۔ انہوں نے جلدی ادب کے ساتھ لقمہ کو اٹھا کر مٹی جھاڑی اور تناول فرمالیا۔

فارسی غلام نے کہا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ ملک تو بڑا مہذب ملک ہے۔ یہ بات یہاں کی تہذیب کے خلاف ہے، لوگ کہیں گے یہ بڑے حریص ہیں ایک ایک لقمہ پر جان دیتے ہیں۔ مٹی تک جھاڑ کر کھا گئے۔ یہ حرص کی دلیل ہے۔ ایسا نہ کیجئے یہ تمدن والوں کا ملک ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کیا جواب دیا۔؟ فرمایا: "ءَاَتْرُکُ سُنَّةَ حَبِیْبِیْ لِھٰؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ." کیا میں اپنے حبیب پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں؟ گویا اس درجہ ایک سنت محبوب تھی، عزیز تھی کہ فارسیوں کا پورا ملک اور ان کی تہذیب وتمدن اتنا عزیز نہیں تھا۔ جب محبت کامل ہوتی ہے تو ملامت گر کی ملامت اثر نہیں کرتی۔ ملامت سے منفعل ہونا جبھی ہوتا ہے جب اپنے اندر خامی ہوتی ہے۔ اس واسطے خامی کو رفع کیجئے اور خامی رفع ہونے کی یہی صورت ہے کہ ذکر اللہ اور یادِ حق کی عادت پڑجائے۔ جب چوبیس گھنٹے اللہ کا نام دل و زبان پہ ہوگا، محبت اور معرفت بڑھ جائے گی۔ پھر ملامت کرنے والے ہزار ملامت کریں گے، کوئی اثر نہیں ہوگا، ان پر ہنسی آئے گی کہ یہ احمق ہیں اس چیز سے روک رہے ہیں۔ آپ خود منفعل اور شرمندہ نہیں ہوں گے۔

بہر حال یہ حدیث بتلاتی ہے کہ زندگی فی الحقیقت ذکر اللہ اور اللہ کا نام ہے جب کائنات، نباتات، جمادات کی زندگی اس سے ہے تو انسان کی زندگی اس سے کیوں نہیں ہوگی۔ اس لئے انسان کو سب سے زیادہ ذاکر رہنا چاہئے تبھی وہ زندہ ہوگا بلکہ زندہ جاوید بن جائے گا۔

بس مولانا کی تعمیل حکم کے لئے یہ چند کلمے میں نے عرض کر دیئے اور اس حدیث کی شرح کی، دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ ہم کو یاد الٰہی اور ذکر حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَاَصْحٰبِہٖ اَجْمَعِیْنَ. بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

نبوت وملوکیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـاوَسَنَدَنَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً وَّنَجْعَلَھُمُ الْوٰرِثِیْنَ ٥ وَنُمَکِّنَ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَھَامٰنَ وَجُنُوْدَھُمَامِنْھُمْ مَّا کَانُوْا یَحْذَرُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

مادی وروحانی اقتدار کی انتہاء...... بزرگانِ محترم! اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نعمتوں کے دو سلسلے قائم فرمائے ہیں، ایک سلسلہ مادی نعمتوں کا اور ایک روحانی نعمتوں کا ہے۔ مادی نعمتوں کے سلسلے میں جیسے بہترین غذائیں، بہترین لباس اور بہترین مکان اور بہترین شکلیں، صورتیں اور ان سے نفع اٹھانا وغیرہ ایک یہ سلسلہ ہے جس کی کوئی حد ونہایت معلوم نہیں ہوتی۔ دنیا میں یہ نعمتیں روز بروز ترقی پر ہیں۔ ہر چیز کے نئے سے نئے ڈیزائن اور نمونے، کچھ آنکھوں کو فرحت دینے والے، کچھ کانوں کو، کچھ دماغ کو اور کچھ ناک کو۔ غرض حواسِ خمسہ کے لئے اللہ نے نئی سے نئی نعمت پیدا کی اور وہ بڑھتی رہتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مادی نعمتوں میں سب سے بڑھ کر اقتدار ہے کہ کسی قوم کو عزت دی جائے، اس کے ہاتھ میں قدرت وتمکنت ہو اور وہ اپنی قسمت کی مالک آپ بن جائے۔ اسی کا نام اقتدار ہے پھر ان مادی نعمتوں میں ایک حصہ لذات کا ہے اور ایک اقتدار کا ہے۔

اس کے بالمقابل دوسری نعمتیں روحانی ہیں، جیسے علم، اخلاق، ہدایت پانا، قلب کی تسکین اور عقلی کام ہیں۔ یہ سب روحانی نعمتیں کہلاتی ہیں جن کے ذریعے انسان کی روح کو فرحت اور تسکین ملتی ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ مادی نعمتیں اس کے سامنے گرد ہیں جس کو روحانی لذت میسر آجائے، پھر مادی نعمتیں ہیچ اور گرد بن جاتی ہیں۔

اہل اللہ نے مادی لذتوں پر لات ماری ہے تو کوئی نعمت ان کو ہاتھ لگی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ان

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵،۶.

نعمتوں کو حقیر اور کم رتبہ سمجھا ہے۔ غرض یہ بات الگ ہے کہ ایک نعمت اعلیٰ ہے۔ اور ایک ادنیٰ ہے۔ مگر ہیں دونوں نعمتیں ایک مادی اور جسمانی، دوسری روحانی اور معنوی لذتیں۔ مادی لذتوں کی انتہاء ملوکیت پر ہو جاتی ہے کہ کسی قوم کو اللہ بادشاہت اور تمکنت دیدے اور ساری نعمتیں اس کے قبضہ میں آ جائیں۔

اور روحانی نعمتوں کی انتہاء نبوّت پر ہو جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام نبوت کے راستے سے جو نعمتیں لاتے ہیں وہ روح کی تسلی کی ہیں۔ ان میں علم واخلاق ہے، اللہ کے جمال وجلال کا مشاہدہ ہے، ہدایت پانا، اللہ کی کتابوں کی تلاوت کرنا، اس کے ذریعے سے روح کو اقتدار ملتا ہے یہ سلسلہ نبوّت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

مادی وروحانی اقتدار کی تاثیر..... تو بادشاہوں کا اقتدار مادی ہے جو بدنوں کے اوپر ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کا اقتدار روحانی ہوتا ہے جو دلوں کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ بدنوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ وہ دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ان کی حکومت جبری اور ان کی حکومت محبت کی ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ سامنے ہے تو آدمی ڈرتا ہے۔ اس کی سی، آئی، ڈی ہے تو خائف ہوتا ہے کہ کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہ نکال دوں جس کی وجہ سے قانون کی زد میں آ جاؤں اور مقدمہ چل جائے۔ چاہے دل میں لعنت ہی بھیجے۔ تو دل پر کوئی حکومت نہیں بلکہ دل میں بعض اوقات نفرت ہوتی ہے۔ لیکن زبان سے نہیں کہہ سکتا تو شاہی اور ملوکیت کا اقتدار بدنوں پر ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی حکومت اور اقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے۔ وہ سامنے بھی نہ ہوں تب بھی آدمی انکی عظمت میں دبا ہوا ہوتا ہے بلکہ دنیا میں بھی نہ ہوں، جب بھی وہی عظمت واقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے جو ان کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ آج انبیاء علیہم السلام کا نام آ جائے سب درود شریف پڑھیں گے صلی اللہ علیہ وسلم پڑھیں گے انبیاء علیہم السلام کی ذات تو بہت بلند و بالا ہے ان کے خدام صحابہ کا ذکر آ جائے تو رضی اللہ عنہم اجمعین کہیں گے۔ صحابہ کرام کا مقام بھی بہت بلند ہے ان کے خدام اور غلام اولیاء کرام ہیں، انکا ذکر آ جائے تو سب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کہیں گے۔ صالحین کا ذکر آ جائے محبت سے یاد کریں گے۔ تو آج انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہیں لیکن قلوب ان کی محبت وعظمت سے لبریز ہیں۔ اگر آج خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آ جائے تو عقیدت سے دل جھک جاتا ہے۔ اگر شیخ علاء الدین صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آ جائے تو فرطِ عقیدت سے دل جھک جائے گا، آج اگر کوئی امام ابی حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ کا نام لے تو دل عقیدت سے جھک جائیں گے۔ اگر کوئی شخص ان کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہے آدمی جان دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ انکے خلاف کوئی کلمہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ محبت وعقیدت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ حضرات آج دنیا کے اندر موجود نہیں ہیں۔ لیکن قلوب پر حکومت آج بھی کر رہے ہیں۔

مسٹر آرنلڈ جو سرسید مرحوم کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' لکھی ہے۔ اس نے اسلامی تبلیغ کے دور اور طریقے تاریخی طور پر ذکر کیے ہیں کہ کس کس طرح سے

اسلام پھیلا اور دنیا میں رائج ہوا۔اس نے اس میں بڑی تفصیلات ذکر کی ہیں۔ ہندوستان کا بھی ذکر کیا ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں میں نے ایک بڑی عجیب بات دیکھی جو مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔اس کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے اسے کہیں اور نظر نہیں آئی۔لیکن دوسروں کو وہ ہر جگہ نظر آئی مگر اس کے لئے وہ انوکھی بات ہے۔

''وہ یہ کہ میں نے ہندوستان میں دیکھا کہ ایک شخص اجمیر میں قبر میں لیٹا ہوا، پورے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے اور سلطان بنا ہوا ہے۔نام بھی اس کا ''سلطان الہند'' ہے۔یعنی حضرت خواجہ اجمیر رحمۃ اللہ علیہ''۔

تو اس نے کہا میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے اس دنیا میں نہیں ہے مگر پورے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر اس کی حکومت قائم ہے اس کا نام بھی آتا ہے تو لوگ عظمت سے اس کا نام لیتے ہیں۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے مادی اقتدار بدنوں کے اوپر ہوتا ہے، روحانی اقتدار قلوب کے اوپر ہوتا ہے۔اس لئے انبیاء علیہم السلام، ان کے خدام اور تربیت یافتہ، دلوں کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔سلاطین اور ان کے تربیت یافتہ بدنوں کے اوپر حکومت کرتے ہیں۔سلاطین دنیا سامنے موجود ہوں تو آدمی عظمت کا کلمہ کہتا ہے ورنہ بعض اوقات لعنت کرتا ہے، انبیاء اور اولیاء دنیا میں موجود ہوں یا نہ ہوں، قلوب پر یکساں ان کی عقیدت و عظمت قائم ہے، محبت سے دل لبریز ہے تو اقتدار کے دوسلسلے نکلے، مادی اقتدار کی انتہاء حکومت کے اوپر ہے اور روحانی اقتدار کی انتہا نبوّت کے اوپر ہے۔

مزاج نبوّت وملوکیت میں فرق......لیکن ان دونوں کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔نبوّت کا بھی ایک مزاج ہے اور بادشاہت وملوکیت کا بھی۔دنیا میں جب بادشاہت غالب آتی ہے تو اس کا مزاج کچھ اور ہے۔ان دونوں مزاجوں کا قرآن حکیم نے تذکرہ کیا۔فرمایا کہ بادشاہ جب کسی ملک پر غالب آتے اور اقتدار پاتے ہیں اور فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہ کیا کرتے ہیں؟ ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ ① جب کوئی بادشاہ کسی ملک میں فاتحانہ داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اس شہر کو اس طرح سے فاسد کرتا ہے کہ عزت والوں کو پست کرتا ہے، ذلت والوں کو اونچا کرتا ہے۔انقلاب عظیم برپا کرتا ہے۔

اس لئے کہ جو اب تک عزت والے تھے ان سے عزت چھیننی ہے کیونکہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ پھر برسر اقتدار نہ آجائیں۔اس لئے انہیں کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے اقتدار کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔وہ نشانات مٹائے جاتے ہیں جو کسی قوم کے اقتدار کے ہوتے ہیں۔کاغذوں سے وہ نام محو کئے جاتے ہیں تا کہ خیال بھی ادھر نہ جائے اس لئے کہ اگر ان کا اقتدار کسی درجہ میں بھی رہ گیا تو ہمارا اقتدار قائم نہیں ہوگا۔﴿وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ ② یہ سلاطین کا طریقہ ہے بادشاہت اور ملوکیت کی تاریخ دیکھی جائے تو ایسی ہی نظر آئے گی۔

① ② پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۳۴.

اقتدار پانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل......اور ایک انبیاء علیہم السلام کا مزاج ہے۔ جب نبوّت کا اقتدار غالب ہوتا ہے تو وہ امن کا اعلان کرتے ہیں۔ عزت والوں کی عزت کو برداشت کرتے ہیں اور جو پست ہیں ان کو ابھارتے ہیں تا کہ سب عزت میں شریک ہو جائیں اور کسی کی تذلیل اور رسوائی نہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دس برس کی زندگی کے بعد جب مدینہ طیبہ سے تشریف لائے اور فاتحانہ انداز میں مکہ کے اندر داخل ہوئے تو دس ہزار صحابہ کا لشکر ساتھ تھا۔ آپ اونٹنی پر سوار ہیں۔ بادشاہ ایسے موقع پر اقتدار جتلاتا ہوا اور اینٹھتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے۔ حدیث میں ہے کہ تواضع اور خاکساری کی وجہ سے گردن مبارک اونٹنی کی گردن پر جھکی ہوئی تھی۔ چونکہ عزت کے ساتھ داخلہ ہوا ہے تو اللہ کی عزت پیش نظر تھی۔ اس لئے غایت تواضع اور انکساری کی وجہ سے سر مبارک اتنا جھک گیا تھا کہ اونٹنی کے سر کو آ ملا تھا۔ تو انبیاء کا داخلہ تو اس شان سے ہوا۔ سلاطین داخل ہوتے ہیں تو اکڑتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ پھر سلاطین عزت والوں کو ذلیل بناتے ہیں، پستوں کو اور پست کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا مزاج یہ ہے کہ آپ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ داخل ہوئے تو جگہ جگہ امن کا اعلان فرمایا۔ فرمایا: "مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِیْ سُفْیَانَ فَھُوَ اٰمِنٌ" ابوسفیان کے گھر میں جو چلا جائے گا اسے بھی امن ہے۔ "وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ فَھُوَ اٰمِنٌ" جو مسجد حرام میں چلا جائے گا اسے بھی امن ہے۔ "مَنْ اَغْلَقَ بَابَهٗ فَھُوَ اٰمِنٌ" جو اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کرے گا اس کے لئے بھی امن ہے۔ غرض امن کا اعلان عام ہوتا جا رہا ہے۔ (1)

اور کس قوم کے مقابلے میں؟ جس نے تیرہ برس اللہ کے رسول کو چین نہیں لینے دیا۔ انتہائی ایذاء رسانی کی بلکہ حد کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گالیاں دی گئیں، کذاب، مجنون، ساحر اور کاہن کہا گیا جادو آپ کے اوپر کرایا گیا، طائف میں تشریف لے گئے تو پتھر اتنے مارے گئے کہ پیر مبارک اتنے زخمی ہو گئے کہ نعلین مبارک خون سے بھر گئے، کتے پیچھے لگائے گئے، اس قوم کے مقابلے پر امن کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ جو مسجد حرام میں یا ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے یا اپنے گھر کا دروازہ بند کرے، اسے بھی امن۔ گویا کوئی راستہ ایسا نہیں چھوڑا کہ بدامنی یا قتل و غارت ہو اور اس قوم کے ساتھ یہ شفقت برتی گئی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا، وطن سے بے وطن کیا۔ یہ نبوّت کا مزاج ہے کہ جتنا اقتدار ملتا جاتا ہے اتنا ہی جھکتے جاتے ہیں۔

نہد شاخ پرز میوہ سر بر زمین

درخت کا پھل جب بڑھ جاتا ہے تو شاخیں زمین کی طرف جھک جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ درخت جب پھل دار ہو تو اوپر کو اٹھنے لگے۔ انبیاء علیہم السلام، اللہ کی طرف سے ساری دولتیں لے کر آتے ہیں ان میں تواضع بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن مادی دولت جوں جوں بڑھتی ہے اس سے نخوت بڑھتی رہتی ہے۔

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الجھاد والسیر، باب فتح مکه ج: ۹ ص: ۲۴۹.

حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جب آپ ہجرت فرما رہے تھے تو جاتے ہوئے مسجد حرام میں تشریف لائے تو بیت اللہ کا کلید بردار عثمان شیبی کا خاندان تھا۔ شیبی اسے کہتے تھے، وہ بیت اللہ کے دروازے پر بیٹھتا تھا۔ بیت اللہ کی کنجی اس کے پاس رہتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مکہ چھوڑ کر ہجرت فرما رہے ہیں۔ آپ کو صدمہ ہے تو شیبی سے کہا:

''اے شیبی! ایک دومنٹ کے لئے بیت اللہ کا دروازہ کھول دے، تاکہ میں اندر دو نفل پڑھ لوں''۔ اس نے جھڑک کر اور ڈانٹ کر کہا کہ تم ہرگز داخل نہیں کئے جاسکتے۔ تم نے ہمارے آبائی دین کو چھوڑا، ہمارے بتوں کو برا کہا۔ یہ نہیں ہوسکتا جاؤ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر لجاجت (نرمی) سے کہا ''میں عبادت کرنا چاہتا ہوں، دو رکعت پڑھنا چاہتا ہوں''۔ اس نے کہا نہیں، آپ کو اجازت نہیں دی جائے گی، آپ جایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے شیبی! ایک وقت آنے والا ہے کہ جس جگہ تو بیٹھا ہوا ہے وہاں تو میں ہوں گا اور جہاں میں کھڑا ہوا التجاء کر رہا ہوں یہاں تو کھڑا ہوگا۔ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا؟''

اس نے کہا ''جاؤ ایسی باتیں بہت دیکھی ہیں۔'' اقتدار کے غرور میں مست تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بے کس و بے بس ہوکر گھر سے باہر نکل رہے تھے، مکے والوں کی اکثریت تھی، اقتدار تھا، دولت اور فوج بھی ان کی تھی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا تو اسے غرور کا نشہ تھا، وہ جانتا تھا کہ آپ کچھ نہیں کرسکتے، نبوّت کی عظمت اس کے دل میں نہیں تھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ نبوّت کو اللہ نے کیا کیا طاقتیں بخشی ہیں۔ وہ تو صرف مادّی طاقت کو جانتا تھا اس بناء پر اس نے کہا ایسی تخیلات کی باتیں بہت سنی ہیں۔ حالت تو یہ ہے کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل ہے اور خواب یہ دیکھ رہے ہیں کہ میں کعبہ کے دروازے پر بطور متولی کے بیٹھوں گا اور جو آج متولی ہے وہ نیچے کھڑا ہوگا۔ یہ شیخ چلی کی باتیں ہیں، محض تخیلات ہیں۔ یہ اس نے کہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوگئے، ہجرت فرمائی۔ جب مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اور امن کا اعلان کیا، ایک نفس کی خونریزی نہیں ہوئی، ایک جان نہیں گئی۔ آپ مسجد حرام میں تشریف لائے اور فرمایا کہ شیبی کو بلاؤ۔ وہ آیا، کعبے کی کنجی اس کے ہاتھ میں، کعبے کے دروازے کا تالا کھولا۔ آپ وہیں تشریف لے گئے جہاں شیبی کھڑا ہوا تھا اور شیبی وہیں کھڑا ہوا تھا جہاں آپ کھڑے ہوئے التجا کر رہے تھے۔

فرمایا: شیبی! وہ وقت تجھے یاد ہے کہ میں نے لجاجت سے التجاء کی تھی کہ مجھے ایک دو رکعت پڑھنے کی اجازت دیدے، تو نے ڈانٹ دیا تھا۔ کہا، جی ہاں یاد ہے۔ فرمایا: یہ بھی یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کہا تھا کہ جس جگہ تو بیٹھا ہوا ہے اس جگہ میں ہوں گا اور جس جگہ میں کھڑا ہوں اس جگہ تو کھڑا ہوا ہوگا یہ تو نے دیکھ لیا؟

اس نے کہا: جی ہاں دیکھ لیا، بے شک میں اسی جگہ کھڑا ہوا ہوں جہاں آپ کھڑے ہوئے تھے۔ اور آپ اس

جگہ ہیں جس جگہ میں تھا۔ فرمایا، اب تیرا کیا حشر ہونا چاہیے؟

اس نے ایک ہی جملہ کہا کہ اَخٌ کَرِیْمٌ وَابن اخ کَرِیْمٌ ① میں ایک کریم پیغمبر اور کریم بھائی کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ بہر حال یہ خاندان قریش میں سے تھا، تو اس نے یہ جملہ کہا اَخٌ کَرِیْمٌ وَنَبِیٌّ کَرِیْمٌ ۔

اب یہ خیال فرمایئے شیبی نے کس طرح سے ڈانٹا تھا۔ اللہ کے رسول کی انتہائی عظمت کے باوجود اس نے کیا کہا کہ لیکن آپ نے کیا معاملہ فرمایا۔ فرمایا "اے شیبی! یہ کعبے کی کنجی تیرے حوالے کرتا ہوں، قیامت تک تیرے ہی خاندان میں رہے گی، کوئی دوسرا اسے نہیں حاصل کر سکے گا۔ آج سے تو اور تیرا خاندان قیامت تک کے لئے متولی ہے"۔

عرب میں بیسیوں نئے انقلابات ہوئے، حکومتیں بدلیں، لیکن شیبی کا خاندان بدستور قائم ہے اور کعبے کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، مکہ کے آدھے بازاروں پر آج شیبی کا قبضہ ہے اور اس کی دولت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لئے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا ہر شخص چاہتا ہے اور وہ فیس لگا دیتا ہے کہ اتنی فیس ادا کر دو گے تو داخل ہونے دوں گا ورنہ نہیں۔ حالانکہ ایسا داخلہ لگانا ممنوع ہے کیونکہ اس پر فیس لگانا جائز نہیں، مگر ایک تو بیت اللہ کی محبت اور اوپر سے کچھ عظمت بھی اور کچھ محبت بھی، اس لئے لوگ فیس ادا کرتے ہیں اور داخل ہوتے ہیں۔ لیکن محض محبت ہی تو مطلوب نہیں، شریعت کا ادب بھی تو ملحوظ ہے۔ وہ صحیح محبت سے کام نہیں کرتا جب تک اتباع شریعت نہ ہو، وہ محبت کارآمد نہیں ہے، جب تک محبت کے ساتھ متابعت سنت اور شریعت کی عظمت نہ ہو۔ اس لئے رشوت دے کر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

کئی بار حاضری ہوئی ہمارا بہت جی چاہتا تھا تو ہمارے لئے یہ مشکل تھی، تو ہم نے افسوس کے ساتھ مکے میں اپنے دوست سے ذکر کیا کہ ہم تو محروم ہی رہ گئے اور بیت اللہ میں داخل ہونے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔ ان کے شیبی کیساتھ تعلقات تھے۔ اس نے کہا، تنہا آپ کے لئے بیت اللہ کھولا جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ اندر جاکے زیارت کریں گے۔

چنانچہ انہوں نے ایسا انتظام کیا جب ہجوم ختم ہو گیا، وہ شیبی کعبے کا دروازہ بند کر کے جانے لگا، انہوں نے اپنے تعلقات کے وجہ سے اس سے بات کی اور بیت اللہ کا دروازہ کھولا اور میرے پاس آدمی بھیج کے مجھے بلایا کہ آپ کے لئے بیت اللہ کھلا ہوا ہے۔ تو میں تو کیا چیز تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں میں نے شریعت کا اتباع کیا تھا اور دل میں داخل ہونے کا جذبہ تھا لیکن رشوت دینا جائز نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام فرما دیا۔

بہر حال لوگ یہ نہیں سمجھتے وہ چاہتے ہیں بس داخل ہو جائیں خواہ کسی ممنوع کا ارتکاب کرنا پڑے۔ غرض شیبی آج بھی برسر اقتدار ہے۔ چودہ صدیاں گذر گئیں مگر اسی کے خاندان کے ہاتھ میں بیت اللہ کی کنجیاں ہیں حالانکہ

① السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب فتح مكه حرسها الله تعالىٰ، ج: ۹ ص: ۱۱۸۔

شیبی نے اللہ کے رسول کے ساتھ انتہائی بے عظمتی کا برتاؤ کیا تھا اور آپ نے نبی ہونے کی حیثیت سے اسے کیا دیا کہ بیت اللہ کا متولی قیامت تک کے لئے قرار دیدیا، بجائے اس کے کہ شیبی سے انتقام لیا جاتا۔ یہ چیز ملوکیت اور بادشاہت میں نہیں ہے۔ بادشاہت میں اگر کوئی ذرا بھی اقتدار کا خلاف کرے تو بغاوت کا الزام قائم ہوتا ہے اور اسے پھانسی دیدی جاتی ہے۔ تو یہ نبوت کا خاصہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو ایک دوست دوست کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔ تو نبوت کا مزاج اور ہے، ملوکیت کا اور ہے۔ آج بھی شیبی برسر اقتدار ہے اور کعبے کی کنجیاں اس کے پاس ہیں اور قیامت تک رہے گا۔ کیونکہ اللہ کے رسول نے فرمادیا ہے کہ کنجیاں قیامت تک کے لئے تیرے خاندان کو دیتا ہوں۔

اہل اللہ کے مزاج میں نیکی کی حرص...... اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ اللہ والے بھی عجیب چیز ہیں۔ یہ ہر بات سے اپنی آخرت کا فائدہ اٹھالیتے ہیں۔ جب ایک شخص دنیا کا طالب ہو وہ ہیر پھیر کر کے اپنے پیسے کمالیتا ہے۔ یہ اللہ والے ہیر پھیر کر کے دین اور آخرت کمالیتے ہیں۔ جب ہم دنیا دار دنیا کے بارے میں حریص ہیں کہ اگر سو روپیہ مل جائے تو تمنا ہوتی ہے کہ ہزار روپیہ مل جائے، ہزار مل جائے تو تمنا ہوتی ہے کہ کروڑوں ہو جائیں۔ غرض طلب کسی حد پر رکتی نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اگر اس بنی آدم کو ایک جنگل بھی سونے کا مل جائے تو کہے گا یا اللہ! پیٹ نہیں بھرا، ایک جنگل اور سونے کا مل جائے۔ دوسرا مل جائے تو تیسرا مانگے گا کسی حد پر نہیں رکتا۔ بعینہ یہی کیفیت اللہ والوں کی ہے کہ ساری جنت پر ان کا قبضہ ہو جائے، تب بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ غرض اہل دنیا دنیا کے بارے میں حریص ہوتے ہیں، اہل اللہ آخرت کے بارے میں حریص ہوتے ہیں۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ، جو نقشبندیہ خاندان کے اکابر میں سے تھے، ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ آئے، وہیں ان کی وفات بھی ہوئی اور قبر بھی ہے۔ انہیں یہ حدیث معلوم تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیبی کو بیت اللہ کی کنجیاں سپرد کی ہیں۔ مکہ میں چاہے سارے خاندان اجڑ جائیں مگر شیبی کا خاندان قیامت تک کے لئے باقی رہے گا۔ یہ ان کا ایمان تھا اور اللہ کے رسول کا قول تھا تو مولانا رفیع الدین صاحب کو عجیب ترکیب سوجھی۔ واقعی ان بزرگوں کو داد دینی چاہئے کہاں ذہن پہنچا۔

انہوں نے کہا جب یہ خاندان قیامت تک کے لئے باقی رہے گا تو اس زمانے میں بھی موجود ہوگا، جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا۔ اس واسطے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ مہدی کا جب قرب قیامت میں ظہور ہوگا تو مکہ ہی میں ہوگا اور وہ بیت اللہ شریف کی دیوار سے کمر لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے، لوگ ان کے ہاتھ پر آکر بیعت کریں گے۔

اور اس وقت کی جو علامات بتلائی گئی ہیں وہ یہ کہ پوری دنیا پر نصاریٰ کا قبضہ ہوگا۔ بلاواسطہ پوری دنیا پر

نصاریٰ کا اقتدار چھایا ہوا ہوگا۔ دوسری علامت یہ فرمائی گئی ”مُلِئَتِ الدُّنیَا ظُلْمًا وَجَوْرًا“ ① پوری دنیا ظلم وستم سے لبریز ہوگی۔ دین و دیانت کا نشان باقی نہیں رہے گا، شرارت نفس، تعیش وعیاشی، ظلم اور بددینی عام ہو جائے گی، محدود لوگ ہوں گے جو پہاڑوں کی چوٹیوں میں جا کر اپنے دین کو سنبھالیں گے، دنیا ان کو حقیر و ذلیل سمجھے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایک عالم اتنا ذلیل ہو جائے گا جیسے مردے گدھے کی لاش ہوتی ہے کہ اسے کوئی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ایک عالم کی ذلت کی یہ کیفیت ہوگی۔ تو اس درجہ ظلم وستم بددینی اور بددیانتی دنیا میں پھیل جائے گی۔ یہ وقت ہوگا کہ دنیا پر نصاریٰ کا قبضہ ہوگا، مسلمان انتہائی ظلم وستم میں گرفتار ہوں گے۔ دیندار پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جا کر چھپ چھپ کر اپنے دین کی حفاظت کر رہے ہوں گے، شہروں اور قصبوں میں ان کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ نماز، روزہ کا تو ذکر کیا رہے گا، بس ظلم وستم غالب ہوگا۔ اس وقت مکہ مکرمہ میں مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا۔

اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ انکے بارے میں اللہ کی طرف سے اعلان کیا جائے گا، ایک غیبی آواز پیدا ہوگی کہ ”هٰذَا خَلِیفَةُ اللهِ الْمَهْدِیُّ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا“ ② یہ اللہ کے خلیفہ مہدی ہیں ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ فرمایا گیا اس وقت ابدال شام، نجباء عراق اور اقطاب ہند اور تمام اہل اللہ جہاں جہاں ہوں گے سمٹ کر شام میں پہنچیں گے اور شام کو حضرت مہدی علیہ الرضوان مرکز بنائیں گے اور یہ وہیں جا کر ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور مسلمانوں کی قوت وہاں جمع ہوگی ان کے ہاتھ پر مغرب اور نصاریٰ کی طاقتیں ٹوٹیں گی اس کے بعد وہ آئے گا کہ پورے عالم میں دین اسلام پھیل جائے گا اور دوسرا کوئی دین اور قومیت باقی نہیں رہے گی۔ اس کی تفصیلات ہیں۔

ان میں مجھے نہیں جانا۔ جو مجھے واقعہ سنانا ہے اس کے متعلق جتنی چیز بیان کرنی تھی وہ میں نے عرض کی۔ گویا مہدی علیہ الرضوان کا ظہور مکے میں ہوگا۔ شام کو وہ اپنا مرکز بنائیں گے۔ مسلمانوں کی ساری قوت شام میں سمٹ آئے گی۔ دجال اور مغربی طاقتوں کا مقابلہ ہوگا ملحمہ کبریٰ واقع ہوگا یعنی سب سے بڑا جہاد اس زمانے میں ہوگا اور تین معرکے ہوں گے لاکھوں آدمی اس میں قتل ہوں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ محاذ جنگ ہی اتنا لانبا ہوگا کہ کوا اڑے گا، کوے کی اڑان مشہور ہے کہ صبح سے شام تک اڑتا رہتا ہے، تھکتا نہیں ہے۔ تو صبح سے شام تک کوا اڑے گا، جہاں جہاں وہ جائے گا لاشیں ہی لاشیں نیچے پڑی ہوئی ہوں گی۔ اس کو یہ نظر آئے گا۔ اتنا لانبا محاذ ہوگا اور مقتولین کی کوئی حد نہیں ہوگی۔ یہ عظیم جہاد ہوگا اس جہاد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے مجاہدین کو وہ اجر ملے گا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو

---

① السنن لابی داؤد، کتاب المهدی، باب ۱۱ ص: ۳۵۶ رقم: ۳۷۳۶. اس حدیث کو ترمذیؒ نے حسن صحیح بتایا ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۹ ص: ۲۸۲ رقم: ۴۲۸۲. ② الحدیث اخرجه الامام احمد ولفظه: اذا رأیتم الرایات السود قدجاءت من قبل خراسان فأتوها فان فیها خلیفة المهدی. مسند احمد ج: ۷ ص: ۱۹۳ ومن حدیث ثوبانؓ.

اجر دیا گیا ہے۔ یہ حدیث میں فرمایا گیا ہے اب میں واقعہ عرض کرتا ہوں جو مولانا رفیع الدین صاحب یہ حدیث سن کر ہجرت کر کے مکہ مکرمہ پہنچے۔

یہ ان کا ایمان تھا کہ شیبی کا خاندان قیامت تک ضرور رہے گا اور جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہوگا جب بھی یہ مکہ ہی میں ہوگا۔ جب مہدی علیہ الرضوان کا ظہور مکے میں ہوگا تو وہ بیت اللہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے اور مسلمانوں سے بیعت کریں گے۔تو بیت اللہ کے دروازے کے کنجیاں شیبی کے ہاتھ میں ہوں گی۔اس لئے یہ بھی وہاں موجود ہوگا۔ یہ چند کڑیاں ملا کر مولانا رفیع الدین صاحب نے ایک حمائل شریف اور ایک تلوار، یہ دونوں لیں۔اور مہدی علیہ الرضوان کے نام ایک خط لکھا کہ

''فقیر رفیع الدین دیوبندی مکہ معظمہ میں حاضر ہے اور آپ جہاد کی ترتیب کر رہے ہیں۔مجاہدین آپ کے ساتھ ہیں۔جن کو وہ اجر ملے گا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین کو ملا،تو رفیع الدین کی طرف سے یہ حمائل تو آپ کی ذات کے لئے ہدیہ ہے اور یہ تلوار کسی مجاہد کو دیدیجئے کہ وہ میری طرف سے جنگ میں شریک ہو جائے،اور مجھے وہ اجر مل جائے جو غزوۂ بدر کے مجاہدین کو ملا''۔

یہ خط لکھ کر کے تلوار اور حمائل شیبی کے سپرد کی جوان کے زمانہ میں شیبی تھا اور کہا کہ تمہارا خاندان قیامت تک رہے گا اور مہدی علیہ الرضوان کے ظہور تک یہ امانت ہے۔تو جب انتقال کرو تو جو تمہارا قائم مقام ہوا سے وصیت کر دینا اور اس سے یہ کہہ دینا کہ جب اس کا انتقال ہو وہ اپنی اولاد کو وصیت کرے کہ رفیع الدین کی یہ تلوار اور حمائل شریف خاندان میں چلتی رہے یہاں تک کہ مہدی علیہ الرضوان کا ظہور ہو جائے۔تو جو اس کے زمانے میں شیبی ہو وہ میری طرف سے حضرت مہدی علیہ الرضوان کو یہ دونوں ہدیئے پیش کر دے۔حمائل ان کی ذات کے لئے تحفہ ہے اور تلوار امانت ہے کہ وہ کسی مجاہد کو میری طرف سے دیدیں تاکہ جب وہ جہاد میں شریک ہو تو میری شرکت بھی ہو جائے اور اس اجر میں میں بھی حصہ پالوں۔کہاں کی بات انہوں نے سوچی۔اس حدیث سے انہوں نے کس طرح کام لیا کہ اعلیٰ ترین جہاد کے اندر اپنی شرکت کر لی۔

تو واقعہ یہ ہے کہ اللہ والے نیکیوں پہ اتنے حریص ہوتے ہیں کہ چاہے ان کا گھر بھر جائے نیکی سے،لیکن انہیں خیال ہو کہ نیکی یہاں سے بھی مل جائے گی،جھٹ وہاں پہنچ جائیں گے کہ اسے بھی کیوں نہ سمیٹ لیں۔یہ چاہتے ہیں کہ ساری جنتیں ہمارے قبضہ میں آ جائیں۔یہ اللہ والوں کا مزاج ہے۔

امام ابوداؤد رحمتہ اللہ علیہ بہت بڑے محدث گزرے ہیں جن کی کتاب ابوداؤد مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، داخل درس ہے۔ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ یہ سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے تھے اور سمندر میں جہاز اترا ہوا کھڑا تھا۔ایسی گودیاں اس زمانے میں نہیں تھیں،جیسی آج بنتی ہیں۔تو جہاز ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا ہوتا تھا۔چونکہ کنارے پر پانی کم ہوتا تھا وہ جہاز کے لئے کافی نہیں ہوتا تھا اور لوگ کشتیوں میں بیٹھ کے جہاز میں

جاتے اور سوار ہوتے۔

ایک جہاز فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور امام ابوداؤدؒ بندر کے کنارے کھڑے ہوئے تھے جہاز میں کسی شخص کو چھینک آئی۔ اس نے چھینک کر زور سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی کو چھینک آئے اسے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا چاہئے اور جس کے کان میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پڑے، وہ جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہے۔ اس شخص نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس زور سے کہا کہ امام ابوداؤدؒ کے کان میں آواز آئی۔ اب ان کا جی چاہا کہ میں شریعت کی اس چیز پر عمل کروں اور یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہوں تاکہ مجھے ثواب ملے حالانکہ مسئلہ یہ ہے کہ چھینک لینے والے کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا واجب ہے جبکہ اس مجلس میں وہ موجود ہو اور اس کے کان میں پڑ جائے کہ اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا ہے۔ وہ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہہ کر جواب دے۔ یہ نہیں ہے کہ مسجد میں ایک شخص کو چھینک آئے اور دوسرا شخص بازار میں جا رہا ہے اور وہ جواب دینے کے لئے مسجد میں آئے۔ ایک مجلس کا مسئلہ ہے مجلس سے خارج کا نہیں ہے۔

تو امام ابوداؤد پر واجب نہیں تھا کہ وہ جواب دیں۔ اس لئے کہ چھینک لینے والا ایک فرلانگ پہ ہے اور یہ یہاں، وہ جہاز پر ہے۔ یہ کنارے پر ہیں۔ مجلس بھی ایک نہیں جگہ بھی ایک نہیں بیچ میں سمندر حائل، مگر وہی بات ہے کہ نیکی کی حرص ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کمالیں اس نیکی کو بھی کیوں چھوڑیں۔

امام ابوداؤدؒ کی آواز اتنی اونچی تو تھی نہیں کہ یہاں کنارے سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہیں تو اس کے کان میں پہنچے۔ چھینک لینے والے کی آواز اتنی بلند تھی کہ اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا اس کی آواز یہاں پہنچ گئی تو تین درہم میں کرائے کی کشتی لی اور اس کشتی میں بیٹھ کر ڈیڑھ فرلانگ کا سفر کر کے جہاز میں پہنچے اور جہاز میں اوپر چڑھ کے کہا، یَرْحَمُکَ اللّٰہُ۔ یہ گویا نیکی کمائی۔ مورخین لکھتے ہیں جس وقت انہوں نے جا کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا، غیب سے ایک آواز آئی کہنے والا نظر نہیں آتا تھا۔ آواز یہ آئی کہ ''اے ابوداؤد آج آپ نے تین درہم میں جنت خرید لی''۔

یہ آواز کان میں پڑی۔ معلوم نہیں کس خلوص سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا۔ حالانکہ امام ابوداؤدؒ محدث ہیں۔ جانے کتنی انہوں نے حدیثیں لکھیں اور کتنا اجر کمایا، کتنی نوافل اور تہجد پڑھے ہوں گے، کتنے صدقات دیئے ہوں گے۔ لیکن جنت کی خریداری کے وقت اس حقیر سے عمل کا ذکر کیا کہ تین درہم میں کشتی کرائے پر لے کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہہ دیا۔

اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کی مقبولیت اس کی صورت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی حقیقت سے ہوتی ہے۔ اخلاص جتنا غالب ہو، چاہے عمل چھوٹا ہو مگر اخلاص سے وزن پیدا ہو جاتا ہے، وہ مقبول ہوتا ہے۔ لمبا چوڑا عمل ہو، اخلاص ندارد ہو۔ قبولیت کی شان نہیں پیدا ہوتی۔ امام ابوداؤدؒ نے معلوم نہیں کس خلوص سے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا ہوگا۔ اتباع سنت کے کس جذبے سے گئے ہوں گے کہ یہ ایک عمل اتنا غالب آ گیا کہ نہ تہجدوں کا ذکر آیا نہ صدقات کا ذکر آیا، ذکر آیا تو اس عمل کا ذکر آیا کہ تین درہم میں آپ نے جنت خرید لی۔ غرض یہ لوگ دین کے اندر بے حد حرص رکھتے ہیں کمانا اتنا جانتے ہیں کہ گویا ہر وقت کماتے ہی رہتے ہیں۔ ہم دکان پہ بیٹھ کے کماتے ہیں۔ یہ چلتے ہوئے الگ،

بیٹھے ہوئے الگ، سوتے ہوئے الگ اور گھر میں الگ کمائیں۔ غرض ہر جگہ ثواب کمانے کی فکر رہتی ہے۔

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ جو شیخ الطائفہ ہیں گویا تمام اہل دیوبند کے مرشد ہیں۔ حضرت مولانا نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے مرشد ہیں۔ ان کا عمل کیا تھا؟ حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ آدمی جب گھر سے مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے چلتا ہے تو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ایک بدی مٹائی جاتی ہے اور یہ بھی دوسری حدیث میں فرمایا گیا کہ آپ نے سوال فرمایا کہ لوگو! جانتے ہو کہ درجات کن کن چیزوں سے بلند ہوتے ہیں اور کفارات کن کن چیزوں سے ہوتے ہیں کہ گناہ مٹا دیئے جائیں؟ عرض کیا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

منجملہ اور چیزوں کے فرمایا: کَثْـرَۃُ الْخُطَاءِ اِلَی الْمَسْجِدِ ① مسجد کی طرف جتنے زیادہ قدم پڑیں گے اتنا ہی گناہوں کا کفارہ ہوگا، اتنے ہی درجات بلند ہوں گے۔

تو ایک طرف یہ حدیث ہے کہ جتنے قدم زیادہ ہوں گے نیکیاں بڑھیں گی، بدیاں گھٹیں گی اور دوسری طرف وہ حدیث ہے کہ ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک بدی مٹائی جاتی ہے۔

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ کا یہ عمل تھا کہ اگر مسجد کو دو راستے جاتے ہوں۔ ایک ذرا لمبا اور ایک چھوٹا ہو تو لمبا راستہ اختیار کرتے تھے تاکہ قدم زیادہ پڑیں، نیکیاں زیادہ لکھی جائیں اور بدیاں زیادہ مٹائی جائیں اور اس میں بھی یہ کرتے تھے کہ لانبا راستہ اختیار کر کے چھوٹے چھوٹے قدم ڈالتے تھے۔ لمبی لمبی گرہیں نہیں ڈالتے تھے، اس لئے کہ حدیث میں کَثْرَۃُ الْخُطَاءِ فرمایا گیا ہے کہ قدموں کی کثرت مطلوب ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ چھوٹے قدم ہوں یا بڑے قدم ہوں اس کی کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر میں چھوٹے قدم ڈالوں، شریعت نے مجھے نہیں روکا، یعنی اگر بیس قدم سے راستہ طے ہوتا، چالیس قدم سے طے کرتے تھے تاکہ چالیس نیکیاں ملیں۔ یہ جب ہوتا ہے کہ دل میں ایک لگن لگی ہوئی ہو کہ مجھے نیکی کمانی ہے بالکل ہمیں اپنے اوپر قیاس کر لینا چاہئے کہ ہمارے دل میں لگن ہوتی ہے کہ کسی طرح ہم پیسہ کمائیں، تجارت، زراعت، ملازمت کے ذریعے کسی طرح کمائیں۔ چوبیس گھنٹے آدمی دماغ لڑاتا رہتا ہے کہ مال کس طرح سے فراہم کروں، اگر مال میں کمی ہو جائے تو کس طرح سے بڑھاؤں' ڈیزائن ختم ہو جائے تو کس طرح سے پورا کروں کہ کمی نہ ہونے پائے۔ گاہک آئے میں یوں نہ کہوں کہ اس وقت مال نہیں ہے۔ تو تاجر ہر مال رکھتا ہے تاکہ گاہک کو جواب نہ دینا پڑے۔

گاہکوں کی اگر کثرت ہے مثلاً پچاس ہوں تو سو گاہک کا مال رکھے گا کہ اگر ایک دم سو گاہک آ جائیں تو مجھے انکار نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ اگر وہ انکار کرتا اور سو کی بجائے پچاس کو دے، روٹی تب بھی چلے گی، مگر وہ تو جذبہ ہوتا ہے کہ مال بڑھے، پیسہ بڑھے ایک لگن لگی ہوتی ہے۔ بس ٹھیک اسی طرح سے ان لوگوں کے دل میں لگن ہوتی ہے

① السنن لابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ماجاء في اسباغ الوضوء ج: ۲ ص: ۱۹ .

کہ نیکی بڑھے، حالانکہ نجات کے لئے اتنی نیکیاں بھی کافی ہیں جتنی اب تک تھیں، مگر یہ چاہتے ہیں کہ اوراضافہ ہو، درجات ملتے رہیں۔ کسی مرتبے اور درجے پر آ کر رکتے ہی نہیں۔ ان کے دل میں ہوس ہوتی ہے۔

اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ حرص وہوس کوئی بری چیز نہیں، مصرف اس کا صحیح، غلط ہوتا ہے۔ حرص بہت بڑی چیز ہے، اس کو ہم برا نہیں کہتے۔ حرص سے انسان کا حوصلہ کھلتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں "اگر ہم ایک جنگل بھر کر بنی آدم کو سونے کا دیدیں تو یہ ہم سے دوسرا مانگے گا"۔

معلوم ہوا اتنا بڑا حوصلہ ہے کہ پوری دنیا کو سونے سے بھر دیں جب بھی اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ گویا اس کا پیٹ یعنی حوصلہ بہت بڑا ہے تو حرص بہت بڑی چیز ہے۔ اس واسطے یہ بری چیز نہیں ہے کہ اس کو برا کہا جائے گا۔

البتہ برا کس چیز کو سمجھا گیا؟ اس کو کہ حوصلہ تو اتنا بڑا اور اسے چند ٹھیکروں میں گنوادے، اس چیز سے وہ چیز کماؤ کہ جیسے تمہاری حرص کی حد نہیں، اس نعمت کی بھی کوئی حد نہ ہو۔ دنیاداری میں اگر ہم نے حرص لگائی تو حرص تو اتنی بری کہ دنیا کے ساتھ آخرت بھی سماجائے اور اسے دنیا کی چیزوں کے اوپر لگا دیا۔ دنیا کی چند دن کی عمر ہے وہ ختم ہوجائے گی۔ حرص تو آگے جارہی ہے اور دنیا یہیں ختم ہوگئی۔ تو اس جذبے کی ہم نے ناقدری کی کہ اللہ نے جذبہ بڑا دیا تھا اس کو حقیر چیز کے اندر ہم نے کھو دیا۔ لیکن اگر اس حرص سے ہم جنت چاہیں تو جیسے ہماری حرص کی حد نہیں، جنت کی نعمتوں کی بھی حد نہیں۔ مانگو کہاں تک مانگتے ہو۔

﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ ① یہی موقع ہے جس میں آدمی حریص بنے۔ تو حرص کا جذبہ برا نہیں ہے۔ اس کا مصرف ہم نے غلط تجویز کر رکھا ہے۔ حرص ہمیں وہاں کرنی چاہئے جہاں نعمت کی کہیں انتہا نہ ہو۔ وہ اللہ کے علوم وکمالات ہیں کہ ان کی کہیں انتہا نہیں۔ یعنی ایک عالم دوسرے عالم کو دیکھ کر حرص کرے کہ کہ اسے سو مسئلے معلوم ہیں میں ڈیڑھ سو کیوں نہ معلوم کروں؟ اور یہ دو سو جانتا ہے میں اڑھائی سو کیوں نہ معلوم کروں، اس میں حرص کرے۔

اس لئے دونوں اگر حرص کریں گے کہ اسے ڈیڑھ سو معلوم ہوئے اسے عار آئی کہ یہ مجھ سے بڑھ گیا میں تین سو معلوم کروں گا پھر اسے عار پیدا ہوئی تو یہ کہے گا میں چار سو معلوم کرتا ہوں۔ ساری عمر یہ بڑھتے رہیں وہاں کمی نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں اگر ساری دنیا مل کر حرص کرنے لگے کہ ہمیں علم حاصل ہو۔ جب بھی علم میں کمی نہیں آئے گی۔ تو حرص ایسے موقع پر کرے جہاں کمی نہ ہو۔ حرص جیسی نعمت کو چھوٹی چیزوں میں گنوا دیا جائے، اسے پسند نہیں کیا گیا۔ یہاں تو ضرورت پوری کرو اور حرص کے جذبے کو آخرت، عمل اور معرفت کے ساتھ لگا دو تا کہ کہیں بھی تم نہ رک سکو۔ ان اہل اللہ نے دانش مندی سے کام لیا کہ اپنے اس حرص کے جذبے کو نیکی اور اجر کمانے کے اندر لگایا کہ جیسے ہماری حرص کی حد نہیں نیکی کی بھی حد نہیں ہم نے حرص کو ان چیزوں کے اندر لگا دیا جو

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶۔

چند دن کے بعد ختم ہو جانے والی ہیں اور حرص آگے تک چلے گی، تو اس کا پیٹ نہیں بھرے گا اور آخرت میں پیٹ بھر سکتا ہے اس لئے یہ لوگ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تو ہمارے حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ، مسجد کے دو راستے ہوتے تو طویل راستے کو اختیار کرتے۔ مختصر راستے کو اختیار نہ کرتے اور طویل راستے میں بھی قدم کثیر رکھتے تا کہ قدم بڑھ جائیں۔ یہ وہی حرص تھی کہ جتنی نیکیاں کما سکیں۔

نبوّت ضعفاء کو بلند کرتی ہے...... بہرحال ایک ملوکیت اور ایک نبوّت ہے۔ ملوکیت دولت اور اقتدار کی مالک ہوتی ہے مادی چیزیں قبضے میں ہوتی ہیں اور نبوّت روحانی نعمتوں، علم، معرفت، کمالات خداوندی اور قرب الٰہی وغیرہ کی مالک ہوتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے مزاج میں رافت نرمی، محبت اور ترس کھانا ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ غالب ہوں گے اتنا زیادہ رحم وکرم ان میں اور بڑھتا رہے گا اور مادی اقتدار کے اندر قصہ برعکس ہوتا ہے۔ چونکہ اقتدار محدود ہے خواہ بادشاہ کا ہو، اسے ڈر ہوتا ہے کہ دوسرا نہ چھین لے۔ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تو وہ شک کے اوپر بھی دوسروں کی راہیں بند کرنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ کہیں آنے نہ پائیں کہ میرے اقتدار میں کمی آ جائے۔

تو نبوّت اور ملوکیت میں یہی فرق ہے کہ ملوکیت تعدی اور زیادتی کی طرف چلتی ہے اور نبوّت رحمدلی اور مہربانی کی طرف چلتی ہے۔ بادشاہت میں اگر کوئی برسر اقتدار سامنے آئے اس کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کوئی کمزور ہو اسے دبانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ابھرنے نہ پائے اور انبیاء علیہم السلام کمزور کو ابھارتے ہیں، جو زور آور ہوا سے اعتدال پر رکھتے ہیں، اسی واسطے جو زیادہ ضعیف ہو گا اس پر انبیاء علیہم السلام کا لطف وکرم زیادہ مبذول ہو گا۔

دنیا کی اقوام نے عورت کی تذلیل کی اور اسلام نے اسے مقام بخشا...... مثال کے طور پر میں عرض کرتا ہوں کہ عورت بہت زیادہ کمزور صنف ہے۔ مرد کو اللہ پاک نے قوت بخشی ہے، عورت میں وہ قوت نہیں ہے۔ نہ معنوی قوت اتنی ہے نہ ظاہری۔ بدن کے اعتبار سے بھی عورت بنسبت مرد کے کمزور ہے اور اندرونی قوتوں عقل و فراست دونوں کے لحاظ سے بھی مرد سے کمزور ہے۔ تو یہ ایک ناتواں اور ضعیف صنف ہے، اسلام نے اس کو اتنا ابھارا، اتنا سہارا دیا کہ اسے احساس نہ پیدا ہو کہ میں کمزور ہوں۔ شروع سے ابھارنا شروع کیا۔ عورت پر تین ہی حالتیں گزرتی ہیں۔ ایک اس کا بچپن ہے جب وہ اولاد کے درجے میں ہوتی ہے۔ ماں باپ سرپرست ہوتے ہیں۔ دوسرا درجہ جوانی کا ہے جب اس کا نکاح ہو جاتا ہے تو خاوند کے ماتحت آ جاتی ہے۔ اور تیسری حالت یہ ہے کہ اس کی اپنی اولاد سامنے ہو۔ تو ایک خود بیٹی ہے اور ایک بیٹوں کی ماں بن جائے اور ایک خاوند کی بیوی بنے۔ ان تینوں حالتوں کے اندر اسلام نے اسے ابھارا ہے۔

جب وہ خود بیٹی ہو، تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لڑکے تمہارے حق میں نعمتیں ہیں، ان پر شکر کرو اور لڑکیوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تمہاری نیکیاں ہیں۔ گویا نعمت کے اوپر شکر واجب ہے، کفران نعمت کرو گے سزا ملے گی اور لڑکی کو کہا گیا کہ یہ باپ کی حسنات میں داخل ہے۔ نیکیاں جنت میں پہنچاتی ہیں تو یہ تمہیں جنت میں پہنچانے کا

ذریعہ بنیں گی۔اس لئے لڑکی کے اوپر محبت وشفقت زیادہ مبذول کی گئی تا کہ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں پر ماں باپ زیادہ شفقت کریں۔اندازہ کیجئے لڑکوں کو نعمت اور لڑکیوں کو نیکی کہا گیا۔تو جیسے ہر نیکی پر توقع ہوتی ہے کہ اجر ملے گا تو لڑکی کے ہونے پر اجر ملے گا۔لڑکے اگر دس بھی ہو جائیں اس پر اجر کا کوئی سوال نہیں۔شکر کرو گے تو ٹھیک ہے۔ نہیں کرو گے تو گردن نپے گی اور لڑکی اگر ہو گئی، آدمی شکر کرے نہ کرے لیکن خود اس کا ہو جانا ایک مستقل نیکی ہے۔ نامہ اعمال میں اجر لکھا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اولاد میں گویا ماں باپ کے اوپر اس درجے میں احسان ہے کہ انکے نامہ اعمال کو اس نے نیکیوں سے بھر دیا اور شریعت کا منشاء یہ ہے کہ شفقت ورحمت لڑکی کے اوپر زیادہ مبذول ہونی چاہئے غرض جب وہ بیٹی ہے تو شریعت نے اس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا اور جب وہ منکوحہ ہو کر خاوند کے تحت آئی، پھر شریعت نے یہ بتلایا کہ "اِنَّ اَکْرَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُکُمْ اَھْلًا" تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم، مسلمان وہ ہے کہ اس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور بیویوں کے ساتھ لطف ومحبت کرے، سخت دلی کا برتاؤ نہ کرے، تنگی اور سختی سے پیش نہ آئے۔اگر ان سے کوئی زیادتی بھی ہو تو صبر وتحمل سے کام لے۔تو جب بیوی ہونے کی حالت ہے تو خاوند کو متوجہ کیا کہ یہ تیری سب سے زیادہ شفقت ومحبت کی مستحق ہے اور اس کی اپنی اولاد ہو جائے، یعنی ماں بنے تو حدیث میں فرمایا گیا کہ اولاد کے لئے ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔جتنی ماں کی اطاعت کرے گا، جنت اس کے قریب ہو گی۔جتنی ماں کی نافرمانی کرے گا، اتنی جنت بعید ہو گی، اللہ کی رحمت سے دور ہوتا جائے گا۔معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے سر پر حق تعالیٰ کی رحمت مبذول ہوتی ہے کہ اگر اولاد ماں کے قریب ہو جائے تو رحمت قریب ہو جاتی ہے۔

اور یہ کیسے لطف کے ساتھ فرمایا، یوں بھی فرما دیتے کہ عورت (ماں) کے ہاتھ کے نیچے یا نگاہوں کے نیچے جنت ہے، یہ نہیں فرمایا۔فرمایا قدموں کے نیچے جنت ہے۔گویا مطلب یہ ہے کہ قدم سب سے زیادہ کم درجے کی چیز ہوتی ہے۔انسان کے بدن میں سب سے زیادہ کم رتبہ قدم ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ بارتبہ سر ہوتا ہے۔ اولاد کو یہ تنبیہہ کی گئی کہ تیرے حق میں اس کے قدم بھی بہت اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔اگر تو ان قدموں کے اوپر ہاتھ رکھے گا تو جنت کو اس کے قدموں میں پائے گا۔گویا انتہاء درجے کی تکریم کی۔

عورت اقوام دنیا کی نظر میں......اور یہ اس لئے کہ دنیا کی اقوام نے عورت کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اسلام سے پہلے ایک زمانہ تھا جب کہ یہود کا غلبہ تھا۔اب یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے مذہب کی چیز تھی یا نہیں تھی۔غالب گمان یہ ہے کہ مذہب کی چیز نہیں تھی، قومی قانون بنایا گیا تھا اس قومیت کے قانون کے تحت یہ چیز تھی اور یونانیوں میں سب سے زیادہ تھی۔وہ یہ کہ عورت پر ماں باپ کو اتنا استحقاق حاصل ہے کہ اسے چاہے باپ قتل کر دے، چاہے اسے زندہ دفن کر دے حتی کہ مشرکین مکہ میں بھی یہ رسم رائج تھی کہ عورت کو زندہ دفن کرتے۔گویا اس زمانے کے قانون نے انہیں یہ حق دیا تھا کہ اگر لڑکی کا گلا گھونٹ کر یا زندہ کو قبر میں ڈال دو، کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں،

کوئی عدالت انہیں سزا نہ دے سکتی تھی۔ یونانیوں کے ہاں یہ قانون تھا کہ خاوند جب کسی عورت سے نکاح کر لیتا تھا تو عورت باندی سے بھی کم رتبہ ہوتی تھی۔ ذرا سی کوتاہی اور نافرمانی پر اسے حق تھا کہ عورت کی گردن مار دے اور قتل کر دے۔ انتہا سے زیادہ سزا تھی۔ یہاں تک کہ اگر عورت سے کوئی برائی ثابت ہو جائے تو گھوڑے کی ٹانگ میں رسی باندھ کر رسی کا ایک سرا عورت کی گردن میں باندھا جاتا تھا اور خاوند گھوڑے پر بیٹھ کر اسے دوڑاتا تھا اور وہ بیچاری گھسٹتی جارہی ہے لہولہان ہو رہی ہے۔ عورت سے یہ سلوک کر رکھا تھا۔ اسلام نے آ کر عورت کا رتبہ بلند کیا۔

اور یہ تو وہ زمانہ تھا جس کو جہالت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ آج تمدن کا زمانہ ہے ابھی تقریباً دس پندرہ سال کا عرصہ ہوا ہے اخبارات میں خبر چھپی تھی کہ یورپ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی کہ اس پر غور کیا جائے کہ عورت کی حیثیت کیا ہے؟ یعنی آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ عورت کی حیثیت و پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ مختلف ممالک کے نمائندے جمع ہوئے جنہوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ اس کی پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ مختلف رائیں ہوئیں بعض ملکوں کے نمائندوں نے کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ عورت انسانیت میں ہی داخل نہیں ہے انسان نام فقط مرد کا ہے، عورت کا نام نہیں ہے۔ یہ کوئی اور جنس ہے جو مرد کے رحم وکرم پر ہے۔ یہ ایک ملک والوں نے رائے دی پھر آراء میں اختلاف ہوتا رہا، بالآخر اس پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ عورت مرد کی تفریح کا ایک آلہ ہے، کھلونا ہے کہ مرد اس سے تفریح کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی خاص پوزیشن عورت کی نہیں ہے اس تفریح کی وجہ سے قدر کرتے ہیں، عورت کے مرتبے کی وجہ سے قدر نہیں کرتے۔ چونکہ اپنی غرض متعلق ہے اس واسطے اس کی حفاظت کی جاتی ہے، آلۂ تفریح ہے اس لئے اس کو سجاتے ہیں۔ جیسے لڑکیاں جب گڑیوں سے کھیلتی ہیں تو دلہن کو بڑے اچھے اچھے کپڑے پہناتی ہیں، اس کو زیور بھی پہناتی ہیں اور بعض بے وقوف جب ان کی آپس میں شادیاں کراتی ہیں تو دس دس روپے کا جہیز بھی اسے دیتی ہیں۔

یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ انکے دل میں گڑیا کی کوئی وقعت ہے۔ وہ تو ایک کھلونا ہے اپنی تفریح طبع کے لئے اس گڑیا کو لباس پہنا کے سجا دیتے ہیں، چونکہ عورت بھی تفریح کا آلہ ہے، اس لئے اس کو سجا دیا۔ زیور پہنا دیا ورنہ اس کا کوئی خاص حق نہیں ہے۔

خاوند بیوی بلحاظ حقوق مساوی ہیں...... لیکن اسلام نے آ کر ان کے برخلاف عورتوں کو حقوق دیئے اور فرمایا ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [1] جو عورت پر خاوند کے حقوق واجب ہیں وہی خاوند پر عورت کے حقوق واجب ہیں وہ حقوق میں کمی کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔ عورت کرے گی، اسے سزا دی جائے گی۔

تو زوجین میں نکاح کے بعد ازدواجی زندگی میں دونوں کا رتبہ حقوق کے لحاظ سے برابر قرار دیا۔ یہ الگ چیز ہے کہ عورت کی عقل میں چونکہ نقصان یا کمزوری ہے اس واسطے اس کو زیر تربیت رکھا، تو یہ منصب کی بات ہے لیکن

---

[1] پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸.

حقوق کے درجے میں دونوں کو برابر قرار دیا کہ عورت کے اوپر مرد کے حقوق ہیں تو عورت کے بھی ہیں۔

اگر عورت نافرمانی کرے تو مرد کو طلاق کا مالک بنایا گیا ہے۔ اگر مرد زیادتی کرے تو عورت کو خلع کا مالک بنایا گیا ہے۔ اگر اسلامی حکومت ہو تو وہ عدالت میں قاضی کے ہاں درخواست دے سکتی ہے کہ میں خاوند کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتی۔ نان ونفقہ خاوند پر واجب ہے، وہ ادا نہیں کرتا۔ حکومت اس کے اوپر جبر کرے گی اور اگر بالکل علیحدہ ہونا چاہے تو علیحدہ بھی ہوسکتی ہے جس کو خلع کہتے ہیں۔ وہ یہ کہ وہ قاضی کے ہاں درخواست کرے گی قاضی خاوند کو بلا کر اس سے مؤاخذہ کرے گا، کیوں نہیں تم نے حقوق ادا کئے۔ اگر اس نے جواب کچھ معقول دیا فبھا۔ ورنہ قاضی کہے گا نکاح فسخ کردے۔ یہ تیرے پاس نہیں رہنا چاہتی۔ اگر فسخ نہیں کرے گا تو قاضی عورت کو طلاق دیدے گا اور طلاق واقع ہوجائے گی تو اس خلع کا مالک عورت کو بنایا گیا ہے۔ غرض اگر ایک طرف طلاق کی ملکیت مرد کے لئے رکھی تو خلع کی ملکیت عورت کے لئے رکھی۔ وہ مجبور ہوکر جدا ہونا چاہے، ہوسکتا ہے یہ چاہے یہ بھی ہوسکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ حقوق کے درجے میں مساوی قرار دیا۔

بعض چیزیں عورت اخلاقاً انجام دیتی ہے اور بعض چیزیں مرد بھی اخلاقاً انجام دیتا ہے لیکن عورت کے لئے واجب نہیں ہے جیسے مثلاً دودھ پلانا ہے عورت کے ذمے واجب نہیں ہے۔ مرد سے کہہ سکتی ہے کہ تو خرچ کر کے دودھ پلوا، میں دودھ نہیں پلاسکتی۔ عورت اولاد کے کپڑے سیتی ہے لیکن اگر وہ خاوند سے کہے کہ درزی سے سلواؤ میرے ذمے واجب نہیں ہے تو خاوند ہرگز مجبور نہیں کرسکتا۔ بہر حال شریعت اسلام میں اس قسم کی چیزیں رکھی گئی ہیں کہ اگر اس کے حقوق ہیں تو اس کے بھی حقوق ہیں۔ یہ اسلام ہی نے اس کو ابھارا۔ تنگ دست اور نازک صنف کو ابھارا، جس کو دنیا کی اقوام نے پامال کردیا تھا۔

غرض جاہل اقوام نے اس پر یہ حقوق جتلائے کہ اس کی گردن مار سکتے تھے، اس کو ایذائیں پہنچا سکتے تھے اور متمدن اقوام یہاں تک پہنچیں کہ وہ تفریح کا ایک کھلونا ہے اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔ اسلام نے کہا کہ کھلونا نہیں، بلکہ خانگی زندگی میں برابر کی حقدار ہے، جس طرح کہ خاوند کے انتقال کے بعد اس کی اولاد وارث ہوگی، دوسرے اس کے وارث ہوں گے، عورت کو وراثت پہنچے گی۔ جس طرح سے عورت کے انتقال کے بعد خاوند کو وراثت میں حصہ ملتا ہے۔ عورت کو بھی خاوند کا وارث قرار دیا گیا۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ① جتنے عورتوں پر خاوندوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اتنا ہی خاوندوں کے اوپر بھی عورتوں کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ برابری اس حد تک رکھی گئی ہے کہ عورت کوئی باندی اور مملوک نہیں بلکہ شریک زندگی اور شریک حیات ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا خاص اصول ہے کہ کمزوروں کو ابھارتا ہے، دبتے کو دباتا نہیں

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸.

بلکہ دبے ہوئے کو اونچا کرنا چاہتا ہے، کمزوروں کو دباتا نہیں بلکہ اونچا بنانا چاہتا ہے، سب سے زیادہ کمزور صنف عورت تھی۔ اسلام نے اس کے اوپر انتہائی رحم وکرم کیا کہ جب وہ بیٹی ہونے کی حالت میں ہے تو ماں باپ کی نیکیوں میں شمار کیا جارہا ہے۔ جب وہ منکوحہ بنی، تو خاوند سے کہا گیا تو قابل تکریم تب بنے گا جب عورت کے ساتھ نرمی اور مدارات کا برتاؤ کرے، جب وہ ماں بن گئی تو اولاد سے کہا جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اگر قدم پر ہاتھ رکھے گا جنت کو قریب پائے گا، اگر تو نے ماں کو ستایا تو جنت قریب نہیں ہوگی، آخرت میں نجات نہیں ہوگی یعنی باپ سے زیادہ ماں کا حق قائم کردیا۔ باپ کے بھی اولاد کے اوپر حقوق ہیں لیکن ماں کے حقوق اس سے زیادہ ہیں۔

ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہیں...... اور اس کی وجہ قرآنِ کریم نے ارشاد فرمائی کہ عورت جتنی مصیبت اولاد کی پرورش میں اٹھاتی ہے باپ نہیں اٹھاتا۔ باپ زیادہ سے زیادہ کماتا ہے میں کہتا ہوں اگر وہ شادی نہ کرتا جب بھی کماتا، اپنے لئے کماتا، دوسروں کے لئے کماتا۔ تو کمانا اس کی طبعی بات ہے وہ ہر صورت سے کماتا گویا وہ محنت محض بیوی کے لئے نہیں ہوتی، وہ اپنے نفس کے لئے بھی ہوتی ہے، اپنے عزیزوں کے لئے بھی ہوتی ہے لیکن عورت اولاد کے لئے جو محنت گوارا کرتی ہے وہ خاوند نہیں کرسکتا۔ نو مہینے تو پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے جس کو فرمایا گیا ﴿حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا﴾ ①

اور فرمایا گیا ﴿حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡلِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ﴾ ②

تھک تھک کر، عاجز آ کر نو مہینے اس کو پیٹ میں اٹھاتی ہے۔ اس کے اوپر ایک بوجھ ہے مگر برداشت کررہی ہے۔ پھر اس کے بعد وضع حمل، تو اس کے بارے میں مثل مشہور ہے کہ "جننا اور مرنا برابر ہوتا ہے" گویا اس کی زندگی کے لالے ہوتے ہیں۔ باقی اللہ بچاوے تو بچاوے، ورنہ موتیں واقع ہوجاتی ہیں۔ تو نو مہینے وہ مصیبت اٹھائی اور جننے کی ایک مستقل مصیبت اٹھائی، پھر اس کے بعد دو برس اس کو اپنا خون چسانا، دودھ پلانا، یہ اپنے بدن کے اجزا اس کو پہنچانا یہ خاوند نہیں کرسکتا، بیوی کرتی ہے، یہ ماں کرتی ہے، باپ نہیں کرسکتا۔

پھر اگر بچے کو ضد چڑھ گئی کہ میں تو گود میں چڑھ کر سوؤں گا۔ عورت کو ساری ساری رات گزر جاتی ہے کہ گود میں اٹھائے پھرتی ہے۔ بچہ اگر بیمار ہے تو ماں اس سے پہلے بیمار ہوجاتی ہے۔ اس کو الگ دکھ ہوتا ہے۔ غرض باپ کی مجال نہیں ہے کہ یہ محنت برداشت کرے، وہ تو مجنوں ہو کے نکل جائے۔

عورت میں جذبۂ خدمت...... اور کہیں ایسا ہو کہ عورت یوں کہے کہ سال یا مہینہ بھر کے لئے خدمت کا تبادلہ کرلیں۔ میں تیری خدمت انجام دوں اور تو بیٹھ کے بال بچے پال، تو ممکن نہیں دو دن میں اسے جنون ہو جائے گا اور پریشان ہو کے نکل جائے گا یہ عورت ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اس محنت کو برداشت کرتی ہے مرد برداشت نہیں کرسکتا۔

وہ ہمارے ہاں ایک کاشتکار کا قصہ مشہور ہے اور قصہ واقعی ہے، فرضی نہیں ہے کہ وہ کاشتکار اپنے کھیت پر گیا۔

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۱۵. ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۴.

وہاں جا کے کھیت کیاری کے کام میں لگ گیا۔ تو طریقہ یہ تھا کہ اس کی عورت ٹھیک بارہ بجے کھانا پکا کے لایا کرتی تھی ایک دن اتفاق سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دیر ہوگئی۔ کاشتکار آئے جائے تو کہاں؟ اسے غصہ چڑھا اس نے سینکڑوں صلواتیں بیوی کو سنائیں کہ تجھ سے کام نہیں ہوتا اور تو سست ہوگئی ہے اور کم بخت تجھ سے کچھ نہیں نبھتا اور میں ہوتا تو یوں کرتا اور تو ایسی ہے تو ویسی ہے بیچاری سنتی رہی یعنی صبح سے شام تک لڑکھپ کے بچوں کو الگ پالا، کھانا الگ پکایا، کھیت پر لے کر بھی گئی، اتفاق سے اگر ذرا دیر ہوگئی تو خاوند نے سینکڑوں صلواتیں سنائیں خیر وہ غریب سنتی رہی۔ خاوند کی زبان سے نکلا کہ اگر میں اس کام میں ہوتا تو کبھی یہ بات نہ ہوتی۔ اس نے کہا اچھا پھر دو چار دن کے لئے خدمتوں کا تبادلہ کرلو۔ میں کھیت پر کام کروں گی تو گھر پر رہ بچوں کو پال اور بارہ بجے کھانا لیکر آ جایا کرنا۔ اس نے کہا یہ کونسی بڑی بات ہے میں کرلوں گا۔ اس نے کہا اچھا کل سے پھر یہی ہوگا۔

چنانچہ صبح کو اٹھتے ہی بیوی تو کھیت پر چلی آئی اور کھیتی کا کام شروع کر دیا۔ اب یہ خاوند صاحب گھر لیٹے رہے آنکھ کھلی تو ایک بچہ رو دیا، یہ اسے سنبھالنے کے لئے گئے تو ادھر سے دوسرا چلایا، اسے پکڑنے کے لئے گئے تو تیسرا رویا، ابھی اس سے نہیں نمٹے کہ معلوم ہوا، وہ گھر میں گائے بندھ رہی تھی اس کا بچھڑا رسہ چھڑا کر گائے کے دودھ پر جا کے لگ گیا، اسی پر گذرا اوقات تھی۔ یہ جلدی سے بچھڑے کو سنبھالنے گیا، تو بچہ چارپائی سے نیچے گر پڑا، اب وہ چلا رہا ہے، شور مچا رہا ہے، یہ وہاں پہنچے بچھڑا جو وہاں پہنچا اور اس نے دودھ لیا تو گائے گھبرا کے بھاگی اور اس کی رسی چارپائی میں اٹک گئی تو وہ چارپائی سمیت چولھے پر چڑھ گئی۔ تو اب چارپائی چولھے کے اوپر رکھی ہوئی ہے، بچہ وہاں پڑا ہوا ہے اور ایک بچہ ادھر چلا رہا ہے، اب اسے پریشانی ہے کہ بچوں کو سنبھالوں یا بچھڑے کو سنبھالوں یا کھانا پکاؤں یا دودھ نکالوں، کھڑا ہوا مجنوں کی طرح ہر طرف دیکھ رہا ہے، یہاں تک کہ دس گیارہ بج گئے، وہ بیچاری کھیت کے اوپر محنت کر رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ آج بارہ چھوڑ ساڑھے گیارہ بجے کھانا آ جائے گا۔ اس لئے کہ مرد بہت قوی ہے، خوب کام انجام دے گا۔ جب بارہ چھوڑ ایک بج گیا اور کوئی نہ آیا۔ اس نے کہا کیا قصہ پیش آ گیا؟ وہ آئی۔ تو آ کے دیکھا کہ ایک بچہ ادھر پڑا رو رہا ہے، ایک ادھر رو رہا ہے اور چارپائی چولھے کے اوپر ٹنگ رہی ہے اور گائے چولھے پر چڑھ رہی، اور بچھڑا پڑا ہوا ہے، نہ کھانا، نہ دودھ، نہ چارپائی، نہ اپنے بچے، گھر میں کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں اور خاوند صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا بات ہے؟ خاوند نے کہا بس کچھ نہیں۔ یہ تیرا ہی کام ہے میرے بس کا کچھ نہیں۔ پھر اس نے کھیتی کا کام شروع کیا اور عورت نے گھر کو سنبھالا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ عورت کا بڑا حوصلہ ہے کہ گھر میں بچوں کو سنبھالنا، کھانا پکانا، گھر کا انتظام کرنا اور خاوند کے سارے معمولات اور خدمات کو انجام دینا۔ اگر خاوند کو چار خدمتیں سپرد کر دی جائیں، دیوانہ ہو جائے۔ یہ عورت ہی کر سکتی ہے۔ چونکہ یہ چیز تھی اس واسطے شریعت اسلام نے اس کا رتبہ بلند کیا۔ باپ سے زیادہ اس کے حقوق بڑھائے۔ مرد منصب کے لحاظ سے کتنا ہی بلند سہی، لیکن حقوق کے لحاظ سے اتنا بلند نہیں ہے جتنے شریعت نے عورت کے حقوق قائم کئے ہیں۔

تو شریعت کا یہ خاص اصول ہے کہ ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ① جو زمین میں ضعیف اور کمزور ہیں ہم ان کو ابھاریں گے۔ ہمارا یہ اصول ہے کہ ان کو بلند و بالا کیا جائے، تو عورت ضعیف، نازک تھی اس لئے اس کو ابھارا۔

یتیم پر شفقت کے لئے ساری امت کو متوجہ کیا گیا...... اسی طرح یتیم بیچارہ ضعیف ہوتا ہے۔ ماں باپ اس کے گزر گئے لاوارث رہ گیا، کوئی پالنے والا نہیں ہے اس پر شفقت کی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے، اگر کوئی شخص یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: ''اَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيْمِ كَهَاتَيْنِ.'' ② میں اور یتیم کی خدمت کرنے والا جنت میں بالکل اس طرح برابر ہوں گے میں ذرا آگے نکل جاؤں گا۔ وہ کچھ پیچھے رہے گا۔ مگر اس کے رتبے کی معیت وہی ہوگی جو جنت میں مجھے دی جائے گی۔ اور پہلے یتیم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ سے زیادہ یتیموں کا والی اور وارث کون ہوسکتا ہے؟ اور آپ سے زیادہ یتیموں کو سہارا دینے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس واسطے احادیث یتیموں کی خدمت کے فضائل سے بھری پڑی ہیں۔

روح اس کے اندر یہی ہے کہ یتیم کمزور تھا، ماں باپ گزر گئے تھے دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ عزیز اقرباء بھی ہوتے ہیں، لیکن جب تک خود اپنی غرض متعلق نہ ہو خلوص سے خدمت کرنے والے دنیا میں گنے چنے ہوتے ہیں، عام طور سے نہیں ہوتے اس واسطے پوری امت کو متوجہ کیا ہے کہ یتیم کا باپ گزر گیا تو ساری امت بمنزلہ باپ کے ہے۔ ہر انسان اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی خدمت کی طرف توجہ کرے۔ تو عورت کمزور تھی اس کی طرف توجہ فرمائی، یتیم کمزور تھا اس کی طرف توجہ فرمائی۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم...... اگر آپ کا کوئی زر خرید غلام ہے وہ بیچارہ کمزور ہے۔ آپ کو آقا سمجھتا ہے تو اس کے لئے شریعت نے فرمایا، اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ ③ وہ غلام جن کو تم نے خریدا ہے وہ بمنزلہ تمہارے بھائی کے ہیں۔ جو خود کھاتے ہو وہ انہیں کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو وہ انہیں پہناؤ، جو اپنی اولاد کو تعلیم دیتے ہو، وہ انہیں تعلیم دو۔ یعنی برابری کا رتبہ رکھو۔ پھر اس کی اتنی عزت بڑھائی کہ اگر آقا اور غلام مسجد میں آئیں تو یہ فرق نہیں ہوسکتا کہ غلام پچھلی صف میں آئے اور آقا اگلی صف میں آئے، وہ دوش بدوش برابر کھڑا ہوگا۔ آقا کو کوئی حق نہیں ہے کہ اسے پیچھے ہٹادے۔ شریعت نے مساوات قائم کی۔ تو ادھر فرمایا ''اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ'' ④

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵.

② الصحیح لمسلم، کتاب البر، باب الاحسان الی الارملۃ والمسکین والیتیم، ج: ۴ ص: ۲۲۸۷ رقم: ۲۹۸۳.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من الجاھلیۃ ولا یکفر صاحبھا، ج: ۱ ص: ۲۰ رقم: ۳۰.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من الجاھلیۃ ولا یکفر صاحبھا، ج: ۱ ص: ۲۰ رقم: ۳۰.

تمہارے برابر کے بھائی ہیں۔ جو خود کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو انہیں پہناؤ، ان کو تعلیم اور تادیب کرو، حسن سلوک سے ان سے پیش آؤ۔

پھر غلام کو آزاد کرنے کے فضائل سے احادیث بھری پڑی ہیں کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کر دیا فرمایا وہ ایسا ہے جیسے اس نے ایک حج مع عمرے کے انجام دیا۔ جو اس کا اجر ہوتا ہے، وہ ایک غلام کو آزاد کرنے میں اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شروع زمانے میں جہاد جتنا زیادہ تھا، غلام زیادہ آتے تھے، ان کو آزاد کرنے کا اتنا دستور تھا کہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں غلام آزاد ہوتے تھے اور ان کو تعلیم دیتے تھے، پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شروع زمانہ اسلام میں بڑے بڑے اکابر علماء جن سے دین اور علم پھیلا، زیادہ تر غلام ہوتے تھے، اس لئے کہ ان کے پاس کوئی زیادہ اسباب معیشت اور دولت نہیں ہوتی تھی، گھر بار نہیں ہوتا تھا کہ اس میں لگیں۔ وہ خالص دین اور علم کی طرف متوجہ ہو جاتے، اس لئے جتنا وہ علم سیکھتے تھے گھر بار والے اتنا نہیں سیکھتے تھے۔ انہیں کچھ دولت کا، کچھ گھر کا شغل بھی ہوتا۔ انہیں فقط علم سیکھنے کا شوق اور شغل ہوتا تھا۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ دیہات کے رہنے والے اور غلام تھے۔ لیکن آج وہ سارے مسلمانوں کے امام ہیں۔ عطاء ابن ابی رباحؒ کے بارے میں امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''مَارَاَیْتُ اَحْسَنَ مِنْ عَطَآءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ'' ① میں نے اپنے زمانے میں عطاء ابن ابی رباح سے زیادہ فضیلت والا کوئی شخص نہیں دیکھا، تو جس کے علم کی امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تعریف کریں۔ اندازہ کیجئے کہ اس کے علم کیا رتبہ ہوگا؟ یہ بھی غلام ہیں۔ تو اتنے بڑے ہیں کہ آج مسلمانوں کے مقتداء ہیں اور اپنی ذات سے دیکھیں تو وہ غلام ہیں۔

صوفیاء اور علماء میں غلام بڑے بڑے اکابر ہوئے اور بڑی تعداد میں ہوئے۔ یہ شریعت اسلام کی اس ہدایت کا اثر ہے کہ اس نے کمزور دیکھ کر پوری امت کو متوجہ کر دیا، ہر آقا کو متوجہ کیا کہ اپنے غلام کو حقیر مت سمجھنا۔

اسلام سے قبل غلاموں سے بدسلوکی...... یہ اس لئے ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کے لئے غلامی ایک بدترین عذاب تھا آقا کو غلام پر حق حاصل تھا کہ اسے قتل کر دے، اس کو ذبح کر دے، اس کو دردناک سزائیں دے، کوئی قانون اس پر گرفت نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک لوگ کرتے تھے کہ تاریخوں میں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ کس طرح ان کے دل برداشت کرتے تھے، غلام سے ذرا سی کوتاہی ہوئی شکنجے بنوائے ہوئے ہوتے جس میں اِدھر اُدھر برچھے

① لم اجدهذه الروايةبهذا السياق ولكن اخرج الامام الترمذى والبيهقى وابن حبان والعلامة ابن بطةوالفاكهى وابن الجعد والزيلعى والعينى وابن عبدالبر واللفظ للترمذى:حيث قال: حدثنامحمودبن غيلان ،حدثناابويحيىٰ الحمانى سمعت اباحنيفة رحمه اللهتعالىٰ يقول مارايت احدا اكذب من جابرالجعفى ولاافضل من عطاء ابن ابى رباح ،السنن للترمذى ج:١٢ ص:٢٩٢ .اللهم الاان الراقم قد تساهل فى نقل الرواية الصحيحة بهذه الالفاظ حيث ذكر''احسن ''بدل قوله افضل. والله اعلم.

لگے ہوتے تھے بیچ میں غلام کو رکھ کے اس کو ملا دیتے تھے۔ اُدھر اُدھر سے برچھا آر پار ہو جاتا تھا اور ہنس رہے ہیں۔

تالابوں کے اندر سانپ چھوڑے ہوئے ہیں، غلام سے ذرا سی کوتاہی ہوئی لات مار کے دھکیل دیا۔ سانپ لپٹ گئے اور آقا کی تفریح ہو رہی ہے۔ بھڑیئے جمع کئے گئے اور اس غلام پہ چھوڑ دیئے گئے، جو سزا کا مستحق تھا، بھیڑیئے اس کو جھپٹ رہے ہیں پھاڑ کھا رہے ہیں اور آقا تفریح کر رہے ہیں۔ غلام کی یہ کیفیت تھی۔

اسلام نے غلامی کو ختم کیوں نہ کر دیا؟...... اسلام نے آ کر غلامی کو تو نہیں مٹایا کہ یہ فطری سی چیز ہے۔ سیاسی طور پر جب کسی قوم پر غلبہ ہو اور وہ قوم حربی بنے اور مقابلہ پر آئے تو سیاسی آزادی چھینی جاتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم مفتوح قوم سے سیاسی آزادی چھین لیتی ہے۔ ان سے بھی چھینی جاتی تھی۔ یہی معنی غلامی کے ہیں۔ دینی آزادی نہیں چھینی جاتی تھی۔ غلام مسجد میں آ سکتا ہے، تلاوت بھی کر سکتا ہے، آقا کے برابر عبادات کر سکتا ہے۔ سیاسی حقوق نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی تھی تو سیاسی آزادی چھن گئی اور سارے حقوق باقی رکھے گئے، تو پچھلی اقوام غلام پر اتنا حق رکھتی تھیں کہ انتہائی دردناک سزائیں دیتیں۔ اسلام نے وہ سب سزائیں مٹا دیں۔ آزاد کرنے کے فضائل بیان کئے جس سے ہزاروں غلام روز آزاد ہوتے تھے تعلیم دینے کی فضلیت بیان کی جس سے ہزاروں غلام بڑے بڑے علما اور فضلاء بن گئے۔ تو ضعفاء کے اوپر اسلام نے رحم کھایا۔ اس لئے عورت، یتیم اور غلام پر رحم کیا۔ جو مظلوم اور بے کس ہو اس کے لئے پوری امت کو فرمایا گیا کہ پوری امت کا حق ہے کہ اس کے ظلم کو دفع کرے اور اس کی مدد کرے۔

جانوروں پر رحم کرنے کا حکم...... حتیٰ کہ جانور جو زیادہ کمزور ہوتا ہے، اس پر اور زیادہ رحم و کرم بتلایا گیا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کو آپ نے جنت میں دیکھا۔ ساری عمر بدکاری کی اور دیکھا گیا جنت میں۔ وجہ کیا پیش آئی؟

فرمایا: ایک کتا پیاس کی وجہ سے مر رہا تھا، زبان پر کانٹے پڑے ہوئے تھے، عرب کی گرمی کی خشکی کی وجہ سے زبان باہر نکلی ہوئی وہ فاحشہ عورت آئی اس کو رحم آیا کہ ایک بے زبان جانور مر رہا ہے کنویں پر نہ ڈول تھا نہ رسی تھی۔ اس نے اپنے پیروں سے چمڑے کا موزہ نکالا اور اپنے دوپٹے میں اس کو باندھ کر اس میں جتنا پانی آیا وہ کتے کے منہ میں ٹپکایا جس سے اس کے دم میں دم آ گیا اور اس کی جان بچ گئی۔ فرمایا اس عمل کی بدولت فاحشہ عورت جنت میں داخل کی گئی۔

اور حدیث میں ہے کہ ایک نیک اور متقی آدمی کو آپ نے جہنم میں دیکھا۔ فرمایا کہ یہ منکشف ہوا کہ وہ اس لئے جہنم میں گیا اس نے ایک بلی کو جو ستاتی تھی جیسے بعض جانور ستاتے ہیں، اس نے غصے میں آ کر ایک کوٹھڑی میں بند کیا اور کہا کہ اسے کوئی نہ کھولے دو تین دن میں وہ سسک کر اندر مر گئی۔ فرمایا: وہ متقی جہنم میں گیا۔ اس لئے کہ اس نے جانور کے اوپر رحم نہیں کھایا۔

فرعونی طاقت پر بنی اسرائیل کے ضعفاء کو غالب کیا گیا...... غرض اسلام ہر کمزور پر رحم کھاتا ہے، انسانوں میں کوئی کمزور ہو یا جانوروں میں تو جس دین نے جانوروں تک پر رحم کھایا وہ کیسے گوارا کرے گا کہ انسان انسانوں پر ظلم کرے یا کوئی کسی دوسرے کے اوپر زیادتی کرے۔ یہ اس نے برداشت نہیں کیا۔

اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ﴾ ①

یہ قصہ فرعون کے زمانے کا ہے، موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ حق تعالیٰ اس کو قرآن میں حکایت فرما رہے ہیں کہ ﴿اَنْ نَّمُنَّ﴾ ہم احسان کریں گے، کن پر؟ ان لوگوں پر جو زمین کے اندر کمزور ہو گئے۔ گویا یہ موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا جا رہا ہے۔

فرعون چونکہ غالب تھا، اقتدار اس کے ہاتھ میں تھا، بنی اسرائیل مغلوب تھے اور بنی اسرائیل کو فرعون نے انتہا درجے کی ذلت پر پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ انبیاء زادے تھے، نبیوں کے خاندان سے تھے۔ اہل علم وسمجھ تھے۔ لیکن چونکہ فرعون کی غلامی میں مبتلا ہو گئے، اس واسطے اس نے جتنی ذلیل خدمات تھیں، وہ بنی اسرائیل کے سپرد کر رکھی تھیں۔ مزدوریاں کرنا، کوڑا اٹھانا اور ان کے بچوں کو پالنا غرض اس قسم کی ساری ذلیل خدمات ان سے لی جاتی تھیں اور انتہائی ذلت کے ساتھ ان کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور انہیں نبی بنا کر مبعوث فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی تربیت شروع کی، تعلیم وتربیت کے ذریعے ان کے اخلاق اور کردار کو درست فرمایا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ یہ جو کمزور ہیں، جن کی تم تربیت کر رہے ہو، ان کے اخلاق درست کر رہے ہیں، ﴿اَنْ نَّمُنَّ﴾ ان پر ہم احسان کرنے والے ہیں۔ یہ ضعفاء ہیں، زمین پر کمزور ہیں، ہم ان کو قوت دینے والے ہیں۔ ﴿وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً﴾ ② انہیں زمین میں امام بنانے والے ہیں۔

﴿وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ﴾ ③ اور زمین کی وارثت ان کو سپرد کرنے والے ہیں۔ زمین کی وراثت میں یہ حصہ دار بنیں گے گویا موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو تسلی دی گئی کہ اپنی کمزوری پر غم نہ کھاؤ۔ مگر ہاں شرط یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جس طرح تعلیم وتربیت دے رہے ہیں ان کا اتباع کیے جاؤ جس علم کی طرف لا رہے ہیں اس علم کی طرف آؤ۔ جن اخلاق کی طرف بلا رہے ہیں ان اخلاق کی طرف آؤ ان کی پیروی کرتے رہو۔ انکی تعلیم وتربیت کے سامنے جھکتے رہے۔ جب تمہارا اخلاق بلند ہوگا تو عنقریب ہم تم کو بلند کرنے والے ہیں یہ موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا گیا۔

آگے ارشاد فرمایا ﴿وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا

①②③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵.

یَحْذَرُوْنَ﴾ ① اور ہم انہیں اقتدار وتمکنت دینے والے ہیں اور فرعون وہامان اور انکے لشکر جن جن چیزوں کو سامنے رکھ کر ڈرتے تھے، اب ان کے سامنے آنے والا ہے۔ انہی چیزوں میں مبتلا کئے جانے والے ہیں جن چیزوں کا خطرہ تھا کہ کہیں یہ بنی اسرائیل غلبہ نہ پالیں اور ہمیں کہیں نیچا نہ دکھادیں۔ یہ ان کے آگے آئیں گی اور تم کمزوری میں مبتلا تھے، تم ان پر غلبہ پاؤ گے۔ حق تعالیٰ نے اس زمانے کے اس واقعہ کی حکایت فرمائی اور اسلام نے اسے بطور اصول بیان کیا تو اسلام کا اصول یہ ہے کہ ضعفاء کو سہارا دیا جائے، جو کمزور ہوں انکے اوپر احسان کیا جائے، جو مفلوک الحال ہوں ان کی مدد کی جائے جو غرباء، یتامیٰ اور مساکین ہوں ان کا ہاتھ بٹایا جائے۔ جو کسی ظلم میں گرفتار ہو اور اسے ظلم سے نجات دلانا آپ کے اختیار میں ہو تو آپ پر فرض ہے کہ آپ اسے نجات دلائیں۔

بہر حال عورت، غلام، یتیم اور مظلوم ومصیبت زدہ ان سب پر رحم کیا ہے۔ تو یہ اسلام کا خاص اصول ہے کہ اس امت مسلمہ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم کمزوروں پر احسان کرنا سیکھو۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمۃ للعالمین فرمائی گئی کہ آپؐ جہانوں کے لئے رحمت ہیں اور سب سے زیادہ آپ کی رحمت کمزوروں پر ظاہر ہوئی ہے، سب سے زیادہ کمزور عرب تھے، ان کو اتنا قوی کیا کہ پورے عالَم میں ان کا نظام قائم ہوگیا، ان کی حکومت قائم ہوگئی۔ تو آپ کی رحمۃ للعالمینی نے کمزوروں اور ضعفاء کو سہارے دیئے مساکین کو اونچا کیا، یتیموں کو والی اور وارث بلکہ آقا بنادیا۔ غلاموں کو ان کے آقاؤں کے اوپر غالب کردیا۔ یہ اسلام کی تعلیم کا اثر تھا اس امت کے سامنے یہ تعلیم پیش کی گئی ہے تاکہ امت بھی اسی راستے پر چلے کمزوروں پر رحم کھائے۔ ہر قوم میں کمزور بھی ہوتے ہیں، قوی بھی ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ ناداروں کی وہ خبرگیری کریں، ضعفاء کی رعایت ومدد کریں۔

دورِ فاروقی میں غرباء کو عدل وانصاف کے ذریعہ غالب کیا گیا...... امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلیفۃ المسلمین بنادیئے گئے تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کے اعلان کیا کہ آج سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے اور جو قوی ہے وہ آج سے میرے نزدیک کمزور ہے۔ یعنی میں کمزوروں کی مدد کروں گا اور اقویاء اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ ان کے ہاتھ میں قوت ہے میں ایک ایک حق ان سے منتقل کر کے کمزوروں کو دلاؤں گا۔

چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت اس سے بھری پڑی ہے کہ عدل وانصاف سے غریبوں کو کتنا سہارا دیا۔ گویا اسلامی حکومت کا اصل مقصد تربیت خلق اللہ ہے۔ امیر المومنین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کی تربیت کرے۔ اخلاقی طور پر ان کی نگہداشت کرے اور یہ دیکھے کہ علم اور اخلاق کے اندر کون کمزور ہے اس کو سہارا دیں۔ بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مثالیں قائم کیں۔

حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رات کو نگہداشت کرنے کے لئے نکلتے کہ

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۶۔

رات میں کون کس طرح زندگی بسر کر رہا ہے حتی کہ گھروں کی حالت معلوم کرتے تھے کہ اخلاقی حالت کچھ کمزور تو نہیں ہوگئی تو راتوں کو گشت کرتے تھے۔ ایک دفعہ گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے کچھ گنگنانے کی آواز آئی جیسے کوئی کچھ گا رہا ہو اور عورت کی آواز تھی۔ نوجوان لڑکی کچھ اشعار پڑھ رہی تھی، اشعار بھی کچھ عاشقانہ تھے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کھٹک پیدا ہوئی کہ ایک لڑکی اور گھر میں عاشقانہ اشعار پڑھے۔

خیر وہ گھر پہ آئے دستک دی کہ کون ہے گھر کے اندر؟ وہ لڑکی امیر المومنین کی آواز پہچان گئی اور رعب کی وجہ سے سہم گئی اور دب گئی اور اتنا رعب پڑا کہ وہ جواب نہ دے سکی، اس کے جواب نہ دینے اور چپ ہو جانے کی وجہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اور زیادہ شبہ پیدا ہوا کہ گانے کی آواز تو بند ہوگئی، مگر جواب کوئی نہیں دیتا پھر ڈانٹ کر آواز دی کہ اس گھر کے اندر کون ہے؟ لڑکی بیچاری اور زیادہ دب گئی اور ڈر گئی۔ تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہو گئے کہ دیکھوں اندر کیا بات ہے۔ معلوم ہوا کہ گھر میں ایک نوجوان لڑکی ہے اور گھر میں کوئی نہیں ہے۔

فرمایا تو کون ہے؟ اور کیوں گا رہی تھی؟ اور تجھے معلوم نہیں ہے کہ اسلام نے عورت کی آواز کو بھی عورت بنایا ہے۔ تو اتنی زور سے بول رہی تھی کہ باہر آواز آئے، تو نہیں سمجھتی کہ تو گنہگار ہوئی اب لڑکی نے جرات کی۔ اسے بھی بھروسہ تھا کہ فاروق اعظمؓ عادل کامل ہیں۔ جو چیز کہوں گی تو یہ نہیں ہے کہ وہ جذبات میں آ کر فیصلہ کریں وہ اس پر غور کریں گے۔ اس لڑکی نے ذرا کرخت آواز کر کے کہا: امیر المومنین! مجھے آپ طعنہ دے رہے ہیں کہ میں نے گناہ کیا۔

آپ نے اس وقت کھڑے کھڑے تین گناہ کئے ہیں اور قرآن وحدیث کے احکام کی تین خلاف ورزیاں کی ہیں۔

بس! فاروق اعظم ٹھنڈے ہو گئے، بجائے اس کے کہ کوئی غصہ آتا۔ رعایا کی ایک لڑکی اور امیر المومنین کو ڈانٹ دے تو جذبات ابھرنے چاہئے تھے۔ کوئی اشتعال پیدا ہونا چاہئے تھا، لیکن جب اس نے کہا کہ آپ نے تین گناہ کئے ہیں تو فوراً سہم گئے اور مرعوب ہو گئے۔ فرمایا بہن! میں نے کیا گناہ کئے؟

اس نے کہا کہ پہلا گناہ تو آپ کا یہ ہے کہ میں ایک اجنبی لڑکی ہوں اور اجنبی لڑکی کے ساتھ کسی مرد کو خلوت جائز نہیں ہے۔ آپ کو کیا حق تھا کہ آپ میرے گھر میں آئے اور آ کر میرے تخلیے میں خلل ڈالے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا صاف حکم ہے کہ ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ ① گھروں میں دروازوں کے ذریعے سے داخل ہو۔ آپ نے خلاف ورزی کی کہ آپ دیوار پھلانگ کر گھر میں آئے آپ کو دیوار پھلانگ کر آنے کا کیا حق تھا؟

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا حکم ہے۔ ﴿لَاتَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ② کسی کے گھر کے اندر اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور سلام نہ کر لو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب کسی دوسرے کے گھر پر جاتے تو تین دفعہ سلام فرماتے

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۹۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۲۷۔

اور تین سلاموں کی کیا صورت ہوتی؟

ایک سلام استیذان یعنی اجازت لینے کا سلام، بجائے اس کے کہ دستک دیں، نام لے کر پکاریں۔ آپ دروازے پر کھڑے ہو کر زور سے فرماتے، السلام علیکم، گھر والوں کو آواز سنائی دیتی، وہ وعلیکم السلام کہہ کر باہر آتے، اجازت دیتے اور گھر میں بلاتے۔ پھر جب گھر میں داخل ہوتے، تو مجلس کو سلام کرتے۔ یہ سلام تحیہ کہلاتا ہے۔ اور پھر جب واپس ہوتے، پھر سلام وداع کہتے، یہ سلام وداع کہلاتا ہے۔ تو تین سلام ہوتے ہیں۔ جو ابتدائی سلام ہے وہ سلام استیذان یعنی اجازت لینے کا سلام ہے۔ تو لڑکی نے کہا، قرآن نے حکم دیا تھا کہ جب تک اجازت کا سلام نہ کیا جائے، گھر میں داخل نہ ہوں۔ آپ بلا سلام استیذان و اجازت کیسے داخل ہوگئے؟

یہ تین گناہ آپ سے سرزد ہوئے ہیں۔ لڑکی نے یہ ڈانٹ کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بہن! لوجہ اللہ مجھے معاف کر، واقعی میرے سے غلطی ہوئی اس نے کہا میری خطاء آپ نے کب کی ہے جو میں آپ کو معاف کروں جس کی خطاء کی ہے، اس سے معافی چاہو، قرآن کی خلاف ورزی کی ہے۔ خدا کے سامنے توبہ استغفار کرو میرے سے معافی کا کیا مطلب؟

اب فاروق اعظمؓ بہت ہی شرمندہ اور بہت ہی منفعل وہاں سے واپس آئے۔ حالانکہ فاروق اعظمؓ امیر المومنین ہیں۔ امیر کو یا امیر کی پولیس کو شبہ پر یہ حق حاصل ہے کہ چھاپہ مار کر گھر میں داخل ہو۔ فاروق اعظم نے یہ کوئی گناہ نہیں کیا تھا پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اجازت تو لی۔ ڈانٹ کر کہا کہ کون ہے جو اندر گا رہا ہے؟ جب کوئی بولا نہیں اور انہیں شبہ ہوا، پھر داخل ہونے کا حق تھا تو خلاف ورزی انہوں نے کی یا لڑکی نے؟

امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے وہ یہ سب چیزیں کر سکتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو گنہگار کے مقام پر سمجھا کہ حقیقتاً مجھ سے غلطی ہوئی اور تمام رات جاگ کر استغفار کیا، عبادت کی اور اللہ کے سامنے روئے۔ صبح کو انشراح ہوا کہ اللہ نے میری غلطی معاف کر دی حالانکہ توبہ کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ گنہگار تھے ہی نہیں مگر پھر بھی اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر توبہ کی۔

اب ضابطے کے مطابق آدمی بھیجا کہ اس لڑکی کو دربار خلافت میں حاضر کرو۔ لڑکی لائی گئی۔ فرمایا، بہن! اللہ تجھے جزائے خیر دے، تو نے مجھے میری غلطیوں پر متنبہ کیا۔ میں نے تمام رات اللہ کے سامنے استغفار کیا اور توبہ کی اور اب مجھے انشراح ہے کہ اللہ نے میرے گناہ کو معاف کر دیا۔

تو اضعاً گناہ کہہ رہے ہیں، ورنہ گناہ نہیں تھا۔ مجھے اللہ نے معاف کر دیا اور میں تیرا احسان مند ہوں۔ لیکن اب بحیثیت امیر المومنین ہونے کے تجھ سے پوچھتا ہوں کہ وہ گانا بجانا کیسا تھا اور تو یوں گا رہی تھی تجھے ایسے عاشقانہ اشعار پڑھنے کا کیا حق ہے؟

لڑکی نے کہا، امیر المومنین! اصل واقعہ یہ ہے کہ میں ایک نوجوان لڑکی ہوں اور بھرپور جوانی ہے اور ابھی

پندرہ دن میری شادی کو ہوئے تھے، میرا خاوند بھی نوجوان ہے آپ نے اسے فلاں محاذ پر فوج کیساتھ بھیج دیا۔ میں اس کے فراق میں یہ عاشقانہ اشعار پڑھ رہی تھی اور کوئی بات نہیں تھی۔ نہ میں زانیہ ہوں نہ بدکار۔ فرمایا، بہتر تو نے سچ کہا، تیرا لہجہ بتلا رہا ہے کہ حقیقتاً بات یہی ہے۔ پھر اسے بہت اکرام کے ساتھ واپس کیا۔

ایک لڑکی کی وجہ سے پوری فوج کے لئے ضابطہ جاری کیا گیا...... ادھر لڑکی کو واپس کیا اور گھر میں آ کر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلیہ محترمہ (رضی اللہ عنہا) سے یہ پوچھا کہ اگر نوجوان لڑکی کی شادی ہو اور نوجوان ہی خاوند ہو اور دونوں میں جدائی کر دی جائے تو کتنے دن تک وہ صبر کر سکتے ہیں کہ اس کے بعد بدکاری میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ فرمایا، تین مہینے سے زیادہ نوجوان عورت صبر نہیں کر سکتی۔ یہ الگ چیز ہے کہ اس کا دین مضبوط ہو، اس میں حیاء ہو اور اپنے اخلاق کی وجہ سے صبر سے برسہا برس بلکہ عمر بھر گزار دے یہ عوارض کی بات ہے۔ گفتگو طبعی جذبات کے اوپر ہو رہی تھی، طبعی جذبات کے اعتبار سے فرمایا کہ اندیشہ ہوتا ہے تین ماہ کے بعد بدکاری میں مبتلا ہو جائے، اگر کوئی دین و دیانت مانع نہ ہو۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اب سرکاری آرڈر جاری کیا ''جن شادی شدہ جوانوں کو جنگ پر بھیجا گیا ہے۔ انہیں تین مہینے کے اندر واپس کیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے سپاہی بھیجے جائیں، تین مہینے یا تین مہینے سے زیادہ کسی نوجوان کو نہ رکھا جائے، جس کی شادی ہو چکی ہو، اور امکانی حد تک ان جوانوں کو فوج میں بھیجنے کی کوشش کی جائے، جو شادی شدہ نہ ہوں تا کہ یکسوئی کے ساتھ جہاد کر سکیں اور شادی شدہ ہوں تو انہیں تین مہینے کے اندر اندر فوراً واپس کیا جائے''

قوم کے اخلاق کی نگہداشت امیر المومنین کا فرض ہے...... گویا اخلاق کی یہ نگہداشت سرکاری طور پر تھی۔ ایک سیاسی نگہداشت ہوتی ہے وہ تو ہر بادشاہ کرتا ہے۔ ایک اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔ اسلام میں امیر المومنین کا یہ فرض ہوتا ہے کہ پبلک کے اخلاق و عادات کی اصلاح کرے۔ ان کے اخلاق اور گھریلو معاملات کو دیکھے کہ کوئی بداخلاقی تو نہیں ہو رہی۔ ان کے تقویٰ و طہارت میں کوئی فرق تو نہیں آ گیا یہ ساری ذمہ داری امیر المومنین پر عائد ہوتی تھی۔

مذہبی معاملات میں پیشوائی بھی امیر المومنین کا فرض ہے...... یہی وجہ تھی کہ امیر کا حق سمجھا گیا ہے کہ وہ امامت کرائے، نماز پڑھانا یہ امیر المومنین کا اصل کام ہے۔ جس عہدے کو ہم بہت ہی گھٹیا اور ردی سمجھتے ہیں۔

یہاں تو خدا کا فضل ہے، یہاں کے مسلمان الحمدللہ مسجدوں کا صرف احترام ہی نہیں کرتے بلکہ مسجدوں کو اپنے گھروں سے زیادہ آراستہ کرتے ہیں۔ ائمہ مساجد کی عزت بھی ہے، تنخواہیں بھی معقول ہیں۔ لیکن ہماری طرف اس بارے میں اس قدر حال ابتر ہے کہ جو بالکل کودن، نکما اور کندۂ ناتراش ہو، اسے امام بنائیں گے، جو حد درجہ جاہل ہو، جو دنیا کا کوئی کام نہ کر سکتا، اسے امام بنائیں گے، جو اندھا، لنگڑا، لولا ہو اسے موذن بنائیں گے، جو دنیا کے کسی کام کا نہ ہو اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارے گھر کا کمین ہے جیسے نائی، حجام، ڈوم کمین ہوتے ہیں۔ یہ امام بھی

ایک کمین ہے جیسے شادیوں کے موقع پر حجاموں اور ڈوموں کو دیا جاتا ہے۔ مسجد کے امام کو بھی کچھ دیدیتے ہیں۔

حالانکہ فقہاء لکھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا وقیع عہدہ ہے اس کو امام بنانا چاہئے جس کی محلے دار عزت وعظمت کرسکیں، اس کی عزت کرنا شریعت نے فرائض میں شامل کیا۔

اس لئے کہ وہ درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے۔ یہ قائم مقام کی حیثیت سے امامت کرار ہا ہے۔ تو اصل میں یہ حق امیر المؤمنین کے لئے رکھا گیا ہے اور اس میں مصلحت یہ ہے کہ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ" مثل مشہور ہے کہ لوگ اپنے بادشاہ کے طریق پر چلتے ہیں۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ جیسا بادشاہ ہوگا ویسی رعیت بنے گی، تو جب امیر المومنین پانچ وقت آکر نماز پڑھائیں گے تو رعیت کا کونسا آدمی رہ جائے گا جو مسجد میں حاضر ہوکر نماز نہ پڑھے۔

اس لئے کہ لوگ بادشاہ کی شوکت کو دیکھ کر وہی کام کرتے ہیں، جو بادشاہ کرتا ہے۔ یعنی دین تو بڑی چیز ہے اگر بادشاہ فسق وفجور میں مبتلا ہے تو رعیت میں بھی از خود وہی بات ہوجاتی ہے کہ رعیت بھی مبتلا ہے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک، یہ اموی خاندان کا خلیفہ تھا۔ اس کو شادیاں کرنے کا بہت شوق تھا۔ ناجائز تو نہیں کرتا تھا۔ چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھتا تھا مگر جسے جائز عیاشی کہتے ہیں کہ قانون کی آڑ رکھ کر عیاشی کرنا، وہ کرتا تھا چار بیویاں رہتی تھیں جہاں چھ ماہ گزرے ایک کو طلاق دی اس کا مہر ادا کیا، اس کی جگہ پانچویں لے آئے پھر دوسری کو طلاق دے کر اس کی جگہ لے آئے۔ غرض اسی طرح کرتے کرتے اس نے دو اڑھائی سو کے قریب شادیاں کیں بس اس کا یہ شوق تھا، بادشاہت تھی، خزانہ ہاتھ میں تھا۔ دین ودیانت پیش نظر نہیں تھا کہ وہ قومی خزانہ اس طرح سے ذاتی مصارف میں خرچ کرتا اتنا غنیمت تھا کہ حرام کاری سے بچتا تھا۔ بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ مگر چار میں ردوبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ اس کا طریقہ تھا۔

تو اس زمانے کے امراء کی مجلس میں بیٹھ کر فخر یہ باتیں ہوتی تھیں، ایک رئیس کہتا کہ میں پچاس شادیاں کر چکا ہوں، تو دوسرا کہتا آپ نے کون سا بڑا کام کیا، میں سو بیویاں کر چکا ہوں، تیسرا کہتا جناب! میں دو سو کر چکا ہوں چونکہ بادشاہوں میں یہ طریقہ تھا تو ساری پبلک میں یہی چیز فخر کا باعث بن گئی۔

جس راستے پر امراء اور سلاطین چلتے ہین اسی پر عام پبلک کے لوگ چلتے ہیں۔ اس لئے شریعت اسلام نے امیر المومنین کا کام قرار دیا کہ وہ امامت کرائے تاکہ یہ ذلیل نہ رہے۔

اب ظاہر ہے کہ جب امیر المومنین خود مسجد میں آئیں گے تو امراء میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا جو مسجد میں نہ آجائے، غرباء ممکن ہے نہ آئیں لیکن امیر، نواب اور جاگیردار کوئی باقی نہیں رہے گا، جو مسجد میں نہ آئے اس لئے کہ انہیں بادشاہ کی رضامندی اور اس راہ پر چلنا مقصود ہوتا ہے۔ اب جب بادشاہ نماز کے راستے پر آگیا تو وہ کہیں گے چلو ہم بھی نماز کے راستے پر سہی۔

عالمگیرؒ کے زمانے کا واقعہ لکھا ہے کہ عالمگیرؒ کے زمانے میں علماء کچھ کسمپرسی میں مبتلا ہو گئے، انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ اس واسطے کہ امراء اپنے نشۂ دولت میں پڑ گئے اب علماء سے مسئلہ کون پوچھے۔ تو علماء بے چارے جوتیاں چٹخاتے پھرنے لگے عالمگیرؒ چونکہ خود عالم تھے۔ اہل علم کی عظمت کو جانتے تھے۔ تو انہوں نے کوئی بیان وغیرہ اخبارات میں شائع نہیں کرایا کہ علماء کی قدر کرنی چاہئے۔

یہ تدبیر اختیار کی کہ جب نماز کا وقت آ گیا تو عالمگیرؒ نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آج فلاں والیٔ ملک جو دکن کے نواب ہیں وہ ہمیں وضو کرائیں تو جو دکن کے والی تھے انہوں نے سات سلام کئے کہ بڑی عزت افزائی ہوئی کہ بادشاہ سلامت نے مجھے حکم دیا کہ میں وضو کراؤں۔ وہ سمجھے کہ اب کوئی جاگیر ملے گی۔ بادشاہ بہت راضی ہے تو آپ فوراً پانی کا لوٹا بھر کر لائے اور آ کر وضو کرانا شروع کر دیا۔

عالمگیرؒ نے پوچھا کہ وضو میں فرض کتنے ہیں؟ انہوں نے ساری عمر کبھی وضو کیا ہو تو انہیں خبر ہوتی۔ اب وہ حیران کیا جواب دیں پوچھا واجبات کتنے ہیں؟ کچھ پتہ نہیں۔ پوچھا سنتیں کتنی ہیں۔ جواب ندارد۔ عالمگیرؒ نے کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ لاکھوں کی رعیت کے اوپر تم حاکم ہو، لاکھوں کی گردنوں پر حکومت کرتے ہو اور مسلم تمہارا نام ہے تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وضو میں فرض واجب اور سنتیں کتنی ہیں، مجھے امید ہے کہ میں آئندہ ایسی صورت نہیں دیکھوں گا ایک کے ساتھ یہ برتاؤ کیا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ایک دوسرے امیر سے کہا آپ ہمارے ساتھ افطار کریں اس نے کہا۔

جہاں پناہ! یہ تو عزت افزائی ہے۔ ورنہ فقیر کی ایسی کہا قسمت کہ بادشاہ سلامت یاد کریں اور جب افطار ہوا تو عالمگیرؒ نے ان سے کہا کہ مفسدات صوم جن سے روزہ فاسد ہوتا ہے کتنے ہیں؟

انہوں نے اتفاق سے روزہ ہی نہیں رکھا تھا انہیں پتہ نہیں تھا کہ روزے کے مفسدات کیا ہیں۔ اب چپ ہیں کیا جواب دیں۔

عالمگیرؒ نے کہا، بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ تم مسلمانوں کے امیر، والی ملک اور نواب کہلاتے ہو، ہزاروں آدمی تمہارے حکم پر چلتے ہیں اور تم مسلمان، ریاست اسلامی، تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ روزہ فاسد کن کن چیزوں سے ہوتا ہے۔

اسی طرح کسی سے زکوٰۃ کا مسئلہ پوچھا تو زکوٰۃ کا نہ آیا۔ کسی سے حج وغیرہ کا۔ غرض سارے فیل ہوئے اور یہ کہا کہ آئندہ میں ایسا نہ دیکھوں۔

بس جب یہاں سے امراء واپس ہوئے۔ اب انہیں مسائل معلوم کرنے کی فکر پڑی تو مولویوں کی تلاش شروع ہوئی۔ اب مولویوں نے نخرے شروع کئے ہم پانچ سو روپے تنخواہ لیں گے۔ انہوں نے کہا حضور! ہم ایک ہزار روپیہ تنخواہ دیں گے، اس لئے کہ جاگیریں جانے کا اندیشہ تھا۔ ریاست چھن جاتی۔ تو مولوی نہ ملیں۔ تمام ملک کے اندر مولویوں کی تلاش شروع ہوئی جتنے علماء، طلباء تھے سب ٹھکانے لگ گئے بڑی بڑی تنخواہیں جاری ہو گئیں اور ساتھ یہ

کہ جتنے امراء تھے انہیں مسائل معلوم ہوئے اور دین پر انہوں نے عمل شروع کر دیا تو یہ وہی بات تھی کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ جیسا بادشاہ ویسی رعایا، بادشاہ اگر خود دین کی طرف متوجہ ہو جائے تو ناممکن ہے کہ رعایا اور پبلک متوجہ نہ ہو، اس لئے کہ حکومت جو راستہ ڈالتی ہے پبلک اسی پر خوش دلی سے چلتی ہے۔

اس میں نیکی ہی کی بات نہیں بری سے بری بات ہو، بادشاہ اس کو رائج کر دے لوگ اس پر چلیں گے۔ آج کا تہذیب وتمدن چونکہ حکومتوں کی طرف سے آیا ہے، تو آج کے تہذیب وتمدن کے کیا معنی؟ اسلام میں تہذیب وتمدن کے یہ معنی تھے کہ اخلاق ہونا، صبر وشکر، حیاء وغیرت، شجاعت وسخاوت ہو، لیکن آج تہذیب کے معنی ہیں کلب گھروں میں جا کر ناچنا، عریانی اور ننگے پن کا مظاہرہ کرنا، فحش اور بے حیائی کی باتیں کرنا، آج کی تہذیب کے یہ معنی ہیں چونکہ حکمرانوں کی طرف سے یہ تہذیب آ رہی ہے، پبلک بھی اسی پر چل رہی ہے اب انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اچھی یا بری چیز ہے۔ ہر اچھی یا بری چونکہ اوپر والے کر رہے ہیں لہٰذا ہم بھی کر رہے ہیں۔ تو جس کے پیچھے شوکت اور قوت آ جاتی ہے۔ وہ چیز دل پذیر بن جاتی ہے، دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔ لوگ اسے اختیار کرتے ہیں۔

اسی واسطے اسلام نے جتنی نیکیاں ہیں ان کا ذمہ دار خود امیر المومنین کو بنایا ہے، یعنی حد کی بات یہ ہے کہ اگر جنازہ آ جائے۔ تو حق یہ ہے کہ امیر المومنین جنازے کی نماز پڑھائیں ظاہر ہے کہ جب امیر المومنین اور بادشاہ جنازے کی نماز پڑھائے گا تو امراء جاگیردار، نواب جتنے بھی ہوں گے یہ لوگ میت سے کنارہ کشی چھوڑ دیں گے کہ بھئی! میت کے پاس بھی جانا چاہئے، اس کی نماز جنازہ بھی پڑھنا چاہئے۔ تو دیندار ہو جائیں گے، امامت کریں گے تو مساجد بھر جائیں گی نماز جنازہ پڑھائیں گے تو لوگ میت کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی شروع کر دیں گے۔ امیر زکوٰۃ دے گا تو دنیا میں زکوٰۃ رائج ہو جائے گی۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ﴾ ①

اگر ہم ان مسلمانوں کو زمین کی قوت وسلطنت دے دیں تو وہ تعیش نہیں اختیار کریں گے ﴿اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ﴾ یہ دین قائم کریں گے۔ ﴿وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ﴾ زکوۃ کا نظام قائم کریں گے، امر بالمعروف کا نظام قائم کریں گے۔ اچھی باتیں دنیا میں رائج کریں گے، منکرات کو مٹائیں گے۔ تو جب صاحب اقتدار منکرات کو مٹانے لگے تو پبلک میں کون رہے گا جو منکرات پر عمل کرے گا۔ وہ بھی مٹائیں گے۔ امیر المومنین معروف اور پاکیزہ خصلت کو رائج کرے تو ہر امیر وغریب رائج کرنے کی فکر میں لگے گا، دین پھیل جائے گا۔ اس واسطے امراء کے فرائض میں قرار دیا گیا ہے کہ نماز جنازہ بھی وہی پڑھائیں، مسجد میں امامت بھی وہی کرائیں۔ یہ منصب دراصل ایسا ہے جیسے آج دنیا میں گورنری کا عہدہ ہے جو کسی سلطنت یا صوبے میں بادشاہ کا نائب ہوتا ہے، امام اللہ کا نائب ہوتا ہے اللہ کے رسول کا قائم مقام ہو کے کھڑا ہوا ہے۔ تو دینی حکومت ہو تو یہ بڑے عہدے ہوتے ہیں۔

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱.

اسی واسطے فرمایا گیا ''یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَاُهُمْ لِکِتَابِ اللّٰہِ'' ① امامت کا حق اس شخص کو ہے جو سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہے اور ''فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَآءَ ۃِ سَوَآءً فَاَعْلَمُھُمْ بِالسُّنَّۃِ'' ② اور اگر قرآن پڑھنے میں مقتدی اور امام سب برابر ہیں تو اسے امام بناؤ جو سنت کے علم سے زیادہ واقف ہو اور اگر قرآن وسنت میں سب کے سب ماہر ہوں پھر اسے امام بناؤ جو فقہ اور نماز کے مسائل زیادہ جانتا ہو اور اگر فقہ میں بھی سارے ماہر ہیں تو پھر اسے بناؤ جس کا نسب اونچا ہو اور اگر اس میں بھی سب برابر ہیں پھر اسے بناؤ جو خوبصورت ہو۔

مطلب یہ کہ امام کے اندر خصوصیت ایسی ہو کہ مقتدیوں کو اسکے پیچھے کھڑے ہونے میں کوئی عار نہ پیدا ہو۔ وہ اس کے ساتھ جھک جائیں اس کی بھی عزت کریں۔ اب اگر آپ جان بوجھ کر ایسے امام رکھیں جن کی صورت نہ شکل نہ علم نہ ہنر، کوئی چیز بھی ان کے اندر نہ ہو۔ جو ساری دنیا سے نکمے ہوں انہیں امام بنادو۔ تو پھر جیسا امام ہوگا، ویسی نماز ہوگی، ویسا ہی آخرت میں اجر ملے گا۔

بہر حال یہ عہدے ہیں اور ان عہدوں کی ذمہ داری امراء اسلام کے اوپر ڈالی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ وعظ، تقریر یا خطابت یہ امیر کے ہاتھوں میں دی گئی ہے، اور فرمایا گیا ''لَا یَقُصُّ اِلَّا اَمِیْرٌ اَوْمَامُوْرٌ اَوْمُخْتَالٌ'' ③ تقریر اور خطابت کا حق سب سے پہلے امیر المومنین کو ہے وہ خطیب بن کر وعظ کہے اور مسائل کہے۔ یا پھر وہ بیان کرے جس کو امیر حکم دے اور مامور کرے کہ تم جا کے وعظ وخطابت کرو اور مسائل پہنچاؤ، اور تیسرا جو کرے گا وہ دھوکہ باز ہوگا۔ وہ اپنی اغراض کے لئے وعظ وتقریر کرے گا۔ اس لئے جب نہ امیر نے اجازت دی اور نہ وہ خود امیر اور مامور، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ذاتی اغراض والا ہے۔

آج کے دور میں مجموعۂ علماء کو خلافت کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے...... آج کے دور میں جہاں امارت ہے خلافت نہیں ہے تو علماء کے مجموعے کو امیر کے قائم مقام سمجھا گیا ہے۔ اگر وہ شہادت دیں کہ یہ اس قابل ہے کہ خطابت کرے، مسائل بیان کرے، اس کو حق ہے، لیکن جس کی کوئی سند نہ ہو، پڑھا ہوا نہ ہو، کوئی عالم شہادت نہ دے کہ اس میں علم ہے وہ اگر تقریر کرے گا ظاہر ہے دین کو فاسد کرے گا اس کو بھی آزاد نہیں رکھا گیا۔

تقریر وتحریر کی آزادی نہیں ہے بلکہ شہادت کے ساتھ تقریر وتحریر کی اجازت ہے اگر یہ عام ہو جائے جیسے آج ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک کچھ کہہ گیا، دوسرا کچھ کہہ گیا۔ عوام تشویشات میں مبتلا ہوتے ہیں کہ کس کے مسائل پر عمل کریں۔ ایک جائز کہہ رہا ہے، ایک ناجائز کہہ رہا ہے، اب ان بے چاروں کو یہ خبر تو نہیں ہے کہ عالم کا لبادہ پہن کر آیا خود عالم نہیں ہے۔ عالم فلاں ہے۔ ان کے سامنے جو اللہ کا نام لے گا وہ کہیں گے یہ عالم ہے۔ امتیاز نہیں ہو سکے گا۔

---

① ② السنن للترمذی، ابواب الصلوۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء من احق بالامامۃ، ج: ۱ ص: ۳۹۷ رقم: ۲۱۸۔ ③ السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب فی القصص، ج: ۱۰ ص: ۸۴ رقم: ۳۱۸۰۔ حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۸ ص: ۱۶۵ رقم: ۳۶۶۵۔

یہی وجہ ہے کہ دین کے ساتھ امارت اور خلافت قائم کی گئی تھی کہ وہ دینی چیزوں کو اپنے قبضہ اور اقتدار میں رکھ کے آگے چلائے اسی لئے فرمایا گیا "لَایَقُصُّ اِلَّا اَمِیْرٌ اَوْمَامُوْرٌ اَوْمُحْتَالٌ" تقریر کرنے والا یا امیر ہوگا یا مامور ہوگا یا پھر دھوکے باز ہوگا اور امیر کے قائم مقام اہل علم ہیں۔

ہمارے ہاں ہندوستان میں حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں میں کچھ وقت پہلے یہ چیز تھی کہ جب کوئی باہر سے خطیب آتا تو علماء کی ایک مجلس جب تک پاس کر کے شہادت نہ دے کہ یہ اس قابل ہے کہ تقریر کر سکے تقریر کی اجازت نہیں ہوتی تھی اس کا ثمرہ یہ ہوتا کہ ریاست میں صرف ایک خیال کے لوگ تھے۔ خیالات میں پراگندگی نہیں تھی۔ ایک مسلک پر سب عمل کرتے تھے عوام میں تشویش نہیں تھی، دین پر چل رہے ہیں۔

حیدرآباد میں بھی یہ چیز تھی اور بھوپال میں بھی۔ اس لئے وہاں علماء کی کثرت تھی، علم کی عظمت بھی تھی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی جب ریاست قدر دانی کرتی ہے تو دین پھیلتا ہے۔

بھوپال میں ایک عام دستور تھا کہ اگر کسی غریب آدمی نے اپنے بچے کو مکتب میں بٹھلایا تو آج مثلاً اس نے الٓمّٓ کا پارہ شروع کیا تو ریاست کی طرف سے ایک روپیہ ماہوار اس کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔ جب دوسرا پارہ لگا تو دو روپے ماہوار ہو گیا۔ تیسرا پارہ لگا تو تین روپے ماہوار ہو گئے یہاں تک کہ جب تیس پارے ہوں تو تیس روپے بچے کا ماہوار وظیفہ ہوتا۔

اور اس زمانے میں ساٹھ ستر برس پہلے تیس روپے ماہوار ایسے تھے جیسے تین سو روپے ماہوار بہت بڑی آمدنی تھی۔ سستا زمانہ تھا، ارزانی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے غریب لوگ تھے جنہیں کھانے کو نہیں ملتا تھا وہ بچوں کو مدرسہ میں داخل کر دیتے تھے کہ قرآن کریم حفظ کرے گا تو اسی دن سے وظیفہ جاری۔ ہزاروں ایسے گھرانے تھے، اور ہزاروں ایسے حافظ پیدا ہو گئے۔ ساری مسجدیں حافظوں سے آباد ہو گئیں اس لئے کہ ریاست پشت پناہی کرتی تھی۔

تو یہ قاعدہ ہے کہ حکومت یا ریاست جس چیز کی پشت پناہی کرتی ہے وہ چلتی ہے اور عوام وخواص سب شوق کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں۔ خلافت میں چونکہ اصل مقصود دین ہے، اس لئے امیر کے ذمہ فرائض عائد کئے گئے کہ جب بادشاہ دین پر چلے گا تو رعیت اور پبلک بھی دین پر چلے گی اور دین عام ہوتا جائے گا۔ جب تک خلافت قائم رہی، دین عام ہوتا رہا اور خلافت کے دوران تیس سال کے اندر اندر نصف دنیا سے زیادہ اوپر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ پورا ایشیاء، آدھا یورپ اور ایشیاء کو چک، ان سب میں اسلام کا پرچم اونچا کر دیا، اس لئے کہ سب کا مقصد یہ تھا کہ دین پھیلے۔

خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد علماء ربانی اور صوفیاء کرام نے اسلام پھیلایا...... خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد جب ملوکیت، بادشاہ پسندی اور اقتدار پسندی کا دور آیا تو سلاطین اسلام نے محض اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لئے آپس میں لڑنا شروع کیا، وہ جو دینی تبلیغ واشاعت تھی وہ قصہ ختم ہو چکا اور جو ملک صحابہ وتابعین وتبع

تابعین کے زمانے دین میں آئے وہ تو آئے اس کے بعد کسرویت وقیصرویت اور اقتدار پسندی غالب آئی تو سلاطین اسلام آپس میں تحفظ اقتدار کے لئے لڑنے لگے۔ دین کی اشاعت اور حفاظت بیچارے علماء نے سنبھال لی، جتنا اسلام پھیلا وہ صوفیاء کی بدولت پھیلا، علماء کی بدولت پھیلا، جو چٹائیوں پر بیٹھنے والے تھے انکے ہاتھ میں نہ کوئی اقتدار تھا نہ کوئی سلطنت کی باگ ڈور تھی۔ اسی لئے ان لوگوں کو تاکیدیں کی گئیں کہ امراء کے پاس مت جاؤ۔ بادشاہوں کی ہم نشینی اور صحبت مت اختیار کرو، ورنہ تم بھی دین سے جاؤ گے۔ ان سے ہٹ کر دین کو پھیلایا تو دین رحم وکرم اور نرمی ومروت کے اخلاق کے راستے آیا۔ سلطنت کے راستے ختم ہوگئے وہاں اقتدار پسندی رہ گئی۔

ہمیں مزاجِ نبوّت پر چلنا ہے......تو میں نے اس پر عرض کیا تھا کہ دنیا میں دو مزاج ہیں، ایک نبوّت کا مزاج ہے اور ایک ملوکیت کا مزاج بادشاہ کا مزاج اقتدار پسندی ہے اور نبوّت کا مزاج خاکساری اور عجز و نیاز مندی ہے۔ نبی تمام سلاطین اور سارے لوگوں سے بالاتر ہوتا ہے لیکن ایسا جھک سکتا ہے جیسے عام آدمی جھک سکتے ہیں۔ بادشاہ ایک محدود خطہ میں رہتا ہے، وہ اپنے کو ''مابدولت'' کے ساتھ تعبیر کرتا ہے کہ ہم نے یوں کیا، ہم نے یوں کہا۔ تو لفظ لفظ کے اندر اقتدار اور رعونت ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے الفاظ میں انتہائی تواضع، خاکساری ہوتی ہے اور عجز و نیاز کا برتاؤ ہوتا ہے۔

اپنے سے چھوٹے کے سامنے بھی عجز و نیاز کا برتاؤ کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سفر پر جارہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رخصت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''وَلَا تَنْسَانَا یَا اَخِیْ فِیْ دُعَاءِ کَ'' ① اے میرے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہمیں فراموش مت کرنا۔ اللہ اللہ! کہاں سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم! اور کہاں فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک خادم اور غلام ہیں ان کو فرماتے ہیں کہ میرے بھائی! مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا۔ تو یہ انتہائی عجز و نیاز کی بات ہے کہ سردار اولین وآخرین اور سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی ایک خادم اور چھوٹے کو فرمارہے ہیں کہ مجھے دعاء میں یاد رکھنا یہ مزاج نبوّت کا ہے اور وہ مزاج بادشاہت کا ہے۔ ہمیں نبوّت کے مزاج پر چلنا ہے۔

جب بادشاہت اور ملوکیت دنیا کو فاسد کردے تو پناہ کی جگہ صرف نبوّت ہوتی ہے۔ اس واسطے ہم جتنا نبوّت کے دامن میں آئیں گے، اتنے ہی اخلاق بلند ہوں گے اتنا ہی علم ومعرفت آئے گی، اتنا ہی کریکٹر اور کردار عمدہ ہوگا۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پر، ان کی تربیت پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے راستے پر چلنا چاہئے۔ اس علم کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ضعفاء قوی بن جاتے ہیں۔ جو پست ہوتے ہیں وہ شوکت والے بن جاتے ہیں جو مظلوم ہوتے ہیں انہیں عدل

① الحدیث اخرجه الامام الترمذی ولفظه: اشرکنا فی دعائک ولا تنسنا، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی صلی الله علیه وسلم ج: ۱۱ ص: ۴۷۴.

مل جاتا ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کے راستہ پر ہی چلنے کا ثمرہ نکلتا ہے اس کے سوا پناہ کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کئے تا کہ دین کے اعتبار سے بھی نافع ہوں اور دنیا کی مشکلات بھی حل ہوں اور حل کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ انبیاء علیہم السلام کا راستہ ہے۔ اسی کو فرمایا گیا ﴿اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ ① ہمارے راستے پر چلو گے، ضعیف بھی ہو گے تو قوی بنا دیئے جاؤ گے، بے شوکت ہو گے تو باشوکت کر دیئے جاؤ گے۔

اس واسطے یہ چند جملے میں نے اس آیت کے تحت عرض کئے۔ چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ عورتیں بھی مدعو کی گئی ہیں۔ اس لئے کچھ عورتوں کے متعلق بھی بیان کیا کہ انکے حقوق پہچاننے کی ضرورت ہے کہ ان کے حقوق پامال نہ کئے جائیں۔ ان عورتوں کا حق ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کے حقوق پامال نہ کریں تا کہ معاشرت صحیح طور پر چل سکے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، ہمارے احوال بھی درست فرمادے، ہمارا دین و دنیا دونوں درست فرماوے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَ ھَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً. اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ. رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآاِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖٓ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵.

ثمرات العلم

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اِقْرَأْبِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَo خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍo اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُo الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِo عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْo كَلَّآ إِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىo أَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰىo إِنَّ إِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾ ① صَدَقَ اللهُ الْعَظِيْمُ.

کچھ اپنے تعارف کے بارے میں...... بزرگانِ محترم! ابھی میرے محترم بزرگ نے میرا تعارف کراتے ہوئے بہت سی چیزیں دارالعلوم دیوبند اور اس کے بانیوں کے بارے میں ذکر فرمائیں۔ حقیقت میں اگر تعارف کے قابل کوئی چیز ہے، وہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء ہی ہیں۔ ہم جیسے ناچیز اور بے مقدار ذرے، وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا تعارف کرایا جائے اور تعارف کا نام لے کر انہیں پیش کیا جائے، ہمارا تعارف یہی کافی ہے کہ ہمیں دارالعلوم دیوبند سے خادمی اور غلامی کی نسبت حاصل ہے۔ اصل میں تعارف کی چیز ادارہ وہ جماعت ہے۔ جس جماعت سے وابستگی اور تعلق کی وجہ سے ہمارا بھی نام لے لیا جاتا ہے۔ اگر اس جماعت سے تعلق نہ ہوتو ہم کوئی قابل ذکر چیز بھی نہیں ہیں۔ آپ نے استاذ غالب کا نام سنا ہوگا شاعروں میں بڑا مشہور شاعر گذرا ہے کلام بھی اس کا بڑا اونچا اور بے نظیر ہوتا ہے خاص شاہی شاعر تھا اور مغلیہ دربار جس کے آخری بادشاہ ظفر تھے، کا شاعر تھا۔ اس نے اپنے متعلق ایک بات کہی ہے وہ پوری طرح سے ہم پر منطبق ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

بنا ہے شاہ کا ملازم پھرے ہے اتراتا ۔۔۔ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

بادشاہ کا ملازم ہوگیا ہے اس لئے لوگ پوچھنے لگے۔ اگر اپنے آپ کو ملازمت سے قطع کر لے، شہر میں اس کی آبرو نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہی صورت ہماری بھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے اکابر سے ایک خادمی اور غلامی کی نسبت ہے۔ اس نسبت کی وجہ سے لوگ ہمیں پوچھ لیتے ہیں۔ اگر وہ نسبت نہ رہے تو ہم میں کوئی چیز ایسی

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱ تا ۸۔

نہیں ہے کہ اس کا کوئی تعارف کرایا جائے یا کوئی قابل ذکر چیز ہوں، ہم بھی اگر اتراتے پھرتے ہیں تو انہی بزرگوں پہ اتراتے پھرتے ہیں، ورنہ ہمارے اندر کوئی چیز نہیں ہے۔

حضرت مولانا مرتضی حسن رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر اساتذہ میں سے تھے، انہوں نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ لاہور میں ایک فقیر، بہت ہی بیچارہ حقیر، فقیر بھی اور اوپر سے حقیر بھی، وہ لاہور کے بازاروں میں یہ کہتے ہوئے پھرتا تھا کہ ''لاہور میری ہتھیلی پر ہے جب چاہوں اسے پلٹ دوں اور ختم کر دوں''۔

رات دن اس کی یہ صدا تھی۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی! اس فقیر میں کیا طاقت ہے کہ لاہور جیسا شہر اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے جب چاہے پلٹ دے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اندر قوت ہے بھی یا یوں ہی خواہ مخواہ دعوے ہی کر رہا ہے؟ تو ایک بزرگ وہاں سے گزرے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ صاحب! یہ فقیر رات دن یہی دعوے کرتا ہے کہ لاہور کوئی چیز نہیں۔ میرے اندر یہ طاقت ہے کہ جب چاہوں اسے پلٹ دوں۔ آپ ذرا دیکھئے کہ اس میں ہے بھی کوئی جان اور طاقت؟ یہ بزرگ مراقب ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ فقیر میں کچھ بھی نہیں خالی قلاش ہے نہ اس میں کوئی بزرگی اور نہ کمال۔ انہیں حیرت ہوئی کہ اس بے مائیگی کے عالم میں یہ دعویٰ کیسے کر رہا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کے پیر کو دیکھنا چاہئے۔ شاید اس کے پیر میں طاقت ہو اسی کے بل پر کہتا ہو۔ لیکن معلوم ہوا وہ بھی خالی ہے۔ اس میں بھی کچھ نہیں۔ انہیں اور حیرانی ہوئی کہ آخر اس میں کیا جان ہے جس کی بنا پر اتنا بڑا دعویٰ؟ انہوں نے پھر مراقبہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا دادا پیر بے شک اتنی طاقت رکھتا ہے کہ جب چاہے لاہور کو پلٹ دے۔ انہوں نے کہا اسی کے بل بوتے پر یہ دعویٰ کر رہا ہے خود اس کے اندر کوئی کمال نہیں ہے۔

ہم بھی جو اتراتے پھرتے ہیں، یا کچھ کہتے ہیں، وہ انہی مشائخ کے بل بوتے پر کہتے پھرتے ہیں، ورنہ ہمارے اندر کوئی جان نہیں۔ اسی برتے پر آپ بھی کہتے ہیں کہ یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، اگر وہ نسبت قطع ہو جائے، نہ اچھے نہ برے یعنی قابل ذکر بھی نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ تعارف کرانے کے قابل وہی اکابر ہیں، وہی جماعت ہے جس نے ہندوستان میں دین پھیلایا اور ہندوستان سے گزر کر کوئی ملک نہیں چھوڑا کہ ان کے پروردہ، ان کے فاضل اور ان کے فیض یافتہ وہاں موجود نہ ہوں۔ آج آپ کے افریقہ میں جو دیوبند سے آٹھ ہزار میل دور ہے، آپ دیکھیں تو ان کے نام لیوا اور ان کا ذکر خیر کرنے والے موجود ہیں۔ یہ مولانا محمد اسماعیل جو افریقی ہیں، ہمارے محترم بزرگ ہیں۔ یہی اس جماعت کا تعارف ہے کہ آٹھ ہزار میل کے فاصلے پر دین کی روشنی پھیلانے والے موجود ہیں۔ تو کوئی کام تو انہوں نے کیا ہوگا کہ ہزاروں میل پر انکے نام لینے والے موجود ہیں۔ اس طرح سے آپ پاکستان، افغانستان، انڈونیشیا، جاوا، سماٹرا، ملایا اور حجاز میں پہنچیں، جگہ جگہ ان کے شاگرد اور نام لیوا موجود ہیں۔

میرا برما جانا ہوا، میں نے دیکھا کہ قصبے قصبے میں فضلائے دیوبند موجود ہیں مدارس قائم ہیں، تعلیم دے رہے ہیں۔ افغانستان میں جانا ہوا، وہاں کوئی قصبہ خالی نہیں جہاں فضلاء موجود نہ ہوں، ہزاروں کے ایمان کو سنبھال رکھا ہے،

کوئی شو، نمود دعوے اور پروپگنڈے نہیں لیکن عمل یہ ہے کہ ہزاروں کے ایمان سنبھلے ہوئے ہیں محض ان کے چہرے اور قول وعمل دیکھ کرلوگوں کے ایمان محفوظ ہیں توان اکابر نے ایک عظیم الشان کام کیا اور علم کا ایک سرچشمہ قائم کردیا۔

دارالعلوم دیوبند کے بارے میں حضرت نانوتوی ؒ کا خواب مبارک...... حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند سات برس کی عمر تھی، حضرت نے خواب دیکھا، جس کو ان کی سوانح میں نقل بھی کیا گیا ہے۔ حضرت ؒ نے یہ دیکھا کہ میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں کی دسوں انگلیوں سے اطراف عالم میں نہریں جاری ہیں اور پانی بہہ رہا ہے۔ حضرت کے ماموں مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم جو فارسی کے بڑے اچھے عالم اور متقی تھے، حضرت نے ان کو اپنا یہ خواب بیان کیا۔ انہوں نے کہا اس کی تعبیر یہ کہ تم سے علوم نبوت اطراف عالم میں پھیلیں گے۔ اب اس وقت کوئی کیا سمجھ سکتا تھا کہ نانوتہ ایک معمولی سی بستی، جہاں نہ کوئی عالم نہ فاضل، اس میں ایک سات برس کا بچہ خواب دیکھ رہا ہے اور اتنا بڑا خواب کہ دنیا جہاں میں میرے سے علم پھیل رہا ہے۔ حضرت نے جب دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، تب لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ اس خواب کی تعبیر ہے جو آپ نے سات برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ تو دارالعلوم دیوبند فی الحقیقت علم کا ایک سمندر ہے جس کی نہریں اطراف عالم میں جاری ہیں اور پھیل رہی ہیں اور لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند الہامی ادارہ ہے...... میرے محترم بھائی نے جس چیز کا ابھی تذکرہ کیا کہ دارالعلوم میں احاطہ مولسری میں ایک کنواں ہے اس سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواب متعلق ہے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم ہیں، لکھے پڑھے بالکل نہیں تھے، دستخط بھی کرنا نہیں جانتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کا اہتمام ان کے سپرد کیا تھا، انہوں نے عرض بھی کیا، حضرت! میں لکھنا پڑھنا اور دستخط کرنا بھی نہیں جانتا فرمایا نہیں آپ آ کے اہتمام سنبھالیں۔ اہتمام کرتے تھے، میر منشی بیٹھ کر احکام لکھتا تھا، مہر لگادی جاتی تھی۔ دستخط کرنا جانتے نہیں تھے، وہ احکام جاری ہوجاتے، اس طرح سے اہتمام شروع کیا۔

مولانا رفیع الدین صاحب نقشبندیہ خاندان کے بزرگ ہیں ان کی طریقت کا یہ سلسلہ آپ کے یہاں افریقہ میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ یہ مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں، ان کے خلیفہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی بنائے گئے ہیں۔ ان کے خلیفہ قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی ہیں، جن کی وفات ہوچکی، ان کے خلیفہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب جو مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) میں مقیم ہیں، مہاجر ہیں، بحمداللہ ان سے افریقہ کے سینکڑوں لوگ بیعت ہیں اور مستفیض ہیں، تو مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقت کا سلسلہ آپ کے افریقہ میں پھیلا ہوا ہے گویا آپ بھی ان کی روحانی اولاد ہیں۔ آپ ان سے الگ نہیں ہیں۔ ان کا میں واقعہ ذکر کررہا ہوں۔ تو

مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے ہیں کہ جب اہتمام مجھے سپرد کیا گیا تو اتنا بڑا ادارہ اور میں بے پڑھا لکھا، مجھے پریشانی تھی میں اس نظم کو کس طرح سے چلاؤں گا؟ میرے اندر کیا طاقت ہے؟ کوئی علمی طاقت ہو تو میں پڑھا لکھا نہیں۔ اور اگر آدمی جہلا کا انتظام کرے، تو چلو ایک جاہل آدمی جاہلوں کا انتظام کر لے، انتظام علماء کا اور کرنے وہ بیٹھا جو قطعاً علم نہیں جانتا، تو مولانا کو حیرانی تھی کہ میں کس طرح یہ کام انجام دوں گا، علم باطن اور علم لدنی حق تعالیٰ نے انہیں دیا تھا لیکن علم ظاہری نہیں تھا۔ فرماتے تھے جب میں زیادہ پریشان ہوا تو میں نے ایک خواب دیکھا، وہ خواب مجھے سنانا ہے، خواب یہ دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند کا جو سب سے بڑا قدیم احاطہ ہے، اس کو احاطہ مولسری کہتے ہیں۔ مولسری میں دو درخت مولانا رفیع الدین صاحب نے ہی بوئے تھے، جب عمارت کی بنیاد رکھی تو اسی تاریخ میں دو درخت بھی لگائے۔ دارالعلوم دیوبند اور وہ دونوں درخت ہم عمر ہیں۔ ایک ہی سال، ایک ہی دن کی پیدائش دونوں ہیں، بہر حال حضرت نے خواب میں دیکھا کہ احاطہ مولسری میں جو کنواں ہے وہ دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی مَن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں اور ہزاروں آدمی دودھ لے کر جا رہے ہیں، کوئی بڑی بالٹی، کوئی گھڑا، کوئی پیالے ہی میں بھر کر لے گیا، کسی کے پاس کوئی برتن نہیں تو اس نے چلو ہی میں لیا اور پی لیا، غرض درجہ بدرجہ ہر ایک دودھ لے جا رہا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم فرما رہے ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خواب دیکھنے کے بعد مراقب ہوا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ کیا اس کا مطلب ہے؟ تو مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ کنواں دارالعلوم دیوبند کی اور دودھ علم کی صورت مثالی ہے اور علم کو تقسیم کرنے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور جو یہ دودھ لے لے کر جا رہے ہیں، یہ دارالعلوم کے طلباء ہیں۔ تو فرمایا جب دارالعلوم میں شوال میں داخلہ ہوتا ہے اور طلباء ہجوم کر کے آتے ہیں، میں فوراً پہچان جاتا ہوں کہ اس میں یہ بھی موجود تھا۔ ان دودھ لینے والوں میں یہ بھی موجود تھا، یہ بھی، ایک ایک کی شکل پہچانتا ہوں۔ گویا ان کو ان تمام طلباء کی شکلیں دکھلائی گئیں، جو اس دارالعلوم سے آئندہ تک بھی فائدہ اٹھائیں گے اور علم حاصل کریں گے۔ تو جب دارالعلوم کی بنیاد الہام پر رکھی گئی، وہاں کے طلباء کا انتخاب بھی منجانب اللہ الہام ہی سے ہوتا ہے۔ ان کے قلوب میں الہام کیا جاتا ہے کہ جاؤ، اور جا کر علم پڑھو، جو جو وہاں کا فاضل ہے خواہ براہ راست فاضل ہے یا بالواسطہ فاضل ہے، وہ منجانب اللہ منتخب ہے۔ جس کو چھانٹ لیا گیا ہے۔ کہ وہ علم پڑھے اور پڑھائے۔ اس طرح سے یہ ادارہ الہامی بنیاد پر قائم ہے۔

اور جیسے آپ نے ابھی واقعہ سنا کہ دارالعلوم دیوبند کا جو نقشہ بنایا تھا۔ جتنا اب صحن ہے وہ اس سے چھوٹا رکھا گیا تھا، بنیادیں تیار کر لی گئی تھیں تو مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رات کو خواب دیکھا بزرگوں کا خواب بھی آدھا کشف اور آدھا خواب ہوتا ہے۔ ہمارے جیسا خواب نہیں ہوتا۔ وہ تو ان کو ایک انکشاف ہوتا ہے، ان کی روحانیت اور نورانیت قلب ہوتی ہے وہ عالم مثال اور عالم غیب کی چیزیں دیکھتے ہیں۔ تو درحقیقت وہ خواب نہیں ہوتا وہ کشف ہوتا ہے۔ تو مولانا فرماتے ہیں کہ میں خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

تشریف لائے اور آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ جو تم نے بنیادوں کے نشان لگائے ہیں اس سے صحن بہت کم رہے گا۔ مدرسہ چھوٹا ہو جائے گا، اس کو بڑا ہونا چاہیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اب بنیاد ہے وہاں جا کر اپنی لاٹھی مبارک سے نشان لگایا اور لمبی لکیر کھینچی فرمایا: ''یہاں تک صحن آنا چاہئے جب مدرسہ وسیع ہوگا''۔

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب صبح کو اٹھ کر میں گیا تو اسی طرح سے وہ نشان لگا ہوا تھا جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا تھا اور میں نے خواب میں دیکھا تھا اسی پر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد کھودی گئی۔ گویا مدرسہ کی بناء قائم کرنے کا تصور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور الہام کے ہوا۔ اس کی بنیاد کا نشان بھی الہام کے ساتھ لگایا گیا۔ اس کے طلباء کا انتخاب بھی منجانب اللہ ہوتا ہے۔ غرض ہر چیز الہامی ہے رسمی مشوروں کے تابع نہیں ہے۔ جیسے دنیا میں لوگ کیا کرتے ہیں کہ باہم جمع ہو کے مشورہ کیا کہ بھئی! ایک ادارہ قائم کرلو یہ صورت نہیں بلکہ غیبی طور پر قلوب میں ڈالا گیا کہ تعلیم گاہ قائم کرو۔

قیام دارالعلوم کا محرک...... وجہ اس کی یہ تھی کہ جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا انہوں نے علم اور دین کے راستے بند کر دیئے اور پادری مسیحیت کی اشاعت کے لئے کھڑے ہو گئے اور علماء کو عاجز کرنا شروع کر دیا۔ پیچھے حکومت کی قوت تھی۔ مسلمان بے بس ہو چکے تھے۔ اس وقت ان بزرگوں نے دیکھا کہ اگر تعلیم دین جاری نہ کی گئی تو اسلام کا وجود ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ کوئی مذہب بھی باقی نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی تعلیم باقی نہ ہو، تعلیم سے مذہب قائم ہوتا ہے۔ کسی مذہب کی تعلیم مٹ جائے، مذہب مٹ جاتا ہے۔ ان بزرگوں نے احساس کیا کہ کوئی تعلیم گاہ قائم ہونی چاہئے۔ تو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

اس وقت صورت حال کیا تھی؟ جب ابتداء میں ہندوستان میں انقلاب ہوا مسلمانوں کو انگریزوں سے ایک عام نفرت تھی اس لئے کہ انہی کے ہاتھ سے حکومت چھینی تھی تو طبعی طور پر نفرت ہونی چاہئے تھی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمارا ملک برباد کیا، اقتدار چھینا۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ نفرت نکل جائے، لیکن نفرت نہیں نکلی، قائم رہی بلکہ بڑھتی رہی۔ آخر وہاں کے مدبروں نے سوچ کر تدبیر نکالی اور وہ یہ کہ جب تک ان کے دل و دماغ کو بدلا نہیں جائے گا اس وقت تک یہ نفرت نہیں نکلے گی، تو نفرت نکالنے کی کوشش نہ کرو، ان کے دل و دماغ کو بدل دو اور دل و دماغ تعلیم کے ذریعہ بدلے جاتے ہیں تو اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم شروع کی گئی تاکہ ان کے دماغوں کے اندر سے وہ خوبی نکال دی جائے جو اسلام نے بھری ہوئی ہے۔ تو لارڈ میکاڈلے تعلیمی اسکیم لے کر ہندوستان آیا اور اس نے اعلان کیا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور فکر اور دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔

اس نے گویا چیلنج کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان بزرگوں نے دیکھا اگر یہ تعلیم پھیل گئی تو الحاد و بے دینی اور انگلستانیت اتنی پھیل جائے گی کہ چاروں طرف سے بہالے جائے گی، اسلام کا وجود باقی

نہیں رہے گا۔ تو حضرت نے دارالعلوم دیو بند کی بنیاد ڈالی اور انہوں نے یہ نعرہ لگایا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں لیکن فکر اور دماغ کے لحاظ سے عربستانی اور اسلامستانی ہوں اور ان کا دل ودماغ اسلامی بنے''۔

کوئی ہندی ہو، چینی ہو، کوئی ایرانی ہو، تورانی ہو، کوئی مصری ہو، کوئی حجازی ہو لیکن دل سب کے یکساں ہوں کہ وہ اسلامی ہوں، ان کے اندر ایمان بھرا ہوا ہو، اس لئے کہ دین اسلام ایک ایسا رشتہ ہے جو مشرق ومغرب کے مسلمانوں کو ایک نکتے پر جمع کر دیتا ہے۔ رنگ اور نسل ہمیں ایک نکتے پر جمع نہیں کر سکتے، کالے اور گورے کا اگر فرق ہوگا تو تنفر پیدا ہوگا۔ یہ فطری چیز ہے، جس کو آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی جانتے ہیں، اگر نسل کا لحاظ کیا جائے تو نسلیں نہیں جمع ہوا کرتیں وطن کا لحاظ کیا جائے تو وطن میں حد بندی ہوتی ہے، دلوں میں بھی حد بندی ہو جائے گی، دلوں کو وہ چیز جمع کر سکتی ہے جس میں کوئی حد بندی نہ ہو، عالمگیر چیز ہو اور پورے عالم پر پھیلنے والی ہو وہ سوائے اسلام کے کوئی دوسری چیز نہیں۔ فرمایا گیا: ''لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللهِ اَتْقٰكُمْ'' (۱) کسی عرب والے کو کسی عجم والے پر کوئی بزرگی اور فضیلت حاصل نہیں ہے اگر ہے تو دین اور تقویٰ کے لحاظ سے ہے۔

آپ نے فرمایا بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ میں کالے اور گورے دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، میری نگاہ میں دونوں یکساں ہیں۔ آپؐ نے فرمایا میں عرب اور عجم، ہند اور سندھ اور ایران اور توران سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (۲) حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ اے پیغمبر کہہ دے کہ میں تمام انسانوں کی طرف، سارے کنبے اور برادریوں کی طرف رسول ہوں تو اسلام نے سب کو ایک نکتے پر لا کر جمع کیا۔

یہی وجہ ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ اگر مشرق میں ایک مسلمان ہو اور اس کو کانٹا چبھے تو وہ ٹھیس محسوس کرتا ہے جو مغرب کے اندر بیٹھا ہوا ہے، کیونکہ دونوں میں رشتہ اسلام کا جڑا ہوا ہے۔ اگر وطن کا رشتہ ہو تو ایران والوں کو توران والوں سے کیا تعلق؟ ہندیوں کو افریقیوں سے اور افریقیوں کو حجازیوں سے کیا تعلق، لیکن اگر اسلام کا رشتہ ہے تو ہند اور سندھ سب ایک ہیں، افریقہ، امریکہ، ہندوستان وانگلستان سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ رشتہ ایک ہے۔ یہ رشتہ جب تک قائم ہے مسلمان یقیناً متحد ہیں، جب یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا، تفریق کا پیدا ہو جانا اور سر پھٹول لازمی ہے۔ تو دنیا مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام نے سب کو ایک نکتے پر جمع کیا۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کو نہ ماننے پر بنی اسرائیل کا انجامِ بد...... اس پر مجھے بنی اسرائیل کا ایک (واقعہ

(۱) مسند احمد، باقي مسند الانصار، ج:۴۷ ص:۴۷۸.

(۲) پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸.

جو حدیث میں ہے) یاد آیا۔ اللہ نے ان کو بڑی برگزیدگی دی تھی۔ قرآن کریم نے کہا کہ: ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ① اے نبی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعامات کئے، دنیا جہاں کی قوموں پر تم کو فضیلت اور برگزیدگی دی۔ اپنے وقت میں بنی اسرائیل سے باعظمت کوئی خاندان نہیں تھا۔ ہزاروں پیغمبر بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے۔ اللہ نے سب کچھ دیا لیکن جب یہ دولت وثروت زیادہ آ جاتی ہے تو عیش پسندی کی طرف طبیعتیں مائل ہو جاتی ہیں اور جتنا عیش بڑھتا جاتا ہے اتنی غفلت بڑھتی جاتی ہے، اتنی ہی پھر ذلت سامنے آتی ہے۔ بنی اسرائیل اس میں مبتلا ہوئے۔ دولت کی کثرت کی وجہ سے عیاشی کی طرف مائل ہوئے، سیاہ کاری، شراب خوری، زنا کاری تمام چیزیں شروع کیں، اس زمانے میں حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر تھے، حضرت دانیال علیہ السلام نے وعظ کہنے شروع کئے۔ فرمایا:

''اے لوگوں اس غفلت کو چھوڑو، اس غفلت کا نتیجہ بہت برا ہے، قوم تباہ و برباد ہو جائے گی، نسلیں برباد ہو جائیں گی، تمہارے چار دن کے عیش کی وجہ سے نسلیں بدترین جائیں گی، تو اپنے اوپر بھی رحم کھاؤ اور اپنی آنے والی نسلوں پر بھی۔ اس تعیش کو چھوڑ دو، اس دولت کو حکم خداوندی کے ماتحت استعمال کرو، اپنی ذاتی ملک مت سمجھو اور اس کے حکم کے مطابق اس میں تصرف کرو، نفس کے کہنے سے تصرفات مت کرو''۔

لیکن جب کوئی قوم عیش میں مبتلا ہو جاتی ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جاتا ہے، پھر وہ یہ نہیں دیکھتی کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اور ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی تھی۔ اندھے ہو کر عیاشی میں پڑے رہے۔ آخر کو اس کا نتیجہ نکلا تو بخت نصر مسلط ہوا۔ یہ عراق کا بادشاہ تھا، سورج پرست تھا، کوئی توحید اس میں نہیں تھی لیکن جب موحدین میں سے توحید نکل جاتی ہے اور جرائم بڑھ جاتے ہیں تو دلوں میں جان باقی نہیں رہتی، پھر مشرک موحدوں کے اوپر تسلط کر سکتے ہیں، ورنہ جب تک موحدوں میں توحید ہے ان کی قلبی قوت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ان پر غالب نہیں آ سکتی، جب خود میں جان نہ رہے تو دوسرے غالب آ جاتے ہیں۔ تو بخت نصر نے زبردست حملہ کیا اور ستر ہزار بنی اسرائیل کو قتل کیا، عورتوں کو تہہ تیغ کیا، گھروں میں گھس کر عورتوں کے پیٹ چاک کئے اور جو بچے تھے ان کو نیزوں کے اوپر ٹانگا تورات اور اس کے اوراق کو جوتوں سے روندا، بیت المقدس میں گندگی اور پلیدی ڈالی اور ستر ہزار بنی اسرائیل کو قیدی اور غلام بنا کر بغداد لے گیا۔ فلسطین، جو یہود کا وطن بنایا گیا تھا اس پر قبضہ کیا۔ تو ستر ہزار کو قتل کیا، لاکھوں عورتوں کی آبروریزی کی، لاکھوں بچوں کو قتل کیا۔ جن ستر ہزار کو گرفتار کیا ان میں حضرت دانیال علیہ السلام بھی تھے، ان کی بھی مشکیں کسی گئیں۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا میں اسی دن سے تمہیں ڈراتا تھا خود بھی تباہ ہوئے اور مجھے بھی خراب کیا۔ اب بنی اسرائیل کو ہوش آیا۔ اب معذرت کی اور کہا کہ اب ہم توبہ کرتے ہیں۔ فرمایا، اب توبہ کرنے سے کیا

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۷.

ہوتا ہے۔ توبہ کا وقت نکل گیا۔

اب کیا ہوتا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

دانہ ہی سارا چگ گئیں، تو اب بھوسے پر قناعت کر لو۔ مگر بہر حال انبیاء علیہم السلام کی شفقت ماں باپ سے زیادہ ہوتی ہے، کوئی قوم جب رجوع کر کے آتی ہے پھر ان کا دل پگھلتا ہے۔ پھر شفقت بڑھتی ہے۔

فرمایا کہ اچھا میں اللہ سے دعا کروں گا۔ میری جدوجہد ہوگی کہ اللہ تمہیں قید سے نکال کر پھر وہی عروج اور ترقی دے۔ یہ ستر ہزار قیدی بغداد کے بڑے جیل خانے میں ڈالدئے اور غلام بنائے گئے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئیں۔ اس لئے کہ اس زمانے کی قید و بند آج کے ترقی یافتہ دور کی طرح تو نہ تھی کہ قیدیوں کے لئے اے کلاس، اور بی کلاس ہو کہ قیدیوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، وہاں تو اندھے کنؤیں میں ڈالدیتے تھے کیڑے مکوڑے کاٹتے تھے، آدھا ریتا اور آدھے آٹے کی روٹی دی جاتی تھی جس سے آدمی مرنے سے پہلے مرجاتا تھا۔ کوئی بارکیں وہاں بنی ہوئی نہ تھیں بہر حال قید میں ڈالدیئے گئے، مگر حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر ہیں، چہرے پر نبوت کا جلال و جمال، عبادت اور زہد، تو ان کی عبادت اور اطاعت کو دیکھ کر جو جیل کا سب سے بڑا حاکم تھا، وہ ان کا معتقد ہو گیا اور بڑی عظمت کرنا شروع کی۔

کافر ہو یا مسلم، مگر ہر انسان کے دل میں ایک نور دیا گیا ہے جس سے وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے، تعصب کی وجہ سے اس کا نفس مانے یا نہ مانے یہ الگ بات ہے مگر دل قبول کرتا ہے کہ سچائی یہی ہے۔ تو حضرت دانیال علیہ السلام کی عظمت، عبادت، زہد، قناعت اور برکت دیکھی، ادھر بنی اسرائیل کو بھی ہوش آیا جب دولت نہ رہی عیش کے سامان بھی نہ رہے اور پیغمبر ساتھ ہیں تو انہیں بھی عبادت ہی کرنی تھی عیش کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ بھی رات دن عبادت میں مصروف۔ تو وہ جیل خانہ کیا ہوا وہ تو خانقاہ بن گیا ہر جگہ سے ذکر اللہ کی آوازیں آ رہی ہیں تو جیل کے جتنے حکام تھے سب معتقد ہو گئے اور اس وجہ سے پورے بنی اسرائیل کی بڑی رعائتیں کرتے تھے ادھر حضرت دانیال علیہ السلام کی دعا جاری کہ اے اللہ! ان کو رہائی بخش۔ آخر رہائی کے اسباب پیدا ہوئے۔

بنی اسرائیل کے لئے دوبارہ اقتدار کی راہ ہموار ہونا شروع ہوئی...... وہ ایسے کہ بخت نصر نے ایک خواب دیکھا اور دیکھ کر بھول گیا کہ میں نے کیا خواب دیکھا تھا، مگر خواب کچھ ہیبت ناک اور ڈراؤنا تھا تو اس کے دل میں الجھن اور پریشانی پیدا ہوئی، اس نے اپنے دربار کے کاہنوں، منجموں اور جو اس زمانے کا علم تھا، اس کے فاضلوں کو جمع کیا اور کہا میرے خواب کی تعبیر بتاؤ۔ انہوں نے کہا، خواب کیا ہے؟ کہا کہ خواب میں بھول گیا۔ انہوں نے کہا پھر تعبیر کا ہے کی بتائیں؟ اس نے کہا میں نے لاکھوں روپیہ تمہارے اوپر خرچ کیا، تم غیب دانی کے دعوے کرتے تھے تم میرا ایک خواب بھی نہیں بتا سکتے، تو تم کیسے غیب دان ہو؟ یا تو تین دن کے اندر خواب بتلاؤ، ورنہ تمہارے خاندانوں کو بھی تہس نہس کر دوں گا۔ ان کو بڑی پریشانی ہوئی کہ یہ تو کل تین دن کی میعاد رہ گئی، ہمارا

سب گھر بار ختم ہوا۔ اس لئے کہ وہ محض بناوٹی باتیں ہوتی تھیں کوئی غیب دانی نہ تھی، نہ کچھ معلوم تھا، بس پیسے وصول کرنے کے لئے سارے دعوے کرتے تھے، جب وقت پڑا تو ساری قلعی کھل گئی۔ خیر یہ خبر عام ہوئی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے سامنے پہنچی۔

حضرت دانیال علیہ السلام جیلر کے پاس تشریف لائے، فرمایا، بادشاہ نے خواب دیکھا ہے اس کا خواب اور تعبیر مجھے معلوم ہے۔ تو جا کے اطلاع کرتا کہ بادشاہ مجھے بلائے اور میں خواب کی تعبیر دوں۔ اور فرمایا یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس میں میرا بھی نفع ہے اور تیرا بھی نفع ہے۔ تو جب جا کے کہے گا کہ میرے قیدیوں میں ایک شخص ہے جو تیرے خواب کو جانتا ہے اور خواب کی تعبیر بھی جانتا ہے۔ تو بادشاہ پریشانی میں گرفتار ہے، خواب بھول گیا ہے، اس لئے بہت خوش ہوگا کہ جلدی بلاؤ، تو میرا یہ فائدہ ہے کہ میری رہائی ہو جائے گی اور رہا ہو کے میں اپنی قوم کی رہائی کی سعی کروں۔ تیرا فائدہ یہ ہے کہ جب تو بادشاہ کو الجھن سے نکال دے گا تیرا عہدہ بڑھے گا، ترقی ہوگی، عزت بڑھے گی۔ تو دونوں کا فائدہ ہے۔

جیلر بہت خوش ہوا کہ عجیب و غریب قیدی ہے معتقد پہلے ہی سے تھا۔ جب یہ غیب دانی دیکھی، عقیدت اور بڑھ گئی۔ جیلر نے کہا یہ تو مجھے معلوم ہے کہ دنیا میں اگر کوئی بادشاہ کا خواب بتا سکتا ہے تو وہ تو ہے لیکن سچ بتایئے، ہے بھی معلوم، یا ایسے ہی بات کہہ دی ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات واقعی نہ ہو تو میں پٹوں اور تمہاری بھی پٹائی ہو۔ فرمایا، تو بے کھٹکے جا کے کہہ، مجھے خواب معلوم ہے اور تعبیر بھی معلوم ہے۔

اس نے بڑی خوشی میں جلدی سے جا کر بادشاہ کو اطلاع دی کہ حضور! آپ جس الجھن میں گرفتار ہیں کہ خواب دیکھ کر بھول گئے ہیں۔ میرے قیدیوں میں ایک بڑا بزرگ قیدی ہے اور میں اس کی بزرگی سال بھر سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تو ایسا انسان نہیں دیکھا، وہ آپ کا خواب جانتا ہے۔ اچھا میرا خواب جانتا ہے؟ اس نے کہا جلدی رہائی کر۔ اس کی قید و بند کاٹ کر اعزاز و اکرام سے اس کو میرے دربار میں لے کے آ، اور اگر اس نے میرا خواب بتلا دیا تو تیرا عہدہ بہت بلند کروں گا، تیری تنخواہ بہت بڑھا دی جائے گی، تیرا اعزاز بڑھ جائے گا۔

جو پیغمبر علیہ السلام نے پیشین گوئی کی تھی وہ بات صحیح نکلی، جیلر کا تو دماغ آسمان پر پہنچ گیا۔ بہت خوش ہوا وہ دوڑا آیا۔ آ کر حضرت دانیال علیہ السلام کی قیدیں کاٹیں، ہتھکڑیاں بیڑیاں جدا کیں اور فاخرہ لباس رکھا کہ اسے پہن کر آپ تشریف لے چلیں میری تو دنیا بن گئی، مجھے آپ نے بہت کچھ دلوا دیا۔ فرمایا: ''تیرا ہی نہیں میرا بھی سب کچھ بنے گا''۔

حضرت دانیال علیہ السلام تشریف لے گئے۔ دربار شاہی میں امراء، وزراء، کاہن اور منجم بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی جان میں جان یوں آ گئی کہ ہماری جان بچ گئی، ورنہ تیسرے دن ہم تہہ تیغ کئے جاتے۔ چلو بادشاہ کے خواب معلوم ہونے کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ دربار میں پہنچے تو حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے دین کے مطابق

بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے تعظیم و توقیر سے اپنے پاس برابر بٹھلایا، دل میں اس کے بے چینی اور اضطراب تھا۔ فوراً دربار برخاست کیا اور تخلیہ کیا۔ تو تخلیئے میں ایک حضرت دانیال علیہ السلام، بادشاہ اور وہ جیلر، تاکہ اگر بات سچی ہو تو جیلر کی عزت افزائی کی جائے اور اگر غلط ہو تو پہلے اس کی گردن ناپی جائے اس نے آ کر جھوٹ بولا۔

بخت نصر نے کہا کہ سب سے پہلے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میرے دربار کا قاعدہ یہ ہے کہ جو درباری آتا ہے وہ مجھے سجدہ کرتا ہے، آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ آپ نے اپنے مذہب اور طریق کے مطابق مجھے سلام کہا۔ لیکن میرے دربار کا قانون سجدہ کرنا ہے، آپ نے کیوں نہ کیا؟

انبیاء علیہم السلام کامل العقل بھی ہوتے ہیں...... حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر ہیں اور پیغمبر جیسے عارف کامل ہوتے ہیں، عالم کامل، عاقل کامل بھی ہوتے ہیں، پیغمبر کی عقل اتنی بلند ہوتی ہے کہ ساری امت کی عقلیں ملا کے جمع کی جائیں تو بھی پیغمبر کی عقل زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک کے سلسلے میں کتابیں لکھی گئی ہیں، آپ کی عقلمندی کے واقعات جمع کئے گئے، اس لئے کہ آپ سید الانبیاء، نبیوں کے بھی سردار ہیں جن کی نبوت سب سے بڑی، ان کی عقل بھی سب سے بڑی۔ تو تمام انبیاء علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک زیادہ ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری امتوں کے عقلاء اور حکماء جمع ہوں ان سب سے تنہا ذات نبوی کی عقل فائق ہے۔ اس لئے آپؐ نے بہت سے فیصلے وحی اترنے سے پہلے اپنی عقل مبارک سے فرمائے ہیں۔

حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے اتنا ستاتا ہے کہ اس نے میری زندگی تلخ کر دی۔ میں نے خوشامدیں کر لیں، سب کچھ کر لیا، مگر ایسا موذی ہے کہ رات دن مجھے ایذا پہنچاتا ہے۔ یا رسول اللہ میں کیا کروں، میں تو عاجز آ گیا۔ فرمایا میں تدبیر بتلاتا ہوں، وہ یہ کہ سارا سامان گھر سے نکال کے سڑک پہ رکھ دے اور سامان کے اوپر بیٹھ جا، اور جو آ کے پوچھے کہ بھائی گھر کے ہوتے ہوئے سڑک پر کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ کہنا کہ پڑوسی ستاتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے کہا ہے کہ بھائی گھر چھوڑ دو، اس واسطے میں نے گھر چھوڑ دیا۔ چنانچہ لوگ آئے۔ پوچھا کہ بھئی! گھر کیوں چھوڑ دیا؟ گھر موجود ہے، سامان یہاں کیوں ہے؟ اس نے کہا کہ جی کیا کروں، پڑوسی نے ستانے میں انتہا کر دی، اللہ کے رسولؐ نے کہا کہ بھئی گھر چھوڑ دے۔ تو جو سنے وہ کہے لعنت اس پڑوسی کے اوپر، جو آ رہا ہے، واقعہ سن رہا ہے، لعنت لعنت کرتا ہے۔ مدینہ میں صبح سے شام تک ہزاروں لعنتیں اس پر ہوئیں۔ لعنتوں کی تسبیح پڑھی جانے لگی۔

وہ پڑوسی موذی عاجز آیا۔ اس نے آ کے ہاتھ جوڑے اور کہا خدا کے واسطے گھر چل، میری تو زندگی تباہ و برباد ہو گئی، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر اب کبھی نہیں ستاؤں گا، بلکہ تیری خدمت کروں گا۔ اب انہوں نے نخرے کرنے شروع کر دیئے کہ بتا پھر تو نہیں ستائے گا، اس نے کہا حلف اٹھاتا ہوں کبھی نہیں ستاؤں گا۔ تو اسے گھر میں لایا سارا سامان خود رکھا اور روزانہ ایذا پہنچانے کی بجائے خدمت شروع کر دی۔ تو تدبیر کارگر ہوئی حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے یہ تدبیر عقل سے بتلائی تھی۔ وحی کے ذریعہ سے نہیں۔

تو پیغمبر عقلمند بھی اتنے ہوتے ہیں کہ ان کی عقل کے سامنے دنیا کی عقل گرد ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل اللہ سے تعلق قوی ہونے کا نام ہے، اللہ سے تعلق ہوگا تو دل کا راستہ سیدھا سیدھا ہوگا۔ عقلمندی یہی ہے کہ اخیر تک کی بات آدمی کو سیدھی نظر آ جائے۔ وہ بغیر تعلق مع اللہ کے نہیں ہوتی، تعلق اللہ سے [illegible] ہے، پھر آدمی عقل مند بنے، وہ عقل نہیں چالاکی وعیاری ہوتی ہے۔ عیاری اور چیز ہے، عقلمندی اور چیز ہے، چالاکی میں دھوکہ دہی ہوتی ہے۔ دھوکہ دہی سے اپنی غرض پوری کی جاتی ہے۔ عقل میں کسی کو دھوکہ نہیں دیا جاتا، سیدھی بات تدبیر سے انجام دی جاتی ہے تو انبیاء علیہم السلام کی نسبت اللہ سے کس کا تعلق زیادہ مضبوط ہو سکتا ہے؟ تو ان سے زیادہ عقل بھی کس کی کامل ہو سکتی ہے؟

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا کہ جب غزوۂ بدر ہوا تو غزوۂ بدر میں کفار کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمان تین سو تیرہ تھے، مگر مسلمانوں کو معلوم نہیں تھا کہ دشمن کی تعداد کتنی ہے۔ جب جنگ کے لئے گئے اس وقت پتہ نہیں تھا بعد میں پتہ چلا۔ تو مشرکین مکہ یعنی دشمن کے کیمپ سے کوئی آدمی راستہ بھول کر صحابہ کے لشکر میں آ نکلا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے پکڑ لیا اور کہا، بتا تمہارے لشکر کی تعداد کتنی ہے؟ ٹوہ ہوتی ہے کہ بھئی دشمن کی تعداد، سامان اور طاقت کتنی ہے؟ اس کا اندازہ ہو جائے۔ صحابہؓ نے اس سے پوچھا۔ وہ ہوشیار اور اپنے لشکر کا خیر خواہ تھا۔ اس نے تعداد نہیں بتلائی یوں کہا کہ وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ خدا کی قسم بڑی بھاری جمعیت اور بڑا جتھہ ہے۔

صحابہ کرام نے اسے ستانا شروع کیا، مارا، ڈانٹا، ڈپٹا۔ غرض صحابہؓ نے ساری تدبیریں کر لیں، مگر وہ بول کے نہیں دیا۔ یوں کہتا رہا کہ وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ۔

یہ جو آوازیں اٹھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمے سے نکلے۔ فرمایا، یہ شور کیسا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی آ پھنسا ہے۔ صحابہ اس سے لشکر کی تعداد معلوم کرنا چاہتے ہیں تاکہ دشمن کی قوت کا پتہ چل جائے۔ وہ بتاتا نہیں۔

فرمایا چھوڑ دو، کیوں پریشان کرتے ہو اسے یہاں لاؤ۔ وہ آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ یہ نہیں کہ کہ تعداد کتنی ہے۔ فرمایا، تمہارے لشکر میں گوشت تو ہوتا ہوگا؟ اس نے کہا جی ہاں روز ہوتا ہے۔ فرمایا کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ اس نے کہا دس فرمایا بس معلوم ہو گیا ایک ہزار آدمی ہے۔ اس لئے کہ ایک اونٹ میں سو آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ منٹ بھر میں پتا چلا لیا کہ ایک ہزار کی تعداد ہے۔ تو سارے صحابہؓ عاجز آ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پل بھر میں اس سے بات نکالی یہ وحیؑ سے نہیں بلکہ عقل سے پتہ چلایا۔

تو انبیاء علیہم السلام کا جیسے علم اور دین کامل ہوتا ہے۔ ایسے ہی ان کی عقل کامل ہوتی ہے۔ کوئی عقلمند ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور انہی کی عقل کے اوپر علم کی وحی اترتی ہے۔ اگر عقل کامل نہ ہو تو وہ اتنا علم کیسے برداشت کر سکتے ہیں، کسی

استاد کے سامنے دو طالب علم ہوں ایک عقلمند ہو اور ایک بیوقوف ہو۔ استاذ دونوں کے سامنے ایک تقریر کرے گا۔ عقلمند تو اس سے دوگنا علم لے کے جائے گا اور بے وقوف کو جتنا پہلے سے تھا، اسے بھی کھو کر جائے گا تو عقل کے بقدر آدمی علم قبول کرتا ہے تو انبیاء کی عقلیں اگر غالب نہ ہوں تو اللہ کا اتنا بڑا علم ان کے قلوب کے اندر کیسے کھپ سکتا تھا۔ شریعت کا عمل ان کی طبیعت کے اوپر اترتا ہے اور علم ان کی عقل کے اوپر اترتا ہے۔ اس لئے علم بھی چوگنا ہوتا ہے جیسے عقل چوگنی، عمل بھی مضبوط ہوتا ہے کیونکہ سچا عمل ان کی طبیعت کا تقاضا ہے، پیغمبر کی طبیعت برائی کی طرف نہیں جاسکتی تو طبیعت پر شریعت اور عقل پر وحی اترتی ہے۔ اس لئے علم بھی کامل اور دین وعمل بھی کامل ہوتا ہے۔

میں حضرت دانیال علیہ السلام کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ بخت نصر نے سوال کیا کہ آپ نے میرے قانون کے مطابق مجھے سجدہ کیوں نہ کیا؟ تو دانیال پیغمبر ہیں، جیسے عامل کامل ہیں، عاقل بھی کامل ہیں۔ سبحان اللہ! کیا جواب دیا۔ فرمایا میں نے قصداً سجدہ نہیں کیا، اس لئے کہ سجدہ نہ کرنے میں میرا بھی نفع تھا، تیرا بھی نفع، اگر میں سجدہ کرلیتا تو تو بھی مارا جاتا اور میں بھی مارا جاتا؟ اس نے کہا یہ کیا بات ہے، سجدہ کرنے میں میری عزت تھی میں کیسے مارا جاتا؟ فرمایا اس کی وجہ ہے، وہ یہ کہ ایک میرا رب ہے اس نے مجھے علم دے رکھا ہے۔ یعنی بات تدبیر سے کی اور کتنی سچی اور سیدھی۔ تو اس نے مجھے علم دیا اور تیرا خواب بھی مجھے بتایا میرے ذہن میں جو تیرا خواب ہے۔ وہ میرا ذاتی علم نہیں وہ میرے رب کا بتلایا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ کہیں وہ کہے کہ یہ تو پیغمبر ہیں اور مجھے تبلیغ کرنے آ [illegible] تو اگر میں تجھے سجدہ کرلیتا وہ مجھ سے خفا ہو جاتا۔ میرا علم مجھ سے چھین لیتا تو میں تو یوں گیا جب علم ہی ختم ہوگیا، میری حیثیت عرفی ختم ہوگئی اور میرے سوا تجھے خواب بتانے والا کوئی نہیں تو تو الجھن میں گرفتار رہتا تو بھی مارا جاتا۔ اس لئے میں نے سجدہ نہیں کیا تاکہ میرا علم باقی رہے اور میں تجھے خواب بتاسکوں میں بھی محفوظ رہوں تو بھی محفوظ رہے۔

اس نے ہاتھ چومے اور کہا میں نے دنیا میں اتنا دانشمند آدمی نہیں دیکھا جتنا کہ آپ ہیں اور اپنے رب کا ایسا خادم میں نے نہیں دیکھا کہ غائبانہ بھی اپنے رب کی خدمت کرے۔ تیرا رب یہاں میرے سامنے ہے نہ تیرے سامنے اس کے باوجود تو اپنے رب کی اتنی عظمت کرتا ہے میرا تو یہ حال ہے کہ جب تک میرا رب سامنے نہیں آتا پیٹھ پیچھے تو میں بھی اس کو گالیاں دیتا رہتا ہوں۔ برا بھلا کہتا ہوں سامنے آتا ہے تو ڈرتا ہوں، مگر حقیقی معنیٰ میں عابد تو ہے کہ تیری آنکھوں کے سامنے رب نہیں ہے، اس کے باوجود تیرے دل میں عظمت موجود تو تیرے سے زیادہ عقلمند اور تیرے سے زیادہ امانت دار بھی میں نے نہیں دیکھا' تو کیا واقعی تجھے میرا خواب معلوم ہے؟ فرمایا، ہاں واقعی مجھے تیرا خواب معلوم ہے۔ اس نے کہا، میرے دل میں بے چینی ہے بس جلدی بتلا۔ میں تو گھٹن میں مبتلا ہوں۔

بخت نصر کا خواب...... فرمایا کہ: سن تو نے خواب یہ دیکھا کہ آسمان اور زمین کے درمیان میں ایک عظیم الشان بت ہے جس کا سر آسمان پر اور پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک مونڈھا مشرق میں ہے ایک مغرب میں۔

پوری فضا اس سے گھری ہوئی ہے تو اس کو حیرانی سے دیکھ رہا ہے کہ کتنا خوبصورت بنایا گیا ہے اور بنانے والا کیسا کاریگر ہے، اتنا بڑا بت کہ زمین وآسمان کے درمیان ساری فضا گھیرے ہوئے ہے۔

پھر اس بت کی شان یہ ہے کہ چہرہ تو اس کا سونے کا ہے اور سینہ چاندی کا اور پیٹ پیتل کا ہے، رانیں تانبے کی ہیں اور پنڈلیاں لوہے اور سیسے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ ہر دھات الگ الگ چمک رہی ہے سونا سب سے زیادہ باقیمت ہے وہ اوپر ہے، چاندی اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، پیتل اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، تانبا اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے ہے، لوہا اس سے کم قیمت ہے وہ اس سے نیچے اور مٹی کی کوئی قیمت نہیں تو وہ قدم بنی ہوئی ہے ہر دھات اپنی اپنی جگہ چمک رہی ہے۔

تو ابھی اسی حیرت میں ہی تھا، تو نے دوسری بات یہ دیکھی کہ آسمان سے پتھر گرا اور اس زور سے اس بت کے سر پر آکر پڑا کہ بت چکنا چور ہو گیا۔ صرف یہی نہیں کہ ٹوٹ گیا بلکہ اوپر سے لے کر نیچے تک ریت کی طرح گر گیا اور وہ جتنی دھاتیں تھیں سب مل کر یک جان ہو گئیں۔ نہ سونا سونا رہا، نہ چاندی چاندی سب گڈمڈ ہو کر ایک ذات بن گئے۔ اب اس ذات میں سب کی تھوڑی تھوڑی چمک تھی مگر الگ الگ نمایاں نہیں تو اس سے اور زیادہ حیرت میں ہے کہ یہ پتھر کیا ہے؟ کہ ایک ضرب میں اس نے سارے بت کو توڑ دیا اور محض ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا بلکہ پیس کر ایک ذات کر دیا ابھی تو دوسری حیرت میں تھا تو تو نے یہ دیکھا کہ وہ فضا جو بت سے خالی ہو گئی۔ اب وہ پتھر پھیلنا شروع ہوا پھیلتے پھیلتے وہ ساری فضا میں پھیل گیا جہاں تک وہ بت پھیلا ہوا تھا وہ پتھر پھیل گیا۔ اس پر تیری آنکھ کھل گئی۔ اس نے کہا میں اپنے رب کی قسم کھاتا ہوں، میرا خواب یہی تھا۔ تو نے بیان کرنے میں ذرہ برابر کمی کی، نہ زیادتی کی۔ ہو بہو یہی واقعہ ہے اور یہی میرے قلب کی حیرت کی کیفیت تھی جو تو نے کھول دی۔

حضرت دانیال علیہ السلام سے تعبیر...... پھر کہنے لگا کہ خدا کے لئے تعبیر جلدی بتا، میں تو مضطرب اور بے چین ہوں۔ فرمایا سن یہ جو تو نے بت دیکھا یہ دنیا کی قومیتیں ہیں۔ سب سے اوپر جو سونا دیکھا وہ تیری عراقی قوم ہے جس میں سب سے پہلے دنیا کا تمدن آیا۔ تمدن کے متعلق مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ سب سے پہلی متمدن قوم عراق کی ہے۔ بغداد سے تمدن شروع ہوا ہے تو یہ تیری قوم سے جو اعلیٰ ترین تمدن لئے ہوئے ہے اور سونے کی طرح چمک رہی ہے تیرے گزرنے کے بعد دوسری قوم آئے گی۔ وہ تیرے بیٹے کی ہوگی وہ چاندی کی طرح سے ہوگی گویا اس کا رتبہ گھٹ جائے گا اور یہ جو تو نے پیتل دیکھا ہے یہ زرد رنگ کی قومیں ہیں جیسے چینی جاپانی ہوتے ہیں کہ انکے چہروں کی رنگتیں زرد ہوتی ہیں اور یہ جو تو نے تانبا دیکھا، یہ سرخ رنگ کی اقوام ہیں۔ جیسے عربی حجازی اور شامی، ان کے چہرے سرخی مائل ہوتے ہیں اور جو یہ تو نے لوہا دیکھا یہ کالی قومیں ہیں جیسے تتر ونی اور حبشی، یہ جو تو نے قدموں میں مٹی دیکھی یہ دو ملکائیں پیدا ہوں گی، دو عورتیں بادشاہ بنیں گی۔ جو بہت کمزور حالت میں ہوں گی۔ ان کی قوم کو کمزور دکھایا گیا۔ دنیا انہیں نیچ سمجھے گی۔ تو تیری قوم سب سے زیادہ اونچی اور مٹی کی، یہ قوم سب سے زیادہ نیچی

جنہیں سب نے پامال کیا ہوگا، اور باقی دوسری قومیں درجہ بدرجہ فرق مراتب میں ہیں۔ تو تو نے یہ دیکھا کہ دنیا کہ قومیتوں کی اونچ نیچ ہے۔ کوئی قوم کہتی تھی کہ میں سونا ہوں، کوئی کہتی تھی میں چاندی ہوں وغیرہ، تو دنیا میں اونچ نیچ، قومیت اور برتری پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر والی قوم نیچے والی قوم کو حقیر جانتی تھی۔ دنیا میں حقارت اور کبر ونخوت کا دور دورہ تھا۔ کوئی کہتی تھی کہ ہم برماجی کے منہ سے نکلی ہوئی قوم ہیں، ہم برہمن ہیں، ہمارا مقام اونچا ہے، یہ جو اچھوت اقوام ہیں یہ نیچی ہیں یہ برماجی کے قدموں سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ ہمیشہ ذلیل ہونے ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں تو اونچ نیچ میں دنیا گرفتار تھی اور قومیتیں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح چمک رہی تھیں کہ اچانک پتھر گرا۔ یہ پتھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین تھا۔ یہ دین اسلام تھا جس نے آ کر دنیا کی قومیتوں کے اوپر ضرب لگائی اور اس درجہ پامال کر دیا کہ اونچ نیچ یکساں ہو کر سب گڈمڈ ہو گیا۔ نہ سونا سونا نظر آیا نہ چاندی چاندی، خلط ملط ہو کر دنیا میں یکسانیت اور مساوات پیدا ہو گئی اور قانونی طور پر مساوات دنیا میں پھیل گئی۔

اس کے بعد تو نے دیکھا کہ وہ پتھر پھیلنا شروع ہوا۔ یہ اس دین کا انجام ہے کہ انجام کار دنیا کے آخری حصے میں یہی دین پورے عالم میں پھیل کر رہے گا اور پوری دنیا اسی کے اوپر آئے گی۔ جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ تو جذبات عالمگیری کی طرف جا رہے ہیں کہ سب قومیں ایک پلیٹ فارم کے اوپر آئیں۔ سب کا مسلک اور نصب العین ایک ہو تو یکسانی، مساوات اور وحدت اقوام ہو۔ تو یہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے جو انجام کار پورے عالم میں پھیل کر رہے گا۔ یہ تیرے خواب کی تعبیر ہے۔

علم نبوّت کی وجہ سے بنی اسرائیل کو دوبارہ عروج ملا...... اس نے ہاتھ چومے اور کہا کہ میں نے دنیا میں نہ اتنا دانشمند دیکھا نہ اتنا عارف کامل دیکھا اور آج سے میں نے حکم جاری کر دیا کہ میری سلطنت کا کوئی کام تیرے مشورے کے بغیر نہ ہو، وزارت کا قلمدان تیرے ہاتھ میں ہو، میرا بھی کوئی حکم اس وقت تک نہیں چلے گا جب تک تو اس پر صادر نہ کرے گا، اس لئے کہ میں نے آج تک ایسی کامل عقل نہیں دیکھی۔ چنانچہ حضرت دانیال علیہ السلام عملی طور پر خود بادشاہ ہو گئے جس سے واضح ہوتا ہے کہ دنیا میں برتری دلانے والی طاقت علم کی طاقت ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے پاس نہ دولت نہ حشمت نہ کروفر تھا، وحی کا علم تھا۔ اس علم سے وہ برتری پھیلی کہ دنیا کے بڑی سے بڑی قوم ان کے سامنے پست ہو گئی اور قلمدان وزارت ان کے ہاتھ میں آ گیا۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم　　　قلم کش را بدولت می رسانم

قلم کہتا ہے کہ میں دنیا کا اصل بادشاہ ہوں جو قلم چلاتا ہے میں اس کو بڑی بڑی حکومتوں پر اور بڑی بڑی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہوں۔ تو جس قوم نے دنیا میں برتری حاصل کی وہ محض صورت اور خوبصورتی سے نہیں ہوتی بلکہ خوبصورتی فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ علم فتنوں کے مٹانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

محض حسن صورت فتنہ کا پیشہ خیمہ ہے...... حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ حسین دنیا میں کوئی نہیں گزرا

حدیث میں فرمایا گیا ہے ’’فَاِذَا قَدْ اُعْطِیَ شَطْرُ الْحُسْنِ‘‘ ① دنیا میں جب اللہ نے حسن پیدا کیا، تو آدھا حسن و جمال پوری دنیا کو دیا اور آدھا حسن و جمال تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا۔ زنان مصر نے جب یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال دیکھا، تو یک زبان ہو کر کہا تھا کہ ﴿وَاللّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا. اِنْ هٰذَآ اِلَّامَلَکٌ کَرِیْمٌ﴾ ② یہ کوئی بشر نہیں یہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے جو آسمان سے اتر آیا ہے۔ گویا ان کا حسن و جمال یہ ہے کہ قرآن بھی شہادت دے رہا ہے۔ اور حدیث بھی شہادت دے رہی ہے لیکن جتنی مصیبتیں اور فتنے یوسف علیہ السلام پر آئے، حسن صورت کی بدولت آئے۔ کنعان کے کنویں میں بھائیوں نے حسد کر کے ڈالا۔ انہیں ان کی خوبصورتی پر حسد تھا، قافلہ نے نکالا اور مصر کے بازار میں غلام بنا کے بیچے گئے۔ حسن صورت نے غلام بنوایا بیگمات مصر میں سے زلیخا عاشق ہوگی جو بادشاہ مصر کی بیوی تھی اس نے برا ارادہ کیا، پیغمبری کی وجہ سے بچے مگر اس نے جیل خانے میں ڈالا تو خوبصورتی کی بدولت نو برس جیل بھگتی، تو غلامی، جیل خانہ اور کنویں میں ڈالا جانا، یہ ساری مصیبتیں خوبصورتی کی بدولت آئیں اور مصر کی بادشاہت لینے کا وقت آیا۔ تو کیا فرمایا؟ ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ③ اگر ملک سنبھالنا ہے اور ملک کا نظم درست کرنا ہے تو ملک کی کنجیاں میرے سپرد کرو۔ میں انتظام کر کے دکھلاؤں گا کیوں؟ یہ نہیں فرمایا کہ اِنِّیْ حَسِیْنٌ جَمِیْلٌ میں بڑا خوبصورت ہوں، بڑی عمدہ سلطنت چلاؤں گا۔ یہ فرمایا ﴿اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ④ میرے اندر علم ہے اور حفظ کا مادہ موجود ہے۔ تو فتنہ کا وقت آیا تو صورت کی خوبی آگے بڑھی اور سلطنت لینے کا وقت آیا تو علم اور کمال آگے بڑھا۔ دنیا میں فرد ہو یا قوم، اسے ترقی علم کی بدولت ہوتی ہے۔ حسن صورت، ظاہری آرائش اور جمال کی وجہ سے آدمی نہیں بڑھتا۔

جہالت تمام برائیوں کی جامع ہے...... یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بعثت ہوتی ہے تو آپ سے پہلے کا زمانہ سب سے برا زمانہ ہے۔ تاریخ میں موجود ہے کہ آپ کی بعثت سے پہلے عرب میں کوئی برائی ایسی نہ تھی جو موجود نہ تھی۔ بدکاری، بداعتقادی، بدعملی اور قساوت قلبی وغیرہ ان میں تھی۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں ذبح کر دیتے تھے۔ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے ان کے دل میں کوئی رحم نہیں آتا تھا۔ ڈکیتی ان کا رات دن کا شیوہ تھا۔ لڑائی جھگڑے اور فتنے رات دن کا قصہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر دو خاندانوں میں جنگ شروع ہوتی جن دو میں لڑائی ہوتی تھی۔ جب وہ مرتے تھے وصیت کر کے جاتے تھے کہ لڑائی مت بند کرنا، کہیں خاندان کی ناک کٹ جائے۔ تو خاندان کی ناک کٹنے کی وجہ سے پچاس پچاس برس تک جنگ جاری رہتی تھی لڑنے، بدعملی اور بداعتقادی سے انہیں عار نہیں تھا۔ شرک انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ تین سو ساٹھ بت خانہ کعبہ کے اردگرد مطاف میں رکھے ہوئے تھے۔ تو تین سو ساٹھ بتوں کی تو وہاں عبادت

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ ......، ج: ۱ ص: ۱۴۶ رقم: ۱۶۲۔

② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱. ③ ④ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

ہوتی تھی کُناف اور نائلہ کے دو بت بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے تھے، وہاں ان کی عبادت ہوتی تھی۔ گھر آتے تھے تو ہر خاندان اور قبیلہ کا بت الگ تھا۔ ایک خاندان کو عار آتا تھا کہ میں اس کے بت کو کیسے پوج لوں۔ یہ چھوٹا خاندان ہے میرا خاندان بڑا ہے، تو اس کا بت چھوٹا، میرا بت بڑا تو تعصبات چلتے تھے اور خاندانوں کے بت الگ تھے۔ پھر گھر گھر میں الگ الگ بت تھے۔ ایک گھر والا دوسرے گھر والے کی طرف رجوع نہیں کرتا تھا کہ میرا خدا میرے گھر میں موجود ہے میں اس کے گھر کی طرف کیوں رجوع کروں؟ پھر ہر شخص کا خدا الگ تھا۔ پھر ہر شخص کے سفر کا الگ اور حضر کا الگ خدا تھا۔ پھر ایک شخص سفر کرتا تھا تو خدا کو جیب میں ڈال کے لے جاتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہاں نہ ملے، تو عبادت و پوجا کس کی کروں گا؟ وہاں پہاڑ پہ بیٹھ کے عبادت شروع کی اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، اتفاق سے نظر پڑی کہ میرے سامنے جو پتھر ہے اس سے زیادہ خوبصورت وہ پڑا ہوا ہے اسے پھینک دیا، اسے اٹھا کے آگے رکھ لیا، اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے شروع کر دیئے جیسے ایک بیوی تھی اسے طلاق دیدی۔ دوسری کر لی۔ یہ حالت خداؤں کی کر رکھی تھی کہ عابدوں کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی خداؤں اور معبودوں کی تھی۔ تو یہ کیفیت تھی کہ شرک انتہائی، بدعملی، بداعتقادی اور بے رحمی انتہائی سارے برے اخلاق جمع ہو گئے تھے۔ لیکن اس زمانے کا جو نام رکھا گیا تو یہ نہیں رکھا گیا کہ زمانہ بدکاری، زمانہ قتل و غارت، زمانہ ڈکیتی اس کا نام زمانہ جاہلیت رکھا گیا جس سے بتلانا ہے کہ ساری برائیوں کا سرچشمہ جہالت ہے اگر وہ زمانہ جاہلیت نہ ہوتا۔ یہ بدکاریاں بھی نمایاں نہ ہوتیں ہر بدکاری الگ الگ ہے اور سب کی جامع جہالت ہے جس سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

علم تمام کمالات کا سرچشمہ ہے...... اس زمانے کے خلاف جب اللہ نے اپنے آخری پیغمبر کو بھیجا اور آپ نور لے کر آئے تو سب سے پہلی آیت قرآن کریم کی کیا اتری؟ ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾ (۱) پڑھو، یعنی جہالت دور کرو۔ اگر یہ چیز تمہیں رفع کرنی ہے، دنیا کی قومیں عربوں کو ذلیل وحقیر جانتی تھی۔ اگر یہ ذلت اور حقارت اپنی قوم سے مٹانی ہے۔ تو وہ جہالت سے آئی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ اِقْرَاْ پڑھو اور پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ ہو جاؤ، جہالت کے جب یہ کرشمے تھے تو علم کا یہ کرشمہ ہوگا کہ ذلت کی بجائے عزت آئے گی۔ برائی کی جگہ بھلائی آئے گی۔ غلط اعتقاد کی بجائے صحیح اعتقاد آئیں گے، بدعملی کی بجائے صحیح عمل آئیں گے۔ شرک کی بجائے توحید پیدا ہوگی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جن جن سعادت مند قلوب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو سنا اور مانا اور قرآن کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی۔ تو وہی زمانہ جس کا نام زمانہ جاہلیت تھا۔ اس کا نام خیر القرون ہوا کہ سب زمانوں میں بہترین زمانہ جن لوگوں کا نام جہلائے مکہ تھا، ان کا نام صحابہ کرامؓ ہوا، جن کا نام لے کر قوموں میں لعنت بھیجی جاتی تھی ان کا نام لے کر اب رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کہا جاتا ہے، اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی جن کی ذلت کا یہ عالم تھا کہ قومیں ان کو کہتی تھی کہ چرواہے، مینگنیوں میں کھیلنے والے، گندگیوں میں بسر کرنے والے،

---

(۱) پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۔

اب ان کا لقب عارفین کاملین ہوا، صفائی ستھرائی ان میں، طہارت وعبادت ان میں، ذہانت وکمالات ان میں۔ بالکل زمانہ لوٹ گیا کہ یا بدتھا یا بہتر ہوگیا۔ یا جہالت کا تھا یا علم کا ہوگیا۔ یہ قرآنی تعلیم کی بدولت تھا، تو پہلی آیت قرآن کریم کی یہی نازل ہوئی کہ اِقْرَاْ جس سے واضح ہے کہ جب کوئی قوم ذلت میں گرفتار ہو جائے پریشانیوں میں مبتلا ہو اس کا علاج یہ ہے کہ علم کے ذریعے پہلے اپنے اخلاق اور اعمال درست کرے۔ چاہے اس میں کچھ مدت لگے لیکن انجام جبھی صحیح نکلے گا جب یہ ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ برس تک تعلیم دی مکہ میں تیرہ برس کی زندگی کیسی تھی؟ مسلمان انتہائی کمزور، کھانے کی نہیں، پینے کو نہیں، شوکت ان کے ہاتھ میں نہیں، تعداد ندارد، ہر چیز کے محتاج، حتیٰ کہ مارے پیٹے جاتے تھے۔ صحابہؓ پر زیادتیاں، بدگوئیاں اور گالم گلوچ ہوتی تھی حکم یہ تھا کہ صبر کرو، تحمل کرو۔

مگر صبر وتحمل کے معنی یہ نہیں کہ پٹتے رہو۔ یہ بزدلی ہے۔ اسلام نے بزدلی نہیں سکھلائی۔ اسلام اور بزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے محض پٹتے رہنا۔ یہ بزدلی تھی۔ تو جہاں یہ حکم آیا کہ پٹتے رہو، مار کھاتے رہو۔ مگر ساتھ میں حملہ بھی کرو اور حملہ کیا۔ ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ① کلمۂ حق کا اعلان کرتے رہو۔ اللہ کی طرف دعوت دیتے رہو، اللہ کی طرف بلاتے رہو، ماریں تو پٹتے رہو۔ برا بھلا کہیں، سنتے رہو، قتل کریں، مقتول ہو جاؤ۔ مگر کلمہ حق کی تبلیغ و دعوت مت چھوڑو۔ تو فقط پٹنا نہیں بتلایا بلکہ حملہ بھی بتلایا۔ مگر یہ حملہ تلوار، لاٹھی اور ہاتھ پیر سے نہیں حملہ زبان اور کلمہ حق کے ذریعے سے تھا۔

اس کے جواب میں تو تلوار چلتی تھی۔ اگر صحابہ کلمۂ حق بلند نہ کرتے، تو وہ خاندانی لوگ تھے سب آپس میں رشتہ دار تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف کون کھڑا ہوتا؟ یہ جو حملہ ہوتا تھا یہ ان کے حملہ کے جواب میں ہوتا تھا۔ مگر یہ حملہ کلمہ حق سے کرتے وہ ہاتھ سے کرتے تھے، اس لئے کہ اِدھر علم تھا اور علم والا سچی بات سے حملہ کرتا ہے جاہل ہاتھ سے جواب دیتا ہے اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تو لڑائی جاری تھی مگر اُدھر سے حملہ علم کے راستے سے اور اِدھر سے جہالت کے راستے سے ہوتا تھا۔ اس راستے میں فرمایا گیا کہ مار کھاؤ پٹو، کوئی پرواہ مت کرو۔ جواب بھی مت دو آیتیں جو نازل ہوتی تھیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا تھا: ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا﴾ ② ﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ③ ''اے نبی صبر جمیل اختیار کر، ان مشرکوں سے اعراض کرو، ان کے برا بھلا کہنے پر مت جاؤ۔ یہ کہتے رہیں، آپؐ اپنا کام کریں''۔ ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ ④ اے نبی! ہم جانتے جب یہ آپ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ تو آپ کا دل گھٹتا ہے، بشری طبیعت کے مطابق کوفت پیدا ہوتی ہے۔ آپ کو رنج

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۵۲. ② پارہ: ۲۹، سورۃ المعارج، الآیۃ: ۵.
③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۶. ④ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۷، ۹۹.

ہوتا ہے لیکن ان بے تمیزوں کو بکنے دو۔ آپ اللہ کی تسبیح و تہلیل اور اس کے ذکر میں لگیں۔ ان کو یہی توفیق ہے کہ یہ برا کہیں۔ آپ کی توفیق یہ ہے کہ آپ کلمات حقہ زبان سے ادا کریں۔ تیرہ برس آپ نے اور صحابہؓ نے اس مصیبت میں گزارے۔ تیرہ برس کے بعد جو زمانہ لوٹا تو جو اقلیت تھی وہ اکثریت بن گئی، جو بے عزت تھے وہ عزت والے بن گئے، جن کے ہاتھ میں شوکت نہیں تھی وہ شوکت والے بن گئے، جو بے زر اور بے کس تھے ان کے ہاتھ میں قیصر و کسریٰ کے خزانے آنے شروع ہو گئے۔ ایک دم انقلاب پیدا ہوا۔

تعمیر باطن سے دنیا میں انقلاب پیدا ہوتا ہے ...... یہ کب ہوا؟ جب پہلے انہوں نے اپنے اندر انقلاب پیدا کیا۔ دنیا میں انقلاب باہر سے نہیں اندر سے چلتا ہے اپنے اندر کی تعمیر کرے، اپنے اخلاق درست کرے، اپنا کیرکٹر سنوارے، دنیا کی قومیں خود اس کے آگے جھک جاتی ہیں۔ ہم اگر برا کردار پیش کریں گے اس کے جواب میں دنیا توہین و تذلیل کرے گی۔ لیکن اگر ہم وقار و متانت و سنجیدگی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کریں گے تو کیا دنیا کے دماغ میں پھوڑا اٹھا ہے کہ پھر بھی خواہ مخواہ بدگوئی کرے؟ اور اگر اس کے باوجود وہ کرے گی تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ اس کا مستحق نہیں ہے، یہ سچا آدمی ہے تو اندورنی اخلاق جب اعلیٰ طریق پر ظاہر ہوتے ہیں تو میں خود جھک جاتی ہیں۔

حدیث قدسی میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''جب کوئی قوم میری نافرمانی کرتی ہے، میرے قانون کو چھوڑ دیتی ہے۔ رات دن گناہوں میں اور معصیتوں میں مبتلا ہوتی ہے تو میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں اس کی عداوت ڈال دیتا ہوں۔ وہ قومیں کھڑی ہوتی ہیں، انہیں سزا دیتی ہیں۔ تلوار اور ہاتھ سے بھی، دولت و شوکت چھیننے سے بھی، وہ میری طرف سے جلاد کے طور پر کام کرتی ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں ہیں میرا حکم چل رہا ہے۔ فرمایا اگر یہ تمہیں ناگوار ہے کہ دنیا کی قومیں تم پر مسلط ہو کر تمہیں تباہ و ذلیل کریں۔ انہیں برا بھلا مت کہو میرے سے معاملہ درست کر لو۔ میں ان کے قلوب میں عداوت کی بجائے محبت ڈال دوں گا۔ وہی قومیں جو تمہارے مدمقابل تھیں وہ سرنگوں ہو جائیں گی۔ قلوب میرے ہاتھ میں ہیں ''اَلْقُلُوْبُ بَيْنَ اِصْبَعَيِ الرَّحْمٰنِ يُصَرِّفُهَا حَيْثُ يَشَآءُ.'' ①
فرماتے ہیں دنیا کے قلوب رحمٰن کی دو انگلیوں کی بیچ میں ہیں۔ جدھر کو چاہیں پلٹ دیں۔

شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے، بڑی کامل اور جامع نصیحت کی ہے۔

گر گزند ت رسد ز خلق مرنج   کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

اگر تمہیں دنیا سے تکلیف پہنچے رنجیدہ مت ہو، اس لئے کہ دنیا کے ہاتھ میں نہ رنج پہنچانا ہے نہ خوشی پہنچانا۔ اگر کوئی تمہاری جائیداد چھیننے کے لئے کھڑا ہو تو اس کے قبضۂ قدرت میں ہے کب؟ وہ تو اللہ کی طرف سے مامور ہے جو کر رہا ہے۔ تو

① السنن للترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن، ج:۸ ص:۲۹ رقم:۲۰۶۶.

گرگز ندت رسد زخلق مرنج — کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست — کہ دل ہر دو در تصرف اوست

دشمن کا خلاف اور دوستوں کی موافقت خدا کی طرف سے سمجھو، اس لئے کہ دل اس کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے کسی کو کسی کا دشمن بنادے، چاہے دوست بنادے، تو بجائے اس کے کہ دوستوں اور دشمنوں کے پیچھے پڑے رہو کہ یہ ہمارا دشمن ہے اس کو کس طرح سے ماریں اور یہ ہمارا دوست ہے اس کو کس طرح سے سر پر اٹھائیں، تم اس سے معاملہ کیوں نہیں درست کرتے کہ دوست دشمن دونوں کے قلوب اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ دوستوں کو پکا دوست بنادے گا۔ دشمنوں کو دوستی کی طرف مائل کر دے گا۔

دنیا میں حقیقی دانشمند اہل اللہ ہیں...... دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ایک ایک سے معاملہ کرو، ایک ایک کی خوشامد کرو، ہزار کی کرو، ایک ذات کی کیوں نہ کرلو کہ سب کی ضرورت ہی نہ پڑے سیدھا سیدھا معاملہ ہے۔

ہارون رشید دربار میں بیٹھا ہوا تھا، اسے جوش آیا تو درباریوں سے خطاب کر کے کہا، آج جس کا جو جی چاہے مانگے میں اس کو وہی دوں گا۔ کسی نے کہا حضور! مجھے دس لاکھ دیدیجئے۔ خزانچی کو حکم دیا، دیدو۔ کسی نے کہا، مجھے فلاں صوبے کی گورنری کا عہدہ دے دیجئے اس نے کہا دے دیا۔ کسی نے کہا مجھے فلاں فلاں قلعہ بخش دیجئے۔ اس نے کہا دیدیا۔ کسی نے کہا مجھے فلاں باغ دیدیجئے اس نے کہا دیدیا۔ غرض جتنے درباری تھے، منہ مانگی مرادیں مانگ رہے ہیں۔

ہارون رشید کی پشت پر باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ ہارون رشید نے اس کی طرف رخ کر کے کہا۔ تو نے کچھ نہیں مانگا، اس نے کہا ان گدھوں کو نمٹ لینے دیجئے۔ اس کے بعد میں مانگوں گی۔ یہ احمق جب نمٹ جائیں گے، جب میں مانگوں گی۔

ہارون رشید نے کہا اچھا! یہ دربار کے سب امراء، وزراء، حکام، یہ سب گدھے اور احمق ہیں؟ اس نے کہا سب گدھے اور احمق ہیں۔ انہیں تمیز تو ہے ہی نہیں۔ ہارون رشید حیران ہوا کہ یہ عورت ذات تو بن گئی عقلمند اور یہ جتنے وزراء ہیں بے وقوف بن گئے، یہ خود احمق معلوم ہوتی ہے کیا تیرے دماغ میں مالیخولیا ہے۔ یہ سب میرے وزراء ہیں اور میرے ملک کا انتظام چلا رہے ہیں خزانوں کے مالک ہیں یہ سارے گدھے ہیں؟

اس نے کہا: حضور! سارے گدھے ہیں، ان میں تمیز نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ ہارون رشید نے بھی یہ سمجھا کہ عورت ذات ہے بکواس کر رہی ہے۔ میں کہاں اس کے منہ آؤں؟ تو اب ہارون نے باندی کی طرف دیکھا اور کہا کیا تو کچھ مانگنا چاہتی ہے؟ اس نے کہا ہاں یہ بے وقوف نمٹ چکے ہیں اب میرا موقع آیا ہے۔ اب میں مانگوں گی۔ ہارون نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے؟ کہا جو میں مانگوں گی دو گے؟ اس نے کہا میرا وعدہ واعلان ہے۔ اس نے ہارون کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا کہ میں تو آپ کو مانگتی ہوں کہ آپ میرے ہو جائیں۔ تو اس نے واقعی عقلمندی کا ثبوت دیا، اس لئے کہ جس نے دس لاکھ مانگے مل گئے اور کچھ نہیں ملا۔ جس نے قلعہ مانگا اس کا کو قلعہ مل گیا باقی کچھ نہیں

ملا۔ عہدہ مانگا، ایک عہدہ مل گیا۔ باقی کچھ نہیں۔

اس نے ہارون رشید کو مانگ لیا کہ جب بادشاہ میرا تو عہدے بھی میرے، قلعے بھی میرے، خزانے بھی میرے، قوم بھی میری۔ تو دانشمندی کی بات یہ تھی کہ اس نے جڑ بنیاد کو پکڑ لیا اور انہوں نے شاخوں کو پکڑا۔ کسی نے پتہ لے لیا۔ کسی نے پھل توڑ لیا۔ اس نے کہا میں درخت ہی پر قبضہ نہ کروں کہ سارے پتے بھی اور سارے پھل بھی میرے ہو جائیں تو حقیقتاً اس باندی نے عورت ہو کر دانشمندی اور عقل کا ثبوت دیا۔

میں کہتا ہوں دنیا میں اہل اللہ حقیقت میں عقلمند ہیں جنہوں نے بجائے اس کہ یہ دولت لیں، وہ دولت لیں، اللہ سے عرض کیا کہ آپ ہمارے ہو جایئے۔ جب آپ ہمارے ہیں تو ساری دنیا ہماری، ساری آخرت ہماری، ساری جنتیں ہماری۔ عرش و کرسی اور لوح قلم ہمارے اور آپ ہمارے نہیں ہیں تو اگر کسی نے دولت لے لی تو چند دن کے بعد ختم ہو جائے گی۔ آگے اس کے لئے کچھ بھی نہیں۔ بڑی سے بڑی دولت حتیٰ کہ ہفت اقلیم کی دولت بھی مل جائے مگر اللہ سے تعلق نہ ہو تو دنیا میں بھی ممکن ہے کہ وہ ختم ہو جائے ورنہ موت تو ختم کر ہی دے گی۔ آخرت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کوئی چیز اس کی قسمت کی نہیں ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ باندی نے عقلمندی دکھلائی۔ اسی طرح اللہ والے عقلمند ہیں جنہوں نے جڑ بنیاد پکڑ رکھی ہے۔ یہی میں عرض کر رہا ہوں کہ بجائے اس کے کہ پچاس ہزار کو راضی کرنے کی کوشش کی جائے، ایک کو کیوں نہ راضی کر لیا جائے کہ وہ سارے پچاس ہزار غلام بنیں۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق بندگی کا ہونا چاہئے...... مگر ساتھ میں یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کو جو راضی کیا جائے اور اس سے جو تعلق رکھا جائے وہ خود غرضی سے نہ رکھا جائے اس وجہ سے اللہ کو راضی کریں کہ میرا گھر بن جائے، میری دولت بڑھ جائے، تو اللہ مقصود نہ ہوا وہ تو گھر دولت مقصود ہو گئی۔ اللہ کو راضی اس لئے کرو کہ حق یہی ہے کہ وہ راضی ہو۔ جب وہ راضی ہو گیا تو سب کچھ مل گیا اور میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ ملے تو آخرت تو مل گئی۔ فرض کرو کہ آخرت بھی نہ ملے۔ اللہ یوں کہہ دے کہ میں راضی ہوں، سب کچھ مل گیا۔ اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں ؎

تو بندگی چوں گدایاں بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

اللہ کی بندگی اور عبادت مزدوروں کی طرح مت کرو کہ صاحب! اجرت ملے گی تو سجدہ کریں گے۔ ذرا کمی ہوئی تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ اپنی مجبوری کی بندگی ہے خدا کی بندگی نہیں ہے۔ اس لئے اللہ کی بندگی کرو کہ وہ راضی ہو جائے ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وہ راضی ہو جائیں گے تو خود سارے خزانے مل جائیں گے۔ مگر خود طمع مت رکھو۔

جب محبوب حقیقی اپنا ہو گیا، جو ساری برکتوں کا سرچشمہ ہے وہ اگر ہمارا ہے تو ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔ تو ایک تو یہ کہ آپ اللہ کی عبادت کریں کہ مجھے دنیا میں فلاں قلعہ، کوٹھی مل جائے۔ یہ بہت ہی کم جذبے کی خواہش ہے اور ایک یہ کہ آپ یوں کہیں کہ چاہے سارے جہاں مجھ سے چھوٹ جائیں مگر میرا اللہ مجھ سے راضی ہو یہ ہے مانگنے

کی چیز اللہ میاں کا امتحان مت لو امتحان تو وہ لے کہ تم نے دعویٰ سچا کیا کہ تم اللہ والے بننا بھی چاہتے ہو یا نہیں؟ تم کون ہوتے ہو قدرت کا امتحان لینے والے؟ وہ امتحان لیں گے تم مفلس اور بندے بن کر ان کے سامنے اپنے کو ڈالدو کہ جو آپ چاہیں گے وہ ہی ہم بھی چاہیں گے۔

کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی پر دونوں جہاں چل رہے ہیں۔لوگوں نے کہا کیا آپ اس درجہ کے ہیں کہ ساری دنیا وآخرت آپ کی مرضی پہ چل رہی ہے؟ فرمایا الحمد اللہ میں اسی درجے کا ہوں۔میری مرضی پر دنیا وآخرت کے سارے واقعات چل رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرمایا، یہ اس طرح سے ہے کہ دونوں جہاں کے واقعات اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے، جو اس کی مرضی ہے وہ میری مرضی ہے تو سارے جہاں کے کارخانے میری مرضی پر چل رہے ہیں۔میری مرضی کے خلاف کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔کوئی پیدا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں الحمد اللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔کوئی مرتا ہے میں کہتا ہوں الحمد اللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔کوئی مرے میں گھٹ کے بیٹھ جاؤں تو میں کوئی خدا سے لڑنے کے لئے جارہا ہوں کہ وہ تو کہیں اس کی موت ہونی چاہئے۔ میں کہوں نہیں صاحب!۔موت نہیں ہونی چاہئے یہ تو غلط بات ہے یہ تو لڑائی ہوگی اللہ میاں سے۔آدمی بندہ بن کے بندگی دکھلائے بندگی کے معنی یہ ہیں کہ اپنی رضا اور خواہش کو فنا کردے۔جو آپ کی مرضی وہی میرے مرضی میں کون ہوں جو آپ کی مرضی کے خلاف کروں؟

ہمارے ہاں پنجاب میں شاہ دولہ ایک بزرگ گزرے ہیں، جمنا کے کنارے پر ایک بستی تھی، اس میں وہ رہتے تھے۔برسات کا زمانہ آیا جمنا کا پانی چڑھا اور پانی چڑھ کر گاؤں کی طرف بڑھا۔تو اس زمانے میں گاؤں میں چہار دیواری بنائی جاتی تھی۔بستیاں گویا قلعہ بند ہوتی تھیں۔تو وہاں ایک مضبوط دیوار تھی جس سے پانی ٹکرا رہا تھا اگر وہ نہ ہوتی تو گاؤں غرق ہو گیا ہوتا۔مگر پانی جو آنا شروع ہوا تو آدھی دیوار تک پہنچ گیا اور اندیشہ ہوا کہ اب ذرا اوپر گیا تو اندر آیا اور بستی غرق ہوئی،لوگ گھبرا کے دوڑتے ہوئے شاہ دولہ کے پاس آئے اور کہا حضرت! دعا کیجئے، دستگیری کیجئے، گاؤں تو تباہ ہوا جمنا چڑھ رہی ہے اور دیوار تقریباً ڈوب چکی گز بھر باقی رہ گئی۔اگر تھوڑا اور پانی آ گیا تو پھر گاؤں کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔فرمایا اچھا پانی زیادہ چڑھ گیا؟ عرض کیا بہت چڑھ گیا۔فرمایا ایک پھاؤڑا اٹھا کے لاؤ (جس سے مزدور مٹی کھودتے ہیں) پھاؤڑا لایا گیا۔شاہ دولہؒ نے اپنے کندھے پہ پھاؤڑا رکھا اور کہا چلو میرے ساتھ لوگ ساتھ آئے بیچارے خوش خوش کہ اب یہ کوئی تدبیر کریں گے۔شاہ دولہؒ نے آتے ہی اس دیوار کو توڑنا شروع کیا جس سے پانی رک رہا تھا۔لوگوں نے عرض کیا، حضرت! یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ تو گاؤں جلدی غرق ہو جائے گا۔اسی نے تو گاؤں بچا رکھا ہے۔فرمایا'' جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ''
نا معقولو! تم مجھے کیا اللہ میاں سے لڑوانے لائے ہو؟ کہ اللہ میاں تو چاہیں یہ بستی غرق ہو اور میں چاہوں غرق

نہ ہو۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ بستی غرق ہو میں بھی چاہتا ہوں کہ بستی غرق ہو۔ جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہؒ۔ تو بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جب منشاء خداوندی سامنے آئے اپنا ارادہ اور رضا فنا کر دے کہ میں تابع حق ہوں۔ حق کے مقابلے پر اپنی مرضی جتلانا، اپنی تجویزیں رکھنا کہ یوں ہونا چاہئے۔ یہ اللہ میاں کو مشورہ دینا ہے۔ جیسے بعض لوگ کہا کرتے ہیں۔ یہ نہایت ہی غلط مقولہ ہے۔ کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو لوگ تعزیت کے خط لکھتے ہیں۔ اس میں لکھا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بے وقت موت پہ مجھے بے حد قلق ہوا۔ اس جاہل سے آدمی پوچھے کہ موت بھی کبھی بے وقت آتی ہے۔ موت کا وقت تو مقرر ہے۔ گویا اس وقت مرنا مناسب نہیں تھا۔ یعنی عیاذ باللہ۔ اللہ میاں ان سے مشورہ کرتے کہ ان صاحب کو اس وقت موت دوں یا نہ دوں؟ اور آپ مشورہ دیتے کہ ابھی موقع نہیں ہے دو چار دن کے بعد دے دیجئے گا۔ بندے کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کوئی لفظ بھی ایسا بولے جس سے معلوم ہو کہ حق تعالیٰ کی رضا اور تقدیر کے مقابلہ میں اس کی کوئی تجویز ہے۔ یہ جو ساری آفتیں آتی ہیں اس لئے آتی ہیں کہ ہم اپنی تجویز کو آگے رکھتے ہیں۔ تقدیر کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور راضی نہیں ہوتے کہ جو اللہ کی تقدیر ہے وہی حق ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک غلام کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی کا کوئی غلام تھا اس سے پوچھا کہ بھئی تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ جو آقا کھلا دے۔ پہنے گا کیا؟ جو آقا پہنا دے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام دیدے۔ اس نے کہا آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا میری اپنی مرضی ہوتی، میں غلام ہی کیوں بنتا۔ آقا ہی نہ ہو جاتا۔ غلام ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ میری رائے بھی غلام، میری مرضی بھی غلام اور میری خواہش بھی غلام۔ جب ایک بندہ، بندہ کا غلام بن کر اتنا فنا ہو جائے کہ اپنی مرضی اور رائے کو بھی چھوڑ دے۔ تو ایک بندہ دعویٰ کرے کہ میں خدا کا غلام ہوں اور پھر اپنی مرضی بھی چلائے۔ یہ اجتماع ضدین ہے۔ بندگی کے معنی ہیں کہ میں فنا ہوں اور تجویز پیش کرنے کے معنی ہیں کہ اللہ میاں مجھ سے مشورہ لے۔ یہ کام کیوں ہوا؟ میری تجویز کے مطابق ہونا چاہئے تھا۔ یہ سخت گستاخی کے الفاظ ہیں۔

مطیع کو سب کچھ اور مدعی کو کچھ نہیں ملتا ...... بندہ کا کام یہ ہے کہ مرضی اور تجویز کو تو چھوڑ دے۔ جو انہوں نے قانون بتلا دیا اس پر عمل کرنا شروع کر دے۔ اطاعت کا ثمرہ یہ ہے کہ اس سے محبت پیدا ہو جائے گی۔ دنیا میں مطیع کو سب کچھ ملا ہے۔ جو طالب ہو اور دعویٰ کرے اسے کبھی نہیں ملتا۔ اطاعت کا راستہ اختیار کرے خود بخود ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کسی سے کہیں کہ صاحب! آپ ہمیں اپنے گھر کے راز بتلا دیجئے وہ کہے گا کہ نامعقول! تم کون ہوتے ہو میرے گھر کے راز پوچھنے والے؟ اور اگر آپ اس کے خادم بن جائیں چند دن کے بعد خود ہی سارے گھر کے راز کہہ دے گا۔

بادشاہ کے دربار میں ایک شخص جائے اور کہے کہ حضور اپنی بیگمات کو میرے سامنے کر دیجئے اور بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں چاندی کتنی اور سونا کتنا ہے؟ وہ کہے گا اس نامعقول کو کان سے پکڑ کے نکال دو یہ ہماری

بیگمات اور خزانے کا نام لے؟ اور یہ ہمارے توشے خانے کا نام لے کہ اس میں لباس کتنے اور ہتھیار کتنے؟ یہ کون بے ادب اور گستاخ ہے۔کان پکڑ کر دربار سے نکال دیا جائے گا۔یہ تو طالب کا انجام ہے جو مانگ رہا تھا۔

اور ایک وہ شخص ہے جو دربار میں آیا۔بادشاہ نے کہا کھڑے ہو جاؤ،اس نے کہا بہت اچھا حضور،کہا بیٹھ جاؤ، اس نے کہا بہت اچھا حضور،غرض جب اطاعت مطلق ہوگی،بادشاہ کہے گا۔بڑا نیاز مند ہے،بڑا مطیع ہے۔تو اعتماد قائم ہوگا۔بادشاہ کہے گا معلوم ہوتا ہے تو مخلص ہے اور نہایت مطیع اور وفادار ہے۔اس واسطے شاہی محلات میں جس وقت تمہارا جی چاہے آ ؤ جاؤ،تم سے کوئی خطرہ نہیں۔اندر جانا شروع ہوا۔بادشاہ نے حکم دیا کہ بیگمات بھی اس سے پردہ چھوڑ دیں۔اس لئے کہ یہ ہمارا خاص آدمی ہے تو بیگمات نے باتیں شروع کیں۔دو برس میں جب نیاز مندی اور اطاعت ظاہر ہوئی۔بادشاہ نے کہا آ ؤ، آج تمہیں خزانے کی سیر کرائیں۔تو شاہی خزانے پر لے گئے۔سونا چاندی اور جواہرات دکھائے۔اس نے اور زیادہ اطاعت شروع کی۔جب ایک برس اور گزرا۔بادشاہ نے کہا اس سے بہتر معتمد علیہ آدمی نہیں۔لو اب تم پر سلطنت کی پالیسی اور راز بھی کھول دیتے ہیں۔

یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ اطاعت کا راستہ اختیار کیا اور پہلے کو دھکے دے کر کیوں نکال دیا گیا؟ اس لئے کہ اطاعت تو تھی نہیں اور خود مطالبہ کیا کہ اپنے اسرار مجھ پر کھول دیجئے۔تو مطالبہ کرنے والے کا جواب کان پکڑ کے نکال دینا ہے اور اطاعت کرنے والے کا جواب یہ ہے کہ خود بادشاہ بلا بلا کر کہے کہ میرے راز معلوم کرو۔ایک مومن کی یہ شان ہونی چاہئے کہ رات دن اطاعت میں سرگرم ہو۔رات دن یہ معلوم کرے کہ جو شریعت اور قانون ہمارے لئے بھیجا گیا ہے۔جب دین و دنیا کی بھلائی کے اس میں وعدے دیئے گئے ہیں۔تو کیوں نہ ہم اللہ کے وعدے پر اطمینان کریں۔معاذ اللہ یہ وعدے غلط بھی ہو سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (1) اللہ ان لوگوں سے وعدہ کرتا ہے۔جو ایمان کو قبول کریں اور عمل صالح کی زندگی اختیار کریں۔ہم انہیں زمین کی طاقت عطا کریں گے۔یہ اللہ کا سچا اور اٹل وعدہ ہے۔کوئی کر کے دکھلائے یقیناً اس کے سامنے وعدہ آئے گا۔کر کے نہ دکھلائے،تجربہ ہی نہ کرے اس کا کوئی علاج نہیں۔اگر ایک طبیب آپ سے یوں کہے کہ بھئی تمہیں زکام ہو رہا ہے۔دہی بھی چھوڑ دو اور دودھ پینا بھی چھوڑ دو۔ملٹھی اور بنفشہ استعمال کرو،اگر وہ طبیب کی اطاعت کرے،استعمال کرے،جبھی زکام جائے گا۔اگر اس نے کہا،بات تو آپ نے سچی کی۔باقی مجھے دودھ دہی سے فرصت نہیں۔میرے گھر پہ تو گائے بھینس بندھی ہوئی ہے۔جب بٹنے کے بٹنے دودھ کے بھرے ہوئے آئیں گے تو کس سے جی رہے گا۔وہ تو پینے ہی کو جی چاہے گا۔کون گل بنفشہ اور ملٹھی کی مصیبت میں پڑے۔میں تو صاحب دودھ پیوں گا۔قانون اپنی جگہ بالکل حق ہے۔

---

(1) پارہ:۱۸،سورۃ النور،الآیۃ:۵۵.

یہی شان اس وقت مسلمانوں کی ہے کہ شریعت کا حکم پیش کیا جائے تو کہتے ہیں کہ بات بالکل سچی ہے۔ حکم سرآنکھوں پر ہے۔ باقی دوکان، جائیداد، مکان اور اپنی عیش سے فرصت نہیں ہے۔ قانون حق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسجد بھی اچھی چیز ہے، نماز بھی اچھی چیز ہے، روزہ، زکوٰۃ اور اطاعت خداوندی بڑی عمدہ چیزیں ہیں مگر کیا کریں کچھ فرصت نہیں ملتی ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد   پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

یہ بات سچی ہے کہ جنت ملے گی۔ اب طبیعت نہ چاہے تو اس کا کیا علاج ہے؟ یہ ہماری مثال ہوگئی کہ سب کچھ جانتے ہیں سب کچھ کہتے ہیں مگر طبیعت کی غلامی اختیار کریں گے، شریعت کی غلامی کی طرف نہیں آئیں گے۔

تو جب طبیب کا کہنا ہی نہ مانے پھر زکام کیسے جائے گا؟ یہ کہنے سے کہ طبیب نے نسخہ سچ اور حق لکھا۔ اس سے زکام نہیں جائے گا۔ اس سچ کو استعمال کرنے سے جائے گا۔ تو شریعت ایک نسخہ ہے آپ اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیں، استعمال نہ کریں۔ بیماری نہیں جائے گی اور ایک تعریف کا کلمہ نہ کہیں۔ اطاعت شعاری سے نسخہ استعمال کرنا شروع کردیں، صحت کے آثار خود بخود آنے شروع ہوں گے۔ آخر ہمارے اور آپ کے بزرگ ہی تھے، ہمیں آج اتنا سکھ نصیب نہیں جتنا ہمارے بزرگوں نے اٹھایا۔ چاہے ان کے پاس اس درجے کے کوٹھی بنگلے نہ ہوں جو ہمارے پاس ہیں۔ مکان سادہ ہوں۔ لیکن مکان کی آرائش سے دل کے سکھ کا کوئی تعلق نہیں، دل کا عیش الگ چیز ہے۔ اصل عیش اور راحت دل کا سکون ہے۔ اگر لاکھوں کروڑوں روپیہ، ہمارے اردگرد جمع ہو اور دل میں گھٹن، بے چینی اور پریشانی ہے۔ معلوم ہوا کہ عیش نہیں ہے اور دن میں چکنی روٹی بھی نہ ملے مگر دل مطمئن ہو کہ کسی کا ہمارے اوپر حق استحقاق نہیں، وہ شخص بادشاہ ہے۔ تو عیش دل کی راحت اور سکون کا نام ہے۔ ہمارے اور آپ کے بزرگوں کو اللہ نے دولت بھی دی تھی اور دل کا سکون بھی دیا تھا۔ جو اطاعت خداوندی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے دولت میں پڑ کے اطاعات کو کھو دیا تو عیش کا سامان تو بہت ہے مگر جسے عیش کہتے ہیں وہ نہیں ہے، قلب میں راحت نہیں ہے بے چینی ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① اللہ کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں۔ دولت بھی جبھی چین بخشتی ہے جب دل کے اندر اللہ کا نام ہو اور یہ نہ ہو تو دولت کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ یہ خود پریشانیوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں افلاطون گزرا ہے۔ آپ نے نام سنا ہوگا۔ ایران کا بڑا طبیب ہے۔ ہم تو یہی سمجھا کرتے تھے کہ یہ ایک حکیم اور فلسفی ہے۔ مگر ایک بڑے محقق عالم شیخ عبدالکریم ہیں، انہوں نے ایک کتاب ''الانسان الکامل'' لکھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ میں افلاطون کی قبر پر گیا۔ تو اس کی قبر کے اوپر انوار و برکات کی بارش ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص مقبولان الٰہی میں سے تھا محض فلسفی نہیں تھا۔ بہر حال

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

افلاطون کا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ایک ہے۔ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تعارف نہیں تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ افلاطون بھی ہے اور افلاطون جانتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ ایک دن اتفاق سے ایک جگہ جمع ہوئے۔ سر راہ ملاقات ہوئی۔ افلاطون چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ کوئی عظیم شخصیت ہے۔ چہرے پر نبوّت کا جلال و جمال اور انوار، دل میں ایمان کی چمک، اس سے وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑا آدمی ہے۔

یہ تو نہیں جانتا تھا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں۔ مگر بہر حال یہ سمجھا کہ یہ کوئی بڑا حکیم ہے۔ بڑی نیاز مندی سے ملاقات کی۔ گفتگو سے واضح ہوا کہ یہ کوئی عالی مقام ذات ہے۔ کہنے لگا برسوں سے میرے ذہن میں ایک سوال ہے جو میرے اندر کھٹک پیدا کرتا ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کے آگے میں نے پیش کیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ آپ کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ آپ ضرور جواب دیں گے علم وفضل آپ کے اندر بھرا ہوا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا سوال ہے؟ بڑا انوکھا اس نے سوال کیا۔ اس نے کہا سوال یہ ہے کہ اگر آسمان کو ہم کمان فرض کر لیں جس سے تیر چلائے جاتے ہیں اور یہ جو مصیبتیں برس رہی ہیں انہیں تیر فرض کر لیں اور اللہ میاں کو تیر چلانے والا فرض کریں تو شکل ایسی بنی کہ آسمان کی کمان سے اللہ میاں مخلوق کے اوپر مصیبتوں کے تیر برسا رہے ہیں تو بچاؤ کی صورت کیا ہے؟ یہ سوال ہے۔

واقعی عقل عاجز ہے، جواب نہیں دے سکتی اس واسطے کہ جب آسمان کمان ہے، تو آسمان کے نیچے سے آپ کہاں چلے جائیں گے؟ زمین کے اوپر آسمان سر پوش کی طرح سے ڈھکا ہوا ہے۔ تو یہ ممکن ہے کہ آپ زمین چھوڑ دیں۔ مگر آسمان کی زد سے تو نہیں جا سکتے۔ عقل جب غور کرے گی تو کہے گی کہ مصیبت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

اور اگر مان بھی لیں کہ آپ کو کوئی راستہ مل گیا کہ آپ آسمان سے نکل کے بھاگ گئے۔ مگر اللہ میاں کی حکومت کے نیچے سے کہیں نہیں جا سکتے؟ کہیں بھی پہنچیں گے اللہ میاں کی حکومت موجود ہے۔ تو جب وہ تیر چلانا چاہیں گے، اس سے بچنا ممکن نہیں۔ جواب سے عقل عاجز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی فلسفی اور حکیم اس کا جواب نہیں دے سکا۔ افلاطون یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی جواب نہیں دے سکیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بچنے کی بڑی آسان صورت ہے۔ بڑے اطمینان سے پل بھر میں آدمی بچ جائے گا۔ افلاطون حیران ہوا کہ سارے حکماء تو عاجز ہو گئے اور ان کے نزدیک بڑا آسان جواب ہے۔ اس نے کہا کیا جواب ہے؟

آپ نے فرمایا جب تیر چلانے والا تیر چلائے، تو اس کے سامنے کی بجائے اس کے پہلو میں آ کر کھڑے ہو جاؤ تیر لگے گا ہی نہیں۔ فرمایا جب اللہ میاں تیر چلائیں تو اللہ میاں کے پہلو میں آ جاؤ اور اللہ میاں کا پہلو ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ جب دل میں یاد بھر جائے گی، اللہ میاں کو اعتماد پیدا ہو جائے گا ہزاروں مصیبتیں برسیں گی قلب میں کوئی تکلیف نہیں پیدا ہوگی اگر مصیبت آئی بھی تو آدمی کہے گا۔

ہر چہ از دوست می رسد نکو ہست

پروردگار نے بھیجی ہے۔ یقیناً اس میں مصلحت ہے۔ میں اس کے اوپر راضی ہوں۔ مصیبت تو مصیبت تب ہی بنتی ہے جب دل اس سے اثر لے اور جب دل خوش ہو کہ مجھے اللہ نے یاد کیا ہے۔ یہ مصیبت تھوڑا ہی ہے یہ تو نعمت ہوگئی۔ ہم بیماری کو، مفلسی کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ یہ مصیبتیں نہیں، مصیبت کے اسباب ہیں۔ مصیبت قلب کی صفت ہے کہ قلب متاثر ہو کے پریشانی کا اثر قبول کرے وہ مصیبت ہے اور اگر مصیبتیں آئیں اور آپ اثر نہ لیں تو آپ مصیبت زدہ نہیں ہیں۔

ایک بزرگ جیل میں چلا جائے اور کہے کہ سبحان اللہ میرے لئے بڑی نعمت ہے۔ اس لئے کہ باہر تو لوگوں کو سر مارنا پڑتا تھا۔ یہاں صبح سے شام تک اللہ اللہ کروں گا اس سے بہتر میرے لئے نعمت کیا ہے؟ اس کے حق میں وہ جیل خانہ مصیبت کب رہا؟

ایک شخص مفلس ہوگیا، وہ کہے الحمد للہ جب دولت تھی تو کہیں حفاظت کی فکر کہیں ڈاکے کا خوف، کہیں گورنمنٹ کے ٹیکسوں کا خوف، یہ ساری مصیبتیں تھیں جو ٹل گئیں۔ اب میں تنہا اللہ کو یاد کروں گا۔ بڑا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ہلکا کر دیا۔ تو مفلسی اس کے حق میں مصیبت کہاں رہی وہ تو نعمت بن گئی۔ تو مصیبت درحقیقت نہ بیماری، نہ مفلسی اور نہ ناداری ہے بلکہ دل کا تاثر مصیبت ہے۔ جب اللہ سے دل متاثر ہو جائے اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو۔ پھر کبھی مصیبت زدہ نہیں بنے گا۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ مصیبتوں کے جب تیر برسنے لگیں تو اللہ کے پہلو میں آ کھڑے ہو اور اللہ کا پہلو اس کی یاد اور اس کا ذکر ہے۔ جب اس میں آ گئے پھر مصیبت اثر نہیں کرے گی۔ جس سے رب کا تعارف نہ ہو، وہ علم جہالت ہے...... تو بات سیدھی یہی ہے کہ سب سے ہٹ کر ایک کے ساتھ تعلق بڑھالو، ہزاروں کی خوشامد نہ کرنی پڑے ایک کا آدمی ہو رہے۔ "یک در گیر، محکم گیر" اور یہ جبھی ہوتا ہے جب اس ذات کا علم صحیح ہو جائے کہ مجھے کس کا ہونا ہے؟ جب علم ہی نہیں ہوگا تو کبھی ادھر اور کبھی ادھر علم کے ذریعے یہ روشن ہو جائے گا کہ مجھے ادھر ہونا ہے۔ متعین ہو جائے گا کہ مجھے فلاں سے ملنا ہے اور وہ ذات بابرکات حق ہے جو کہ پروردگار، مالک اور خالق بھی ہے اس واسطے فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ ① پڑھو کونسی پڑھائی پڑھو؟ جس میں پہلے اللہ کا نام آئے۔ اللہ کا تعارف ہو، وہ پڑھائی پڑھو۔ آپ نے پڑھنا شروع کیا۔ کیٹ، بلی، فین، پنکھا اس سے مخلوقات کا تعارف ہوا خدا کا تعارف نہ ہوا۔ اگر آپ یوں کہیں کہ اللہ وہ ذات ہے جو خالق اور مالک ہے۔ یہاں سے علم کی ابتداء ہوئی تو پروردگار کی ذات کا اور اس کی عظمت کا تعارف ہوا، جب عظمت دل میں بیٹھ گئی تو بندگی کا جذبہ دل میں اٹھے گا اور

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱.

جب بندگی ہوگی تو طمانیت قلب، سکون اور بشاشت قلبی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے اللہ نے فرمایا کہ: تم اور علم حاصل کرو نہ، کرو تمہاری مرضی ہے۔ مگر پہلے وہ علم حاصل کرو جس سے پروردگار کا تعارف حاصل ہو جائے، وہ کونسا علم ہے؟ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو جو تمہارا پالنے والا ہے۔

ممکن ہے کہ ماں باپ یوں کہیں کہ ہم پالنے والے ہیں؟ لہٰذا ہمارے نام سے پڑھا کرو۔ ہمارا تعارف حاصل کرو، اس لئے آگے فرمایا کونسا پروردگار؟ ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ﴾ جس نے پیدا کیا وہ رب مراد ہے۔ ماں باپ رب نہیں وہ خالق نہیں ہیں۔ خلق کرنے والا اصل رب ہے۔ ماں باپ جو پالتے ہیں وہ بھی اللہ کی شفقت ہے جو اس نے دلوں میں ڈالدی ہے۔ اگر ماں کے دل میں بچے پر رحم و کرم اور شفقت نہ ہو وہ کبھی نہیں پال سکتی ایک ہی خاوند کی دو بیویاں ہوں، ماں تو پال دے گی، سوکن نہیں پالے گی، سوکن کے آگے بچہ آئے گا تو ایسی چٹکی بھرے گی کہ بچہ بلبلاتا ہوا رہ جائے گا۔

فرق یہی ہے کہ ماں کے دل میں شفقت اور سوکن کے دل میں عداوت ہے، پال پرورش سے نہیں ہوتی، رحم و شفقت سے ہوتی ہے حالانکہ اولاد اسی کی ہے جو دونوں کا خاوند کہلاتا ہے۔ تو ماں باپ کے دل میں رحمت و شفقت کس نے ڈالی؟ اس نے ڈالی، بعض دفعہ ماں باپ کے دل میں بھی عداوت ہو جاتی ہے اگر اولاد انتہائی نافرمانی کرے، ستاوے ماں باپ بددعا کرتے ہیں گھر سے نکال دیتے ہیں پھر اس کی خبر گیری نہیں کرتے۔

اس لئے فرمایا کہ پڑھو اس رب کے نام سے پڑھو جو خالق ہے۔ اگر ماں باپ کہنے لگیں کہ ہم ہی اولاد کے خالق ہیں۔ اگر ہم نہ ہوتے، اولاد کہاں سے آتی؟ آگے اس کا جواب دیا ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (1) جس نے خون کے لوتھڑے سے بنایا ہے۔ ماں باپ میں یہ قوت نہیں کہ وہ خون کے قطرے پر تصویر کشی کریں۔ وہ جو ماں کے پیٹ میں گندہ قطرہ جاتا ہے کیا باپ وہاں نقاشی کرنے کے لئے پہنچتا ہے؟ صورت وہ بناتا ہے؟ کون ذات ہے جس نے اندر پہنچ کر پالنا شروع کیا، اندر تصویر کشی کی اور ایسا پاکیزہ نقشہ بنایا کہ ایک گندے قطرے سے جوہر پاک بنا دیا۔ ایک گندی چیز ہے مگر اپنی حکمت سے کیا پاکباز انسان بنا دیا۔ اگر سونے، چاندی اور جواہرات سے انسان کو بناتے، تو اللہ کو بنانے والا کوئی نہ سمجھتا۔ سب یہ سمجھتے کہ جوہر کی خاصیت یہ ہے کہ اچھا انسان پیدا ہو، لیکن گندے قطرے سے پیدا کیا تا کہ اس کی صناعی واضح ہو کہ ہم وہ ہیں جو گندگی میں سے پاکی نکالتے ہیں، پاکی میں سے گندگی پیدا کرتے ہیں۔ تو ماں باپ خلق کے سبب ہیں خالق نہیں ہیں۔ خلق اور پیدائش حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں سبب تخلیق ہونا اور بات ہے خالق ہونا اور بات ہے۔

جب متعین ہو گیا کہ اصل میں پالنے والا اللہ ہے جو خالق ہے۔ تو اسی کا تعارف ہونا چاہئے۔ اسی کو علم کہا جائے گا جس سے آدمی اپنے خالق کو پہچانے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ

---

(1) پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۲.

علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است

جوعلم، راہ حق کا راستہ نہ دکھائے وہ جہالت ہے علم نہیں ہے، علم وہی ہے جو سیدھا اور حق کا راستہ بتائے۔ تو فرمایا کہ: اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو تا کہ اس کی پہچان پیدا ہو۔ باقی رب کا تعارف کس طرح سے ہو؟

تعارف کا طریق...... آگے اس کا طریقہ بتلایا کہ: ﴿اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی ہے۔ قلم لکڑی یا لوہے کا ہوتا ہے یا پلاسٹک کا ہوتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی میں شعور وعقل نہیں ہے۔ قلم سے بڑے بڑے علوم نکلتے ہیں۔ مگر قلم کو خود کچھ پتہ نہیں وہ جاہل مطلق ہے۔ تو حق تعالیٰ نے بتلایا کہ قلم خود کچھ نہیں قلم کے ذریعے سے ہم علم دے رہے ہیں۔ تو گویا ہم سے پوچھو، مگر قلم سے مت پوچھو۔ مگر علم کے پہنچانے کا سبب قلم کو بنا دیا۔ اسی طرح فرمایا ماں باپ کو ہم نے تخلیق کا سبب بنا دیا۔ وہ خالق نہیں ہیں، ان میں کیا قوت ہے کہ یہ کسی میں خلق کریں۔ تخلیق کے معنی وجود دینے کے ہیں۔ ان کا اپنا وجود تو ان کے اپنے ہاتھ میں ہے نہیں، تو بچے کو کیا وجود دیں گے۔ اگر ان کا وجود ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا تو ماں باپ مرنا کبھی گوارا نہ کرتے۔ لیکن سب کو جانا پڑتا ہے۔ جب ان کا اپنا وجود ہاتھ میں نہیں تو دوسروں کو کیا وجود دیں گے؟ اب آپ کہیں گے انکے ماں باپ نے انہیں وجود دیا۔ تو ان کی بھی یہی کیفیت تھی۔ جب وہ جانے پہ آئے تو چلے گئے اپنے وجود کو نہیں سنبھال سکے۔ آدم علیہ السلام تک چلے جاؤ، کسی کا وجود اس کے ہاتھ میں نہیں آخر میں اللہ ہی کی ذات نکلے گی جس کے ہاتھ میں سب کے وجود ہیں۔

اسی لئے فرمایا کہ: جب قلم کو علوم کا راستہ بنا دیتے ہیں اور خود قلم کو بھی پتا نہیں۔ اس طرح ماں باپ کو پال پرورش کا واسطہ بنا دیتے ہیں، خود ماں باپ کے اندر کوئی جوہر نہیں شفقت، رحم وکرم، تدبیر ہم ڈالتے ہیں تا کہ بچے کی پرورش کریں۔ تو اس رب کے نام سے پڑھو جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ اور تعلیم دی تو وہ قلم کا بھی محتاج نہیں۔ زبان کے ذریعہ علم پہنچا تا ہے۔ بولنے سے، آنکھ سے دیکھ کر صورت کی نقل وحرکت سے اور دنیا کے تغیرات کو دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے، تو اس سے علم ملتا ہے۔ تو ہم نہ قلم کے نہ زبان کے محتاج، جس طرح چاہیں علم دیدیں۔ وہی ذات بابرکات تعارف کے قابل ہے جو اتنی باکمال ذات ہے تو اسی کے نام سے پڑھو۔

خلاصہ ساری بات کا یہ نکلا کہ کسی قوم کی ترقی کا پہلا زینہ علم حاصل کرنا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ جاہلیت کو ختم کیا تو اقــراء کے ذریعے سے ختم کیا۔ پڑھنے سے ہی آدمی آگے بڑھتا ہے۔ اس سے اونچ نیچ اور مرضی خداوندی کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے بندگی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ تو ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ جو انسان نہیں جانتا تھا اللہ نے اس کے اندر علم ڈال دیا۔

افراط دولت علم سے محرومی کا ذریعہ ہے...... اور آگے یہ بھی فرما دیا، ﴿کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی ۝ اَنْ

رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی﴾ علم سے محروم کیا چیز رکھتی ہے؟ جب وسائل زندگی قبضہ میں آ جائیں اور آدمی سمجھے کہ میں مستغنی ہوں، مجھے خدا کی بھی ضرورت نہیں اس لئے کہ خزانہ میرے پاس بھرا پڑا ہے۔ سونا، چاندی، غلہ، باغات سب کچھ میرے پاس، اب میں قابو یافتہ ہوں، اب مجھے خدا کی کیا ضرورت پڑی؟ جب خدا ہی کی ضرورت نہیں تو خدا کے علم کی کیا ضرورت ہوگی؟ تو علم سے محروم رکھنے والی زیادہ تر دولت کی افراط ہوتی ہے۔ جبکہ آدمی اپنے دل کو اس میں اٹکا دے۔ اس کو فقط ایک خادم کا درجہ دے۔ خدا نہ بنائے اور یہ سمجھے کہ یہ میری نہیں ہے میرے خدا کی ہے، اسی کے حکم کے تحت مجھے اسے خرچ کرنا ہے جب اس پر آ جائے گا تو خدا کی مرضی کی ضرورت پڑے گی کہ وہ کیسے خرچ کرانا چاہتا ہے، اس کی منشاء کیا ہے، کس کو دوں؟ کس کو نہ دوں؟ پھر اس کو ٹوہ لگے گی کہ مرضیات خداوندی معلوم کروں۔ مرضیات معلوم کرے گا تو پھر تعلیم ہی آ جاتی ہے علم شریعت ہی آ جاتا ہے جس کے ذریعہ سے معلوم ہو کہ اللہ فلاں کام سے خوش اور فلاں سے ناراض ہوتا ہے۔

اہل حق قابل تعارف ہیں...... یہی تعلیم تھی جس کے دینے کے لئے بزرگوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ جس پر میں نے کہا تھا کہ اصل تعارف انکا ہونا چاہئے۔ ہم جیسوں کا کیا تعارف، ہم جیسے ہزاروں نالائق انکے خدام ہیں؟ اصل میں وہ قابل تعارف ہیں۔ انہوں نے اپنا تعارف اس طرح کرا دیا کہ علم کا ایک سرچشمہ قائم کر دیا۔ اس کے ذریعے سے ہزاروں کو عالم بنا دیا۔ اس سو برس کے اندر دارالعلوم سے بیس ہزار علماء تیار ہوئے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے ہزاروں افراد اور علماء تیار کئے یہ تعارف کے قابل ہیں اور وہ سرچشمۂ علم ہے۔ ہم تو اپنا تعارف ان کا نام لے کر کراتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے لوگ ہمیں بھی پہچان لیتے ہیں۔ انہیں نہ پہچانیں تو ہمیں کوئی پہچاننے والا نہیں۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حدیث کے استاذ' طلباء کو خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے۔ طلباء کو اکثر پیار سے جاہلین کہا کرتے تھے۔ فرماتے: ''جاہلین! ہمیں تو روٹی بھی ملتی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ملتی ہے۔ ان کا نام لے لیتے ہیں لوگ قدر کر کے ہمیں روٹی کھلاتے ہیں ہماری تو روٹی بھی ان کے نام سے ہے۔ ان کا نام نہ ہو تو ہمارے پاس روٹی بھی نہ ہو''۔

تو تعارف کے قابل پیغمبر' خلفائے راشدین اور علمائے ربانی کی ذات ہے ہم جیسے کیا قابلیت رکھتے ہیں کہ ان کا تعارف کرایا جائے۔ چونکہ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ چھڑ گیا تھا اس واسطے میں نے بھی اسی پر بولنا شروع کر دیا بہر حال کوئی موضوع ہاتھ لگنا چاہئے اس سے پہلے میں خود بھی سوچتا تھا کہ کیا بیان کروں کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی مگر اللہ تعالیٰ ہمارے محترم بھائی کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے موضوع متعین کر دیا۔ تو چار کلمات میں بھی آپ کے سامنے عرض کر سکا۔ بہر حال یہ ان کا تعارف ہے اور یہ ان کی تعلیم ہے کہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ

خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو زمانہ جاہلیت اور جاہلیت کو ختم کرو علم آئے گا۔ تو جیسے زمانہ جاہلیت کی ذلتیں مٹ کر عزتیں آئیں، اب بھی عزتیں آسکتی ہیں۔ زمانہ یکساں رہا ہے جو آثار اس وقت آئے تھے وہ آج بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے خوب کہا ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

ہم آج بھی اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انداز برتیں، تو آج بھی آگ بردو سلام بن سکتی ہے۔ وہی آگ جو جلانے کے لئے کھڑی ہوئی ہے وہ ٹھنڈی ہو کر باغ و بہار بن جائیگی، ہم اپنے اندر کوئی تغیر پیدا کریں۔ اس طرح تو کام نہیں چلتا کہ ہم تو اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہوں اور چاہیں فلاں میں بھی تغیر آجائے، پبلک اور حکومت میں بھی تغیر آجائے مگر ہم اپنی جگہ قائم رہیں۔ ہم اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتے۔ تو آپ ایسے قطب کہاں ہیں کہ دنیا ہل جائے مگر آپ نہ ہلیں۔ پہلے تو آپ کو ہلنا پڑے گا جب آپ حرکت میں آئیں گے، جب دنیا میں ہلچل آئے گی اس سے پہلے نہیں آئے گی۔ بس یہی چند باتیں عرض کرنی تھیں اسے وعظ و نصیحت سمجھ لیجئے، شکوہ یا علاج و تدبیر سمجھ لیجئے اس میں ساری چیزیں آگئیں۔ جو آپ کا جی چاہے سمجھ لیں۔

عورت کے ذریعے پورے گھر میں تعلیم آسکتی ہے......اور آپ ہی کے ساتھ اپنی بہنوں کو یہ خصوصیت سے خطاب ہے کہ سب سے پہلا مدرسہ بچے کے لئے ماں کی گود ہے۔ اگر ماں کی گود میں علم ہے تو سمجھو کہ بچہ عالم بنے گا۔ ماں کی گود میں اگر کوئی سمجھداری ہے سمجھو کہ بچہ سمجھدار پیدا ہوگا۔ تو سب سے زیادہ ہماری ماؤں، بہنوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی گود کو علم سے بھریں۔ خود مسائل سیکھیں بچہ ابتداءً جو کچھ سیکھے گا، انہی سے سیکھے گا۔ اگر ماں کی زبان پر علم کا چرچہ ہے۔ بچہ بھی وہی چرچہ لے کر کھڑا ہوگا اور ماں کی زبان پر جہالت ہے بچہ بھی جہالت لے کر چلے گا۔ اس لئے ہماری بہنوں کو اپنی وجہ سے اور اپنی نسلوں کی وجہ سے خود بھی بدلنے کی اور اپنی اصلاح کی ضرورت ہے کہ وہ علم کی طرف متوجہ ہوں اور اگر وہ متوجہ ہوگئیں تو ان مردوں کی کیا مجال ہے کہ یہ متوجہ نہ ہوں۔ اس واسطے کہ یہ تو ان کے زرخرید غلام ہیں۔ جتنی شادی اور غمی کی رسمیں ہوتی ہیں جن میں مسلمان تباہ ہوئے۔ جب پوچھا جائے کہ بھئی! تم عقلمند سمجھدار ہو پھر یہ کیا کر رہے ہو؟ تو کہتے ہیں کہ جی! عورتیں نہیں مانتیں گویا عورتیں لیڈر اور حکام ہیں وہاں سے آرڈر جاری ہوتا ہے اور ان کا فرض ہے کہ تعمیل کریں۔ یہ غلامی میں گرفتار ہیں۔ بہر حال یہ ایسے ہی غلام ہیں تو میں کہتا ہوں کہ اگر عورتیں انہیں خیر پہ لگانا چاہیں تو یہ ضرور لگ کے رہیں گے۔ آخر عورتوں کو جب کچھ بنوانا ہوتا ہے، زیور یا کپڑا وہ ضد کرتی ہیں اور اتنا اصرار کرتی ہیں کہ وہ چوری کرے ڈکیتی کرے، مگر انکی فرمائش پوری کرے۔ اگر عورتیں یوں کہہ دیں کہ جناب جب تک آپ صبح کو ایک سپارہ تلاوت نہیں کریں گے، نماز نہیں پڑھیں گے تو ہم نہ روٹی پکا کے دیں گی نہ کپڑا سی کے دیں گی سب کو چند دن کے بعد نانی یاد آجائیگی۔ جھک ماریں گے، تلاوت کریں گے۔ نماز پڑھیں گے۔ تو جب تم ضد کر کے دنیوی اغراض پوری کرا لیتی ہو تو ضد

کر کے دینی اغراض کیوں نہیں پوری کرائی جاتیں؟ ہم نے بہت سے خاندان دیکھے ہیں کہ دیندار عورت آئی تو خاوند کو مجبور کر دیا اور اس کو دیندار بننا پڑا۔ بددین آئی تو اس نے بددین کر کے چھوڑا۔ تو عورت کا اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ اثرات کو صحیح طور پر استعمال کریں تو اپنی اور خاوند دونوں بلکہ اولاد کی بھی دین و دنیا بن جائے۔ بس ذرا سی ضد کر لیا کرو کہ یہ کام نہیں ہوگا جب تک کہ یہ دینی کام نہ ہو۔ خاوند مجبور ہوگا اس لئے کہ جس کے ہاتھ میں ہانڈی، ڈوئی ہوتی ہے اس کے سامنے ہر کوئی مجبور ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''جس کے ہاتھ میں ہانڈی ڈوئی اس کا سب کچھ''۔

اب مرد تو بیٹھ کے نہیں کھانا پکا سکتا۔ وہ دکان پر کمائے گا یا گھر داری کرے گا؟ یہ عورت کا کام ہے اگر عورت یہ کام چھوڑ دے اور کہے کہ یوں کرنا پڑے گا۔ مرد اس کے کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ تو جب آرڈر ہی جاری کرنا ہے تو کچھ دین کے لئے بھی آرڈر جاری کر دیا کرو۔ فقط زیور، کپڑے کے لئے نہیں، کبھی کبھی دین کے لئے بھی ان زرخرید غلاموں کو آرڈر دیدیا یہ تو ماننے کے لئے مجبور ہیں، اس واسطے مجھے یہ چند باتیں اپنی بہنوں سے بھی عرض کرنی ہیں کہ وہ بھی ادھر توجہ کریں۔ وہ اگر مردوں کو آمادہ کر دیں گی تو یہ جلد آمادہ ہو جائیں گے اور ان کے اوپر زیادہ اثر پڑے گا۔ اس لئے کہ جب عورتیں اس پر آجائیں کہ تعلیم حاصل کرو۔ جن کا کام گھر میں رہنا ہے۔ تو مرد سوچے گا جب میرے گھر کے ذرے ذرے میں یہ چیز آ گئی تو میں کیسے جدا رہوں؟ بیوی، لڑکیاں اور بچے بھی کہنے لگے۔ اب میں اگر یہ کام نہیں کروں گا تو آخر جاؤں گا کہاں؟ کس سے ملنا ہوگا؟ مجبور ہو کے چلے گا۔ اس لئے اپنی بہنوں سے بہت ادب سے گذارش ہے کہ کبھی کبھی تھوڑی تھوڑی ضد، دیندار بنانے کے لئے بھی کر لیا کرو اور جو ناز نخرے دنیا کے لئے ہیں وہ دین کے بارے میں بھی جتا دیا کرو۔ گھروں میں دینداری آجائے گی۔

ورنہ حدیث میں فرمایا گیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کیا، فرمایا: ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا فَسَقَ فِتْیَانُکُمْ وَطَغٰی نِسَآئُکُمْ'' اے لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فسق وفجور میں مبتلا ہو جائیں گے اور تمہاری عورتیں آزاد اور سرکش بن جائیں گی؟ صحابہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ وہ تو خیر محض کا زمانہ تھا۔

''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! یا رسول اللہ! کیا ایسا بھی وقت آنا ہے؟ کہ ہماری عورتیں آزاد ہو جائیں اور ہمارے نوجوان لڑکے فاسق و فاجر بن جائیں دین پر نہ چلیں؟ قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ فرمایا، یہ ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت باتیں ہوں گی۔ ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا لَمْ تَاْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ'' اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم اچھی باتوں کی نصیحت چھوڑ دو گے اور بری باتوں سے روکنا چھوڑ دو گے۔ تمہارے سامنے برائیاں ہوں گی اور کسی کو توفیق نہیں ہوگی کہ ٹوک دے کہ یہ حرکت بری ہے، اسے چھوڑ دو۔ اس لئے کہ خود اس میں مبتلا ہے تو کسی دوسرے کو کیا کہے گا؟ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو جائے گا۔ اب صحابہ کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔

''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! عرض کیا یا رسول اللہ! ایسا بھی دن آنا ہے کہ اچھی بات کی نصیحت چھوٹ جائے، بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے، دنیا سے روک ٹوک اٹھ جائے؟ قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ یہ بھی ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت بات ہوگی۔

''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْکَرِ وَنَهَیْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ'' جب تم برائی کا حکم دو گے اور بھلائی سے روکو گے صحابہ کو اور حیرت ہوئی (عرض کیا): ''قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ''! یارسول اللہ! ایسا بھی ہوگا؟ فرمایا: ''قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ'' یہ بھی ہوگا اس سے بھی زیادہ سخت بات ہوگی۔ ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَالْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا.'' (1) جو کسی زمانے میں اچھی باتیں تھیں۔ آج لوگ ان کو برا سمجھ رہے ہیں۔ اور جو بری باتیں سمجھی جاتی تھیں آج لوگ ان کو اچھا سمجھ رہے ہیں۔ کام جب الٹتا ہے جب آدمی بدعملی کی مشق کرے۔ تو کرتے کرتے فہم خراب ہو جاتا ہے۔ علاج وہی ہے کہ آدمی پھر لوٹ کے آئے اور اسی نیکی سے ابتداء کرے۔ اتباع شریعت، اتباع سنت اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے ابتداء کرے، وہیں آ کے بات بنے گی۔

صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اچھے انسان پیدا کرتی ہیں...... آج سائنس نے آنکھوں کو چکا چوند کر رکھا ہے بجلیوں سے شہر روشن، فضائیں ہوائی جہازوں سے بھری ہوئی ہیں، دریا بڑے بڑے بحری جہازوں سے آباد ہیں۔ گویا بر اور بحر کے اندر چاندنا ہو رہا ہے۔ مگر یاد رکھیئے۔ سائنس اچھے اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے اچھے انسان نہیں پیدا کر سکتی۔ اچھے انسان انبیاء علیہم السلام کی تعلیم پیدا کرے گی جس سے کریکٹر اور اخلاق ربانی درست ہوں۔ میں مخالف نہیں ہوں، ضرور جہاز بنائیے۔ مگر اپنے کو درست بھی کیجئے اکبر الٰہ آبادی نے خوب کہا ہے، لسان العصر بڑا حکیم ہے، خوب اس نے بات کہی ہے کہ۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو ۔۔۔ جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو

ہزاروں فٹ کی بلندی پر پہنچ جاؤ، چاند پر پہنچ جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں، جائز ہے۔

پر ایک سخن بندہ عاجز کی رہے یاد ۔۔۔ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

یہ دو چیزیں پیش فرمائیں۔ اللہ کی عظمت اور نفس کی حقارت کہ ہم ایک گندہ قطرہ ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔ اپنی حقیقت کو فراموش مت کرو اور اللہ کی عظمت و بزرگی کو دل سے مت کھوؤ۔ جب یہ دو چیزیں یاد ہو جائیں گی تو سائنس' فلسفہ' سامان سب چیزیں اچھی بن جائیں گی۔ تمہارا دل اگر مسلم بن جائے تو ہوائی جہاز، بحری جہاز بھی مسلمان ہوگا، یہ سب چیزیں مسلمان ہوں گی اور اگر تمہارا دل کافر ہے تو یہ ساری چیزیں کفار ہیں اور مضرت رساں ہیں۔ تو درست کرنا اپنے آپ کو ہے۔ سامان تو پہلے ہی درست ہیں۔ ان کا کیا درست کرنا؟

ہم چاہتے ہیں کہ سائنس کے ذریعے ساری دنیا پر کنٹرول حاصل کر لیں۔ لیکن وہ انسان کیا کنٹرول حاصل

(1) المعجم الاوسط للطبرانی، باب الهاء، من اسمه همام، ج: ۲۰ ص: ۱۷۲۔

کرے گا جس نے اپنے نفس کے اوپر کنٹرول حاصل نہیں کیا۔اس کا نفس تو اس کے قبضے میں ہے ہی نہیں۔نفس کی نکیل ہاتھ میں ہے نہیں۔نفس نے کہا میں حرام کی غذا کھاؤں گا۔اس نے کہا اچھی بات ہے، میں فلاں ناجائز کام کروں گا۔اس نے کہا اچھی بات ہے۔تو جو اپنے نفس پر قابو نہیں پاسکا، وہ دنیا پہ کیا قابو پائے گا؟ آج ہر آدمی اس فکر میں ہے کہ پوری دنیا پر کنٹرول حاصل کرے لیکن پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے اوپر تو کنٹرول حاصل کرو۔

تو کارے زمین رانکو ساختی چہ باسماں نیز پر داختی

پہلے زمین کا انتظام صحیح کرلو پھر آسمان پر جانا۔زمین پر تو کوے اڑ رہے ہیں اور آسمانوں پر جانے کی سوجھ رہی ہے۔جو خاک کو نہ درست کرسکا، وہ جوہر پاک کی درستی کیا کرے گا؟ بہر حال یہ چند باتیں مجھے بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں عرض کرنی تھیں وہ یہ کہ اپنی درستگی اور اپنی اصلاح کی فکر کیجئے۔وہ علم ربانی اور اخلاق ربانی سے ہوتی ہے۔سامانوں سے نہیں ہوتی۔سامان شوق سے استعمال کرو، مگر اپنے کو درست بنا کر، جبھی یہ کارآمد ہوں گے۔بس، یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو نیکی کی راہ پر چلنے، حق کے راستے کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرماوے۔(آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

عمل صالح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ إِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَاكُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے، جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی۔ اس میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کو عمل کے اوپر آمادہ کیا اور ابھارا ہے کہ عملی زندگی اختیار کرو۔ محض قولی اور باتیں کرنے کی زندگی، یہ آخرت کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک عملی جدوجہد اور سعی عمل انسان میں نہ ہو۔ اسی مقصد پر آمادہ کرنے کے لئے یہ آیت حق تعالیٰ شانہ نے اتاری۔ میں اسی کے متعلق چند جملے مختصر طریق پر گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

اس سے پہلے کہ آیت کا مضمون شروع کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں حدیث شریف کی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس مثال کے ذریعے اس آیت کا مضمون بہت زیادہ واضح اور کھل جائے گا۔ کیونکہ مثال میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ باریک سے باریک مضمون بھی جب مثال کے ذریعے سمجھایا جائے تو وہ بالکل کھل جاتا اور نمایاں ہوجاتا ہے۔ یہ علم کی خاص قوت حق تعالیٰ شانہ نے انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمائی ہے۔ وہ بڑے بڑے دقیق مسئلوں کو موٹی موٹی مثالوں سے اس طرح سمجھا دیتے ہیں کہ ایک جاہل سے جاہل اور بے پڑھے سے بھی بے پڑھا لکھا آدمی سمجھ سکے۔ یہ خاص قوت سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جوتیوں کی برکت سے اولیائے کاملین اور علمائے ربانی میں بھی یہ قوت ہوتی ہے۔

مثال ایک کھلی دلیل ہوتی ہے...... مجھے اس پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آیا، جن کا نام نامی آپ نے ابھی سنا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اپنے اعوان وانصار کے ساتھ اس

ادارے کو قائم کیا اور چلایا۔ انہی کا ایک واقعہ مثال کے سلسلے میں مجھے یاد آیا۔ ان کے مریدین میں ایک شخص اللہ دین تھا، میں نے بھی دیکھا ہے، بوڑھا آدمی بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا اس کی گوشت کی دکان تھی۔ بے پڑھا لکھا بھی تھا اور تجارت بھی اس کی ایسی تھی جس میں پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ گائے، بھینس ذبح کی، اس کا گوشت بیچ دیا۔ وہ حضرت سے بیعت تھا۔ مگر میں نے اس کو دیکھا کہ اس میں دین کی سمجھ اتنی اعلیٰ تھی کہ آج علماء میں بھی وہ نہیں ملتی۔ جو اس جاہل میں صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ اس نے خود ہی یہ واقعہ مجھے سنایا تھا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا کوئی سوڈیڑھ سو آدمی حضرت کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے حضرت سے ایک سوال کیا کہ:

حضرت! یہ جو سننے میں آیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مرنے کے بعد بزرگوں کے قرب جوار میں دفن ہونے کی کوشش کی جائے، اولیاء کے مزارات کے پاس اپنی قبر بنوائیں اس کی لوگ کوشش کریں تو اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس لئے کہ مرنے والا اگر نیک ہے اور اعمال صالحہ اس کے ساتھ ہیں، اسے کہیں بھی دفن کردو، اس کی نیکی اس کے ساتھ ہے، قبر اس کی روشن ہو جائے گی اور اگر وہ بدعمل ہے، اسے نبی کے قریب بھی دفن کردیں، تب بھی اس کی بدی سامنے آئے گی۔ تو انبیاء واولیاء کے قرب وجوار میں دفن کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟

یہ اس نے سوال کیا۔ اب سوال کرنے والا بالکل ان پڑھ جاہل آدمی اور عالم برزخ کا سوال کررہا ہے۔ اس کو اگر حقائق سمجھائے جائیں اور علم کی باریک باتیں بتائی جائیں، وہ کچھ بھی نہ سمجھتا۔ موٹی سمجھ کا آدمی تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سمجھایا اور ایک مثال کے ذریعے مسئلے کو واضح کردیا کہ وہ جاہل بھی سمجھ گیا اور دوسرے بھی سمجھ گئے۔ جب وہ سوال کرچکا، حضرت نے فرمایا، اچھا ہم اس کا جواب دیں گے۔ ابھی جواب نہیں دیا۔ موقع پر جواب دیں گے وہ بھی خاموش ہوگیا۔ گرمی شدید پڑرہی تھی، وہ پنکھا لے کر حضرت کو جھلنے کھڑا ہوگیا اسے یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے کیا سوال کیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ گذر چکے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا میاں اللہ دین! تم یہ پنکھا کسے جھل رہے ہو؟ کہا حضرتؒ! آپ کو جھل رہا ہوں۔ فرمایا یہ جو لوگ مجلس میں ساتھ بیٹھے ہیں انہیں تو نہیں جھل رہا؟ کہا نہیں، انہیں تو نہیں جھل رہا۔ اس واسطے کہ نہ میں ان کا شاگرد نہ ان کا مرید۔ یہ تو سارے میرے برابر ہیں۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ ان کو پنکھا جھلوں اور ان کا خادم بنوں۔ میں تو آپ کو پنکھا جھلنے کھڑا ہوگیا۔ فرمایا ہوا ان سب لوگوں کو لگ رہی ہے؟ کہا کہ جی ہاں، ہوا تو لگ رہی ہے۔ فرمایا: یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔

تم نے یہ سوال کیا کہ انبیاء واولیاء کے قریب دفن کرنے سے کیا فائدہ؟ فرمایا: اولیاء اللہ کی قبروں پر رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں، رحمت کی ہوائیں اترتی ہیں مقصود اصلی وہ ہوتے ہیں لیکن آس پاس والوں کو بھی ہوا لگتی ہے۔ رحمت کے اثرات سب کو پہنچتے ہیں۔ اس واسطے دفن کرنے کے بارے میں فرمایا گیا کہ کوشش کرو اہل اللہ اور

صالحین کے پاس دفن ہوں، ان پر رحمت کی ہوائیں چلیں گی۔ آس پاس والوں کو بھی لگیں گی، چاہے وہ مقصودِ اصلی نہ ہوں۔ مقصود فقط وہ نبی یا ولی کامل ہوں۔ فرمایا یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ تو قبر اور برزخ کے عالم کا باریک مسئلہ پوچھنے والا ایک ان پڑھ تھا، مثال کے ذریعے جواب دیکر ایک باریک مسئلہ اسکے دل میں اتار دیا۔ سب لوگ سمجھ گئے۔ تو مثال ایک ایسی دلیل ہوتی ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل جو سمجھ میں نہ آسکیں، وہ مثال کے ذریعے سمجھائے جاسکتے ہیں۔

اسی اللہ دین نے حضرت سے ایک اور بھی سوال کیا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مظفر نگر تشریف لے گئے یہ دیوبند سے کوئی سولہ میل دور ایک ضلع ہے۔ حضرت کے ایک مرید ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب تھے، جو جیل کے ڈاکٹر تھے، وہیں ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے جیل کی طرف روانہ ہوئے، یہی اللہ دین ساتھ تھا، پیچھے اور لوگ بھی تھے۔ اس نے پھر حضرت سے اس سے بھی زیادہ باریک سوال کیا۔ واقعی باریک سوال کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ حدیث میں ہے کہ ''اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ''① سوال کرنے کے لئے بھی آدھے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جاہل آدمی سوال بھی نہیں کرتا، کچھ نہ کچھ معلومات ہوں گی، جبھی سوال کرے گا۔ محض جاہل ہوتو آدمی کو سوال بھی سمجھ نہیں آتا۔ یہ بظاہر جاہل تھا، مگر صحبت یافتہ تھا، اس لئے بڑے باریک باریک سوالات اس کے دل میں پیدا ہوتے اور ان کے جواب میں جب علم کھلتا، لوگ فائدہ اٹھاتے تھے۔ تو حضرتؒ مظفر نگر میں جیل کی طرف جارہے تھے یہ بھی ساتھ تھا اس نے پھر ایک سوال کیا۔ اس نے کہا، حضرت جی! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پیشین گوئیاں انبیاء بھی کرتے ہی، اولیاء بھی کرتے ہیں انبیاء بھی خبریں دیتے ہیں کہ ایسا واقعہ ہونے والا ہے بلکہ مدت بتلا دیتے ہیں کہ سو یا دو سو برس کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔ جیسے حدیث میں آپ نے خبر دی کہ مجھے میری امت کی عمر پانچ سو برس دکھلائی گئی۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ ہزار برس دکھلائی گئی۔ اس کا علماء نے جواب دیا کہ پانچ سو اور ہزار کو کیسے جمع کیا جائے، اس وقت مجھے وہ بیان کرنا مقصود نہیں، مطلب یہ تھا کہ آپ نے پیشین گوئی کی اور مدت متعین کردی، ٹھیک پانچ سو برس کے بعد وہ واقعہ پیش آگیا، جس کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا تھا۔ اور دوسرا واقعہ بھی ٹھیک ہزار برس کے بعد پیش آگیا۔

تو اللہ دین نے کہا کہ انبیاء بھی پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور وقت بھی متعین کردیتے ہیں اور ٹھیک مقرر وقت پر وہ بات پیش آتی ہے۔ مگر اولیاء اللہ پیشین گوئی کرتے ہیں اور وقت متعین کرتے ہیں۔ بعض دفعہ وقت سے پہلے ہوجاتی ہے اور بعض دفعہ وقت کے بعد ٹھیک وقت پہ نہیں ہوتی کیا یہ لوگ غلط دیکھتے ہیں؟ کیا اولیاء اللہ معاذ اللہ غلط

---

① شعب الایمان للبیهقی، ولفظه: وحسن السوال نصف العلم، الثانی والاربعون من شعب الایمان، ج:۱۴ ص:۸۶ علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه مخیس بن تمیم عن حفص بن عمر، قال الذهبی: مجهولون، دیکھئے: مجمع الزوائد، ج:۱ ص:۱۶۰۔

گوئی کرتے ہیں اور جھوٹ بیان کر دیتے ہیں؟ جب ان کے بیان کئے ہوئے وقت پہ کام نہیں ہوتا، کبھی پہلے ہو گیا، کبھی بعد میں، معلوم ہوا وہ غلط اطلاع دیتے ہیں اور جو غلط اطلاع دے اور معاذ اللہ جھوٹ کہہ دے، وہ ولی کیسا ہوا؟ ہاں انبیاء جو بات کہتے ہیں۔ ٹھیک وقت متعین پر وہ بات پیش آ جاتی ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ نبی جو وقت مقرر کرے، وہ بات تو ٹھیک وقت پہ پیش آئے اور ولی جو مقرر کرے۔ اس میں بات آگے پیچھے ہو جاتی ہے، تو ولی کی سمجھ میں نہیں آتا وہ غلط گوئی کرتے ہیں یا انہیں خبر نہیں ہوتی؟ تو کیا ضرورت ہے پیشین گوئی کرنے کی، جب انہیں کسی بات کا علم ہی نہیں۔

اب یہ سوال بہت باریک، نبی اور ولی کے کشف کا سوال ایک جاہل آدمی پوچھ رہا ہے، جسے نہ کشف کی خبر نہ کشف کے اوقات کی خبر نہ اس کے تعینات کی خبر اور وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کر رہا ہے۔

اب اگر حضرت کشف کی حقیقت بیان کرتے اور کشف کی میعاد اور مدت سے بحث کرتے وہ کون دن کیا سمجھتا؟ وہ ایسے دیکھتا رہتا جیسے دیوار کھڑی رہتی ہے۔ مگر حضرت نے اس کے مناسب حال جواب دیا اتنا باریک مسئلہ ایک مثال سے سمجھا دیا۔

فرمایا: میاں اللہ دین! یہ سامنے جو عمارت نظر آ رہی ہے۔ یہ کیا عمارت ہے؟ اس نے کہا کہ جیل خانہ ہے جیل خانہ وہاں سے کوئی دو فرلانگ پر تھا۔ فرمایا یقینی بات ہے کہ جیل خانہ ہے؟ کہا کہ جی ہاں بالکل یقینی ہے۔ میں حلف اٹھالوں کہ یہ جیل خانہ ہے۔ فرمایا یہاں سے کتنی دور ہوگا؟ اس نے کہا اندازاً چار سو قدم ہوگا۔ فرمایا چار سو کے، تین سو پچانوے اور چار سو پانچ بھی ہو سکتے ہیں؟ کہا کہ جی ہاں ہو سکتے ہیں۔ یہ تو میرا ایک تخمینہ ہے۔ پانچ کم ہو جائیں یا پانچ زیادہ ہو جائیں۔ یہ یقینی ہے کہ یہ جیل خانہ ہے۔ حضرت خاموش ہو گئے اور برابر چل رہے ہیں۔

جب جیل خانہ کے دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اس کی دیوار بالکل ایک گز رہ گئی۔ فرمایا: اللہ دین یہ کیا عمارت ہے؟ کہا کہ جیل خانہ ہے۔ فرمایا یقینی ہے؟ کہا کہ جی اب تو اور بھی یقینی ہے۔ فرمایا کتنا دور ہوگا؟ اس نے کہا، جی ایک گز فرمایا، گز کی ڈیڑھ بھی ہو سکے یا پونے دو؟ اس نے کہا نہیں ٹھیک گز ہے۔ کہو تو میں ناپ کے بتلا دوں؟

فرمایا: یہی نبی اور ولی کے کشف میں فرق ہے۔ یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ جو چیز نبی دیکھتا ہے، وہی ولی بھی دیکھتا ہے۔ مگر ولی دور سے دیکھتا ہے، اپنے اندازہ اور تخمینے سے مدت متعین کرتا ہے اس میں کمی بیشی ہو جاتی ہے اور نبی کو شے کے سر پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں، وہ جو مدت مقرر کرتا ہے، ٹھیک نپی تلی ہوتی ہے۔ اس میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ جیسے تم نے دو فرلانگ کے فاصلہ پر کہا کہ چار سو قدم ہیں، مگر چار سو کے تین سو پچانوے بھی ہو سکتے ہیں اور چار سو پانچ بھی اور جب جیل خانے کے سر پر پہنچ گئے، تم نے کہا صاحب! گز کا پون گز اور سوا گز نہیں ہو سکتا، گز بھر ہی رہے گا۔ فرمایا نبی اور ولی کے کشف میں یہی فرق ہے۔ اب کتنا دقیق مسئلہ تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کیسی سہولت سے اسے حل کر دیا کہ اس جاہل کو بھی سمجھ آ گیا اور ہم جیسے جاہلوں کو بھی فائدہ پہنچ گیا۔

اگر یہ سوال نہ کرتا، ہماری بھی سمجھ میں بات نہ آتی۔

تو مثالوں کے ذریعے سے انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام بڑے بڑے باریک مسائل موٹی عقل والوں کو سمجھا دیتے ہیں۔

اسی پر مجھے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا، حضرتؒ ایک دفعہ مظفر نگر تشریف لے گئے۔ تو مظفر نگر کے اسٹیشن پر حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی کچھ لیٹ تھی۔ اس زمانے کا سب سے بڑا مہندس، ریاضی دان، اقلیدس کا جاننے والا ایک ہندو تھا، اسے ناز تھا کہ میں فن ریاضی میں بڑا ماہر ہوں، اسے جو معلوم ہوا کہ حضرت نانوتوی اسٹیشن پر موجود ہیں۔ حضرت بھی فن ریاضی میں بڑے مشہور تھے حتیٰ کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اقلیدس پر اعتراضات کئے ہیں، جس کے بارے میں یہ عام مسلّم تھا کہ اقلیدس پر اعتراض ممکن نہیں ہے، یہ تو بدیہی چیزیں ہیں۔ حضرت نے اس پر اعتراض کیا اور اس زمانے کے ریاضی دان حیران ہوئے کہ اس کا جواب کس طرح سے دیں۔ تو اس ہندو کو معلوم ہوا کہ حضرت بھی اسٹیشن پر ہیں، وہ جلدی سے آیا اور بڑی نیاز مندی سے ملا، کچھ بات چیت کی، اس کے بعد اس نے کہا حضرت جی! مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ لوح محفوظ میں ساری چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ ہر ہر انسان کی ہر ہر حرکت اور ہر ذرہ ذرہ اس میں قیامت تک کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ تو ایک انسان کی اتنی بڑی زندگی ہے کہ اس میں ہزاروں واقعات ہیں تو ایک ایک واقعہ اور ایک ایک ہوں، ایک ایک چوں اس میں لکھی ہوئی ہے تو لوح محفوظ کہاں تک پھیلی ہوئی ہوگی، اس کی تو کوئی حد نہیں ہوگی اس لئے کہ سارے انسانوں، جانوروں، درختوں اور پتھروں کے واقعات، ایک ایک پتھر کا ہلنا جب یہ سب کچھ ہوگا' تو کتنی بڑی لوح محفوظ ہوگی؟ وہ کہاں رکھی ہوئی ہوگی؟ آسمان کتنا بھی بڑا سہی، مگر لوح محفوظ میں تو آسمان بھی لکھے ہوئے ہیں۔ وہ کہیں آ ہی نہیں سکتی؟ یہ اس نے سوال کیا۔

حضرت نے فرمایا کہ: صاحب! آپ کی عمر کتنی ہے اس نے کہا ساٹھ برس۔ فرمایا ساٹھ برس میں آپ کی زندگی میں ہزاروں واقعات پیش آئے ہوں گے؟ کہا کہ بالکل۔ فرمایا آپ کو کچھ یاد بھی ہیں؟ کہا کہ جی بہت یاد ہیں، بس وہ جو بچپن کی چار، پانچ برس کی زندگی تھی، اس کو چھوڑ کے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا، تو حافظہ میرا قوی ہے، مجھے سارے واقعات یاد ہیں۔ فرمایا، اگر تم ان کو لکھنا شروع کرو تو کتنے کاغذوں پر لکھے جائیں گے؟ اس نے کہا کہ جی ایک کاغذ؟ اگر میں لکھنا شروع کروں، دس بیس پچاس میل تک وہ سلسلہ چلا جائے گا، وہ تو ساری زندگی ہے فرمایا اتنے لمبے چوڑے واقعات تمہیں یاد ہیں؟ تو وہ کہاں محفوظ ہیں؟ وہ جو اتنے واقعات ہیں وہ کہاں لکھے ہوئے ہیں؟ کہ تم فوراً سنا دیتے ہو۔ اس نے کہا جی میرے دماغ میں محفوظ ہیں؟ فرمایا زندگی اتنی سی اور اس کے واقعات لکھنا شروع کرو تو میلوں تک سلسلہ چلا جائے اور دماغ کی اتنی چھوٹی سی ڈبیہ میں وہ سارے واقعات (قوت حافظہ میں) محفوظ ہیں۔ فرمایا: یہ تمہاری قوت حافظہ ہے، لوح محفوظ اللہ کی قوت حافظہ ہے۔ جیسے تمہاری زندگی کے واقعات اس

میں محفوظ ہیں، کائنات کی زندگی کے واقعات اس میں محفوظ ہیں وہ بہت بڑی سہی لیکن جیسے تم کہہ رہے ہو کہ کہیں حد و نہایت نہیں۔ یہ بات نہیں جیسے تمہارے دماغ کی بھی ایک حد ہے کہ اتنی سی ڈبیہ ہے، جو پورے سر میں نہیں، سر کے پیچھے گدی میں ہے، اس لئے کہ اگلا حصہ حس مشترک کا ہے اس میں دیکھنے، سننے، اور سونگھنے کی طاقت جمع ہے اِدھر اُدھر کچھ نالیاں ہیں، جن میں علم وغیرہ گھومتا رہتا ہے یعنی فکر کی طاقت، پچھلے جو واقعات ہیں وہ گدی کے قریب ایک چھوٹے سے حصہ میں ہیں۔ تو جس اللہ کو یہ قدرت ہے کہ انچ بھر کی ڈبیہ میں ہزاروں لاکھوں واقعات لکھ دے، جنہیں کاغذ پر لکھو تو پچاسوں میل تک کاغذ چلا جائے۔ اسے یہ قدرت بھی ہے کہ ساری دنیا کے ذرے ذرے کے واقعات لوحِ محفوظ میں لکھ دے۔ اور وہ لوحِ محفوظ اتنی بڑی نہ ہو، جتنی تم سمجھ رہے ہو۔

تو کتنا باریک مسئلہ تھا اور حضرت نے کس سہولت سے مثال دے کر سمجھا دیا۔ تو مثال بڑی عجیب و غریب دلیل ہوتی ہے کہ دقیق مسائل جو عقل و فہم میں نہ آسکیں مثال کے ذریعے واضح ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم نے دنیا و آخرت کے لئے بڑی بڑی مثالیں دی ہیں اور ان مثالوں سے سمجھا دیا ہے۔ احادیث میں بھی باریک مسائل کی ہزاروں مثالیں دی گئی ہیں۔ تو مثال یہ خاص قوت ہوتی ہے علم کی، جو انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور ان کے طفیل میں اولیاء اور علماء ربانی کو دی جاتی ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بھائیوں کی مثال..... مجھے ایک مثال حدیث کی یاد آئی، جو اس آیت سے متعلق ہے، جو میں نے تلاوت کی تھی۔ میں آیت کا مضمون اس مثال ہی سے شروع کرتا ہوں، جو حدیث میں فرمائی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! ایک مثال سنو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متوجہ ہوئے۔

فرمایا: ایک شخص کے تین بھائی تھے۔ ایک بڑا، ایک منجھلا، ایک چھوٹا۔ تینوں حقیقی بھائی تھے اور ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ اس شخص کے مرنے کا وقت آیا، تو مرنے کی حالت میں انسان بے کس و بے بس ہوتا ہے، نہ خود کچھ کرسکتا ہے نہ کوئی دوسرا بنا سکتا ہے۔ محض اللہ کے رحم و کرم پر ایک بے کسی کا عالم ہوتا ہے۔ کوئی سہارا معاون اور مددگار اس کو نظر نہیں آتا۔

﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ o اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذٍ ن الْمَسَاقُ﴾ ① . جب پنڈلی پر پنڈلی مارتا ہوا ہوتا ہے تشنج ہوتا ہے اور جان کھنچتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اب پروردگار کی طرف روانگی ہے۔ اب کون ہے بچانے والا اور مدد کرنے والا؟ وہ انتہائی بے کسی کا عالم ہوتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس شخص کے اوپر بے کسی کا عالم طاری ہوا اور مرنے کا وقت آیا۔ تو سب سے پہلے اس نے اپنے بڑے بھائی کو بلایا اور کہا اے بھائی! میں نے ہمیشہ تیرے ساتھ احسان و سلوک کیا۔ اپنے کو نعمتوں میں پیچھے اور تجھے آگے رکھا۔ کوئی بھی آڑا وقت آن پڑا، میں نے تیری حفاظت، تیرے بچانے اور تجھے آرام پہنچانے میں جان لگا دی اب یہ میرے اوپر آخری اور انتہائی

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۲۹، ۳۰.

بے کسی کا وقت ہے۔ تو میرا بھائی ہے اور بھائی وہ جس کے ساتھ عمر بھر میں نے سلوک اور احسان کیا، میں چاہتا ہوں تو اس وقت میری مدد، کہ میرا کوئی مددگار نہیں ہے میں اس وقت کسی کو بھی نہیں پکار سکتا۔ وقت پڑنے پر بھائی ہی یاد آتا ہے تجھ سے میری توقع ہے کہ تو میری کچھ مدد کریگا۔ بڑے بھائی نے جواب دیا کہ تیرا بالکل غلط خیال ہے میں تیری کوئی مدد نہیں کرسکتا نہ میں تیرے کام آسکتا ہوں تو نے اگر میرے ساتھ احسان کیا تو تو نے جھک مارا، برا کیا، میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا۔ صاف ٹکا سا جواب دے دیا۔ زیادہ سے زیادہ اگر میں تیری مدد کرسکتا ہوں تو اتنی کہ جب تک تیرے دم میں دم ہے میں تیرے پاس بیٹھا رہوں گا لیکن یہ کہ میں تیرا کوئی کام بنادوں، تیری مصیبت کو ٹلا دوں، یا اپنے اوپر لے لوں، اس کی کوئی توقع مت رکھنا۔ میں تیرے کام آنے والا نہیں ہوں اسے بڑا صدمہ ہوا کہ جس بھائی کے ساتھ میں نے عمر بھر سلوک کیا۔ جب مجھ پر وقت پڑا، تو ٹکا سا جواب دے دیا۔

تو مایوس ہو کر منجھلے بھائی کو بلایا۔ اس کے سامنے بھی یہی تقریر کی اور کہا کہ یہ میرا آخری وقت ہے، کڑا وقت ہے، کوئی مددگار نہیں ہے۔ میری توقع ہے کہ تو میری مدد کریگا اس لئے کہ تیرے ساتھ بھی میں نے ساری عمر سلوک و احسان کیا، خود تکلیف اٹھائی مگر تجھ پر آنچ نہیں آنے دی۔ کیا تو میری مدد کرسکتا ہے؟

اس نے کہا کہ بالکل تیرا خیال فاسد ہے میں بالکل تیری مدد نہیں کرسکتا نہ میں تیرے کام آؤں گا۔ تو نے میری مدد کی یا احسان کیا، کیا ہوگا، اچھا کیا یا برا کیا۔ بہر حال مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں، مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ میں تیرے کام آنے والا نہیں ہوں۔ بہت اگر کام آیا تو اتنا کام میں کردوں گا کہ جب تیرا دم نکل جائے گا، تو تجھے لے جاکر گھڑے میں دفن کردوں گا، اس سے زیادہ کوئی توقع مت رکھنا۔ اس نے کہا افسوس اِنَّا لِلّٰہ جن بھائیوں سے توقع تھی انہوں نے وقت پر جواب دے دیا جن کے ساتھ سلوک کیا، انہوں نے وقت پر ٹکا سا جواب دیدیا۔ تب اس نے سب سے چھوٹے بھائی کو بلایا اور کہا بھائی! مجھ پر آڑا وقت ہے، میں پریشانی میں مبتلا ہوں۔ کیا تو میری مدد کرسکتا ہے اور میرا منہ نہیں ہے کہ میں تجھ سے مدد مانگوں۔ اس لئے کہ میں نے عمر بھر تجھے تکلیف پہنچائی، ہمیشہ تجھے ایذائیں پہنچائیں۔ عمر بھر تیرے ساتھ کوئی بھلا سلوک نہیں کیا مگر بہر حال تو پھر بھائی ہے۔ شاید تو میرے کام آجائے۔

چھوٹے بھائی نے جواب دیا، تو ذرا پریشان مت ہو۔ میں تیرے کام آؤں گا کوئی مصیبت تجھ پر پڑے گی پہلے میں اپنے پر جھیلوں گا، بعد میں تجھ تک آنے دوں گا۔ اگرچہ تو نے عمر بھر مجھے ستایا اور پریشان کیا بلکہ میری تذلیل و توہین کی اور مجھے ذلیل رکھا۔ مگر میں شریف الطبع ہوں۔ میں تیرے کام آؤں گا، تو بالکل مت گھبرا کوئی مصیبت آئے گی، پہلے میں ہوں، بعد میں تو ہے۔ اس نے کہا اللہ تجھے جزائے خیر دے، مجھے توقع نہیں تھی۔ مگر واقعی تیرا حوصلہ بہت بلند ہے۔ میں نے ساری عمر تجھے ستایا اور وقت پر تو کام آیا تو نے مجھے تسلی دی۔ ①

یہ تین بھائیوں کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور فرمایا: اے لوگو! سمجھے بھی یہ تین بھائی کون

① فضائل اعمال مولفہ از برکۃ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

ہیں؟ عرض کیا: اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ.

فرمایا: بڑا بھائی کیسا تھا؟ لوگوں نے کہا، بڑا کمینہ اور بد خصلت تھا کہ وقت کے اوپر کام نہ آیا۔ بھائی تو وہ ہے جو وقت کے اوپر کام آئے۔

فرمایا: منجھلا کیسا تھا؟ عرض کیا وہ بھی بہت خراب وخستہ اور بڑا بدنیت اور بے مروت۔ جس نے عین وقت کے اوپر جواب دے دیا۔

اور فرمایا: چھوٹا بھائی کیسا تھا؟ عرض کیا بڑا شریف، بڑا عالی حوصلہ اور بڑا عالی ظرف۔ باوجودیکہ اس کے ساتھ برائی کی گئی، لیکن کام آیا تو وہی آیا۔

بڑے بھائی کا سلوک..... فرمایا: سمجھے کہ یہ تین بھائی کون ہیں؟ عرض کیا، اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ تین بھائی کون ہیں۔

فرمایا: وہ بڑا بھائی جس کے ساتھ آدمی عمر بھر سلوک واحسان کرتا ہے، وہ اس کا مال ودولت ہے۔ عمر بھر اس کے حاصل کرنے میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ ایمان رہے نہ رہے، مگر پیسہ ہاتھ میں آنا چاہئے۔ اس کی عزت افزائی میں جان پہ مصیبت اٹھاتا ہے۔ اپنے کو ذلیل بنالیتا ہے۔ مگر مال پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ دنیا میں اتنی خدمت کسی چیز کی نہیں کی جاتی، جتنی مال کی کی جاتی ہے، جتنی رغبت اس کی طرف ہے، کسی چیز کی طرف نہیں کی جاتی۔ فرمایا بڑے بھائی سے آدمی جتنا اچھا سلوک کرسکتا ہے، اس سے زیادہ مال سے کرتا ہے۔ لیکن جب مرنے کا وقت آتا ہے، سب سے پہلے بیگانہ یہی مال ہوتا ہے۔ اس وقت آدمی مال ودولت کی طرف رجوع کرے، تو وہ کہتا ہے، مجھ سے کسی قسم کی توقع مت رکھنا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کرسکتا ہوں، جب تک تیرا سانس چل رہا ہے، میں تیرے پاس بیٹھا رہوں اور جب سانس نکل گیا، میرا تیرا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں، تو اور عالم میں جائے گا، میں اور عالم کی چیز ہوں، تو کسی اور کی چیز بنے گا، میں کسی اور کا بنوں گا۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: جب انسان کا جنازہ نکلتا ہے۔ تو ملائکہ علیہم السلام پکارتے ہیں، "مَاقَدَّمَ فُلَانٌ مَاقَدَّمَ فُلَانٌ" فلاں نے کیا چیز آگے بھیجی جو آخرت میں کام آئے، اور توشہ وزاد راہ بنے۔

اور وارث کیا پکارتے ہیں؟ "مَاآخَّرَ فُلَانٌ، مَاآخَّرَ فُلَانٌ" فلاں نے پیچھے کیا چیز چھوڑی جو ہم اس پر قبضہ کریں اور اس کو بانٹیں۔ مرنے والا ابھی قبر میں پہنچنے نہیں پاتا اور وارثوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں کہ یہ چیز میں قبضاؤں گا۔ یہ چیز میرے قبضے میں آئے گی۔ بہت سے لوگ فرضی وارث بن کے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ اس کے مال کے وارث ہم ہیں، حتیٰ کہ بیویوں تک یہ نگاہ پہنچتی ہے کہ اس بیوہ سے میں نکاح کروں گا۔ کوئی کہتا ہے میں نکاح کروں گا۔ مالدار عورت ہے۔ تو مرنے والا ابھی قبر میں بھی نہیں پہنچتا اور وارثوں کی رال ٹپکنی شروع ہوجاتی ہے۔ تو مال ودولت سب سے پہلے بیگانہ بنتا ہے اور دوسروں کی گود میں چلا جاتا ہے۔ اصل

مالک پوچھتا ہوا رہ جاتا ہے کہ کوئی ہے میرے کام آنے والا؟ وہ کہتا ہے مجھ سے بالکل توقع مت رکھنا۔

بہرحال دولت کے مالک ورثاء اور پس ماندگان بن جاتے ہیں اور وہ اس بیچارے سے بیگانہ بن جاتی ہے، جس نے ساری عمر اس کو کمایا تھا، محنت کی تھی۔ حتیٰ کہ ایمان اور جان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کتنی ہو، مگر دھوپ اور چھاؤں کی طرح سے ہے۔ آج ایک کے ہاتھ میں ہے، کل دوسرے کے ہاتھ میں ہے، ہزاروں امیر اس دنیا میں غریب بنتے دیکھے گئے ہیں اور ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے گئے۔ دولت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی اس کو آدمی خادم بنا کے رکھے، مخدوم نہ بنائے، قبلہ وکعبہ نہ بنائے کہ اس کی پرستش و پوجا شروع کر دے۔ اس کی محبت کو دل سے وابستہ نہ کرے، ایک خادم کی حیثیت سمجھے، جیسے اللہ نے اور خدمت گذاری کے سامان پیدا کئے ہیں' یہ بھی استعمالی سامان ہے' اسے استعمال کرتا رہے اور خدا کا شکر ادا کرتا رہے، لیکن یہ کہ اپنی امیدوں کا مرکز بنا لے، جب یہ چھوڑنے پہ آتی ہے، ساری امیدیں دھری رہ جاتی ہیں۔ اس واسطے دولت اور مال کو حق تعالیٰ نے یہ حیثیت دی ہے کہ اسے دین کا ایک وسیلہ اور خادم بنایا ہے، خود مقصود نہیں رکھا دنیا کا سامان انسان کا مقصود نہیں۔ مقصود دوسری چیز ہے، یہ اس کے لئے وسیلہ کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہی سمجھا دولتیں کمائیں، تجارتیں کیں، زراعتیں کیں اللہ نے دولت دی مگر اس کو مقصود اصلی نہ سمجھا، مقصود کا وسیلہ سمجھا۔ مقصود اصلی حق تعالیٰ شانہٗ اور ان کی محبت کو سمجھا۔ اس کو ایک ذریعہ اور راستہ بنایا کہ اس کے ذریعے اللہ تک پہنچیں۔ دولت مند دولت کے راستے سے اگر دین کمانا چاہے، تو کما سکتا ہے۔ ایک غریب آدمی اپنی جان اور جسم کے ذریعے دین کماتا ہے۔ اور دولت مند دولت کے ذریعے۔ اس کو جان دی۔ اس کو مال دیا۔ بنایا دونوں کو وسیلہ۔

انبیاء علیہم السلام نے دولت کمانے کا حکم بھی دیا فرمایا: "كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ" (1) حلال کمائی کرنا، یہ بھی ایسا ہی فریضہ ہے، جیسے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا۔ مگر ساتھ یہ بتلایا کہ قلبی محبت کا تعلق اس سے نہ پیدا کرو۔ محبت کا تعلق صرف اللہ کی ذات سے رکھو، کام کاج کا تعلق اپنی دولت سے رکھو۔

دل بیار دست بکار

دل مالک کے اندر لگا ہوا ہو۔ ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہوں۔ دل کاروبار میں نہ لگا ہوا ہو۔ دل میں اللہ کی محبت ہو۔ اس لئے کہ دل ایک پاکیزہ ظرف ہے۔ پاک ظرف میں پاک ہی چیز بھرنے کی ضرورت ہے۔ اور اللہ کی محبت سے بڑھ کر پاک چیز کوئی نہیں ہے۔ تو دل اس کا مستحق ہے کہ وہی پاک چیز اس میں بھری جائے۔ دولت

---

(1) شعب الایمان للبیهقی، الستون من شعب الایمان وهو باب فی حقوق الاولاد والاهلین علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواه الطبرانی والبیهقی فی الشعب والقضاعی عن ابن مسعود مرفوعاً وقال البیهقی: تفرد به عباد وهو ضعیف لکن له شواهد کثیرة: منها ما رواه الطبرانی فی الاوسط عن انس.. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۱۱۰.

حلال ہونے کی وجہ سے پاک بن جائے، مگر اپنی ذات سے کوئی اعلیٰ چیز نہیں ہے کہ قلب کے اندر بھری جائے۔

قلب فقط آخرت کا عضو ہے......وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کے سارے بدن میں اگر آخرت کا کوئی عضو ہے، تو وہ قلب ہے۔ باقی سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔ ہاتھ، پیر، دماغ سر یہ سب دنیوی اعضاء ہیں۔ صرف ایک ہی عضو ہے جو آخرت کا ہے۔

اور یہ فرق کیسے معلوم ہو؟ اس طرح کہ قلب صرف حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو کبھی قبول نہیں کرتا۔ یہ ممکن ہے کہ آپ غلط فہمی سے باطل کو حق سمجھ جائیں۔ مگر دل حق ہی سمجھ کر قبول کرے گا۔ باطل کو باطل سمجھے اور قبول کرے۔ جھوٹ کو جھوٹ سمجھے اور پھر قبول کرے، مطمئن ہو جائے ایسے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ جب سچی بات دل میں آئے گی، تبھی اطمینان ہوگا۔ ملمع سازی سے آپ جھوٹ کہتے رہیں، دل کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ برائی کی بات کریں تو قلب مطمئن نہیں ہوگا۔ چور، چوری کرتا ہے، لیکن اندر سے اس کا دل ملامت کرتا ہے، یہ بہت بری حرکت کر رہا ہے۔ اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے، مگر دل اعلان کر دیتا ہے کہ یہ بات بری ہے۔

آپ کسی کو بری نگاہ سے دیکھیں، دل ملامت کرے گا کہ غلط ہے، ناجائز کام ہے، بدنگاہی مت کرو۔ تو دل ملامت کرے گا، اگر آپ دیکھ لیں گے، دل میں گھٹن ہوگی کہ بہت بری حرکت ہوئی۔ تو قلب جب بھی قبول کرتا ہے، حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو، جھوٹ کو، فریب کو کبھی نہیں قبول کرتا۔ تو اس سے زیادہ مخلص کوئی دوسرا نہیں ہے کہ سچائی کا ماننے والا ہے، جھوٹ اور باطل کا ماننے والا نہیں ہے۔

بخلاف اور اعضاء کے، وہ سچ بھی قبول کرتے ہیں، جھوٹ بھی، حلال بھی قبول کرتے ہیں، حرام بھی اسی ہاتھ سے آپ پاک کمائی اٹھالیں گے اور ناجائز کمائی چوری، ڈکیتی کی وہ بھی جب اٹھائیں گے تو ہاتھ میں چبھے گی نہیں، ہاتھ اسے بھی پکڑ لے گا، دل قبول نہیں کرے گا، مگر ہاتھ قبول کر لے گا۔ حلال کی کمائی رکھ دو تب، حرام کی رکھ دو تب، دونوں کو لے کر گھر چلا آئے گا۔ منہ میں آپ کچھ ڈالیں تو جیسی لذت حلال چیز کے کھانے سے آئے گی، ویسی لذت حرام کمائی سے بھی آئے گی۔ مٹھائی اگر حرام کی ہے، تو یہ نہیں کہ وہ کڑوی ہو جائے۔ ویسی میٹھی لگے گی جیسی حلال کی مٹھائی۔ زبان دونوں کو قبول کر لیتی ہے، حلال کی مٹھائی کو بھی، حرام کی مٹھائی کو بھی حرام کی چیز سے کانٹے نہیں چبھتے، وہ کھا جاتی ہے اور اسے ذائقہ آتا ہے۔ لیکن قلب حرام کی چیز سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے بڑی بری حرکت کی، جانے آخرت میں کیا بنے گا، کیا میری درگت ہوگی۔ اسی طرح سے پیر ہیں، جس طرح سے آپ کو مسجد کی طرف لے جاتے ہیں اگر کوئی شراب کی بھٹی کی طرف جائے گا، پیر اسے بھی لے جائیں گے، پیروں میں کانٹے نہیں چبھیں گے۔ قطعاً نہیں رکیں گے، حرام موقع پر لے جاؤ، حلال موقع پر لے جاؤ، اپنی کارگذاری دکھلا دیں گے، تو ہاتھ، منہ، پیر جائز ناجائز دونوں کو قبول کرتے ہیں۔

اس آنکھ سے اگر اپنی ماں اور بیوی کو دیکھے تو پاک نگاہ ہوگی۔ لیکن اجنبی عورت کو دیکھے، ناپاک نگاہ ہوگی۔ مگر

آنکھ دونوں کو دیکھ لے گی۔ اجنبی عورت کے دیکھنے میں تو وہ نہیں آئے گا۔ آنکھ کے اندر کانٹے نہیں چبھیں گے، وہ ویسی ہی لذت لے گی، جیسے حلال عورت کو دیکھنے میں لذت آتی ہے۔ لیکن دل مطمئن نہیں ہوگا۔ دل کہے گا، بڑی غلط حرکت کی، خدا جانے آخرت میں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ تو دل ہمیشہ حق کو قبول کرتا ہے، باطل کو قبول نہیں کرتا اور دل کے سوا جتنے اعضاء ہیں، حق و باطل دونوں کو قبول کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق کا عضو صرف دل ہے، باقی اعضاء حقانی بھی ہیں باطل پرست بھی ہیں۔ نیک بھی ہیں، بد بھی ہیں، انہیں حق بات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے یہ فقط قلب کا کام ہے۔ تو قلب جیسے حقانی عضو میں اگر آدمی ایسی چیزیں بھر لے، جو حلال بھی بن سکتی ہوں اور حرام بھی، تو اس نے قلب کو گندہ کر دیا۔ قلب میں ایسی چیز بھرنی چاہئے کہ جیسے یہ پاک ہے ویسے ہی وہ چیز بھی پاک ہو۔ وہ چیز اللہ کی محبت، علم و معرفت خداوندی اور پاکیزہ اخلاق ہیں کہ یہ حق ہی حق ہیں، ان کی جگہ قلب میں ہونی چاہئے۔ دولت کی جگہ قلب میں نہیں ہونی چاہئے، ہاتھ پیر میں ہونی چاہئے، اس لئے کہ وہ حلال و حرام اور پاک و ناپاک بھی بن سکتی ہے۔

قلب میں خالص پاک چیز آنی چاہئے۔ اہل اللہ کا مذاج ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے کمایا، دولت ہاتھ میں آئی، لیکن دولت کو قبلہ و کعبہ نہ بنایا کہ اس کی پوجا میں لگ جائیں، اسے ایک ضرورت کا زیر استعمال سامان سمجھا، جائز مواقع پر خرچ کیا، حکم خداوندی کے تابع رہے۔ حاصل یہ نکلا کہ دولت کو اپنا خدا بنا لینا کہ اگر وہ پاس ہے تو دل کو چین ہے اور ذرا اس میں کمی آئی، دل بے چین اور ڈانواں ڈول۔

یہ شان اللہ کی محبت کی ہونی چاہئے کہ حق تعالیٰ سے ذرا بعد ہو جائے، تو دل بے چین ہو جائے، اور قرب میسر آئے تو فرحت و انبساط پیدا ہو جائے۔

بازار اگر ذرا مندا (سُست) پڑ جائے، لوگ پریشان ہو جاتے ہیں، اب کیا ہوگا؟ کیا بنے گا؟ جیسے معلوم ہو سارا چین و آرام چھن گیا، یہ نہیں ہونا چاہئے۔ کمانے کی چیز ہے، اسے جائز طریق پر آدمی کمائے۔ لیکن اس کو خادم سمجھے، مخدوم نہ بنائے۔ خدمت اللہ ربّ العزت کی اور اس کی محبت کی کرے۔

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی اور بہت بڑے تاجر ہیں۔ انکی تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی، تو کیفیت یہ تھی کہ روم، شام اور مصر میں جگہ جگہ ان کی تجارت کی کوٹھیاں تھیں اور مال سپلائی ہوتا تھا اور نفع کی رقم جب آتی تھی تو یہ نہیں تھا کہ ایک دو آدمی لے کر چلے آئیں۔ لاکھوں روپے کا خزانہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جب گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی، تو تنگ آ کے کہتے کہ بھئی! کونے میں ڈھیر لگا دو۔ تو روپیہ، سونے اور چاندی کے ٹکڑے اس طرح چھت تک بھرے ہوتے جیسے غلہ بھر دیا جاتا ہے، تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کروڑ پتی صحابہ میں سے تھے۔ مگر قلب کی کیا کیفیت تھی؟ قلب کی کیفیت یہ تھی کہ مہمانداری کثرت سے تھی، تین تین سو، چار چار سو مہمان دسترخوان پر بیٹھتے تھے اور کئی کئی قسم کے کھانے دسترخوان پر

چنے جاتے، مدارات ہوتی تھی۔ جب دستر خوان پر کھانے چن دیئے جاتے اور اب قریب ہوتا کہ کھانا شروع ہو، تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کا دل ایک دم روتا، آنکھوں سے آنسو جاری۔ اور فرماتے، اے اللہ! تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر کبھی ایک سے دوسرا کھانا نہ ہوا اور عبدالرحمٰن کے دستر خوان پر اتنے کھانے؟ کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو نہیں ختم کی جا رہی ہیں؟

کہیں مجھے آخرت سے محروم تو نہیں کیا جا رہا۔ یہ کہہ کر روتے سارے حاضرین اور مہمان روتے۔ اس لئے کہ صحابی ہیں، صاحب دل ہیں۔ ان کے دل کا اثر دوسروں پر پڑتا اب چار سو آدمی کی ساری مجلس بیٹھی رو رہی ہے، گڑگڑا رہے ہیں اور اپنی آخرت کو یاد کر رہے ہیں۔ روتے روتے بدحال ہو جاتے اور سارا دستر خوان بے کھائے پیئے اٹھ جاتا۔ مہمان اور میزبان بھی فاقے سے اٹھ جاتے۔ رات کو پھر دستر خوان چنا جاتا، پھر کھانے کا وقت آتا تو بے اختیار حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کا دل دھڑکنا شروع ہوتا اور رونا شروع کرتے، اور کہتے:

''اے اللہ! مہاجرین اولین اس دنیا میں اس غربت سے گئے کہ کھانے کو ان کو پائی میسر نہیں تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا، اس غربت میں انہوں نے وفات پائی کہ کفن پورا میسر نہیں آیا، سر ڈھانپتے تھے، تو پیر کھل جاتے تھے پیر ڈھانپتے تھے، سر کھل جاتا تھا۔ آخر سر کو ڈھانپا گیا اور پیروں پر گھاس ڈال دی گئی، اس طرح سے دفن کیا، جن کا لقب ''سَیِّدُ الشُّھَدَآءِ حَمْزَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ'' ہے''۔

تو روتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے غربت کا یہ عالم اور عبدالرحمٰن کا یہ عالم کہ دس دس قسم کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ کہیں میری آخرت تو نہیں ختم کی جا رہی ہے۔ حاضرین بھی روتے اور پھر دستر خوان بے کھائے پیئے اٹھ جاتا۔ تین تین وقت کا فاقہ اس طرح سے ہوتا تھا۔

اندازہ کیا آپ نے دولت تو اتنی بے شمار کہ گھر میں غلے کی طرح سے بھری ہوئی ہے اور قلب اتنا متوجہ الی اللہ کہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا ہوش، مسلم کو ایسا بنایا گیا ہے۔ مسلمان کو نہ تو یہ کہا گیا کہ تو شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں جا کر بیٹھ، پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ فرمایا یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے رہبانیت ختم کر دی۔ کمانا فرض بتلایا ہے۔ لیکن کمانے کے بعد لکھ پتی بن جائے۔ تو کیفیت یہ پیدا کر دی جائے کہ ہاتھ پیر میں تو سونا چاندی رکھا ہوا ہو، دل اللہ میں اٹکا ہوا ہو۔ مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیئے۔

اور مذاہب میں ترک دنیا اس طرح سکھلائی گئی کہ دولت کو ختم کر دو۔ اسلام میں اس طرح سے سکھلائی گئی کہ کماؤ مگر دل سے ترک کر دو۔ محبت کا تعلق نہ رہے۔ یہ زیادہ حوصلہ کا کام ہے۔ دنیا کو بالکل چھوڑ کر پہاڑ میں جا بیٹھے، یہ آسان ہے۔ لیکن سامنے موجود ہو، پھر دل میں گنجائش نہ ہو، یہ ہر ایک کا حوصلہ نہیں۔ یہ مشکل کام ہے۔ یہ مجاہدہ مسلمان کو بتلایا گیا کہ سب کچھ لے کر پھر قلب سے بے تعلق رہے اور ہاتھ پیر سے اس طرح لگا رہے جیسے چوبیس گھنٹے اسی کام کے ہوں۔

حاصل یہ نکلا کہ دولت کتنی بڑھ جائے، اس کو وفادار نہیں بتلایا گیا۔ وہ دنیوی زندگی میں بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور مرنے کے وقت تو چھوڑتی ہی ہے۔ جو ایسی بے وفا چیز ہو، اس سے محبت کر کے آدمی کیا کرے؟ اسے غلام اور خادم بنائے رکھے، یہی اس کا حق ہے۔ پھر بھی اگر اس کو قبلہ بنالے، تو حشر یہ ہوگا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال میں بیان فرمایا کہ عین مرتے وقت مال سے مدد طلب کی کہ میں نے ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح تیری عزت کی، کیا تو میرے کام آئے گا؟ اس نے کہا میں تیرے کام آنے والا نہیں۔ اس وقت آدمی پچھتائے گا کہ میں نے سارا دل ودماغ کا سرمایہ اس کے اوپر لگا دیا اور اس نے وفا نہ کی، افسوس رہا۔ تو فرمایا کہ یہ تو بڑا بھائی ہے۔

1 **منجھلے بھائی کا سلوک**...... اور فرمایا سمجھے منجھلا بھائی کون ہے؟ فرمایا وہ انسان کے بیوی اور بچے ہیں کہ انسان مرتے وقت امید کی نگاہیں ڈالتا ہے کہ شاید میری بیوی یا اولاد کام آ جائے۔ میرا آخری وقت ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں کام آ سکتے۔ تو جانے تیری قبر جانے زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ تو مر جائے گا تو تجھے زیر زمین دفن کر دیں گے۔ لیکن آگے تو جانے، تیرا کام جانے۔ ہم تیرے مددگار نہیں حالانکہ بیوی بچے آدمی کے وہ ہیں کہ آدمی بعض اوقات ان کی محبت میں جان بھی کھو دیتا ہے، بعض دفعہ ایمان بھی کھو دیتا ہے۔ اولاد کی صحت اور بیماری سے بچانے کے لئے بعض مرتبہ ماں باپ شرکیہ چیزیں بھی کر گزرتے ہیں۔ ٹونے اور ٹوٹکے نیز سحر اور جادو بھی کرا لیتے ہیں۔ سحر حرام سے بھی باز نہیں رہتے کہ کسی طرح سے اولاد بچ جائے، کسی طرح سے جان بچ جائے۔ اولاد کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ مگر مرنے کے وقت وہ بھی ٹکا سا جواب دے دے گی کہ میں تمہارے کام کی نہیں۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔ یہ کہے گا، میں نے عمر بھر تیرے ساتھ سلوک کیا، وہ کہے گی، کیا ہوگا، تو نے جھک مارا، کس نے کہا تھا تجھے سلوک کرنے کو۔ اب بھگت اکیلے ہی۔ ہم تیرے کام آنے والے نہیں ہیں۔ تو فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھائی کیسا ہے۔ عرض کیا: یارسول اللہ! یہ بھائی شریف نہیں ہے۔ یہ بھی کمینہ خصلت نکلا۔

اس واسطے بیوی بچوں سے محبت ہو تو ان کی اصلاح کے لئے ہو، ان کی تعلیم وتربیت کے لئے تعلق ہو۔ بیوی کی محبت اس لئے ہو کہ اس کو بھی خدا پرستی میں لگایا جائے۔ محض نفس پرستی کی محبت ہوگی تو سب سے پہلے وہ الگ ہو کر یہ کہے گی، میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں وہ کہے گا میں تیرا خاوند ہوں، وہ کہے گی میں نہیں جانتی۔ اب تو میں دوسرے کے گھر جانے والی ہوں یا بیٹھنے والی ہوں۔ میرا تیرا واسطہ کیا؟۔ لیکن اگر تربیت کی اور اسے سیدھے سچے راستے پر لگایا، وہ کہے گی کہ میں ایصال ثواب بھی کروں گی، میں قبر میں بھی تجھے نہیں بھلاؤں گی۔

آخرت میں بھی نہیں بھلاؤں گی، تو مطمئن رہ میں برابر ثواب پہنچاؤں گی۔ اولاد کہے گی، میں تیرے لئے صدقہ جاریہ ہوں۔ تو نے میری تربیت کی، مجھے علم پڑھایا، عمل کے راستہ پر لگایا، آج تو جا رہا ہے، تو میرا عمل تیرے ساتھ جا رہا ہے۔ میرا صدقہ جاریہ ہونا تیرے ساتھ ہے، تو فکر مت کرنا۔ لیکن اگر محض اولاد ہی اولاد ہے، یا بیوی ہی بیوی ہے، کوئی تربیت نہیں، محض نفس پرستی اور تعیش ہی ہے اور کچھ نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا تیرا کیا

واسطہ؟ تو جانے تیرا کام جانے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' یہ منجھلا بھائی کیسا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا بالکل بیکار اور کمینہ خصلت ثابت ہوا۔

چھوٹے بھائی کا حسن سلوک......فرمایا: اور سمجھے وہ تیسرا بھائی کون ہے؟ جس کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی کی اور اس نے کہا میں ہی آج کام آؤں گا۔ فرمایا وہ انسان کا نیک عمل ہے جس سے انسان عمر بھر بدسلوکی کرتا ہے۔ نماز کا گلا گھونٹتا ہے، یہ روز کا معمول ہے۔ نہ وقت کی پابندی نہ مسجد کی حاضری۔ کتنے انسان ہیں کہ رمضان آ رہا ہے، لیکن انہیں ذرا احترام نہیں۔ بر سر بازار وہ سگریٹ پیتے اور کھاتے پھر رہے ہیں۔ بہت سے اللہ کے بندے ہیں کہ انہیں بے شمار دولت دی گئی۔ انہیں زکوٰۃ و صدقات کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ وہ تعیش اور سینما تھیٹر پر خرچ کریں گے، یا شراب و کباب پر خرچ کریں گے۔ تو اس میں خرچ کرتے ہیں اور نیکی کا گلا گھونٹتے ہیں۔ نہ نماز کی فکر نہ روزے کی فکر، نہ حج کی فکر۔ اور اگر یہ چیزیں سرانجام دیں، تو دل میں غرور کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ اس لئے کہ باوجود دولت کے میں نے نماز پڑھ لی۔ معاذ اللہ اللہ پر کوئی احسان کیا۔ نماز پڑھنا چاہئے تو نہیں تھا، اس لئے کہ دولت مجھے فرصت کب دیتی ہے۔ یہ میرا احسان ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی اور حج کر لیا۔ حج کرنے کے بعد تو گویا ساتوں جنتیں میرے قبضے کی ہو گئیں۔ اب میرے نیچے سے نکل ہی نہیں سکتیں تو یا تو عمل ندارد اور اگر کرے تو غرور موجود ہے، اس سے تو نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

بہرحال نیکی کے ساتھ انسان بدسلوکی کرتا ہے۔ سوائے اس کے کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو نیکی تقویٰ اور طہارت کو اصل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی نیکی کو قائم رکھنے کے لئے جان و مال کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر وہ سو میں دو چار ہوتے ہیں۔ زیادہ وہی ہوتے ہیں جنہیں نیکی وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس لئے کہ آخرت پیش نظر ہے ہی نہیں بس یہیں کا سارا جھگڑا سامنے ہے۔

تو مرنے کے وقت جب آدمی نیک عمل کی طرف رجوع کرے گا، تو یہ نیک عمل کہے گا۔ میں ہی ہوں تیرے کام آنے والا۔ اگرچہ تو نے میرے ساتھ بدسلوکی کی۔ میں قبر میں، حشر میں، پل صراط پر تیرے ساتھ ہوں اور جنت میں بھی جو تجھے منافع ملیں گے، وہ میری وجہ سے ملیں گے۔ اس لئے وہاں بھی تیرے ساتھ ہوں۔ تو ابدالآباد تک جو چیز انسان کا ساتھ دینے والی ہے، وہ انسان کی نیکی اور عمل صالح ہے۔

حدیث میں ہے کہ: جب آدمی قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور سوال و جواب میں پورا اترتا ہے، اس کی قبر جہاں تک نگاہ جاتی ہے، وسیع کر دی جاتی ہے۔ اسے ایک عظیم عالم نظر پڑتا ہے، جس میں روشنی بھی ہے، چاندنا بھی ہے، تو دور سے اسے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے چہرے سے خیر و برکت ٹپکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس کا چہرہ دیکھ کر دل میں فرحت اور خوشی بھر جاتی ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ قریب آ رہا ہے۔ جب قریب آتا ہے تو یہ میت پوچھتی ہے، اے شخص تو کون ہے؟ اس تنہائی کے گھرانے میں تو میرے پاس آیا۔ تیرے چہرے کو دیکھ کر مجھے

یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل خوشیوں سے لبریز ہے۔ تو کون ہے جو اس بے کسی کے عالم میں میرے پاس آرہا ہے۔ وہ کہے گا تو مجھے بھول گیا، اتنی جلدی فراموش کر دیا۔ اَنَا عَمَلُکَ الصَّالِحُ ① میں تیرا نیک عمل ہوں۔ میں تجھے تسلی دینے کے لئے آیا ہوں کہ اسی تنہائی میں قطعاً مت گھبرانا، میں تیرے ساتھ ہوں۔ کوئی آنچ تجھ پر نہیں آسکتی آئے گی تو میں اسے جھیلوں گا۔

تو عمل صالح وہ ہے جو نزع میں بھی ساتھ، قبر میں بھی ساتھ۔ حدیث میں ہے کہ نزع کے وقت خود ملک الموت علیہ السلام تلقین کرتے ہیں کہ دیکھ جان کنی کا وقت قریب ہے۔ اب بھی اللہ اللہ کر لے، اب بھی کلمہ پڑھ تو نیکی کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس وقت آدمی عمل تو نہیں کر سکتا، بے بس ہے، بعض دفعہ تو زبان بھی بے بس ہوتی ہے۔ آدمی وہ بھی نہیں کر سکتا، مگر دل میں تصور کر سکتا ہے۔ اس وقت کا وہ عمل بھی کارآمد ہو جاتا ہے کہ وہ دل کے اندر توحید و رسالت اور ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کا ورد کر رہا ہے۔ تو ملک الموت بھی کہتے ہیں کہ ہاں جلدی کر۔ اس کو تلقین کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہی نیکی کارآمد ہوگی۔ اس وقت کی یہ نیکی بھی کارآمد ہوگی۔ تو اس وقت دولت، بیوی، بچوں کا کام نہیں کر سکتا۔ کر سکتا ہے تو صرف نیکی کا کام کر سکتا ہے۔ تو نزع میں بھی نیکی کارآمد ہوئی۔

قبر میں بھی نیکی کارآمد ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے۔ تو چاروں طرف سے عذاب اس کی طرف دوڑتا اور بڑھتا ہے۔ لیکن اگر کسی کے دماغ میں قرآن کی آیتیں محفوظ ہیں، وہ کھڑی ہو جاتی ہیں، خبردار! اِدھر سے مت آنا۔ عذاب کا راستہ روک دیتی ہے۔ دائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں ہے کہ نمازیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ خبردار اِدھر سے مت آنا۔ بائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پیروں کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو زکوٰۃ وصدقات کھڑے ہو جاتے ہیں چہار طرف سے ناکہ بندی کر دیتے ہیں۔ عذاب رک جاتا ہے۔ اس طرح سے عذاب سے حفاظت کرنے والے وہاں اعمال صالحہ بنتے ہیں۔ وہاں بیوی، بچے اور رشتہ دار مدد کو نہیں پہنچتے۔ البتہ نیکی وہاں سنتری بن کے حفاظت کرتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جب آدمی پر پھانسی کا مقدمہ چل جائے اور تمام ثبوت بیکار ہو جائیں اور یقین ہو کہ اب پھانسی چڑھے گا۔ اس وقت دنیا کا دستور ہے کہ مجرم براہ راست بادشاہ کے سامنے مراحم خسروانہ کی درخواست کرتا ہے کہ قانون میں تو گنجائش نہیں ہے۔ بادشاہ اگر خصوصی رحم و کرم سے مجھے چھوڑ دے، تو میری رہائی ہو سکتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی بادشاہ اور حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کو پیش کرتا ہے۔

قدیم زمانے میں دستور تھا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی شاہی فرمان ہوتا تھا، تو لوگ مراحم خسروانہ کی درخواست

---

① المصنف لابن ابی شیبة، باب فی نفس المومن کیف تخرج، ج:۳، ص:۲۵۶، رقم: ۱۲۰۵۹۔ امام ہیثمیؒ فرماتے ہیں امام احمد نے اس کو مطول ذکر کیا ہے اور اس کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب السوال فی القبر ج:۱ ص:۴۷۱۔

پیش کرتے وقت وہ لے جا کر پیش کرتے تھے کہ ہم تو پشتینی حکومت کے وفادار ہیں، ہمارے گھر میں تو بادشاہ کا فرمان موجود ہے، ہمیں بادشاہ اور حکومت نے اپنا سمجھا تھا۔ ہم اس فرمان کو پیش کر کے نجات چاہتے ہیں۔ ہم وفادار، خدام، فدیہ اور حکومتی ٹیکس ادا کرنیوالا فدوی اور غلام ہیں۔ تو دستور یہ تھا کہ شاہی فرمان ادب کے ساتھ سر پر رکھ کر پیش کیا کرتے تھے کہ یہ فرمان ہے۔ ہم حکومت کے وفادار ہیں۔ اس لئے ہم کو چھوڑ دیا جائے تو ادب کی وجہ سے سر پر رکھ پیش کرتے تھے ہاتھ سے پیش نہیں کرتے تھے۔ تو علماء لکھتے ہیں کہ جب عذاب خداوندی سر کی طرف سے آئے گا تو یہ شخص جس کے دماغ میں قرآن کریم محفوظ ہے۔ یہ قرآن کریم کو پیش کرے گا کہ میں تو اللہ کی حکومت کا فرمانبردار ہوں، میں غلام رہ چکا ہوں میرے گھر میں تو یہ شاہی فرمان ''قرآن کریم'' آیا ہوا ہے۔ میں سر پر رکھ کر پیش کرتا ہوں کہ اس کی بدولت مجھے نجات دی جائے اور ابدالآباد کی پھانسی سے مجھے بچایا جائے۔ تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو قرآن روکتا ہے۔ اسی حدیث میں ہے ''اَلصَّلٰوۃُ بُرْھَانٌ'' ① نماز انسان کی دستاویز ہے اور عدالت میں جب اپنی رہائی کے ثبوت کے لئے دستاویز پیش کرتے ہیں، تو ادباً دائیں ہاتھ سے پیش کرتے ہیں۔ گویا نماز دائیں طرف سے عذاب کو روکے گی۔ گویا یہ انسان کی دستاویز ہے۔

اسی حدیث میں فرمایا گیا: اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ ② روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے تو جب وار روکا کرتے ہیں تو ڈھال بائیں ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو روزہ مثل ڈھال کے آگے آجاتا ہے۔ تو ادھر سے بھی عذاب نہیں آسکتا۔ اور زکوٰۃ و صدقات یہ انسان کے پامزد ہیں۔ ہاتھ پیر کی کمائی ہے۔ تو پیروں کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو یہ صدقات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض قبر میں چہار طرف سے ناکہ بندی عمل صالح ہی کرتا ہے۔

نیکی ہر عالم میں کارآمد ہوگی...... حدیث میں ہے کہ آدمی جب قبر سے اٹھ کر میدان محشر میں جائے گا، تو اس کے آگے آگے ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' سر کے اوپر ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ''، دائیں طرف ''سُبْحَانَ اللّٰهِ''، بائیں طرف ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' اور پشت پر ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' ہوگا اور یہ پانچوں کلمے اس طرح سے حفاظت کرتے ہوئے لے جائیں گے، جس طرح سپاہی حفاظت سے لے جاتے ہیں اور میدان محشر کے ہولناک مناظر سے بچادیں گے۔ بلکہ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ ③ اللہ کی طرف سے آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں کچھ چیزیں ہوں گی۔ جو اللہ کے امر سے حفاظت کریں گی۔ وہ معقبات یہ تسبیحات ہوں گی۔ اللہ

---

① السنن للترمذی، ابواب الصلوة عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی فضل الصلوة، ج: ۲ ص: ۵۱۲ رقم: ۶۱۴. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج: ۲ ص: ۱۱۴ رقم: ۶۱۴. ② السنن للترمذی، ابواب الصلوة عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی فضل الصلوة، ج: ۲ حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج: ۲ ص: ۲۶۴ رقم: ۷۶۴. ③ پارہ: ۱۳، سورة الرعد، الآیة: ۱۱.

کے نام اور کلمات ہیں جن کے ذریعے سے آدمی بچے گا، تو محشر میں بھی عمل صالح ہی کام آیا قبر ونزع میں بھی عمل صالح کام آیا۔ زندگی میں بھی اگر کام آتا ہے تو یہی عمل آتا ہے۔ اگر کوئی شخص متقی ہے اور وہ اتفاق سے کسی مصیبت میں پھنس جائے تو لوگوں کی ہمدردیاں اس کیساتھ ہوجاتی ہیں کہا کرتے ہیں کہ بھائی غریب آدمی ہے، بے چارہ پھنس گیا مصیبت میں، یہ کوئی چور ڈاکو نہیں، کبھی برائی نہیں کرتا تھا، آج اس پر مقدمہ قائم ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کسی دشمن نے شرارت کی ہے۔ یہ اپنی ذات سے برا نہیں۔ تو نیک آدمی کو دنیا بھی اچھا کہتی ہے اور بدآدمی کو دنیا بھی برا کہتی ہے تو نیکی اور تقویٰ دنیا میں کام آتا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا o وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ① جو اللہ سے ڈرتا ہے، نیکی کرتا ہے اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا ہے۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ میں تو ہر طرف سے پھنس چکا تھا۔ یہ کہاں سے راستہ پیدا ہوگیا۔ اللہ کی طرف سے اس کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے مدد ہوتی ہے۔

﴿وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ② جب رزق کے دروازے ہر طرف سے بند ہوجاتے ہیں، اگر آدمی نیک اور متقی ہے، تو ایسے راستے سے رزق بھیجتے ہیں کہ وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ اس راستہ سے رزق آئے گا۔

تو دنیا میں، مرنے کے وقت اور قبر میں بھی حتیٰ کہ حشر میں بھی نیکی ہی کام آئی۔ اس کے سوا کوئی چیز کہیں کام نہیں آتی۔ بلکہ بیوی اور بچے بھی جبھی کام آتے ہیں، جب ان کے اندر نیکی پیدا کردی جائے۔ وہ بدمزاج ہوں تو بیوی وبال بن جاتی ہے۔ اولاد اگر بری پیدا ہوئی تو وہ ایک مستقل مصیبت بن جاتی ہے نبی کریم داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی ہے ''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَّلَدٍ يَّكُوْنُ عَلَیَّ وَبَالًا. اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ امْرَاَةٍ تُشَيِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِيْبِ'' ③ اے اللہ! ایسی عورت سے پناہ مانگتا ہوں، جو بڑھاپے سے پہلے مجھے بوڑھا کر دے۔ یعنی رات دن اتنا ستائے کہ میں غم میں گھل گھل کر وقت سے پہلے بوڑھا ہوجاؤں۔ اور ایسی اولاد سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو میرے لئے عذاب اور وبال بن جائے کہ نہ چھوڑ کے بن پڑتی ہے، نہ پکڑ کے بن پڑتی ہے۔ چھوڑ کے دھکا بھی نہیں دے سکتے کہ اولاد ہے۔ رکھے تو رات دن اس کی بدمزاجی کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار، اولاد و بیوی وبال جان بنتی ہیں۔ راحت کا ذریعہ کب بنتی ہیں؟ جب ان کو نیکی کا راستہ دکھایا جائے۔ تو یہاں بھی نیکی ہی کام آئی۔ اولاد اور بیوی کام نہیں آئی۔ حدیث میں ہے کہ: چند چیزیں ہیں جن کے صدقہ جاریہ کا ثواب آدمی کو پہنچتا رہتا ہے۔ جیسے کنواں، سرائے یا مسافر خانہ بنوادیا تو جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، آرام حاصل کریں گے۔ اسے ثواب ملتا رہے گا۔ ④ یہ ابدی صدقہ ہے۔ کسی نے مسجد ومدرسہ بنوادیا۔ جب تک لوگ اس میں

---

① پارہ: ۲۸، سورة الطلاق، الآیة: ۲، ۳. ② پارہ: ۲۸، سورة الطلاق، الآیة: ۳. ③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمه : محمد ج: ۱۳ ص: ۴۳۷ علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیه من لم اعرفهم۔

④ الصحیح لمسلم، کتاب الوصیة، باب مایلحق الانسان من الثواب بعدوفاته، ج: ۳ ص: ۲۵۵ رقم: ۱۶۳۱.

پڑھیں گے، عبادت کریں گے اجر وثواب بنانے والے کو ملتا رہے گا یہ صدقات جاریہ ہیں۔فرمایا گیا سب سے بڑا صدقہ جاریہ انسان کی نیک اولاد ہے۔جس کو آدمی سچے راستے پر ڈال دے۔جب تک وہ نیکی کرے گی، اس کی نیکی کو دیکھ کر کوئی اور نیکی پہ چلے گا، تو جو سب کو اجر ملے گا، وہ تنہا اس شخص کو ملتا رہے گا۔جس نے اولاد کو صالح بنایا، دین سکھلایا، علم دین پڑھایا، ان کی نیکیاں دیکھ کر محلہ والے، شہر والے نیک بن گئے۔تو سب کو مل کر جتنا ثواب ملے گا، اس تنہا کو ملے گا، جس نے یہ راستہ پیدا کیا۔تو اولاد صدقہ جاریہ کب بنتی ہے جب نیکی کے راستے پر ڈال دو۔تو فی الحقیقت نیکی ہی کام آئی۔ اولاد کام نہیں آئی۔ بیوی کب راحت بنتی ہے، جب اس کے ماں باپ نے اس کے اخلاق درست کر دیئے ہوں۔اس کو صحیح تربیت دی ہو کہ وہ اپنے خاوند اور سسرال کے لئے راحت کا ذریعہ بنے۔تو راحت عورت نے نہیں پہنچائی، اس کی نیکی نے پہنچائی۔

حاصل یہ نکلا کہ عمل صالح دنیا میں، قبر میں اور آخرت میں بھی کام دے گا۔نہ بیوی نہ اولاد نہ رشتہ دار اور نہ دولت کام آئیں گے۔وہ تو بڑے اور منجھلے بھائی ہیں جو وقت کے اوپر جواب دیں گے۔یہ بے چارہ عمل صالح ہی چھوٹا بھائی ہے جو ہر جگہ کام دیتا ہے۔

تو اس مثال سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا باریک مسئلہ حل فرما دیا۔اولاد اور دولت کی پوزیشن بھی بتلادی اور عمل صالح کی بھی۔اگر ویسے حجت و برہان سے سمجھایا جاتا تو شاید میری اور آپ کی سمجھ میں نہ آتا مثال دے کر سمجھایا تو بات بالکل عیاں ہوگئی اور کھل گئی۔یہ انبیاء علیہم السلام کی خاص علمی قوت ہے کہ باریک مسائل کو مثالوں کے ذریعے واضح فرما دیتے ہیں۔تو عمل صالح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے عمدہ طریق پر واضح فرما دیا۔اس کی حیثیت کھل گئی اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا:

عمل صالح کی ضرورت...... ﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا﴾ اے لوگو! عمل کرو۔محض باتیں نہ بناؤ، محض معلومات میں اضافہ مت کرو۔یہ ایک قسم کا تعیش ہے، یہ ذہن کی عیاشی ہے، یہ کارآمد نہیں ہوگی۔علم کو اپنے اندر سمو کر عمل صالح کا راستہ بناؤ۔یہ کارآمد ہوگا۔تو اے پیغمبر! فرمادیجئے اے لوگو! عمل کرو۔﴿فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ① یہ جو تم عمل کر رہے ہو۔یہ رائیگاں جانے والا نہیں ہے اسے عنقریب اللہ اور اس کے رسول اور مومنین بھی دیکھنے والے ہیں۔قیامت کے دن مسلمانوں کے سامنے بھی تمہاری زندگی آئے گی۔اللہ کے سامنے اعمال پیش ہوں گے۔

انبیاء علیہم السلام اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اعمال پیش ہوں گے کہ یہ ہی آپ کی امت کے اعمال اور اولین و آخرین جتنے ایمان والے ہیں، سب کے سامنے ہر ہر شخص کی زندگی آئے گی۔تو فرمایا گیا، ایسے موقع سے غافل مت رہو، جس میں ساری چیزیں کھلنے والی ہیں۔اگر ہماری کوئی برائی ہو اور ہمارے گھر والوں کے

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۵.

سامنے آجائے۔ تو ہم منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ گھر والوں کی نگاہ میں بھی ہماری ذلت ہوگی اور گھر والوں سے گزر کر محلے والے بھی جان لیں، تو اور زیادہ شرمندگی ہوتی ہے اور اگر محلے سے گزر کر پورے شہر میں پھیل جائے کہ فلاں صاحب نے یہ کرتوت کی، تو گھر سے نکلنے کا منہ نہیں ہوتا۔ تو دوسروں میں ذرا ہماری بدی پھیل جائے، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اور جب خدانخواستہ اولین و آخرین کے سامنے ہماری برائی آ گئی، آدمؑ کی ساری اولاد دیکھے گی۔ اس میں مسلم و کافر اپنے اور پرائے سب ہی ہیں۔ ہر ہر شخص علی رؤس الاشہاد دیکھے گا کہ فلاں نے یہ حرکت کی تھی۔ اس وقت شرمندگی کا کیا حال ہوگا؟ اس وقت انسان کی خفت و ندامت کا کیا عالم ہوگا؟

تو اس وقت سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① اس دن سے ڈرو جب سب رب العالمین کے سامنے کھڑے حساب دیتے ہوئے ہوں گے ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ﴾ ② جب قیامت کے دن اللہ، رسولوں کو جمع کریں گے اور فرمائیں گے جب تم نے ہدایت کی، تو امتوں نے تمہارے سامنے کیا کیا جواب دیئے۔ اور وہ کہتے ہوئے ہوں گے کہ فلاں نے میری بات مانی اور فلاں نے نہیں مانی۔ فلاں طبقے نے سنا اور فلاں طبقے نے میرے کہنے کو بالکل اکارت کر دیا۔ اس وقت کی رسوائی، شرمندگی اور فضیحت کتنی بڑی ہوگی، اس کا کوئی اندازہ یہاں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا۔

روز کے روز نیک اعمال کرتے رہنا چاہیے...... اس واسطے حدیث میں حضرت عمر بن خطاب کا ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: "حَاسِبُوْا انفسکم قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا" ③ اس سے پہلے اپنی زندگی کا حساب لے لو، کہ وہاں حساب لیا جائے۔ اس سے پہلے اپنے کچے چٹھے کو درست کر لو۔ جو وہاں پر خدا کے اکاؤنٹنٹ ہیں، وہ تمہارے حساب کو جانچیں۔

اگر یہ معمول بنا لیا جائے تو کوئی بڑی بات نہیں عمر بھر کی باتیں آدمی کو یاد نہیں رہتیں۔ لیکن روز کی بات تو روز یاد رہتی ہے۔ اگر چارپائی پر لیٹ کر آدمی عشاء کے بعد ایک وقت مقرر کر لے کہ لیٹ کر دس منٹ کیلئے سوچے، دن میں میں نے کتنی بدیاں کیں اور کتنی نیکیاں کیں اگر نیکیاں سمجھ میں آئیں تو اللہ کا شکر کرے، کہ یہ محض اللہ کا فضل ہے جو مجھے نیکی کی توفیق دے دی۔ تو وعدۂ خداوندی ہے کہ جس نعمت پر شکر کرو گے، اس نعمت کو بڑھاتا جاؤں گا۔ نیکی پر شکر کرو گے، نیکی بڑھتی جائے گی اور دن بھر میں جتنی بدیاں کی ہیں، وہ بھی آدمی سوچ لے جو بدی سامنے آئے، گڑ گڑا کے اللہ کے سامنے توبہ کرے کہ اے اللہ! میرے سے غلطی ہوئی۔ اگر اللہ کا حق تھا، توبہ کر لے، امید ہے کہ معاف ہو جائے گا۔ اگر مخلوق کا حق تھا، اگلے دن حق کو ادا کر دے کسی کا روپیہ مار لیا تھا، اسے دے دے۔ کسی کو گالی دی تھی یا غیبت کی تھی، اس سے معافی مانگ لے حقوق اللہ ضائع کئے ہیں تو توبہ سے معاف ہو جائیں گے۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۶۔ ② پارہ: ۷، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۰۹۔ ③ السنن للترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقاق والورع، باب ماجاء فی صفۃ اوانی الحوض، ج: ۴ ص: ۶۳۸ رقم: ۲۴۵۹۔

حقوق العباد ضائع کیے ہیں، توبہ کرے اور صاحب حق سے معافی مانگ لے۔ اگر روز کے روز کچا چٹھا صاف ہوتا رہا، آدمی کو مرنے کا غم نہیں ہوگا۔ مرنے کے وقت حساب صاف ہوگا، کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اور اگر روز کے روز نہ کیا، آج پچاس بدیاں کیں، وہ جمع ہوگئیں، کل اور کیں، ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ تیسرے دن اور بیس پچاس کیں، تو ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ مرنے کے وقت ظلمتوں کے سیاہ پردے سامنے پڑے ہوئے ہوں گے۔

کس طرح سے آدمی انہیں دھوئے گا، اگر ایک کپڑے پر دھبہ پڑ جائے؛ جبھی کپڑا صابن سے دھودے کپڑا صاف اور اگر دھبے پڑتے پڑتے مہینے بھر میں سارا کپڑا سیاہ ہوگیا، تو سارے بازار کا صابن خرچ کر کے بھی دھبے نہیں جائیں گے۔ وہ تو کپڑا ہی کالا ہوگیا۔ اس واسطے آدمی روز کے دھبے دھولے۔ تو صاف ہو جائیں گے ان کو جمع نہ کرے۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا اگر کوئی بدی کرے تو بدی کے ساتھ ساتھ توبہ بھی کرے تاکہ وہ مٹ جائے' نامہ اعمال درست ہو جائے۔ جمع و اصرار اس کے اوپر نہ کرے، تو یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ کرلیا کرے۔ سونے کے وقت دس منٹ مقرر کرے کہ آج میں نے کتنی نیکیاں کیں۔ کتنی بدیاں کیں۔ نیکیاں یاد آئیں تو شکر کرے اور بدیاں یاد آئیں تو توبہ کرے۔ جب روز توبہ ہوتی رہے گی، بدیاں مٹتی رہیں گی۔ تو آدمی ہلکا پھلکا رہے گا۔ بڑی آسانی سے موت کے لئے منتظر ہو جائے گا اور موت کے تصور سے کوئی گرانی نہیں ہوگی۔

نیکی سے امید اور بدی سے مایوسی پیدا ہوتی ہے...... اس لئے کہ نیکی کرنے سے امید پیدا ہوتی ہے، بدی کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے جو ملازم ہمیشہ نالائقیاں کرتا ہے اسے مایوسی ہوتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں ملنا ملانا، بس آقا کی طرف سے جوتیاں پڑیں گی اور جو کام عمدہ کرتا ہے، اسے تمنا رہتی ہے کاش میرے سے کوئی پوچھے، تونے کیا کام کیا تاکہ میں بتا سکوں کہ میں نے یہ کیا یہ کیا مجھے انعام ملے گا، تنخواہ بڑھے گی، مالک کے دل میں میری قدر بڑھے گی۔ تو نیکی کرنے سے امیدیں بندھتی ہیں۔ حق تعالیٰ سے ملنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اور بدیاں کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے، گھٹن پیدا ہوتی ہے اللہ کے سامنے جانے کو جی نہیں چاہتا نیک آدمی تمنا میں رہتا ہے کہ کب موت آئے اور مجھے بدلے ملیں اور بدآدمی مایوس ہوتا ہے کہ کسی طرح موت نہ آئے، اسے مرنا بھی موت ہو جاتا ہے۔

اسی واسطے کفار کے بارے میں فرمایا گیا، چونکہ انہیں مایوسی ہوتی ہے، کیونکہ وہ کفر میں مبتلا ہیں۔ آخرت کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس لئے انہیں مرنا بھی بھاری ہے ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾ ① تم ان کو اس زندگی کے اوپر انتہائی حریص پاؤ گے۔ اگر ان کی عمر پچاس برس کی ہو تو وہ چاہیں گے، ساٹھ برس کی ہو جائے، دنیا سے ٹلنے کا نام نہیں لیں گے۔ ﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ ② اور جو شرک میں مبتلا ہیں، وہ اس تمنا میں ہیں کہ کاش ایک ہزار برس کی عمر مل جائے۔ وہ مل جائے تو چاہیں گے کہ ایک ہزار کی اور مل جائے۔ وہ دنیا سے ٹلنا چاہتے ہی نہیں۔ اس لئے کہ آئندہ انہیں کوئی توقع نہیں۔ مایوسیاں اور

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۹۶. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۹۶.

ظلمتیں ان کے سامنے ہیں۔ مستقبل ان کا تاریک ہے۔

اور نیک آدمی مومن تو اس کے بارے میں ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا، یہود نے کہا تھا ہم اولیاء اللہ ہیں، تو فرمایا گیا ﴿قُلْ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْآ اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① اے یہود! اگر تم اولیاء اللہ ہو، اور تم اللہ کے دوست ہو، تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ۔ ولی کو تو تمنا ہوتی ہے کہ کب میں اس دنیا کو چھوڑوں اور اپنے پروردگار کے پاس جاؤں تم اگر واقعی ولی ہو تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ۔ حالانکہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ موت کے نام سے تمہیں بخار چڑھتا ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ بس دنیا سے کسی طرح ٹلیں ہی نہ اور ایک ولی کامل کہتا ہے کہ یا اللہ! کب وہ دن آئے کہ اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑ کر پاک وطن میں پہنچیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں برویم	راحت جاں طلبیم در پے جاناں بروئیم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے	تادر میکدہ شاداں و غزلخواں بروئیم

وہ کہتے کہ وہ کیسا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑی ہوئی بستی کو چھوڑ کر ہم اس پاک وطن میں پہنچیں گے غزل خواں وفرحاں وشاداں اور اللہ کے گن گاتے ہوئے اللہ کے ہاں آخرت میں پہنچیں گے۔ تو ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ مرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور بدی کا خاصہ یہ ہے کہ مایوسی بڑھتی ہے۔ خدا سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔

اس واسطے فرمایا مشرکین کو حیات دنیوی پر زیادہ حریص پاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی نیکی بڑھتی جائے گی، انسان کے لئے مرنا خوشگوار ہوتا جائے گا۔

یہ جو بعض اوقات ہماری کیفیت ہوتی ہے کہ ذرا سا بیمار ہوئے اور گمان ہوا کہ موت آئی تو بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں کہ کچھ کرو، کوئی تعویذ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ٹل جائیں مرنا جینا یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ مگر انسان اتنا گھبرا جائے، خدا جانے کیا ہو جائے گا۔ ایک صالح اور نیک بندے کے لئے تو خوشی کا مقام ہے کہ زندہ رہوں تو روزہ، نماز، طاعت وعبادت وغیرہ کا عمل نصیب ہوگا اور اگر مر گیا، تو اللہ کی ملاقات نصیب ہوگی، اس سے بہتر کیا چیز ہوگی۔ تو زندگی بھی خوشگوار، مرنا بھی خوشگوار! حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وفات کا جب وقت آیا تو چہرہ کھلا ہوا ہے، خوشی اور مسرت میں ڈوبے ہوئے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! نزع کی تکلیف ہو رہی ہے اور خوشی ایسی جیسے معلوم ہو کہ شادی ہونے والی ہے فرمایا "غَدًا نَلْقَى مُحَمَّدًا وَّاَصْحَابَهٗ" ② پس عنقریب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے ملاقات ہونے والی ہے۔ اسی خوشی میں جان دے رہے ہیں کہ اب وقت قریب ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت کے وقت خوش ہیں، روزے سے ہیں، فرمایا بس عنقریب افطار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا کر کرنا ہے۔ چند منٹ رہ گئے ہیں یہ کیفیت نیکی اور تقویٰ وطہارت سے پیدا ہوتی ہے کہ

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶۔ ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الزکوۃ، باب الانفاق و کراھیۃ الامساک، ج: ۶ ص: ۱۷۷۔

موت خوشگوار بن جاتی ہے بلکہ تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر حال روز کے روز اگر محاسبہ کر لیا جائے اور اپنی نیکیوں کو شکر کے راستے سے بڑھایا جائے اور بدیوں کو توبہ کے راستے سے ختم کر دیا جائے۔ تو موت خوشگوار ہو جائے گی۔ اگر تصور بندھے گا کہ موت آنے والی ہے تو گھبراہٹ نہیں پیدا ہوگی۔ یہ کہے گا یا اللہ! اگر میں زندہ رہوں، تب بھی تیرا ہوں، مروں تب بھی تیرا ہوں۔ یہاں تو نے زمین کی سطح پہ رکھا ہے، وہاں زمین کی تہہ میں۔ عالم دونوں تیرے ہی ہیں۔ اس لئے تیرے ہی پاس رہوں گا، مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں قبر کے ہولناک حالات ارشاد فرمائے کہ منکر نکیر اس ڈراؤنی شکل میں آئیں گے۔ قبر میں یوں تاریکی اور اندھیرا ہوگا۔ مصیبت ناک صورتیں سامنے آئیں گی۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا، یا رسول! اس وقت ہماری عقل بھی درست ہوگی؟ فرمایا عقل تو رہے گی۔ کہا: اب کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہوتا رہے گا جو کچھ ہوگا۔ منکر نکیر سے نمٹ لیں گے تو عقل سے مراد مادی عقل نہیں تھی جس سے ہوائی جہاز اور موٹر تیار کئے جاتے ہیں۔ عقل سے مراد عقل ایمانی تھی۔ یعنی ہمارا علم، معرفت، بصیرت، توکل علی اللہ اور ایمانی قوت قائم رہے گی؟ فرمایا، رہے گی۔ عرض کیا اب کوئی فکر نہیں منکر نکیر کسی صورت میں آ جائیں۔ وہ بھی اللہ کی مخلوق، ہم بھی اللہ کی مخلوق ڈرنے کی کیا ضرورت؟ اللہ میاں سامنے ہے جس سے ہم ڈر رہے ہیں۔ جو اللہ سے ڈر گیا۔ وہ پھر کسی سے بھی نہیں ڈرے گا۔ یہ توکل تام اور عمل صالح کی برکت ہے کہ نہ موت کی فکر نہ اس کے ہولناک مناظر کی فکر بس اللہ پر بھروسہ ہے۔ جب وہ چاہیں گے لے جائیں گے ہم تو ان کے زیر سایہ ہیں، ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت؟

جو بادشاہ کا ملازم ہے، صاحب خاص ہو اور ہر وقت پاس رہتا ہو اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔ جب بادشاہ سفر کریں گے۔ تو میں ان کے ساتھ اور جب اپنے محل سرائے میں ہوں گے تو میں ان کے ساتھ ہوں گا۔ میرا حلوہ مانڈہ ہر وقت صحیح ہے اور ہر وقت کی عیش ہے۔ میں سفر میں بھی ساتھ، حضر میں بھی ساتھ، مجھے فکر کی کیا ضرورت؟۔ یہی شان مومن کی بھی ہے کہ سفر میں دنیا کے مسافر خانے میں ہو۔ تب بھی تکلیف نہیں کہ مالک کی نگاہ کے نیچے ہے اور منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ تب تو راحت ہی راحت ہے وہاں پہنچ گئے جس کے لئے سب محنتیں کیں۔ یہ سب چیزیں عمل سے بنتی ہے۔ اس لئے فرمایا گیا:

﴿قُلِ اعْمَلُوْا﴾ اے نبی کریم صلی علیہ وسلم! اپنی امت سے فرما دیجئے کہ اے لوگو! عمل کرو۔ اس لئے کہ عمل اکارت نہیں جائے گا، سامنے آئے گا۔ ﴿فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ① عنقریب اس عمل کو اللہ، اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین بھی دیکھیں گے۔ ﴿وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۵۔

وَالشَّهَادَةِ﴾ ① اور قریب وقت آ رہا ہے کہ تم سب کے سب اللہ کے پاس پہنچائے جاؤ گے جو غیب و شہادت کا جاننے والا ہے۔ کوئی ادنیٰ چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اور یہی نہیں کہ محض جانتا ہی ہے، بلکہ ﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ ② وہ جتلائے گا کہ تم نے یہ یہ کرتوتیں کی تھیں۔ اگر نیکی کی ہے، تو جتلائیں گے کہ تم بڑے اعلیٰ لوگ ہو۔ بڑی اعلیٰ کارگردگی دکھلائی۔ برائیاں کی ہیں تو یہ جتلایا جائے گا کہ یہ تمہارے کرتوت ہیں۔ تو وہ خبر دے دیں گے ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ چیزیں کی تھیں۔

نیکی اور بدی دنیا میں بھی نمایاں ہو کر رہتی ہے...... آدمی کی نیکی اور بدی چھپی نہیں رہتی دنیا میں بھی سامنے آ جاتی ہے۔ آخرت میں تو آئے ہی گی۔ حدیث میں فرمایا گیا ایک کوٹھڑی فرض کی جائے اس کے اندر ایک اور کوٹھڑی، اس کے اندر ایک اور کمرہ اور اس میں ایک اور کمرہ سات کمرے اندر باہر ہوں اور کسی کمرے میں نہ دروازہ ہو نہ روشن دان ہو نہ سوراخ ہو اور ساتویں کوٹھڑی کے اندر بیٹھ کر آدمی کوئی نیک یا بد عمل کرتا ہے، اللہ اس کے عمل کو کھول کے رہتا ہے کہ مخلوق کے دل میں پڑ جاتا ہے کہ فلاں نے یہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ نیک آدمی کو ساری دنیا نیک کہتی ہے۔ کسی نے جا کے تو اس کو نہیں دیکھا کہ اس نے کیا کیا نیکیاں کیں خواہ مخواہ دنیا کی زبان پر ہوتا ہے کہ فلاں بڑا نیک ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتا ہے اور بد ہمیشہ ساری بدیاں چھپا کے کرتا ہے کوئی کسی کے سامنے آ کر بدی نہیں کرتا چور چوری چھپ کر کرے گا، زناکار چھپ کر زنا کرے گا۔ مگر دنیا کی زبان پر ہے کہ فلاں بڑا بدکار، سیاہ کار اور بے ہودہ آدمی ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم نے خود اس کو یہ عمل بد کرتے ہوئے دیکھا؟ کہیں گے نہیں، دیکھا تو نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں کو اطلاع دی جاتی ہے۔ تو آدمی نیکی یا بدی کرے، چھپی نہیں رہتی۔

تو اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین اس کے عمل کو دیکھیں گے۔ صرف دنیا ہی میں نہیں، بلکہ اللہ کے حضور میں دیکھیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ جتلائیں گے کہ تم نے یہ یہ کیا تھا اور جتلانے کے بعد پھر ثمرہ مرتب ہو گا تو نیکی کا بدلہ نیکی سے اور بدی کا بدلہ بدی سے دیا جائے۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ﴾ ③ ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ سامنے آ جائے گی۔ اس کا بدلہ بھی دیا جائے گا۔ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ﴾ ④ اور ذرہ برابر بدی کی ہے، وہ بھی سامنے آ جائے گی۔ اس کا بھی صلہ ملے گا۔

عملی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت...... میں نے یہ آیت اسی واسطے اختیار کی تھی کہ عمل کی زندگی اختیار کی جائے۔ جتنے مسائل اب تک عمل میں آ چکے ہیں۔ اپنی زندگی کا جائزہ لے کر ان کو عمل میں لایا جائے اور جو نہیں آئے، ان کو معلوم کیا جائے، تا کہ بقیہ زندگی درست کی جائے۔ یہ جب ہی ہو گا جب دل میں عملی زندگی کی فکر ہو۔

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۶۔ ② پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۶۔

③ پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ: ۷۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ: ۸۔

قول ہی قول یا محض باتیں کر لینا یا بنا لینا یا امیدیں اور تمنائیں باندھ لینا کہ ہم تو مسلمان ہیں یوں ہوگا۔ اس سے کام نہیں چلتا۔ جدوجہد سے کام چلتا ہے۔ ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى﴾ ① انسان کے لئے اس کی سعی ہی کارآمد ہوگی۔ اس کی جدوجہد ہی کام دے گی۔ جیسے دنیا کا معاملہ ہے کہ یہاں اگر کوئی محنت نہ کرے، تجارت و زراعت نہ کرے، تو دوسروں کی محنت کام نہیں آتی اپنا ہی کیا کام آتا ہے۔ دوسرا اگر خدمت بھی کرے گا، ایک دن خدمت کر دی، دو دن کر دی۔ ناداروں کی طرح کفالت تو نہیں کر سکتے کہ انہیں بیٹھے بٹھائے کھلائے جاؤ۔ مثل مشہور ہے کہ ''آنسوؤں سے گھڑے تو نہیں بھرے جا سکتے'' گھڑے تو دریا سے ہی بھر سکتے ہیں تو لوگوں کی امداد سے زندگیاں نہیں گزرتیں کچھ آدمی خود کرے، کچھ کمی رہ جائے' دوسرا کر دے۔ یہ تو ہوتا ہے۔ لیکن دنیا ان کی کفالت کر دے جو ہاتھ پیر ہلانا نہیں جانتے ایسا کوئی نہیں کیا کرتا۔ اپنی ہی سعی کام آتی ہے تو جب دنیا جیسی مردار چیز بھی بلاسعی کے نہیں حاصل کی جا سکتی۔

تو آخرت جیسی پاک چیز بلاسعی کیسے مل سکتی ہے؟ کہ وہ گھر بیٹھے خود ہی آجائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾ ② کیا ہم رحمت تمہاری کمر سے چپکا دیں۔ تم بھاگے چلے جا رہے ہو، اور ہم پیچھے آ رہے ہیں کہ بھئی رحمت لیتے جاؤ۔ دس دفعہ محنت کرو، خوشامد کرو، تب رحمت ملے گی۔ مستغنی بنتے ہو؟ ہم تو غنی ہیں، تم محتاج ہو کے غنی بنتے ہو۔ ہم غنی ہی غنی ہیں۔ ہم میں محتاجگی کا نام نہیں، غنا تو ہمارا کام ہے نہ کہ بندے کا۔

اس واسطے یہ آیت میں نے تلاوت کی عمل کے بارے میں چند باتیں گذارش کیں اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مثال دی کہ عمل کی یہ پوزیشن ہے۔ اسی کی طرف توجہ رکھنی چاہئے۔ علم چاہے تھوڑا ہو مگر اس پر عمل پورا ہو۔ وہی انشاء اللہ دنیا و آخرت میں کام آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کرنے اور عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

---

① پارہ: ۲۷، سورة النجم، الآية: ۳۹. ② پارہ: ۱۲، سورة هود، الآية: ۲۸.

انسانی زندگی کا نصب العین

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ !

عظیم ترین نعمت...... بزرگان محترم! حق تعالیٰ کے انعامات انسانوں کے اوپر بے شمار ہیں۔ جن کی کوئی گنتی نہیں کی جاسکتی۔ قدم قدم پر نعمتوں کی بارشیں ہیں اور لحہ بہ لحہ انسانوں کو عجیب عجیب انعامات دیئے جارہے ہیں۔ خود ہی ارشاد فرمایا ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ ① اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے بیٹھ جاؤ تو تم شمار نہیں کر سکتے۔ ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

غرض انسان کے اوپر بے شمار نعمتیں ہیں۔ لیکن ساری نعمتوں کی اصل اصول زندگی کی نعمت ہے جو ہمیں عطا کی گئی۔ اگر زندگی نہ ہو تو کوئی بھی نعمت نہ ہمارے لئے نافع بن سکتی ہے نہ مفید ہو سکتی ہے۔ تو اصل میں سب سے بڑی نعمت زندگی ہے۔ ایک زندہ انسان ہی نعمت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ تو نعمتیں ساری ایک طرف اور زندگی ایک طرف۔ عظیم ترین یہ نعمت یا عمر جس کی کوئی قیمت نہیں ہے اللہ نے بے قیمت عطا کر دی ہے۔

ما نبودیم و تقاضائے ما نبود! ‏ ‏ ‏ ‏ لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

نہ ہم تھے نہ ہماری طرف سے کوئی پکار تھی۔ نہ ہماری طرف سے کوئی تقاضا تھا۔ مگر تیرا لطف و کرم ہماری خاموش آواز کو سن رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں زندگی ملے۔ اس خاموش پکار پر اتنی بڑی نعمت دیدی کہ سارے جہاں مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتے۔ ایک انسان چاہتا ہے کہ میرے ہاں اولاد ہو، اگر نہیں ہوتی تو دنیا کے خزانے خرچ کر دے، نہیں ہوتی اور دینے پہ آتے ہیں تو غریب انسان کو اتنی دے دیتے ہیں کہ بظاہر وہ تنگ آ جاتا ہے۔ تو نہ مانگے سے ملتی ہے نہ قیمت سے ملتی ہے۔ محض فضل سے ملتی ہے۔

سب سے بڑی نعمت یہ عمر ہے پھر یہ عمر بھی کوئی چھوٹی موٹی عمر نہیں ہے۔ آپ اسے عمر سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کسی کی زندگی پچاس برس ہوگی؟ کسی کی ساٹھ ہوگی؟ بہت لمبی عمر ہوئی تو اسّی نوّے برس کی ہوگی؟ یہ زندگی ہے؟ یہ زندگی

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۸.

کا ایک معمولی حصہ اور زندگی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے۔

ابدی زندگی...... انسان کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے'' ہمیشہ سے نہیں تھا لیکن پیدا ہونے کے بعد اب ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ اب انسان کے لئے مٹنا نہیں ہے۔ وطن کا انتقال ایک وطن سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف ہوتا رہتا ہے۔ نقل مکانی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن زندگی انسان سے چھنتی نہیں ہے۔

یہ پہلے ''عالم الست'' میں تھا جبکہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے سب بنی آدم کو نکالا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر داہنا ہاتھ مارا تو ساری نیک اولاد نکل پڑی اور بایاں ہاتھ مارا تو ساری بد اولاد نکل پڑی۔ یہ بنی آدم کا پہلا ظہور ہے تو ''عہد الست'' میں ابتدائی ظہور ہے۔ وہاں سے انسان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد منتقل ہو کر ماں کے پیٹ میں آ گیا پھر ماں کے پیٹ کی عمر نو مہینے کی ہے۔ پہلے بھی فنا نہیں ہوا تھا، ماں کے پیٹ میں بھی آ کر فنا نہیں ہوا۔ ''عہد الست'' سے انتقال ہوا تو رحم مادر میں آیا۔ رحم مادر سے انتقال ہوا تو دنیا میں آ گیا۔ ہر ایک عالم سے گزرتے ہوئے انتقال ہوتا ہے اور دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ دنیا میں انتقال ہو گا تو برزخ کے اندر پہنچ جائے گا۔ برزخ سے انتقال ہو گا تو عالم حشر کے اندر پہنچ جائے گا۔ وہاں پچاس ہزار برس کا ایک دن ہو گا۔ عالم حشر سے انتقال ہو گا تو عالم جنت میں پہنچ جائے گا۔ پھر جنت میں ابدالآباد تک روزانہ انتقالات ہیں۔ بڑے بڑے جہاں اور روز نئی نئی نعمتوں کی تجدید ہو گی۔ وہاں بھی درجہ بدرجہ عروج حاصل کرتا رہے گا۔ تو جب سے انسان کا ظہور ہوا اب تک برابر سفر میں ہے اور سفر کرتا رہے گا۔ اس لئے انسان ازلی نہیں ہے مگر ابدی ہے کہ مٹنے والا نہیں ہے تو آپ کی عمر تھوڑی نہیں ہے جس کو بیس پچاس اور سو برس سمجھ لیں۔ یہ انسان کی عمر کا ایک معمولی حصہ ہے، انسان ابدی طور پر زندہ ہے اس ابدی اور لامحدود عمر کا ایک معمولی حصہ ہے جس کو ہم زندگی کہتے ہیں۔ یہ زندگی کا کروڑواں حصہ بھی نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان کی زندگی بڑی طویل اور لمبی ہے۔

اختیاری نصب العین کی ضرورت...... اس دنیوی زندگی کو گزارنا، اس کے لئے اللہ نے ایک تو غیر اختیاری حصہ رکھا ہے۔ وہ آپ چاہیں نہ چاہیں گزر جائے گا اور جب انسان پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اختیار میں دی ہیں کہ اپنے ارادے اور اختیار سے زندگی کا نصب العین بناؤ۔ اس کے تحت زندگی گزارو۔ اس لئے کہ جو وقت یا جو زندگی بلا نصب العین کے گزرتی ہے۔ وہی مجنونانہ حرکت کہلاتی ہے۔ ایک دیوانے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ زندگی اس کی بھی گزر رہی ہے۔ تو دیوانگی کے ساتھ عمر کو گزارنا، یہ دانش مند کا کام نہیں ہے۔ یہ دیوانوں کا کام ہے۔ زندگی کا کوئی نصب العین بنانا پڑے گا جس کے تحت زندگی گزاری جائے کہ ہم کیوں زندہ ہیں؟ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ اور یہ جو روز میرے انتقال ہوتے رہتے ہیں اس جہاں سے اس جہاں کی طرف اور وہاں سے وہاں کی طرف۔ آخر یہ کیا کوئی افسانہ ہے؟ یا کوئی قصہ ہے کہ خواہ مخواہ انسان چل رہا ہے۔

ہم کراچی سے حیدرآباد دکن کا سفر کرتے ہیں۔کوئی نہ کوئی مقصد دینی یا دنیوی سوچ لیتے ہیں کہ اس لئے جارہے ہیں۔بلامقصد ریل میں بیٹھ جائیں اور کوئی پوچھے کہ کیوں جارہے ہیں؟ کہ یوں ہی۔کہا جائے گا کہ تم دیوانے ہو؟۔تو دیوانہ اسے کہتے ہیں جو بلانصب العین اور بلا مقصد کے زندگی گزارے، دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر نقل وحرکت کا کوئی نصب العین ضرور ہو۔تو اتنی بڑی حرکت جو ہزاروں برس سے چل رہی ہے، اور ابدالآباد تک چلتی رہے گی اور بلامقصد ہو؟ یعنی دیوانگی بھی اور اتنی لمبی دیوانگی کہ اس کی کوئی حد ونہایت نہ ہو۔کم سے کم انسان کے لئے زیبا نہیں جو مدعی ہے کہ میں سب سے بڑا دانشمند ہوں مجھے عقل کامل دی گئی ہے۔یہ مدعی ہے کہ میں ساری کائنات پر فوقیت رکھتا ہوں اور افضل ہوں حتیٰ کہ ملائکہ کی جنس سے بھی افضل ہونے کا دعوے دار ہے۔تو یہ انسان جو اتنا بڑا دعویٰ رکھتا ہے، اس کی اتنی بڑی زندگی بلا کسی مقصد کے؟ تو ایک طرف یہ عقل کا دعویٰ کہ سب سے بالاتر اور ایک طرف یہ مجنونانہ حرکت کہ کوئی نصب العین زندگی کا نہیں۔یہ کوئی جوڑ نہیں لگتا۔اس لئے انسان وہی کہلائے گا جو اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کرے۔

ابدی مقصد......اور نصب العین بھی معمولی نہیں ہونا چاہئے۔اس واسطے کہ جب عمر لمبی اور ابدالآباد تک کی ہے تو مقصد ایسا ہو جو ابدالآباد تک چلے، چند دن میں ختم ہو جائے وہ بھی دیوانگی ہوگی کہ عمر تو لاکھوں برس کی لے کر آیا اور مقصد وہ سوچ لیا جو دس بیس برس میں ختم ہو جائے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ پھر بلا مقصد کے عمر گزرے، پھر اس کے اوپر دیوانگی آجائے تو مقصد اور نصب العین زندگی کا ہونا چاہئے اور ایسا ہونا چاہئے جیسی خدا نے عمر دی ہے کہ عمر لمبی ہے تو مقصد بھی لمبا ہو۔اگر وہ دس جہاں طے کرے تو وہ مقصد بھی دس جہان طے کرے، اس لئے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ زندگی جیسی نعمت اور دولت جو انمول موتی کی طرح سے ہے، ساری دنیا مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتی، اس کے لئے کوئی ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ مقصد ہونا چاہئے کہ ہماری دانش کے بھی سب قائل ہو جائیں اور خود انسان بھی ایک دوسرے کا قائل ہو کہ واقعی صحیح مقصد ہے۔

وقتی دولت اور روٹی مقصد نہیں......مقاصد دنیا میں بہت ہیں، مثلاً عمر کا ایک مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی لمبی چوڑی عمر، کا مقصد روٹی فرض کرلیں کہ ہمیں کھانے کو ملے، یہ مقصد اور نصب العین تو ہے لیکن یہ کیا نصب العین ہے جس کے لئے نہ فضیلت کی ضرورت نہ کمال کی ضرورت نہ علم کی ضرورت یہ مقصد بے پڑھے لکھے کو بھی حاصل ہے۔ روٹی ہی تو ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے تعلیم کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔بلکہ تعلیم کی انتہائی توہین ہے اگر اس کا مقصد روٹی بنایا جائے، اس لئے کہ روٹی جانور کا بھی مقصد ہے۔ہر جاندار اپنے اپنے مناسب روٹی کھاتا ہے، شیر اور بھیڑیا جو کھاتے ہیں، کیا انہیں کوئی ڈگریاں حاصل ہوتی ہیں، جن سے یہ کماتے ہیں؟ تو روٹی اور کھانا ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں، عالم کو بھی ملتا ہے، جاہل کو بھی۔غرض ایسی چیز کو مقصد زندگی قرار دینا جس کے لئے قطعاً علم وشعور کی ضرورت نہیں۔یہ زندگی کی توہین ہوگی۔

پھر یہ کہ زندگی ابدالآباد کی مل رہی ہے اور مقصد وہ ٹھہرایا ہے جو دس بیس برس میں ختم ہو جائے۔ جب آدمی کا سانس ختم ہوا تو روٹی بھی ختم، روٹی اسے چھوڑ گئی یہ روٹی کو چھوڑ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ پھر بلا نصب العین کے زندگی رہ گئی، اس لئے لمبی زندگی کا نصب العین لمبا ہونا چاہئے اس لئے روٹی مقصد نہیں بن سکتی۔

دولت بھی اسی میں شامل ہے۔ آپ دولت کمانے کو نصب العین رکھیں گے تو یہ کوئی اونچا مقصد نہیں، یہ ایک وسیلہ ہے اور ضرورت کی چیز ہے، انسان جب تک دنیا میں زندہ رہے گا۔ کمائے گا بھی اور اسے حکم بھی ہے کہ کمائے، یہ بھی نہیں کہ معطل ہو کے بیٹھ جائے، لیکن مقصد زندگی نہیں، کمانا خود کسی مقصد کے لئے ہوتا ہے، کمانا خود مقصد نہیں اگر وہ مقصد جو کمانے سے پورا ہوتا ہے کسی اور طریق سے پورا ہو جائے تو اس کمانے کو یقیناً چھوڑ دیا جائے گا مثلاً پیٹ بھرنا ہے، کپڑے پہننا یا رہنا سہنا یعنی مکان بنانا، یہ بڑا مقصد ہے۔ اگر اللہ میاں کسی ایسے جہان میں بھیج دیں جہاں ہمیں اس طرح کے مکان کی ضرورت پڑے نہ پیٹ بھرنے کی ضرورت پڑے، تو کمانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، غرض یہ زندگی کا نصب العین نہیں بن سکتا ایک وقتی چیز ہے۔

پھر یہ کہ اس جہاں کی کوئی کتنی بھی بڑی چیز ہے، یہ بھی اس میں داخل ہے کہ جب آدمی اس جہان کو چھوڑے گا وہ چیز اسے چھوڑ دے گی، یہ اس کو چھوڑ دے گا، پھر وہ نصب العین ہی کیا ہوا۔؟ ہمیں ایسا نصب العین چاہئے جو ہماری عمر کے ساتھ ساتھ چلے، کروڑوں برس کی عمر ہو جب بھی وہ چلتا رہے، جبھی عمر کی توقیر ہوگی اور اللہ کے انعام کی قدر ہوگی۔ ورنہ انتہائی بے قدری ہوگی کہ اتنی بڑی نعمت اور اس کے لئے کوئی مقصد ہی نہ ہو اور اگر ہو تو پانچ برس کا ہو۔

عزت و جاہ بھی مقصد نہیں ...... یا مثلاً ایک مقصد یہ ہے کہ روٹی بھی نہیں، دولت بھی نہیں، کرسی مقصد ہے یعنی عزت اور جاہ ہمارا مقصد ہے کہ آدمی عزت کے ساتھ زندگی گزارے۔

یہ مقصد برا نہیں ہے۔ مگر انتہائی بے بنیاد مقصد ہے اس کی کوئی بنیاد ہی نہیں، اس واسطے کہ جس کو ہم عزت سمجھتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ہمیں بڑا سمجھیں اس کا مطلب یہ نکلا کہ لوگوں کا خیال ہماری طرف سے صحیح ہو تو عزت ہماری ہے اور ہاتھ میں لوگوں کے ہے؟ اور وہ بھی خیالی۔ ذرا وہ خیال بدل دیں، بس ہماری عزت ختم ہوگئی۔ آج اگر لوگوں نے ہمارے گلے میں ہار ڈال دیا، ہم عزت والے اور کل کو پبلک خفا ہو کر جوتیوں کا ہار ڈال دے، بس ذلیل ہو گئے۔ یہ کیا مقصد ہوا؟ اول تو خیالی اور خیال بھی دوسرے کا؟

اگر ہمارے ہی خیال سے عزت قائم ہوتی، تو ہم تخیل باندھے بیٹھے رہتے کہ ہم بڑے باعزت ہیں اور عمر بھر اس تخیل کو نہ چھوڑتے، تو عمر بھر عزت والے تو رہتے، عزت ہماری، قبضے میں دوسرے کے وہ بھی خیالی۔ اور وہ خیال اس کے بھی ہاتھ میں نہیں۔ آج خیال بدل گیا تو کل ہماری بے عزتی ہوگئی تو لمبی چوڑی عمر اتنی بڑی نعمت کا نصب العین ایک بے بنیاد اور خیالی چیز؟

حقیقی عزت ...... حقیقی عزت یہ ہے کہ اللہ کے ہاں کوئی مقبول ہو، اسے عزت کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کسی کو مقبولیت

دے اور اپنی مخلوق کے دلوں میں اس کی عزت ڈال دے، وہ عزت ہے وہ خیال کی نہیں واقعی عزت ہوتی ہے۔حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حق تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبریل کو فرماتے ہیں، میں نے فلاں بندے سے محبت کی، تو بھی اس سے محبت کر۔حضرت جبریلؑ کے دل میں محبت آ جاتی ہے، جبریل علیہ السلام آسمان اول کے ملائکہ میں اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب نے محبت کی تم بھی محبت کرو، آسمان دوم میں اس کی محبت ہوتی ہے، وہ تیسرے کو، وہ چوتھے کو، یہاں تک کہ اس آسمان دنیا تک محبت آ جاتی ہے۔تمام ملائکہ میں وہ محبوب بن جاتا ہے۔اس کے بعد یہ ملائکہ علوی ملائکہ سفلیٰ کو الہام کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں سے محبت کی، تم بھی محبت کرو، ان کے دلوں میں محبت آ جاتی ہے وہ ملائکہ سُفلیٰ اولیائے کرام جو دنیا میں محبوبانِ الٰہی ہیں، کے قلوب میں الہام کرتے ہیں کہ ہم سب محبت کرتے ہیں تم بھی محبت کرو، تو خواص اہل اللہ کے قلب میں محبت آ جاتی ہے۔پھر ان کے آس پاس کے حلقوں کے اندر محبت پہنچتی ہے، ’’فَيُوْضَعُ لَهُ قُبُوْلُهُ فِي الْاَرْضِ‘‘ ① اس کی مقبولیت پوری زمین میں پھیل جاتی ہے اسے کچھ کرنا دھرنا نہیں پڑا اور محبت آسمانوں دنیا کے اندر پھیل جاتی ہے۔تو حقیقی عزت وعظمت یہ ہے کہ من جانب اللہ اس کی مقبولیت دنیا میں پھیل جائے، یہ اصل عزت ہے، اسی لئے نہ اپنے تخیل سے اپنے کو عزت دار سمجھے نہ چند افراد کے دماغ پر روغن قاز مل کر کوشش کرے کہ تم تخیل میں مجھے بڑا سمجھو، یہ خیالی چیز ہوگی، جب خیال بدل جائے گا، عزت ختم ہو جائے گی لیکن جس کی عزت ملاءِ اعلیٰ میں قائم ہوگی، ملائکہ علوی وسُفلیٰ کے دلوں میں جس کی محبت قائم ہوگی، وہ محبت بنیادوں پر قائم ہے تخیلات پر نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کے باطن میں اگر کسی محبت کی قائم ہے وہ اٹل ہے اور اتنی قوی بنیاد پر ہے کہ اسے کوئی مٹانیوالا نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی محبت یہی ہوتی ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کی محبت ہوتی ہے پھر عالم میں ان کی محبوبیت پھیلا دی جاتی ہے۔اولیائے کرام، صوفیائے عظام اور ائمہ مجتہدین کی محبت اٹل بنیادوں پر ہوتی ہے۔وہ دنیا سے گزر جائیں مگر ان کی محبت نہیں گزرتی۔انبیاء علیہم السلام میں سے آج اگر کسی پیغمبر کا نام نامی آئے گا گردنیں عظمت سے جھک جائیں گی ہم درود شریف پڑھنا شروع کر دیں گے۔

یہ کیا چیز ہے؟ آج یہ ہستیاں اس عالم میں نہیں ہیں مگر دلوں کے اندر محبت موجود ہے، نسلاً بعد نسلٍ چلی جا رہی ہے۔صدیاں گزر گئیں مگر محبت اٹل ہے۔اس لئے کہ اس محبت کی بنیادوں میں حق تعالیٰ کے باطن سے چلنے والی محبت ہے جو مٹنے والی نہیں ہے۔آج دنیا میں حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ موجود نہیں ہیں۔آج حضرت صابر کلیریؒ موجود نہیں ہیں۔شیخ شہاب الدین سہروردیؒ موجود نہیں ہیں۔لیکن قلوب میں محبت قائم ہے، ان لوگوں کے نام آتے ہیں تو ہماری زبانوں سے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نکلتا ہے۔عظمت سے ہم گردنیں جھکا دیتے ہیں۔وہ ہستیاں موجود نہیں، مگر محبوبیت موجود ہے، اس لئے کہ یہ محبوبیت اللہ سے چلی اور بندوں تک پہنچی، خواص سے

① الصحيح لمسلم كتاب البر والصلة والآداب، باب اذا احب الله عبدا حببه الى عباده، ج: ١٣ ص: ٨٦ رقم: ٤٧٧٢.

شروع ہوئی عوام تک پہنچی۔

عزت کے بارے میں سنہری اصول......اس سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ جو مقبولیت عوام سے اوپر کی طرف چلتی ہے وہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ عوام میں پھیل گئی آگے خواص میں اس کا کوئی وجود نہیں، وہ عزت فرضی ہوتی ہے، چند دن کے بعد زائل ہو جاتی ہے اور جو خواص سے چلے، عوام کی طرف آئے وہ حقیقی عزت ہوتی ہے، تو میں نے عرض کیا انبیاء علیہم السلام، اولیائے کرام، علمائے ربانی اور صالح بندوں کی محبت، کوئی کارنامہ کر جانے والوں کی محبت جو رہتی دنیا تک قلوب میں باقی رہتی ہے وہ حقیقی عزت ہے۔ اس کی بنیاد فرضی نہیں ہوتی۔ آدمی کا خیال نہیں ہوتا قلب کی گہرائی ہوتی ہے۔ اگر آدمی یہ بھی چاہے کہ میں اپنے خیال سے یہ محبت نکال دوں، اسے قدرت نہیں ہوتی۔ اس کا دل ملامت کرے گا کہ نہیں تجھے محبت رکھنی پڑے گی، اس لئے کہ وہ بنیادوں پر قائم ہے۔

حاصل یہ ہے کہ عزت وہ ہے جو اللہ کی طرف سے چلے۔ مقبولیت عند اللہ ہو۔ وہ عزت نہیں ہے کہ لوگوں کے تخیلات کے اوپر اس کی بنا ہو۔ کیونکہ خیال رات دن بدلنے والی چیز ہے۔ تو ایسی محبت وعزت جو کہ خیالی ہو، اس کو ہم اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ یہ زندگی کی توہین ہے، زندگی امر واقعی اور نصب العین فرضی اور خیالی بنا رہے ہیں زندگی کی بنیادیں اٹل کہ انسان ابدی ہے اور عزت جو نصب العین ٹھہرا، اس کی کوئی بنیاد نہیں کہ کل کو ہے، پرسوں کو نہیں، یہ زندگی کی توہین کرنا ہے۔ اس لئے یہ بھی نصب العین نہیں بن سکتی۔ تو نہ دولت اور رسمی عزت مقصد زندگی بن سکتی ہے نہ روٹی بن سکتی ہے۔ اگر دنیا ہی تک زندگی محدود ہوتی تو چلو ہم یہی نصب العین قرار دے لیتے مگر مشکل یہ ہے کہ زندگی آگے جانیوالی ہے۔ یہ زندگی کا کروڑواں معمولی حصہ ہے دائمی اور ابدی زندگی تو آگے ہے اس واسطے کوئی اور نصب العین ہونا چاہئے۔

انسان کا علم......وہ نصب العین کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ انسان تجویز نہیں کر سکتا، انسان بے چارہ محدود ہے وہ اپنے حال کی بات دیکھے گا۔ اس کا ماحول ایک محدود ماحول ہے۔ اس کے اندر وہ گھرا ہوا ہے، وہیں کی سوچے گا۔ تو انسان بے چارے کا تخیل ہی کیا؟ اس کی عقل ہی کیا؟ کہ وہ ایک لامحدود نصب العین سوچ لے۔ اپنے تخیل کے دائرے میں سوچے گا وہ محدود چیز ہوگی، کارآمد نہیں ہوگی۔ اس لئے انسانی زندگی کا نصب العین وہ بتلا سکتا ہے جو خود بھی لامحدود ہو، اس کا علم بھی ازلی ابدی ہو ازل سے ہے اور ابد تک جانے والا ہے۔ وہ خود انسان کا خالق ہے، اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو جانتا ہے۔ اس کے داؤ بھات سے واقف ہے فرمایا گیا ﴿**اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ**﴾ ①

جس نے پیدا کیا۔ کیا وہ نہیں جانے گا مخلوق کو؟ وہی ہے اصل میں جاننے والا۔ ہم تم اپنے سے اتنے واقف نہیں ہیں جتنا ہمارا خالق ہم سے واقف ہے، ہمیں آج یہ پتہ ہے ہی نہیں کہ ہمارے پیٹ میں کیا ہو رہا ہے، یعنی

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۴۔

پیٹ ہمارا، نفس ہمارا، خود ہمیں ہی پتہ نہیں اندر کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ عظیم الشان مشین ہے جو چل رہی ہے۔ غذا پہنچ رہی ہے۔ معدہ اپنا کام کر رہا ہے، جگر، دل اور دماغ اپنا کام کر رہا ہے۔ جب آپ لقمہ کھاتے ہیں وہ معدے میں پہنچتا ہے معدہ اسے لے کر سفید حریرہ بنا دیتا ہے اور کچھ فضلات ہیں جن کو انتڑیوں کی طرف پھینک دیتا ہے اور اس کا جوہر جگر کی طرف پھینک دیتا ہے جگر کو کہتے ہیں کہ یہ طباخ بدن ہے (بدن کا باورچی) جگر اس حریرے کو پکاتا ہے۔ جب ہنڈیا پکتی ہے تو ایک حصہ اوپر جھاگ کی طرح ہوتا ہے۔ ایک حصہ تلچھٹ کی طرح ہوتا ہے، ایک حصہ بیچ بیچ میں ہوتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو جوہر بنتا ہے، وہ جو اوپر کا جھاگ کا حصہ ہے وہ بلغم ہے جو نیچے تلچھٹ کا حصہ ہے وہ سودا ہے، جو بین بین ہے وہ صفرا ہے اور ان تینوں چیزوں سے مل کر جو جوہر بنتا ہے۔ اسے خون کہتے ہیں۔ یہ چار خلطیں تیار ہوئیں جگر باریک رگوں کے ذریعہ خون کو قلب کے اندر بھیجتا ہے، قلب کے بارے میں اطباء لکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہے جیسے چوگڑی ہوتی ہے کہ بیچ میں سے دبا ہوا دونوں کنارے پھیلے ہوئے، جیسے اگالدان ہوتا ہے تو بیچ میں سے پتلا اور دونوں کنارے چوڑے، یہ قلب کی صورت ہے۔ اس کا ایک حصہ بطن عالی اور ایک بطن سافل کہلاتا ہے۔ یہ خون بطن سافل کے اندر پہنچتا ہے قلب اس کو پھر اپنی حرارت سے پکاتا ہے۔ اس کے پکانے سے ایک لطیف بھاپ پیدا ہوتی ہے۔ وہ روح حیوانی کہلاتی ہے، اس رُوح کے اوپر پھر اوپر سے روح آتی ہے جس کو روح ربانی کہتے ہیں، اس سے انسانی کے علم اور ادراک کا تعلق ہے۔ تو بدن کا حصہ نیچے ایک سواری ہے اس پر روح حیوانی سوار ہے پھر روح حیوانی ایک سواری ہے اس پر روح ربانی سوار ہے اس طرح سے یہ تین چیزیں ہیں جو مل کر سفر طے کر رہی ہیں۔ تو آپ نے اندازہ کیا کہ کس طرح غذائیں پہنچ رہی ہیں اور ہضم ہو رہی ہیں اور اس سے طرح طرح کی چیزیں بن رہی ہیں لیکن انسان کو خود کو اس وقت پتہ نہیں کہ معدہ کیا کر رہا ہے، جگر کیا کر رہا ہے اور قلب کیا کر رہا ہے؟ جب ہمارے اندر سب کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں تو اس کا محدود علم ہے۔ تو لامحدود زندگی کا نصب العین کیسے تجویز کرے گا؟ یہ اگر تجویز کرے گا تو چند روزہ ہوگا جیسے خود اس بیچارے کا علم چند روزہ ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ زندگی کا نصب العین تجویز کرنے والا وہ ہو جو زندگی کا خالق ہے۔ وہی اس کے اول و آخر سے واقف ہے۔ وہی نصب العین متعین بھی فرما سکتا ہے۔

خالق انسان کا تجویز کردہ نصب العین ...... اس خالق نے ایک نصب العین تجویز فرمایا اور اپنے فرمان کے ذریعے ہم تک بھیج دیا جس کو قرآن کریم کہتے ہیں، فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ وہ میری اطاعت کریں، تو مقصد زندگی درحقیقت اپنے خالق و مالک کی اطاعت و عبادت نکلی، عبادت کا لفظ سن کر ممکن ہے کہ آپ کو یہ تخیل پیدا ہوا ہو کہ بس اب کہا جائے گا کہ جا کے مسجد میں بیٹھو، کوٹھی بھی چھوڑ دو اور بنگلہ بھی اور مسجد کا رستہ لو، عبادت تو وہاں ہوگی۔ اور ممکن ہے یہ کہا جائے کہ

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

بھائی! یہ دولت جو ہے اسے خیر باد کہو، یہ سب کچھ صدقہ کر کے جاؤ اللہ کے راستہ میں، اور اپنا گھر بار چھوڑو۔

دولت سے بھی خدا ملتا ہے..... تو میں عرض کئے دیتا ہوں کہ یہ غلط تخیل ہے اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ انسان جس دائرے میں رہے اسے مایوس نہیں کرتا، خدا تک پہنچنے کا لازمی راستہ بتلاتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ انسان آج جس دائرے میں ہے، اس دائرے کو چھوڑ کر فلاں دائرے میں جائے جب تو مجھ تک آئے گا اور اگر نہیں چھوڑے گا تو مجھ تک نہیں آئے گا، ایسا نہیں ہے۔

اگر ایک آدمی دولت مند ہے۔ اسے اسلام یہ کبھی نہیں کہے گا کہ تو اپنی ساری دولت کو ختم کر دے بلکہ اسی دولت کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اس کے صرف اور آمد کا طریقہ بتلائے گا، اس کے قوانین بتلائے گا کہ میری اطاعت کے تحت اس کو خرچ کر۔ اور میری اطاعت کے تحت اس کو حاصل کر یہ سب تیرے لئے عبادت ہے، تو اس طرح کرنے سے مجھ تک پہنچ جائیگا، تو دولت مند کو کہے گا کہ تو دولت کے راستے سے مجھ تک پہنچ۔

اس واسطے کہ ہزاروں عبادتیں ہیں جن کا تعلق ہی مال سے ہے۔ اگر دولت نہیں ہوگی تو آدمی زکوٰۃ کیسے دے گا؟ صدقۂ فطر کیسے دے گا؟ خیرات کیسے کرے گا؟ صلہ رحمی کیسے کرے گا؟ حج کیسے کرے گا؟ اجتماعی امور کیسے انجام دے گا؟ غرض خیرات وصدقات اور چندے، یہ سارے اعمال انجام نہیں دے سکتا جب تک دولت نہ ہو اور یہ سارے کام اسلام کے ہیں۔ اسلام کیسے کہہ دے گا۔ کہ دولت کو ضائع کر دو یا حاصل نہ کرو یا آ گئی ہے تو اسے کھو دو، بلکہ اسی کو رکھ کر اسی دائرے میں سے راستہ نکال دے گا کہ اس کے اوپر چلو۔

غربت سے بھی خدا ملتا ہے...... لیکن اگر دولت مندوں کو اسلام نے راستہ بتلایا کہ تم اپنی دولت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بناؤ۔ تو ممکن تھا کہ ایک غریب آدمی کا دل ٹوٹتا کہ بس دولت مند دنیا اور آخرت دونوں کما لے گیا۔ میں یہاں بھی محروم وہاں بھی محروم، نہ صدقہ دے سکتا ہوں نہ خیرات نہ صلہ رحمی کے قابل ہوں تو میں دنیا میں بھی ایسے ہی بے چارہ و بے کس رہا اور آخرت میں پہنچا تو بھی عبادتیں کم ہوئیں اس کا دل ٹوٹا۔ اسلام نے فوراً ڈھارس دی کہ تو بھی مایوس مت ہو۔ حدیث میں فرمایا کہ: ''اے غریب! تو اپنی غربت پر پریشان مت ہو، اس وقت کو یاد کر کہ قیامت کے دن امراء اپنے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہوں گے اور غرباء پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل بھی ہو چکے ہوں گے''۔

تو غریب نے کہا کہ مجھے میری غربت مبارک، مجھے تموّل کی ضرورت نہیں ہے، یہ پانچ سو برس کی مدت خدا جانے کیسے گزرے گی؟۔ حساب دے سکیں نہ دے سکیں؟۔ کوئی عتاب نہ ہو، مصیبت نہ کہیں بھگتنی پڑے۔ دنیا کی ساٹھ ستر برس کی عمر تو گزر ہی جائے گی۔ میں سچے دل سے اپنی غربت پر خوش ہوں، تو اسے دولت کی نعمت دی اور اسے استغناء کی نعمت دی، دولت نہیں ہے مگر اس کا دل غنی ہے۔ ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بعض دفعہ ایک شعر پڑھا کرتے تھے، فرماتے تھے۔

لنگ کے زیر و لنگ کے بالا   نے غم وزد نے غم کالا!

ایک لنگی اوپر سے اوڑھ لی، ایک باندھ لی، نہ چور کا ڈر نہ چکار کا ڈر، بس غنی بنے بیٹھے ہیں۔ دولت مند کو دولت کی وجہ سے ہزار مصیبتیں ہیں، اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے، کہیں چور، ڈاکو نہ آ جائے، حاکم حسد کرے تو اس سے بھی کسی طرح بچوں اور دولت کو بچاؤں کہیں ٹیکسوں کا اور محصول کا قصہ' غرض صبح سے شام تک ایک مصیبت ہے مگر غریب کہتا ہے کہ میں مصیبت زدہ نہیں ہوں۔

لنگ کے زیر و لنگ کے بالا   نے غم وزد نے غم کالا!

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

ما ہیچ نداریم ، غم ہیچ نداریم   دستار نداریم غم پیچ نداریم

ہم کچھ نہیں رکھتے، اس لئے غم بھی کچھ نہیں رکھتے، ہم دستار ہی نہیں رکھتے' اس لئے پیچ وخم کا بھی ہمیں غم نہیں پیچ وخم کے غم میں تو وہ پڑے جو دستار رکھتا ہو۔

غرض ایک دولت مند کو اگر مادی دولت دی گئی، تو غریب آدمی کو جو صابر اور محتسب ہے اس کو استغناء کی دولت دی گئی یہ کمال غناء سے بادشاہوں سے زیادہ مزے میں اور مطمئن ہے۔ فرمایا گیا کہ دنیا میں تجھے یہ نعمت ملی کہ تجھے غنی بنادیا گیا سینکڑوں مصیبتوں سے چھوٹ گیا اور آخرت کی یہ نعمت ہے کہ پانچ سو برس پہلے تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور امراء ابھی حساب و کتاب میں ہوں گے، تو دولت مند یوں خوش ہے کہ میں اپنی دولت سے جنت کما رہا ہوں، غریب آدمی یوں خوش ہے کہ میں اپنے غناء سے جنت کما رہا ہوں، تو اسلام نے کسی حالت میں مایوس نہ کیا، نہ دولت مند کو یہ کہا کہ تو فقیر بن۔ نہ فقیر کو یہ کہا کہ تو دولت مند بن ہر ایک حالت و کیفیت میں اس کو تسلی دی اور اسے راستہ بتلا دیا، یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ کسی حالت کے بدلے بغیر اسی حالت میں اسلام راستہ نکالتا ہے، مایوس نہیں ہونے دیتا۔

صحت ومرض میں بھی خدا ملتا ہے...... حدیث میں فرمایا گیا سب سے بڑی نعمت جس پر رشک کیا جائے، وہ صحت و تندرستی ہے صحت نہ ہو تو عبادت کیسے کرے؟ حج کو کیسے جائے؟ نماز کیسے پڑھے؟ روزہ کیسے رکھے؟ گویا ساری عبادتیں صحت سے وابستہ ہیں، اس لئے اس کی فضیلتیں بیان کی گئیں۔ صحت مند اور تندرست آدمی خوش ہے کہ مجھے اللہ نے صحت دی ہے، میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جانی عبادت بھی کر رہا ہوں، محنت بھی اٹھا رہا ہوں، حج کو بھی جا رہا ہوں لیکن بیمار کا دل ٹوٹا کہ افسوس میں کچھ عمل نہ کر سکا، نہ میں مسجد تک جا سکتا ہوں نہ میں حج کرنے جا سکتا ہوں نہ میں جہاد کے لئے جا سکتا ہوں، کوئی کام بھی میں نہیں کر سکتا، افسوس میں محروم رہا۔ اسلام نے آ کر فوراً تسلی دی کہ پریشان مت ہو۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ بعضے بندوں سے پوچھیں گے کہ۔ اے بندے! میں بیمار ہوا تو مجھے پوچھنے نہ آیا۔؟ میں مریض ہوا تو میری مزاج پرسی کو نہ حاضر ہوا؟

بندہ کہے گا، اے اللہ! آپ تو رب ہیں آپ کو بیماری سے کیا تعلق؟ بیماری تو عیب اور نقص کی چیز ہے۔ آپ ہر نقص اور برائی سے بری ہیں۔ ①

فرمائیں گے فلاں بندہ بیمار ہوا تھا۔ اگر تو بیمار پرسی کے لئے جاتا، مجھے اس کی چارپائی کی پٹی پر موجود پاتا۔ بیمار کا دل بڑھ گیا کہ میری وہ خصوصیت ہے کہ بیماری میں حق تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے، کسی تندرست کی چارپائی پر حق تعالیٰ نہیں ہیں اور بیمار کی چارپائی پر موجود ہیں۔ یعنی خاص تجلی، لطف وکرم اور عنایت موجود ہے۔ کسی تندرست کے بارے میں حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تندرستی اپنے اوپر لے کر کہا ہو کہ میں تندرست تھا۔ تو میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ بیمار کے بارے میں اپنے اوپر لیکر فرمایا کہ میں بیمار ہوا، تو مجھے پوچھنے نہ آیا۔ گویا بیمار اتنا عزیز ہے کہ اس کی بیماری کو اپنی بیماری فرمایا کہ میں بیمار ہوا۔ تو بیمار کا دل بڑھ گیا کہ ایسی تندرستی کو سلام ہے جسے اتنا قرب نہ ہو، مجھے یہ بیماری عزیز اور مبارک ہے میں اس بیماری کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ توجہ الی اللہ کا ذریعہ بن رہی ہے اور درجات ومراتب طے ہو رہے ہیں۔

صبر کا پھل..... حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، ایک ناسور پھوڑے کے اندر بتیس برس مبتلا رہے ہیں، جو پہلو پر تھا اور چت لیٹے رہتے تھے، کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ یعنی بتیس برس تک چت ہی لیٹے لیٹے کھانا بھی، پینا بھی، عبادت کرنا بھی، قضائے حاجت کرنا بھی۔ آپ اندازہ کیجئے بتیس برس ایک شخص ایک پہلو پر پڑا رہے، اس پر کتنی عظیم تکلیف ہوگی؟ کتنی بڑی بیماری ہے؟

یہ تو بیماری کی کیفیت تھی۔ لیکن چہرہ اتنا ہشاش بشاش کہ کسی تندرست کو وہ چہرہ میسر نہیں، لوگوں کو حیرت تھی کہ بیماری اتنی شدید کہ برس گزر گئے کروٹ نہیں بدل سکتے اور چہرہ دیکھو تو ایسا کھلا ہوا کہ تندرستوں کو بھی نصیب نہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت!۔ یہ کیا بات ہے کہ بیماری تو اتنی شدید اور اتنی ممتد اور لمبی چوڑی اور آپ کے چہرے پر اتنی بشاشت اور تازگی کہ کسی تندرست کو بھی نصیب نہیں؟ فرمایا:

جب بیماری میرے اوپر آئی، میں نے صبر کیا، میں نے یہ کہا کہ: اللہ کی طرف سے میرے لئے عطیہ ہے۔ اللہ نے میرے لئے یہی مصلحت سمجھی۔ میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اس صبر کا اللہ نے مجھے یہ پھل دیا کہ میں اپنے بستر پر روزانہ ملائکہ علیہم السلام سے مصافحے کرتا ہوں۔ مجھے عالم غیب کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ عالم غیب میرے اوپر کھلا ہوا ہے۔

تو جس بیمار کے اوپر عالم غیب کا انکشاف ہو جائے۔ ملائکہ کی آمد ورفت محسوس ہونے لگے اسے کیا مصیبت ہے کہ وہ تندرستی چاہے؟ اس کے لئے تو بیماری ہزار درجے کی نعمت ہے۔ حاصل یہ کہ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے تندرست کو تندرستی میں تسلی دی، بیمار کو کہا کہ تیری بیماری اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے تو اگر اس میں صبر اور

---

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل عیادۃ المریض، ج: ۴ ص: ۹۹۰ رقم: ۲۵۶۹۔

احتساب کرے گا حسبۃً للہ اس حالت پر صابر اور راضی رہے گا تیرے لئے درجات ہی درجات ہیں۔

پھر یہ بھی نہیں فرمایا کہ تو علاج مت کر علاج بھی کر، دوا دارو بھی کر مگر نتیجہ جو بھی نکلے، اس پر راضی رہ، اپنی جدوجہد کئے جا باقی افعال خداوندی میں مداخلت مت کر تیرا کام دوا کرنا ہے۔ تیرا یہ کام نہیں ہے کہ دوا کے اوپر نتیجہ بھی مرتب کر دے کہ صحت ہونی چاہئے۔ یہ اللہ کا کام ہے، تو اپنا کام کر، اللہ کے کام میں دخل مت دے، دوا دارو کر، مگر اللہ کی طرف سے جو کچھ ہو جائے اس پر راضی رہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے، اس پر صبر کرو گے، وہی بیماری ترقی درجات اور اخلاق کی بلندی کا ذریعہ بنتی جائے گی۔ اس سے آدمی کے روحانی مقامات طے ہوں گے، تندرست کو روحانیت کے وہ مقامات نہیں ملتے جو بیمار کو ملتے ہیں۔ تو بیمار یوں کہے گا مجھے میری بیماری مبارک، مجھے تندرستی کی ضرورت نہیں۔ تندرستی میں مجھے یہ مقامات مل نہیں سکتے تھے، جو بیماری میں ملے۔

تو اسلام نے تندرست کو تندرستی میں تسلی دی کہ تو اس کو مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا، بیمار کو بیماری میں تسلی دی کہ تو بیماری کو مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا، تو بیماری کی وجہ سے محروم نہیں رہ سکتا، یہ خیال مت کر کہ جو کچھ ملنا تھا، تندرست کو مل گیا، میرے واسطے کچھ نہیں رہا۔ تیری بیماری میں تیرے لئے سب کچھ ہے۔ بہرحال ہر ایک کو اپنے دائرے اور اپنے مقام پر تسلی دینا یہ اسلام کا کام ہے۔

زندگی اور موت میں بھی خدا ملتا ہے...... زندگی ہے، یہ بڑی نعمت ہے، زندگی نہ ہو تو آدمی طاعت وعبادت کیسے کرے؟ ترقی کے مدارج کیسے طے ہوں؟ سارے کام زندگی سے متعلق ہیں موت جب آئے، مرنے والے کا دل ٹوٹا کہ یہ تو اپنی زندگی میں سب کچھ کما رہا ہے، میں تو ختم ہو چکا، میرے لئے اب کچھ نہ رہا، فوراً اسلام نے تسلی دی کہ بے صبر مت بن پریشان مت ہو۔ "تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ" ① مومن کا سب سے بڑا تحفہ موت ہے جو اس کو اللہ کی طرف سے عطاء کیا جاتا ہے فرمایا "اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ." ② موت ایک پل ہے جس سے گزر کر حبیب اپنے محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے، اگر موت بیچ میں نہ ہو تو اللہ سے ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اگر یہ زندگی ختم ہو کر اگلی زندگی نہ آئے تو جمال خداوندی کے دیکھنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تو اس سے مرنے والے کو تسلی ہوگئی کہ میں تو بڑے درجات کی طرف جا رہا ہوں مجھے زندگی نہیں چاہئے۔ بلکہ ایسے میں موت کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُكَ" ③ اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول ہونے کا

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱ ص: ۶۶ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجلہ ثقات دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۲ ص: ۳۲۰. ② یہ حضرت حبان الاسود کا قول ہے۔ دیکھئے: فیض القدیر، ج: ۳ ص: ۳۰۷.

③ المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۳ ص: ۴۷۸ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۳۰۹.

قائل ہو۔ جو مجھے رسول مانتا ہے، اس کے دل میں موت کی محبت ڈال دے اس لئے کہ اگر اسے اللہ سے محبت ہے۔ اللہ تک پہنچانے والی چیز موت ہے تو اس سے بھی محبت ہوگی، کیونکہ منزل اگر محبوب ہے تو راستہ بھی عزیز اور محبوب ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا کہ یہود نے دعویٰ کیا تھا کہ اولیاء اللہ تو ہم ہیں۔ فوراً قرآن کریم نے مطالبہ کیا: ﴿قُلْ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① اے یہود! اگر تمہیں یہ دعویٰ ہے کہ تم اولیاء اللہ ہو تو ذرا موت کی تمنا تو کر کے دکھاؤ۔ ولی اللہ وہ ہوتا ہے جس کے دل میں اس زندگی سے زیادہ موت کی محبت ہوتی ہے ان کی زبانوں پر یہ شعر رہتا ہے کہ:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم تا در میکدہ شاداں وغزلخواں بروم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو چھوڑ کر ہم اس شہر مطلوب تک پہنچیں گے اور غزلخواں، شاداں اور فرحان جائیں گے، وہ کون سا دن ہوگا کہ اس گندے جہان کو چھوڑ کر پاک جہان میں جائیں گے۔

ابن الفارض رحمہ اللہ، جب ان کی وفات کا وقت آیا تو ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کھول دی گئیں اور منکشف ہوئیں، تو ابن الفارضؒ نے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر لیں اور یہ شعر پڑھا ۔

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِيْ فِي الْحُبِّ عِنْدَكُمْ مَا قَدْ رَاَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِيْ

اگر میری عمر بھر کی محنت کا ثمرہ یہ آٹھ کھلونے ہیں جو آپ نے رکھ دیئے تو افسوس میری عمر ضائع ہوگئی، مجھے کچھ نہ ملا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ آٹھوں جنتیں چھپا دی گئیں، تجلیات خداوندی سامنے آئیں اور ان کی روح غرغرا کر پرواز کر گئی، تو ایک مرنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ تجلیات خداوندی میرے استقبال کو آ رہی ہیں، اسے کیسے زندگی کی تمنا باقی رہ سکتی ہے؟

حدیث میں ہے کہ جب مومن کے مرنے کا وقت آتا ہے تو ملک الموت کے اعوان و انصار دو قسم کے ہیں ایک وہ جو دائیں ہاتھ پر ہیں۔ لاکھوں کروڑوں فرشتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو بائیں ہاتھ پر ہیں۔ دائیں ہاتھ والے مومنوں کی ارواح قبض کرتے ہیں اور بائیں ہاتھ والے کفار کی ارواح قبض کرتے ہیں۔ دائیں ہاتھ والے روشن چہرے کے ملائکہ ہیں، سورج اور چاند کی طرح ان کے چہرے چمکتے ہیں اور بائیں ہاتھ والے ملائکہ سود الوجوہ ہیں، سیاہ اور بھیانک چہرے ہیبت ناک ان کی شکلیں ہیں۔

مومن پر جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ دور سے کچھ ستارے اور روشنی دیکھتا ہے وہ تحیر (حیران) میں مبتلا ہوتا ہے کہ یہ روشنی کیسی ہے؟ یہ چاند سورج کیسے ہیں؟

یہ جو وقت ہوتا ہے ادھر سے غفلت کا اور ادھر متوجہ ہونے کا ہوتا ہے۔ ابھی نزع نہیں شروع ہوا ابھی غفلت

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ٦.

طاری ہوئی، نزع تب شروع ہو گا جب سانس چلنے لگے لیکن ابتداءً یہ خوشی طاری ہے ہے اور یہ غفلت ہے کہ ادھر کا جہان چھپ جاتا ہے اور ادھر کا جہان روشن ہو جاتا ہے اور یہ نظر پڑتا ہے کہ لاکھوں چاند اور سورج ہیں جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ تو یہ تحیر میں دیکھتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسا کارخانہ ہے؟۔ اور ملائکہ علیہم السلام یہ آہستہ آہستہ اس لئے بڑھتے ہیں کہ مقصد شفقت ہے، اگر ایک دم آ پڑیں تو یہ گھبرا نہ جائے کہ یہ کیا بات ہو گئی، اس لئے آہستہ آہستہ اس کے دل میں گنجائش کرتے ہوئے آتے ہیں کہ وہ سہتا جائے اور یہ سمجھتا جائے پھر اخیر میں قریب آ جاتے ہیں پھر اسے کوئی اوپری بات معلوم نہیں ہوتی۔ اور یہ نہیں کہ آتے ہی روح قبض کرنی شروع کر دی۔ حدیث میں ہے کہ اس میت کو عالم آخرت کی ترغیب دلاتے ہیں اور دنیا سے نفرت دلاتے ہیں کہتے ہیں کہ ''اُخْرُجِیْ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ اُخْرُجِیْ اِلٰى رَوْحٍ وَّرَيْحَانٍ وَرَبِّ غَيْرَ غَضْبَانَ'' ① اے پاک روح! اے پاک نفس! تو نے اپنے بدن کو نیک اعمال سے پاک کیا۔ اپنی روح کو بھی ذکر سے نیک کیا یا نیک کلمات سے پاک رکھا، تو اے پاک روح! اپنے پاک بدن سے چلی آ۔ اور کہاں جا؟ ''اُخْرُجِیْ اِلٰى رَوْحٍ وَّرَيْحَانٍ'' بہاروں کی طرف اور نعمتوں کی طرف چل اور اس پروردگار کی طرف چل جو تجھ پر نامہربان نہیں، بلکہ شفیق، مہربان اور رحمت والا ہے، تیرا منتظر ہے۔ یہ گویا ترغیب دیتے ہیں تاکہ بندہ راضی ہو اور اس کی رضا کے بعد روح قبض کرنا شروع کریں۔

انبیاء علیہم اسلام کی ارواح قبض کرنے کے لئے ملک الموت آتے ہیں تو باقاعدہ اجازت مانگتے ہیں جب انبیاء علیہم اسلام اجازت دے دیتے ہیں تب قبض روح شروع ہوتا ہے۔ مومن سے اجازت نہیں لی جاتی مگر ترغیب دی جاتی ہے تاکہ وہ موت کے اوپر مطمئن ہو جائے۔ اس کی رضا حاصل ہو جائے تب قبض روح شروع ہو، تو یوں ترغیب دیتے ہیں کہ اس گندے جہاں کو چھوڑ اور اس پاک جہاں کی طرف چل، ادھر نفس کی حکومت تھی، ادھر اس رب کی حکومت ہے جو تجھ پر کبھی نامہربان نہیں ہے، ہمیشہ تجھ پر مہربان رہے گا، روح وریحان اور نعمتوں کی طرف چل۔

سب جانتے ہیں کہ موت سے انسان کو طبعاً کراہت ہے، کتنی نعمتیں ہوں مگر موت قبول کرنے کے لئے آدمی تیار نہیں ہوتا، تو جب وہ اس ترغیب سے راضی نہیں ہوتا، حدیث میں ہے کہ پھر ملائکہ اس کو جنت کے تحفے دکھلاتے ہیں، کچھ پھل، کچھ لباس، اس کو دیکھ کر ایک دم روح پرواز کرنی شروع کر دیتی ہے اور تشبیہ دی گئی کہ اس طرح سے نکل جاتی ہے جیسے مشک میں پانی بھر کر پانی الٹ دو، اس کا منہ کھول کر نیچے کر دو اور سارا پانی غرغرا کر نکل جائے گا، ایک قطرہ باقی نہیں رہے گا، اس طرح روح شوق وذوق میں پرواز کر جاتی ہے، تو ملائکہ علیہم السلام آتے ہیں، ترغیب دیتے ہیں، بندے کی رضا حاصل کرتے ہیں جب وہ راضی ہوتا ہے تب اس کی روح قبض کرتے ہیں، یہ ملائکہ علیہم السلام کی شفقت ہے، ملک الموت اس سے بات بھی کرتے ہیں۔

① المصنف لعبدالرزاق، کتاب الجنائز، باب الصبر والبکاء والنیاحة، ج: ۳ ص: ۵۶۶ رقم: ۶۷۰۲۔

جب نزع شروع ہوا۔ یہ ملک الموت کے اعوان وانصار کا کام ہے، نزع ہونے کے بعد روح کا قبض کرنا اور قبضے میں لینا، یہ ملک الموت کا کام ہے، گویا ابتدائی مبادی یہ ملائکہ طے کرتے ہیں اور آخری نتیجہ ملک الموت علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی جیسے نعمت ہے موت بھی ایک نعمت ہے۔ اسلام نے اگر زندگی کی تعریف کی اور ترغیب دی اور کہا کہ تم دعائیں مانگو کہ ہماری عمر صالحات وحسنات کے ساتھ دراز ہو، اب ایک شخص زندہ ہے تو ممکن ہے مرنے والے کے دل میں مایوسی پیدا ہو کہ اسے تو سب کچھ مل گیا، میری عمر ختم ہوگئی، تو اسے اس حالت میں تسلی دی کہ تیری موت تیرے لئے تحفہ اور روح وریحان کا پیغام ہے حق تعالیٰ کی رضا اور خوشی کا پیغام ہے، غرض یہ اس پر راضی کہ مجھے موت آ رہی ہے، وہ اس پر راضی کہ مجھے زندگی مل رہی ہے، نہ یہ مایوس نہ وہ مایوس۔ اسلام نے ہر ایک کو تسلی دی ہے کسی حالت میں اپنے پیروؤں کو مایوس نہیں کرتا، ہزار مصیبتیں آ جائیں اسلام مایوس نہیں ہونے دے گا۔ ہزار نعمتیں آ جائیں اس میں راستے دکھلائے گا، مصائب کے بارے فرمایا ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (1) کتنی مصیبت آ جائے، کبھی مایوس مت ہونا، مومن کا کام نہیں ہے اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا۔

تو مصائب میں اسلام تسلی دیتا ہے کہ مصیبت سے مت گھبراؤ، مصیبت بھیجنے والے پر نظر رکھو، نعمت میں آدمی راضی کہ نعمت مل گئی، مصیبت آ گئی تو صابر اس کے اندر بھی راضی کہ مجھے بھی نعمت مل گئی، میرے اخلاق میں وہ بلندی پیدا ہوئی کہ نعمتوں میں وہ بلندی پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ تو اس مصیبت نے میرے اخلاق اونچے کر دیئے۔ غرض کوئی حالت ایسی نہیں ہے کہ انسان کو مایوس بنا دیا گیا ہو۔

یہ میں نے اس پر عرض کیا کہ جب میں نے عبادت کا نام لیا تو ممکن ہے اس طرف تصور گیا ہو کہ بس اب کہا جائے گا کہ کوٹھی بنگلے چھوڑو اور جاؤ مسجد کی طرف۔ یہ نہیں کہا جا رہا، بلکہ کوئی حالت ایسی نہیں جس میں خدا نہ ملتا ہو، اگر آپ کوٹھی بنگلوں میں رہ کر چاہیں، وہاں بھی اللہ کو یاد کر سکتے ہیں۔ آپ کی نیت صحیح ہونی چاہئے۔ آپ کا نصب العین درست ہونا چاہئے، مال کماؤ تو جائز طریق پر خرچ کرو جائز طریق پر، تو کمانا بھی عبادت، خرچ کرنا بھی عبادت ہے، دونوں پر سچی نیت سے اس طرح اجر ملے گا جس طرح نماز پڑھنے پر ملتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی مفلس بنے جب خدا کو پائے گا۔

دولت اپنی ذات سے بری نہیں...... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب مقبول ہیں، لیکن ان میں مالدار بھی ہیں اور نادار بھی، لکھ پتی بھی ہیں اور کروڑ پتی بھی اور ابوذر غفاریؓ جیسے بھی جن کا مذہب یہ تھا کہ اگر ایک وقت کا کھانا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے کہ دوسرے وقت کے لئے آدمی جمع کرے تو جہاں ابوذر غفاریؓ جیسے صحابہؓ ہیں وہاں عبدالرحمن ابن عوفؓ جیسے بھی ہیں جو لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگوں میں ہیں جن کی تجارت تھی۔

(1) پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷.

ان کی تجارت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی تھی اور حال یہ تھا کہ ان کی تجارت کی کوٹھیاں روم، مصر اور شام میں جگہ جگہ بنی ہوئی تھیں اور نفع کا مال جب آتا تھا، تو یہ نہیں تھا کہ دس پانچ آدمی لے کر آجائیں بلکہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور فرماتے تھے کہ گھر میں ڈالدو، وہ اس قدر ہوتا تھا کہ غلے کی طرح ڈھیر لگ جاتا تھا۔ دولت کی یہ کیفیت تھی۔

مگر اس کے ساتھ قلب کی کیا کیفیت تھی؟ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مہمانداری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو، چار چار سو مہمان، دسترخوان پر جمع ہوتے تھے، جب نعمتیں چنی جاتیں، دسترخوان سج جاتا اور کھانے کیلئے بیٹھتے تو عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونا شروع کرتے بے اختیار دل بھر آتا اور فرماتے "اے اللہ! تیرے نبی کے دسترخوان پر کبھی ایک سے دوسرا کھانا جمع نہ ہوا اور میرے دسترخوان پر اتنی نعمتیں۔؟ کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو نہیں ختم کی جا رہیں"۔ یہ کہہ کر روتے اتنا روتے کہ بے خود ہو جاتے، سارے حاضرین اور مہمان بھی روتے اور بے کھائے پیئے دسترخوان اٹھ جاتا۔

رات کو پھر دسترخوان بچھایا جاتا۔ پھر اللہ کی نعمتیں چنی جاتیں، پھر عبدالرحمٰن ابن عوفؓ پر گریہ طاری ہوتا اور کہتے کہ "اے اللہ مہاجرین اولین اتنی غربت اور بے کسی سے دنیا سے گئے کہ فاقے پر فاقے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس غربت میں وفات پائی کہ کفن بھی پورا میسر نہیں تھا۔ اگر سر ڈھانپا جاتا تو پیر کھل جاتے تھے۔ پیر ڈھانپے جاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ آخر میں سر ڈھانپ دیا گیا اور پاؤں پر اذخر گھاس ڈال کر دفن کر دیا گیا۔ تو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تو یہ حالت اور عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کا گھر پیسوں اور اشرفیوں سے بھرا پڑا ہے کہیں دنیا ہی میں میری جنت کی نعمتیں تو ختم نہیں کی جا رہی ہیں؟"

پھر روتے، سارے حاضرین روتے اور بے کھائے پیئے دسترخوان اٹھ جاتا، تین تین وقت کے فاقے اس طرح سے آتے تھے۔ تو دولت کا یہ حال اور قلب کا یہ حال؟ غرض اسلام دولت کا مخالف نہیں ہے، تمول کو برا نہیں کہتا لیکن تمول سے اگر دل بگڑ جائے اس دل کو اسلام برا کہتا ہے، دولت اس لئے نہیں ہے کہ دل کو بگاڑا جائے، بلکہ اس لئے ہے کہ صحیح دل رکھ کر اس کو صحیح مصرف میں لگایا جائے تو آدمی کی دولت بری نہیں ہے آدمی برا ہوتا ہے، آدمی برا ہے تو دولت بری ہو جائے گی، آدمی اچھا ہے تو دولت اچھی ہو جائے گی سامان اپنی ذات سے اچھا یا برا نہیں، سامان والے کو دیکھو کہ وہ اچھا ہے یا برا۔؟ وہ اچھا ہے تو سارا سامان اچھا۔ وہ برا ہے تو سارا سامان برا۔ لوگ خواہ مخواہ دولت کو برا کہتے ہیں۔ دولت بیچاری نے کیا قصور کیا ہے؟ آدمی اپنے کو دیکھے۔

دولت کی مثال ...... عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی عجیب مثال دی ہے فرمایا: دولت کی مثال ایک سمندر کی ہے اور انسان کا دل کشتی جیسا ہے۔ پانی اگر کشتی سے باہر رہے تو منزلیں طے کرے گی اور اگر کشتی کے اندر آ گیا تو کشتی بھی گئی اور کشتی والا بھی گیا، تو فرمایا:

دولت ایک سمندر کی مانند ہے اور ہمارے دل کشتیوں کی مانند ہیں۔ اگر دولت دل سے باہر باہر ہے تو پار لگا کے آخرت کے کنارے پر پہنچا دے گی۔ لیکن اگر دل کے اندر آ گئی تو دل بھی ڈوبا اور دل والا بھی ڈوبا، غرض دولت کی برائی نہیں، دولت کا محل بتایا کہ دل سے باہر ہاتھ پاؤں میں رکھو کماؤ، کھاؤ پیو اور خرچ کرو، لیکن رہنی چاہئے ہاتھ پیر کے اندر۔ دل کے اندر فقط محبت خداوندی ہونی چاہئے۔ دولت کی محبت نہیں ہونی چاہئے۔

طبعی محبت کی رعایت...... اور اگر تھوڑی بہت طبعی طور پر محبت ہو بھی، آخر بالکل محبت کو کیسے دل سے نکال دے، کچھ نہ کچھ محبت ہوتی ہے۔ تو اسلام نے بھی یہ نہیں کہا کہ بالکل محبت نکال دو تمہیں طبعی طور پر محبت و تعلق ہے، لہذا رکھو، مگر وہ محبت اتنی نہ ہو کہ جب محبت خداوندی کا مقابلہ پڑے تو یہ محبت غالب آ جائے۔ مقابلہ پڑے تو وہ محبت غالب رہنی چاہئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر تمہارے ماں باپ اور اولاد اور تمہارے بھائی بند اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ، تمہارے اموال اور تمہاری تجارتیں جن میں کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار کھوٹا نہ ہونا چاہئے اور تمہاری بلڈنگیں، اعلیٰ اعلیٰ مکانات و محلات جن سے تم راضی ہو اور تمہارے قلوب میں کشش موجود ہے، ﴿اَحَبَّ اِلَيْكُمْ﴾ اگر یہ اللہ کی محبت کے مقابلہ میں زیادہ محبوب بن گئے تو مصائب اور فتنوں کا انتظار کرو۔

اس میں بتلا دیا گیا کہ "اَحَبِّيَّتْ" کی ممانعت ہے کہ بمقابلۂ خدا زیادہ محبوب نہیں ہونا چاہئے۔ معلوم ہوا تھوڑی بہت محبت ہو تو اجازت دی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اسے اپنے مال اور اپنی چیزوں سے محبت ہوتی ہے، ہر انسان ولی کامل نہیں ہوتا۔ یہ پیغمبروں کے مقامات ہیں کہ ذرہ برابر قلب میں لگاؤ نہیں ہے، اولیاء کے مقامات ہیں کہ دولت یا مال سے ذرہ برابر لگاؤ نہیں، اب ہم اور آپ اس مقام تک کہاں پہنچ سکتے ہیں؟ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محبت رکھو ہم نکالنا نہیں چاہتے، مگر مقابلہ پڑ جائے تو یہ دیکھو کہ محبت خداوندی کے مقابلے میں یہ مغلوب ہے یا غالب ہے؟ اگر غالب ہو تو پھر مصیبتوں کا انتظار کرو۔ اگر مغلوب ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، بہر حال اس کی گنجائش دی ہے۔ معلوم ہوا دولت کے اندر رہ کر بلکہ دولت کی کچھ نہ کچھ محبت رکھ کر پھر بھی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دولت اس سے چھینی جائے تب اللہ تک پہنچے یہ اسی دولت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔ حاصل یہ نکلا کہ عبادت کا لفظ سن کر یہ دھیان نہ جانا چاہئے کہ گھر بار چھوڑ کر مسجد میں جاؤ، مسجد میں بھی خدا ملتا ہے گھر میں بھی ملتا ہے۔

انسان ہر حال میں خدا تک پہنچ سکتا ہے..... کھانا کھاتے ہوئے دستر خوان پر بھی ملتا ہے حتیٰ کہ استنجاء تک

---

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۲۴.

جاتے ہوئے بھی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ایک آدمی کھانا کھا رہا ہے اور اس نیت سے کھا رہا ہے کہ اگر میرے پیٹ میں کچھ قوت پڑ جائے تو اللہ کے راستہ میں عبادت و طاعت میں صرف کروں گا۔ وہ پورا کھانا عبادت میں داخل ہے اور اس شان سے داخل ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ جس نے بسم اللہ سے کھانا شروع کیا اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا پر ختم کیا یعنی کھا کر یہ کہا فرماتے ہیں: غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبٍ پچھلے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں کھائی روٹی اور معاصی کی بخشش ہو رہی ہے، جو نماز پر ثمرہ مرتب ہوتا ہے، وہ دستر خوان پر مرتب ہوا۔ معلوم ہوا آدمی دستر خوان پر بیٹھ کر بھی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔

روزہ سے بھی پہنچتا ہے، افطار سے بھی پہنچتا ہے۔ روزہ رکھے گا اس کے لئے فرماتے ہیں ''اَلصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ.'' ① ''روزہ میرا ہے میں اس کا بدلہ دوں گا'' اور افطار کرنے بیٹھا تو فرمایا افطار کرنے والے کے لئے دو فرحتیں ہیں، ایک فرحت یہ ہے کہ پانی پی کر پورے بدن میں سیرابی آ گئی اور دوسری فرحت یہ ہے کہ اللہ کی ملاقات نصیب ہوگی، رضائے خداوندی نصیب ہوگی۔ غرض روزے میں آدمی فاقہ کر کے اللہ تک پہنچا اور کھا کر بھی اللہ تک پہنچا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جب فاقہ کرے جبھی پہنچے اسی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی مفلس ہو جبھی اللہ تک پہنچے، سرمایہ دار ہو تب بھی پہنچ سکتا ہے، بشرطیکہ سرمایہ کا اول و آخر درست ہو، حرام اور ناجائز کمائی نہ ہو، خرچ میں بھی ناجائز طریقہ نہ ہو۔

آج کا جنید و شبلی...... اور آج تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایک انسان حرام سے بچ جائے اور فرائض ادا کرتا رہے تو وہ ولی کامل ہے۔ یہ اس زمانے میں جنید بغدادی جیسا ہے کہ اس زمانے میں جنید بننے کے لئے بے شک یہ ضروری تھا کہ کسی مکروہ کا بھی ارتکاب نہ کرے اور کوئی مستحب بھی نہ چھوٹنے پائے۔ لیکن آج کا جنید اگر فرائض سرانجام دے اور حرام سے بچ جائے تو انشاء اللہ اسے جنید و شبلی جیسا اجر ملے گا۔

اس لئے کہ آج کا زمانہ انتہائی فتنوں اور رکاوٹوں کا زمانہ ہے۔ ان رکاوٹوں میں رہ کر آدمی اپنے دین پر قائم رہ جائے تو وہ مجاہد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے ارشاد فرماتے ہیں کہ ''آج تم ایسے دور میں ہو کہ اگر دین کے دس حصوں سے نو حصے انجام دو۔ ایک حصہ چھوٹ جائے، تم سے قیامت کے دن مواخذہ ہوگا کہ تم نے ایک حصہ کیوں چھوڑا؟ اور فرمایا تمہارے بعد ضعفاء آنے والے ہیں کہ اگر دین کے دس حصوں میں ایک حصے پر عمل کریں اور نو حصے چھوٹ جائیں تو انہیں اجر وہ دیا جائے گا جو تمہیں دیا جا رہا ہے''۔

یہ اس لئے کہ تمہارے سامنے رکاوٹیں نہیں خدا کا رسول موجود ہے، معجزے موجود، خیر القرون کے اندر تم موجود ہو، سارے دواعی اور اسباب دین موجود ہیں۔ اس لئے دین پر عمل کرنا تمہارے لئے دشوار نہیں۔ بعد والے وہ ہوں گے کہ نہ ان کی آنکھوں کے سامنے اللہ کا رسول موجود نہ معجزے ہوں گے نہ ان کے سامنے خیر القرون ہوگا نہ وہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الصوم، باب فضل الصیام، ج:۲، ص:۸۰۷ رقم: ۱۱۵۱.

حالات و کیفیات ہوں گی، بلکہ شک ڈالنے والے اور شبہات پیدا کرنے والے زیادہ ہوں گے۔ فتنوں کا ایک ہجوم ہوگا۔ جو ان سب کے اندر رہ کر دین پر قائم ہوگا۔ وہ تھوڑا بھی کرے گا تو اجر وہ ملے گا جو آج تمہیں دیا جارہا ہے۔

غرض رکاوٹوں اور موانع کی کثرت میں جو چیز آتی ہے وہ قابل قدر ہوتی ہے، اس واسطے دولت دنیا ہو، تمول ہو، بلڈنگیں ہوں، باغات ہوں اگر حلال طریق پر کمائی جائیں حق تعالیٰ نے عطا کیا، تو اس کا عطیہ ہے، ضائع نہ کیا جائے لیکن اسی سے پوچھ کر خرچ کیا جائے۔

ہماری ملکیت کی حیثیت...... اس واسطے کہ اپنی جان کے بھی ہم مالک نہیں ہیں تو اپنے مالوں کے مالک بھی ہم نہیں ہیں۔ جان کا مالک وہ ہے جس نے جان بنائی، ہمارے مالوں کا مالک وہ ہے جس نے مال بنا کر ہمارے سپرد کیا ہے۔ درحقیقت مالک حق تعالیٰ شانہٗ ہیں ہم امین وخزانچی ہیں، خزانچی کا کام یہ نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے جسے چاہے دیدے، مالک سے پوچھنا پڑے گا کہ کتنا کس کو دوں؟ وہاں سے آرڈر ہوگا جتنا حکم ہوگا، اتنا خرچ کرنا پڑے گا، فرمایا گیا ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ ① "زمین کا مالک اللہ ہے جسے چاہے بخش دے"۔ ہم مالک نہیں ہیں، اور جب بخش دیتے ہیں تو بخشنے کے بعد بھی مالک وہی رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ﴿وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ﴾ ② سارے انسان دولتوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ "اصل وارث ہم ہیں"۔ پھر وراثت ہمارے ہی پاس آجائے گی، ہم ہی اول میں مالک تھے، ہم ہی اخیر میں ہیں اور درمیان کے حصہ میں بھی مالک ہم ہی ہیں، ہمارا ہی آرڈر چلے گا، ہمارے ہی کہنے کے مطابق وہ خرچ کی جائے گی۔

اسی لئے فرماتے ہیں ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ③ اس دولت میں سے خرچ کرو جو ہماری بخشی ہوئی ہے۔ یہ لفظ اس لئے کہہ دیا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم مالک ہو یا تم اس دولت کے بنانے والے ہو، پیدا کرنے والے بھی ہم ہیں مالک بھی ہم ہیں تو فرمادیا کہ ﴿مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ وہ جو ہم نے تمہیں دولت دی ہے اس میں سے خرچ کرو۔

ترغیب انفاق...... اس عنوان سے خرچ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ انسان کو اپنی چیز دوسرے کو دینے میں طبعًا رکاوٹ ہوتی ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ بھائی یہ چیز تمہاری کب ہے تو دینا آسان ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ۔

مال مفت دل بے رحم

جب مال مفت کا ملے گا، آدمی بے تکلف خرچ کرے گا۔ ایک چیز دوسرے کی ہے، میں کیوں بخل کروں؟ اس لئے فرمایا کہ: تم اسے اپنی چیز سمجھتے کیوں ہو؟ یہ تو ہماری چیز ہے۔ جب ہم اجازت دے رہے ہیں تو ہماری چیز سمجھ کر خرچ کرو تاکہ سخاوت کرسکو۔ اطمینان سے دے سکو۔ یہ تمول اور دولت خود دین کے کمانے کے ذریعہ ہے جیسے میں نے عرض کیا صحابہؓ میں ابوذر غفاریؓ جیسے بھی ہیں اور صدیق اکبرؓ و (عبدالرحمٰن ابن عوفؓ) جیسے بھی ہیں۔

---

① پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۸۔ ② پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۸۔ ③ پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۱۰۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: میرے اوپر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ ابوبکرؓ کا احسان ہے کہ چالیس ہزار روپیہ میری ذات کے اوپر خرچ کیا ہے۔ اس زمانے کا چالیس ہزار روپیہ ایسا ہے جیسا آج کا چالیس لاکھ روپیہ۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ضرورت پیش آئی اور خدام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خرچ کیا۔ یہ خرچ کرنا عین طاعت وعبادت بنا وہی ترقی کا باعث بنا کہ صدیقیت کا مقام ملا۔

بادشاہت کے ساتھ عبادت...... حاصل یہ نکلا کہ انسان کسی بھی حالت میں ہو عبادت سے محروم نہیں رہ سکتا، ہر مقام کی عبادت ہے۔ دولت مند کی عبادت دولت کے ساتھ، غریب کی عبادت غربت کے ساتھ ہوتی ہے۔ بادشاہ کی عبادت بادشاہت کے ساتھ ہوتی ہے اور فقیر بے نوا کی عبادت فقر وفاقہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

امیر کے بارے میں فرمایا کہ: ''سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّهٗ'' ① ''سات قسم کے لوگ ہوں گے جن کو قیامت میں عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جس دن بجز اللہ کے سائے کے کوئی سایہ نہیں ہوگا''۔ اس میں پہلی نوع فرمایا:

''اِمَامٌ عَادِلٌ.'' ''وہ بادشاہ جو عدل وانصاف والا ہو''۔ اسے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔ ایک فقیر یہ سمجھتا تھا کہ اسے اتنے اونچے مراتب مل رہے ہیں۔ یہ تخت پہ بیٹھا ہوا بادشاہ ہے۔ اس کے سامنے وسائل زندگی کھلے ہوئے ہیں عیش کے سارے سامان اس کے قبضے میں ہیں۔ یہ کیا دیندار ہوتا؟ لیکن اسلام نے آ کر اسے تسلی دی کہ تو تخت پر بیٹھ کر بھی اللہ کو پا سکے گا۔ اگر تو عدل وانصاف کرے تو تجھے وہ مقام ملے گا کہ تجھے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔ غرض ایک فقیر بے نوا کو بھی یہ مقام دیا گیا اور ایک بادشاہ وقت کو جو تخت وتاج کا مالک تھا، اسے بھی یہ مقام دیا گیا۔ تو اسلام کسی کے ساتھ بخل نہیں کرتا۔ نہ یہ کہتا ہے کہ تو اپنا مقام بدل جب جا کے تجھے خدا ملے گا۔ بلکہ اپنے مقام پر رہ۔ مگر ضرورت کس چیز کی ہے؟ فکر کی ضرورت ہے۔ بے فکرا انسان کوئی انسان نہیں ہے۔ جس انسان کا نصب العین نہیں ہے، وہ انسان نہیں ہے، عقلمند انسان وہ ہے کہ اپنا نصب العین ٹھہرا دے۔ تو نصب العین طاعت وعبادت خداوندی نکلا۔ دولت مند ہوگا تب بھی اطاعت کر سکتا ہے۔ مفلسی میں ہوگا تب بھی یہ نصب العین اپنا سکتا ہے۔ بادشاہی تخت پر ہے تب بھی یہ نصب العین قائم ہے۔ غربت میں ہے تب بھی، تندرستی میں ہو تب بھی یہ نصب العین قائم اور انتہائی بیماری میں ہو تب بھی۔ زندگی ہو تو یہ نصب العین قائم، موت آ جائے تو بھی، یہ عجیب ترین نصب العین ہے جو اس لمبی عمر کے ساتھ اخیر تک چلتا ہے۔

قبر میں عبادت...... قبر میں بھی جا کر عبادت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لئے صاف حدیث موجود ہے کہ ''اَلْاَنْبِيَآءُ اَحْيَآءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ'' (اَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ② ''انبیاء علیہم السلام اپنی

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الزكوة، باب فضل الصدقة، ج: ۲ ص: ۷۱۵ رقم: ۱۰۳۱. ② المسند للامام ابى يعلىٰ الموصلى، احاديث انس بن مالك رضى الله تعالىٰ عنه، ج: ۶ ص: ۱۴۷ رقم: ۳۴۲۵. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۸ ص: ۲۱۱.

قبروں میں زندہ ہیں اور عبادتوں میں مشغول ہیں نمازیں بھی پڑھتے ہیں'' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مُوْسٰی یُلَبِّیْ'' ① گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں موسیٰ علیہ السلام تلبیہ پڑھتے ہوئے لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے میدان عرفات میں جا رہے ہیں گویا حج بھی کرتے ہیں تلبیہ بھی پڑھتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ مطاف میں ایک شخص چوڑے سینے والا، چہرہ اتنا حسین اور تروتازہ کہ ایسا معلوم ہوا ابھی حمام سے غسل کر کے نکلا ہے۔ بال اتنے خوبصورت اور اتنے شاداب جیسے معلوم ہو کہ ان سے پانی ابھی ٹپک پڑے گا۔ تو میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ: مطاف میں یہ کون شخص ہے؟ کہا مسیح ابن مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام طواف میں بھی ہیں، غرض انبیاء علیہم السلام کی عبادت ثابت ہوئی۔

اولیائے کرام، کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اولیائے کرام کو بھی ذکر کا الہام فرماتے ہوں وہ بھی تسبیح وتہلیل میں لگے رہتے ہوں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ صلحائے مومنین بھی ذکر اللہ میں لگے رہتے ہوں۔ حدیث میں ہے کہ: ''تُحْشَرُوْنَ کَمَا تَمُوْتُوْنَ وَتَمُوْتُوْنَ کَمَا تَحْیَوْنَ.'' ''تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے''۔ اگر ذکر اللہ پر زندگی گزاری ہے، موت بھی ذکر اللہ پر آئے گی، قبر سے جب اٹھے گا وہی ذکر کرتا ہوا اٹھے گا اگر حج میں لبیک کہتا ہوا انتقال کر گیا تو حدیث میں ہے کہ جب قبر سے اٹھے گا تو لبیک لبیک زبان پر جاری ہوگا۔ اور یہ سمجھتا ہوا ہوگا گویا میں حج کر رہا ہوں۔ بعد میں یہ پتہ چلے گا کہ یہ میدان عرفات نہیں ہے بلکہ میدان محشر ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب انسان قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور ملائکہ علیہم السلام سوال وجواب کے لئے آتے ہیں جن میں سے ایک کا نام منکر اور ایک کا نام نکیر ہے، اور منکر نکیر اس لئے کہا کہ ان کی صورتیں اوپری ہوتی ہیں جو کبھی نہیں دیکھی ہوتیں۔ وحشت ناک، ہیبت ناک اور ڈراؤنی شکلیں ہوتی ہیں۔ وہ آتے ہیں اور تین سوال کرتے ہیں کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ تیرا پروردگار کون؟ وَمَادِیْنُکَ؟ اور تیرا طریق کار کیا تھا؟ وَمَنْ ھٰذَا الرَّجُلُ؟ ② اور یہ ذات بابرکات جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے کون ہیں؟

حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب یہ دونوں سوال کرنے کے لئے آتے ہیں تو ہر مومن کو جو وہاں قبر میں وقت دکھلایا جاتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ سورج ڈوبنے والا ہے اور عنقریب دن ختم ہونیوالا ہے۔ یَتَمَثَّلُ لَہُ الشَّمْسُ سورج کی صورت مثالی سامنے آتی ہے کہ سورج ڈھلنے والا ہے۔ اس وقت فرشتہ پوچھتا ہے کہ مَنْ رَّبُّکَ کون

---

① الحديث اخرجه الامام مسلم في صحيحه ولفظه: كأني انظر الى موسىٰ عليه السلام ها بطاً من الثنية وله جؤار الى الله بالتلبية، كتاب الايمان، باب الاسراء برسول الله صلى الله عليه وسلم الى السماوات ج: ١ ص: ٣٩٢.

② المصنف لابن ابى شيبة، كتاب الجنائز، باب فى نفس المومن كيف تخرج ونفس الكافر، ج: ٣ ص: ٥٥ رقم: ١٢٠٨٩. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ٦ ص: ١٣٠.

ہے تیرا پروردگار؟ یہ میت جواب دیتا ہے کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ میاں پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے کہیں وقت نہ نکل جائے، میری نماز مکروہ نہ ہو جائے۔

دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ اس سے کیا جواب مانگتے ہو کہ تیرا رب کون ہے؟ یہ تو رب میں اتنا منہمک ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کو اور اس کی عبادت کرنے کو تیار ہے؟ اس سے رب کا کیا پوچھنا؟ اس نے عملاً جواب دیدیا کہ یہ اس کا بندہ ہے جس کی نماز پڑھنے کو تیار ہے۔

دوسرا کہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ یہ جواب سچا دے گا، مگر ہمارا فرض ہے ہمیں ڈیوٹی انجام دینی ہے یہ ہمیں یقین ہے کہ تینوں سوالات کا جواب حق ملے گا۔ تو قبر میں اس مومن کا یہ کہنا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ (مجھے چھوڑ دو نماز کا وقت جا رہا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں نماز کا جذبہ رہے گا۔

اب یہ کہ پڑھوائی جائے نہ پڑھوائی جائے یہ اللہ جانتا ہے لیکن جذبہ ہے۔ ''نِيَّةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ'' ''اگر انسان نیت کرے تو نیت عمل سے بہتر ہے''۔ اس پر وہی اجر مرتب ہوتا ہے جو عمل پر ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ: بعض لوگ میدان محشر میں حاضر ہوں گے حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ ان کے نامہ اعمال میں لکھ دو کہ ساری عمر تہجد پڑھا۔ ملائکہ عرض کریں گے یا اللہ! انہوں نے تو ایک دن بھی نہیں پڑھا۔

حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے ان میں سے ایک جب رات کو سوتا تھا تو یہ جذبہ لے کر سوتا تھا کہ آج رات کو ضرور اٹھ کے تہجد پڑھوں گا۔ مگر غریب کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں، جب اس نے ساری عمر یہ نیت رکھی تو لکھ دو کہ اس نے ساری عمر تہجد پڑھا۔ غرض مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، وہاں جو یہ کہے گا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ مجھے چھوڑو، میں نماز پڑھتا ہوں، معلوم ہوتا ہے ہر مومن کے اندر یہ جذبہ ہے۔

مگر یہ جذبہ کس مومن کے لئے ہوگا؟ جو دنیا میں بھی وقت مکروہ سے بچنے کے لئے چاہتا تھا کہ وقت پہ نماز ادا کرلوں، وہی وہاں بھی کہے گا۔ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ اور جو یہاں پڑا ہوا دندناتا سوتا تھا، اس کی زبان سے نہیں نکلے گا کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ مجھے چھوڑ دو۔ میں نماز پڑھتا ہوں۔

اور شاید عصر کی نماز اس لئے رکھی کہ امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عصر کی نماز کے وقت کے دو حصے ہیں۔ ایک وقت کامل ہے، ایک وقت مکروہ۔ دھوپ میں جب تک زردی نہ آئے وہ وقت کامل ہے اور جب زردی آجائے وہ وقت مکروہ ہے اور عین جب سورج غروب ہونے لگے وہ وقت وقت مکروہ تحریمی ہے۔

امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ جب عصر کی نماز اس کے اوپر کامل فرض ہوئی تھی تو کامل ہی ادا کرنی چاہئے ناقص واجب ہوگی تو ناقص ادا کرے گا۔ اس واسطے اگر غروب کے وقت بھی ادا کردی تو ادا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جیسی واجب ہوئی تھی ویسی ادا کردی، اس لئے کہ عصر کے دو وقت ہیں، ایک وقت کامل ایک وقت مکروہ۔ قبر میں مومن کے واسطے ڈرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ کہیں وقت مکروہ نہ آجائے، میں پہلے ہی کیوں نہ ادا کرلوں؟ صبح کی نماز

میں دو قسم کے وقت نہیں ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے پڑھ لے، جتنا وقت ہے سارا کامل ہے، جب سورج نکل آیا، وقت ختم ہو گیا۔ بخلاف عصر کے اس کے دو وقت ہیں۔ تو شاید اس لئے عصر کی نماز کا وقت دکھایا جاتا ہے کہ اس میں ناقص اور کامل دو حصے ہیں۔ تو مومن سوچتا ہے کہ کامل نماز ادا کیا کرتا تھا۔ اب یہ وقت ناقص آ رہا ہے میری نماز کہیں ناقص نہ ہو جائے۔ اس لئے ملائکہ سے کہے گا دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ۔

بہر حال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن قبر میں ایک جذبہ لے کر جائے گا اور جذبہ یہ ہوگا کہ میں نماز پڑھوں۔ تو انبیاء علیہم السلام عملاً نماز میں مشغول ہیں۔ مومن اس جذبے میں مشغول ہے اگر چہ عمل کی اجازت نہ دی جائے یا اس میں سکت نہ ہو۔ تو دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ اس کا جذبہ ہی عمل کے قائم مقام ہوگا۔ گویا وہ بھی نماز پڑھ رہا ہے۔

میدانِ حشر میں جذبۂ عبادت...... تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کا نصب العین وہ ہونا چاہئے کہ انسان اسے اس دنیا میں بھی نصب العین بنا سکے اور جب قبر میں پہنچے تب اس کا نصب العین اس کے ساتھ ہو اور وہ عبادت ہے۔ عبادت کا جذبہ جیسے یہاں ہے ویسے وہاں ہوگا۔ میدانِ حشر میں جب آدمی اٹھے گا اسی حالت پر اٹھے گا جس حالت پر موت آئی ہے اگر نماز پڑھتے ہوئے، ذکر کرتے ہوئے، حج کرتے ہوئے موت آئے، اسی حالت میں قبر سے اللہ اللہ یا لبیک لبیک کہتے ہوئے اٹھے گا اور دل میں تمنا ہوگی کہ میدانِ محشر میں نماز پڑھوں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ جو دار العلوم کے شیخ، مربی اور اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے ان کا مقولہ سنا، فرمایا: ”قیامت کے دن اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ اے امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے؟ عرض کروں گا، نہ مجھے جنت چاہئے نہ حوریں اور نہ محلات چاہئیں، مجھے تو اپنے عرش کے نیچے دو گز جگہ دے دیجئے۔ میں وہاں پر نماز پڑھتا رہوں“۔ گویا اس درجہ نماز کی تڑپ کہ اگر وہاں بھی طلب ہوگی تو نماز کی ہوگی۔ تو یہ ایک ایسا عمدہ نصب العین ہے کہ دنیا، قبر اور میدانِ محشر میں بھی ساتھ ہے۔

جنت میں عبادت...... اور جنت میں بھی ساتھ ہوگا۔ جنت کے بارے میں فرمایا گیا ”یُلْهَمُوْنَ التَّسْبِیْحَ“ ① ”جتنے جنتی ہوں گے، ان کی زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہوگا“۔ یہ ارادۃً نہیں ہوگا، ارادے کی محنت دنیا میں انہوں نے اللہ اللہ کر کے اٹھالی تھی۔ اب اللہ کا ذکر نفس میں رچ گیا ہوگا اسلئے بلا ارادہ ذکر جاری ہوگا۔ سانس کے ساتھ اللہ کا نام نکلے گا، جیسے پاس انفاس ہوتا ہے کہ آنے والے سانس کے ساتھ اللہ اور جانے والے کے ساتھ ھُوْ، اَللّٰهُ ھُوْ، اَللّٰهُ ھُوْ۔ غرض اہل جنت کی زبانوں پر بلا ارادہ تسبیح و تہلیل اور اللہ کا نام جاری ہوگا۔ یہ اس کا اثر ہوگا کہ دنیا میں انہوں نے محنت کر کے ذکر اللہ کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ ”رَتِّلْ وَارْتَقِ“ ② ”تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا“ جتنی تیری ہمت ہے درجات کماتا جا، معلوم ہوتا

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب فی صفات الجنة...... ج: ۴ ص: ۲۱۸ رقم: ۳۵۲۸.

② السنن للترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی من قرأ حرفاً...... ج: ۵ ص: ۱۷۷ رقم: ۲۹۱۴.

ہے جنت میں روزانہ ترقی ہوگی۔ تلاوت کے ذریعے سے روزانہ عروج ہوگا۔ نیا سے نیا مقام، نئی سے نئی حالت، نئی سے نئی کیفیت اور نئی سے نئی نعمت ملتی رہے گی۔ تو عبادت کا نصب العین وہ ہے کہ دنیا سے چلا قبر تک پہنچا حشر تک پھر جنت تک پہنچا اور جنت میں پھر نئے سے نئے جہان، نئے سے نئے مقامات ابدالآباد تک آتے رہیں گے اور عبادت کا یہ نصب العین ساتھ رہے گا۔

ایمان کی وجہ سے ہر چیز پاکیزہ بن جائے گی...... اس لئے میں نے عرض کیا کہ: اس لمبی زندگی کے لئے نصب العین بھی لمبا ہونا چاہئے معمولی نصب العین جو چند دن کے بعد ختم ہو جائے۔ وہ زندگی کے حسب حال اور لائق نہیں ہے۔ یہ زندگی کی توہین ہے، آپ زندگی کا نصب العین روٹی کو بنائیں۔ یہ اس کی توہین ہے اس لئے کہ روٹی انسانوں کو بھی ملتی ہے جانوروں کو بھی ملتی ہے، یا دولت کمانے کو نصب العین بنائیں تو دولت خود ایک ذریعہ اور واسطہ ہے خود مقصد نہیں ہے، آدمی کی جب جان پر آنے لگتی ہے تو دولت کو خرچ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا دولت خود مقصود نہیں، جان مقصود ہے اور جب ایمان پر آنے لگتی ہے تو جان گنوا دیتا ہے کہ ایمان محفوظ رہنا چاہئے، معلوم ہوتا ہے ایمان مقصود ہے، تو سب سے بڑا نصب العین ایمان ہوا کہ نہ جان کی پرواہ کی نہ مال کی، تو ان چیزوں کو نصب العین بنانا عارضی چیزوں کو نصب العین بنانا ہے۔ اس واسطے لمبی زندگی نصب العین وہ ہونا چاہئے جو زندگی کے آخری گوشے تک پہنچ جائے، وہ طاعت وعبادت خداوندی ہے، وہ دولت ایمان ہے، وہ دولت عرفان ہے، وہ اللہ کی معرفت اور پہچان ہے۔

اس کو سامنے رکھ کر آدمی مال کو بھی گھماتا رہے، جان اور آبرو کو بھی گھماتا رہے، اس وقت اس کی جان بھی قیمتی جان بن جائے گی کیونکہ ایمان کے لئے ذریعہ بنی، مال بھی اس کا پاک مال بن جائے گا کیونکہ ایمان کے لئے وسیلہ بنا۔ اس کی اولاد بھی پاک بنادی جائے گی کیونکہ ایمان اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ذریعہ بنے گی۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ.'' ① ''نیک آدمی کا مال بھی نیک ہوتا ہے'' نیک مال نیکی کا ذریعہ بنتا ہے، تو انسان پاک رہے گا تو مال بھی پاک بنے گا۔ اگر انسان نے اپنے قلب اور روح کو معصیتوں سے ناپاک بنا دیا، اس کا مال بھی ناپاک بنے گا۔ اس لئے مال کی مذمت نہ کی جائے، مذمت اپنی کی جائے، غلطی ہماری ہوتی ہے، ڈال دیتے ہیں مال کے اوپر، آدمی پاک بن جائے ساری چیز پاک بن جائیں گی۔ بلڈنگ بھی پاک، مکان بھی پاک، ہر چیز اچھی ہو جائے گی، یہ جبھی ہوگا جب اپنی پوری زندگی کی نقل وحرکت کا اصل نصب العین اطاعت خداوندی بنایا جائے۔ اکبر الٰہ آبادی نے ایک قطعہ کہا تھا کہ اس قطعے میں اس زمانے کی ایک حالت ظاہر کی ہے، مگر مقصد رہ گیا تھا تو ایک شعر میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ اس میں مقصد کی تکمیل ہو گئی۔ اکبر الٰہ آبادی کہتا ہے کہ ؎

① المسند للامام احمد، احادیث عمرو بن العاص، ج: ۴ ص: ۱۹۷۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — یہ فقط وقت کا گزرنا ہے

نہ راحت ابدی نہ مصیبت ابدی، اگر مصیبت میں آدمی وقت ٹلا دے مصیبت ختم ہو جاتی ہے۔ نعمت میں وقت ٹلا دے، نعمت ختم ہوگئی، پائیداری اور قرار کسی چیز کو نہیں ہے، نہ یہاں کی عیش کے لئے پائیداری ہے نہ مصیبت کے لئے عیش والا بھی سب کچھ چھوڑ کر چل دے گا، مصیبت والا بھی چل دے گا۔ تو اکبر نے کہا کہ ۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

مگر ابھی شعر تشنہ ادھورا رہ جاتا ہے، وقت تو گزر جائے گا مگر آخر انسان کرے کیا؟ مصیبت و راحت ایک حالت ہی آئی اور گئی کہنا آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس کا میں نے جوڑ لگا یا دیا۔ گو یہ جوڑا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دے اس لئے کہ اکبر تو لسان العصر ہے، بڑے اونچے درجے کا شاعر ہے ہماری کیا شاعری اس کے مقابلے میں بس تک بندی ہے، مگر بہر حال خواہ وہ تک بندی ہی ہو، مگر پیوند تو لگا ہی دیا۔ چاہے وہ مخمل میں ٹاٹ ہی کا ہو، اس لئے کہ اگر مخمل پھٹی رہ جائے تو بدن کھلا رہ جائے گا۔ تو ٹاٹ سے بدن تو چھپ جائے گا لباس کا مقصد پورا ہو جائے گا، اس واسطے ہم نے بھی پیوند لگا دیا۔ وہ پیوند کیا ہے؟ تو اکبر نے کہا کہ ۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں کہ ۔

مقصد زندگی ہے طاعت حق — نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے
رہ گیا عزوجاہ کا جھگڑا — نہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
اور قابل ذکر بھی نہیں خورد و نوش — نہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے ①

اصل مقصد یہ ہے کہ طاعت حق ہو، یہ ہوگی تو ہر چیز پائیدار اور کارآمد بن گئی اور اگر اطاعت حق باقی نہ رہی تو مال بھی وبال، جان بھی وبال، صحت بھی وبال، ساری ہیئتیں حقیقتیں، حرکتیں سب وبال جان بن جائیں گی، اندر ایمان نہیں رہے گا اور اگر ایمان آ گیا پھر اس کے لئے ہر چیز نعمت و راحت کا ذریعہ بنے گا۔

زندگی کی قدر کی صورت...... اس ساری تقریر کا حاصل یہ نکلا کہ ہمیں اس زندگی کی قدر کرنی چاہئے، یہ اللہ کی ایک نعمت ہے اور قدر کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی نصب العین کے تحت خرچ کیا جائے، بلا موضوع اور بلا مقصد نہ خرچ کیا جائے، اور یہ مقاصد نہیں ہیں کہ مجھے عیش مل جائے یا میری زندگی آرام سے گزر جائے یا میرے پاس دولت

① از مجالس حکیم الاسلام ص ۳۹۔

زیادہ ہو جائے یا میرے پاس کوٹھی ہو یہ کوئی مقصد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ دے آدمی بنا لے مگر اس کو بھی کسی مقصد کے تابع کیا گیا ہے، کوٹھی میں نیت کرے کہ میں اس لئے بناتا ہوں کہ دوست احباب جمع ہوں گے خدا کا نام لیں گے، موقع ہوگا تو جماعت ہوگی۔ اب کوٹھی نہ ہوئی عبادت گاہ بن گئی۔ اس کوٹھی میں آپ کو وہ اجر مل گیا جو مسجد میں ملتا۔

حسنِ نیت...... کسی بزرگ کے ایک خادم نے مکان بنوایا، جب مکان مکمل ہو گیا تو اس نے اس میں اپنے شیخ کو دعوت دی کہ آپ تبرکاً مکان کا افتتاح کر دیں۔ شیخ آئے تو بڑے خوش ہوئے کہ بڑا عمدہ مکان ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ بھئی! یہ اتنے بڑے بڑے روشندان، دروازے اور کھڑکیاں کیوں رکھیں؟

اس نے کہا حضرت اس لئے رکھیں کہ ہوا آئے، فضا صاف رہے۔ دھوپ بھی آئے، فرمایا: جا بندۂ خدا! اس میں اس کی نیت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دھوپ تو ویسے بھی آ جاتی۔ نیت نہ کرتا، ہوا بھی آتی، ان روشندانوں میں تو نے کوئی ایسی نیت کیوں نہ کرلی کہ تجھے اجر مل جاتا۔ یہ چیزیں تو خود بخود آنی تھیں فرمایا، تو نے یہ نیت کیوں نہ کرلی کہ میں اس لئے لمبے لمبے روشندان رکھ رہا ہوں کہ ان سے موذن کی اذان کی آواز جلدی سے آ جایا کرے گی، میں دراس لئے رکھ رہا ہوں کہ ذکر اللہ کرنے والوں کی صدا جلدی میرے کانوں تک پہنچ جایا کرے اگر یہ نیت کرتا، تو اجر بھی ملتا، ثواب بھی ملتا۔ اور دھوپ ہوا بلا نیت کے بھی آ جاتی تو مکان کی خوشنمائی میں آدمی اگر یہ نیت کر لے کہ یہ میں گویا اپنا گھر نہیں بنوار ہا یہ اللہ کا گھر ہے اس میں ذکر بھی ہوگا، نمازیں بھی پڑھی جائیں گی، وعظ بھی ہوں گے، بس یہ مکان باعث اجر بن گیا اس نے وہ کام دیا جو مسجد اور خانقاہ کام دیتی۔ تو ذرا سی نیت کے پھیر سے انسان عادت کو عبادت بنا لیتا ہے اور ذرا سی نیت کی خرابی سے عبادت بھی عادت بن کے رہ جاتی، سارا اجر ختم ہو جاتا ہے۔ نماز کو اس نیت سے پڑھ لو کہ لوگ ہمیں اچھا سمجھیں، یہ ریاکاری ہوگئی۔ نماز ختم ہوگئی۔ یہ منہ پر مار دینے کے قابل ہے اور روٹی کھانے میں اس کی نیت کرلو کہ اس لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو عبادت کروں گا تو آپ کی روٹی عبادت بن گئی۔ نیت اللہ نے ایسی پاکیزہ چیز بنائی ہے کہ عادت کو چاہو تو عبادت بنالو اور بری نیت ہو تو عبادت عادت بن کر رہ جاتی ہے، وہ بالکل قابل اجر ہی نہیں باقی رہتی۔

اس واسطے نصب العین اور نیت صحیح ہو تو انسان کی پوری زندگی کارآمد بن جاتی ہے۔ یہ چند باتیں میں نے اس لئے گزارش کیں کہ مجمع میں وہ حضرات بھی ہیں جن کو اللہ نے نعمتوں سے نوازا ہے اور حق تعالیٰ نے دولتیں دی ہیں اور یہ شکر کی بات ہے کہ اللہ اپنے بندے کو نعمت عطاء کرے، فقط اسی کے خوش ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ اس کے ہر بھائی کو خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے بھائی کو حق تعالیٰ نے نعمت دی اور سرفراز کیا۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہ دولت تو نہیں ملی مگر علم اور ایمان کامل کی دولت ملی ہوئی ہے تو اس درجے کی دولت ان کے پاس نہیں ہے اور بہت سے بیچارے ایسے بھی ہیں کہ نہ یہ دولت ہے نہ وہ دولت، مگر ساتھ میں حسرت اور صبر کی دولت ہے کہ ہائے ہمیں کچھ نہ ملا۔ اور ہم محروم رہ گئے۔ طاعت وعبادت مالی نہ کر سکے۔ ان کی حسرت اس دولت کے قائم مقام ہے، اس

حسرت سے ان کو اجر و ترقی دی جائے گی۔ ایسے مختلف لوگ موجود ہیں، اس واسطے نصب العین مشترک ہونا چاہئے جو سب کے لئے کار آمد ہو، وہ اطاعت حق اور عبادت خداوندی ہے کہ وہ دولت میں بھی قائم رہ سکتا ہے اور ناداری میں بھی، حسرت میں بھی قائم رہ سکتا ہے فرحت میں بھی اور ایسی چیز کے لئے زیبا ہے کہ اس کو ہم اس لمبی عمر کا نصب العین اور مقصد بنا سکیں تو اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے، اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ①

عبادت کے معنی......اور عبادت کے معنی حقیقت میں نہ نماز پڑھنے کے ہیں، نہ روزہ رکھنے کے ہیں، نہ زکوٰۃ دینے کے ہیں، عبادت کے معنی تعمیل حکم کے ہیں کہ جو ہم کہیں اس کی اطاعت کی جائے، اگر ہم کہیں نماز پڑھو تو نماز پڑھنا عبادت ہے۔ اگر ہم کہیں ہرگز نماز مت پڑھو، تو چھوڑنا عبادت بن جاتا ہے۔ اگر ہم کہیں روزہ رکھو تو روزہ رکھنا عبادت ہے، پانچ وقت میں نماز پڑھو تو نماز عبادت اور تین وقتوں میں حکم ہے کہ ہرگز مت پڑھو سورج ڈوبنے اور نکلنے کے وقت اور زوال کے وقت ان اوقات میں آدمی نماز پڑھے گا تو گنہگار ہوگا۔ معلوم ہوا نہ نماز پڑھنا عبادت نہ چھوڑنا عبادت کہنا ماننا عبادت ہے، رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم ہے، عید کا چاند دکھائی دیا، تو عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر کوئی رکھے گا تو گنہگار ہوگا، معلوم ہوا نہ روزہ عبادت نہ اس کا چھوڑنا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے جب ہم کہیں رکھو تو رکھنا عبادت، جب ہم کہیں چھوڑ دو، تو چھوڑنا عبادت ہے۔

فرمایا گیا: خودکشی حرام ہے، اپنے آپ کو قتل مت کرو، لیکن اگر نفیر عام ہو اور یوں فرما دیا جائے کہ میدان جہاد میں ذبح ہو جاؤ گھوڑوں کو بھی ختم کر دو، یہ عبادت ہو جائے گی۔ معلوم ہوا نہ جان کی حفاظت عبادت، نہ جان گنوانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے جب ہم یوں کہیں جان کی حفاظت کرو، حفاظت کرنا عبادت ہے جب ہم یوں کہیں کہ اس جان کی پرواہ مت کرو، جان دیدو، پھر جان دیدینا عبادت ہے۔

غرض عبادت کا حاصل یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی کو قانون خداوندی کے تحت میں گزارنا، ہر حالت میں اسی کی رضا کو سامنے رکھنا اور اپنی منشاء کو ختم کرنا، یہ عبادت ہے۔

بہر حال اسلام کسی حالت میں کسی کو مایوس نہیں کرتا جس حالت میں بھی انسان ہو، اسی حال میں رہتے ہوئے خدا تک پہنچنے کے لئے اسے راہ بتلاتا ہے اور انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی راہ درست فرمائے اور اس نصب العین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اپنی رضا نصیب فرمائے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا آسان فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶۔

پرسکون زندگی

مشاہیر عالم کے نام لکھے گئے خط کا جواب

از حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!

(کراچی کے ایک صاحب اے جی یودوجکی نے مشاہیر عالم کے نام ایک مطبوعہ خط میں درخواست کی کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ انسان اس ابتر اور پراگندہ دنیا میں پرسکون زندگی کیسے بسر کر سکتا ہے۔

''حضرت مہتمم صاحب قدس اللہ سرہٗ کے نام بھی خط آیا اور اتفاق سے حضرت موصوف کے سامنے اس وقت آیا جب وہ پچھلے دنوں بمبئی سے کلکتے کا سفر ہوائی جہاز میں کر رہے تھے۔اس فرصت میں موصوف نے اس سوال کا جواب ایک خط کی شکل میں کراچی کے ان صاحب کو تحریر فرمایا جسے ہم درج ذیل حوالہ قرطاس کرتے ہیں)۔

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى

محترم المقام! زید مجدکم السامی ہدیہ مسنونہ کے بعد عرض ہے کہ آپ کا گرامی نامہ دفتر دارالعلوم دیوبند میں موصول ہوا۔ میں اس دوران سفر میں تھا، سفر طویل ہو گیا اور آپ کا والا نامہ دیوبند سے ہوتا ہوا مجھے بمبئی میں ملا۔ وہاں بھی مصروفیات کے سبب جواب لکھنے کا موقعہ نہ ملا اور کلکتہ روانگی ہو گئی۔اس لئے آج کلکتے سے جواب عرض کر رہا ہوں۔اور اس تاخیر جواب کی معافی چاہتا ہوں۔

آپ نے والا نامہ میں سوال فرمایا کہ ''اس پریشان اور ابتر دنیا میں انسان کس طرح ایک خوش وخرم اور پرسکون زندگی بسر کر سکتا ہے؟''

جواباً عرض ہے کہ سوال اہم اور عموماً آج کے دکھی دلوں کی ایک عمومی پکار ہے اس لئے حقیقتاً توجہ طلب ہے، لیکن یہ سوال جس قدر اہم اور پیچیدہ دکھائی دیتا ہے اسی قدر اپنے جواب کے لحاظ سے واضح اور صاف بھی ہے۔ جواب سامنے لانے کے لئے پہلے پریشانی اور ابتری کے معنی متعین کر لینے چاہئیں تو اس سے بچنے کی صورت اور زندگی کے سکون کی راہ خود ہی متعین ہو جائے گی۔لوگوں نے عموماً مصیبت پریشانی، دکھ درد، بیماری افلاس، تنگ دستی، جیل قید و بند، مار دھاڑ، قتل وغارت، قحط، وباء، بلا وغیرہ کو سمجھ رکھا ہے، حالانکہ ان میں سے ایک چیز بھی مصیبت نہیں، یہ صرف واقعاتَ اور حوادث ہیں، پریشانی اور مصیبت درحقیقت ان سے دل کا اثر لینا تشویش میں پڑنا، دل

تنگ ہونا اور کرب وغم میں ڈوب جانا ہے۔

پس یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ اسباب مصیبت کہلائی جاسکتی ہیں، مصیبت نہیں کہی جاسکتیں، مصیبت قلب کی کیفیت احساس اور تاثر کا نام ہوگا، جیل کی قید و بند کا نام مصیبت نہیں بلکہ اس سے دل میں پراگندگی اور گھٹن کا اثر آنا مصیبت ہے۔ افلاس وتہی دستی خود کوئی پریشانی نہیں، بلکہ دل کا اس سے گھبرانا اور مضطرب ہونا پریشانی ہے، تپ ولرزہ یا ہیضہ وطاعون اور قحط و وباء مصیبت نہیں بلکہ دل کا ان سے کرب و بے چینی کا اثر لینا مصیبت ہے۔ پس مصیبت خود ہمارے دل کی کیفیت ہے۔ دنیا کے واقعات نہیں، اس لئے مصیبت کے خاتمہ کی یہ تدبیر کبھی معقول اور کارگر نہیں ہوسکتی کہ دنیا کے حوادث کو مٹانے کی کوشش کی جائے، جب کہ حوادث زمانہ نہ خود مصیبت ہیں اور نہ ہی ہمارے قبضے میں ہیں، بلکہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ان حوادث کے پیش آنے پر قلبی تشویش و پراگندگی کا راستہ روک دیا جائے اور ان سے بجائے خلاف طبع ضیق وتشویش کا اثر لینے کے، انہیں طبعیت کے موافق بنالیا جائے جس سے دل ان سے گھٹنے کے بجائے لذت لینے لگے تو ان میں سے نہ صرف مصیبت ہونے کی شان ہی نکل جائے گی بلکہ یہ امور قلبی راحتوں کا ذریعہ بن جائیں گے اور زندگی میں پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

آج کی دنیا زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے ان حوادث زمانہ کو ختم کر دینے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ لیکن یہ چونکہ ایک ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش ہے جو کبھی شرمندہ وقوع نہیں ہوسکتی اس لئے جتنا جتنا یہ اوندھی تدبیر بڑھتی جائے گی، اتنا ہی دنیا کی زندگی میں ابتری اور بے چینی کا اضافہ ہوتا رہے گا اور کبھی بھی پریشانیوں اور بے چینیوں کا خاتمہ نہ ہوگا، جیسا کہ مشاہدے میں آرہا ہے۔ پس عالم کو بدل ڈالنے کی کوشش کا نام چین نہیں بلکہ خود اپنے کو بدل دینے کا نام سکھ اور چین ہے۔

اس کی سہل صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ نظر کو ان حوادث سے ہٹا کر اس سرچشمہ کی طرف پھیر دیا جائے جہاں سے بن بن کر یہ اسباب، مصائب و آفات عالم پر اتر رہے ہیں اور وہ اللہ رب العزت کی ذات بابرکات ہے جس نے اس عالم کو اپنی لامحدود حکمتوں سے عالم اضداد بنایا ہے اور اس میں راحت وکلفت، نعمت و مصیبت، حظ وکرب اور چین اور بے چینی دونوں کو سمو کر اس عالم کی تعمیر کی ہے۔ اگر اس سے رشتہ محبت وعبودیت اور رابطہ رضا وتسلیم قائم کر لیا جائے جس کا نام ایمان ہے اور ریاضت ومشق سے اسے اپنا حال اور جوہر نفس بنالیا جائے کہ اس کے ہر تصرف اور تقدیر پر اطمینان واعتماد کلی میسر آجائے تو یہ محبت ہی ہر تلخ کو شیریں اور ہر ناگوار کو خوش گوار بنادے گی جس سے قلب ان حوادث سے تشویش کا اثر نہیں لے سکے گا جو مصیبت کی روح ہے کہ۔

از محبت تلخہا شیریں بود

کیوں کہ عاشق کے لئے محبوب کی طرف سے آئی ہوئی ہر چیز محبوب اور لذیذ ہوتی ہے، وہ محبوب کی بھیجی ہوئی تکلیف کو بھی اپنے حق میں یہ سمجھ کر راحت جانتا ہے کہ محبوب نے مجھے یاد تو کیا، وہ میری طرف متوجہ تو ہے اور

مجھے قابل معاملہ تو سمجھا، یہ تصور ہی اس مصیبت کو اس کے لئے لذت وراحت بنا دے گا اور مصیبت، مصیبت نہ رہے گی۔ خلاصہ یہ نکلا کہ مصیبت نام ہے خلاف طبع کا اور خلاف طبع کو موافق طبع بنانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ عالم کی طبیعت کو بدلنے کے بجائے، (جو بس کی بات نہیں) اپنی طبیعت کو بدل دیا جائے اور اس کا رخ مصیبت سے پھیر کر مصیبت بھیجنے والے کی طرف کر دیا جائے کہ نظر مصیبت پر نہ رہے بلکہ خالق مصیبت کی توجہ وعنایت اور بے پایاں حکمت وتربیت پر ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ یقین بجز خدا کی ذات کو مانے ہوئے اور اس کے ہر ہر تصرف پر کلی اعتماد واطمینان کئے بغیر میسر نہیں آ سکتا، اس لئے مصائب کا خاتمہ خدا کے نام سے بھاگنے میں نہیں ہے بلکہ اس کی طرف لوٹنے میں ہے یعنی آگے بڑھنے میں نہیں بلکہ پیچھے ہٹنے میں ہے۔

اندریں صورت انسان جتنا بھی استیصال حوادث کی مہم میں لگا رہے گا، مصائب سے کبھی نجات نہ پا سکے گا جس کا راز یہ ہے کہ وہ دفعیہ حوادث وآفات کی تدبیر کسی نہ کسی سبب ہی کے ذریعے کرے گا اور یہ سبب بھی جب کہ خود ایک حادثہ ہوگا جس میں منفعت کے ساتھ مضرت کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوگا تو یہ دفع مصیبت بھی مصیبت سے خالی نہ ہوگا اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ استیصال مصائب کی بجائے کچھ نہ کچھ اضافہ مصائب ہی ہو جائے گا اور ایک مصیبت اگر کسی حد تک ٹل بھی جائیگی تو دوسری مصیبت اسی آن اس کی جگہ لے لے گی ۔

گر گریزی برامید راحتے ہم ازاں جا پیشیت آبد آفتے

لیکن اگر ان حوادث سے بالاتر ہو کر خالق حوادث سے قلب کا تعلق قائم کر لیا جائے تو ادھر سے علمی طور پر تو ان آفات ومصائب کی حکمتیں دل پر کھلیں گی جس سے یہ مصائب معقول اور برمحل محسوس ہونے لگیں گے اور ان سے اکتانے کی کوئی وجہ معقول نہ ہوگی کہ قلب عقلاً غمگین ہو اور پھر عشق الٰہی کی سرشاری میں جب کہ ان حوادث کا ورود منشاء محبوب محسوس ہوگا تو اسے توجہ محبوب سمجھ کر یہ عاشق قلب میں عملاً ان آفات سے لذت وسرشاری کا اثر بھی لینے لگے گا اور آخر کار اس روحانی لذت وسرشاری میں محو ہو کر اسے فرصت ہی نہیں ملے گی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان آفات ومصائب کی طرف دھیان بھی کر سکے۔ اس لئے اس کے حق میں نعمت تو نعمت ہوئی مصیبت اس سے بھی بڑھ کر نعمت ولذت بن جائے گی اور زندگی سے مصائب اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پس راحت حقیقۃً اسباب راحت میں نہیں بلکہ مسبب الاسباب سے سچے تعلق میں پنہاں ہے۔

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

خلاصہ یہ ہے کہ راستے دو ہی ہیں، ایک مصائب سے دل تنگ ہو کر اسباب کے راستے سے ان کا مقابلہ اور استیصال کی فکر وسعی اور ایک مسبب الاسباب سے عشق کے ذریعہ مصائب کو توجہ محبوب سمجھ کر ان پر دل سے راضی ہو جانا اور شیوۂ تسلیم ورضا اختیار کرنا، پہلا راستہ بندگان عقل (فلاسفہ) نے اختیار کیا تو ایک لمحہ کے لئے بھی مصائب سے نجات نہ پا سکے، نہ خود مطمئن ہوئے نہ کسی کو اطمینان دلا سکے، بلکہ خود مبتلا ہو کر پوری دنیا کو مبتلائے مصائب

وآفات کردیا جس سے دنیا سے سکھ اور چین رخصت ہوگیا، اسباب راحت بڑھ گئے اور راحت رخصت ہوگئی۔

دوسرا راستہ بندگان خدا (انبیاء واولیاء) نے اختیار کیا کہ حوادث عالم سے تنگ دل ہونے کے بجائے انہیں توجہ حق اور منشاء الٰہی سمجھ کر ذریعہ راحت قلب بنایا تو تشویش و پریشانی ان کے قلب کے آس پاس بھی نہ پھٹک سکی، خود بھی مطمئن اور منشرح ہوئے اور عالم میں بھی سکون واطمینان کی لہریں دوڑا دیں اس لئے ان کی اور ان کے متبعین کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لئے مصیبتوں کا خاتمہ ہوا اور خوشی وخرمی ان کی زندگیوں کا عنوان بن گئی۔ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ٥ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ۚ لَاتَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ ① "بلا شبہ اولیاء الٰہی پر نہ خوف ہے نہ غم جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے، ان کے لئے دنیا (زندگی) میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں خوشی وخرمی کا یہی اٹل قانون ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افلاطون حکیم نے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کو کمان فرض کیا جائے اور مصائب وآفات کو اس کمان سے چلنے والے تیر شمار کیا جائے اور خدا کو تیر انداز مانا جائے تو ان مصائب سے بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

عقل کا جواب تو مایوسی ہوتا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں کیوں کہ آدمی نہ آسمان کے دائرے کے باہر جا سکتا ہے نہ خدا کے احاطے سے باہر نکل سکتا ہے، اس لئے لامحالہ اسے مصائب کے تیر کھانے ہی پڑیں گے، بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، لیکن انبیاء فلاسفہ نہیں ہوتے کہ محسوسات میں گھری ہوئی محدود عقل کا سہارا پکڑ کر اپنے علم وعمل کے راستے محدود کرلیں، ان کا تعلق خالق عقل سے ہوتا ہے جو اپنے کمالات وتصرفات میں لامحدود ہے اور تعلق بھی محبت وعشق کا ہوتا ہے جو شش جہت سے بھی اوپر کی بات لاتا ہے۔

عقل گوید، شش جہت راہیست حدے بیش نیست   عشق گوید، ہست راہے، بارہا من رفتہ ام

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مصائب کے تیروں سے بچاؤ کی بہت آسان صورت ہے اور وہ یہ کہ آدمی تیر انداز کے پہلو میں آکھڑا ہو، نہ تیر لگے گا نہ اثر کرے گا اور پہلوئے خداوندی ذکر اللہ اور یاد حق ہے جس میں محو ہوکر آدمی اپنے کو کلیتہً خدا کے سپرد کردیتا ہے اور یہ محبت وتفویض ہی عاشق کا وہ کام ہے جس سے ہر تلخ اس کے لئے شیریں بن جاتا ہے اور اس کی صدا یہ ہوجاتی ہے کہ

ناخوش تو خوش بود برجان من   دل فدائے یار دل رنجان من

اور پھر اس کی تفویض اور جان سپاری کا عالم یہ ہوجاتا ہے کہ

زندہ کنی عطائے تو' ور بکشی فدائے تو   دل شدہ مبتلائے تو' ہر چہ کنی رضائے تو

ظاہر ہے کہ اس لذت جان سپاری کے ہوتے ہوئے مصائب وآفات کی مجال ہی کیا رہ جاتی ہے کہ وہ قلب

① پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۶۲، ۶۴۔

عاشق کو بے چین کرسکیں یا اس میں ذرہ برابر پراگندگی اور تشویش پیدا کرسکیں اس حالت میں قلب عاشق کی ہر تشویش و پراگندگی مبدل بہ سکون وطمانینت ہو جاتی ہے جو لذت و راحت کی جڑ اور بنیاد ہے اب اگر اس میں کوئی تشویش و خلش ہو سکتی ہے تو اندیشہ فراق محبوب کی تو ہو سکتی ہے ورنہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی تشویش و پریشانی سے آلودہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ بندۂ عقل کو کبھی قلبی راحت نہیں مل سکتی اور بندۂ خدا کو کبھی قلبی پریشانی نہیں ہو سکتی۔

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (1) ''آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں''۔ مغروران عقل تجویز کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو ہمیشہ نامراد رہتے ہیں اور خاکساران حق تفویض کی راہ چلتے ہیں تو ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ پس دنیا والوں کی انتہائی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسباب راحت کو راحت اور اسباب مصیبت کو مصیبت سمجھ رکھا ہے اس لئے دنیا کو اسباب و وسائل سے بھرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ یہی راستہ زندگی کی تشویشات اور بے چینیوں کا ہے جس میں ایک لمحہ کے لئے راحت میسر نہیں آ سکتی، وہ اس راہ سے جتنا بھی حصول راحت اور دفعیہ مصائب کی جدوجہد کرتے رہیں گے اتنا ہی راحت سے دور اور قلبی سکون سے بعید تر ہوتے چلے جائیں گے۔

حصول راحت کا راستہ صرف ایک ہی ہے کہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے لوٹ کر خدا سے معاملہ صاف اور رابطہ قوی کیا جائے اور اسی سچے خدا کا سہارا پکڑا جائے جسے چھوڑ کر ہم بہت آگے نکل آئے ہیں، ورنہ زندگی کے پرسکون ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا، اس لئے آج کی پریشان حال اور ابتر دنیا اگر فی الحقیقت ایک خوش خرم اور پرسکون زندگی چاہتی ہے تو اپنا رخ بدلے اور بم چلانے، ایٹم بم بنانے، چاند پر جانے اور سیارات چھوڑنے میں راحت و سکون تلاش کرنے کی بجائے خداوند کریم کی بارگاہ کی طرف توجہ کرے اور اس کے بھیجے ہوئے مستند قانون کو اپنا کر راہ عبودیت اختیار کرے کہ اس بارگاہ سے نہ کبھی کوئی مایوس لوٹا ہے نہ لوٹے گا اور اس سے کٹ کر نہ کبھی کوئی کامیاب ہوا ہے نہ ہوگا۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(1) پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸۔

سیرت اور صورت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

احوال واقعی...... بزرگان محترم! اس جلسہ کا اصل مقصد جامعہ اشرفیہ کے فارغ التحصیل طلباء کی دستار بندی اور ان کو مجمع عام میں سند وغیرہ دینا ہے تا کہ جامعہ کی سال بھر کی کارگزاری معاونوں کے سامنے آ جائے۔ تو اصل مقصد دستار بندی اور ان کی تکمیل کا اعلان ہے۔ یہ مقصد عنقریب آپ حضرات کے سامنے آ جائے گا۔ میں اسی ذیل میں چند کلمات بہت مختصر وقت میں گزارش کرنا چاہتا ہوں۔

اور مختصر وقت میں نے اس لئے عرض کیا کہ کچھ تو میں علیل اور ضعیف بھی ہوں اور زیادہ بیان ہوتا بھی نہیں ہے کچھ اس وجہ سے کہ علماء کے اتنے بڑے مجمع میں ایک طالب علم کو یوں بھی جرات نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہمارے استاذ اکبر حضرت علامہ مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون جاتے تو حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "شاہ صاحب کے آنے سے میرے قلب کے اوپر ان کی علمی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے۔ میں کچھ مرعوبیت سی محسوس کرتا ہوں"۔

حالانکہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ عالم کامل، عارف باللہ وہ حضرت شاہ صاحب کی علمی عظمت محسوس کریں حالانکہ حضرت شاہ صاحب ان کے ہم درس ہیں۔ حق تعالیٰ علم جسے چاہیں عطاء فرمائیں۔ تو حضرت علمی عظمت اور بوجھ محسوس کرتے تھے اور جہاں اتنے علماء بیٹھے ہوئے ہوں آپ اندازہ کیجئے میرے دل پر اس کا کتنا بوجھ پڑ رہا ہوگا۔ اور بوجھ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اول تو قلت استعداد کی وجہ سے کوئی مضمون ہی نہیں (ذہن میں) ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ اور حبط ہو جاتا ہے۔ مگر بہر حال جب آپ حضرات نے اس جگہ بٹھلا دیا، اس کا قدرتی تقاضاء یہ

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۷۔

ہے کہ کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ اس واسطے میں نے عرض کیا کہ اختصار ہوگا، کچھ علالت، کچھ ضعف اور کچھ علماء کی موجودگی یہ چند در چند چیزیں ہیں جن کی وجہ سے شاید میں زیادہ تفصیل نہ عرض کرسکوں اور مقصد اصلی دستار بندی ہے، اس کے لئے وقت بھی دینا ہے۔

اس دنیا میں ہر مخفی حقیقت کے لئے کسی پیکر کا ہونا ضروری ہے...... بات صرف اتنی گزارش کرنی ہے کہ اس دنیا کے حالات اور اس کی اشیاء پر جہاں تک ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہر چیز یہاں مرکب ہے۔ ایک حصہ اس میں نمایاں ہے، جس کو آپ جسم یا صورت کہہ دیں اور ایک حصہ مخفی ہے جس کو آپ روح یا جان کہہ دیں۔ غرض یہاں کی ہر چیز روح اور جسم سے مرکب ہے۔ اس جہان میں نہ جسم محض ہے نہ روح محض ہے جسم محض ہو تو اس کا انجام گلنا پھولنا، پھٹنا سڑنا ہے۔ وہ بغیر روح کے باقی نہیں رہ سکتا اور روح محض بلا جسم کے نمایاں نہیں ہوسکتی، وہ مخفی کی مخفی رہ جائے گی۔ اس لئے دنیا میں جب بھی کوئی چیز آئے گی تو وہ اپنا کوئی پیکر یا ہیئت لے کر آئے گی۔

یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ جب بھی کوئی غیبی حقیقت ظاہر ہوگی۔ وہ کوئی نہ کوئی پیکر یا پیراہن ضرور اختیار کرے گی اور وہ پیراہن اسی کے مناسب حال ہوگا جو اللہ نے اس لئے کے تجویز کیا ہے۔ مثلاً گلاب کی خوشبو ایک غیبی حقیقت ہے وہ جب نمایاں ہوگی، یہ نہیں ہے کہ وہ کیکر کے پتوں میں نمایاں ہو جائے، اپنے ہی مناسب صورت اختیار کرے گی۔ خربوزہ ہے اس کا ایک ذائقہ ہے۔ جب بھی اسے آپ تلاش کریں گے تو خربوزے کی ہیئت میں تلاش کریں گے یہ نہیں کہ آپ آم کی ہیئت میں خربوزے کا مزہ ڈھونڈنے لگیں۔ اس لئے کہ اس ذائقہ کو اللہ نے اسی کے مناسب شکل دی ہے۔ وہ غیر شکل میں نمایاں نہیں ہوسکتا۔

حقیقت کے مناسب صورت...... انسان کو حق تعالیٰ شانہٗ نے حقیقت جامعہ بنایا ہے جس میں سارے ظاہری اور باطنی کمالات رکھے ہیں۔ اس کے مناسب حال یہی صورت ہے جو آپ کی صورت نوعیہ ہے۔ یہ حقیقت کسی جانور کی شکل میں ظاہر نہیں ہوسکتی۔ اسی انسانی پیکر میں ظاہر ہوگی تو ہر حقیقت قدرۃً چاہتی ہے کہ میرے مناسب صورت ہو۔ ہر صورت چاہتی ہے کہ میرے مناسب اس میں حقیقت ڈالی جائے۔ اللہ کے ہاں کوئی بے جوڑ قصہ نہیں ہے کہ حقیقت کوئی سی ہو اور شکل کوئی سی ہو۔ ہر صورت کے مناسب حقیقت اور ہر حقیقت کے مناسب صورت ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ "اِلْتَمِسُوا الْخَيْرَ فِيْ حِسَانِ الْوُجُوْهِ" ① "خوبصورت چہروں میں خیر تلاش کرو"۔ یعنی اگر چہرہ مہرہ اچھا ہے تو اندر بھی خیر ہی ہوگی۔ چہرہ مہرہ خراب ہے تو اس درجے کی نہیں ہوگی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ قادر مطلق ہیں۔ وہ پابند نہیں ہیں، وہ چاہیں تو بہتر سے بہتر صورت میں بری حقیقت ڈال دیں اور بری سی بری صورت میں بہترین حقیقت ڈال دیں۔ یہ درحقیقت ان کے قبضہ قدرت کی

---

① مسند ابی یعلی الموصلی، ولفظه: اطلبوا، سعید بن ستان عن انس بن مالکؓ ج:۱۰ ص:۲۱. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه ابو یعلی وفیه من لم اعرفهم دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۸ ص:۱۹۵.

بات ہے۔لیکن سنت اللہ یہی ہے کہ جیسا پیکر ہوگا ویسی حقیقت ظاہر ہوگی۔

دیدہ زیب صورت میں بری حقیقت...... غالباً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا دور ہے،اس میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ عام سڑک پر ایک عورت پڑی رہتی تھی اور جتنی بدصورتی کی علامتیں ہیں وہ ساری اس میں جمع تھیں رنگ بھی کالا، ہونٹ بھی موٹے، دانت بھی زرد اور آنکھیں کرنڈی، رال بھی بہہ رہی ہے اور آنکھوں پہ چیپڑ بھی لگے ہوئے۔غرض اس کی صورت کو دیکھ کر نفرت آتی تھی۔سڑک پر پڑی رہتی تھی۔لوگ اسے بھیک دے دیتے تھے۔ رخ کوئی نہیں کرتا تھا۔سب نفرت کا اظہار کرتے تھے۔وہ حاملہ پائی گئی۔

لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس غلیظ کی طرف کس نے توجہ کی ہوگی؟ یہاں تک کہ حکومت میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر اس گندی عورت کی طرف کون متوجہ ہوا ہوگا؟ تو سی۔آئی۔ڈی (C.I.D) سے کہا گیا کہ اس کا پتہ چلاؤ، کون ایسی بھدی عورت کی طرف متوجہ ہوا؟

پولیس نے ایک ایسے آدمی کو لاکر پیش کیا جو نہایت حسین وجمیل اور نہایت ہی دیدہ زیب اس کی صورت۔ لوگ حیران تھے کہ ایسے پاکیزہ صورت انسان سے ایسا گندہ فعل کیسے سرزد ہوا؟ اور یہ فرشتہ صورت آدمی اس غلیظ عورت کی طرف کیسے متوجہ ہوا؟ تو پولیس سے سوال کیا گیا کہ تم نے کیسے پہچانا؟ پولیس نے کہا کہ اصل میں یہ شخص عرائض نویس ہے۔جیسے لوگ عرضیاں لکھتے رہتے ہیں تو ان کو اجرت ملتی ہے۔یہ بھی عرائض نویس ہے۔فٹ پاتھ پر نالی بہہ رہی تھی اس کے قریب اس کی جگہ تھی۔اس کی دوات خشک ہوگئی، تو اس نے بے تکلف نالی میں ہاتھ ڈال کر وہ جو گندہ پانی بہہ رہا تھا۔اپنی دوات میں ڈالا۔ہم نے جاکے پکڑ لیا کہ ایسی عورت کے ساتھ ایسی گندی حرکت یہی شخص کرسکتا ہے۔اس کی طبیعت میں گندگی ہے اور پکڑنے کے بعد تحقیقات ہوئیں تو بات سچی ثابت ہوئی کہ یہی مبتلا تھے۔تو صورت اتنی حسین وجمیل کہ بقول شخصے "دیکھ کر دھوپ بھاگ جائے" اور حرکت ایسی گندی سرزد ہوگئی کہ اس گندی عورت کی طرف متوجہ ہوگیا۔

میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ قادر مطلق ہیں۔بہتر سے بہتر صورت میں گندی حقیقت ڈال دیں، اور گندی سے گندی صورت میں بہترین حقیقت ڈال دیں۔

بدنما صورت میں پاکیزہ حقیقت...... امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "مَارَأَیْتُ اَفْضَلَ مِنْ عَطَآءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ" ① "میں نے اپنے دور میں عطاء ابن ابن رباح سے بہتر عالم نہیں پایا، علم، زہد، تقوی، اور کمالات ظاہر وباطن کے لحاظ سے میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں پایا۔آپ اندازہ کیجئے کہ امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس شخص کے علم وکمال کی تعریف کریں اس کا کس درجہ کا کمال اور علم وفضل ہوگا؟۔تو علم وفضل کا یہ حال کہ ابوحنیفہ، مداح اور صورت انتہائی بدنما، کالی کلوٹی، دیکھ کر لوگ بھاگیں۔مگر اس کالی صورت میں حقیقت اتنی

① السنن للترمذی، کتاب العلل، ج: ۱۲، ص: ۴۹۲.

پاکیزہ بھری ہوئی کہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے سامنے گردن جھکا رہے ہیں۔

صورت ترجمانِ حقیقت ہے...... تو یہ حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ اچھی صورت میں بری حقیقت اور بری صورت میں اچھی حقیقت ڈال دیں مگر سنت اللہ یہی ہے کہ اچھی صورتیں ہوں گی تو اچھی حقیقتیں ہوں گی اور بری صورت ہوگی تو حقیقت بھی اسی درجے کی ہوگی۔ اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ''اِلْتَمِسُوا الْخَیْرَ فِیْ حِسَانِ الْوُجُوْہِ'' ① ''اچھی حقیقتوں کو پاکیزہ چہروں میں تلاش کرو''۔ اس قسم کی تکوینی چیزیں اکثری ہوتی ہیں کلیہ نہیں ہوتیں کوئی نہ کوئی جز ان سے نکلتا رہتا ہے۔ عام سنت اللہ یہی ہے کہ جیسی صورت ویسی حقیقت۔ غرض ہر حقیقت کے مناسب صورت اور ہر صورت کے مناسب حقیقت دی جاتی ہے۔

صورت کا کام در حقیقت تعارف کرانا ہے یعنی حقیقت چھپی ہوئی ہے اسے پہچان نہیں سکتے جب تک کوئی صورت سامنے نہ ہو۔ کیونکہ صورت حقیقت کی ترجمان ہوتی ہے صورت دیکھتے ہی آدمی کہتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے۔ گلاب کی پتی دیکھ کر آپ فوراً پہچان لیں گے کہ اس میں گلاب کی خوشبو ہے۔ آم کی شکل دیکھتے ہی پہچان لیں گے کہ یہ اس ذائقے کا پھل ہے۔ اس میں آپ خربوزے کا ذائقہ محسوس نہیں کریں گے۔ تو اس دنیا میں کوئی حقیقت بغیر شکل کے نہیں پہچانی جاتی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ہر حقیقت کو ایک صورت عطاء فرمائی ہے۔ اگر کوئی عالم ایسا ہو کہ آپ بغیر صورت کے حقیقت کو پہچان لیں۔ تو شکل وصورت کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ محض اس لئے رکھی گئی ہے کہ تعارف حاصل ہو جائے۔

حقیقت بیت اللہ الکریم...... آپ حج کرنے کے لئے جاتے ہیں یا یہاں بیٹھ کر بیت اللہ کی طرف رخ کر کے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ بیت اللہ کچھ نہیں ہے۔ بیت اللہ معبود نہیں ہے وہ جو ایک چہار دیواری کا کوٹھا سیاہ لباس پہنے ایک محبوب کی مانند کھڑا ہے وہ مسجود نہیں ہے کہ آپ اسے سجدہ کریں بلکہ کعبہ در حقیقت وہ محل مبارک ہے جس کے اوپر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے اور وہ محل بھی فی الحقیقت کعبہ نہیں اس محل پر تجلی خداوندی اتری ہوئی ہے۔ اس تجلی کو ہم سجدہ کرتے ہیں، وہ مسجود ہے۔ تو اس تجلی کے لئے محل کی ضرورت تھی۔ تو اللہ نے ایک بقعہ مبارک معین فرما دیا۔ اس محل کی پہچان کروانے کی ضرورت تھی تو کعبے کی چہار دیواری پر محنت کی گئی اور اسے بنایا گیا۔ غرض کعبہ ایک علامتی نشان ہے۔ حقیقت کعبہ وہ تجلی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں وہی فی الحقیقت مسجود ہے۔

ذات بالاتر ہے۔ وہ کسی چیز میں نہیں سما سکتی کیونکہ لامحدود ہے۔ محدود چیزوں کے اندر ذات نہیں سما سکتی۔ البتہ تجلی ایسی چیز ہے کہ بڑی سے بڑی چیز یا چھوٹی سے چھوٹی چیز میں آسکتی ہے۔ اس لئے کہ تجلی کے معنی عکس کے ہیں۔ جیسے مثلاً آفتاب بڑی چیز ہے اور سائنس دان کہتے ہیں کہ آفتاب زمین سے ساڑھے تین سو گنا بڑا ہے۔ لیکن

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱۶ ص: ۲۵۰۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی من طریق یحی بن یزید بن عبدالملک النوفلی عن ابیہ وکلاھما ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۸ ص: ۱۹۵۔

زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جسے آئینہ کہتے ہیں۔ اس میں آفتاب کی پوری تصویر اتر آتی ہے۔ وہ آفتاب کا عکس ہے، عین آفتاب نہیں ہے۔ ممکن نہیں کہ عین آفتاب آئینہ میں سما جائے۔ لیکن اس عکس کو دیکھ کر آپ یہی کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آئینے میں سورج کو دیکھا اس میں سورج کے سارے خدوخال موجود ہیں۔ وہی رنگ، وہی نقشہ، بلکہ آئینے کا آفتاب کام بھی وہی کرتا ہے جو اصل کا کام ہے۔ اصل کا کام گرمی اور روشنی پہنچانا ہے۔ اس آئینے کے ذریعے سے بھی آپ گرمی پہنچالیں گے اور آئینے کے مقابلے میں آئینے رکھتے چلے جائیں۔ ہر آئینے میں ایک سورج آتا چلا جائے گا اور ان کے واسطے سے اندھیرے کنوئیں میں بھی روشنی ہو جائے گی۔ تو جو اصل کا کام ہے تنویر اور حرارت۔ یعنی روشنی پہنچانا اور گرمی پہنچانا وہی کام عکس بھی کرتا ہے۔ اس لئے عکس کو دیکھتے ہی کہا کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں کو دیکھا۔ آپ کسی کی فوٹو لے لیں گو نا جائز ہی سہی لیکن فوٹو دیکھتے ہی آپ کہتے ہیں کہ یہ فلاں صاحب ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویر اور اصل میں عینیت کا علاقہ ہوتا ہے، غیریت نہیں ہوتی اگر غیریت ہوتی تو عکس کو دیکھ کر اصل کو آپ کبھی نہ پہچان سکتے۔ تو عکس کا دیکھنا بعینہ اصل کا دیکھنا ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات لامحدود ہے۔ وہ کسی غیر میں (مخلوق میں) نہیں سماسکتی۔ وہ بالاتر ہے لیکن مخلوق کو پہچان کروانے کیلئے بیچ میں اللہ نے تجلی کا راستہ رکھا تو اس فضا میں یا آئینۂ بیت اللہ کے اندر اپنا عکس ڈال دیا۔ اور عکس بڑی سے بڑی چیز کا چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی آسکتا ہے۔ تو درحقیقت مسجود وہ تجلی اور عکس خداوندی ہے جو بیت اللہ کے اندر اترا ہوا ہے۔ یہ بیت اللہ کی عمارت اس کا ایک علامتی نشان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تب بھی سجدہ ادھر ہی کو ہوگا۔ کیونکہ مقیم موجود ہے جس کو سجدہ کیا جاتا ہے۔

عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں جب انہوں نے کعبے کی عمارت نئی بنائی تو پرانی عمارت نہیں تھی۔ وہ منہدم کردی گئی تھی لیکن طواف بھی جاری رہا اور نمازیں بھی جاری رہیں۔ حالانکہ عمارت موجود نہیں تھی تو کعبہ اس تجلی مبارک کا نام ہے۔ جس کا علامتی نشان کعبہ ہے۔

صورتِ کعبہ کا احترام...... مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ علامتی نشان ہونے کی وجہ سے یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ وہ کوئی ناقابل التفات چیز ہے۔ اس کی عظمت، اس کا احترام، اس کا ادب اتنا ہی واجب ہوگا جیسے عین تجلی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس لئے کہ اسے تجلی سے ایک نسبت ہے اور وہ اس سے ملحق ہے۔ نسبت کا اثر آئے گا تو اس کی اینٹ اینٹ معظم اور محترم بن جائے گی۔ اس کا بھی ادب واجب ہوگا۔

اور نہ صرف بیت اللہ کا بلکہ اگر آپ بیت اللہ کے اوپر غلاف ڈال دیں تو وہ غلاف بنایا تو آپ ہی نے ہے، مگر جب اس پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ نسبت قائم ہوگئی۔ اس نسبت کی وجہ سے بنانے والے کو بھی اس کے سامنے جھکنا پڑے گا تو تجلی کی وجہ سے عظمت بقعہ مبارک کی قائم ہوئی۔ اس بقعہ کی وجہ سے بیت اللہ کی چہار دیواری کی عظمت قائم ہوئی اور پھر ان سبھی وجوہ سے مسجد حرام کی عظمت قائم ہوئی اور مسجد حرام کی وجہ سے پورے مکہ کی قائم ہوئی۔ حتیٰ کہ حجاز

بھی مقدس بن گیا۔ درجہ بدرجہ وہ تعظیم و تقدیس اور تکریم سب میں آتی رہی۔ تو اصل تعظیم اس تجلی مبارک کی ہے پھر درجہ بدرجہ نسبتیں پا کر سب اشیاء مقدس اور باعظمت بنتی گئیں حتی کہ اگر کوئی حج کر کے آئے۔ آپ اس کے بھی ہاتھ چومتے ہیں۔ اس میں کیا نئی بات پیدا ہوئی؟ عبادت تھی تو وہ یہاں بھی کرتا تھا۔ نماز بھی پڑھتا تھا۔ ایک محض اسے بیت اللہ سے نسبت پیدا ہو گئی کہ اس کی آنکھوں نے بیت اللہ کا جلوہ دیکھا ہے۔ اس نسبت کی وجہ سے وہ حاجی واجب الاحترام بن جاتا ہے تو دنیا میں ساری عظمتیں نسبت سے قائم ہوتی ہیں اور نسبت صورت اور حقیقت کی مطابقت کی وجہ سے قائم ہوتی ہے کہ یہ حقیقت اس صورت میں پائی جائے۔ لہٰذا یہ صورت بھی قابل احترام ہے۔

قرآن کریم اللہ کسی کے سینے میں اتار دے۔ اس حافظ کی بھی آپ قدر کرتے ہیں۔ حالانکہ حافظ گوشت پوست کا مجموعہ ہے۔ وہی گوشت پوست آپ کے اندر بھی موجود ہے۔ اس کی ذات میں کوئی عظمت نہیں مگر اللہ نے چونکہ اسکے قلب میں اپنا کلام اتار دیا ہے۔ کلام کی عظمت کی وجہ سے اس کی روح باعظمت ہوئی اور روح باعظمت ہونے کی وجہ سے اس کا بدن بھی باعظمت بن گیا۔ آپ لوگ اس کے ہاتھوں کو بھی چومتے ہیں۔

ظہورِ حقیقت کی علامت...... تو درحقیقت واجب التعظیم وہ حقیقت ہوتی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کی پہچان کروانے کے لئے حق تعالیٰ ایک شکل بنا دیتے ہیں جو ذریعۂ تعارف بھی ہوتی ہے اور واجب الاحترام بھی ہوتی ہے تو سنت اللہ یہی ہے کہ جب کوئی حقیقت نمایاں ہونے کے قابل ہوتی ہے اسے کوئی شکل دے دی جاتی ہے۔

ایک بچہ ہے وہ بلوغ کے قریب پہنچ جائے تو وہ اعلان کرتا تھوڑا ہی پھرتا ہے کہ میں بالغ ہو گیا ہوں۔ مجھے بالغ سمجھو اور بلوغ کے احکام جاری کرو۔ البتہ اس کی شکل ایسی بنتی ہے کہ دیکھتے ہی پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ بالغ ہو گیا۔ چہرہ بھی چوڑا چکلا ہو جاتا ہے۔ جان آنے لگتی ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ اب یہ نکاح کے قابل ہے اس کا اب کہیں رشتہ ڈھونڈو۔ اب یہ بچہ نہیں رہا۔ یہ درحقیقت جوانی ہے جو روپ اختیار کرتی ہے۔ اس روپ کی وجہ سے پہچان لیا جاتا ہے کہ اس میں بلوغ کی حقیقت آ گئی ہے اور بلوغ کی حد کو پہنچ گیا۔ اب یہ اس درجے پر آ گیا ہے کہ اگر اس کا نکاح کر دیا جائے تو اس کی نسل آگے چل سکتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح سے ایک طالب علم جو آپ کے ہاں آٹھ برس سے تعلیم پا رہا تھا وہ اب تک نابالغ تھا۔ اس نے میزان پڑھی، بلوغ کو نہیں پہنچا۔ شرح وقایہ تک پہنچا جب بھی بالغ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ جب اس نے بخاری پڑھی۔ اب کہیں گے کہ یہ حد بلوغ کو پہنچ گیا۔ اب ایسا ہے کہ اگر اس کا کتاب سے رشتہ کر دیا جائے، تو اس کی علمی نسل شروع ہو جائے گی۔ اس کے شاگرد پیدا ہونے لگیں گے۔ روحانی ذریت پیدا ہونے لگے گی۔ اس لئے کہ حد بلوغ کو پہنچ گیا۔ اس کے لئے اللہ نے علامتیں رکھی ہیں۔

اسی طرح سے معنوی طور پر جب ایک طالب علم حد بلوغ و کمال کو پہنچے اس کی بزرگوں نے کچھ علامتیں رکھ دی ہیں۔ جس سے پہچانا جائے۔ مثلاً ایک علامت پگڑی باندھنا ہے۔ دستار بندی۔ یہ درحقیقت ایک اعلان ہے اور اس کی

علامت ہے کہ یہ اب علمی طور پر بالغ ہوگیا ہے ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اب اس کی روحانی طور پر ذریت واولاد پیدا ہوسکتی ہے۔ بھئی! نکاح کرنے میں بھی آپ دو آدمی گواہ مقرر کرتے ہیں کہ نکاح ہوگیا۔ اولاد جائز ہوگی۔ اسی طرح اس بالغ طالب علم کے بارے میں سارے استاذ شہود بنتے ہیں کہ یہ بالغ ہے اب جسے یہ پڑھائے گا وہ اس سے علم حاصل کرے گا۔ غلط راستہ پر نہیں جائے گا تو پگڑی دے دینا یا سند اس کے ہاتھ میں دے دینا یہ علامت ہے۔

حصولِ حقیقت کے ذرائع کا احترام..... مگر وہ طلباء جن کی دستار بندی ہوگی حد کمال پر پہنچنے کا یہ مطلب نہ سمجھیں کہ ہم کامل ہوگئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں صلاحیت واستعداد پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کامل بننا چاہیں تو بن سکتے ہیں۔ اب استاذ اور کتاب کے محتاج نہیں رہے۔ اس درجے کی قوت آ گئی ہے کہ اگر وہ مطالعہ شروع کریں، تبحر پیدا کریں، تفقہ سے کام لیں، تو ان کا علم آگے چلے گا تو دستار بند ہو کے طلباء یہ تصور نہ باندھیں کہ ہم اب کامل ہوگئے بلکہ یہ تصور باندھیں کہ استاذوں کی برکت سے صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، کہ اگر ہم کمال کے راستے طے کریں تو اب طے کر سکتے ہیں، اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہوگا کہ ہم استاذوں سے بالکل مستغنی ہوگئے بلکہ مرتے دم تک استاذوں کے محتاج رہیں گے، اس لئے کہ جتنا علم ان کا بڑھ گیا، ان کے استاذوں کا علم بھی بڑھ رہا ہے تو وہ اور زیادہ آگے بڑھ جائیں گے۔

مجھے اس پر ہمارے بھائی ادریس کا واقعہ یاد آیا۔ آپ کے ہاں کے شیخ الحدیث مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، واقعی ایک مثالی عالم تھے۔ متقی صاحب تقویٰ وطہارت، تبحر اور متفقہ، غرض جو عالم میں خصوصیات ہونی چاہئیں۔ اللہ نے وہ سب عطاء کی تھیں اور وہ میرے بھائیوں میں بھی اور دوستوں میں سے بھی تھے اور ہم چونکہ ساتھ ہی پڑھے تھے۔ ایک ہی جماعت میں تھے۔ اس لئے ہماری آپس میں بے تکلفی بھی تھی۔ بہر حال ایک مثالی عالم تھے۔ انہوں نے مسئلہ تقدیر پر ایک مضمون لکھا، جو منظوم ہے غالباً وہ چھپ بھی گیا ہے اور اس کے شروع میں میں نے کچھ مقدمہ بھی لکھا تھا، مولانا نے مسئلہ تقدیر کی شرح لکھی ہے۔ اور اس کے شروع میں بطور مقدمے کے میں نے کچھ لکھا ہے۔ یہ رسالہ لکھ کر وہ تھانہ بھون پہنچے اور ان کے ذہن میں یہ تخیل تھا کہ ایسی بدیہی چیزیں میں نے لکھی ہیں کہ ان میں کسی قیاس کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کھلی کھلی باتیں ہیں اور نصوص شرعیہ پیش کی ہیں۔ اس پر کون نکتہ چینی کر سکتا ہے؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر عرض کیا' حضرت! میں نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ آپ اس پر ایک نگاہ ڈال دیں، کوئی تقریظ کا کلمہ لکھ دیں تا کہ یہ مستند بن جائے۔

حضرت نے فرمایا کہ بھئی! دوپہر کو قیلولہ کرنے کی عادت ہے تو لیٹ کر میں اسے دیکھ لوں گا کوئی بات ذہن میں آئی تو کچھ لکھ دوں گا۔ یہ حضرت کے پاس وہ رسالہ چھوڑ کر چلے آئے۔ حضرت نے دوپہر کو وہ سارا رسالہ دیکھا، ظہر کی نماز کے بعد جب جمع ہوئے تو حضرت مولانا ادریس صاحب بھی آئے۔ حضرت نے فرمایا: مولوی

ادریس یہ رسالہ تم نے لکھا ہے؟ انہوں نے کہا'' جی حضرت'' فرمایا: اول سے لے کر آخیر تک سارا غلط ہے۔

اب ان کی آنکھیں کھلیں۔ فرمایا کہ مواد سارا صحیح ہے اس لئے کہ آیات وروایات پیش کی گئی ہیں، لیکن ان میں سے جو لطائف نکالے گئے اور جو اس کا اسلوب بیان ہے اس میں غلطی کی ہے اور پھر اس پر اعتراضات کئے اور واقعی ناقابل حل اعتراضات تھے۔

ہمارے بھائی ادریس صاحب کو یہ بات نظر نہیں پڑی۔ اس پر حضرت نے ایک جملہ فرمایا'' بھائی! نظر تمہاری وسیع ہے۔ علم تمہارا بہت وسیع ہے۔ ہمارا اتنا نہیں۔ مگر تم بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے تمہیں رجوع کرنا پڑے گا''۔ اس لئے کہ دس برس کتابیں دیکھ کر جس نتیجے پر پہنچو گے۔ بوڑھوں کے پاس آ کر منٹ بھر میں تمہیں چیز مل جائے گی۔ تو فرمایا'' تم بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے''۔

غرض جن حضرات کی دستار بندی ہو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کامل ہو گئے۔ اب انہیں کسی سے سروکار نہیں۔ وہ اب بھی اپنے اساتذہ کے محتاج ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ علم میں بڑھتے جائیں گے تو استاذ تو ان سے دس برس بڑا ہے۔ وہ بھی تو آگے بڑھتا جائے گا۔ یہ یہاں تک پہنچیں گے وہ اور دس گز آگے پہنچ جائے گا۔ اور علم کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ کسی مقام پر پہنچ جائے، پھر بھی آدمی علم کا محتاج رہتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کا شعر ہے، فرماتے ہیں کہ ؎

كُلَّمَآ اَدَّبَنِيْ دَهْرٌ اَرَانِيْ نَقْصَ عَقْلِيْ ‍ ‍ ‍ كُلَّمَآ اَزْدَادُ عِلْمًا اِزْدَدْتُ عِلْمًا بِجَهْلِيْ

'' جوں جوں زمانے نے مجھے علم سکھایا اور میرا شعور بڑھتا گیا اور مجھ پر میری جہالت واضح ہوتی گئی جس مقام پر میں پہنچتا اور اس مقام کا علم ہوتا تو ہزاروں مقام نظر پڑتے جس سے معلوم ہوتا کہ ان سے ابھی تک جہالت تھی''۔ جب اس سے اگلے مقام پر پہنچے، تو اس سے آگے لامحدود مقامات ہیں جن کا علم نہیں تو اور جہالت کھلی کہ ابھی تو جاہل ہی جاہل ہیں۔ اس لئے کہ علم حق تعالیٰ کی صفت اور اس کا کمال ہے۔ اس کی ہر صفت لامحدود ہے۔ آدمی کتنا ہی بڑھ جائے جہالت پھر بھی رہے گی۔ اخلاق ربانی بلحاظ کمال کے لامحدود ہیں۔ آدمی کتنا ہی بااخلاق بن جائے پھر بھی وہ نیچا ہی رہے گا۔ اس لئے کہ مراتب اخلاق لامحدود ہیں۔

قرآنی حقائق کی اخروی شکلیں...... اسی واسطے حضرات صوفیاء کے ہاں صوفی کا لقب نامراد ہے۔ یہ ایسا وحشت ناک لقب رکھتے ہیں کہ وہ مبنی بر حقیقت تو ہوتا ہے مگر لفظ ڈراؤنا ہوتا ہے یعنی جسے ہم بامراد سمجھتے ہیں کہ یہ کامل و مکمل ہے یہ اس کا نام نامراد رکھتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب طریقت کبھی مراد کو پہنچتا ہی نہیں حق تعالیٰ کے مراتب کمال لامحدود ہیں، جس حد تک پہنچے گا محدود پہنچے گا۔ معلوم ہوگا آگے ابھی باقی ہیں۔ وہ کبھی مراد کی انتہا کو پہنچے گا ہی نہیں۔ جب رہے گا بیچ میں ہی رہے گا اس لئے انہوں نے لقب ہی نامراد رکھ دیا ؎

اے برادر بے نہایت در گہے ست ‍ ‍ ‍ ہر چہ بروے مے رسی بروے مائیست

بے انتہا درگاہیں چلتے جاؤ، کوئی حدونہایت نہیں حتی کہ جنت میں بھی آپ پہنچ جائیں گے۔ اور ان شاء اللہ ضرور پہنچیں گے۔ وہاں بھی آپ بڑھتے ہی رہیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی حد پر رک جائیں گے۔ اس لئے کہ جنت ظاہری و باطنی کمالات ربانی کے مقامات کھلنے کا نام ہے جیسا کہ ظاہری نعمتیں وہاں بے شمار ملیں گی۔ باطنی نعمتوں کی بھی وہاں کوئی حدونہایت نہیں ہوگی۔ آدمی کا علم بڑھتا جائے گا۔ حدیث میں ہے کہ حافظ قرآن کو فرمایا جائے گا۔

''رَتِّلْ وَارْتَقِ'' تلاوت کرتا جا، ترقی کرتا جا۔ یعنی جتنی آیتیں ہیں۔ اتنے ہی قرآن کے مقامات ہیں اور ان مقامات کی اتنی لامحدود کیفیات ہیں۔ جس مقام پر پہنچو گے لامحدود نعمتیں اور کیفیات محسوس ہوں گی اور معلوم ہوگا اب تک کچھ ملا ہی نہیں تھا تو آگے لے لو۔ کبھی بھی حد کو نہیں پہنچو گے۔ حافظ کو فرما دیا جائے گا۔ جہاں تک تیری قوت ہے تلاوت کر اور ترقی کرتا جا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی جتنی آیتیں ہیں اتنے ہی جنت کے درجات ہیں۔ جیسے دنیا میں ایک آیت لاکھوں علوم پر مشتمل ہے کہ جتنا اس کے سمندر میں غوطہ لگاؤ تہ نہیں ملتی۔ علوم در علوم نکلتے چلے آتے ہیں ۔

حرف حرفش را اندر معنی ‌ ‌ ‌ ‌ معنی در معنی در معنی

جتنا کریدو گے علم کے نیچے علم ہے تہہ بہ تہہ علوم ہیں۔ آخر اللہ کا کلام ہے، معجزہ ہے۔ اسی طرح جب ایک آیت کے حقائق کھل کر وہاں کیفیات کی صورت میں نمایاں ہوں گے وہ بھی تہ بہ تہہ ہوں گے۔ ان کی بھی کوئی حد نہیں ہوگی ۔ گویا ایک ہی آیت کے علوم و کیفیات پاتے پاتے ہزاروں برس گزر جائیں گے۔ اسی کی لذت سے فارغ نہیں ہوگا۔ آگے کا مرتبہ جب آئے گا جب اس سے بھی فراغت نہ ہوگی۔ غرض بے انتہاء درجات و مراتب ہیں۔

اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ جنت میں جا کے مقامات انتہا کو نہیں پہنچیں گے۔ روز ترقی رہے گی اور یہی چیزیں جو آپ نے اللہ کی آیتیں پڑھی ہیں، انہی کے حقائق متمثل ہوں گے۔ شکل بدل بدل کر باغ و بہار کی صورت میں نعمت بن بن کر آپ کے سامنے آئے گی۔

﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ ① ''دنیا میں جو عمل کرتے تھے، اس کو بعینہ یہی آپ کا عمل نعمت کے مختلف روپ اختیار کرے گا''۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اَلسَّخَاءُ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ'' ② ''یہ سخاوت جنت میں ایک درخت کی صورت میں نمایاں ہوگی''۔

ظاہر میں آپ نے فقیر کے ہاتھ پر کچھ رکھا، داد و دہش کی۔ اس کی شکل درخت کی ہوگی اس لئے کہ جزا مطابق عمل ہوتی ہے۔ عملاً آپ نے فقیر کے سر پر سایہ کیا۔ اس کی بھوک کو دفع کیا، اس کی پریشانی کو دور کیا، اس کی سرپرستی کی۔ گویا فقیر کو آپ نے اپنے زیر سایہ لے لیا۔ وہ بیچارہ مطمئن ہوگیا۔ اس عمل نے جنت میں جا کر ایک

---

① پاره: ١٥، سورة الكهف، الآية: ٤٩. ② الحديث اخرجه البيهقي في شعب الايمان، الرابع والسبعون من شعب الايمان وضعفه، ج:٧ ص: ٤٣٤ رقم: ١٠٨٧٥.

درخت کی شکل اختیار کی، تو درخت کے سایہ میں آپ آ گئے جیسے ایک فقیر کو آپ نے سایہ دیا تھا۔ اسے آپ نے پھل کھلایا تھا۔ جس سے وہ بیچارہ بچ گیا۔ وہ درخت آپ کو پھل دے گا۔ جس سے آپ کی زندگی بھی ترقی کرے گی۔ اس لئے آپ کا عمل درخت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ تو جیسے درخت سایہ بھی دیتا ہے، پھل بھی دیتا ہے، فرحت بھی پیدا کرتا ہے۔ یہی منافع سخی کو حاصل ہوں گے۔

کمال علمی کی علامات...... حاصل ساری بات کا یہ نکلا کہ جس طرح جوانی کچھ علامتوں سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے روحانی مقامات اوراس کا حد کمال کو پہنچنا بھی کچھ علامات سے پہچانا جاتا ہے۔ جب علمی طور پر وہ بالغ ہوگا، اساتذہ شہادت دیں گے کہ یہ بالغ ہوگیا۔

اس کی علامت یہ ہے کہ سند اس کے ہاتھ میں دے دیں گے اوراس کے سر پر پگڑی باندھ دیں کوئی نشان اس کے سامنے پیش کر دیں وہ ایک علامت ہوگی، جیسے جوان آدمی کے لئے داڑھی کا نکلنا، چہرے کا چوڑا چکا ہو جانا جوانی کی علامت ہوتی ہے۔ مگر جیسے میں نے عرض کیا جو بھی کسی حقیقت کی علامت ہوگی اگر وہ حقیقت اچھی ہے تو وہ علامت بھی قابل تعظیم ہوگی۔ جیسا کہ آپ کو گلاب کی خوشبو محبوب ہے تو اس کی پنکھڑیاں بھی اتنی ہی محبوب ہوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ آپ انہیں جوتوں سے روندیں۔ اگر خوشبو عزیز ہے تو اس کے پتے بھی عزیز ہوں گے۔ وہی تو خوشبو کا ظرف ہے۔ وہ اگر پامال ہوگیا تو خوشبو باقی کہاں رہے گی؟۔ تو علم کی خوشبو کی جس قسم کی علامات ہیں، جس پیکر میں چھپی ہوئی ہوں گی۔ اگر علم واجب التعظیم ہے تو وہ شخصیت بھی واجب التعظیم ہوگی۔ جو اس کو سند ملے گی وہ بھی واجب الاحترام ہوگی۔ اس کو پگڑی ملے گی وہ بھی واجب القدر ہوگی۔ وہ اس اندرونی حقیقت کی علامت ہوگی جس سے آپ کو نظر آ جائے گا کہ اندر علم وکمال ہے۔

اس واسطے کہ متکلم کی حقیقت اس کے کلام سے کھلتی ہے جیسا کلام سامنے آئے گا آپ سمجھ جائیں گے ایسا ہی متکلم بھی ہوگا۔ تو جیسی علامتیں سامنے آئیں گی آپ سمجھ لیں گے کہ ایسی ہی حقیقت اس کے اندر ہے، مثلاً علامت یہ سامنے آئی کہ سر پر دستار باندھی گئی، سند ہاتھ میں دی گئی۔ اساتذہ نے شہادت دی۔ یہ علامت ہوگی کہ واقعی اس میں کوئی اچھی حقیقت ہے، وہ حقیقت واجب الاحترام تو یہ علامتیں بھی واجب الاحترام۔

انتقال حقیقت کا اثر...... مجھے اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمایا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ: جس سال ہم نے دارالعلوم سے تعلیم پائی تو دورے میں کل چودہ لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جب یہ دورے سے فارغ ہوئے تو اہل مدرسہ نے فیصلہ کیا کہ کوئی جلسہ دستار بندی کیا جائے۔ ان کو پگڑی باندھی جائے اور اعلان کیا جائے کہ یہ فارغ التحصیل ہیں۔ فرماتے تھے کہ ہم طلباء کو بڑی فکر پیدا ہوئی کہ بھئی! ہمارے اندر نہ کوئی لیاقت ہے نہ قابلیت ہے اور بر سر مجمع ہمیں دستار دی جائے تو کہیں ہم، اپنے استاذوں کے بدنام کنندہ ثابت نہ ہوں؟ اس لئے کسی طرح سے اس جلسے کو رکوانا چاہئے۔ ہم اس

قابل نہیں ہیں کہ ہمیں پگڑی دی جائے۔

خیر کا زمانہ تھا، تواضع اور کسرِ نفسی طلباء میں بھری ہوئی تھی۔ فرماتے تھے کہ سب نے مجھے وکیل بنایا کہ تو جا کے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عرض کر جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ: میں چھتے کی مسجد میں حاضر ہوا اور حضرتؒ کے حجرے میں گیا تو کتاب دیکھ رہے تھے اور ہیئت یہ بتائی کہ اونچا تکیہ تھا اور اس پر کہنیاں ٹیک رکھی تھی اور ہاتھ پیشانی کے قریب تھے۔ کتاب میں محو تھے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ دو تین منٹ کے بعد حضرت مولاناؒ نے دیکھا تو میں نے سلام عرض کیا۔ جواب دے کر فرمایا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا؟

میں نے عرض کیا حضرت! یہ سننے میں آ رہا ہے کہ دستار بندی کا جلسہ ہو گا اور ہمیں پگڑی باندھی جائے گی۔ اگر یہ امر ہے تب تو ہم تعمیل کریں۔ آپ جو چاہیں ہمارے سر کے اوپر باندھ دیں لیکن اگر اس میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے تو اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ (کہ ہم سب کی یہ رائے ہے کہ) ہم نالائق اس قابل نہیں ہیں کہ ہمیں پگڑی دی جائے۔ ہم کہیں اپنے استادوں کے بدنام کرنے کا ذریعہ نہ بنیں۔ اس لئے اس جلسے کو روک دیا جائے۔

فرماتے تھے کہ: مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں جوشِ رحمت پیدا ہوا۔ پہلا جملہ تو یہ فرمایا کہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم ایسا سمجھو اور جب تک آدمی اپنے بڑوں کے سامنے ہوتا ہے یہی سمجھتا ہے کہ میں نالائق ہوں کسی قابل نہیں ہوں اور اسے سمجھنا بھی چاہئے۔ فرمایا یہ تمہاری سعادت ہے۔

اس کے بعد فرمایا باقی ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ "فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ اللّٰهِ" مطمئن ہو کے کر رہے ہیں۔ ہمیں تمہاری استعدادوں کے اوپر اعتماد ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ہمیں شرح صدر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہم نہ صرف پگڑی باندھیں گے بلکہ یہ بھی اعلان کریں گے کہ: "جس فن میں جس کا جی چاہے، ان سے مناظرہ کر لے"۔ تو حضرتؒ فرماتے تھے کہ: حضرتؒ نے یہ جملے فرمائے کہ ہم فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ اللّٰهِ مطمئن ہو کر تمہیں دستار باندھ رہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں انشراح ہے تمہاری استعدادیں ہیں اور ہم بھرے مجمع میں اعلان کریں گے کہ جس کا جی چاہے جس فن میں ان سے بحث کر لے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تو کانپ گیا کہ بھئی! آئے تھے نماز بخشوانے، یہاں روزے بھی گلے پڑ گئے، ہم تو آئے تھے کہ سند بھی نہ ملے، یہاں اعلان ہو گا کہ بحث بھی کرو، تو میں بہت سہم گیا، اس کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور جملہ فرمایا جو شفقت کا تھا، فرمایا: "تمہاری سعادت مندی ہے جو تم اپنے کو نااہل اور نالائق سمجھتے ہو باقی عام طور پر دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں جاؤ گے تم ہی تم ہو گے۔" فرماتے تھے کہ ہم نے یہی دیکھا کہ جہاں گئے ہم ہی ہم نظر آئے اور کسی کی دال گلتی ہم نے نہیں دیکھی یہ ان بزرگوں کے قول کا اثر تھا اور اس حقیقت کا جوان کے ذریعے سے ان کے قلوب میں پہنچی۔

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ: جس کو دستار دی جائے، اس کا جذبہ یہ ہونا چاہئے کہ یہ بزرگوں کی طرف سے ایک عطیہ ہے، ہمارے لئے تبرک ہے مگر ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اس عطیہ کو ہم رکھ سکیں۔ شاید اس کی برکت سے

حق تعالیٰ ہمارے اندر کوئی پاکیزگی پیدا فرمادے۔

نقل پر حصول حقیقت...... اس لئے کہ بعض دفعہ جب صورت اچھی ہوتی ہے۔ تو اچھی صورت میں بھی اچھی حقیقت حق تعالیٰ کی طرف سے آجاتی ہے۔ جب اچھی ہیئت بنے گی اور امید ہے کہ اللہ کی طرف سے اچھی حقیقت بھی آجائے گی۔

آپ نے واقعہ سنا ہی ہوگا' حدیث شریف میں حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا مشہور واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک یا کسی اور غزوے سے جب واپس ہوئے تو مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّكَرَامَةً) چند میل باقی رہ گیا۔ عادت شریف یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نہیں داخل ہوا کرتے تھے۔ سعی فرماتے تھے کہ دن میں داخل ہوں۔ اس لئے وہاں پڑاؤ ڈال دیا گیا تا کہ کل صبح کو مدینہ منورہ میں پہنچ جائیں چونکہ لشکر تھا۔ خیمے وغیرہ لگ گئے۔ تو نماز کے لئے اذان ہوئی۔ جب کوئی فوج یا لشکر جاتا ہے تو لشکر اور فوجیں دیکھنے کیلئے عموماً بچے جمع ہو جاتے ہیں۔ اب یہ صحابہ کا لشکر تھا اور اس زمانے میں عام شہرہ تھا کہ ایک نئی قوم پیدا ہوئی ہے۔ یہ ان کا لشکر ہے تو دیکھنے کے لئے سینکڑوں بچے جمع ہو گئے جب اذان ہوئی تو بچوں نے اذان کی نقل اتارنی شروع کی اور ایک شور کی شکل بن گئی کیونکہ ہر بچہ جب اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے گا تو خود ہی شور ہو گیا اَللّٰہُ اَکْبَرُ کا بڑا شور مچا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیمے سے باہر تشریف لائے۔ فرمایا یہ شور کیسا؟ لوگوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! موذن اذان دے رہا ہے، بچے نقلیں اتار رہے ہیں۔ فرمایا: ان بچوں کو پکڑ کے لاؤ۔

حضرات صحابہؓ پکڑنے کے لئے دوڑے تو بچے بھاگ گئے۔ یہ ابومحذورہؓ نہ جوان تھے نہ بالکل بچے تھے، انہیں غیرت آئی کہ میں بھاگ جاؤں۔ یہ کھڑے ہو گئے۔ صحابہؓ نے انہیں پکڑ لیا اور لا کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے ذرا جرات سے کہا کہ اذان دے رہے تھے۔ فرمایا۔ اچھا دو اور نقل اتارو۔

انہوں نے ذرا دبے لفظوں میں کہا: اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، فرمایا' زور سے کیوں نہیں کہتے؟ انہوں نے زور سے کہا جیسے موذن اَللّٰہُ اَکْبَرُ پکارتا ہے۔ اس کے بعد حقیقت اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ توحید کا مسئلہ آیا۔ فرمایا آگے چلو۔ اب یہ ذرا جھجکے۔ اس لئے کہ توحید میں بھی ان لوگوں کو بہت سا کلام تھا۔ وہ شرک کے اندر مبتلا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نقل کیوں نہیں اتارتے؟ انہوں نے ذرا دبے اور گھٹے لفظوں میں ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہا فرمایا: زور سے کہو۔ انہوں نے زور سے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فرمایا آگے چلو۔ آگے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو ساری جھگڑے کی چیز تھی۔

اس لئے کہ توحید کے کسی نہ درجے کے مشرکین مکہ بھی قائل تھے۔ بالکل منکر نہیں تھے اور کہتے تھے کہ اللہ اور خالق تو ایک ہی ہے۔ اس نے اپنے نیچے بہت سے خدا بنا رکھے ہیں۔ انہیں اختیارات دے دیئے ہیں، کوئی روزی

دینے والا ہے، کوئی اولاد دینے والا ہے۔ اصل ایک ہی ہے اور اسی واسطے جب وہ حج میں جاتے تھے تو ان کا تلبیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جس میں ایسی ہی توحید کا اقرار تھا اور کہتے تھے "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ. لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ اِلَّاشَرِیْکًاھُوَلَکَ" "اے اللہ میں تیرے پاس حاضر ہوا تیرا کوئی شریک نہیں، ہاں شریک وہ ہے جو تو نے خود ہی اپنا شریک بنا رکھا ہے"۔ یعنی تو نے ہی معاذ اللہ جو شرک کا دروازہ کھول دیا ہے۔ وہ شریک تو موجود ہے باقی از خود کوئی تیرا شریک نہیں ہو سکتا۔

تو کسی نہ کسی درجے میں توحید کو مانتے تھے۔ سارا جھگڑا رسالت کے اندر تھا اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّااللّٰهُ تک تو بات بیت گئی۔ اب جب اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰهِ کی باری آئی تو یہ بہت سٹپٹائے کہ کیا کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نقل اتارو۔ جب نقل اتار رہے تھے، انہوں نے بہت دبے گھٹے لفظوں میں کہا "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰهِ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زور سے کہو۔ انہوں نے زور سے کہا۔ یہاں تک کہ اذان پوری ہوگئی۔ فرمایا' جاؤ'! عرض کیا، حضور! اب جاؤں کہاں؟ میں تو اب غلام بن چکا!

وہ توحید و رسالت جو زبان سے ادا کی۔ وہی صورت وہی آواز دل میں اثر کر گئی۔ توحید بھی دل میں اتر گئی۔ نبوت کی عظمت بھی دل میں اتر گئی۔ تو عرض کیا اب میں کہاں جاؤں۔ میں تو غلام ہو چکا ہوں۔ میرا تو دل مسلمان ہو چکا۔ زبان سے میں نے توحید و رسالت کا اعلان کر دیا۔ زبان نے جس چیز کا اعلان کیا تھا، وہی دل میں اثر کر گئی۔ اچھی صورت بنی تھی تو اس میں حقیقت بھی اچھی پیدا ہوگئی۔ تو آدمی اچھی صورت بنا لے تو حق تعالیٰ اس میں حقیقت حسنہ ڈال دیتے ہیں۔

ظاہری وضع کا باطن پر اثر...... یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے ظاہری روپ، ظاہری وضع قطع، اس کی تہذیب پر توجہ دلائی ہے کہ جیسی تم ظاہری وضع اختیار کرو گے، باطن بھی تمہارا ویسا بن جائے گا۔ فرض کر لیجئے کوئی شخص پہلوانوں کا سا لباس پہننے لگے، لنگوٹ باندھ کر میدان میں آ جائے۔ طبعاً اس کا دل چاہے گا کہ پنجہ کشی کرے، ڈنڈ پیلے، مقابلے ہوں اور کشتی ہو۔ طبعاً ادھر جذبات مائل ہو جائیں گے۔ وہ اس وضع کا اثر ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص زنانہ لباس پہن لے۔ چوڑیاں بھی پہن لے، رنگین کپڑے پہن لے، چند دن کے بعد جذبات میں نسوانیت آ جائے گی، اس کا جی چاہے گا کہ بولے بھی عورتوں کی طرح اور لب و لہجہ بھی وہی اختیار کرے۔ وہ اس وضع کا اثر ہوگا۔

اگر ایک شخص علماء کی وضع اختیار کرے طبعی طور پر ورع و تقویٰ کی طرف توجہ ہوگی چاہے ظاہر داری میں ہو کہ میاں مولویانہ لباس پہن رکھا ہے۔ اس میں اگر کوئی بری حرکت کی۔ لوگ کیا کہیں گے۔؟ اس لباس میں رہ کر یہ حرکت؟ تو خواہ مخواہ طبیعت مائل ہوتی ہے کہ کوئی متقیانہ افعال سرزد ہوں۔ یا اہل اللہ اور درویشوں جیسا لباس پہن لے۔ تو قدرۃً اس میں زہد و قناعت کے جذبات پیدا ہوں گے غرض ہر وضع قطع باطن پر موثر ہوتی ہے۔ جیسی ہیئت بنا لو گے ویسی

حقیقت بن جاتی ہے۔ اس لئے شریعت نے زور دیا ہے کہ ہیئت بناؤ تو اہل اللہ جیسی بناؤ۔ انبیاء علیہم السلام کی ہیئت بناؤ۔ صحابہ کرامؓ اور علماء ربانی کی ہیئت بناؤ۔ اس ہیئت میں اچھی حقیقت ڈال دیتے ہیں۔ چاہے ظاہر داری کے لئے ہی بناؤ مگر بیکار نہیں ثابت ہوتی۔ غرض ظاہری قول، ظاہری ہیئت ایسی مت اختیار کرو کہ تمہارا باطن بگڑ جائے۔

قول و فعل کا اثر...... مثلاً زمانہ جاہلیت میں یہ رسم پڑی ہوئی تھی کہ اس طرح سے اگر کسی نے انگلی دکھلا دی تو تلواریں نکل جاتی تھیں جیسے ہمارے آپ کے ملک میں کہتے ہیں کہ کسی کو ٹھینگا دکھا دینا، کسی کو انگوٹھا دکھا دیا وہ لڑ پڑے گا۔ یہ چڑانے کی علامت ہے۔ زمانہ جاہلیت میں چڑانے کی یہ علامت تھی۔ اس طرح انگلی دکھائی اور تلواریں نکلیں۔ اس لئے اس انگلی کا نام سَبَّابَہ یعنی گالم گلوچ کی انگلی تھا۔ جہاں اٹھی اور لڑائی شروع ہوتی۔

شریعت اسلام نے اس کی ہیئت کو بدلا۔ اس کے محل کو بدلا کہ انگلی اٹھائی جائے مگر کہاں؟ شہادت اور توحید کے واسطے التحیات کے اندر اٹھائی جائے اور اس کا نام رکھا سَبَّاحَہ، یعنی اللہ کی پاکی بیان کرنے والی انگلی۔ فرمایا سَبَّابَہ مت کہو، ورنہ وہی لغوی معنی یاد آئیں گے جو زمانہ جاہلیت کے تھے۔ سَبَّاحَہ کہو۔ جب لفظ اچھا بولو گے، حقیقت بھی اندر اچھی آ جائے گی۔

تجارت کرنے والے کو قرآن کریم نے تاجر کہا ہے۔ اور زمانہ جاہلیت میں خنسار کہتے تھے۔ تو ارشاد فرمایا گیا کہ۔ خنسار مت کہو۔ تاجر کہو، یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ: ''لَاتَقُوْلُوْا خِنْسَارًا وَقُوْلُوْا تَاجِرًا۔'' خنسار مت کہو، جاہلیت کی لغت ہے۔ جب وہ بولو گے تو تمہاری طبیعت خواہ مخواہ جاہلیت کی طرف جائے گی، اس لئے وہی لفظ بولو، جو اللہ نے اختیار کیا ہے تاکہ ذہن جائے تو قرآن کی طرف اور حقائق الٰہیہ کی طرف جائے۔ غرض ہر چیز میں ہیئت ہو۔ لفظ یا قول ہو اچھی صورت اختیار کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے۔

اس لئے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں تاثیر نہ ہو۔ ہر چیز میں اللہ نے اثر دیا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں اثر ہے، جیسا دانہ کھائیں گے ویسا اثر ظاہر ہوگا۔ جیسا پھل کھائیں ویسا اثر ظاہر ہوگا۔ ہر چیز میں تاثیر ہے۔ اور فقط اشیاء ہی میں تاثیر نہیں۔ آپ کے بدن میں بھی تاثیر ہے، آپ کی ہر ہیئت میں تاثیر ہے۔ آپ اگر کسی کو منہ اچھا کر کے دکھلائیں، ممنون ہوگا اور اگر کسی بری ہیئت سے دکھلائیں۔ جبھی لڑائی ہو جائے گی، معلوم ہوتا ہے ہیئت میں ممنون کرنے کا اثر بھی ہے اور غیض و غضب میں لانے کا بھی۔ اسی طرح آپ کی آنکھ بھی موثر ہے۔ اگر آپ نیچی نگاہ کر کے بات کریں، محبت پیدا ہوگی اور اگر آنکھ اٹھا کے گھور کے گفتگو کریں تو غیض و غضب پیدا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے آنکھ خاموش ہے۔ مگر خاموشی کے ساتھ بولتی ہے۔ بعض دفعہ غیض اور بعض دفعہ محبت پیدا کر دیتی ہے۔

لباس کی وضع قطع میں اثر ہے جیسی وضع ہوگی ویسی تاثیرات قلب کے اوپر پڑیں گی۔ چہرے مہرے کی جیسی ہیئت بنائیں گے، ویسے قلب کے اوپر اثرات پڑیں گے۔ جب ہر چیز میں اثر ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اوضاع کے اندر اور ہیئت کے اندر اثر نہ ہو۔ شریعت نے تہذیب سکھلائی کہ قول بھی ایسا مت کہو جو بھدا ہو جس سے دو معنی

کی طرف دھیان جائے۔ ہیئت بھی ایسی مت بناؤ جس سے کوئی برائی پیدا ہو۔ ہیئت، قول اور نظر بھی اچھی رکھو۔

اس لئے فرمایا ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ ① "چال میں میانہ روی اختیار کرو" ٹھپ ٹھپ کرتے ہوئے چلو گے، تکبرانہ چال ہو جائے گی، بہت جھک کے چلو گے بیماروں کی چال بن جائے گی۔ درمیانی چال رکھو اس میں تواضع اور انکساری بھی ہو اور ساتھ میں قوت بھی ہو، نہ تمہیں بیمار سمجھا جائے نہ متکبر سمجھا جائے اس لئے کہ چال کا بھی اثر پڑتا ہے۔ اور فرمایا ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ ② "آواز میں ذرا پستی اختیار کرو"۔ بہت زیادہ چلا کے بولنا جس سے دوسرا سمجھے کہ اس نے مجھے بہرہ سمجھا، جب ایک اچھے بھلے آدمی کو آپ خواہ مخواہ بہرہ بنا دیں گے، اسے غصہ ہی آئے گا، پھر زیادہ تلخ آواز کانوں کو بھی ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ بقدر ضرورت آواز بلند کرے، اعتدال کے ساتھ گفتگو کرے۔ تو پوری طرح مہذب بنو۔ ہاتھ پاؤں زبان اور ہیئت میں اعتدال رکھو۔ کہیں ارشاد فرمایا:

ایمان کا اثر...... "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" ③ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔ وہ کیا مسلمان ہے کہ گالم گلوچ کرتا آ رہا ہے۔ دوسرے کا دل دکھاتا ہوا آ رہا ہے، چاہے آپ اسے اسلام سے خارج نہ کریں۔ مگر حقیقی معنی میں کوئی کمال تھوڑا ہی ہے؟ بڑا مسلم حقیقت میں وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں اور کہیں فرمایا: "اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَدِمَآئِهِمْ" ④ "مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے اپنی جانوں، اموال اور آبرو کے بارے میں مطمئن ہو جائیں"۔ لاکھوں روپے چھوڑ کر چلے جائیں کہ یہ مومن ہے خیانت نہیں کر سکتا۔ بہو بیٹی کو چھوڑ کر اطمینان ہو کہ یہ مومن ہے خیانت نہیں کرے گا۔ اور یہاں لفظ جو فرمایا وہ یہ نہیں کہ: "مَنْ اَمِنَهُ الْمُؤْمِنُوْنَ" اس سے مسلمان مطمئن ہوں، بلکہ فرمایا مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ لوگ اس سے مطمئن ہو جائیں کہ یہ مومن ہے خائن نہیں۔ غیر مسلم بھی اطمینان کا اظہار کریں کہ واقعی یہ ایماندار آدمی ہے۔ تو مومن تو وہ ہے۔

اگر مومن اور مسلم ایسا ہے کہ لوگ اس سے ڈرتے ہوں کہ بھئی! ذرا بچ کے چلو۔ کہیں جیب نہ کترے، کہیں گالی نہ دیدے، کہیں دل نہ دکھا دے، مومن کیا، یہ تو اچھا خاصا بیل ہو گیا۔ اس لئے کہ بیل جب چلتا ہے تو لوگ بچ کے چلتے ہیں کہ بھئی! جانور ہے کہیں لات نہ مار دے، دم نہ مار دے، پیشاب نہ کر دے، چھینٹ نہ پڑ جائے۔ اگر مومن سے بھی اسی طرح بچ کے چلیں کہ کہیں گالی نہ دے دے، جیب نہ کتر لے، چھری نہ مار دے، یہ مومن کیا یہ تو اچھا خاصا بیل ہے مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے مطمئن ہوں کہ جان بھی محفوظ ہے، آبرو بھی اس سے محفوظ ہے۔ کیونکہ یہ مومن ہے جب تک لوگوں کو اتنا اطمینان نہ ہو وہ آدمی سچا مومن ہے؟

---

①② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۹۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام، ج: ۱ ص: ۶۵ رقم: ۴۱۔ ④ الصحیح لابن حبان، کتاب الایمان، باب فرض الایمان، ج: ۲ ص: ۲۶۴ رقم: ۵۱۰۔

کردار واخلاق کے اثرات ...... یہ ایمان لے کر اگر آپ غیر مسلموں کے سامنے جائیں گے۔ان کی گردنیں جھکیں گی۔اسلام اسی طرح پھیلا ہے، دباؤ سے نہیں پھیلا۔ کردار واخلاق اور معاملات کی سچائی، اور خیر خواہی خلق اللہ سے اسلام پھیلا ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جہاں ان اوصاف کو لے کے پہنچے لوگوں کی گردنیں جھک گئیں، سندھ میں جب حضرات صحابہؓ داخل ہوئے تو مورخین لکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی ان کے چہرے دیکھ کے مسلمان ہوئے ہیں کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں۔ یہ سچوں کے چہرے ہیں۔تو مسلمان کا چہرہ مہرہ بھی مبلغ ہے۔اس کی وضع قطع بھی مبلغ ہےاوراس کی ہر حرکت مبلغ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم غور کریں تو ہم خود اسلام کی تبلیغ میں حائل ہیں۔غیر مسلم ہمیں اور آپ کو دیکھ کر، ہماری حرکات کو دیکھ کر اسلام سے رک گئے ہیں۔اگر سو میں سے دس پانچ آدمی پاکیزہ اخلاق کے نکل آئیں اسے قوم کی پاکیزگی نہیں کہتے کم سے کم اکثریت تو ہو۔حالات یہ ہیں کہ ہمارے افعال بھی منکر، ہیئتیں بھی منکر، بیسیوں خرافات بھری ہوئی ہیں۔تو غیر مسلموں تک اسلام کو پہنچانے میں اپنے افعال سے ہم خود حائل بنے ہوئے ہیں وہ ہمارے دین کو کتابوں سے نہیں، افعال سے دیکھتے ہیں۔ ہماری حرکتیں بری دیکھیں گے، کہیں گے ان کا دین بھی ویسا ہی ہے، ہماری حرکتیں صحیح ہوں۔ کہیں گے، واقعی ان کا دین اچھا ہے۔ بہر حال ہمیں اور آپ کو سنبھلنے کی ضرورت ہے۔ہم ایسے ہوں کہ محض زبان سے تبلیغ نہ کریں بلکہ ہمارا چہرہ مہرہ دیکھ کر لوگ کہیں واقعی مسلمان آدمی معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں دیو بند کے قریب مظفر نگر میں آریوں سے مسلمانوں کا مناظرہ ہوا۔اس میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے گئے۔ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی جوانی کا زمانہ تھا، تھوڑی تھوڑی داڑھی آئی ہوئی تھی۔ بالکل ابتدائی دور تھا۔حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وجیہ بھی تھے اور حسین وجمیل بھی تھے۔اکثر سبز پگڑی باندھا کرتے تھے۔غرض حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی دلکش صورت تھی۔حضرت شاہ صاحبؒ اس مناظرے میں گئے کیونکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان کے استاذ بھی پہنچے ہوئے تھے۔اس موقع پر آریہ مبلغ نے کہا کہ: ”اگر کسی کی صورت کو دیکھ کر اسلام قبول کیا جاسکتا۔تو میں مولوی انور شاہ کی صورت کو دیکھ کر ابھی اسلام قبول کر لیتا۔اس کا چہرہ بتلاتا ہے کہ اسلام یہ ہے“۔تو مسلمان کا چہرہ مہرہ خود مبلغ ہوتا ہے۔غرض شریعت اسلام نے ہیئتوں کی تہذیب اوران کو درست کرنے کی تاکید کی ہے۔کیونکہ ہیئت سے سارا کام چلتا ہے۔

لباس کا اثر ...... جب فوجیں آپس میں ملتی ہیں تو فوج کا سپاہی اپنی وردی سے پہچانا جاتا ہے جو اس کا یونیفارم ہوتا ہے اس سے شناخت ہوتی ہے۔اگر کوئی اپنا سپاہی دشمن کی وردی پہن کے آجائے یقیناً اسے گولی ماردیں گے بعد میں چاہے افسوس کریں کہ بھئی! یہ تو اپنی فوج کا تھا۔معلوم ہوا سارا دار و مدار یونیفارم اور وردی ہوتا ہے۔آپ سب اللہ کی فوج کے سپاہی ہیں۔اگر دشمن کی ہیئت میں آئیں گے تو ڈر ہے کہیں گولی نہ ماردی جائے۔اپنی ہیئت میں آنا چاہئے

تا کہ اپنی فوج کا سپاہی سمجھا جائے تو ہیئتوں کی اصلاح، ظاہر کی تہذیب اس کی طرف شریعت نے بہت توجہ فرمائی۔

میں اس لئے یہ عرض کررہا تھا کہ ان طالبعلموں کو جنہیں دستار دی جائے گی انکی ہیئت ایسی ہوگی کہ ہاتھ میں سند ہے۔ سر پر پگڑی ہے دل میں علم بھرا ہوا ہے۔ مجموعے سے سمجھا جائے گا یہ ماشاءاللہ فارغ التحصیل ہوگئے۔ مگر ان کا فرض ہے کہ وہ یوں نہ سمجھیں کہ ہم کامل مکمل ہوگئے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ ہم نے پہلے زینے پر قدم رکھ دیا ہے۔ اب تکمیل کا راستہ شروع ہوا ہے۔ اگر چاہیں تو مکمل ہوسکتے ہیں۔ فی الحال ہماری ابتداء تھی۔ اساتذہ کو انکی استعداد کی شہادت دینی ہے کہ ان کے دل میں طلب پیدا ہوگئی ہے۔ اگر یہ چاہیں تو مکمل ہوسکتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک خوشی کا وقت ہوگا کہ ہم اپنے طلباء کو دستار باندھیں گے کہ قوم میں الحمدللہ ایسے نوجوان پیدا ہوئے جو کل کو علم سکھلائیں گے، ان کی علمی ذریت قائم ہوگی۔

علم کے اثرات...... اور ظاہر بات ہے کہ علم ایک ایسی چیز ہے کہ ساری دنیا اس کی قدر کرتی ہے۔ کوئی بڑا ہی کندہ ناتراش ہوگا جو علم کی قدر نہ کرے۔ اس لئے کہ علم نہ ہندی ہے نہ سندھی۔ نہ افریقی نہ امریکی۔ نہ ایشیائی نہ یورپین۔ بلکہ سارے انسانوں کی ایک متاع مشترک ہے۔ اس لئے ہر انسان علم کی طرف جھکتا ہے۔ علم میں زندگی و نسل اور وطن کا تعصب نہیں آتا وہ سب کے لئے یکساں ہے۔ اسی لئے طلباء کے تبادلے ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف ہوتے ہیں۔ علم سیکھنے کے لئے یورپ والے آپ کے یہاں آرہے ہیں۔ آپ کے طلباء یورپ جارہے ہیں۔

علم کوئی سا بھی ہو، انسان کا ایک طبعی مرغوب ہے۔ اس میں یہ قید نہیں کہ بھئی! یہ ہندوستان والوں کا علم ہے۔ ہمیں اس سے بچنا چاہئے۔ علم میں پاکستانی ہندوستانی کی تقسیم ہے ہی نہیں۔ وہ تقسیم سے بالاتر ہے۔ لہٰذا سب جھکیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم ہماری صفت نہیں ہے اگر ہماری صفت ہوتی اس میں تعصب ہوتا۔ یہ ہمارے خدا کی صفت ہے اور حق تعالیٰ ان ساری حدبندیوں سے بالا ہیں۔ ان کی صفت پر جب آپ آئیں گے تو اتحاد پیدا ہوگا۔

میرا افریقہ جانا ہوا تھا۔ افریقہ یونیورسٹی جوہانسبرگ میں ہے۔ اس میں ایک تعلیمی اجتماع ہورہا تھا۔ اور سارے یورپین جمع تھے۔ کوئی چھ سات ہزار آدمی کا مجمع تھا۔ وہاں کالے گورے کی بڑی تفریق ہے۔ کالوں کی گاڑیاں الگ، گوروں کی الگ دکانیں، اسٹیشن پر کالوں کا حصہ الگ، گوروں کا الگ غرض رنگ کے لحاظ سے بڑا تعصب وہاں پھیلا ہوا ہے۔ تو ہم یونیورسٹی دیکھنے کے لئے گئے۔ معلوم ہوا کہ ایک بین الملکی تعلیمی اجتماع ہورہا ہے۔ اس میں سارے ملک کے نمائندے جمع ہیں۔ ہم نے ارادہ کیا کہ واپس ہوجائیں پھر کسی وقت آ کے دیکھیں گے تو دو لڑکیاں کسی صوبے سے نمائندے کے طور پر آرہی تھیں۔ وہ یہ سمجھیں کہ یہ راستہ بھول گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ اوپر جانا چاہتے ہیں تو آیئے ہمارے ساتھ چلئے، ہم بھی ساتھ ہولئے۔ اوپر جاکے دیکھا تو بڑا عجیب اجتماع۔ اس میں چھ سات ہزار گورے مرد بھی عورتیں بھی جمع ہیں۔ اور اس طرح سے اسٹیج قائم جیسے پارلیمنٹوں میں ہوتا ہے کہ اوپر کی اسٹیج پہ تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ صدر نائب صدر اور سیکرٹری۔ اس کے بعد نیچے ایک اور اسٹیج تھا۔ اس پر پانچ افراد تھے۔ اس

سے نیچے ایک اور اسٹیج تھا۔ اس پر سات افراد تھے، جیسے پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس انداز کا تھا۔ ہم پیچھے کرسیوں پر دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ تو ایک نمائندے نے یہ سمجھ کر کہ یہ وضع قطع سے دوسرے ملک کے معلوم ہوتے ہیں. ہمارے میزبانوں سے پوچھا کہ یہ یہاں کے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں، ہندوستان سے آئے ہیں۔ کہاں کے ہیں؟ انہوں نے کہا دارالعلوم دیوبند کے۔ انہوں نے کہا۔ دارالعلوم دیوبند کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا ایک مذہبی یونیورسٹی ہے اور یہ اس کے چانسلر ہیں۔ تو اس لڑکی کو بھی قدر ہوئی کہ اچھا یہ یونیورسٹی کے چانسلر ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ اس نے کہا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں اگر میں (ان کی آمد کی) صدر کو اطلاع دوں؟ انہوں نے کہا دے دیجئے۔ اب میں تو کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ انگریزی میں بات چیت ہو رہی تھی۔ خیر اس نے صدر کو اطلاع دی۔ اس نے کھڑے ہو کے کہا کہ ہمارا تعلیمی جلسہ ہے۔ اور حسن اتفاق دیکھئے کہ ہندوستان کا ایک شخص جو وہاں کے تعلیمی ادارے کا ذمہ دار ہے۔ وہ موجود ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں اسے اسٹیج پہ بلاؤں؟

ساری پبلک نے کہا کہ ضرور بلائیے، اب وہاں سے ایک آدمی پہنچا، اب یہ قوم کی شائستگی کی بات ہے کہ جوں ہی میں اٹھا، تو پورا جلسہ کھڑا ہو گیا۔ اور تالیاں بجانی شروع کیں، اپنی دانست میں گویا تبریک و تہنیت پیش کی جب تک میں اسٹیج پر نہیں پہنچ گیا برابر تالیاں بجتی رہیں۔ اسٹیج پر جب پہنچے تو اوپر تین کرسیاں تھیں۔ صدر، نائب صدر، سیکرٹری۔ سیکرٹری عورت تھی اور وہ بیچ میں تھی صدر نائب صدر اِدھر اُدھر تھے۔ میرے پہنچتے ہی اس (سیکرٹری) عورت نے کرسی چھوڑ دی۔ مجھے بٹھلا دیا۔ خود پشت پہ کھڑی ہو گئی۔ تو خیر میں نے کہا گورا ہٹا، کالے نے قبضہ کیا۔ میں اب تک یہ سمجھ رہا ہوں کہ محض تکریماً اور اعزازاً ایسا کیا۔ لیکن صدر نے اعلان کیا کہ: یہ ہندوستان کی یونیورسٹی کے ذمہ دار ہیں۔ آپ اجازت دیں، تو میں انہیں تقریر کے لئے کہوں؟ پبلک نے کہا 'ضرور کہنا چاہئے۔

اب اس نے تقریر کی درخواست کی تب میں سمجھا کہ یہ مقصد تھا۔ میں محض اعزاز ہی سمجھ رہا تھا۔ اچانک اس نے مجھے کہا کچھ بیان کیجئے۔ وہ جو وہاں میں نے جملے کہے کہ وہ مجھے سنانے تھے جس کے لئے یہ تمہید تھی جو میں نے یہ واقعہ سنایا، وہاں چونکہ کالے گورے کی تفریق ہے۔ تو پہلے میں نے کھڑے ہو کر حکومت کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہمیں آنے کی اجازت دی اور پبلک کا کہ اس نے قبول کیا، پھر جلسے والوں کا کہ انہوں نے ہمیں یہاں آنے کی اجازت دی۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ "آپ نے اس پر غور کیا کہ کالے اور گورے مل کر اس وقت ایک جگہ جمع ہیں۔ تو کس چیز نے ہمیں جمع کیا؟ یہ سوال میں نے کھڑا کیا۔"

اگر آپ کہیں کہ رنگ نے جمع کیا تو میرا رنگ اور آپ کا رنگ اور ہے۔ رنگ کے معنی ہی حد بندی اور قطع و انقطاع کے ہیں۔ جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا۔ جو گورا ہے وہ کالا نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمیشہ الگ ہی الگ رہیں گے۔ تو رنگوں کے ملنے کا بھی کوئی معنی نہیں۔ اسی طرح میں نے کہا: مجھے اور آپ کو وطن نے بھی جمع نہیں کیا۔ آپ کا وطن افریقہ ہے میرا وطن ہندوستان ہے اور وطن کے معنی ہی حد بندی کے ہیں کہ افریقہ ہندوستان، اور ہندوستان افریقہ

نہیں بن سکتا۔ تو ہم الگ ہی رہیں گے۔

اور میں نے کہا نسل نے بھی ہمیں جمع نہیں کیا میری نسل اور ہے اور آپ کی نسل اور ہے، نسل کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو ایک خاندان کا ہے وہ دوسرے خاندان کا نہیں بن سکتا، ہمیشہ انقطاع رہے گا۔ پھر آخر ہمیں کس چیز نے جمع کیا؟ اور میں نے کہا کہ جمع بھی اس طرح کہ آپ اور ہم صرف کندھا ہی ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ دل بھی ہمارے ملے ہوئے ہیں، ہر ایک کے دل میں دوسرے کی جگہ، یہ کس چیز نے جمع کیا؟ میں نے کہا در حقیقت ہمیں علم نے جمع کیا ہے نہ کہ رنگ، نسل اور وطن نے جمع کیا، اور علم نے کیوں جمع کیا؟ اس لئے کہ وہ ہماری صفت نہیں ہے۔ اگر وہ ہماری صفت ہوتی تو میرا علم اور ہوتا، اس کا علم اور ہوتا، آپ کا علم اور ہوتا۔ وہ بھی تفریق کا ذریعہ بنتا، علم اللہ کی صفت ہے میری اور آپ کی نہیں ہے میں نے کہا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اپنی صفات پر کبھی جمع نہیں ہو سکتے جب تک انہیں چھوڑ کر کوئی خدا کی صفت اختیار نہ کریں جامعیت کی شان اسی کے اندر ہے اور میں نے کہا کہ:

جب اللہ کی صفت میں جمع کرنے کی شان ہے۔ تو اگر کوئی ذات تک پہنچے۔ اس کو سامنے رکھے۔ پھر انسان ہی نہیں حیوان غیر حیوان سب جمع ہو جائیں گے۔ سب کا خالق وہی ہے۔ سب کی اصل ایک ہے۔ اس لئے جمع کرنے کی شان اللہ کی ذات وصفات ہی میں ہے۔ انسان کی ذات وصفات میں جمع کرنے اور جمع ہونے کی شان نہیں ہے۔ جب تک ہم اپنی صفات کو چھوڑ کر خدائی صفات اختیار نہیں کریں گے۔ ہم میں اتحاد نہیں قائم ہوگا۔ تو ذریعۂ اتحاد اللہ کی ذات وصفات ہیں۔ اور ذات وصفات اسلام بتاتا ہے۔ تو اسلام جمع ہونے کا ذریعہ ہے اور کوئی چیز جمع کرنیوالی نہیں ہے۔ یہ ایک بات بیچ میں یاد آ گئی تھی۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ان طلباء کو جنہیں دستار دی جائے گی کہ یہ ایک ظاہری ہیئت ہے اور اس ظاہری ہیئت کے ذریعے سے وہ پہچانے جائیں گے کہ اللہ نے اتنی قابلیت عطاء کی تو انہیں غرہ نہیں کرنا چاہئے اور ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اب یہ ہم سے مستغنی ہو گئے۔ کتنا بھی زمانہ گزر جائے۔ وہ آپ کے شاگرد ہی رہیں گے اور بوڑھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

بہر حال یہ مبارک ساعت ہے کہ جس میں جامعہ کے سات آٹھ سال کا نچوڑ آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا جائے گا کہ اتنے افراد ہم نے تیار کئے اور اتنوں کو اس قابل بنایا کہ یہ آگے دوسروں کو ہدایت ونصیحت کر سکیں۔

نسبت کا اثر......اب یہ آپ حضرات کا فرض ہوگا کہ اپنی اعانت سے اپنے چندوں سے آپ نے جن کو تیار کیا، آپ خود ان کی قدر کریں۔ آپ کو بھی قدر کرنی پڑے گی۔ جیسے بیت اللہ کا غلاف آپ ہی اپنے ہاتھوں بناتے ہیں۔ لیکن بن کر جب وہ بیت اللہ پر لٹک جاتا ہے تو آپ ہی اسے چومتے ہیں اور پیشانی پر لگاتے ہیں کہ اسے نسبت پیدا ہو گئی۔ ان بچوں کو آپ ہی نے پڑھایا ہے اور پگڑی بھی آپ ہی نے دی۔ لیکن آپ کے لئے ان کی قدر کرنی واجب ہو گئی۔ چونکہ نسبت پیدا ہو گئی۔ اس لئے آپ کو بھی علم کے آگے جھکنا پڑے گا۔

آپ اگر کسی عالم کے آگے جھکتے ہیں تو اس کے گوشت پوست کی وجہ سے نہیں۔ جیسا گوشت پوست اس میں ہے آپ میں بھی ہے، اس علم کی وجہ سے جھکتے ہیں جو اس کے اندر ہے۔ تو یہی علم ان طلباء میں بھی ہے جس حد تک بھی اللہ نے ان کو علم دیا ہے اور قابلیت دی ہے، وہ ایسی ہے کہ آپ پر تعظیم کرنا واجب ہے۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ ایک باپ بے پڑھا لکھا ہے۔ اس نے بچے کو پڑھا دیا۔ جب اسٹیج بنے گا، اسٹیج پر بچہ بیٹھے گا اور باپ نیچے۔ وہ علم ہی ہے جس نے اسے اونچا بنا دیا اور جس کے پاس علم نہیں وہ نیچا رہ گیا۔ کیونکہ علم خود ذاتی طور پر رفعت کی چیز ہے وہ اللہ کی صفت ہے۔ علم کبھی نیچا ہو کے نہیں رہتا۔ اس لئے عالم کبھی نیچا ہو کے نہیں رہے گا اگر واقع میں عالم ہے۔ علم میں طبعی طور پر ترفع اور بلندی کی شان ہے۔

طریق منزل مقصود...... مگر اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی میں کہیں تکبر نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے اس کا بدرقہ عبدیت ہے کہ علم کے ساتھ جب تک عبدیت جمع نہیں ہوگی تو تکبر اور نخوت اس سے الگ نہیں ہو سکتا اور عبدیت یہ ہے کہ کسی مرد کامل کے سامنے آدمی پامال بنے ؎

قال را بگذار، مرد حال شو ۔۔۔ پیش مرد کاملے پامال شو

تو عالم اگر کسی کے سامنے جھک کر اپنے اخلاق کی اصلاح نہ کرائے تو علم اس کے لئے اور زیادہ تباہی اور وبال کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے وہ تکبر و نخوت پیدا کرے گا۔ لڑائی جھگڑے پیدا کرے گا۔ جو عالم تربیت یافتہ نہیں ہوگا، اخلاق صحیح نہیں ہوں گے۔ عموماً فسادات اور جھگڑے کا باعث بنے گا۔ جب تک اپنے اخلاق کو پامال کر کے ان کو بلند نہ کر لے، حرص کی بجائے قناعت نہ ہو، کبر کی بجائے تواضع نہ ہو، بخل کے بجائے سخاوت نہ ہو۔ غرض جب تک اخلاق فاضلہ نہ جمع ہوں علم کی قدر نہیں کھل سکتی نہ علم کام دے سکتا ہے جب تک اخلاق صحیح نہ ہوں۔ تو محض علم سے آدمی منزل مقصود پر نہیں پہنچتا۔

اس لئے مدارس میں دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے ایک تعلیم کی جس سے علم پہنچے اور ایک تربیت کی جس سے اخلاق درست ہوں۔ اگر تعلیم محض رہ گئی۔ علم آ جائے گا، اخلاق نہیں آئیں گے وہ وبال جان بن جائے گا۔ اگر اخلاق درست ہو گئے علم نہ آیا تو جاہلانہ افعال سرزد ہوں گے۔ اس سے منکرات و بدعات سرزد ہوں گی، دونوں صورتیں تباہی کی ہیں۔ تو علم اور اخلاق جب تک جمع نہ ہوں کام چلنے والا نہیں ہے۔ صاحب ہدایہ نے اپنے مقدمہ میں کچھ اشعار لکھے ہیں اس میں لکھتے ہیں کہ ؎

فَسَادٌ کَبِیْرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّکٌ ۔۔۔ وَاَکْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّکٌ

هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعَالَمِیْنَ کَبِیْرَةٌ ۔۔۔ لِمَنْ بِهِمَا فِيْ دِیْنِهٖ یَتَمَسَّکُ

''وہ عالم دنیا میں فساد کبیر ہے جو دوسروں کی ہتک چاہے۔ کبر و نخوت میں بھرا ہوا ہو دوسروں کی تحقیر و تذلیل کے در پے ہو۔ وہ عالم میں عظیم فساد ہے اور اس سے بھی زیادہ فساد ہے اس عابد میں جو جہالت کے ساتھ عبادت

کررہا ہے۔ وہ رات دن بدعات ومنکرات میں مبتلا ہوگا۔"

گویا امت کے فساد کے دو دھڑے ہیں۔ ایک جاہل مولوی ایک جاہل صوفی ایک وہ عالم ہے کہ علم ہے مگر اخلاق نہیں۔ ایک وہ عابد کہ عبادت ہے مگر علم نہیں۔ دونوں چیزیں جمع ہوں جب جا کے وہ مصلح ثابت ہوگا۔ تو کہتے ہیں۔

هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعَالَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ　　لِمَنْ بِهِمَا فِيْ دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكُ

"یہ دونوں قسم کے لوگ دنیا کے لئے فتنہ ہیں جو بھی دین کے بارے میں ان سے تمسک کرے گا۔ وہ فتنہ میں گرفتار ہوگا"۔ وہ عالم ربانی جس کا علم بھی صحیح، اخلاق بھی صحیح، سیرت بھی پاکیزہ ہو۔ وہ اصلاح کا ذریعہ بنے گا۔ وہ صحیح راستہ دکھلائے گا۔ اسی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

یہ جو ہمارے بچے تیار ہوں گے اس میں اس کی ضرورت ہے کہ ان میں دونوں وصف آ جائیں علم بھی صحیح ہو اور اخلاق بھی ان کے درست ہوں۔ دوران تعلیم میں ہی اخلاق کی درستگی کی تمرین ہو۔ تواضع، انکسار، خدمت، ایثار اور جذبہ خدمت خلق اللہ، یہ جذبات ان کے اندر پیدا کئے جائیں، ابھارے جائیں۔ ان سے ان کی نشو ونما صحیح ہوگی۔ اور فرض کیجئے اس وقت اس میں کوئی کمی رہ گئی، تو بعد میں اسے پورا کر لیجئے۔

علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ سلف کی شان یہ تھی "كَانُوْا يَتَعَلَّمُوْنَ الْهُدٰى كَمَا كَانُوْا يَتَعَلَّمُوْنَ الْعِلْمَ." "سلف کی شان یہ تھی کہ جب آٹھ دس برس میں علم حاصل کر لیتے تھے اس کے بعد عمل سیکھنے کے لئے مستقلاً مشائخ کی خدمت میں رہتے تاکہ اعمال اور اخلاق درست ہوں"۔

ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند میں بھی میری طالب علمی کے زمانے تک تو یہ پابندی رہی کہ طالب علم فارغ التحصیل ہو جاتا تھا، لیکن سند نہیں دی جاتی تھی جب تک جماعت کے کسی بزرگ کے پاس رہ کر ان کا مرید ہو کر اپنے اخلاق کی اصلاح نہ کرا لے، بعد میں ایسا نہ رہا۔ اس لئے خرابی پیدا ہوگئی۔ بہر حال جیسے علم ضروری ہے، اخلاق بھی ضروری ہیں۔

یہ ہمارے بھائی جو پگڑی باندھیں گے وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ آج سے علم میں بھی کامل ہو گئے، اخلاق میں بھی کامل ہو گئے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا ہے، اب آگے چڑھنا ان کا کام ہے۔ تو ہمارے لئے خوشی کا مقام ہے کہ ہم نے پہلی سیڑھی پر انہیں چڑھا دیا۔

بس یہ چند باتیں جلسہ دستار بندی کے سلسلہ میں ذہن میں آ گئیں اپنے ضعف کی وجہ سے میں کوئی خاص ترتیب سے کچھ زیادہ بول نہیں سکا۔ بہر حال جیسے کھانے کے بارے میں اصول ہے کہ "خَيْرُ الطَّعَامِ مَا حَضَرَ." "بہترین کھانا وہ ہے جو حاضر ہو" آدمی مہمان کے سامنے رکھ دے۔ تو یہاں بھی خَيْرُ الْكَلَامِ مَا حَضَرَ جو دل میں آ گیا، وہ پیش کر دیا۔ اسے قبول کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ مدرسہ کو بھی قائم و دائم رکھے۔ مدرسہ کے سارے اساتذہ

شعب الایمان

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ:...... فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً اَعْلٰهَا قَوْلُ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَدْنٰهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ. وَالْحَيَآءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ. اَوْ كَمَاقَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ.

احوالِ واقعی ...... بزرگانِ محترم! جیسا کہ آپ کے علم میں آیا ہے کہ قریب ہی میں میری آنکھ کا آپریشن ہوا اس کی وجہ سے کچھ ضعف بھی لاحق ہوا جس کا اثر اب تک موجود ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت تو یہ تھی کہ میں کم سے کم تین چار ماہ، مئی، جون تک زور سے بھی نہ بولوں اور تقریر بھی نہ کروں۔ لیکن یہاں ایک ایک کر کے اس ہدایت کی خلاف ورزی ہوئی۔ زور سے بھی بولنا پڑا اور تقریریں بھی کرنی پڑیں اور ایسی صورت بن جاتی ہے کہ بولنے کی مجبوری پیش آتی ہے تاہم جتنا اپنے بس میں ہوتا ہے میں احتیاط بھی کرتا ہوں۔ اس لئے یہ گذارش ہے کہ شاید میں زیادہ دیر تک نہ بول سکوں۔ جتنا بھی آسانی سے بن پڑے گا، اسی قدر چند لمحات آپ حضرات کے لوں گا اور اس حدیث کے بارے میں چند کلمات گذارش کروں گا۔

ترجمۂ حدیث ...... یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ پہلے اس کا ترجمہ سن لیجئے۔ اس کے بعد اس کی تھوڑی تفسیر اور تشریح۔ ترجمہ یہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے اور شاخیں ہیں جن میں سے اعلیٰ ترین شعبہ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا اور پڑھنا۔ اور ادنیٰ شعبہ راستے سے ایذا دہ چیزوں کا ہٹا دینا، تکلیف دہ چیزوں کا دور کر دینا ہے تا کہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور فرمایا حیاء ایمان کا ایک بہت بڑا شعبہ ہے۔ یہ حدیث کا تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔

اس میں ایمان کے شعبے اور اس کی شاخیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلے اس کی ضرورت ہے کہ خود ایمان کی حقیقت سامنے آئے تا کہ اس کے شعبوں کو اور اس کی شاخوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

ایمان کی دو بنیادیں......ایمان کی دو بنیادیں ہیں، ایک "اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ" اور ایک "اَلشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ" اللہ کے اوامر اور اس کے قانون کی عظمت و تعظیم کرنا اور دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت کرنا اور اس کی خدمت کرنا یہ ایمان کے اجزاء یا اس کے دو بنیادی شعبے ہیں۔ ایک کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف دوڑے، اسی کی طرف جانے کی کوشش کرے، اس کی عظمت و تعظیم کے حقوق بجالائے۔ دوسرے کا حاصل یہ ہے کہ اس کی مخلوق کی خدمت کا حق بجالائے۔ اگر ایک شخص اللہ کی طرف دوڑتا ہے لیکن مخلوق کو ستاتا اور ایذارسانی کرتا ہے۔ اس شخص کو ضعیف الایمان کہا جائے گا۔ اس کا ایمان کمزور، ناقص ہے۔ ایک طرف دوسرا شخص ہے جو دن رات قومی خدمات میں لگا ہوا ہے، ہر وقت کا اوڑھنا اور بچھونا قوم کی خدمت ہے۔ لیکن اللہ کی طرف رجوع نہیں ہے۔ نہ عبادت ہے نہ اطاعت ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ ضعیف الایمان اور ناقص الایمان ہے۔ کامل الایمان وہی شخص سمجھا جائے گا کہ ایک طرف اللہ کی طرف جھکا ہوا ہو اور دوسری جانب مخلوق کی طرف رجوع کئے ہوئے ہو جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان ہے کہ ہمہ وقت رجوع الی اللہ بھی ہے اور ہمہ وقت خدمت مخلوق اللہ بھی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک فرمائی گئی کہ "كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ" ① "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یاد خداوندی سے فارغ نہیں تھا"۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے حتی کہ گھر میں رہتے ہوئے، بیویوں کے پاس جاتے ہوئے بھی کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا کہ ذکر اللہ آپ سے صادر نہ ہوا ہو۔ زبان مبارک، قلب مبارک اور عمل مبارک سے۔ غرض یاد خداوندی ہر وقت ہر لمحے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کی تربیت و تعلیم، ان کی راہنمائی و ہدایت سے کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری عمر شریف رجوع الی اللہ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اللہ کی طرف رجوع کرنا مخلوق کی خدمت سے غافل نہیں بناتا۔ اسی طرح ہر آں مخلوق کی خدمت میں منہمک ہیں اور یہ خدمت رجوع الی اللہ سے غافل نہیں کرسکتی تھی۔ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی تھی۔

اللہ نے اپنے قانون کو حجت و برہان اور بصیرت سے منوایا ہے...... "اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ" "اللہ کے اوامر کی تعظیم کرنا"۔ یہ ایمان کا جزاول تھا مگر یہ قدرتی بات ہے کہ کسی قانون کی عظمت تب ہوتی ہے جب قانون ساز کی عظمت دل میں ہو۔ اگر قانون بنانے والا یا قانون چلانے والا، اس کی دل میں کوئی عظمت نہ ہو بلکہ اس کی حقارت دل میں بیٹھی ہوئی ہو، تو قانون کی عظمت بھی دل میں نہیں ہوسکتی۔ اگر قانون بنانے والے کی عظمت دل میں نہ ہو تو پھر قانون دباؤ اور مجبوری کا رہ جاتا ہے۔ دلی شغف کے ساتھ آدمی قانون پر نہیں چل سکتا۔

شریعت اسلام کے قانون کو اللہ نے اس طرح نہیں بھیجا کہ دباؤ ڈال کر منوایا ہو۔ پہلے مالک سے محبت پیدا کی گئی ہے۔ اس محبت کے ذیل میں قانون سے خود بخود محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی قانون شریعت پر اپنے دل کی

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب هل يتتبع المؤذن فاه ههنا وههنا...... ج:٣ ص:١٠.

محبت، رضا اور شغف سے چلتا ہے دباؤ سے نہیں چلتا۔ یہ نہیں ہوا کہ تلوار کا دباؤ ڈالا اور مجبور و مقہور کر دیا ہو۔ بلکہ حجتیں پیش کیں کہ دلائل سے سمجھو، بصیرت سے سمجھو۔ جب شرح صدر ہو جائے قبول کرو، ورنہ چھوڑ دو۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی شان فرمائی گئی، ﴿اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾ ① ”جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پیش کی جاتی تھیں، تو وہ اندھوں اور بہروں کی طرح نہیں گرتے تھے بلکہ بینا و شنوا ہو کر سوچ سمجھ کر بصیرت کے ساتھ قبول کرتے تھے“۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی ﴿عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ، وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ② ”میں اور میرا اتباع کرنے والے اس دین پر بصیرت اور شرح صدر کے ساتھ قائم ہیں“۔ کسی دباؤ یا مجبوری سے نہیں بلکہ دل کی لگن سے قائم ہیں تو شریعت اسلام نے بصیرت پیدا کرنی چاہی ہے۔ قران کریم نے جہاں جہاں اللہ کا وجود اس کی توحید اس کی صفات، منوائی ہیں۔ وہاں دلائل دیئے ہیں۔ انفسی دلائل بھی، آفاقی دلائل بھی۔ کہ اپنے نفسوں میں غور کرو تو تمہیں اللہ کے وجود کی حجتیں ملیں گی۔ کائنات میں غور کرو تو اس کے وجود اور اس کی یکتائی کے دلائل ملیں گے کہیں پہاڑوں کو، کہیں دریاؤں کو، کہیں ہواؤں کے لوٹ پھیر کو پیش کیا کہیں سورج کی حرکت کو پیش کیا کہ ان تمام تغیرات کو دیکھو۔ سورج کتنا بڑا عظیم کرہ ہے۔ آج کل کے فلاسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ زمین سے سورج گیارہ کروڑ گنا بڑا ہے۔ گویا سورج میں سے گیارہ کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں۔ اتنا بڑا سیارہ اور چوبیس گھنٹوں میں لاکھوں میل کی حرکت کرتا ہے تو اتنا بڑا کرہ اور غلاموں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے۔ اس کے اوپر کوئی بڑی طاقت ہے اس نے اسے چکر میں ڈال رکھا ہے۔ اس لئے سورج کو دیکھ کر اس کی ذات عالی کو پہچانو۔

اگر زمین حرکت کر رہی ہے جیسا کہ آج کے فلاسفہ کا دعویٰ ہے۔ تو یہ عظیم کرہ جس میں اربوں کھربوں مخلوق آباد ہے اس کو کس نے چکر میں ڈال رکھا ہے؟ کس نے گھما رکھا ہے؟ ﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ﴾ ③ ”سورج کی یہ مجال نہیں کہ چاند کو جا پکڑے، رات کی یہ مجال نہیں ہے کہ دن کو نہ آنے دے، خود چھا جائے“۔ اپنے وقت پر دن، اپنے وقت پر رات بھی آ رہی ہے۔ یہ محکم نظام کسی نابینا کا قائم کیا ہوا نہیں بلکہ دانا اور بینا کا قائم کیا ہوا ہے۔ ایسے دانا اور حکمت والے کا قائم کیا ہوا ہے جس کی حکمت لامحدود ہے، جس کے کمالات لامحدود ہیں۔ موسم اپنے اپنے وقت پر آ رہے ہیں۔ گرمی اپنے وقت پر آتی ہے۔ ایک سیکنڈ نہیں رک سکتی، سردی، برسات اپنے اپنے وقت پر آتی ہے۔

سبزیوں کا جو نظام بنا دیا ہے اسی وقت پر بیج زمین سے اپنا سر نکالتا ہے۔ تناور درخت بنتا ہے۔ درخت کی جو بنیاد اور عمر ہے وہ مقرر اور لکھی ہوئی ہے اتنا پاکیزہ اور اتنا اعلیٰ ترین محکم نظام بغیر کسی حکمت والے کے ممکن نہیں ہے۔ غرض قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کے وجود اور یکتائی کو منوایا، وہاں یہ نہیں کہا کہ تم مجبور ہو، ماننا پڑے گا ورنہ

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔ ③ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۴۰۔

جہنم میں جاؤ گے بلکہ دلائل وحجتیں پیش کیں کہ ان کو سوچو اور سمجھو۔

عقل وبصیرت کے ساتھ کیئے ہوئے عمل سے ہی درجات بلند ہوتے ہیں...... عقل کی فضیلتیں الگ بیان کیں۔ حدیث میں ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یارسول اللہ! دو شخص یکساں قسم کا عمل کریں۔ اتنی ہی نمازیں وہ پڑھتا ہے، اتنی یہ اتنا ہی ذکر وہ کررہا ہے۔ اتنا ہی یہ لیکن روز قیامت ایک کے درجات زیادہ بلند ہوں گے، ایک نیچے رہ جائے گا حالانکہ عمل کی تعداد دونوں کی برابر ہے۔ فرق کی وجہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرق کی وجہ عقل ہے جو عقل اور بصیرت سے عمل کرتا ہے اس کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔ جو بے بصیرتی سے عمل کرتا ہے وہ نجات پالے گا لیکن اس کے لئے درجات کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوگا۔ تو عقل کو (بلندی درجات کے لئے) معیار قرار دیا۔ اسی کو فرمایا: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ① ”آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں، رات اور دن کے لوٹنے پھیرنے میں قدرت کی آیات اور نشانیاں ہیں مگر کن کے لئے؟ عقل والوں کیلئے جو تدبر کے ساتھ غور وفکر کرتے ہیں“۔ جو صرف پیشانی کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں، ان کے لئے کوئی نشانی نہیں ہے۔ جو پیشانی کی آنکھ سے دیکھنے کے بعد دل کی آنکھ سے بھی دیکھیں اور تدبر کریں، ان کے سامنے اللہ کی قدرت کی نشانیاں کھلیں گی۔

شریعت اسلامی کی نظر میں عقل مند کون ہیں؟...... اور عقلمند کون ہیں؟ آگے ان کی تفصیل فرمائی: ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ② ”عقل مند وہ ہیں جو اٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے اللہ کے ذکر میں منہمک ہیں اور ہر وقت تخلیق اور کمالات میں فکر کرتے رہتے ہیں“ تو دل میں ذکر اور فکر دونوں ہوں وہ عقلمند ہیں۔ فقط ذاکر کو بھی عقل مند نہیں کہا گیا، فقط متفکر کو بھی عقل مند نہیں کہا گیا۔ اگر محض فکر ہی فکر ہے ذکر اللہ نہیں تو وہ فلسفی ہے اور اگر محض ذکر ہی ہے فکر نہیں ہے تو وہ متقشف اور جامد ہے۔ دونوں چیزیں جمع ہوں کہ ذاکر بھی اور متفکر بھی تو اس کو شریعت کی اصطلاح میں عقلمند کہا گیا ہے۔ اسی پر اللہ کی قدرت کی نشانیاں کھلتی ہیں۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے کوئی دباؤ ڈال کر نہیں منوایا چونکہ اللہ کا حکم ہے۔ لہٰذا مانو۔ حالانکہ یہ فرمانے کا حق تھا کہ اللہ کا حکم آ گیا ہے تو ماننا پڑے گا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے وجود کو دلائل سے سمجھو، اس کے قانون کو بھی بصیرت سے سمجھو، سوچ سمجھ کر قبول کرو۔ اندھوں، بہروں کی طرح سے قبول نہ کرو۔ عقل کو آزاد چھوڑا ہے کہ وہ فکر کرے۔ شریعت اسلام نے جمود نہیں بتلایا حاصل اس کا یہ نکلا کہ کوئی دباؤ ڈالنا مقصود نہیں ہے بلکہ ذکر اور فکر کرانا مقصود ہے۔

مدار نجات اللہ کا فضل ہے...... اور زیادہ ذکر کون کرتا ہے؟ ”مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ“، ”جس شخص کو جس سے محبت ہوتی ہے اس چیز کو کثرت سے یاد کرتا ہے“ اللہ سے جب محبت ہوگی اس کی یاد بھی بڑھے گی۔ اس کی

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۰۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۱۔

فکر بھی بڑھے گی۔ رات دن غور بھی کرے گا۔ تو اصل چیز محبت نکل آتی ہے۔ یعنی دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت پیدا کرو پھر ان کے قانون کی محبت بھی ہوگی ان کے قوانین کی عظمت بھی ہوگی اور اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ جو ایمان کا ایک بڑا جز ہے وہ ثابت ہو جائے گا۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کے اوامر کی تعظیم ہو اور اوامر کی عظمت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک دل میں اللہ کی عظمت نہ بھری ہوئی ہو۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: میدان حشر میں بعض لوگ ایسے بھی آئیں گے جو بے شمار گناہوں کا بار اپنے سر پہ لئے ہوں گے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ان لوگوں کے لئے فرماتے ہیں کہ ”اے بندے! اگر تو میرے سامنے اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں۔ تو اتنی بڑی مغفرت لے کر میں تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر ہو۔ تو میری بڑائی کو مانتا ہو“۔

بڑائی اور عظمت خداوندی وہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اگر اتفاقاً و احیاناً گناہ بھی سرزد ہو جائے۔ فرماتے ہیں، پرواہ مت کرو سچی توبہ کرلو اور اگر خدانخواستہ توبہ بھی نہ ہوئی، اس کے لئے فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ”نیکیاں خود بدیوں کو مٹا دیں گی“ عمل صالح اور نیکی کے اندر لگے رہو۔ تو عمل صالح میں لگایا گیا تاکہ بدیاں بھی مٹ جائیں اور اگر اس کے باوجود بھی بدیاں سرزد ہوں تو دل کے اندر حق تعالیٰ کی عظمت ضرور رکھو۔

اس کا یہ مطلب نہ سمجھو کہ آج سے آدمی بدیوں پر جری ہو جائے کہ جی! بس میں دل کے اندر عظمت و محبت رکھتا ہوں۔ لہٰذا اب میں آزاد ہوں، میں جو چاہوں کروں۔ میں کہتا ہوں، جو بدی کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قلب کے اندر محبت کی کمی ہے۔ پوری محبت ہے ہی نہیں۔ جس کے قلب میں محبت رچی ہوئی ہوگی وہ بدی سے خود بخود بچے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ: جو بھی بندہ بخشا جائے گا وہ درحقیقت اپنے عمل سے نہیں، اللہ کے فضل سے بخشا جائے گا۔ جب تک فضل متوجہ نہ ہو، بخشش کی کوئی صورت نہیں ہے خواہ کتنی بڑی نیکیاں ہوں۔

اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ”وَلَا اَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ!“ یارسول اللہ کیا آپ کی نجات بھی اللہ ہی کے فضل سے ہوں؟ فرمایا کہ ”میری نجات بھی اللہ ہی کے فضل سے ہوگی“ اگر فضل متوجہ نہ ہو تو میری بھی نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ”اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ“ ① جب تک اللہ ہی اپنی رحمت اور فضل نہ کرے۔ اس کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔

عمل بھی ضروری ہے۔ یہ بھی آپ نہ سمجھئے کہ بس فضل کے اوپر آدمی بیٹھا رہے اور یوں کہے کہ فضل ہوگا، نجات ہو جائے گی۔ پھر عمل کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں کہتا ہوں عمل کرنا، اس کی دلیل ہے کہ فضل متوجہ ہو چکا۔

① الصحیح لمسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب لن یدخل الجنة احد بعمله...... ج:۴ ص: ۱۲۷۱.

اگر عمل نہیں کر رہا تو اس کے معنی ہیں کہ اس کے اوپر فضل نہیں ہو رہا۔ عمل فضل کی علامت ہے کوئی بیکار چیز نہیں ہے۔ بہر حال عمل کرا دینا اور عمل قبول کر لینا یہ بھی فضل کی دلیل ہے، اس عمل پر نجات کا ثمرہ مرتب کرنا یہ بھی فضل کی دلیل ہے۔ اول سے آخر تک فضل خداوندی سے کام چلے گا۔ محض ہمارے اعمال کہ ہم اس پر غرہ (فخر) کریں، یہ اس درجے کے نہیں ہیں جو ہمیں نجات دلا سکیں۔ جب تک کہ اللہ کا فضل متوجہ نہ ہو۔

اسلام میں اعترافِ عجز روحِ عبادت ہے...... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی عمل کتنا ہی کرے۔ اللہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس واسطے کہ انعامات لامحدود ہیں۔ اور ہمارے عمل محدود ہوگا۔ ہم خود ہماری طاقت، ہمارا دماغ، عقل وقوت بھی محدود ہے، عمل جتنا کریں گے وہ ایک حد کے اندر ہوگا اور اللہ کی رحمتوں کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے۔ بارش کی طرح سے ہر ہر آن رحمتیں برس رہی ہیں۔ ان رحمتوں کا حق ادا کرنا حقیقت میں بس کی بات ہے بھی نہیں، ناممکن ہے۔ بس یہی صورت ہے کہ عمل کر کے آدمی یوں کہے، اے اللہ! مجھ سے کچھ نہیں بن پڑا۔ یہ اپنے عجز کا اعتراف کر لینا یہی حق کی ادائیگی ہے ورنہ حقیقی معنی میں اللہ کے حق کو کون ادا کر سکتا ہے؟ حضرات داؤد علیہ السلام کو فرمایا گیا ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ①

اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو سب سے زیادہ سمجھنے والے حضرات انبیاء علیہم السلام ہی ہوتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! جب شکر کرنے کا آپ کا حکم ہے۔ تو میرا فرض ہے اور میں شکر ادا کروں گا۔ مگر میں حیران ہوں کہ ادا کروں تو کس طرح سے کروں؟ اس لئے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، اس شکر کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو یہ توفیق خود ایک نعمت ہوگئی۔ اس پر مجھے شکر ادا کرنا چاہئے اور جب اس پر شکر ادا کروں گا تو اس شکر کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت اور آ گئی، تو پھر اس پر شکر ادا کرنا چاہئے۔ گویا ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں شکر کی ابتداء کیسے کروں؟ شکر کو انجام کیسے دوں؟ سوائے اس کے کہ اپنے عجز کا اعتراف کروں کہ میں آپ کے شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں۔

حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا ''اے داؤد! تم نے اگر یہ سمجھ لیا کہ تم ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے کہ اپنی ہار مان لو اور اپنے عجز کو تسلیم کر لو۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الشاکرین ہیں کہ آپ سے بڑھ کر اللہ کا کوئی بندہ شکر گزار نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ ''اَللّٰهُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ'' اے اللہ! میرے بس میں نہیں ہے کہ تیری ثناء اور صفت بیان کر سکوں اور تیرا شکر ادا کر سکوں۔ ''اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ'' ② ''بس اس سے سوا کیا کہوں۔ تو ویسا ہی ہے جیسے تو نے خود تعریف کی ہے''۔ میری تعریف سے تو بالاتر ہے۔ میرے قبضے میں نہیں ہے کہ تیری تعریف

① پارہ: ۲۲، سورة السبأ، الآية: ۱۳۔ ② المصنف لابن ابی شیبة، کتاب الصلوة، باب مایقول الرجل فی آخر الوتر...... ج: ۲ ص: ۹۹ رقم: ۲۹۴۳۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۴ ص: ۳۹۵۔

کرسکوں۔اس عجز کے اعتراف کو بھی حق تعالیٰ نے شکر قرار دیا ہے کہ یہی میرا شکر ہے۔اس لئے کہ حق ادا کرنا بندے کے قبضے میں نہیں ہے تو اعمال بھی ہمارے ناقص اور نکمے شکر کی ادائیگی سے بھی ہم عاجز پھر سوائے اعتراف عجز کے اور کیا صورت ہے؟اس کا نام اللہ نے شکر اور عبادت رکھ دیا کہ کرو اور کرنے کے بعد کہو کہ ہم سے کچھ نہ ہوسکا۔

ملائکہ علیہم السلام جو ہزار ہا ہزار برس سے عبادت میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں اربوں کھربوں ملائکہ ایسے ہیں کہ جب سے پیدا ہوئے وہ سجدے ہی میں ہیں۔ کچھ رکوع ہی میں ہیں اور بعض تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔حدیث میں فرمایا گیا کہ: ساتویں آسمان پر ملائکہ کا قبلہ ہے،جس کو بیت المعمور کہتے ہیں۔روزانہ ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں اور فرمایا جو ستر ہزار آج طواف کریں گے،اب ابدالآباد تک انہیں پھر نوبت نہیں آئے گی۔ اگلے دن پھر نئے ستر ہزار اور پھر نئے۔تو کروڑوں،کھربوں ملائکہ ہیں جو طواف میں مشغول ہیں۔اسی طرح اربوں کھربوں ہیں جو صف بندی کئے ہوئے تسبیح و تہلیل میں ہیں اتنی لاکھوں برس کی عبادت کے بعد ملائکہ قیامت کے دن عرض کریں گے:''مَاعَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ'' ① ''اے اللہ!ہم نہ تیری عبادت کا حق ادا کرسکے،نہ ہم تیری معرفت پوری کرسکے۔تو ہماری عبادتوں سے بالاتر ہے۔''

یہ ان کا اعتراف عجز یہی حقیقت میں ان کی عبادت ہے تو عبادت گزار کا کام یہ ہے کہ اپنے عجز کا اعتراف کرے کہ مجھ سے کچھ نہیں بن سکا۔یہ تواضع وانکسار اور یہ کسر نفس یہی اسلام میں عبادت کی روح ہے۔اسی سے انسان کی مقبولیت بڑھتی ہے۔

بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قانون خداوندی کی عظمت نہیں ہوسکتی جب تک اللہ کی عظمت دل کے اندر نہ ہو اور اس عظمت کا تقاضا یہی ہوگا کہ ہمہ وقت زبان سے،قلب سے،دماغ سے اور اعضاء و جوارح سے بھی اطاعت و عبادت میں مشغول رہیں۔ہر اعتبار سے ہم شکر گزار بنے رہیں۔

اور شکر گزاری یا عظمت کا اعتراف فقط زبان سے نہیں ہوتا،دل سے بھی ہوتا ہے۔روح سے بھی اور عمل سے بھی ہوتا ہے۔جتنا اطاعت کا عمل بڑھے گا تو عملی شکر بڑھے گا،جتنا زبان سے اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہیں گے۔یہ اظہار عظمت کا شکر ہوگا،جتنا دماغ میں سوچیں گے کہ اللہ سب سے بڑی ذات ہے۔یہ اس کی عظمت کا دماغ اعتراف کررہا ہے۔عقل سے جتنے دلائل اس کی عظمت کے قائم کریں گے یہ عقل کا اعتراف عظمت ہے کہ وہ بھی مانتی ہے۔عظمت والی ذات وہ ہے۔جتنی آپ کے وجدان اور ضمیر میں عظمت بیٹھے گی۔یہ قلب کا اعتراف ہے کہ وہ عظمت کو ظاہر کررہا ہے تو رگ و پے سے عظمت کا اعتراف ہونا چاہئے۔وجدان،ارکان،زبان ولسان الغرض ہر اعتبار سے اس کی عظمتوں کا اعتراف چاہئے،جتنا شکر ادا کیا جائے گا،اتنی عظمت نمایاں ہوگی اور پھر بھی یہ کہہ دینا چاہئے کہ ہم حق ادا نہیں کرسکے۔

بہر حال اس عظمت کے بعد اب فرماتے ہیں کہ: جب تم اس مقام عظمت پر آجاؤ گے،اگر تم سے گناہ بھی

① المستدرک علی الصحیحین للامام الحاکم ومن مناقب امیر المؤمنین عمر بن الخطاب،ج:۳ ص:۹۳ رقم: ۴۵۰۲.

سرزد ہوں گے تو پرواہ مت کرو۔ میں اتنی بڑی بخشش لے کر تم سے ملاقات کروں گا اس لئے اگر عظمت ہے تو بندہ تو خطا ونسیان سے مرکب ہے یہ غلطی کرے گا آخر بشریت ہے۔ معصوم صرف انبیاء علیہم السلام بنائے گئے ہیں اور محفوظ اولیاء اللہ ہی بنائے گئے ہیں۔

ہم اور آپ تو رات دن گناہوں میں غرقاب ہیں۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہو اور وہ بغیر عظمت کے متوجہ نہیں ہوتا اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس لئے عظمت کا اعتراف دل میں ہوگا، تو قانون خداوندی کی عظمت بھی دل میں ہوگی اور جب اس کے قانون کی عظمت دل میں بیٹھے گی تو عمل درآمد دل کے لگاؤ سے ہوگا۔ خواہ وہ دیانات ہوں، خواہ وہ عبادات ہوں، خواہ وہ معاشرت ہو، انفرادی و جماعتی زندگی ہو، شہری زندگی ہو۔ جب قانون کی عظمت ہوگی تو آدمی بغیر قانون کس طرح نہیں چلے گا؟ ضرور چلے گا۔ ہر آن اس کی اس پر توجہ رہے گی کہ اس بارے میں میرے پروردگار کا کیا حکم ہے جو میں اس پر چلوں اور کس طریق پر عمل درآمد کروں۔

عظمت و محبت خداوندی ہی ایمان کی بنیاد ہے...... بہرحال پہلی بنیاد ’’اَلتَّعۡظِیۡمُ لِاَمۡرِ اللّٰہِ‘‘ ہے۔ یہ ایمان کا پہلا رکن ہے۔ اگر عظمت نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔ پھر عظمت کے بھی درجات ہیں۔ ایک درجہ عظمت کا وہ ہے جو عوام مومنین کے دل میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو اولیاء عظام اور علماء ربانیین کے دل میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو ائمہ کرام کے دلوں میں ہوتا ہے۔ ایک وہ ہے جو صحابہ کرامؓ کے قلوب میں تھا۔ ایک وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں تھا۔ اسی طرح ایمانوں میں بھی فرق ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا ایمان سب سے اعظم ترین ایمان ہے۔ صحابہ کرامؓ کا ایمان اس کے بعد تابعین کا اس کے بعد ہم جیسے عوام کا ایمان سب سے آخر کا درجہ ہے۔ تو جیسے درجات عظمت کے ہیں۔ ویسے ہی درجات ایمان کے بھی ہیں۔ بہرحال جب نفس عظمت میں شرکت ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ قانون کی عظمت بھی ہوگی۔ جب عظمت ہوگی، پھر محبت بھی ہوگی، محبت ہوگی تو آدمی کے دل میں قانون پر عمل درآمد کرنے کی لگن پیدا ہو جائے گی۔

یہی محبت تھی جس نے حضرات صحابہ کرامؓ کو مجبور کیا کہ گھربار انہوں نے چھوڑا، جائیدادیں انہوں نے ترک کیں، وطن چھوڑ کر بے وطن ہوئے۔ اپنی لذتیں ترک کیں، اپنا آرام و آسائش تج دیا۔ کس لئے؟ محض محبت نبوی اور عظمت خداوندی کی وجہ سے جب محبت دل میں بیٹھ گئی تو ہر چیز ان کے سامنے ہیچ بن گئی۔ تو ہجرت کر کے وطن چھوڑ کر کے اللہ کے رسول کے ساتھ آ گئے۔ جانیں الگ قربان کیں، مال الگ چھوڑا اولاد کو، عزیزوں کو، رشتہ داروں کو الگ چھوڑا، اگر محبت و عظمت نہ ہوتی، یہ اتنے بڑے بڑے کام ان سے سرزد نہیں ہو سکتے تھے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایات میں فرمایا گیا ہے کہ: جب غزوہ بدر ہوا تو حضرت صدیق اکبرؓ کے چھوٹے صاحب زادے اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے وہ کفار کے لشکر میں مسلمانوں کے مدمقابل تھے غزوہ بدر کے بعد ایمان کی توفیق ہوئی اور ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد ایک دفعہ اپنے

والد صدیق اکبرؓ سے کہنے لگے کہ: ''اے میرے والد! جنگ بدر کے اندر کئی دفعہ ایسا موقع آیا کہ آپ میری زد کے نیچے تھے اگر میں تیر چلاتا یا تلوار سے آگے بڑھ کر مقابلہ کرتا، میں آپ کو ختم کر سکتا تھا، مگر میں نے یہ خیال کیا کہ یہ میرے باپ ہیں۔ میرے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ یہ میرے ہاتھ سے قتل ہوں۔ اس لئے میں باپ ہونے کی عظمت کی وجہ سے رک جاتا تھا''۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے میرے بیٹے! اگر تو میری زد پر آجاتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا پھر میں دوسروں کی طرف بڑھتا اس لئے کہ جب دل میں اللہ کی محبت آگئی تو پھر کسی دوسرے کی محبت کی سمائی کا دل میں کیا سوال، پھر کہاں کی اولاد اور کہاں کی بنیاد؟ جب میں اللہ کے لئے کھڑا ہوا تو میں پہلے اس کو دیکھتا جو دشمن خدا ہے اور میرا عزیز بھی ہے تاکہ میں اپنی عزیز داری کو حق تعالیٰ کی دشمنی سے پاک کردوں۔ میں پہلے تجھے قتل کرتا''۔ اولاد کے حق میں یہ جذبہ پیدا ہو جانا، ظاہر بات ہے کہ عظمت و محبت خداوندی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس درجہ کی محبت رچ بس گئی تھی کہ اصول و فروع کی محبت ہی نہ رہی تھی۔

اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ'' ① ''کوئی بھی تم میں سے اس وقت تک کامل الایمان مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی محبت اپنی اولاد ماں باپ سے نہ ہو جب تک اتنی محبت غالب نہیں آجائے گی اس وقت تک مت سمجھو کہ تم میں کمال ایمان پیدا ہو گیا''۔ ظاہر بات ہے کہ ایمان کی بنیاد محبت نکل آتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ایمان متحقق نہیں ہو سکتا۔

ایک محبت تو طبعی ہے جو اولاد کے ساتھ ہوتی ہے اور اولاد کو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتی ہے اور ایک محبت عقلی ہے۔ ایمان عقلی محبت کا نام ہے طبعی محبت کا نام نہیں ہے۔ طبعی طور پر آدمی اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتا ہے لیکن عقلاً یہ سمجھتا ہے کہ زیادہ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ محبوب حقیقی حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ اس واسطے جب اللہ کے حکم اور اولاد کا مقابلہ پڑتا ہے وہ اولاد کو دھکا دے دیتا ہے اور حکم خداوندی کو آگے رکھتا ہے۔ یہ عقلی محبت ہے، محض طبعی جذبہ نہیں ہے تو ایمان عقلی محبت و عظمت کا نام ہے۔ یہ پہلا رکن ہے۔

ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ...... دوسرا رکن یہ ہے کہ: اَلشَّفْقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللهِ جتنا آدمی اللہ کی طرف جھکے اتنا ہی اس کی مخلوق کی خدمت کی طرف متوجہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰهِ مَنْ یُّحْسِنُ اِلٰی عَیَالِهٖ. ② ''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی قید نہیں ہے۔ جتنے بندگان خدا ہیں وہ سب خدا کا کنبہ ہیں۔ اس کی پیدا کی ہوئی چہیتی مخلوق ہے اللہ کو سب سے زیادہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ...... ج: ١ ص: ٦٧ رقم: ٤٤.

② مسند ابی يعلى الموصلی، ثابت البنانی عن انسؓ ج: ٧ ص: ٣٤٠.

محبوب وہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ احسان وسلوک کے ساتھ پیش آئے''۔ وہی اللہ کا سب سے زیادہ چہیتا ہے۔ بہر حال جیسے اللہ کی محبت لازمی ہے، اسی طرح سے فرمایا گیا مخلوق پر شفقت کو لازمی سمجھو۔

اگر مخلوق ستم رسیدہ ہے، مظلوم و بے کس ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے۔ اگر کوئی غیر مسلم بھی مصائب میں پھنس جائے اور مسلم دیکھ رہا ہے کہ وہ مصیبت زدہ ہے تو مسلم کا کام یہ ہے کہ اس کو بھی مصیبت سے نجات دلائے۔ جتنا بھی اس کے بس میں ہے۔ اس کو بھی ظلم وستم اور پریشانی سے چھڑائے بہر حال مخلوق کی خدمت یہ شفقت کے لئے ضروری ہے۔ جب تک مخلوق کی خدمت نہ ہو شفقت نہیں پائی جا سکتی۔

خدمت کے پھر دو درجے ہیں۔ ایک درجہ نفع رسانی کا ہے، ایک درجہ ضرر رسانی سے بچ جانے کا۔ تکلیف نہ پہنچاؤ، نفع چاہے پہنچا سکو یا نہ پہنچا سکو۔ تو ایک درجہ کف الاذیٰ کا ہے یعنی اپنی ایذا رسانی کو روک دو۔ اذیت مت پہنچاؤ اور ایک یہ کہ اس سے آگے بڑھ کر اس کی مخلوق کو نفع اور راحت پہنچاؤ۔ اولین درجہ یہ ہے کہ تم سے کسی مخلوق کو ضرر و اذیت نہ پہنچے، اگر یہ بھی نہ ہو تو سمجھو ایمان نہیں۔ اگر آدمی کسی دوسرے کو تکلیف میں مبتلا دیکھے یا اسے گمان ہوں کہ یہ مبتلا ہو جائے گا۔ آدمی کا فرض ہے کہ اسے متنبہ کر دے، اگر متنبہ بھی نہ کرے آنکھ بند کر کے گزر جائے تو سمجھ لو کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔ ورنہ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرے کو متنبہ کر دے کہ یہ تکلیف کا راستہ ہے اس پر مت جاؤ، اسی واسطے فرمایا گیا: اَدْنٰهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ. ①

''ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹائے'' جس سے کسی کو تکلیف پہنچے کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اٹھا کر راستے کو صاف کر دے۔ اینٹیں پڑی ہوئی ہیں جن سے لوگوں کو ٹھوکریں لگیں گی اٹھا دے تا کہ مخلوق کو اذیت نہ پہنچے۔ یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو فرماتے ہیں کہ: قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: تین قسم کے آدمی ہیں جن پر حق تعالیٰ لعنت کرتے ہیں۔ ایک وہ جو سڑک کے اوپر ایذا دہ چیزیں ڈال دے ایک وہ کہ موارد عامہ میں جہاں لوگ بیٹھتے ہوں، راحت اٹھاتے ہوں، وہاں بول و براز کر کے جگہ کو پراگندہ کرے۔ جیسے کوئی درخت کا سایہ ہے لوگوں کی بیٹھنے اٹھنے کی جگہ ہے وہاں پر آدمی نجاست ڈال دے یا بول براز کرے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس پر ہماری طرف سے لعنت ہے۔ اسی طرح سے کسی ایسی تکلیف کا سامان کر دے کہ مخلوق کو ٹھوکر لگ رہی ہے یا مخلوق کو کانٹے چبھ رہے ہیں جو اس نے پھیلا دیئے ہیں۔ اب لوگ تکلیف میں پڑتے ہیں تو یہ خوش ہوتا ہے۔ گویا اس کی تفریح ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ سمجھو ایسے شخص میں ایمان نہیں ہے۔ وہ حق تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہے۔ تو جہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کی عظمت کرو، وہاں یہ بھی بتلایا گیا کہ مخلوق کی خدمت کرو اور خدمت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کم سے کم اذیت دوسروں کو مت پہنچاؤ۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان و افضلها و ادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵.

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

خیر کی امید نہیں تو کم از کم آدمی بدی نہ پہنچائے۔ دوسرے کے واسطے ایذا زدہ نہ بنے۔ یہ گویا لازمی سمجھا گیا ہے کہ نہ قول سے ایذا پہنچاؤ نہ عمل سے ایذا پہنچاؤ، نہ کسی ہیئت سے ایذا پہنچاؤ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ① لمز بھی مت کرو۔ کسی کو کن آنکھیوں سے آنکھ مار دینا، پھبتی اڑانے کے وقت آدمی آنکھوں سے اشارہ کیا کرتا ہے جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے اس کی مخالفت فرمائی گئی کہ تمہاری آنکھ کو بھی حق نہیں ہے کہ دوسرے کے لئے ایذا رسانی کا سبب بنے ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ برے لقب سے بھی یاد نہ کرو۔ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ: کوئی کسی کو کہے یا کافر، یا فاسق. فرمایا ایمان کے بعد ایسے برے القاب؟ ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ﴾ ② "ایمان کے بعد فسق و فجور مت اختیار کرو" کہ لوگوں کو برے القاب سے یاد کرو یا خطاب کرو۔ بعض لوگ دوسرے کو برے برے القاب سے مخاطب کرتے ہیں، وہ بیچارے شرمندہ ہوتے ہیں۔ اس کی مخالفت فرمائی گئی۔ فرمایا گیا ﴿لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ﴾ ③ "ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر بھی مت کرو۔ پھبتی بھی مت کسو، ایسا مذاق بھی مت کرو کہ دوسرے کے دل کو صدمہ پہنچ جائے تم جو دوسرے کو تمسخر اور اس کی تحقیر کر رہے ہو، تمہیں کیا خبر ہے کہ اللہ کے ہاں وہ زیادہ مقبول ہو اور تمہاری قبولیت اتنی نہ ہو"۔ اس لئے فرمایا تمسخر بھی مت کرو، لمز بھی مت کرو۔ تکلیف دہ ہیئت بھی مت بناؤ۔ جیسے زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ یہ انگلی اگر کسی نے ذرا سی اٹھا دی تو تلوار کھنچ جاتی تھی۔ چڑانے کی انگلی سمجھی جاتی تھی۔ گویا انگلی کا اٹھا دینا گالی دینا تھا۔ اسی واسطے اس انگلی کا نام "سَبَّابَه" تھا۔ یعنی گالم گلوچ کی انگلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام بدلا اور فرمایا اسے "سَبَّاحَه" کہو یعنی اللہ کی پاکی بلند کرنے کی انگلی اور نمازوں میں اس انگلی کو اٹھاؤ جب کلمہ شہادت اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھو۔ تو بجائے سبابہ کے سباحہ اس کا نام رکھا کہ یہ گالم گلوچ کی انگلی نہیں ہے بلکہ تسبیح و تہلیل ہے اور طاعت و عبادت کی انگلی ہے۔ اس نام کو بھی چھوڑ دو جو زمانہ جاہلیت کا نام ہے۔

کمال ایمان کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟...... بہر حال کسی ایسی ہیئت سے اشارہ کرنا یا جیسے کسی زمانے میں انگوٹھا دکھلا دینے کا دستور تھا جس سے دوسرا چڑ جائے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسا زمانہ جاہلیت میں شہادت کی انگلی دکھا کر چڑا دینا سمجھا جاتا تھا۔ ان تمام چیزوں سے روکا گیا تاکہ ایک مسلم دوسرے مسلم کے لئے ایذا رسانی کا باعث نہ بنے۔

فرمایا گیا: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ ④ "مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ نہ زبان سے ایذا پہنچائے نہ ہاتھ سے"۔ کہیں فرمایا گیا "اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ③ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۱. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام، ج: ۱ ص: ۶۵ رقم: ۴۱.

اَلنَّاسُ عَلٰی دِمَائِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ۔" ① مومن کون ہے؟ جس سے لوگ اپنی جان، مال، آبرو کے بارے میں امن میں ہوں اور مطمئن ہو جائیں، لوگ یوں سمجھیں کہ ہماری جان بھی محفوظ ہے اس لئے کہ یہ مومن ہے یہ جان کے اندر خیانت نہیں کرے گا۔ ہماری آبرو بھی محفوظ ہے اس لئے کہ یہ مومن ہے خائن نہیں ہے۔

اور یہاں پر لفظ مَنْ اَمِنَہُ النَّاسُ ہے یعنی لوگ مطمئن ہوں۔ اس میں یہ بھی قید نہیں کہ مسلمان ہی مطمئن ہوں بلکہ غیر مسلم بھی مطمئن ہو جائیں کہ یہ موذی نہیں ہے۔ یہ ایماندار ہے تو ایمان کی علامت یہ بتلائی گئی کہ ہر کس و ناکس اس کے معاملات کو دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ یہ مومن ہے۔ اس سے مال، جان، آبرو میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ کسی میں بھی خیانت نہیں کرے گا۔ بہر حال مومن کی شان یہ ہوئی کہ اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بھرا ہوا ہو اور بلا استثناء ہر مخلوق کی درجہ بدرجہ خدمت کرے جس کے دل میں محبت خداوندی ہوگی، اس کے دل میں اس کی مخلوق کی محبت ہوگی اور جب مخلوق کی بھی محبت ہوگی تو اسے چین نہیں آئے گا کہ کوئی شخص اذیت و تکلیف کے اندر رہے۔ وہ سعی کرے گا کہ اس کی تکلیف رفع کروں۔ کم سے کم اس کی اذیت و تکلیف کا ذریعہ نہ بنوں اور اس کی جان و مال محفوظ رہنا چاہئے۔

اگر خدانخواستہ مومن ایسا ہو جائے کہ لوگ اس سے دور ہٹنے لگیں کہ بھائی! کہیں یہ چھری نہ مار دے، کہیں جیب نہ کتر لے، کہیں گالی نہ دیدے تو وہ مومن کیا؟ وہ تو اچھا خاصا بیل ہے۔ بیل جب چلتا ہے تو لوگ پہلو بچا کر چلتے ہیں کہ بیل ہے کہیں لات نہ مار دے، کہیں دم نہ مار دے، کہیں پیشاب نہ کر دے، چھینٹا نہ پڑ جائے۔ اگر مومن سے بھی یہ کھٹک پیدا ہو گئی کہ کہیں چھری نہ مار دے، جیب نہ کتر لے وہ بھی پھر بیل ہوا۔

مومن وہ ہے جس سے لوگ مطمئن ہو جائیں کہ یہ نہ ہماری جان کا لیوا ہے نہ آبرو گرانے والا ہے نہ مال میں خیانت کرنے والا۔ غائبانہ بھی خیانت نہ کرے بلکہ حفاظت کرے۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، اچھے بڑے صالح لوگوں میں سے تھے۔ وہ سہارنپور سے اپنے وطن کانپور جا رہے تھے۔ سہارنپور کے گنے مشہور ہیں۔ انہوں نے کافی مقدار میں گنے خرید کئے۔ اب وہ جا کے کانٹے پر ڈالے تا کہ تلواؤں، اس لئے کہ وہ اس مقدار سے زیادہ تھے جو ایک ٹکٹ میں لے جائی جا سکتی ہے۔ تولنے والے بابو نے دیکھا کہ ایک نیک صالح آدمی، صورت بھولی بھالی، اس کے چہرے پر ایمانداری برس رہی ہے اس نے کہا مولوی صاحب! تلوانے کی ضرورت نہیں، بس تم ویسے ہی لے جاؤ۔

انہوں نے کہا صاحب! آپ تو کہہ رہے ہیں کہ ویسے ہی لے جاؤ۔ اگر میں لے گیا اور ریل میں چیکر آ گیا اور اس نے مال چیک کیا۔ وہ کہے گا یہ مال زیادہ ہے۔ وہ میرے سے جرمانہ بھی وصول کرے گا۔ میں یہاں تھوڑا دے کر چھوٹتا ہوں، وہاں زیادہ دینا پڑے گا۔ آپ مجھے کیوں زیادہ میں پھنسا رہے ہیں؟

① الصحیح لابن حبان، کتاب الایمان، باب فرض الایمان، ج: ۲ ص: ۲۶۴ رقم: ۵۱۰۔

اس نے کہا۔نہیں، ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔انہوں نے کہا صاحب، غازی آباد سے گاڑی بدلے گی وہاں دوسرا چیکر آئے گا،اس نے چیک کیا تو جتنا لمبا راستہ ہوتا جائے گا محصول و جرمانہ بھی بڑھتا جائے گا۔اس نے کہا ہم اس سے کہہ دیں گے کہ وہ اس چیکر سے کہہ دے گا کہ بھئی! انہیں مت ستانا اور یہ مال لے جانے دو۔

انہوں نے کہا صاحب! اس نے چھوڑ دیا لیکن جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور میرے پاس جو وزن زیادہ ہوگا تو وہ بابو کہے گا کہ یہ اپنا ٹکٹ دے رہے ہو، اس مال کا ٹکٹ کہاں ہے؟ تب میں کیا کہوں گا؟ اس نے کہا ہم اس دوسرے چیکر سے کہلا دیں گے۔ وہ اس بابو سے کہہ دے گا۔ آپ کو پاس کر دیا جائے گا۔ آپ بے فکر ہو کر لے جائیں۔ انہوں نے کہا پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا پھر کیا ہوگا۔ پھر آپ کا گھر آ جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ اللہ میاں جو میرے سے پوچھیں گے کہ ریلوے کے مال میں خیانت کیوں کر کے آیا تھا؟ قیامت کے دن جو باز پرس ہوگی، تو میں کیا جواب دوں گا؟ اس نے حیرت سے دیکھ کر کہا کہ یہ کوئی مجنون اور دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا اللہ کا نام لینا اس کے نزدیک دیوانگی تھی۔ حقیقت یہی ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد ـــــــ اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

دیوانہ وہ ہے جو اللہ کا دیوانہ نہیں بنتا، فرزانہ وہ ہے جو فرزانہ نہیں ہے۔ ہر وقت غرور میں مبتلا ہے۔

"اَكْثِرُوْا ذِكْرَ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ" ① "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اتنا اللہ اللہ کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ اور مجنون کہنے لگیں"۔ ایک سودا اس کے دل کے اندر سما جائے۔ جب دیکھو اللہ اللہ، جب دیکھو اللہ اللہ۔ معلوم ہوتا ہے دیوانہ ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا اور اس میں فرمایا کہ: ہمارے حضرت استاذ یہ فرماتے تھے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں امام اوزاعی کا مقولہ نقل کیا ہے امام اوزاعی تیسرے قرن کے اکابر علماء میں سے ہیں۔ امامت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ امام اوزاعی نے اس وقت کے مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر کہا تھا کہ "اگر صحابہ کرامؓ آج قبروں میں سے نکل آئیں تو ہم تو انہیں مجنون کہیں گے اور وہ ہمیں کافر کہیں گے کہ وہ اسلام جو دنیا کے اندر ہم چھوڑ گئے تھے وہ تو گیا۔ اب اس کا وجود کہاں ہے؟" یہ امام غزالی نے امام اوزاعی کا مقولہ نقل کیا ہے۔

اس پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "میں یہ کہتا ہوں اس زمانے میں اگر قبر سے نکل کر امام غزالی آ جائیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے اور ہم انہیں مجنون کہیں گے"۔

اور شیخ الہند نے فرمایا: "اگر میرے استاذ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے زمانے کے لوگ قبروں سے نکل کر آ جائیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے، ہم انہیں مجنون کہیں گے"۔ حقیقت یہی ہے کہ دیوانہ تو وہی ہے جسے لوگ دیوانہ کہیں اور خدا

① مسند احمد، مسند ابی سعید الخدریؓ ج:۲۳ ص:۲۷۱۔

کا دیوانہ اللہ کا مجنون کہ ہر وقت اللہ ہی کا نام ہے۔ اسی ہی کی رٹ ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جب تک یہ جنون نہیں سمائے گا، ایمان کا کمال نہیں ہوسکتا۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ علیہ عنہ جلیل القدر صحابیؓ ہیں۔ صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا لقب ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسرار اور فتن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئیاں فرمائیں، ان کے اسرار ان کے قلب میں محفوظ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے بہت سے واقعات بیان کرتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے فتنے مجھے بتلا دیئے ہیں۔ فتنہ پردازوں کے نام اور ان کے نسب نامے بھی بتلا دیئے ہیں کہ فلاں فلاں وقت میں فلاں فلاں فتنہ پرداز کھڑا ہوگا۔ لیکن ان کو زبان سے ادا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ فتنوں کے بارے میں ان سے کچھ احادیث مروی ہیں، گویا اسرار نبوت کے امین ہیں۔ اسرار نبوت ان کے قلب میں ہیں۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب ایران فتح ہوا اور اس کا دار السلطنت بغداد تھا۔ یہ وہاں پہنچے تو آپ کھانا کھا رہے تھے، ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ پانی وغیرہ لئے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ تو حضرت حذیفہ ابن یمانؓ کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے اتفاق سے ایک لقمہ گر پڑا۔ آپؓ نے فوراً لقمے کو اٹھایا۔ اس کی مٹی جھاڑ کر صاف کیا اور تناول فرمالیا۔ اس فارسی غلام نے کہا یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ متمدن لوگوں کا ملک ہے یہاں تہذیب اور شائستگی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ زمین پر سے لقمہ اٹھا کر کھالینا، لوگ اس کو عیب شمار کریں گے اور کہیں گے کہ یہ حرص وہوس ہے، زمین پر پڑا ہوا ٹکڑا اٹھا کے کھالیا؟ یہ تمیز کے خلاف ہے۔ آپ ایسا نہ کریں ورنہ لوگ آپ کے اوپر ملامت کریں گے، مذاق اڑائیں گے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''أَأَتْرُکُ سُنَّۃَ حَبِیْبِیْ لِھٰؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ.'' ''کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں؟'' اس سنت میں جو برکت ہے وہ دنیا ومافیہا میں نہیں ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ.

جب تک اس درجے کا جنون دل میں نہ سما جائے کہ ایک ایک سنت پر آدمی جم جائے اور دانت سے مضبوط پکڑ لے کہ دنیا کی ملامت کا خوف ترک کردے، اس وقت تک کمال ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں ایمان نام ہی جنون کا ہے۔ مگر جنون عشق کا نام ہے اور عشق بھی اللہ کا کسی غیر اللہ کے عشق کا نام ایمان نہیں ہے۔ جب عشق دل میں گھر کر جاتا ہے تو عاشق تو واقعی مجنون سا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ غیر محبوب اس کے دل سے محو ہو جاتا ہے۔ وہ تذکرہ کرے گا تو محبوب کا، نام لے گا تو محبوب کا، فکر ہوگی تو محبوب کی۔ غرض جنہیں عشق کی دولت میسر نہیں وہ انہیں مجنون نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قُلِ اللّٰہَ اللّٰہَ حَتّٰی تُقَالَ مَجْنُوْنٌ'' اتنا اللہ اللہ کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہنے لگیں۔

اسی بنا پر امام اوزاعی نے کہا تھا کہ اگر آج صحابہ کرامؓ اپنی قبروں میں سے نکل کر آجائیں تو ہم انہیں مجنون

کہیں گے وہ ہمیں کافر کہیں گے۔ ہم کہیں گے یہ دیوانے ہیں۔ سوتے اور جاگتے انہیں ایک ہی لگن ہے۔ وہ ہمیں کافر کہیں گے۔ وہ ذکر اللہ کی لگن اور وہ اسلام کہاں گیا جو ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ بہر حال دل کی لگن اور تڑپ کا نام ایمان ہے کہ دل میں ایک نسبت پیدا ہو جائے اور آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے، کھانے، پینے، سونے، جاگنے میں ایک ہی کا نام اور ایک ہی کا ذکر ہو۔

مومن کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں ہونا چاہئے...... آخر احادیث میں جو مختلف اوقات کے اذکار بتلائے گئے ہیں کہ مومن کا کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے کہ اللہ کی طرف وہ توجہ نہ کرے۔ گھر سے باہر نکلے تو دعا پڑھے "بِسْمِ اللّٰهِ، آمَنَّا بِاللّٰهِ تَوَكَّلْنَا عَلَى اللّٰهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" ①

گھر میں داخل ہو تو کہو "اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا." ②

استنجا کے لئے داخل ہو تو کہو "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ." ③

استنجا کر کے باہر آؤ تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنِّي الْاَذٰى وَعَافَانِيْ." ④

لباس پہنو تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ هٰذَا وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ." ⑤

دوستوں سے مصافحہ کرو تو کہو "نَحْمَدُ اللّٰهَ تَعَالٰى وَنَسْتَغْفِرُهُ." ⑥ "ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اس سے استغفار کرتے ہیں"۔

دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھو تو کہو بسم اللہ اور فارغ ہو جاؤ تو کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا. پھر اس کے وعدے دیئے گئے کہ اگر کسی نے بسم اللہ سے کھانے کی ابتداء کی اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا. پر ختم کیا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں تو گناہوں کی مغفرت کا وعدہ الگ دیا گیا، تو مومن کا کوئی لمحہ فارغ نہیں ہونا چاہئے۔ سونے کے لئے لیٹو تو کہو "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْيٰى." "اے اللہ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر زندہ ہوں گا"۔

جب صبح کو اٹھو تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ." "اس اللہ کے لئے حمد ہے

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول الرجل اذا اخرج من بیته، ج: ۴ ص: ۳۲۵ رقم: ۵۰۹۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح الترغیب والترھیب ج: ۲ ص: ۱۲۱ رقم: ۱۶۰۵.

② السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول الرجل اذا دخل بیته، ج: ۴ ص: ۳۲۵ رقم: ۵۰۹۶.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الطھارة، باب اذا ارادد خول الخلاء، ج: ۱ ص: ۲۸۳ رقم: ۳۷۵.

④ السنن لابن ماجه، کتاب الطھارة، باب مایقول اذا خرج من الخلاء، ج: ۱ ص: ۱۱۰ رقم: ۳۰۱.

⑤ المستدرک للامام الحاکم، کتاب اللباس، ج: ۴ ص: ۲۱۳.

⑥ السنن لابن ماجه، کتاب الادب، باب الرجل یقال له کیف اصبحت، ج: ۲ ص: ۱۲۲۲ رقم: ۳۷۱۱.

جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی اور اس کی طرف سب کو جانا ہے یا جمع ہونا ہے اور پھیلنا ہے"۔

آفتاب نکلے تو دعا بتلائی "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَلَّلَنَا الْیَوْمَ عَافِیَةً وَّجَآءَ بِالشَّمْسِ مِنْ مَّطْلَعِهَا. اَللّٰهُمَّ اُشْهِدُکَ وَاُشْهِدُ حَمَلَةَ عَرْشِکَ وَ مَلٰٓئِکَتَکَ وَجَمِیْعَ خَلْقِکَ اَنَّکَ اَنْتَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ." ① "اس اللہ کے لئے حمد ہے جس نے دن چمکا دیا۔ جس نے سورج کو نکالا۔ اے اللہ میں تجھے بھی گواہ کرتا ہوں تیرے حملۂ عرش کو بھی گواہ کرتا ہوں تیرے ملائکہ کو بھی گواہ کرتا ہوں اور تیری تمام مخلوق کو گواہ کرتا ہوں کہ میں شاہد ہوں۔ تو اللہ ہے، تو یکتا ہے اور تیرا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے"۔

اسی طرح فرمایا: بیوی کے پاس جاؤ تو یہ دعا پڑھو: "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مَارَزَقْتَنَا." ② اولاد کی خبر سنو تو یہ دعا پڑھو۔ نیا پھل سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو۔ غرض تمام اوقات کی سینکڑوں دعائیں ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ مومن کی زندگی کو ہر آن ذاکر کی زندگی بنایا گیا ہے۔ وہ ہر آن اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ توحید کا سبق پڑھتا رہے۔ ایک ہی کی طرف جھکنا، ایک ہی کے لئے جینا، ایک ہی کے لئے مرنا اسی کا نام اسلام ہے۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا گیا ﴿اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ ③ "اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ"۔ اس مسلم بننے کے یہ معنی نہیں تھے کہ کلمہ پڑھ کر آج مسلم بن جاؤ۔ آپ تو پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی اولوالعزم، ہزارہا پیغمبروں کے والد بزرگوار ہیں۔ خلیل اللہ لقب ہے۔ تو یہ مطلب نہیں تھا کہ اب تک مسلمان نہیں۔ اب کلمہ پڑھ کر مسلمان بن جاؤ۔ مسلم بننے کے معنی گردن جھکا دینے کے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو ہمارے حوالے اور سپرد کر دو کہ نہ تمہاری مرضی رہے اور نہ ارادہ رہے۔ جو کچھ ہو ہماری مرضی اور ہمارا ارادہ ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ④ "اے اللہ! میں مسلم بن گیا"۔ میں نے اپنے آپ کو سونپ دیا۔ آپ کے حوالے کر دیا۔ جو چاہیں آپ کریں جب یہ کر دیا تو اب یہ اعلان کر دو:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ⑤ ابراہیم! کھلے بندوں کہہ دو، میری نماز، میرا حج، میرا مرنا اور میرا جینا، اور مرنے اور جینے کے درمیان جتنے افعال ہیں وہ خود سارے اس کے اندر آ گئے۔ تو سونا، جاگنا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا۔ سب اللہ کیلئے ہے۔ میرے نفس کے لئے کچھ نہیں۔ جس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے۔ اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور آج میں ہی اول مسلم ہوں۔

تو اسلام کے معنی گردن جھکا دینے کے نکل آئے۔ یعنی زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کو ہی یاد کرو۔ اس کی یہ تفسیر ہے

---

① الاذکار للنووی، ج: ۱ ص: ۸۶. عمل الیوم واللیلة لابن سنی ج: ۱ ص: ۲۷۷.

② الصحیح لمسلم، کتاب النکاح، باب مایستحب ان یقول عندالجماع، ج: ۲ ص: ۱۰۵۸ رقم: ۱۴۳۴.

③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱. ④ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱. ⑤ پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۲، ۱۶۳.

جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات میں اذکار بتلاتے ہیں۔ فرائض وسنن اور واجبات اپنی جگہ وہ تو وقت خاص میں ادا کرو۔ لیکن تمام اوقات جو تمہاری زندگی کے ہیں۔ ہر موقع کی دعا ہر موقع پر ذکر اللہ کرو اور اسے یاد کرتے رہو تاکہ مسلم کی زندگی سو کر اٹھنے سے لے کر رات کے سونے تک ذکر اللہ سے معمور رہے۔ یہی حقیقت میں اسلام ہے ایسا اسلام جب آدمی کا ہوگا، تو لامحالہ لوگ اسے مجنون ہی کہیں گے کہ بھئی جب سو رہا ہے تو اللہ اللہ، جاگ رہا ہے تو اللہ اللہ، کپڑے پہنتا ہے جب بھی اللہ اللہ، روٹی کھاتا ہے جب بھی اللہ اللہ۔

مومن کا قلب بھی ذاکر ہونا چاہئے......اور یہ واقعہ ہے جو اس کی مشق کرے، اذکار کا پابند بن جائے گا۔ پھر قلب ذاکر بن جاتا ہے۔ پھر وہ ارادہ بھی نہ کرے جب بھی ذکر اللہ بے ارادہ اس کی زبان اور قلب سے جاری ہوتا ہے۔ حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں ایک صاحب اسی شان کے تھے کہ ذکر اللہ ان کے رگ وپے میں رچ چکا تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ اللہ کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پانی اتر آیا، تو آپریشن کی ضرورت پیش آئی۔ جب ہسپتال گئے تو ڈاکٹر نے کہا کہ: دیکھئے بالکل خاموش رہئے گا۔ ہلنا جلنا بالکل نہیں ہوگا اور میں آپریشن کرتا ہوں پہلے میں آپ کو بے ہوش کروں گا۔ اس کے بعد پھر آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ بارہ گھنٹے کے لئے حس وحرکت نہ کریں انہوں نے فرمایا بہت اچھا۔

اس نے کلوروفام سنگھایا بے ہوش ہونا تھا کہ ایک دم قلب میں سے الا اللہ، الا اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے کہا کیا کرتے ہو؟ اب انہیں تھوڑی ہی خبر تھی کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ تو بے ہوش تھے۔ آخر وہ پھر ہوش میں لے آیا اور کہا یہ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے کہا کیا؟ کہا آپ تو اللہ اللہ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا مجھے تو کوئی خبر نہیں۔ اس نے کہا دیکھئے اللہ اللہ کرنے کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔ کم سے کم اس وقت خاموش رہئے۔ اس نے پھر بے ہوش کیا۔ بے ہوش ہونا تھا' پھر قلب سے الا اللہ الا اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ آخر ان کی آنکھ نہ بن سکی۔ ڈاکٹر نے کہا میں اس حالت میں آپریشن نہیں کر سکتا۔ تو آدمی جب بیداری میں اللہ کے نام کی مشق کرتا ہے، رات دن ذکر میں رہے پھر بلا ارادہ اس کی زبان پر ذکر جاری ہو جاتا ہے اور وہ ہر وقت ذاکر رہتا ہے۔ تو لامحالہ ایسے شخص کو مجنون ہی کہا جائے گا کہ عجیب جنونی آدمی ہے۔ ہر وقت الا اللہ سونے کے لئے لیٹے تب الا اللہ، اور جاگتا ہے تب الا اللہ گھر سے نکلتا ہے جب الا اللہ مسلم کی یہ زندگی ہے۔

معاشرے کے تمام گوشوں میں ذکر اللہ موجود ہے......اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام نے معاشرہ سے بالکل بیگانہ بنا دیا ہے نہ تجارت کرو نہ زراعت بس اللہ اللہ کرتے رہو۔ اس تجارت وزراعت کو بھی اسلام نے اللہ اللہ بنا دیا ہے کہ جب حسن نیت سے شریعت کے مطابق تجارت ہو، زراعت، مزارعت، معاشرت، تمدن ہو، وہ خود اللہ اللہ کے اندر داخل ہے۔ وہ بھی ذکر حق ہے۔ جب اتباع سنت پایا جائے گا وہ خود ذکر اللہ ہوگا۔ بہر حال معاشرت کا کوئی گوشہ خالی نہیں جس میں ذکر کی شان موجود نہ ہو، ذرا سی فکر کی ضرورت ہے دل میں یہ لگن ہو کہ میں اللہ کے لئے

کرر ہاہوں اور آدمی جو چیز کرے اس نمونے کو سامنے رکھ لے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا ہے۔ پھر اس کی ساری زندگی ذکر اللہ ہی میں شمار ہوگی، اسے ذاکر کہا جائے گا، غافل نہیں کہا جائیگا۔ عظمت ومحبت خداوندی جب قلب میں سماجاتی ہے تو ایسے ذاکر آدمی سے جب کوئی فعل سرزد ہوگا وہ خود ذکر کے حکم میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی خدمت خلق اللہ کے اندر راسخ القدم ہوگا۔ وہ ایک طرف اللہ کا ذاکر ہوگا اور ایک طرف مخلوق کا خادم ہوگا۔ ایک طرف عبادت رب ادا کرے گا۔ ایک طرف خدمت خلق ادا کرے گا اور ایک چیز اس کو دوسری طرف سے غافل نہیں بنا سکے گی، جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے اور انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چل کر آدمی ولایت کے اونچے اونچے مراتب پر پہنچتا ہے۔ اس مرتبہ کا حاصل یہی ہے کہ ذکر اللہ اس کے رگ وپے میں راسخ ہو جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھے جب بھی ذکر اللہ اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہو اور فرش زمین پر بیٹھے جب بھی ذاکر ہو۔ وہ بہترین فاخرہ لباس پہن لے جب بھی وہ ذاکر ہو، پھٹے پرانے کپڑے پہن رہا ہے جب بھی اس کا قلب ذاکر ہو کوئی چیز اس کو ذکر اللہ سے روکنے والی نہیں ہے بلکہ وہ لباس خود اس کے لئے یاددہانی کا ذریعہ اور مذکر بن جاتا ہے۔

اولیاء اللہ میں بزرگی کی دوشانیں...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے طبقے کے اور بہت سے بزرگ، رامپور ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں جمع ہوئے۔ کسی ایک جگہ دعوت میں یہ سب حضرات مدعو تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی عادت اور شان یہ تھی کہ زہد اور ترک دنیا انتہا درجے کا تھا۔ میرے تو جد امجد ہی تھے۔ گھر میں جو واقعات میں نے سنے وہ یہ ہیں کہ حضرت کی ملک میں ایک جوڑا کپڑے سے زیادہ نہیں تھا جو بدن پر ہوتا۔ گھر بار جائیداد سب دوسرے کے حوالے کر دی تھی۔ ان کی ملک میں ایک جوڑا کپڑا جو بدن پر تھا، ایک قرآن شریف، ایک صحیح بخاری کا نسخہ اور فتوحات مکیہ کی جلد جو شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ چار چیزیں کل ان کی ملک تھیں۔

کپڑے کا جوڑا جب پھٹ پھٹا کر پرانا ہو جاتا تھا اور اس درجے پر آجاتا تھا کہ پہننے کے قابل نہ رہے تب دوسرا جوڑا بنتا تھا اور وہ جوڑا بھی گاڑھے کا کوئی اعلیٰ لباس نہیں ہوتا تھا۔ حضرت کا طریقہ یہ تھا کہ بند دارا چکن بلا کرتے کے پہنتے تھے اور ایک جوڑ پائنچے کا چوڑا پاجامہ جو پرانے زمانے میں لوگ پہنتے تھے اور ایک پرانی لنگی کندھے پر رہتی تھی۔ کپڑوں کو دھولیا اور سکھا کر پہن لیا۔ وہی ایک جوڑا تھا جب تک وہ پھٹ کر بدن سے الگ نہ ہو جائے جب تک دوسرا جوڑا نہ بنتا تھا۔

تو رامپور کی جس دعوت کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس میں حضرت تشریف رکھتے تھے۔ اتفاق سے کپڑا بہت پرانا ہو گیا تھا، پگڑی میں کچھ ڈورے بھی لٹک رہے تھے، یہ شان تو حضرت کی تھی۔

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس دن اتفاق سے بڑا فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً

پانچ سوروپے قیمت کا لباس ہوگا۔ بہترین جبہ اور بہترین عمامہ۔ تو لوگوں کی جیسی عادت ہوتی ہے دعوت میں بیٹھ کر انہوں نے کچھ تبصرے شروع کر دیئے۔ ایک نے کہا کہ بھئی! مولانا رشید احمد صاحب عالم بہت بڑے ہیں باقی بزرگی سے کیا تعلق؟ بزرگ تو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جو بالکل تارک الدنیا ہیں۔ کپڑا الباس دیکھو تو انتہائی زہد وقناعت بزرگی کی شان تو ان میں ہے اور یہ تو پانچ سوروپے کا جوڑا پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔

گویا عوام الناس ان بزرگوں کو لباس سے پہچانتے ہیں۔ لباس اچھا ہے تو بزرگی ندارد ہے۔ لباس پھٹا ہوا ہے تو بزرگی موجود ہے۔ یہ ایک سطحی سی چیز ہے۔ مگر بہر حال لوگوں نے یہ تبصرہ شروع کیا۔ یہ بھنک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پڑگئی حضرت نانوتوی کا چہرہ یہ چیز سن کر غصے میں سرخ ہو گیا اور اس شخص سے فرمایا کہ: ''جاہل! تو کیا جانے کہ بزرگ کسے کہتے ہیں تو نے کپڑوں کو دیکھ کر بزرگی سمجھی ہے؟ کپڑوں کے معیار سے تو بزرگی کو پرکھتا ہے؟'' فرمایا ''میری کیفیت یہ ہے کہ اگر میں یہ پھٹا پرانا لباس نہ پہنوں، میرا نفس اپنے آپ سے باہر ہو جائے۔ اس لباس نے اسے روک رکھا ہے''۔

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ شخص وہ ہے کہ اگر ایک لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تو بھی اس شخص کے نفس میں تغیر نہیں ہوگا نہ اس کے دل میں کوئی پھول پیدا ہوگی، نہ نفس پھولے گا، نہ غرور پیدا ہوگا۔ غنا کے اس درجے و مرتبے پر ان کا نفس پہنچ چکا ہے کہ بادشاہی تخت پر بٹھلا دو تب بھی یہ زاہد اور قانع ہیں۔ لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تب بھی ان کے قلب میں زہد وقناعت ہے''۔ تو حقیقت یہ ہے کہ ذکر اللہ کرنے والے اگر پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوں، تب بھی وہ ذاکر ہیں۔ ایک لاکھ کا لباس ہو تب بھی ذاکر ہیں۔ ذکر قلب کی شان ہے۔ قلب اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی شان ہی دوسری ہو جاتی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کبار محدثین میں گذرے ہیں۔ امام کے رتبے کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لباس بہت فاخرہ اور ٹھاٹھ دار پہنتے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! بظاہر یہ زہد وقناعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ آپ تو ایسا لباس پہنتے ہیں جیسے نوابوں کا فرمایا ''میں اس لئے پہنتا ہوں' اگر میں پھٹے پرانے کپڑے پہن لوں تو۔ ''لَوْلَاهٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَاهٰٓؤُلَآءِ الْمُلُوْكُ'' ''یہ امیر زادے اور بادشاہ زادے مجھے ناک پوچھنے کا رومال بنالیں''۔ میں اس لئے فاخرہ لباس پہنتا ہوں تاکہ بتلادوں کہ جو چیز تمہارے پاس ہے وہ ہمارے پاس بھی ہے۔ ہم تم سے مستغنی ہیں کسی درجے میں تمہارے محتاج نہیں ہیں۔ میں اس نیت سے پہنتا ہوں، تو اس نیت سے فاخرہ لباس پہننا یہ خود اطاعت وعبادت ہے۔ اس لئے اہل اللہ کا کوئی قدم بھی اطاعت وعبادت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ والوں میں بہت سے ایسے گزرے ہیں۔ جو فاخرہ لباس پہنتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی گزرے ہیں جو پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن بزرگی ایک قدر مشترک تھی۔ یہاں بھی تھی، وہاں بھی تھی۔ یہاں اور نیت سے تھی وہاں اور نیت سے تھی۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ کے اکابر اولیاء میں سے ہیں لیکن بادشاہوں کی وہ شان نہیں ہوتی تھی جوان کی شان تھی۔ مسند الگ تھی، صفائی ستھرائی الگ خدام الگ کھڑے ہوئے ہیں، دروازوں کے اوپر دربان الگ موجود ہیں اور صفائی کا یہ عالم کہ اگر ایک تنکا بھی سامنے پڑا ہوا ہوتا تھا تو سر میں درد ہوجاتا تھا۔ فرماتے تھے ''کوڑا کباڑ گھر کے اندر بھر رکھا ہے۔'' بہت نزاکت تھی۔

بادشاہ وقت نے ملنے کی آرزو کی۔ اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے بہت چاہا کے مجھے اجازت مل جائے ۔مگر اجازت نہیں تھی۔ آخر حضرت مرزا صاحب کے خادم خاص کو اپنے پاس بلایا اور کہا: تو ان کے دل میں گھر کئے ہوئے ہے۔ تیرا معاملہ بہت رسوخ کا ہے تو میرے لئے ایک پانچ منٹ کی مہلت لے لے۔

اس نے کچھ اتار چڑھاؤ کر کے حضرت سے عرض کیا۔ تو پانچ منٹ کی اجازت ہوگئی کہ بادشاہ آسکتے ہیں۔ بادشاہ سلامت آئے۔ بہت ادب کے ساتھ دوزانو ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت مرزا صاحبؒ نے کچھ نصائح فرمائیں اس دوران میں حضرت مرزا صاحب کو پیاس معلوم ہوئی تو خادم کو پانی لانے کے لئے اشارہ کیا بادشاہ نے سمجھ لیا کہ پانی چاہتے ہیں تو کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ اگر مجھے اجازت ہو؟ اجازت ہوگئی کہ اچھا تم پانی پلاؤ، تو بادشاہ پانی لینے گئے تو گھڑے کے اوپر جو بڑولی ڈھکی ہوئی تھی۔ پانی لے کر جو اسے رکھا وہ کچھ ٹیڑھی رکھی گئی بس مزاج میں تغیر پیدا ہو گیا۔ فرمایا ''تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں تم بادشاہت کیسے کرتے ہو گے؟ ہٹو یہاں سے'' اپنے خادم خاص کو حکم دیا کہ وہی پانی پلائے گا۔

اس شان کے بھی بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی ولایت میں کوئی کمی نہیں۔ ولی کامل ہیں۔ ان کی نسبت و تصرف اور تربیت سے ہزاروں اولیاء بن گئے۔ ایک شان یہ ہے۔

اور ایک شان حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے یہ بھی انہی کے ہمعصر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ غلام علی صاحب اور مرزا مظہر جاناں رحمہ اللہ علیہم یہ تینوں ایک قرن کے بزرگ ہیں۔ شاہ غلام علی صاحب کا یہ حال کہ نہ گھر، نہ در، نہ کپڑا نہ لتا، زہد و قناعت اور فقر و فاقے اور اس پر مہمانوں کی یہ کثرت کہ تین تین سو، چار چار سو مہمان ہر وقت ان کے دسترخوان پر ہوتے تھے۔ لیکن ظاہر میں ذریعہ معاش کچھ نہیں ریاست ٹونک کے نواب۔ نواب امیر خاں، وہ حضرت کے مرید تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شیخ کے ہاں تین تین سو، چار چار سو مہمان ہوتے ہیں۔ آخر یہ کہاں سے آتا ہوگا؟ بڑی تنگی اٹھاتے ہوں گے۔ بڑی پریشانی ہوتی ہوگی۔ تو ریاست ٹونک کا ایک ضلع جس کی ایک سال کی کئی لاکھ روپے آمدنی تھی۔ وہ پورے کا پورا حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں پیتل کے پتر پر لکھ کر بھیجا کہ میں آپ کو ہدیہ کرتا ہوں تاکہ مہمانوں اور گھر والوں کا خرچ چلے۔ آپ اسے خدا کے لئے قبول فرمالیں۔ شاہ غلام علی صاحب نے اسی پتر پر جواب لکھا اور اس پر ایک شعر لکھ کر بھیج دیا۔ لکھا۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ۔۔۔ با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر وفاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے۔ میری طرف سے انہیں کہہ دو کہ روزی مقدر ہے۔ تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

تو ایک طرف یہ زہد وقناعت اور ایک طرف یہ ٹھاٹھ باٹھ جو مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے۔ ہیں وہ بھی ولی کامل، یہ بھی ولی کامل، ولایت کے لباس مختلف ہوتے ہیں۔ ولایت کا تعلق کپڑوں سے نہیں وہ قلب سے ہے۔ قلب جب اللہ رسیدہ بن جائے۔ وہ ولی کامل ہے۔ اپنے حسن نیت سے کوئی لباس فاخرہ پہنتا ہے اس میں بھی نیکی کی نیت مضمر ہوتی ہے، اس میں بھی مصلحت ہے۔ کسی پر زہد وقناعت کا غلبہ ہوتا ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بزرگی کی دو شانیں...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں۔ آپؐ نے انہیں دعا دی ہے کہ: ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' ① ''اے اللہ! ابن عباس کو کتاب اللہ کا عالم بنادے اور اس کی حکمت سکھلا دے''۔ تو بڑے زبردست مفسر ہیں بلکہ تفسیر قرآن کے اندر صحابہؓ میں یکتا ہیں۔ لیکن لباس کس شان کا پہنتے تھے؟ ان کے لباس کا کپڑا اس زمانے کا بہترین کپڑا اور قیمتی ہوتا تھا۔ بڑا فاخرہ لباس ہوتا اور جس مجلس میں بیٹھتے تھے تو عجیب عطر ہوتا مجلس اس سے مہک جاتی تھی۔

اور ایک طرف ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں کہ جو بدن پر کپڑا ہے ان کا مذہب یہ تھا کہ اس کے سوا دوسرا کپڑا رکھنا جائز نہیں۔ ان کی یہ شان تھی۔ جب ملک شام فتح ہوا تو شام میں تمدن تھا۔ حضرت امیر معاویہ کی حکومت تھی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا، ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ شام میں پہنچے وہاں تمدن، کھانے پینے کی افراط اور سب کے بہترین مکانات تھے۔ ان پر زہد وقناعت کا غلبہ، جس گھر میں جاتے اور دیکھا کہ دسترخوان پر بہترین کھانے جمع ہیں۔ بس لاٹھی لے کے سر ہو جاتے کہ اللہ کے رسولؐ کے دسترخوان پر کب دو کھانے جمع ہوئے ہیں جو تم نے جمع کر رکھے ہیں۔ تو یہ نہیں کہ امر بالمعروف کر دیں۔ لاٹھی لے کے مار پٹائی کے لئے تیار ہو جاتے۔ لوگ عظمت کرتے تھے کہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ دسترخوان اٹھ جاتا۔ لیکن لوگ تنگ آ گئے۔ اس طرح کسی کا بہترین لباس دیکھا۔ بس لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا لباس کب پہنا؟ کسی کے گھر میں صندوق میں دو چار جوڑے جمع ہیں۔ لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کب چار جوڑے رکھے تھے جو تم رکھ رہے ہو؟ اور مرنے مارنے کو تیار۔ آخر کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے واقعات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھے کہ یہ تو لوگوں کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔ اب لوگ اس کامل زہد وقناعت پر کیسے آ جائیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد وقناعت تھا۔ امت میں تو ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں حکم دیا جائے کہ یہ شہر میں نہ رہیں۔ ان کی کسی سے نہ نبھے گی۔ چنانچہ وہاں سے حکم پہنچ گیا کہ ربذہ میں جا کے قیام کرو تو جنگل میں جا کے قیام کیا۔

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ اللھم علمه الكتاب، ج: ۱ ص: ۴۱ رقم: ۷۵.

چونکہ امیر المومنین کا حکم تھا اور وہ واجب الاطاعت تھا، سر جھکا دیا اور پھر ہمیشہ کے لئے شہر چھوڑ کر جنگل میں قیام کیا۔ وفات کا جب وقت آیا تو گھر میں خود تھے اور ان کی بیوی تھی۔ تیسرا کوئی نہیں تھا، بیوی رونے لگی۔ اس لئے کہ ہاتھ پلے کچھ نہیں تھا، اس لئے کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ صبح کا جو کھانا کھایا، تو رات کا کھانا رکھنا جائز ہی نہیں، توکل کے خلاف ہے۔ جو بدن پر کپڑا پہنے ہوئے تھے اس کے سوا اور کوئی کپڑا نہیں تھا۔

آپ نے فرمایا: رومت۔ دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں تمہیں ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑے گا۔ ان سے کہنا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ کی وفات ہوگئی ہے۔ لوگو! (سواریوں سے) اتر جاؤ اور ان کے کفن دفن کا انتظام کر دو۔ بیوی باہر جا کر بیٹھ گئی۔ تو واقعی تھوڑی دیر بعد گرد اڑی اور اونٹوں پر پانچ، چھ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا۔ جب وہ ان کے گھر کے قریب پہنچا بیوی نے کہا اے لوگو! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ابوذر غفاریؓ ہیں' ان کی وفات کا وقت ہے۔ آپ لوگ اتر جائیں ان کے کفن دفن کا انتظام کر دیں اور نماز جنازہ پڑھا دیں۔ تو ان سواروں میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جلیل القدر صحابیؓ ہیں یہ سن کر کہ ابوذر غفاریؓ ہیں تو اس زور سے چلا پڑے کہ: ''صَدَقَ صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ'' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا کہ: ''وَیْحَکَ اَبِیْ ذَرٍّ یَعِیْشُ فَرِیْدًا وَیَمُوْتُ فَرِیْدًا۔'' اے ابوذر! افسوس ہے کہ تنہائی میں زندگی گزارو گے اور تنہائی میں تمہاری موت بھی آئے گی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا۔ وہ واقعہ سامنے آ گیا۔

اس کے بعد اندر آئے ملاقات ہوئی۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ خوش ہوئے۔ فرمایا یہ میرا آخری وقت ہے۔ میرے کفن دفن کا انتظام کر دو اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کفن کا کوئی سامان نہیں۔ بس یہ کرتہ اور لنگی ہے جو باندھے ہوئے ہوں، اس کے سوا کوئی کپڑا نہیں۔ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور دوسرے حضرات سے خطاب کر کے کہا کہ ''کوئی شخص مجھے ایک چادر دے دے تا کہ اس چادر میں لپیٹ کر دفن کر دیا جاؤں''۔ گویا اگر کفن سنت میسر نہ ہو تو کفن کفایت ہی میسر آ جائے۔

کفن سنت تو تین کپڑے ہیں۔ ازار، لنگی اور ایک قمیض ہے اور کفن کفایت یہ ہے کہ ایک ہی کپڑے میں پوری لاش کو دفن کر دیا جائے۔ تو فرمایا کم سے کم کفن کفایت میسر آ جائے۔ ورنہ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں۔ اور زہد و قناعت کا یہ عالم کہ فرمایا: ''تم میں سے کوئی مجھے ایک چادر دے دو، مگر وہ شخص دے جو حکومت کا ملازم محصل اور زکوۃ وصول کرنے والا نہ ہو'' فرمایا ''جو لوگ مالیات کے وصول کرنے کے اوپر مقرر ہیں وہ بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں یا بہت اعلیٰ مال وصول کرلاتے ہیں تو رعایا تنگ ہوتی ہے یا رعایت و مروت کرتے ہیں تو ادنیٰ درجے کی چیزیں لے آتے ہیں۔ اس سے حکومت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اعتدال سے کام نہیں لیتے۔ اس واسطے اس شخص کی چادر میں قبول نہیں کروں گا جو مالیاتی تحقیق کے اوپر ملازم ہے''۔

حالانکہ وہ خلافت راشدہ کا دور ہے۔ یہ صحابہؓ ہیں جن کا تقوی اور تقدس دنیا کے لئے نمونہ اور معیار ہے۔ مگر ابوذرغفاریؓ کا تقوی یہ ہے کہ وہ اسے بھی خلاف تقوی سمجھتے ہیں کہ ایسے ملازم کا ہدیہ بھی قبول کریں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے پاس دو چادریں ہیں اور وہ میری ماں کے ہاتھ کا کاتا ہوا سوت ہے اور گھر ہی بنا ہوا ہے۔ فرمایا "ہاں! بس وہ کافی ہے، ایک چادر مجھے دے دو۔" چنانچہ وفات ہوئی اور اسی چادر میں لپیٹ کر دفن کردیئے گئے۔ ان پانچ، چھ حضرات نے جنازہ کی نماز ادا کردی۔

تو میں عرض کررہا ہوں ایک طرف ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جو پانچ سو روپے کا جبہ پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ ہیں کہ پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کوئی جوڑا بھی موجود نہیں۔ لیکن بزرگی میں کلام نہیں ہے۔ وہ بھی اعلیٰ ترین بزرگ ہیں۔ یہ بھی اعلیٰ ترین بزرگ ہیں۔ دونوں صحابیؓ ہیں اور صحابہؓ کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ (رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ)" سارے صحابہؓ متقی، پارسا اور پاکباز ہیں اولیائے کاملین ہیں۔ امت میں کوئی بڑے سے بڑا قطب اور ولی گزرے لیکن صحابیت کے رتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ صحابیت کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ ان میں بھی دونوں شانیں موجود ہیں، تو بزرگی کا تعلق لباس کے فاخرہ ہونے اور لباس کے کمتر ہونے سے نہیں ہے۔ وہ قلوب سے متعلق ہے۔ فاخرہ لباس پہننے میں بھی ان کی نیتیں اچھی ہوتی ہیں اور پھٹا پرانا لباس پہننے میں بھی اچھی نیت ہوتی ہے۔ بزرگی دونوں کا ہی قدر مشترک ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں بزرگی کی دو شانیں...... اور میں تو کہتا ہوں کہ: انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون بزرگ ہے ان کی جوتیوں کے صدقے سے تو دنیا میں بزرگ بنتے ہیں۔ انبیاء آتے ہی بزرگی بانٹنے کے لئے ہیں۔ ان کے گھر سے بزرگی تقسیم ہوتی ہے۔ انبیاء میں بھی دونوں شانیں ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ ہیں اور تخت سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہی محلات کھڑے ہوئے انکے نیچے نہریں اور دریا بہہ رہے ہیں اور ایک طرف حضرت عیسی علیہ السلام ہیں کہ جو چیز بدن کے اوپر ہے اس کے سوا کوئی چیز ان کی ملک ہی نہیں ہے اور اس میں بھی یہ کیفیت ہے کہ کل سامان ان کے پاس کیا تھا؟ ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ کھانے کا وقت آتا تو وہ کھانے کا برتن تھا۔ وضو کا وقت آتا تو وہ پانی کا ظرف تھا۔ اسی میں پانی لے لیتے اسی میں پی لیتے اور اسی میں کھا لیتے۔ زندگی کا سامان ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ چمڑے کا تکیہ تھا کہ جہاں نیند آئی سر کے نیچے رکھا اور سو گئے۔ چاہے زمین ہی پر ہو۔ یہ کل مال و دولت تھا۔

ایک دن تشریف لے جارہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص دریا کے کنارے پر کھڑا چلو سے پانی پی رہا ہے۔ فرمایا اللہ اکبر اتنی دنیا ہم نے اپنے پاس رکھی ہے کہ جس کے بغیر بھی گذر ہوسکتا تھا۔ یہ بلا پیالے کے پانی پی رہا ہے۔ وہ پیالہ بھی پھینک کے چلے گئے کہ یہ بھی میرے پاس زائد تھا صرف تکیہ باقی رہ گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کہنی سر کے

نیچے رکھے ہوئے سو رہا ہے۔ فرمایا اللہ اکبر۔ یہ تکیہ دنیا کا ایک مستقل سامان ہے جو میں نے رکھ رکھا ہے اس کے بغیر بھی گزر بسر ہو سکتا ہے، کہنی رکھ کے بھی سو سکتے ہیں۔ اس دن سے وہ تکیہ بھی چھوڑ دیا۔ اب اس کے بعد سوائے ستر ڈھانپنے کے کوئی چیز باقی نہ رہی، یہ بھی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ سلیمان علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں یہاں شاہی ٹھاٹھ ہے۔ وہاں انتہائی درویشی ہے اور ان دونوں میں بزرگی اور نبوت مشترک ہے۔

تو لباس سے کسی کو پرکھنا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک یہ کہ خلاف شرع لباس ہو، اگر وہ پہنے ہوئے ہو تو ہر مسلمان کو تنقید کا حق ہے کہ یہ جائز نہیں۔ پاجامہ پہنے اور وہ ٹخنوں سے نیچے ہے آپ کو نصیحت کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قیامت کے دن تین شخص ہوں گے جن کی طرف حق تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔ ان میں سے ایک شخص ''اَلْمُسْبِلُ الْمَنَّانُ'' ہے جس کے کپڑے اتنے لمبے ہوں جو ٹخنوں سے اتنے نیچے ہوں کہ گھسٹتے جا رہے ہوں۔ (۱)

یہ تکبر کی علامت ہے اور متکبر پر رحمت کی نظر نہیں ڈالی جائے گی، اس پر آپ اعتراض کر سکتے ہیں۔ کوئی ریشم کا لباس پہنے ہوئے ہو یہ ناجائز ہے آپ کو حق ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ مردوں کے لئے خالص ریشم پہنا جائز نہیں سوائے اس کے کہ چار انگشت کے اندر اندر ریشم ہو کوئی پھول بوٹے یا دھاری بنی ہوئی ہو۔ یہ تو جائز ہے لیکن خالص ریشم کا لباس یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی خلاف شرع لباس پہنے ہوئے ہو آپ کو اعتراض کا حق ہے لیکن مطلقاً کوئی شخص قیمتی لباس پہنے ہوئے ہو اور آپ اس سے دلیل پکڑیں کہ اس کے قلب میں بزرگی نہیں ہے تو ھَلاَّ شَقَقْتَ قَلْبَهٗ آپ اس کے قلب میں گھس کر دیکھ آئے ہیں کہ اس کے قلب میں بزرگی نہیں ہے۔ لباس سے بزرگی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ مکان کے اچھے ہونے سے بزرگی کی قلت یا بزرگی سے معدوم نہیں مانا جا سکتا۔ تو انبیاء میں دونوں شانیں موجود، اولیاءؒ میں بھی موجود، صحابہؓ میں بھی موجود۔ ہر طبقے کے لوگ ہوتے تھے، دیکھنا اصل یہ ہے کہ قلوب کس درجے کے ہیں۔

تواضع بزرگی کی سب سے بڑی علامت ہے:..... بہر حال قلب وہ ہے جس کے اندر بزرگی ہو، لباس کیسا بھی ہو۔ حضرت مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ انہوں نے ایک شخص سے فرمایا کہ جاہل تو کیا جانے کہ بزرگی کسے کہتے ہیں؟ ''میرے لئے اس پھٹے پرانے لباس میں بھی اپنے نفس کے لئے مشکل اور بھاری ہے اور یہ وہ شخص ہے کہ اسے ایک لاکھ روپے کا لباس پہنا دو، اس کے نفس میں تغیر نہیں آ سکتا''۔

یہ تو یوں کہہ رہے ہیں اور مولانا گنگوہی سے جب پوچھا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کس مقام کے ہیں، یہ فرمایا کہ: ''بھائی! ہم نے ایک ہی ساتھ پڑھا، ایک ہی استاذ کے شاگرد ہوئے، ایک ہی شیخ کے مرید ہوئے، ایک ساتھ زندگی گزاری۔ لیکن باوجود اس کے وہ اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ ہم ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ

(۱) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار...... ج: ۱ ص: ۱۰۲ رقم: ۱۰۶.

پائے کہ وہ کہاں تک پہنچ چکے ہیں'۔

ان سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں کہ وہ بہت اعلیٰ مقام پر ہیں۔ ان سے پوچھو تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اتنے اونچے ہیں کہ میں ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ بزرگی کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ اپنے نفس کی حقارت دل میں جمی ہوئی ہو اور دوسرے کی بزرگی جمی ہوئی ہو۔ اگر ایک شخص دوسرے کی تحقیر کرتا ہے اور وہ مدعی ہے کہ میں سب سے زیادہ بڑا ہوں۔ یہ دعویٰ ہی علامت ہے کہ بزرگی نشان کو بھی اس میں موجود نہیں ہے۔ بزرگی میں نہ دعویٰ وادعاء ہوتا ہے نہ شیخی ہوتی ہے۔ ترک دعویٰ اور ترک شیخی کا نام بزرگی ہے۔ جب یہ پیدا ہو، کہا جائے گا بزرگی ہے۔

آج ہم اپنی حالت کو دیکھیں، ہر شخص یوں کہتا ہے کہ: میں اچھا ہوں اور یہ برا ہے اور قدیم مسلمانوں کا یہ دستور تھا کہ ہر شخص یوں جانتا تھا کہ یہ اچھا ہے اور ساری برائیاں میرے اندر ہیں۔ اس واسطے عالم میں امن تھا۔ آج ہم دوسرے کو حقیر اور اپنے کو بڑا جانتے ہیں اور اپنے کو بڑا جان کو دوسرے پر ہم ہر قسم کی زیادتی جائز رکھتے ہیں۔ تو دنیا فساد کا گھرانہ بن گئی۔ ہم نے دنیا کو فساد سے بھر دیا اور قدیم بزرگوں نے امن سے بھر رکھا تھا۔ ان میں اور ہم میں یہی فرق ہے۔ وہاں بزرگی کے معنی یہ تھے کہ اپنے نفس کی تحقیر ہو اور دوسرے کی عظمت جہاں فرمایا گیا ''ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا'' ''ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان اور حسن ظن رکھو''۔ اگر کوئی برائی بھی سننے میں آئے اس کی تاویل کرو کہ نہیں یہ نہیں یہ مطلب ہوگا۔

اچھے مطلب پر محمول کرو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی کی نیک عبادت بھی ہو تو توڑ مروڑ کر ایسے معنی بیان کریں کہ کسی طرح اس پر الزام آ جائے۔ یہ قلب کے کھوٹ کی دلیل ہوتی ہے۔ ورنہ مومن کا کام یہ ہے کہ اگر کسی کا قول، فعل یا کسی کی عبارت کچھ مبہم بھی ہو تو اس کو ایسے معنی پہناؤ کہ اس کی بریت ثابت ہو نہ یہ کہ وہ مجرم بن جائے۔

اس واسطے علماء لکھتے ہیں کہ: کسی مسلمان سے حسن ظن قائم کرنے کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن بدظنی قائم کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ جب تک ہاتھ میں حجت نہ ہو کسی سے بدگمانی پیدا کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب اپنے نفس کی حقارت اور دوسرے کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہو۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں، دوسرا بڑا ہے۔ فساد اس سے پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ یوں کہیں گے کہ میں بڑا ہوں تو حقیر ہے وہ کہے گا تو ذلیل ہے میں عزت دار ہوں، فساد شروع ہو جائے گا، جب آپ یوں کہیں کہ بڑے آپ ہی ہیں، وہ کہے نہیں بڑے آپ ہی ہیں۔ پھر نزاع کیسے ہوگا؟ لڑائی کہاں سے ہوگی تو تواضع کے اندر امن ہے اور تکبر کے اندر خلل امن اور بدامنی ہے۔ جہاں کہیں آپ فساد دیکھیں سر پھٹول دیکھیں سمجھ لیں کہ کسی متکبر کا وجود درمیان میں آ گیا ہے۔ متواضع جب ہوگا تو وہاں بدامنی کے کوئی معنی نہیں۔ وہاں تو امن ہی امن قائم ہوگا، فلاح ہی فلاح ہوگی۔ مومن کو تواضع سکھلائی گئی ہے، تکبر نہیں سکھلایا گیا۔

عظمت و کبریائی صرف اللہ کی شان ہے...... تکبر اللہ کی شان ہے۔ خدا کے سوا کسی کے لئے تکبر زیبا نہیں،

وہی فرما سکتے ہیں ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ① "زمین اور آسمان کے اندر سب بڑائیاں ان کے لئے ہیں"۔ انہی کا نام ﴿اَلْمُتَكَبِّرُ﴾ ہے وہی تکبر کر سکتے ہیں۔

یہاں پر ممکن ہے کہ کسی کو طالب علمانہ سوال پیدا ہو کہ حدیث میں تو یہ عکم دیا گیا کہ "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" ② "اللہ کے اخلاق اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرو"۔ وہ رحیم وکریم ہے تو تم بھی اپنے اندر رحم وکرم پیدا کرو۔ وہ علیم وخبیر ہے تو تم بھی اپنے اندر علم وخبر پیدا کرو۔ جہالت دور کرو۔ وہ لطیف ہے تو تم بھی اپنے اندر لطافت اور ستھرائی پیدا کرو۔ وہ حافظ وحسیب ہے۔ تو تم بھی اپنے بھائیوں کے محافظ بنو۔

جب یہ حکم ہے تو اللہ کی صفات میں سے متکبر ہونا بھی ایک صفت ہے۔ پھر چاہئے کہ ہر شخص متکبر بھی بنے۔ پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ تکبر کرنا بہت بری بات ہے۔ تو ممکن ہے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر کرنا بری بات نہیں ہے۔ تکبر تو اللہ کی شان ہے۔ وہ بری تھوڑا ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں جھوٹ بولنا برا ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ یوں کہیں گے کہ میں بڑا ہوں تو وہ سچے ہیں اور جب میں یوں کہوں گا کہ میں بڑا ہوں تو یہ جھوٹ ہوگا۔ تو جھوٹ بولنا بری بات ہے تکبر کرنا بری بات نہیں ہے۔ خدا کے سوا جو تکبر اور بڑائی کا دعویٰ کرے گا۔ وہ جھوٹا ہوگا۔ تو جھوٹ سے بچایا گیا ہے اس لئے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" ③ اپنی جگہ صحیح ہے اور تکبر اور برائی کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ ہرگز بڑائی مت کرو، جھوٹے بن جاؤ گے۔ لیکن جب متواضع بنو گے تو اللہ خود بخود بڑائی دے دے گا۔ دنیا سمجھے گی کہ تم بڑے ہو۔ تمہارے اندر بڑائی آ گئی۔ تو ایک ہے بڑا بننے کا دعویٰ کرنا اور ایک عند اللہ بڑا بن جانا ہے تو عند اللہ بڑے بن جاؤ۔ اللہ تمہیں بڑائی دے دے، یہ بڑائی قابل قبول ہے لیکن تم خود ہی کہنے لگو کہ میں بڑا ہوں۔ یہ قابل قبول نہیں ہے۔ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کا مقابلہ ہے جس کو ایک حدیث قدسی میں حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا: "اَلْكِبْرِيَآءُ رِدَآئِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ وَمَنْ نَّازَعَنِيْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهٗ" ④ "تکبر میری چادر ہے، عظمت اور بزرگی میری لنگی ہے جو اس میں کھینچا تانی کرے گا۔ میں یقیناً اس کی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچا دکھاؤں گا"۔ تو جو بھی بڑا بول بولتا ہے ہاتھ کے ہاتھ اسی مجلس میں اسے سزا مل جاتی ہے۔ چار آدمی کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی تذلیل کے درپے ہو جاتے ہیں اور جو چھوٹا بول بولتا ہے کہ میں ہیچ ہوں، میں حقیر ہوں۔ دوسرے تعریفیں کرتے ہیں کہ نہیں آپ بڑے ہیں' آپ بزرگ ہیں۔ آپ ایسے اور ایسے ہیں۔ تو بڑائی کا بول بولنا، دعویٰ کرنا، تذلیل کی علامت ہے۔ دوسرے یقیناً ذلیل سمجھیں گے۔ چھوٹا بنے گا تو دوسرے بڑا سمجھیں گے بڑائی حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دعوے کرے بلکہ دعویٰ ترک کر دے خود بخود بڑائی آ جائے گی۔ تو "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ" میں اگر بزرگی لینی ہے تو اس کا راستہ تواضع ہے۔ تکبر اور کبریائی نہیں ہے۔

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۳۷. ② ③ احیاء علوم الدین، باب بیان ان المستحق للمحبۃ ھو اللہ وحدہ ج: ۳ ص: ۴۰۰. ④ السنن لابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر، ج: ۶ ص: ۵۹ رقم: ۶۵۹۵.

جیسے آپ کسی پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔ جب چڑھیں گے تو جھک کے چڑھنا پڑے گا اور جب اتریں، تو جب تک اکڑیں گے نہیں اترنا مشکل ہوگا۔ یہ اس کی علامت ہے کہ اونچائی پر جب پہنچ سکتے ہو جب جھک کے چلو، جب اکڑو گے تو نیچے کی طرف جاؤ گے۔ اوپر نہیں جاسکتے۔ آدمی جتنا اکڑے گا زمین میں دھنسے گا۔ جتنا جھکے گا اتنا بلندی کے اوپر پہنچے گا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ۔

پستی سے سر بلند ہوا اور سرکشی سے پست　　　اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جتنا کوئی بڑا بننا چاہتا ہے اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور جو بے چارہ خود گر جاتا ہے اسے اوپر اٹھا دیتے ہیں اور بلند بنا دیتے ہیں۔

''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ'' ① ''جو اللہ کے لئے نیچا بننا چاہے اللہ اسے اونچا کرتا ہے''۔ حدیث میں ہے کہ: اگر کوئی بندہ دعویٰ کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے نماز پڑھی، میں نے حج کیا۔ میں نے اتنی نیکیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔ نامعقول! تو نے کیا کیا؟ توفیق میں نے دی، عقل تیرے اندر میں نے پیدا کی، ارادہ میں نے پیدا کیا تو نے کیا کیا؟

اور اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا اگر میں نے نماز پڑھی تو تو نے ہی توفیق دی تھی، تو نے ہی راستہ مہیا کیا تھا، تو نے ہی مجھے ہمت دی تھی۔ ساری بات خوبیوں کی تیری طرف ہے مجھ سے کچھ نہیں ہوسکا۔ اس کو فرماتے ہیں کہ نہیں چل کے تو ہی گیا تھا، مسجد تک تو ہی گیا تھا، حج کا ارادہ تو نے کیا تھا۔ اس کو سراہتے ہیں اور اونچا اٹھاتے ہیں۔ تو جو جھکتا ہے اسے اونچا کرتے ہیں۔ جو خود اونچا بننا چاہتا ہے اسے جھکا دیتے ہیں۔ اس لئے عزت پانے کا راستہ جھکاؤ ہے عزت یوں نہیں آیا کرتی کہ آپ ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں کہ کرو میری عزت نہیں تو ماروں گا۔ یہ عزت کا طریقہ نہیں عزت کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسرے کی عزت کریں وہ تمہاری عزت کرے گا۔ تو معزز بن جاؤ گے تم ڈنڈے سے دوسرے کی تذلیل کرو اور کہو میری عزت کرو۔ یہ تو خود اپنی ذلت اور رسوائی مول لینا ہے۔

تواضع علامت آدمیت ہے...... بہر حال جب تک کہ تواضع، خدمت اور خدمت گزاری نہ ہو، اس وقت تک صحیح معنی میں آدمی کے اندر بندگی نہیں پیدا ہوتی۔ مخلوق کی تذلیل وتحقیر سے آدمی خود اپنی ذلت کے راستے ہموار کرتا ہے، تو ایک طرف عظمت خداوندی دل میں ہو اور ایک طرف خدمت خلق اللہ ہو اور خادم خلق نہیں بن سکتا، جب تک کہ متواضع، منکسر المزاج نہ ہو' جب تک یہ نہ سمجھے کہ میں ان سب سے کم رتبہ ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں ان کی خدمت کروں۔ اب راستے میں کانٹے یا کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، ایک متکبر کانٹے کو اٹھانے کے لئے کبھی نہیں جھکے گا سمجھے گا میری شان کے خلاف ہے۔ میری حیثیت عرفی بہت بلند ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، ج:٦ ص: ٢٠٠١ رقم: ٢٥٨٨.

متواضع ہے تو وہ جھک کر کانچ کے ٹکڑے اپنے ہاتھ سے اٹھا پھینکے گا تا کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔ یہ خدمت وہ سر انجام دے گا جس کے قلب کے اندر تواضع اور انکساری موجود ہوگی، کبر اور ریا کاری جس کے اندر ہوگی، وہ کبھی یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکے گا۔ بہر خدمت خلق اللہ کا جذبہ تب موجود ہوگا، جب دل میں تواضع للہ کا جذبہ موجود ہو، منکسر المزاج ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے آدم علیہ السلام کا بیٹا ہو تو ضرور تواضع کرے گا اور اگر اپنا نسب نامہ شیطان سے ملالے گا، کبھی تواضع نہیں کرے گا۔ اس واسطے کہ دونوں سے لغزشیں ہوئیں آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی اور ابلیس سے بھی ہوئی۔ آدم علیہ السلام نیت کے پاک تھے مگر بھول کر ایک لغزش ہوگئی۔ حکم دیا گیا تھا کہ درخت مت کھاؤ۔ بھول کر کھالیا حالانکہ وہ نافرمانی نہیں تھی۔ نافرمانی کہتے ہیں جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ یہ نہیں ہوا تھا۔ جانتے تھے کہ اللہ نے روکا ہے۔ مگر شکل کیا پیش آئی؟ ایک تو کمبخت شیطان نے آ کے قسم کھائی ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّی لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ ① "قسم کھا کے کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں"۔ آدم علیہ السلام کا سچا قلب، آپ کسی فریب سے واقف نہیں۔ مقام جنت میں ہیں، جو کریم مقام ہے۔ یہ شبہ بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے، جب دل میں ایمان ہوتا ہے تو حسن ظن دل میں ہوتا ہے۔ دوسرے کو بھی آدمی یہی سمجھتا ہے کہ یہ بھی اچھا ہے۔ یہ خدا کا نام لے کر قسم کھا رہا ہے۔ بھلا خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنے کی جرات کیسے ہوسکتی ہے؟ ان کے ذہن میں یہ آیا۔

ہمارے بزرگوں میں سے ایک بزرگ تھے۔ حضرت میاں جی منے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے ایک محدث تھے، انکے نانا تھے۔ بالکل مادرزاد ولی اور معصوم فطرت بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے ہی نہیں۔ ایک جگہ کھونٹی گاڑ رکھی تھی دھوپ وہاں تک پہنچ جاتی۔ کہتے کہ جاؤ بھئی! چھٹی کا وقت آ گیا لڑکے شرارت کر کے کھونٹی آگے گاڑ دیتے۔ دھوپ جلدی پہنچ جاتی اور کہتے میاں جی صاحب! چھٹی دے دو، وقت ہوگیا فرماتے اچھا جاؤ چھٹی۔

لوگوں نے عرض کیا، حضرت! یہ بچے جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہوں نے کھونٹی آگے گاڑ دی ہے فرماتے: مسلمان کا بچہ جھوٹ نہیں بول سکتا، مسلمان بچے کا یہ کام نہیں۔ فرماتے، بس بھئی تم جاؤ۔ تو واقعی جس کے دل میں اسلام اور سچائی ہوتی ہے۔ حسن ظن کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کو جھوٹا سمجھتا ہی نہیں۔ سمجھتا ہے کہ سچ ہی بول رہا ہوگا۔ جب خدا کی قسم کھا کر کہے تب تو وہم بھی نہیں جاتا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تو شیطان ملعون ہے سب کچھ ہے مگر جب اُس نے اللہ کی قسم کھائی آدم علیہ السلام کا دل پگھل گیا۔ فرمایا: خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنا مشکل معلوم ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ مجھے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ممانعت کی گئی تھی اور یہ فرما دیا گیا تھا کہ یہ درخت مت کھانا کہیں حکم کی خلاف ورزی نہ ہوجائے۔ تو اس نے تاویل سمجھائی، یہ کہا کہ یہ حکم موبد نہیں تھا کہ ہمیشہ

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۱.

ہمیشہ کے لئے ہو۔ یہ حکم محدود وقت کے لئے تھا۔ اس لئے حکم دیا گیا تھا کہ اس درخت کو کھانے کی آپ میں صلاحیت نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے اس درخت کے کھانے کی استعداد پیدا ہوگئی ہے اور جب آپ کھا لیں گے تو ابدالآباد تک جنت میں رہیں گے۔

تو جنت مقام کریم وسکون ہے۔ اس میں رہنے کی تمنا آدم علیہ السلام کی فطرت کا جذبہ تھا اور قسم کھا کے اس نے خیر خواہی جتلائی اور تاویل سمجھائی کہ یہ ممانعت وقتی تھی، دوامی نہیں تھی۔ ان چیزوں سے گھبرا کر درخت کھالیا تھا۔ اسے نافرمانی نہیں کہتے۔ صورۃً تو نافرمانی ہے مگر حقیقتاً نافرمانی نہیں۔ اسے لغزش، خطاء فکری یا خطاء اجتہادی کہیں گے۔ عصیان اور نافرمانی نہیں کہیں گے۔

اور حق تعالیٰ نے بھی تعبیر فرمادیا کہ ﴿وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ ① ”آدم نے نافرمانی کی“۔ حقیقت میں آدم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر بھی ہیں۔ مگر ہیں تو اللہ کی بارگاہ کے بندے ہی، اور مقرب بندے۔ مقربین سے اگر ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو ان پر شدت تعلق کی بنا پر زیادہ سختی کی جاتی ہے۔ اگر کوئی دشمن آپ کو گالی دے آپ برا نہیں مانیں گے کہ دشمن کا کام ہی یہ ہے لیکن اگر آپ کا بیٹا ذرا ترچھی نگاہ سے بھی دیکھ لے، ڈھول مارنے کو تیار ہو جائیں گے کہ تو اپنا ہو کر یہ کام کرتا ہے تو شدت تعلق کی بنا پر تھوڑی سے بات بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام مقربان بارگاہ حق میں سے ہیں، پیغمبر ہیں۔ انہوں نے لغزش کر کے درخت کھالیا تو سختی سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تم نافرمانی کر رہے ہو۔ یعنی اتنے مقرب ہو کر کیوں تم سے لغزش سرزد ہوئی؟ تمہارے حق میں یہ لغزش بھی عصیان کا نام پائے گی۔ مگر حقیقۃً وہ عصیان نہیں تھا۔ خطاء فکری اور خطاء اجتہادی تھی۔

تو ایک طرف ابلیس سے خطا سرزد ہوئی۔ فرمایا گیا تھا کہ تو آدم کو سجدہ کر، اس نے نہیں کیا اور آدم علیہ السلام سے بھی خطا سرزد ہوئی۔ مگر فرق کیا تھا؟ آدم علیہ السلام نے خطا کے بعد کہا کہ ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا﴾ ② اے اللہ! میں نے کیا جب میں مجرم نہیں کیا جب میں مجرم، جب تک آپ نہیں بخشیں گے میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔

﴿وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ③ ”اگر آپ میری مغفرت نہیں کریں گے تو میں ٹوٹے اور گھاٹے والوں میں سے ہو جاؤں گا“۔ میرے پنپنے کی کوئی صورت نہیں بہر حال ہر حالت میں خطا کار ہوں تو اعتراف خطا کیا تو خلافت کا تاج سر پر رکھ دیا گیا ابدالآباد کے لئے مقبول بنائے گئے ان کی اولاد میں لاکھوں کروڑوں بندگان الٰہی مقبول بنے اور ان سے جنت آباد ہوگی۔

شیطان نے گناہ کر کے یہ نہیں کیا کہ یہ کہا ہو مجھ سے غلطی ہوئی بلکہ اللہ کے حکم میں اور نکتہ چینی کی کہ آپ کہتے ہیں کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ مجھے آگ سے اور آدم کو خاک سے پیدا کیا۔ جھکنا خاک کا کام ہوتا ہے آگ کا کام نہیں۔ میں کیسے آدم کے سامنے جھک جاؤں؟ گویا پورا مقابلہ ٹھانا تو ابدالآباد کے لئے ملعون بنا دیا گیا۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۲۱. ② پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۳. ③ پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۳.

تو آدم علیہ السلام نے غلطی کا اعتراف کیا، تواضع وانکساری سے پیش آئے تو خلافت مل گئی۔ شیطان کبرو ریاء سے پیش آیا ابدالآباد کے لئے ملعون بن گیا۔

اس نے کہا تھا ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ﴾ ① میں بہتر ہوں۔ آدم بہتر نہیں ہے انانیت وہاں سے چلی۔ جو انانیت برتتا ہے وہ گویا اپنا نسب نامہ شیطانؑ کے ساتھ جوڑ رہا ہے اور جو کہتا ہے کہ میں ہیچ اور خاکسار ہوں، وہ آدم کا بیٹا ہے کیونکہ انکسار کرنا اور تواضع للہ کرنا آدم علیہ السلام ہی کا کام تھا۔

حدیث میں فرمایا گیا: "انتم بنوا آدم وآدم من تراب." ② "تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں" تو مٹی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اچھل اچھل کر اوپر جائے۔ وہ جتنی پامال ہوگی اتنی ہی کارآمد ہوگی۔ اگر وہ اڑ کر کپڑوں پر پڑی، آپ لعنت برسائیں گے، کپڑے جھٹک دیں گے اگر آنکھوں میں پڑی تو برا بھلا کہیں گے اور آنکھوں کو دھوئیں گے۔ جوتوں کے نیچے رہے گی تو باعزت رہے گی اوپر چڑھے گی تو بے عزت بن جائے گی۔

انسان بھی ایسا ہے کہ جتنا متواضع ہو کر مٹی بن جائے سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے اور اگر وہ سروں پر چڑھنے لگے تو اسے پٹخ کر پامال کر دیتے ہیں' پیروں کے نیچے آ جاتا ہے تو متکبر بننا درحقیقت نسب نامہ شیطان کے ساتھ جوڑ دینا ہے۔ متواضع بننا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اپنی نسبت کرنا ہے۔ جتنا آدم کے ہم بیٹے بنیں گے۔ اتنا ہی عزت پائیں گے۔ جتنا اپنے کو کبر وانانیت سے نسبت دیں گے اتنا ہی پامال کئے جائیں گے۔

مخلوقِ خدا کی خدمت وہ کر سکتا ہے جس میں انانیت نہ ہو۔ جو یوں کہے کہ ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ﴾ ③ اسے کیا ضرورت ہے کہ دوسرے کو ایذا رسانی سے بچانے کے لئے مٹی، ڈھیلے، کانچ، کانٹے اٹھا کے پھینک دے۔ وہ کہے گا میں سب سے بہتر ہوں (سب کو چاہئے میری خدمت کریں، میں کسی کی خدمت کیوں کروں، اس لئے) میں کیوں کانٹوں کو اٹھاؤں۔ لیکن متواضع آدمی کہے گا کہ میں تو خدمتِ خلق کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں خدمت کروں۔

بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے دو رکن ہیں ایک "اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ" اللہ کے اوامر کی عظمت اور وہ پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کی بزرگی وعظمت سے دل لبریز نہ ہو جائے۔ دوسرا "اَلشَّفَقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰهِ" مخلوقِ خدا پر شفقت کرنا، ترس کھانا اور اس کی خدمت کرنا یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ تواضع للہ کا جذبہ نہ ہو۔ جب تک اپنی ہیچ دانی اپنے اندر نہ ہو، انانیت نہ ہو۔ جب یہ دو باتیں جمع ہو جائیں گی۔ کہا جائے گا کہ اس کے اندر ایمان ہے اور ایمان بھی کمال درجے کا ہے۔ کہ اِدھر اللہ سے واصل اُدھر مخلوق میں شامل اِدھر اللہ سے ملا ہوا

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۶. ② السنن للامام الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الحجرات، ج: ۵، ص: ۳۸۹ رقم: ۳۲۷۰. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۷ ص: ۱۱۵ رقم: ۲۶۶۸. ③ پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیۃ: ۷۶.

ہے اُدھر مخلوق میں ملا ہوا ہے۔ اللہ تک پہنچنے سے اس میں یہ کبر نہیں آتا کہ میں تو مقبولانِ الٰہی میں سے ہوں۔ یہ مخلوق میرے رتبے کی نہیں اسے پامال کر دے اور مخلوق میں آ کر یہ بات نہیں کہتا کہ میں رات دن چین اڑا رہا ہوں مجھے اللہ کی بندگی سے کیا واسطہ؟ بندگی میں بھی کامل، خدمت میں بھی کامل ہو تو ایمان بھی اسی کا کامل ہوگا۔

حیاءدار آدمی ہی عبادت و خدمت کر سکتا ہے...... مگر یہ کون کر سکتا ہے؟ جس کے اندر اللہ سے حیا موجود ہو جو حیادار ہو۔ کوئی بے حیا و بے غیرت ہو جائے، وہ نہ عبادت کی طرف متوجہ ہوگا نہ خدمت کی طرف متوجہ ہوگا۔ تو عظیم چیز حیا ہے اور حیا کی حقیقت وہی انکسارِ نفس کہ نفس میں انکسار ہو، نفس ٹوٹ رہا ہو اور اپنے کو دوسرے کی عظمت کے سامنے ہیچ سمجھ رہا ہو۔

تو ایمان اس زمین پر آتا ہے جس زمین میں حیاء موجود ہو، اس قلب میں گھر کرتا ہے جس قلب کے اندر حیاء موجود ہو۔ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً'' ① ''ستر سے کچھ اوپر ایمان کی شاخیں اور شعبے ہیں'' اوپر کی شاخ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ دل میں اللہ کی اتنی عظمت بیٹھ چکی ہے کہ اس کے سوا کسی کو معبود بنانے کو تیار نہیں ہے اور ایمان کا ادنیٰ درجہ ''اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ.'' ہے یعنی راستے سے ایذا دہ چیزوں کو اٹھا کر پھینک دینا تا کہ مخلوق کو تکلیف نہ پہنچے تو ایک ایمان کا اوپر کا سرا بتلایا گیا جو اللہ سے ملا ہوا ہے اور ایک نیچے کا سرا بتلایا گیا جو مخلوق سے ملا ہوا ہے۔ اور دونوں کا منشاء بتلا دیا۔ ''وَالْحَیَآءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ'' ② یہ دونوں شعبے وہ برتے گا' جس میں حیاء اور انکسارِ نفس موجود ہو اور جس میں حیاء نہیں تو ''اِذَا فَاتَکَ الْحَیَآءُ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ'' ③ ''جب آدمی سے حیاء جاتی رہتی ہے تو پھر جو چاہے کرے''۔ پھر قلب کے اندر زندگی باقی نہیں رہتی۔ بس جو کرتا ہے کرتا رہتا ہے۔

تو اس حدیث میں مومن کامل بننے کی ہدایت دی گئی اور اس کے لئے ایک طرف عباداتِ خداوندی ہے اس کا اعلیٰ قول ہے کہ زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھے اور جب زبان سے پڑھنے کا عادی ہوگا تو یقیناً قلب میں بھی توحید جمے گی اور جب قلب میں جم جائے گی تو ہر فعل سے توحید سرزد ہوگی۔ مترشح ہوگی اور نکلے گی۔ ہر فعل میں توحید رچ جائے گی۔ پھر ہر موقعہ پر ذکر اس کے اندر ہوگا۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے وہ ذاکر بن جائے گا۔

دوسری چیز فرمائی خدمتِ خلق اللہ ہے۔ اس کا بھی تعلق حیاء سے ہوگا۔ جتنا حیاءدار ہوگا اتنا مخلوق سے شفقت سے پیش آئے گا اور اس کی خدمت کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہ حدیث میں نے اس وقت تلاوت کی تھی اور اس کے

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان و افضلها و ادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵.

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان و افضلها و ادناها...... ج: ۱ ص: ۶۳ رقم: ۳۵.

③ الحدیث اخرجه البخاری فی صحیحه ولفظه: اذالم تستحی فاصنع ماشئت، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار ج: ۱۱ ص: ۳۰۳.

متعلق یہ چند جملے عرض کئے جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ میں زیادہ نہیں بول سکوں گا اور اب بھی کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ مگر بہر حال اتنے پر قناعت ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں آپ سب کو کمال ایمان کی اور حیا کی توفیق دے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

تعلیم وتبلیغ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّــا بَعْــدُ: بزرگان محترم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ مکی زندگی اور مدنی زندگی، مکی زندگی تیرہ برس کی ہے اور مدنی زندگی دس برس کی ہے۔

مکی زندگی...... مکی زندگی تکالیف ومشکلات، پریشانیوں اور کلفتوں کی ایک طویل صبر آزما زندگی ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی نبی کو اپنی قوم سے وہ ایذائیں اور تکلیفیں نہیں پہنچیں جو مجھ کو میری قوم سے پہنچی ہیں"۔ لیکن ان تمام تکالیف کے بعد بھی آپ دین کی تبلیغ واشاعت کا کام انتہائی انہماک اور لگن سے کرتے رہے مشرکین کے ایمان نہ لانے سے آپکے دل میں جو ضیق وتنگی پیدا ہوئی تھی اس پر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: آپ اپنے دل کو ان پر نہ کڑائیے بلکہ اپنے کام میں لگے رہیئے۔ آپ خدا کے حکم پر عمل کرتے رہے اور اس کی حمد وتعریف اور اس کے بھیجے ہوئے مذہب کی تبلیغ میں لگے رہے، آپ ؐ کو مجنون، کاہن، جادوگر اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا، آپ ؐ پر پتھر پھینکے گئے، آپ کو زہر دیا گیا، کوئی نازیبا حرکت نہ تھی جو آپ کے ساتھ نہ کی گئی ہو، لیکن ان سب کے باوجود آپ ؐ اور آپ ؐ کے صحابہ ؓ انتہائی صبر وثبات کے ساتھ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے سعی وکوشش کرتے رہے، خدا کی طرف سے بھی آپ کو یہی حکم ملا کہ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ﴾ ① ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا﴾ ② "آپ صبر کیجئے جیسا کہ آپ سے قبل دوسرے اولوالعزم وصاحب ہمت لوگوں نے صبر کیا" صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیئے اور اگر اس پر بھی یہ جاہل اعتراض کریں تو آپ ان پر اپنے دل کو نہ کڑائیے ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ ③ "آپ ان پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجے گئے"۔

جہادِ کبیر...... یہ بات اسلام کے منافی معلوم ہوتی ہے کہ پٹتے رہنے اور مصائب وتکالیف برداشت کرنے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا، بات یہ نہیں بلکہ خدا کا یہ حکم تھا کہ ہر قسم کی تکالیف ومصائب کو برداشت کرو اور زبان سے

① پارہ: ۲۶، سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۳۵. ② پارہ: ۲۹، سورۃ المعارج، الآیۃ: ۵. ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الغاشیۃ: ۲۲.

اُف بھی نہ کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جواب نہ دیا جائے، جواب دیا جائے اور اس سے بھی سخت دیا جائے اگر تلوار سے جسم پر حملہ کیا جائے تو اس کا جواب زبان سے روح پر حملہ کر کے دیا جائے۔ اگر تکلیف پہنچائی جائے تو دین کی بات انہیں پہنچا کر تکلیف پہنچائی جائے، عربی شاعر نے کیا خوب کہا۔

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ وَلَا يَلْتَامُ مَاجَرَحَ اللِّسَانُ

''یعنی نیزوں کے لگے زخم تو بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے لگے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں''۔ انکا اندمال نہیں، یہ زبان کا جہاد بڑا جہاد ہے۔ اسے جہاد کبیر کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ جہاد جو تلوار لے کر کیا جاتا ہے اس میں منٹوں کا قصہ ہوتا ہے اور تکلیف بھی تھوڑی دیر کی، لیکن دین کی دعوت کا جو جہاد زبان سے کیا جاتا ہے وہ اذیت و تکلیف کے لحاظ سے زیادہ سخت ہے اس میں تکلیفیں اور اذیتیں اٹھانا اور ہر لحہ قتل ہونا ہے۔ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا بہادر کون ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ جو حملہ کر کے قتل کر دے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں جو اپنے نفس کو قتل کر دے، یہ دعوت کا کام جہاد کبیر ہے، اس میں انسان طعنے سنتا، گالیاں کھاتا، تکلیفیں اٹھاتا، مصیبتیں جھیلتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے اور میدان کارزار میں آدمی جا کر جنگ کرتا ہے پھر یا تو قتل کرتا ہے یا قتل ہو جاتا ہے۔

انقلاب عظیم...... اسلام نے اپنے متبعین کو صبر و تحمل کی تعلیم دے کر جبن و بزدلی کی دعوت نہیں دی۔ بلکہ بہادری اور اولوالعزمی کی طرف بلایا ہے اور اپنے مشن کیلئے ہر قسم کی تکلیف و مصیبت برداشت کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے اور بتلا دیا ہے کہ کامیابی و کامرانی شدائد و مصائب پر اسی طرح صبر و تحمل کرنے سے ملتی ہے، مکہ کی زندگی کو دیکھئے، تیرہ آدمی مسلمان ہوئے یہ سب حضرت ارقم کے گھر میں بندر ہتے زنجیریں چڑھائے رکھتے، عدد کے اعتبار سے بھی کم، شوکت و سطوت بھی ندارد، لیکن دین کی تبلیغ میں لگے رہے، حق کی طرف بلاتے رہے، تکلیفیں اور مصائب جھیلتے رہے اور اپنی زبان سے کفار کے قلب و جگر پر نشتر زنی کرتے رہے، بالآخر ان کی پیہم سعی اور مسلسل کوشش سے ایک عظیم انقلاب آیا، اقلیت اکثریت میں بدل گئی۔ ذلت و خواری کی جگہ عظمت و رفعت نے لے لی، یہ تبدیلی تلوار کے جہاد سے رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ زبان کے اس جہاد سے ہوئی تھی جسے جہاد عظیم کہا گیا ہے اور کیسے ہوئی؟ اس طرح ہوئی کہ وہ لوگ مصائب کو جھیل گئے مگر حوصلہ نہیں چھوڑا۔

آج کی ہماری زندگی مشابہ ہے مکہ کی زندگی سے بالکل وہ حال تو نہیں جو وہاں تھا، یہاں ہماری جائدادیں ہیں، ہمیں قانونی حقوق حاصل ہیں۔ ہم جو پیشہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، لیکن اسلام کی شوکت اور اسلام کا حکم نہیں ہے، تمدن تہذیب کی ہر بات تسلیم کر لی جاتی ہے لیکن وہی بات خدا کے نام پر نہیں مانی جاتی خدا کا نام لے کر کچھ نہیں منوایا جا سکتا۔ تمدن و تہذیب کے نام پر ہر بات منوائی جا سکتی ہے ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ

﴿الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ ① ''سارا غصہ، سارا شکوہ صرف اس وجہ سے ہے کہ خدا کا نام لیا جاتا ہے'' یہاں مادہ پرستی ہے، وطن پرستی ہے، لیکن خدا پرستی نہیں ہے اس زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ آج ہم اور آپ تلوار سے طاقت پیدا نہیں کر سکتے بلکہ صرف خدا کی طرف دعوت دے کر طاقت وقوت پیدا کر سکتے ہیں۔ آج ہماری کامیابی وکامرانی و فلاح اس دعوتی کام میں مضمر ہے، دعوت وتبلیغ کا یہ کام ہماری زندگیوں میں ایک عظیم انقلاب لاسکتا ہے اور ہم میں وہ قوت پیدا کر سکتا ہے کہ جو ہم سے ٹکرائے پاش پاش ہو جائے۔

ہماری نجات کا ذریعہ..... حق بات کو دوسروں تک پہنچانا اور دین کی تبلیغ واشاعت کا کام انتہائی امانت اور دیانت سے کرنا خدا کا حکم ہے اور خدا کا کام کرنے والا خدا کی نگرانی میں ہے۔ اگر دل میں یہ تصور جاگ اٹھے کہ خدا کی مدد ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس بات کا ڈر اور کس کا خوف؟ گورنمنٹ کا ایک ادنیٰ ملازم جب سرکاری کام پر ہوتا ہے تو وہ کتنا جری ہوتا ہے اس کی تمام جرات صرف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ سرکاری ملازم ہے، اگر اس پر کوئی حملہ کرے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس نے سرکار پر حملہ کیا۔ یہی تصور دین کا کام کرتے وقت ہمارے دل میں ہونا چاہئے۔ ہم اس ملک میں اور ان حالات میں اگر اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں تو صرف مذہب کے نام سے، اس کے علاوہ ہماری نجات کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ ② قسم ہے زمانے کی زمانہ چلا آرہا ہے اور چلا جائے گا، زمانہ مکانیات پر چھا گیا ہے، مکان اپنی جگہ قائم ہے اور زمانہ پیہم گردش میں ہے سب سے زیادہ وسیع محرف زمانہ ہے، ازل سے قبل کا ہے اور انتہاء کا علم نہیں زمانہ کا پھیلاؤ بہت زیادہ، خدا تعالیٰ زمانہ کی قسم کھاتا ہے اور قسم گواہ کے قائم مقام ہے یعنی خدا تعالیٰ زمانہ کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ انسان ٹوٹے اور گھاٹے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے نیک اعمال کئے، ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے علاوہ تمام لوگ خسارہ ونقصان میں ہیں۔

قوتِ ایمان..... تاریخ دیکھی جائے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک فتح ان ہی قوتوں کو ہوئی جو ایمان والے تھے اور جن لوگوں نے ایمان والوں کی مخالفت کی، ان کو تکلیفیں دیں، ایذائیں پہنچائیں وہ ذلیل وخوار ہوئے، فرعون، ہامان، شداد، ابوجہل، ابولہب اور ان جیسے تمام مال ودولت والے جنہوں نے اپنے اپنے وقتوں میں ایمان والوں کو ستایا، پریشان کیا اور ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی لیکن انجام کار خود ہی ذلت وخواری سے دوچار ہوئے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب..... اگر کامیابی حاصل کرنا ہے تو ایمان والا بننا پڑے گا قرآن پاک نے صاف الفاظ میں فرمادیا ہے ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ ③ ''یعنی انسان کو اس کی سعی وکوشش ہی کام دے گی''، کسی دوسرے کی سعی کام نہ آئے گی۔ لیکن اس کے برخلاف حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر ثواب دوسروں کو

① پارہ: ۳۰، سورۃ البروج، الآیۃ: ۸۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ العصر۔ ③ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹۔

پہنچایا جائے تو ثواب دوسروں کو پہنچ جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک کی سعی دوسرے کے کام آتی ہے۔ اس طرح حدیث وقرآن میں تعارض واقع ہوتا ہے۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب جو ایک خدا ترس عالم تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ: میں نے جلالین میں قرآن کی یہ آیت پڑھی اور حدیث کی ایک کتاب میں ایصال ثواب کی یہ حدیث دیکھی، دونوں میں تعارض نظر آیا۔ بہت سوچا، کتابیں دیکھی لیکن کسی طرح اس کا حل سمجھ نہ آسکا۔ رات کو سونے کے لئے گھر گیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لیکن معاً یہ خیال آیا کہ اگر رات کو موت آگئی تو دو صورتوں میں سے ایک یقینی ہے یا تو حدیث کا انکار لازم آتا ہے یا پھر قرآن کا اور ان دو صورتوں میں ایمان کی سلامتی نہیں، یہ خیال آتے ہی بستر چھوڑ دیا اور پیدل گنگوہ کا سفر کیا، ۲۲ کوس کا سفر رات بھر میں کر کے صبح تڑکے گنگوہ پہنچا، مولانا گنگوہیؒ جو کہ ضعیف ہو چکے تھے بینائی جا چکی تھی اس وقت وضو فرما رہے تھے، فرمایا کہ کیوں آئے؟ میں نے عرض کیا کہ اس آیت اور حدیث میں تعارض واقع ہو گیا ہے اور اس کا حل سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، اسی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا قرآن کی اس آیت ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى﴾ ① سے نفس ایمان مراد ہے یعنی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لائے تو کسی دوسرے کا ایمان اس کے کام نہیں آئے گا اور حدیث سے مراد عمل ہے، ایمان کسی کو نہیں بخشا جا سکتا، عمل بخشا جا سکتا ہے۔

عام تبلیغ ہر شخص پر ضروری ہے...... اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ: انسان خسارہ میں ہے مگر صرف اہل ایمان اور وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں، جو ایک دوسرے کو حق وصبر کی وصیت کریں اور دوسروں کو صالح ونیکوکار بنانے کی کوشش کریں، دین کی تبلیغ واشاعت کا کام اس لئے شروع کیا گیا، کیونکہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ کام صرف علماء سے متعلق ہے، وہ مسائل جن میں اختلاف ہو انہیں نہ بیان کیا جائے بلکہ علماء اس کو بوقت ضرورت بیان کریں اور عام تبلیغ ہر شخص پر لازمی ہے امت محمدیہ کے ہر فرد سے اس ذمہ داری کو لازم ٹھہرایا گیا ہے ارشاد ہے ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② اس آیت میں اس امت کو مخاطب بنایا گیا ہے اور "لِلنَّاسِ" کہا گیا ہے "لِلْمُسْلِمِيْنَ" نہیں کہا گیا۔

تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ...... ہندوستان میں اس وقت دعوت وتبلیغ کے کام کو چند سال قبل حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے شروع کیا۔ خدا تعالیٰ نے ان کے قلب مبارک پر اس کا القاء کیا انہوں نے تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ اختیار کیا۔ کیونکہ دستور ہے کہ جب کچھ لوگ مل کر ایک بات کہتے ہیں یا کوئی کام کرتے ہیں تو اس کا اثر خاص طور پر پڑتا ہے، ایک ہی بات کو جب مختلف لوگ مختلف وقتوں میں کہتے ہیں تو اس کا اثر کبھی نہ کبھی تو ہوتا ہے حق تعالیٰ نے سورۂ یاسین میں ارشاد فرمایا ہے ﴿اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۱۰۔

فَقَالُوْآ اِنَّآ اِلَیْکُمْ مُّرْسَلُوْنَ﴾ ① ”جب ہم نے انکے پاس دو رسول بھیجے تو انہوں نے ان کی تکذیب کی تو ہم نے تیسرا رسول بھیج کران کوسرفراز کیا، انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں“۔

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے دعوت کے کام میں جماعتی طریقہ اپنایا، کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ آج کا دور اجتماعی دور ہے، کھیل کود، صنعت وتجارت وزراعت غرض ہر چیز میں اجتماعیت پائی جاتی ہے، ہر مسئلہ میں وفود جاتے ہیں میٹنگیں ہوتی ہیں ہر جگہ جماعتی رنگ دکھلائی دیتا ہے، اس جماعتی ماحول میں انفرادی بات کا زیادہ اثر نہیں ہوتا، یہی کچھ سوچ سمجھ کر مولانا مرحومؒ نے اس جماعتی کام کو جماعتی ڈھنگ سے شروع کیا، جب جماعت بنا کر کچھ لوگ کسی آدمی کے پاس جاتے ہیں اور اس حال میں کہ کاندھوں پر بستر لدے ہوئے پیدل چل کر آرہے ہیں، محنت ومشقت کے آثار چہرے سے ظاہر ہیں، لامحالہ وہ آدمی سوچتا ہے کہ یہ لوگ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ انہیں مجھ سے کوئی غرض ومطلب نہیں، پھر کیا چیز ہے جو انہیں اس تکلیف کو برداشت کرنے پر آمادہ کررہی ہے، ضرور جو یہ لوگ کہتے ہیں وہ صحیح ہوگا یہ چیز اسے بہت متاثر کرتی ہے۔

تبلیغی جماعت اور انقلابِ عظیم...... میں نے شاید کہیں لکھا ہے کہ تبلیغ کو اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر بطور فن کے القاء کیا، اس میں تعلیم وتربیت، سیر وسیاحت، روح کی دلچسپی، بدن کی ورزش ہر ایک چیز موجود ہے، آج کے دور میں یہ کام بڑا ہی مفید اور لازمی ہے، اسی وجہ سے یہ کام تیزی سے پھیل رہا ہے اور اس تبلیغ سے ایک عظیم انقلاب آرہا ہے، ہندوستان کے ہر خطے میں اور ہندوستان سے باہر جہاں بھی میں گیا وہاں میں نے تبلیغی جماعتیں اور تبلیغی مراکز دیکھے۔ رسمی انداز میں اس عالمگیر طریقہ پر کام نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ نہ فتنہ وفساد ہے اور نہ واویلا اور شور، آپ نے کہیں نہیں سنا ہوگا کہ ان جماعتی لوگوں نے کہیں غدر کیا، کہیں فساد برپا کیا۔ یہ ایک خاموش تبلیغ ہے، جو عالمگیر طریقہ سے ساری دنیا میں پھیلتی جارہی ہے اور اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی آرہی ہے۔

تبلیغ میں باہر نکلنے کا فائدہ...... تبلیغ کے کام میں آدمی کو اسکے گھر سے نکالا جاتا ہے، وہ گھر کے ماحول سے نکل کر خدا کے گھر میں پہنچتا ہے، وہاں اسے دوسرا ماحول ملتا ہے، گھر کے ماحول میں اور اس ماحول میں بڑا فرق ہوتا ہے، یہاں اسے داعی اور عامل دونوں بننا پڑتا ہے، وہ داعی بن کر آتا ہے اور عامل بن کر جاتا ہے۔

مقصدِ تبلیغ...... حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ: ہم نے علم حاصل کیا تھا غیر اللہ کے لئے مگر جب علم آ گیا تو اس نے کہا کہ میں تو خدا کے لئے ہوں۔ اس تبلیغی کام کا ایک نظام ہے اور اوقات نکالنے کا ایک اصول ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ قلب کی صفائی ہو وہ تمام دنیوی آلودگیوں سے پاک ہو، تزکیۂ نفس ہو، انشراحِ قلبی اور روحانی قوتوں کو جلا ہو، شیطانی قوتیں دبیں اور مغلوب ہو جائیں۔

① پارہ: ۲۲، سورۃ یس، الآیۃ: ۱۴۔

بے لوث خدمت...... آج کے دور میں بہت سی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن یہ تحریک اپنی مثال آپ ہے۔اس میں نہ عہدے ہیں نہ منصب ہیں نہ کرسیاں اور نہ سیٹیں ہیں، بلکہ اپنے ہی مال کا خرچ ہے، اپنی جیب پر بار ہے، یہ تحریک موجودہ دور میں دین کے تحفظ کے لئے ایک بڑی پناہ گاہ ہے، کسی ریاست کی بنیاد ہوتی ہے ''توہمات'' اور ''تنازع للبقاء'' پر لیکن یہاں اس کے برعکس ہے یہاں تنازع للبقاء کی جگہ فنا للبقاء ہے اور توہمات کی جگہ محبت و الفت ہے، ریاست کے لئے پارٹیاں بنائی جاتی ہیں اور یہاں خود بخود پارٹیاں بن جاتی ہیں۔

دو پناہ گاہیں...... آج جس دور میں ہم گزر رہے ہیں اس دور میں مسلمانوں کے لئے صرف دو پناہ گاہیں ہیں ایک دینی مدرسے اور دوسرے یہ تبلیغی کام تعلیم والے باہر سے لوگوں کو لاکر ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور پھر اپنی تعلیم دیتے ہیں اور یہ تبلیغی کام والے جمع شدہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔

دعوتِ شرکت...... تبلیغی کام ایک ٹھوس اور بنیادی کام ہے، اس پر قوموں کے عروج وزوال کی بنیاد ہے جو لوگ اس تبلیغی کام میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے وقتوں کو لگاتے ہیں وہ مزید اس کام میں لگیں، اگر پہلے کم وقت لگاتے تھے تو اب اور زیادہ وقت لگائیں اور اس کام کو محنت اور جانفشانی سے کریں جو کہیں اس پر خود عامل ہوں اور عمل کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ سب سے بڑی دلیل عمل ہے اور عمل کے بڑے اثرات پڑتے ہیں۔

حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ: دنیا میں ہر شخص اپنی بات کو خوشنما کر کے پیش کرتا ہے لیکن اگر اس کا یہ قول عمل کے مطابق ہے تو ٹھیک ورنہ اس کے لئے ہلاکت و تباہی ہے اسی طرح ہر کام کے کرنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور کچھ حدیں ہوتی ہیں، کام کو اس طرح کریں کہ دوسرے کے حقوق پامال نہ ہوں ''اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا'' ① انسان پر اس کے نفس کا، اس کی جان کا، اس کی بیوی کا، آنکھوں کا، ہر ایک کا حق ہے اگر ایک انسان ایک حق ادا کرے اور اس حق کے ادا کرنے میں دوسرے بہت سے حقوق پامال ہوں تو یہ خیر کی بات نہیں۔خیر کی بات تو یہ ہے کہ حق بھی ادا ہو جائے اور دوسرے حقوق کی پامالی بھی نہ ہو، کھاؤ بھی کہ یہ نفس کا حق ہے اور روزہ بھی رکھو کہ خدا کا حق بھی ادا ہو جائے۔

دعوتی کام کا نفع...... آج دنیا میں اور خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے راہ نجات اور فلاح و کامرانی کی راہ یہی دعوتی کام ہے۔اس کام نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے یہی کام کرنے والے پنپے ہیں۔اور یہی کام کرنے والے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ②

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب من اقسم علی اخیه لیفطر... ج:۷ ص:۷۶.

② نشان منزل، بھوپال۔ مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۶۷ء

تبلیغی جماعت اور اصلاح

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ! (1)

تمہید...... بزرگانِ محترم! اس وقت تبلیغی سلسلے کے چند مقاصد آپ حضرات سے گزارش کرنے ہیں، وہ مقاصد اور باتیں کوئی نئی نہیں ہوں گی، ہاں عنوان کا فرق ہوگا' میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد سے پہلے بطور تمہید ایک اصول عرض کردوں۔ اصول سمجھ میں آجانے کے بعد مقاصد خود بخود سمجھ میں آجائیں گے۔

اصول یہ ہے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اضداد بنایا ہے، ہر اصل کے مقابلے میں اس کی ایک ضد رکھی ہے اور ہر اصل کا تصادم اپنی ضد سے برابر ہوتا رہتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے مقابلے میں کفر ہے، توحید کے مقابلے میں شرک ہے، اخلاص کے مقابلے میں نفاق ہے، سچ کے مقابلہ میں جھوٹ ہے، ظلمت کے مقابلے میں نور ہے، دن کے مقابلے میں رات ہے۔ اسی طرح دنیا کے اندر خیر و شر، بھلائی اور برائی بھی ملی جلی چل رہی ہیں۔ اس دنیا کو نہ صرف خیر کا عالم کہہ سکتے ہیں اور نہ صرف شر کا، خیر محض اور راحت محض یہ عالم جنت ہے۔ تکلیف محض اور برائی محض یہ جہنم کا عالم ہے۔ اس دنیا کو جنت و جہنم دونوں سے مرکب کر کے بنایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں خیر و شر دونوں ہی کے آثار موجود ہیں۔

ایک غور طلب حقیقت...... غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شر و برائی اس عالم میں اصلی ہے اور یہ خود بخود چیزوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، مگر بھلائی محنت کر کے لانی پڑتی ہے، تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ آدمی محنت کرتا ہے بھلائی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر محنت نہیں کرتا تو برائی خود بخود ابھر کر سامنے آجاتی ہے مثال کے طور پر کھانا ہے اس کو خوش رنگ، خوشبودار اور خوش ذائقہ باقی رکھنے کے لئے نعمت خانہ بنوانا پڑتا ہے اسے ہوادار کمرے میں رکھنا پڑتا ہے، تب کہیں کھانا اپنی خوبیوں کے ساتھ باقی رہتا ہے، لیکن اگر یہ محنت نہ کی جائے تو کھانا خود بخود سڑ جائے گا، خراب ہو جائے گا۔ اس کے اندر بدبو پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

---

(1) عالمی تبلیغی اجتماع سہارنپور، منعقدہ ۱۹۷۱ء بروز شنبہ بعد مغرب اسلامیہ انٹر کالج میں بیان ہوا۔

اسی طرح ایک باغ ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو، چمن بندی ہوئی ہو، پھول کھلے ہوئے ہوں۔ اس کا منظر نگاہوں کو اچھا معلوم ہوتا ہو، دیکھنے سے آنکھوں میں تراوٹ پیدا ہوتی ہو، سونگھنے سے ناک میں خوشبو آتی ہو، مگر یہ ساری خوبیاں اس وقت پیدا ہوگی جب کہ آپ مالی رکھیں گے، مالی رکھیں گے اور وہ برابر باغ کی دیکھ بھال کرتے رہیں، درختوں کی جڑوں کو صاف کریں، اس کو پانی دیں، جہاں مناسب سمجھیں کتر بیونت کریں۔

لیکن اگر آپ باغ کو جھال جھنکال بنا چاہیں سو اس کے لئے آپ کو نہ تو کسی مالی رکھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی ہالی وموالی رکھنے کی ضرورت۔ بس بنانے کی محنت چھوڑ دیجئے تو خود بخود ہی چند دنوں میں باغ کی ساری سرسبزی وشادابی ختم ہو جائے گی۔

ایسے ہی مکان ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ صاف ہو، ستھرا ہو، خوش رنگ ہو، دیدہ زیب ہو، ڈیزائن اچھا ہو، ان سب کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑے گی، ماہر و تجربہ کار معمار لانے پڑیں گے، پھر مکان بن جانے کے بعد فراش رکھنا ہوگا جو برابر اس کو جھاڑتا پونچھتا رہے تب جا کر یہ خوبیاں برقرار رہیں گی، لیکن اگر آپ مکان کو ویران بنانا چاہیں، اسے اجاڑنا چاہیں تو کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، اس کے صحیح رکھنے پر آپ جو محنت صرف کر رہے تھے اسے چھوڑ دیجئے چند دن کے بعد گرد آئے گی پھر پلاستر اکھڑے گا، پھر اینٹیں جھڑیں گی، پھر چھت گرے گی، پھر دیواریں آپڑیں گی اور اس طرح مکان کھنڈر ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی اور شر کائنات کی ہر ہر چیز کی ذات کے اندر موجود ہے، انسان محنت کرتا ہے تو خیر آجاتی ہے، نہیں کرتا تو شر خود بخود ابھر آتا ہے۔ یہ اس عالم کا ایک طرز ہے اور سنت اللہ اسی طرح جاری ہے چونکہ اس عالم کا ایک بڑا فرد انسان بھی ہے لہٰذا اس کے لئے بھی اس اصول اور اس قاعدہ سے جدا ہونا ممکن نہیں، چنانچہ بلا تکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ برائی ہر انسان کی ذات میں موجود ہوتی ہے اور بھلائی لانی پڑتی ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے، آپ اس کی تربیت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں تب جا کر وہ انسان بنتا ہے اور اگر آپ یہ محنت نہ کریں، تو اس کے اندر جو برائیاں ہیں ان کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، خوبیاں پیدا کرنے کے لئے عالم بنانے کے لئے سینکڑوں ادارے ہیں، مدرسے ہیں مگر کیا جاہل بنانے کے لئے بھی آپ نے کوئی مدرسہ دیکھا؟ جاہل تو انسان بنا بنایا پیدا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْــِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے اور پھر تمہارے اندر سننے کی طاقت رکھ دی تا کہ سن سن کر علم حاصل کرو، دیکھنے کی طاقت رکھ دی تا کہ دیکھ دیکھ کر علم حاصل کرو، تدبر و تفکر کی قوت رکھ دی تا کہ اس کے ذریعہ معلومات میں اضافہ کرو''۔

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان میں علم کی استعداد اور صلاحیت تو رکھتے ہیں، مگر کوئی ماں کے پیٹ سے علم وہنر لے کر نہیں آتا۔ یہ تو انسان کے علم کا حال ہے اور جہاں تک عمل کا تعلق ہے، اس سلسلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں موجود ہے ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ ① ''میں اپنے نفس کی براءت نہیں کرتا اس وجہ سے کہ نفس تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے'' معلوم ہوا کہ نفس انسانی میں ذاتی طور پر شر موجود ہے اسلئے وہ انسان کے برے اعمال ہی کی طرف لے جائے گا۔ آپ اس کی تربیت کریں گے تو بن جائے گا اور بھلائی کی طرف آ جائے گا ورنہ برائی پیدا ہونے اور اس کی تربیت کے لئے کسی کالج اور مدرسہ کی ضرورت نہیں ہوگی، خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ ؂

قرنہا باید کہ تا یک سنگ خاراز آفتاب ۔۔۔ لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

یعنی ایک پتھر کا بے قیمت ٹکڑا جب سالہا سال اور قرن ہا قرن دھوپ میں پڑا رہتا ہے، آفتاب کی تپش اور اس کی گرمی کو برداشت کرتا ہے تب جا کے ایک باقیمت لعل بنتا ہے ؂

ماہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ بعد کشت ۔۔۔ جامہ گردد شاہدے رایا شہیدے راکفن

ایک بنولے کا دانہ محبوب کے بدن کی زینت بنے اس کے لئے مہینوں کی مدت درکار ہوتی ہے' آدمی زمین پر محنت کرتا ہے اس میں ہل چلاتا ہے، اسے کھیتی کے قابل بناتا ہے پھر بیج کو زمین بوس کر دیتا ہے، اس کے بعد اس سے کونپل نکلتی ہے، درخت بنتا ہے، روئی بنتی ہے، اسے توڑ لیا جاتا ہے، پھر مل میں بھیجا جاتا ہے، اس کی دھنائی ہوتی ہے، صفائی ہوتی ہے، سوت بنتا ہے پھر کپڑا تیار ہوتا ہے اور پھر درزی اس کی قطع و برید کرتا ہے، ان تمام مراحل سے گزر کر پھر کسی محبوب کا جامہ بنتا ہے، ورنہ تو بنولے کی کوئی قیمت نہیں تھی، زیادہ سے زیادہ کسی بھینس کے منہ میں چلا جاتا۔ آگے کہا ہے کہ ؂

سالہا باید کہ تا یک کودکے از درس علم ۔۔۔ عالمے گرد ونکو یا شاعر شیریں سخن

یعنی ایک نادان اور چھوٹا بچہ جب سالہا سال کسی مکتب اور مدرسے میں پڑھتا ہے، استاد کی مار اور سختیاں برداشت کرتا ہے اس کے بعد جا کر یا وہ عالم بنتا ہے یا شاعر۔

تو عالم بنانے اور خوش اخلاق بنانے کے لئے سالہا سال کی مدت درکار ہوتی ہے، مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، معلمین وملازمین رکھنے پڑتے ہیں، تب جا کے آدمی، آدمی بنتا ہے، لیکن جاہل و بداخلاق بنانے کے لئے نہ تو کہیں مدرسہ قائم کیا جاتا ہے اور نہ کوئی ادارہ۔ حاصل یہ کہ کسی چیز کو قیمتی بنانے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے، محنت کی ضرورت پڑتی ہے مگر بے قیمت بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

انسان کی قدر و قیمت اوصاف سے ہے...... آپ جانتے ہیں کہ اللہ میں بالذات خوبیاں ہیں، کمالات

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۳.

ہیں اور مخلوق میں ذاتی طور پر خوبی وکمال نام کی کوئی چیز نہیں اور یہ بھی مسلمہ قاعدہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت اوصاف سے ہوتی ہے، جس شئی کے اندر اوصاف زیادہ ہوں گے، اس کی اسی قدر توقیر ہوگی، عزت ہوگی اور اسی اعتبار سے اسے بلند مرتبہ اور مقام حاصل ہوگا، ایک شخص عالم ہے اس کی آپ عزت کرتے ہیں اس کے علم کی وجہ سے اور اگر وہی آپ کا استاد بھی ہو تو عزت کا ایک درجہ بڑھ جائے گا اور اگر اتفاق سے وہی آپ کا حاکم بھی ہو تو اس کی عزت کا ایک درجہ اور بڑھ جائے گا۔

حاصل یہ کہ انسان کے اندر جس قدر اوصاف بڑھتے جائیں گے، اس کی قدر و قیمت اور عزت وقار میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ بالذات انسان میں کوئی کمال نہیں، کمال ایک عارضی شئی ہے، جو محنت کر کے لایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ بچے کی تربیت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں اور اگر وہ تعلیم سے جی چراتا ہے تو لالچ دلاتے ہیں، اس لئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ بچہ کسی ہنر اور کمال کا مالک بن جائے۔

بہر حال اتنا تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی قدر قیمت اس کے اوصاف سے ہوتی ہے حضرات انبیاءؑ کی ذات بلاشبہ مقدس ہے اور ان میں بھی سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مقدس بابرکات تو حد درجہ متبرک ومقدس ہے، لیکن یہ سارے کا سارا تقدس نبوت ورسالت ہی کی وجہ سے ہے اور اسی منصب رسالت کی وجہ سے آپ واجب الاطاعت ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ لوگو! اگر میں حکم شرعی بیان کروں تو اس کا ماننا لازمی اور ضروری ہے لیکن اگر ذاتی مشورہ دوں تو اس کا ماننا ضروری نہیں، یہ اور بات ہے کہ ہر مسلمان کے قلب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حد درجہ محبت ہے اس کی وجہ سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے کو بھی حکم سمجھے اور ماننے کے لئے تیار ہو جائے، مگر جہاں تک قانون کی بات تھی وہ آپ نے بیان فرما دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے کر دیا، حضرت بریرہؓ نہایت ہی خوبصورت اور حضرت مغیثؓ بالکل معمولی شکل کے آدمی تھے، جس کی وجہ سے ان دونوں میں بنتی نہیں تھی، آئے دن لڑائی جھگڑے کا بازار گرم رہتا، حتی کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بریرہؓ کو آزاد کر دیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ باندی جب آزاد ہو جائے تو نکاح کا باقی رکھنا یا نہ رکھنا اس کے ہاتھ میں ہو جاتا ہے، حضرت بریرہؓ نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے فائدہ اٹھانا چاہئے چنانچہ انہوں نے نکاح کے فسخ کرنے ارادہ کر لیا۔ حضرت مغیثؓ حضرت بریرہؓ پر سو جان سے عاشق تھے۔ جب انہیں بریرہ کے ارادے کی خبر ہوئی تو روایتوں میں آتا ہے کہ یہ مدینہ کی گلیوں میں بے چین و بیقرار پھر رہے تھے اسی بے چینی کی حالت میں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے بریرہؓ سے نکاح کرایا تھا اور اب آپ ہی اسے باقی رکھیئے، چنانچہ حضرت بریرہؓ کو بلایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیثؓ کی جانب سے سفارش فرمائی اور بریرہؓ کو طرح طرح سے سمجھایا اور کہا کہ نکاح باقی رکھو فسخ مت کرو، بریرہؓ بھی تھیں بڑی ہوشیار، انہوں نے فوراً پوچھا، یا

رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کا ذاتی مشورہ؟ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے۔ حضرت بریرہؓ کہتی ہیں۔ پھر تو میں نہیں قبول کرتی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا ① اس سے واضح ہوتا ہے کہ ذاتی طور پر اگر حضرات انبیاء بھی کوئی بات کہیں تو اس کا ماننا بھی ضروری نہیں ہے، یوں محبت وعقیدت کی لائن سے آپ جو کچھ بھی سمجھ لیں، تو جب حضرات انبیاءؑ کے یہ درجات ہیں تو پھر ہماری آپ کی کیا حیثیت ہے اور ہم اور آپ کس شمار میں آئیں گے؟

حقیقتِ آدمیت......اس کا حاصل یہ نکلا کہ جب انسان کے اندر اوصاف وکمال جمع ہو جائیں وہ علم وفضل کا مالک بن جائے تو اس کی توقیر ہوتی ہے، عزت ہوتی ہے بہرحال میں عرض یہ کر رہا تھا کہ: اس دنیا میں برائی اصل ہے اس کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی اور بھلائی لائی جاتی ہے اس کے لئے محنت کرنی ہوتی ہے، مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے ورنہ نہ تعلیم گاہیں ہوتیں نہ خانقاہیں اور نہ اس طرح کے تبلیغی اجتماعات ہوتے، تعلیم کی حاجت ہونا یہ دلالت ہے کہ آدمی اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ نہیں بلکہ اس کو گھڑ گھڑ کر انسان بنایا جاتا ہے، آدمی پیدا ہوتا ہے مگر آدمیت بنائی جاتی ہے، آدمی کی صورت کا نام انسان نہیں بلکہ وہ تو سیرت اور اخلاق کے مجموعہ کا نام ہے، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

گر بصورت آدمی انسان بودے ——— احمد و بوجہل ہم یکساں بودے

اگر آدمی کی صورت ہی کا نام انسان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل میں کوئی فرق نہ ہوتا، صورت تو دونوں کی یکساں ہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ انسانیت دراصل آتی ہے سیرت سے، اخلاق سے، اگر صورت اچھی ہوئی لیکن باطن خراب ہے یا ظاہر درست ہے لیکن اندر ناقص اور نکما ہے تو اس سے کوئی بات پیدا نہ ہوگی، بلکہ یہ صورت حال عیب ہے ہنر نہیں اور اسی طرح باطن کے خراب رہتے ہوئے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی جدوجہد بالکل ایسی ہے جیسا کہ نجاست کے اوپر چاندی کا ورق لگا دیا جائے اس طرح نجاست کا پاک ہونا تو درکنار ورق بھی ناپاک اور ناقابل استعمال ہو جائیں گے، اسی طرح اگر کوئی بہترین لباس پہن لے مگر دل میں گندگی بھری ہو تو لباس کی وجہ سے وہ نہ تو واجب الاحترام ہوگا اور نہ اس کے کمال میں کسی طرح کا اضافہ ہوگا۔

ارسطو مشہور حکیم اور فلسفی گزرا ہے، رات دن جڑی بوٹیوں کی تلاش میں رہتا اور ان کا امتحان لیا کرتا تھا وہ اپنے کام میں اتنا مشغول رہتا کہ اسے نہ دن کی خبر ہوتی اور نہ رات کی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے دن کا تھکا ہارا راستہ پر سو گیا، اتفاق سے اسی دن بادشاہ کی سواری نکلی ہوئی تھی، آگے آگے نقیب وچوبدار ہٹو، بچو ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے آرہے تھے مگر یہ نیند میں اس طرح مست کہ اسے کچھ بھی خبر نہیں پڑا سوتا رہا، ان بیچاروں کو کسی قسم کی فکر نہیں ہوا کرتی ہے، بادشاہ کی سواری کا گزر اس کے پاس سے ہوا اسے اس طرح سوتے دیکھ کر چلتے چلتے بادشاہ نے غصہ

① الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب شفاعۃ النبی ﷺ فی زوج بریرۃ، ج: ۵ ص: ۲۰۲۳ رقم: ۴۹۷۹۔

میں ایک ٹھوکر ماری اس پر اس نے کہا "بے ادب" بادشاہ نے کہا کہ گستاخ! تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں ارسطو نے جواب دیتے ہوئے کہا: غالباً آپ جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ وہی ٹھوکر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ بادشاہ کو اس کے اس گستاخانہ کلام کو سن کر اور بھی غصہ آیا اس نے کہا بدتمیز! میرے پاس خزانہ ہے، فوجیں ہیں، قلعہ ہے، تخت و تاج ہے پھر بھی تو مجھ سے یہ گستاخانہ انداز اختیار کئے ہوئے ہے، ارسطو نے کہا کہ یہ ساری چیزیں تو باہر کی ہیں تیرے اندر میں کون سی چیز، کون سی خوبی اور کون سا کمال ہے، تو یقین رکھ کہ جس دن تیرے اوپر سے یہ قبا شاہی اتر جائے گی تو ذلیل ہو جائے گا، تیرا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ آدمی کو فخر اپنے اندر کی چیز پر کرنا چاہئے جب تیرے اندر کوئی کمال نہیں ہے تو تو کپڑوں اور تخت و تاج سے با کمال نہیں بن جائے گا۔ یہ قبا شاہی چھوڑ اور ایک لنگی باندھ۔ پھر ہم دونوں دریا میں کود یں جب معلوم ہوگا کہ تم کون ہو اور میں کون ہوں تیرے اندر کیا کمال ہے۔ اور میرے اندر کیا کمال ہے۔

حاصل یہ کہ آدمی صورت انسانی کا نام نہیں اور نہ اس کی وجہ سے آدمی باعزت اور با کمال بنتا ہے اسی طرح لباس، وہ انسان کے باہر کی چیز ہے اور دولت تو اس سے بھی باہر ہوتی ہے لہٰذا ان چیزوں کی وجہ سے با کمال ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، سرچشمۂ کمال تو خدا ہی کی ذات ہے اور ہمارے اندر جو کمال آئے گا وہ وہیں سے آئے گا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا قرب ہو بارگاہ خداوندی سے اور ظاہر ہے کہ قرب حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی، پھر جس قدر جدوجہد بڑھے گی قرب بڑھے گا اور جس قدر قرب بڑھتا جائے گا کمال آتا چلا جائے گا اور جتنا بعد ہوگا کمال کے اندر کمی پیدا ہوتی جائے گی۔

کمالاتِ انسانی...... انسان کے دو کمال ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کا علمی کمال اور دوسرا عملی کمال، علمی کمال پیدا کرنے کے لئے مکاتب ہیں، مدارس ہیں، یونیورسٹیاں ہیں اور عملی کمال پیدا کرنے کے بھی مختلف طریقے ہیں اور مختلف ذرائع ہیں، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں عملی کمال پیدا کرنے کے چار طریقے لکھے ہیں۔

صحبتِ اہل اللہ...... اول یہ کہ اہل اللہ کی صحبت میں رہا جائے، ان حضرات کی جتنی ہی زیادہ صحبت نصیب ہوگی، اتنا ہی ان کا رنگ قلب کے اندر اترتا چلا جائے گا، مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، صحبت نیک سے آدمی کے اندر خیر پیدا ہوتی ہے، خوبی پیدا ہوتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَالسُّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَ نَافِخِ الْكِيْرِ. فَحَامِلُ الْمِسْكِ: اِمَّا اَنْ يُّحْذِيَكَ وَاِمَّا اَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا طَيِّبًا. وَنَافِخُ الْكِيْرِ: اِمَّا اَنْ يُّحْرِقَ ثِيَابَكَ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا خَبِيْثَةً." ① "اچھے ساتھی اور برے رفیق کی مثال، مشک ساتھ رکھنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے پس مشک والا اگر تمہارے پاس سے بھی گزر گیا تو جب بھی نفع تم اس سے خرید لو گے تو بھی نفع، ہر حالت میں دماغ معطر

① الصحیح للبخاری، کتاب البیوع، باب فی العطار وبیع المسک، ج: ۲ ص: ۷۱۴ رقم: ۱۹۹۵۔

رہے گا۔ اور بھٹی والے سے تعلق میں کپڑا جلے گا ورنہ اس کی بدبو بلاشبہ دماغ کو مکدر رکھے گی"۔

تو بھائی! ہر چیز کے اثرات ہوا کرتے ہیں، اگر آپ دریا کے کنارے آباد ہوں گے تو آپ کے مزاج میں بھی رطوبت پیدا ہوگی خشک علاقے میں رہیں گے تو یبوست پیدا ہوگی، گلاب کے پھول کو کپڑے میں رکھ دیجئے تھوڑ دیر کے بعد نکالیں گے تو کپڑے سے بھی گلاب کی خوشبو آئے گی، ریشمی کپڑوں میں عورتیں برسات کے موسم میں گولیاں رکھ دیتی ہیں، اگلے موسم میں جب نکالتی ہیں تو کپڑوں سے گولیوں کی بدبو آتی ہے، حالانکہ کپڑے کی ذات میں نہ تو خوشبو ہے، نہ بدبو، مگر مصاحبت کا اثر پڑتا ہے، اگر گلاب کو اس کا مصاحب بنادیا جائے تو کپڑے میں خوشبو آجاتی ہے اور اگر گولیوں کو مصاحب بنادیا جائے تو اس کے اثرات کپڑے کے اندر رچ بس جاتے ہیں اور کپڑے سے بدبو آنے لگتی ہے۔ اسی طرح اہل اللہ کی صحبت کے اثرات ہوتے ہیں جن سے متاثر ہوئے بغیر انسان نہیں رہ سکتا، ایک عالم ربانی اور درویش حقانی کی شان یہ ہوتی ہے اس کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آئے گویا کہ ان کا ذکر، ذکر خدا کی تمہید ہے کسی نے کہا ہے کہ ۔

خاصان خدا خدا نہ باشند ؎ ولیکن از خدا جدا نہ باشند

جب آپ اہل اللہ کے قریب ہوں گے تو کمالات ربانی آپ کے اندر آئیں گے، صحبت صالح کے آثار خیر و برکت کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔

فیض صحبت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... یہی وجہ ہے کہ جو مرتبہ اور مقام حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں، کوئی بڑے سے بڑا قطب ہو، غوث ہو، صحابیت کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ ان حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے، آپ کی مجلس میں شریک رہے ہیں جسے آپ کی صحبت نصیب ہوئی ہو اور آپ کی مجلس میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو اس کے کمالات کا کیا کہنا، ایک آدمی آفتاب کے نیچے کھڑا ہو تو اس پر جو گرمی ہوگی وہ کمرے میں بیٹھنے والے کو نہیں ہوسکتی اور جو تہہ خانے میں بیٹھا ہوگا اس پر دھوپ اور گرمی کا اثر بھی کم ہوگا، جتنا آفتاب سے قریب ہوگا، حرارت اور نورانیت بڑھتی جائے گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب نبوت ہیں آپ سے جو بلاواسطہ مستفید ہوئے ہیں انکے فضائل و کمالات درجہ اولیٰ میں ہیں اور جو بالواسطہ ہیں ان کا ثانوی درجہ ہے اور ان حضرات سے جن لوگوں نے استفادہ کیا وہ تیسرے نمبر پر ہیں اسی طرح درجہ بدرجہ کمی ہوتی چلی جائے گی۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ'' ① ''سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر جو اس سے متصل ہو پھر جو اس سے متصل ہو''۔ سلف میں شاگرد و استاد کی اصطلاح نہیں تھی بلکہ شاگردوں کو ''صاحب'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، کہا جاتا تھا کہ یہ اصحاب ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، یہ اصحاب مالک ہیں یہ اصحاب فلاں ہیں

① الصحیح لمسلم، کتاب المناقب، باب فضائل الصحابة ثم الذین یلونهم...... ج:٦ ص:١٩٦٤ رقم: ٢٥٣٥.

اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان حضرات نے اپنے استاذ اور شیخ سے محض کتاب کے الفاظ اور معنی ہی نہیں حاصل کئے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے استاذ کے رنگ کو بھی قبول کیا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہ رنگ قبول کیا تھا جو آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ حاصل یہ کہ سب سے بڑی چیز ہے صحبت اس کے ذریعہ ایک کے قلب کا رنگ اور اس کے جذبات دوسرے کے اندر آتے ہیں، محمد حسین آزاد نے بالکل سادہ لفاظ میں ایک شعر کہا ہے ؎

ملنے والوں سے راہ پیدا کر　　　اس کے ملنے کی اور صورت کیا

یعنی تم اگر محبوب سے ملنا چاہتے ہو تو پہلے ان کے پاس آنے جانیوالوں سے رسم وراہ پیدا کرو۔ وہ کسی دن تذکرہ کردیں گے تمہاری بھی رسائی ہو جائے گی۔ ایسے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچنے کے لئے پہلے اللہ والوں سے ملا جائے، ان کے رنگ کو قبول کیا جائے، قلوب کے بدلنے کی کوشش کی جائے، اخلاق کو درست کیا جائے، نفس کی اصلاح کی جائے، پھر بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی قبول فرمالیں گے اور اپنا بنالیں گے۔

اگر کسی کے پاس علم ہے مگر اس نے شیخ کی صحبت نہیں اختیار کی ہے، اس کا رنگ نہیں قبول کیا ہے تو وہ علم صرف لفظی ہوگا حقیقی نہیں ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ (1) "اللہ سے ڈرو اور معیت اختیار کرو سچے لوگوں کی" سچوں کی معیت اختیار کرنے سے ان کے اثرات تمہارے اندر پیدا ہوں گے اور سچائی کی خوبی تمہارے ذہن میں بیٹھتی چلی جائے گی۔ صحبت ہی کی بات ہے کہ محدثین کے یہاں ان راویوں کی روایت زیادہ قابل قبول ہوتی ہے، جنہوں نے محض سنا ہی نہیں بلکہ اپنے شیخ کی صحبت بھی زیادہ سے زیادہ اٹھائی ہو۔

علم حقیقی...... دیکھو بھائی! ایک علم تو ہوتا ہے رسمی اور لفظی جو رٹنے اور کتابوں سے آجاتا ہے اور ایک علم ہوتا ہے حقیقی جو علماء ربانی اور اہل اللہ کی صحبت سے آتا ہے، بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آئے کہ وہ عالم تو نہیں مگر جاہلوں کو کون کہے عالموں کی بھی رہنمائی فرماتے تھے۔ حاجی امیر خاں صاحب ہمارے اکابر دیوبند کے ایک متعارف خادم جن سے سنی ہوئی روایات کا مجموعہ خود میں نے مرتب کیا اور حضرت اقدس حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے اس پر فوائد اپنے قلم سے تحریر فرمائے جیسا کہ معلوم ہے کہ وہ رسمی عالم تو نہیں تھے یعنی انہوں نے با قاعدہ کسی درسگاہ میں نہ پڑھا تھا اور نہ کسی مدرسہ کی ان کے پاس سند تھی مگر حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہما کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اس کی برکت سے انکے علم وفکر میں کچھ ایسی گہرائی پیدا ہوگئی تھی کہ علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی بحر العلوم اور کتابوں کی حافظ شخصیت ان سے استفادہ کرتی تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آتا ہے، وہ بداخلاق بھی ہے، مشرک بھی، مگر جب آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ محبت سے فیض یاب ہوتا ہے تو عالم بھی بن جاتا ہے، خلیق بھی بن جاتا ہے اور کریم بھی۔

تو بھائی نیک صحبت سے اخلاق بدل جاتے ہیں، روحیں پلٹ جاتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ

(1) پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ: الآیۃ: ۱۱۹.

علیہ وسلم کے ہزاروں معجزات ہیں اور معجزات کو تو چھوڑ دیجئے آپ کا یہی کم کارنامہ اور کیا کم معجزہ ہے کہ آپؐ نے عرب جیسی تہذیب واخلاق سے ناآشنا قوم کے قلوب کو بدل کر رکھ دیا، لوہے کا نرم کر دینا آسان ہے مگر قلوب اور روحوں کا بدلنا نہایت ہی مشکل، ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا ہر ہر صحابیؓ ایک معجزہ ہے۔

مؤاخاۃ فی اللہ...... لیکن اگر کسی شخص کو اتفاق سے شیخ میسر نہ آئے اور وہ کہے کہ میری بستی میں نہ تو کوئی شیخ ہے نہ کوئی عالم پھر میرے نفس کی اصلاح کی کیا صورت ہوگی، ایسے شخص کے متعلق امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اسے مایوس نہیں ہونا چاہئے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بستی میں اس کا کوئی دوست تو ہوگا ہی اور اگر نہ ہو تو ایک دو آدمیوں سے دوستی کر کے آپس میں سمجھوتہ کر لینا چاہئے کہ اگر میں کوئی برائی کروں تو تم میرا ہاتھ پکڑ کر روک دو، تم کرو گے تو میں روک دوں گا، تم سے کوئی کوتاہی ہوگی، تو میں تنبیہ کروں گا، مجھ سے ہوگی تم کرنا، اگر دوستی اس طرح ہوگئی تو زیادہ نہیں چالیس دن کے اندر سینکڑوں برائیاں ختم ہو جائیں گی۔

تو اگر کوئی شیخ نہیں ملتا، کوئی عالم نہیں ملتا۔ تو اس طرح اپنے نفس کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ: قیامت کے دن سات آدمی ایسے ہوں گے جنہیں اس دن جس دن کہ کہیں سایہ نہ ہوگا اللہ تبارک وتعالیٰ عرش کے سائے تلے جگہ دیں گے ان میں سے ایک نوع یہ بھی ہے۔ ’’**قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّهٗ: اِمَامٌ عَادِلٌ، وَشَابٌّ نَشَافِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰى يَعُوْدَ اِلَيْهِ، وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَ تَفَرَّقَا، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَاَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰى لَاتَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَاتُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ**‘‘ ①

’’آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات آدمی وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں لیں گے، جس دن کہ سوائے خدا کے سائے کے کسی کا سایہ نہ ہوگا، ایک انصاف پرور بادشاہ، دوسرے وہ نوجوان جس کی جوانی کا آغاز ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوا اور تیسرا وہ شخص جس کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہے، جب مسجد سے نکلتا ہے تو بے چین رہتا ہے، تاوقتیکہ پھر مسجد میں نہ پہنچ جائے اور دو اشخاص جنہوں نے اللہ ہی کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے ترک تعلق کیا اور ایک وہ شخص ہے کہ جس نے خدا کو یاد کیا ہو تنہائی میں اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک وہ کہ جسے ایک ایسی عورت نے زنا کی دعوت دی جو خوبصورت بھی تھی اور بلند خاندان سے تعلق بھی رکھتی تھی اس پر اس نوجوان نے یہ کہہ دیا کہ مجھے تو خدا کا خوف اس کام کی اجازت نہیں دیتا اور ایک وہ شخص جس نے صدقہ دیا اور اتنا چھپایا کہ بائیں ہاتھ کو بھی نہیں معلوم کہ داہنے ہاتھ نے کیا دیا‘‘۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل اخفاء الصدقة، ج: ٢ ص: ٧١٥ رقم: ١٠٣١۔

حدیث میں ہے کہ: ایسے دو آدمی جن میں مواخات فی اللہ تھی اگر ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور وہ مقبول عند اللہ ہو جائے تو وہ دعاء کرے گا کہ اے اللہ میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر لے آ، اسی کی وجہ سے مجھے یہ مقام ملا ہے۔

انتخاب دوست...... اور یہ جو میں نے عرض کیا کہ: اصلاح کے اس دوسرے طریقہ میں کسی دوست سے مدد لینی ہوگی، تو بھائی! دوست بھی دنیا میں ایک ہی نوعیت، فطرت اور مزاج کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں بڑا فرق اور تفاوت رہتا ہے اس لئے دوست کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا کسی نے کہا ہے نا کہ۔

دلا اندر جہاں یاراں سہ قسم اند ‌ ‌ زبانی اند و نانی اند و جانی

بنانی ناں بدہ از دربدر کن ‌ ‌ تلطف کن :بیاران زبانی

ولیکن یار جانی را بدست آر ‌ ‌ مدار اتش بگیری تا توانی

یعنی دوست کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک تو دستر خوانی دوست اگر خدا نے آپ کا دستر خوان سلامت رکھا ہے تو پھر آپ کے لئے دوستوں کی کمی نہیں جتنے چاہئے جمع کر لیجئے اور بعض زبانی دوست ہوتے ہیں ان کی بھی دنیا میں کوئی کمی نہیں اور بعض جگری اور حقیقی دوست ہوا کرتے ہیں جو صرف آرام اور راحت ہی میں نہیں بلکہ تکلیف اور مصیبت میں بھی پورا پورا ساتھ دیتے ہیں، ایسے دوستوں کی تعداد یقیناً کم ہے۔

جو دستر خوانی دوست ہوں ان کی بات تو بالکل نہ مانیو اس لئے کہ جس دن تمہارا دستر خوان لپٹ جائے گا ان کی دوستی بھی ختم ہو جائے گی البتہ انہیں انکی طلب وخواہش کے مطابق کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑا لیجئے اور جو زبانی جمع خرچ کرنے کے عادی ہوں تم بھی ان کے ساتھ دوستی زبان ہی تک محدود رکھو۔

ایک شاعر تھے انہوں نے ایک امیر صاحب کی شان میں قصیدہ پڑھا اور اس میں خوب ایران توران کی ہانکی کہ آپکی کرسی کا پایہ ہفت آسمان سے بلند ہے آپ کے تاج کے موتی، جیسے آسمان کے تارے وغیرہ وغیرہ۔ جب قصیدہ ختم ہو گیا تو امیر صاحب نے کہا کہ: پرسوں آنا تمہیں دو ہزار اشرفیاں دوں گا۔ اس سے جناب خوب خوش ہوئے اور گھر جا کر تیسرے دن کا انتظار کرنے لگے قبل اسکے کہ تیسرا دن آئے پہلے ہی انہوں نے اس امید پر کہ اب تو دو ہزار ملے گا ہی پانچ سو روپیہ قرض لے لیا، چنانچہ اب بہترین کھانے پک رہے ہیں، اعزاء واقارب کی دعوتیں ہو رہی ہیں نئے نئے جوڑے تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ جب تیسرا دن آیا تو دربار پہنچ کر امیر صاحب کو سلامی دی۔ امیر صاحب نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، دوسری مرتبہ سلام کیا، اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے، تیسری بار کھانسے اس پر بھی امیر صاحب کی نگاہ نہ اٹھی، آخر زبان ہی سے کہا کہ بندہ حاضر ہے میں نے اس دن قصیدہ پڑھا تھا اور آج کے دن آپ نے دو ہزار اشرفیاں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ امیر صاحب نے سر اٹھایا اور کہا: بھائی تم نے قصیدہ پڑھا تھا جس کے اندر محض الفاظ ہی الفاظ تھے، حقیقت اور واقعیت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا تم نے مجھے لفظوں سے خوش کر دیا۔

میں نے بھی تمہیں لفظوں سے خوش کر دیا، جیسا تم نے دیا تھا ویسا میں نے واپس کر دیا اب اور کیا چاہتے ہو؟

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ دوستوں کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ محض زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں ان کی باتوں کا حقیقت اور واقعیت سے نہ کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی واسطہ، ایسے دوستوں کی زبانوں پر اعتماد نہ کرنا چاہئے، لیکن ایسے دوست جو مصیبت میں کام آتے ہوں، خود پریشانیاں اٹھالیتے ہوں مگر دوست پر آنچ نہ آنے دیتے ہوں، ہزاروں میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ اور اسی تیسرے دوست کے متعلق شاعر نے یہ بات کی ہے کہ اسے مضبوط پکڑ لو اور اس کے تعلق ومحبت کی قدر کرو۔ بہر حال اصلاح نفس کے لئے اگر کوئی شیخ نہیں ملتا تو اپنے دوستوں ہی سے اپنی صلاح کرنی چاہئے۔

دشمن کے ذریعے اصلاح...... لیکن اگر کوئی کہے کہ میرا کوئی دوست ہی نہیں تو پھر اس کے لئے تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ذریعہ اپنی اصلاح کرے ایسا تو شاید ہی کوئی ہوگا کہ آج کے دور میں جس کا کوئی دشمن نہ ہو، آپ کے دشمن چھانٹ چھانٹ کر آپ کے عیوب اور برائیاں نکالتے اور پھیلاتے رہیں گے اب آپ کا کام یہ ہوگا کہ آپ کے اندر جو برائیاں ہیں انہیں چھوڑتے چلے جایئے۔ اگر آپ اس طرح ایک چلے دو چلے بھی گزار لیں گے تو بڑی حد تک آپ کی برائیاں ختم ہو جائیں گی اور آپ صالح بن جائیں گے۔

محاسبۂ نفس...... اور اگر کوئی کہے کہ میں تو پہاڑ کی کھوہ میں رہتا ہوں، مجھے نہ کسی شیخ کی صحبت میسر ہے اور نہ میرا کوئی دوست ہے نہ دشمن ہے پھر میرے لئے اصلاح کا کیا طریقہ ہوگا، امام غزالی لکھتے ہیں کہ اس کو بھی مایوس نہ ہونا چاہئے اس کے لئے چوتھا طریقہ محاسبہ نفس کا ہے، روزانہ سوتے وقت کم از کم پندرہ منٹ مراقبہ کرے اور سوچے کہ آج میں نے کتنی بھلائیاں کیں اور کتنے گناہ مجھ سے سرزد ہوئے، جو بھلائیاں کی ہوں ان پر شکر ادا کرے اسلئے کہ شکر یہ ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ زیادتی کی توفیق دیں گے، ارشاد خداوندی ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ① "یعنی اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم نعمتوں کو بڑھا دیں گے، تو جتنا شکر ادا کریں گے خدا تعالیٰ نعمتوں کو بڑھا دیں گے" اور جو گناہ سرزد ہوئے ہوں ان پر سچے دل سے توبہ کرے، جب صدق دل سے توبہ کر لے گا تو سارے گناہ جھڑ جائیں گے، حدیث میں ہے: "اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ." ② "گناہ سے توبہ کرنیوالا ایسا ہے کہ جیسا کہ اس سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوا"۔ اگر برابر اس عمل کو جاری رکھا جائے گا تو برائیاں ختم ہوتی جائیں گی اور نفس میں اصلاح وتقویٰ پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حاصل یہ کہ اولاً تو شیخ کے ذریعہ نفس کی اصلاح کیجئے شیخ نہ ملے تو پھر دوست کے ذریعے خوبیاں پیدا کیجئے اور اگر دوست نہ ہو تو پھر دشمن کو آلہ کار بنایئے اور اگر دشمن بھی نہیں ہے تو اپنا شیخ اپنے ہی کو بنا لیجئے، عرفی طور پر

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷.

② السنن لابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ذکر التوبۃ، ج: ۲ ص: ۱۴۱۹ رقم: ۴۲۵۰.

اصلاح کے یہ چار طریقے ہیں، ان میں سے اگر ایک بھی میسر آ جائے تو نجات کے لئے کافی ہے اور اگر اتفاق سے یہ چاروں چیزیں میسر آ جاویں تب وہ شخص کیمیا بن جائے گا کہ (۱) شیخ بھی ہو (۲) مواخاۃ فی اللہ بھی ہو (۳) دشمن بھی ہو اور (۴) محاسبہ بھی ہو گویا اگر کسی کو یہ چاروں چیزیں میسر آ جائیں تو پھر زہے قسمت وز ہے نصیب۔

تبلیغی جماعت اصلاحی طریقوں کی جامع ہے...... اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ اصلاح کے ان چاروں طریقوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے تو یہ تبلیغی جماعت ایک ''معجون مرکب'' ہے گویا یہ نسخہ امرت کا بن گیا جس میں اصلاح نفس کے یہ چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں۔ الغرض اس میں محنت کرنے سے بہت ہی بڑا فائدہ ہوگا آپ کہیں گے کہ تبلیغ میں نکالا کیوں جاتا ہے؟

تو تبلیغ میں اس لئے نکالا جاتا ہے کہ اس میں بزرگوں کی صحبت میسر ہوتی ہے پھر ساتھی اچھے ملتے ہیں، جو ایک دوسرے کو برائی سے روکتے ہیں اور پھر جب وہ اپنا خرچ کر کے باہر نکلا ہے تو دینی جذبات بھی ابھریں گے اسے اپنی اصلاح کا خیال پیدا ہوگا، اس لئے کہ جب وہ اپنا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور ہر قسم کی مشقت برداشت کر رہا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ اثر لے کر ضرور ہی آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر یہ اثر لے کر نہ لوٹے تو وہ انسان نہیں پتھر ہے۔ اگر انسان ہے تو ضرور وہ اثر لے کر آئے گا۔ کیونکہ وہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہا ہے۔

جماعت کی برکات...... بہت ممکن ہے کہ اس مجموعہ مرکب میں بعض کمزور ارادہ، بعض نحیف عمل، بعض خام علم والے جمع ہو جائیں اور شبہ یہ ہو کہ تبلیغ سے حاصل ہونیوالا فائدہ یقینی ہونے کی بجائے موہوم ہو کر رہ جائے گا۔ تو بھائی اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ کمزوروں سے مرکب اجتماع، جمعیت اور اتحاد کی بنا پر یہ ایک قوت حاصل کر لے گا جیسا کہ اس کی نظیر خود ہی ہمارے فن حدیث میں بھی موجود ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ اگر کسی حدیث کے سلسلے میں چند ضعیف سندیں جمع ہو جائیں تو وہ حدیث بھی محدثین کے نزدیک قوی سمجھی جانے لگتی ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اگر چند بھیک مانگنے والے دو، دو، چار، چار پیسے جمع کر لیتے ہیں تو سب کے کھانے کا انتظام ہو جاتا ہے اور اگر علیحدہ علیحدہ چاہیں تو کسی کا بھی پیٹ نہیں بھر سکتا، ایسے ہی اگر چند ضعیف العمل اور ضعیف روحانیت والے نیک نیتی سے جمع ہو جائیں گے تو ایک کا دوسرے پر اثر پڑے گا اور سبھی کے اندر قوت پیدا ہو جائے گا۔ اور بھائی ان حضرات کی نیک نیتی میں کیا شبہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ حضرات نہ تو تجارت کے لئے جمع ہوتے ہیں نہ کھیتی باڑی اور نہ کسی دوسرے کاروبار کے لئے۔

پھر یہ بھی تو سوچئے کہ دس پندرہ آدمیوں کی جماعت میں کوئی نہ کوئی تو مقبول خداوندی ضرور ہی ہوگا اور ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی مقبولیت کا اثر دوسروں پر یقیناً پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ مومن کو نماز با جماعت پڑھنے کا حکم ہے۔ اس لئے کہ وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ ساری جماعت کے نمازی بھی کمزور کیوں نہ ہوں، پھر بھی مجموعہ میں خدا کا کوئی مقبول بندہ ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی وجہ سے پوری جماعت کی نماز قبول ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ جماعت میں خواہ کتنے ہی ضعیف کیوں نہ ہوں، لیکن خدا کا کوئی مقبول بندہ ضرور ہوگا جس کی وجہ سے

اس کی مقبولیت ضرور ہوگی۔

نیک نیتی کا اثر......اور پھر وہ اپنی ذاتی غرض سے نہیں نکلے ہیں، بلکہ اللہ کے رضا کے لئے نکلے ہیں۔اس نیک نیتی کا اثر بھی پڑتا ہے، کیونکہ یہ اللہ کا نام سیکھنے جارہے ہیں۔خدا کو یاد کرنے کے لئے جارہے ہیں۔تو جب اس نیت سے اللہ کے راستہ میں نکلیں گے تو اس کا اثر بھی ضرور آئے گا۔گویا اس طرح فی الجملہ صحبت شیخ وصحبت صلحاء میسر آجائے گا۔بہر حال یہ سب سے پہلی چیز صحبت اہل اللہ ہے۔

تبلیغی بھائی......پھر جب ایک جذبہ سے جائیں گے تو مواخاۃ (بھائی چارگی) بھی قائم ہوگی، یہی وجہ ہے کہ ان میں باہم دوستی بھی قائم ہوجاتی ہے۔اس لئے واپس آنے کے بعد ایک دوسرے کو تبلیغی بھائی کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں کہ تبلیغی بھائی آرہے ہیں گویا ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی بن جاتا ہے اور آپس میں ایک قسم کی اخوت ہوجاتی ہے۔

جماعت کی نماز کی بھی یہی خصوصیت ہے، جب لوگ مسجد میں آتے ہیں تو ایک کی دوسرے سے آنکھیں چار ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں باہمی محبت پیدا ہوجاتی ہے اور جب ان میں سے کوئی کبھی غائب ہوتا ہے تو دوسرے سے معلوم کرتے ہیں کہ فلاں تو روزانہ آیا کرتا تھا آج کیوں نہیں آیا معلوم ہوا کہ بیمار ہے، پھر لوگ اس کی عیادت کے لئے جائیں گے اور اس طرح لوگوں کو عیادت مریض کا ثواب حاصل ہوگا۔نیز اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل ہوگا۔حدیث میں ہے کہ مرض کی حالت میں آدمی کو اللہ تعالیٰ سے بے حد قرب ہوتا ہے۔حدیث ہی میں ہے کہ بندے کو اللہ تعالیٰ سے نعمتوں میں اتنا قرب نہیں ہوتا جتنا کہ مصیبتوں میں ہوتا ہے۔نیز حدیث ہی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے فرمائیں گے کہ میں بیمار ہوا تھا تو میری مزاج پرسی کے لئے نہیں گیا، بندہ کہے گا کہ اے باری تعالیٰ آپ کی ذات تو ان چیزوں سے پاک ہے، آپکے بیمار ہونے کا کیا سوال؟ باری تعالیٰ فرمائیں گے میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا، اگر تو اس کی عیادت کے لئے جاتا تو مجھے اس کی پٹی پر موجود پاتا، تو پھر تجھے بھی وہ قرب نصیب ہوتا جو میرے اس بندے کو مجھ سے حاصل تھا۔

حاصل یہ ہے کہ ایک مریض کی عیادت کے لئے جانے سے عیادت کے ثواب کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب بھی نصیب ہوگا، اگر خدانخواستہ اس کا انتقال ہوگیا تو سب کے سب اس کے کفن دفن میں لگیں گے اس کا بھی ثواب ملے گا گویا کہ از اول تا آخر ثواب ہی ثواب ہے، یہ ہیں برکات مسجد میں حاضری اور بروقت مسلمانوں کے آپس میں ملنے جلنے کے نتائج، اب آپ دیکھئے کہ تبلیغ والے مرکز ہمیشہ مسجد کو ہی بناتے ہیں تو مسجدوں کی وہ برکات جو مسجد میں آنیوالوں کے لئے مخصوص ہیں۔خود تبلیغ والوں کو ضرور بلکہ کچھ زائد ہی نصیب ہونگی اور پھر ایک مشرب ایک مسکن ایک مطعم کی بناء پر جو مواخات بھائی بندی کے جذبات باہم رونما ہوتے ہیں یہ تبلیغ والے اس سے کبھی محروم نہیں رہ سکتے تو تبلیغی جماعت میں نکل کر شیخ بھی ملے، دوست بھی ملے، نیت بھی اچھی ہوئی اور پھر اچھی بات

کہنے کا موقعہ بھی ملا۔

جماعت میں دشمنوں سے عبرت کا موقع......اب جب اچھی بات کہو گے تو ہر ایک ٹھنڈے دل سے نہیں سنے گا بلکہ اس کے مخالف ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت میں رہ کر دشمنوں سے بھی نصیحت حاصل کرنے کا بہترین موقع حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ آپ دس لوگوں کے پاس جائیں گے، دس منہ ہوں گے، دس قسم کی باتیں ہوں گی، کوئی بدعتی کہے گا، کوئی وہابی کہے گا اور بھی طرح طرح کی سخت وسست باتیں آپ کو لوگ کہیں گے، آپ کے عیوب اور خرابیاں نکالنے کی کوشش کریں گے، جب آپ بار بار اس قسم کے لوگوں کو سنیں گے تو غور کریں گے کہ آخر میرے اندر کیا کمزوریاں ہیں کیا کوتاہیاں ہیں پھر ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معلوم کر کے آپ ان کو دور کرنے کی فکر کریں گے۔ حاصل یہ کہ اس میں نیک لوگوں کی صحبت بھی میسر، دوستی بھی میسر، دشمنوں سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا بھی موقعہ۔

تبلیغ میں محاسبہ......اور ان تمام باتوں کے ساتھ جب آپ رات کو پڑ کر سوئیں گے تو یقیناً سوچیں گے کہ آج میں نے کتنی نیکیاں کیں اور کتنی برائیاں کیں اور پھر آپ کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ رات کا وقت ہے حق تعالیٰ سے قرب ہے لاؤ نیکیوں پر اس کا شکریہ ادا کروں اور برائیوں سے توبہ کرلوں، تو اس طرح نیکیوں کا سلسلہ بڑھ جائے گا اور برائیاں گھٹتی چلی جائیں گی۔ تو بھائی! اس جماعت میں یہ چاروں دوائیں موجود ہیں، جو ہدایت کے لئے ایک ایسا معجون مرکب ہے کہ اس کے بعد پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔

تبلیغ اور اصلاح......اور مقصود اصلی یہ ہے کہ پہلے خود ہمارا ہی دین درست ہو یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ابتداء خود اپنے ہی سے کرنی پڑتی ہے، ضروری ہے کہ آدمی پہلے خود صالح بنے، پھر دوسرا مقام یہ ہے کہ دوسروں کو صالح بنائے، ایک دوسرے کو دیکھ کر عمل کرے گا تو صالح بنے گا۔ دوسروں کو عمل کی دعوت دے گا تو مصلح بنے گا۔

اعتراضات اور ان کا اصولی جواب......رہ گئے تبلیغی جماعت پر اعتراضات تو لوگ کرتے رہتے ہیں، کون سا ایسا کام اور کون سی ایسی جماعت ہے جس پر اعتراضات نہیں ہوتے، آپ اعتراضات کو چھوڑ دیجئے اور کام کرتے جائیے۔ مثال کے طور پر لوگ ایک اعتراض یہ کیا کرتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے صرف فضائل بیان کرتے ہیں۔ مسائل نہیں بیان کرتے اور دین درست ہوتا ہے مسائل سے، فضائل سننے کے بعد دل میں امنگ تو پیدا ہو جاتی ہے مگر جب آگے مسئلہ نہیں معلوم ہوگا تو ممکن ہے کہ لوگ امنگ اور جذبات کی رو میں بہہ کر من گھڑت عمل شروع کر دیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ بدعت میں مبتلا ہوں گے۔

لوگوں کا یہ کہنا کہ اس طرز عمل سے لوگ بدعت کے اندر مبتلا ہوتے چلے جائیں گے۔ اولاً تو محض احتمال اور امکان کی بات ہے دیکھنا یہ ہے کہ واقعہ کیا ہے چالیس برس کے اندر کتنے لوگ بدعت میں مبتلا ہوئے؟

رہا مسائل کا نہ چھیڑنا، اس کا اگر یہ جواب دیا جائے کہ ہم پہلے فضائل بیان کر کے جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بعد میں مسائل چلائیں گے، تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ چالیس سال سے تبلیغ چل رہی ہے کیا آج تک جذبہ ہی پیدا نہیں ہوا؟ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ تبلیغ والے فضائل ہی تو بیان کرتے ہیں مسائل سے انکار تو نہیں کرتے، کیا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ کسی سے نہ پوچھو، ہرگز وہ ایسا نہیں کہتے۔

دوسرے یہ کہ کام کرنے کے مختلف میدان اور مختلف لائنیں ہوتی ہیں، کوئی درس و تدریس کی لائن اختیار کرتا ہے، کوئی وعظ و تبلیغ کی، تو کوئی سیاست و حکمت کی، ان حضرات نے بھی ایک لائن اختیار کر لی ہے، فضائل بیان کرتے ہیں، لوگوں کے اندر دینی جذبہ اور امنگ پیدا کرتے ہیں، اب ساری لائن وہی اختیار کر لیں، یہ نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن۔

جب آپ کسی کام کو شروع کرتے ہیں تو آپ کام کرنے سے پہلے کچھ مقاصد اور اصول مقرر کرتے ہیں اور اپنی لائن متعین کرتے ہیں، اس میں آپ سب چیزوں کو داخل نہیں کرتے، تو پھر آپ اس میں سب چیزوں کو کیوں شامل کرنا چاہتے ہیں؟ بہرحال جب کوئی اعتراض کرے تو اسے سن لینا چاہئے اور اپنا کام کرتے رہنا چاہئے عمل ہی سب اعتراضات کا جواب ہے۔

مقصد تبلیغ...... بس تبلیغ والوں کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر دین کا جذبہ اور دینی امنگ پیدا کر دی جائے، اب اس امنگ سے آدمی دین کی جس لائن میں بھی کام لینا چاہے لے سکتا ہے، نیز دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب کسی چیز کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی خود ہی اس امنگ کو صحیح طریقے سے پورا کرنے کی جدوجہد اور سعی کرتا ہے۔ اگر آپ کے اندر صحیح امنگ پیدا ہو گئی ہے اور آپ کو مسائل کی طلب ہے تو علماء سے ملئے، مدرسے میں جائیے اور مسائل معلوم کیجئے باقی کام میں نہ لگنا اور اعتراضات کا کرنا یہ حیلہ کرنیوالوں کا کام ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ہر جماعت کا ایک نصب العین اور طریقہ کار ہوتا ہے، آپ کا اس پر دوسری چیزوں کو لادنا کہ فلاں چیز کو بھی اس میں شامل کر لیجئے کسی طرح مناسب نہ ہوگا، جب اس جماعت نے اپنا ایک موضوع متعین کر لیا تو آپ کو چاہئے کہ آپ اسے اس پر کاربند رہنے دیں۔

بہرحال تبلیغ سے نفع اظہر من الشمس ہے کہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں دین کی امنگ اور طلب پیدا ہوئی اور اسی امنگ اور طلب کی وجہ سے کتنی بدعات ختم ہوئیں ورنہ لاکھوں آدمیوں کا محض اللہ اور اللہ کے دین کی خاطر اپنا پیسہ خرچ کر کے سفر کرنا، اپنا کھانا، اپنا پینا، پہلے یہ جذبہ کہاں تھا تو اس سے جو نفع پہنچا اس کو تو آپ بیان نہ کریں اور جو ان کا منصوبہ نہیں اس کو آپ اعتراض کی بنیاد بنائیں، یہ تو کوئی مناسب بات نہ ہوگی۔

خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے...... بہرحال! اصلاح نفس کے چار جز اور چار طریقے ہیں اور تبلیغ کے اندر حسن اتفاق سے چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں، صحبت صالح بھی ہے۔ ذکر و فکر بھی ہے۔ مواخاۃ فی اللہ بھی ہے۔ دشمن سے عبرت و موعظت بھی ہے اور محاسبہ نفس بھی ہے اور انہی چاروں کے مجموعہ کا نام تبلیغی جماعت ہے۔ عام لوگوں کے لئے اصلاح نفس کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا، اس طریقہ کار سے دین عام ہوتا جا رہا

ہے اور ہر ملک کے اندر یہ صدا پہنچتی چلی جا رہی ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کے عقائد درست ہو رہے ہیں، لوگ تیزی سے اعمال کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں کم از کم ان تجربات کو سامنے رکھ کر اعتراض کرنے والوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا اور غور کرنا چاہئے۔

اس لئے اس میں خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے، آپ خود داخل ہو کر اس بات کا فائدہ محسوس کریں گے کہ اس کام سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا؟ آپ اسے تجربات کی روشنی میں معلوم کر لیجئے جو شخص بھی حسن نیت سے اس کام میں آئے گا، اس کا اثر اسے ضرور ہوگا۔ اس کام میں دعوت بھی ہے اور دعوت ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی، نماز کی محنت بھی ہے، ساتھیوں کے ساتھ تعلق بھی ہے، ذکر بھی ہے اور محاسبہ بھی ہے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس محنت سے بہت سی خیر اور بھلائی انسان میں آ رہی ہے۔ کتنے برے تھے جو جماعت کی وجہ سے اچھے بن گئے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ برے عقیدے والے صالح عقیدے والے بن گئے۔

بے جا اعتراض......اور پھر اعتراضات تو وہ قابل قبول ہیں، جو کام میں گھس کر کئے جاویں اور جو باہر بیٹھ کر اعتراضات کرے وہ قابل قبول نہیں ہوا کرتے، اگر اندر گھس کر کوئی اعتراض کرے تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن اندر گھسنے والا کوئی اعتراض کرتا نہیں۔ کیونکہ داخل ہونے کے بعد اسے اس کام کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ سب باہر کے اعتراضات ہیں جو قابل قبول نہیں۔

یوں تو اعتراضات سے مدرسے والے بھی خالی نہیں۔ اللہ و رسول بھی اعتراضات سے خالی نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی نسبت کہا گیا کہ اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کی باتیں کہنا کسی طرح بھی گالی سے کم نہیں، بخاری شریف کی ایک حدیث میں: "قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: کَذَّبَنِی ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ ذٰلِکَ، وَشَتَمَنِیْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ ذٰلِکَ. فَاَمَّا تَکْذِیْبُہٗ اِیَّایَ فَقَوْلُہٗ: لَنْ یُّعِیْدَنِیْ وَلَیْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَھْوَنَ عَلَیَّ مِنْ اِعَادَتِہٖ. وَاَمَّا شَتْمُہٗ اِیَّایَ فَقَوْلُہٗ: اِتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا، وَاَنَا الْاَحَدُ وَالصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لِّیْ کُفُوًا اَحَدٌ." ترجمہ: "اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نے مجھ کو جھٹلایا۔ حالانکہ اس کے لئے مناسب نہ تھا کہ میری تکذیب کرے اس نے مجھے برا بھلا کہا حالانکہ یہ اسے زیبا نہ تھا۔ تکذیب مثلاً یہ کہنا کہ اللہ مجھ کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہ کریں گے۔ حالانکہ پہلی مرتبہ کے مقابلے میں دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ یوں کہتا ہے کہ اللہ صاحب اولاد ہے، حالانکہ میں ایک ہوں بے نیاز ہوں اور نہ کوئی میرا باپ ہے نہ بیٹا اور نہ ہی میرا کوئی شریک وساجھی ہے"۔

آپ خود سوچئے کہ اس سے زیادہ گالی کیا ہوگی کہ کسی آدمی کے متعلق یہ کہا جائے کہ فلاں کے سانپ پیدا ہوا ہے اس شخص کے لئے کتنی شرم کی بات ہوگی، حالانکہ سانپ بھی جاندار ہے اور اس معنی کر کے دونوں میں ایک گونہ

مماثلت ومشابہت ہے۔

اور بھائی! اللہ تبارک تعالیٰ تو نور ہیں، پھر انکے لئے بیٹا اور بیٹی ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس طرح رسولوں کو بھی مورد طعن وتشنیع بنایا گیا۔ کسی نے کہا یہ تو کاہن ہیں، کسی نے کہا جادوگر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو اللہ ورسول بھی اعتراض سے نہیں بچ سکے تو ہماری اور آپ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ بہر حال اعتراض کرنیوالے تو سب پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہ چاہئے۔

اعتراض کی حقیقت...... اعتراضات کا دائرہ بہت وسیع اور نہایت آسان ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ علمی لائینوں میں سب سے زیادہ مشکل کام فتویٰ دینا ہے۔ اس لئے کہ کسی مسئلے کے متعلق فتویٰ دینے کے لئے سینکڑوں جزئیات سامنے رکھنی پڑتی ہیں، جب تک تمام جزئیات سامنے نہ ہوں۔ فتویٰ دینا مشکل ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دو واقعے اور دو مسئلے بالکل ایک جیسے مگر حکم دونوں کا جدا جدا، حضرت نے فرمایا کہ: بڑے سے بڑے عالم کا مفتی ہونا ضروری نہیں۔ پھر فرمایا کہ: اس سے آسان کام درس دینا ہے، افتاء میں سینکڑوں جزئیات سامنے رکھنی پڑتی ہیں، غور کرنا پڑتا ہے، دماغ پر زور ڈالنا ہوتا ہے اور درس دینے والا ایک عبارت کو دیکھ کر اس کا ماحصل بیان کر دیتا ہے اور فرمایا کہ درس دینے سے بھی آسان کام تقریر کرنا ہے اور وہ بھی عامیانہ اور میں ان تینوں پر ایک جزیہ کا اضافہ کر کے یوں کہتا ہوں کہ ان سب سے آسان ہے اعتراض کا کر دینا، جس پر چاہے اعتراض کر دیجئے، صحابہؓ پر اعتراض، ائمہ مجتہدین پر اعتراض، لطف کی بات یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے تھکتے نہیں اور تھکیں بھی تو کیسے، اس لئے کہ اس میں نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے اور نہ عقل کی، بس ہر بات کے متعلق یہ کہہ دیجئے کہ یہ غلط ہے۔

اور اعتراض کرنے کے لئے علم کی بھی ضرورت نہیں، اعتراض کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں، جن کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہوتی نہ علم کی نہ عمل کی اتنا آسان کام ہے اعتراض کا کرنا ایسے آسان کام کو ہر کوئی شخص کر سکتا ہے۔ تو بھائی! اگر کچھ لوگ ایسے گئے گزرے اور آسان کام کو اختیار کرتے ہیں تو کرتے رہیں، اس سے آپ کا کیا نقصان ہوتا ہے، آپ اپنے کام میں پورے طریقے سے مشغول رہئے، کل میدان قیامت میں اعتراض کرنیوالے بھی کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والوں کی بھی صفیں لگی ہوں گی، ہر ایک کی محنت کا ثمرہ اس کے سامنے آ جائے گا۔

انعام خداوندی...... یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق اور آپ کی قسمت کی بات ہے کہ آپ کے حصے میں کام کرنا آیا اور دوسروں کے نصیب میں اعتراض کرنا۔ اس لئے آپ تو خوش رہئے کہ حق تعالیٰ نے آپ لوگوں کو کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور اعتراضات سے بچالیا۔ اور رہ گیا اوروں کا اعتراض کرنا، اس کے لئے آپ لوگوں کا عمل خود جواب ہے، مثل مشہور ہے کہ۔ ''ایک چپ سو کو ہرا دیتی ہے''۔ اور چپ سے بڑھ کر عمل ہے اس سے کچھ بھی اشکال قائم نہیں رہے گا۔

خلاصہ: بہر حال میں نے عرض کیا کہ: اصلاح نفس ضروری ہے اور اصلاح نفس کے طریق کو بھی میں نے بیان

کر دیا اور اس کام میں اصلاح نفس کے تقریباً چاروں طریقے موجود ہیں جو جتنی محنت کرے گا، اتنی ہی ترقی حاصل کریگا۔ اس لئے کہ جب آپ عمل کریں گے تو اس پر اس کام کے ثمرات بھی ضرور مرتب ہوں گے۔ اب تک معترضین کے متعلق جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ ان کے اعتراض کو مان کر کے، اور اگر غور کیا جائے تو سرے سے ان کے اعتراضات ہی قابل تسلیم نہیں۔ اس لئے کہ اس میں بڑے اور پرانے لوگ بھی تو موجود ہوتے ہیں، جن سے کام کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں اور اصول سے کام کرنے میں ترقی ہوگی، بعض ارباب درس وتدریس ہوتے ہیں اور بعض اہل فتویٰ ان سے آپ کو روکتے بھی نہیں ہیں۔ اگر کسی کو علم حاصل کرنا ہو تو ان سے حاصل کر سکتا ہے مسئلہ معلوم کرنا ہو تو ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔ کام کرنے والوں کیلئے یہ سب باتیں ہیں اور محنتیں ہیں۔ اور نہ کام کرنے والوں کے لئے یہ سارے اعتراضات ہیں، بہرحال نسخہ ہے مکمل ہاں دل ہی اگر نہ چاہے تو اور بات ہے کسی نے صحیح کہا ہے کہ ''اگر تو ہی نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں'' تو بات بتلانے والوں نے بتلا دی، اعلان کرنے والوں نے آواز بھی لگا دی، منزل بھی بتلا دی' ثمرہ بھی بتلا دیا کہ یہ سامنے آئے گا۔ اب ان حضرات کی ذمہ داری نہیں کہ وہ آپ کی طرف سے چلیں بھی، آپ چلیں گے اور کام کریں گے تو اس کا پھل پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ نفع عام ہے اس لئے اس میں ضرورت ہے کہ سب چلیں۔ اگر آپ تعلیم میں شرکت کر سکتے ہیں تو تعلیم میں شریک ہوں، گشت میں شرکت کر سکتے ہوں، تو گشت میں شریک ہوں اور اگر کچھ اوقات لگا سکتے ہوں تو اوقات بھی لگائیں۔ اور بھائی! اس سے کنارے رہنا بڑی ہی محرومی کی بات ہے۔ فکری طور پر ہو، عملی طور پر ہو، جس درجہ میں بھی ہو، اس میں شریک رہنا چاہئے۔ یہاں آنے کا اصل مقصد حضرت شیخ مدظلہ سے ملاقات تھی پھر اس کے بعد آپ حضرات کی درخواست کو چلتے چلتے پورا کرنا بھی ضروری تھا۔ سو ملنے کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔ بہرحال نفس کی اصلاح ہوگی تو انسان کامل ہوگا اور یہ بات حاصل ہوگی ان طریقوں سے۔ حق تعالیٰ ان چند کلمات کو قبول فرمائیں۔ اور ہمیں بھی اور آپ کو بھی عمل کی توفیق عطاء فرمائیں۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جماعتی تبلیغ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. ②

ہمیشہ دین ایک رہا اور شرائع حسب مزاج اقوام نازل ہوتی رہیں...... بزرگان محترم، و برادران عزیز! اللہ کا دین ایک ہی ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی رہا۔ البتہ شریعتیں مختلف ہوئیں۔ مگر اصل دین ایک رہا۔ اصل دین میں بنیادی چیزیں داخل ہیں۔ جیسے وجود خداوندی، توحید الٰہی، رسالت و نبوت، عالم برزخ، عالم حشر، جنت و دوزخ میزان، پل صراط۔ یہ تمام چیزیں تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دی گئیں، جو بنیادی اصول ہیں۔ آگے شریعتیں عملی پروگرام ہیں، جو ان اصول کے تحت ہیں، وہ اقوام کے مختلف مزاج و نفسیات اور ان کی طبعی افتاد کے باعث مختلف رہی ہیں۔ جیسی ضرورت ہوئی، اسی انداز کا عمل ان کو بخشا گیا، اگر قوم سخت مزاج ہوئی، تو شرعی احکام سخت نازل ہوئے۔ اگر کسی قوم کے مزاج میں نرمی تھی، تو احکام میں بھی نرمی رکھی گئی، اگر اعتدال ہے تو احکام میں بھی اعتدال رکھا گیا۔ غرض عملی احکام نفسیات اقوام اور افتاد مزاج کے مطابق حق تعالیٰ نے نازل فرمائے۔

اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ: اَبُوْنَا وَاحِدٌ اُمَّهَاتُنَا شَتّٰى ③ "باپ ہمارا ایک ہے مائیں مختلف ہیں"۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۳، ۱۴۔

② بروز جمعرات ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ بمطابق ۱۶ نومبر ۱۹۷۸ء بعد نماز مغرب، مسجد حفائر، مکہ مکرمہ۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قولہ تعالیٰ واذکر فی الکتب مریم، ج: ۱۳ ص: ۱۲۷ رقم: ۳۲۵۹۔

باپ سے اصول کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دین سب کا ایک ہے اور امہات سے عملی احکام کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی شریعتیں مختلف ہیں۔ اس لئے ہر نبی کے زمانے میں شریعتوں کے اندر اختلاف رہا ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کا دور مبارک ہے، اسے یوں سمجھئے کہ وہ اس عالم بشریت کی طفولیت اور لڑکپن کا زمانہ ہے' گویا عالم بشریت ایک لڑکا ہے جو آگے جا کے جوان اور بوڑھا ہوا۔ اس زمانے کے احکام بہت ہلکے تھے۔

﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① "چیزوں کے نام یاد کرا دیئے گئے"۔ جیسے بچوں کو ابتداً آپ یاد کرا دیتے ہیں۔ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، روٹی ہے، لوٹا ہے وغیرہ۔ عمل کے درجے میں صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام یاد کرا دیئے گئے کہ یہ صبح و شام رٹ لیا کرو۔ لوگ یہی عمل کرتے تھے۔ تو عالم بشریت بالکل سادہ تھا۔ جیسے بچے کا مزاج ہوتا ہے۔ تو احکام بھی بالکل ابتدائی تھے۔ یہ مکمل احکام نہیں تھے جو بعد کی شریعتوں میں نازل کیے گئے۔

ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ اس میں لوگ فلکیات کی طرف چل پڑے تھے۔ سورج چاند کو پوجنا اور ستاروں سے اثرات لینا، تو ابراہیم علیہ السلام نے اس زمانے کے طریق کو سامنے رکھ کر وجود خداوندی اور توحید خداوندی کو سمجھایا جس کا قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا ﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ ② ابراہیم علیہ السلام کو ستاروں اور فلکیات کی نفسیات سمجھا دی گئی۔ انہوں نے اسی طریق پر قوم کی اصلاح فرمائی اور اس کے مناسب ہی احکام بھی دیئے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا۔ یہود کا مزاج بہت سخت تھا۔ ابتداء ہی سے یہ قوم تلخ اور سخت واقع ہوئی ہے۔ ان میں کبر و نخوت بھی تھا۔ بہرحال اولاد انبیاء علیہم السلام تھی۔ تو بزرگ زادوں میں نسبت کے لحاظ سے کچھ یوں بھی نخوت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ کہتے تھے ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ③ حق تعالیٰ سے ہماری رشتہ داریاں قائم ہیں، اسی لئے تو ہم اولاد انبیاء ہیں۔ تو وہ جلدی ماننے والے نہیں تھے۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا۔ بعض انبیاء کی تکفیر کی، بعض کو قتل کیا۔ گستاخیاں کیں اور جو احکام نازل ہوتے، ان کے مقابلے پر آ جاتے تھے۔ مانتے نہیں تھے، تو یہ ساری شریعت بھی سخت قسم کی نازل ہوئی۔ اگر گوسالہ پرستی کی تو فرمایا گیا تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ تو آپس میں باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو قتل کیا۔ ہزاروں آدمی قتل ہوئے۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ رات کو جو عمل کرتے تھے، صبح کو ان کے دروازوں پر لکھا ہوتا کہ یہ بدعملی کی ہے گویا دنیا ہی میں رسوا کر دیا جاتا تھا۔ اتنے سخت احکام دیئے گئے تھے۔

اگر کپڑے پر نجاست لگ گئی، تو پانی سے پاک نہیں ہوتا تھا۔ قینچی سے اسے کاٹنے کی نوبت آتی تھی۔ حتیٰ کہ اگر بدن پر نجاست لگ گئی تو صرف پانی سے پاک نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ کھال کو کھرچا نہ جائے۔ ایسے شدید ترین

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۷۴، ۷۵. ③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۸.

احکام تھے اس لئے کہ قوم کے مزاج میں شدت تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، وہ اس پہلے عمل کا ردعمل تھا۔ اس قوم میں نرمی بے حد تھی احکام بھی نرم دیئے گئے۔ فرمایا گیا، اگر تمہارے دائیں گال پر کوئی تھپڑ مار دے تو تم اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کردو کہ ایک اور مار دے، خدا تیرا بھلا کرے۔ گویا انتقام لینا اس شریعت میں ممنوع تھا۔ یہود کی شریعت میں انتقام لینا واجب تھا۔ اگر کوئی تمہارا دانت توڑے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کا دانت توڑو۔ آنکھ پھوڑے تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑو۔ ﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ①

غرض جیسا عمل کرے، بدلہ لینا واجب ہے۔ معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ معافی نرم خو لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ جو تند مزاج ہوں ان کو معافی کارگر نہیں ہوتی۔ وہاں تو بدلہ لینا ہی ضروری ہوتا ہے۔ جبھی وہ سیدھے ہو سکتے ہیں۔ تو شریعت موسوی کے اندر انتقام لینا واجب تھا۔ معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ عیسوی شریعت میں اس کا بالکل ردعمل تھا کہ نہ صرف انتقام لینا ہی جائز نہیں، بلکہ معاف کرنا واجب تھا۔

وہاں یہ تھا کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو کپڑے کا قطع کر دینا ضروری تھا۔ یہاں یہ تھا کہ اگر سارا بدن نجاست میں لت پت ہو جائے، دل کو پاک رکھو، عبادت کرتے رہو، بدن چاہے کیسا ہو، اتنی نرمی کی گئی۔

مطلب یہ ہے کہ شرعی احکام حسب مزاج اقوام نازل کئے گئے ہیں۔ دین اور اصول سب کے ایک رہے ہیں۔

امت محمدیہ کو اجر و ثواب زیادہ دیا گیا اور عمل کا بار کم ڈالا گیا...... جب آخر میں امت مسلمہ آئی تو یہ بوڑھی امت تھی۔ بوڑھے آدمی کے اندر عقل و تجربہ بڑھ جاتا ہے مگر عملی قوت گھٹ جاتی ہے۔ بوڑھے آدمی سے عمل ہونا مشکل ہے۔ مگر دماغ اتنا روشن ہوتا ہے کہ نوجوانوں کا فرض ہوتا ہے کہ ان سے مشورہ لیں، ان کی رائے پر عمل کریں۔ وہ زمانے کا سرد اور گرم دیکھے چکے ہوتے ہیں تو کوئی تجربے کی بات بتائیں گے۔ یہ امت بوڑھی امت تھی۔ دنیا کا اختتام اسی امت کے اوپر تھا۔ گویا یہ عالم بشریت کے بڑھاپے کا دور تھا۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں طفولیت کا دور تھا۔ وہاں بچوں کے مناسب احکام تھے۔ یہاں بوڑھوں کے مناسب احکام ہیں۔ بوڑھوں کے لئے یہ ہوتا تھا کہ عمل کا بار تو ان پر کم ڈالتے ہیں مگر تحسین و آفرین زیادہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شادی بیاہ ہو، تو بڑے میاں کو کہتے ہیں کہ آپ کا بڑا کام یہ ہے کہ آپ کھانے کے اوپر بیٹھے نگرانی کرتے رہیں۔ نوجوان کھانا تقسیم کریں گے، بڑے میاں صبح سے شام تک بیٹھے ہوئے ہیں۔ شام کو لوگ کہتے ہیں کہ صاحب بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔ بڑی ہمت کے آدمی ہیں۔ حالانکہ صبح سے شام تک بیٹھے ہی رہے اور بڑے میاں نے کیا کیا؟ مگر کہتے ہیں کہ بڑا کام کیا اور بڑے باہمت ہیں۔ حالانکہ ایک رکابی اٹھا کر انہوں نے نہیں دی۔ غرض بوڑھوں پر عمل کا بوجھ

---

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٤٥.

کم ڈالتے ہیں۔ تحسین اور آفرین زیادہ کرتے ہیں۔

البتہ نوجوانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کی رائے پر چلیں۔ اس لئے کہ ان کی رائے میں وزن ہوتا ہے۔ یہی صورت اس امت کی ہوئی کہ تمام امتوں کے احوال اس کے سامنے تھے۔ تو اس امت کا علم کامل اور تجربہ وسیع ہوا۔ پچھلی امتوں کے سامنے بعض باریک مسئلوں کے احکام نہیں تھے، وہ اسی امت کے بارے میں رائج ہو سکتے تھے اور دنیا کے بارے میں رائج نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ یہ امت جو تھی اس کے سامنے امت آدم، امت نوح، امت موسیٰ، امت عیسیٰ علیہم السلام کے احوال کھلے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے ایک ایک چیز روشن کر دی۔ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام تاریخی چیزیں واضح کر دیں۔ گویا یہ امت سب کے احوال سامنے رکھے ہوئے ہے۔ اس لئے یہ روشن ضمیر ہے اور اس کا علم وسیع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن اس امت کی شہادت سے دنیا کے فیصلے ہوں گے، چونکہ یہ امتوں کے احوال کو جانتی تھی، اس لئے جس امت کے بارے میں گواہی دے گی کہ یہ باطل پر تھی، وہ عنداللہ بھی باطل پر سمجھی جائے گی، عذاب وثواب کے سارے معاملات اس امت کی شہادت پر ہوں گے۔ اس لئے کہ جاننے والی امت عالم میں اس کے سوا کوئی نہ ہوگی۔ قرآن حکیم میں فرمایا ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ ① ”یہ امت وسط، امت معتدل بنائی گئی۔ اس کو دنیا کی امتوں کے حق میں گواہ بنایا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حق میں گواہ بنیں گے کہ میری امت نے سچ کہا“۔ بہر حال اس امت کو علم دیا گیا لیکن عمل کا بار اس پر کم ڈالا گیا۔ جتنے شاق شاق عمل پچھلی امتوں پر اتارے گئے تھے۔ اس پر عشر عشیر اور نصف بھی نہیں ہے۔ بہت ہلکے ہلکے احکام دیئے گئے مگر اجر زیادہ دیا گیا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی اور دس ہی نہیں بلکہ سات سو ملیں گی اور سات سو ہی نہیں بلکہ ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ ② اللہ ”جس کے لئے چاہے جتنا چاہے اجر بڑھا دے“۔ تو ایک نیکی دس نیکی کے برابر اور وہ سات سو نیکی کے برابر اور وہ ہزار ہا نیکی کے برابر۔ حدیث میں فرمایا: ”تَصَدَّقُوْا وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ.“ ③ ”صدقہ کرو اگرچہ چھوہارے کی گھٹلی صدقہ کی جائے“۔ اس گھٹلی کو حق تعالیٰ پالتے ہیں۔ قیامت میں اس کو جبل احد کے برابر کر کے اس کا اجر پیش کیا جائے گا۔ لوگ حیران ہوں گے کہ اتنا بڑا اجر۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے تم نے گھٹلی صدقہ کی۔ تو گھٹلی کا جبل احد سے مقابلہ کیا جائے۔ کتنی گھٹلیاں بن سکتی ہیں، اربوں کھربوں بنیں گی۔

امت محمدیہ سے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مراعات...... مطلب یہ ہے کہ ایک گھٹلی کا اجر کروڑوں گنا زیادہ دیا گیا۔ تو اس امت پر عمل ہلکا رکھا گیا اور اجر زیادہ دیا گیا۔ اگر کوئی ایک نیکی کا ارادہ کرے، ابھی عمل نہیں کیا۔ ایک نیکی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۴۳. ② پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۱.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الصدقۃ ولو بشق تمرۃ او کلمۃ طیبۃ، ج: ۲ ص: ۷۰۳ رقم: ۱۰۱۶.

لکھی جاتی ہے۔ اگر وہ نیکی کر لی، پھر کئی گنا بڑھا دی جاتی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بدی کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جاتا تا کہ آدمی بدی کا ارادہ کرتا، ایک بدی لکھ دی جاتی۔ مگر نہیں لکھی جاتی۔ ارادے کے بعد اگر بدی سے رک گیا، تو ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے کہ یہ رکنا بھی ایک مستقل نیکی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ بدی کر لی تو حدیث میں ہے کہ ملائکہ انتظار کرتے ہیں کہ ابھی مت لکھو، ممکن ہے توبہ کر لے۔ ''اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ.'' ① ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا''۔ اس کا حساب ہی نہیں کیا جائے گا۔ اگر اس نے توبہ کر لی تو نامہ اعمال صاف ہے گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں اور اگر توبہ نہ بھی کی آگے وعدہ دیا گیا کہ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ② تمہاری اگر نیکیاں زیادہ ہیں تو وہ خود تمہاری بدیوں کو مٹا دیں گی۔ اس کا تدارک اس طرح سے کر دیا انتہائی تسہیل اور سہولت اس امت کو دی گئی ہے کہ عمل کا بار بہت کم ڈالا گیا اور اجر بہت زیادہ دیا گیا۔ پچھلی امتوں کو یہ کہا گیا کہ اگر تم نے نبی کی نافرمانی کی، تم پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ قوم عاد کو ہوا سے تباہ کر دیا گیا۔ قوم ثمود کو حضرت جبریل علیہ السلام کی ایک چنگھاڑ نے تباہ کر دیا۔ قوم شعیب پر آگ برسا دی گئی، وہ تہس نہس ہو گئے، قوم فرعون کو دریائے قلزم میں غرق کر دیا گیا۔ تو شدید ترین عذابات آتے تھے۔

اس امت کے بارے میں رحمت اللعالمینی کا صدقہ ہے کہ گناہ بھی کر رہی ہے، برائیاں بھی کر رہی ہے۔ مبتلا بھی ہے لیکن فرمایا گیا ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ ③ اللہ اس امت کو عذاب نہیں دیں گے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہوں اور جب کہ امت میں استغفار کرنے والے موجود ہوں، تو پوری امت کو عذاب میں نہیں مبتلا کیا جائے گا۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ میری امت کا استیصال ہو جائے۔ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حقہ قائم رہے گی۔ اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ ''لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلٰلَةِ'' ④ ''میری امت ساری کی ساری مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی'' فرقے اور پارٹیاں ہوں گی، مبطل اور شکوک و شبہات نکالنے والے بھی ہوں گے۔ مگر ایک جماعت حقہ قائم رہے گی۔ وہی کام کرے گی، جو میں نے کیا۔ وہی باتیں کہے گی، جو میں نے کہیں اعتقاد و عمل کا وہی نقشہ قائم کرے گی جو میں نے کیا۔

''لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَایَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ'' ⑤ میری امت میں ہمیشہ ایک طائفہ حقہ، موجود رہے گا۔ یہاں طائفہ کا لفظ بولا۔ طائفہ چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں۔ یعنی چاہے چھوٹی جماعت ہو مگر حق پر رہے گی اور من جانب اللہ ان کی مدد کی جائے گی۔ کوئی انہیں رسوا کرنا

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ۲ ص: ۴۱۹ رقم: ۴۲۵۰.

② پارہ: ۱۲، سورة هود، الآية: ۱۱۴. ③ پارہ: ۹، سورة الانفال، الآية: ۳۳. ④ المعجم الكبير للطبراني، ج: ۱۱ ص: ۷۸. ⑤ السنن للترمذي، كتاب الفتن، باب ماجاء في ائمة المضلين ج: ۸ ص: ۱۷۲.

چاہے گا نہیں کر سکے گا۔ لوگ ان کی مخالفت کریں گے، مگر وہ حق سے نہیں ہٹے گی اور برابر آگے چلے گی"۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کے صدقے اس امت کو بہت سی سہولتیں دی گئی ہیں۔ نیکیوں میں اجر و ثواب کی، بدیوں میں معافی کی، اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں ہیں۔

وحدت دین اور اختلاف شرائع کا قرآن سے ثبوت...... غرض میرا مطلب یہ تھا کہ دین از آدم تا ایں جا ایک ہے۔ آج تک وہی دین ہے، شریعتیں مختلف ہیں۔ تمام انبیاء کا دین ایک ہی رہا۔ یعنی توحید خداوندی، اسی توحید سے پھر سارے اعمال پیدا ہوئے۔ اسی کو فرمایا گیا "کَانَ دِیْنُ الْاَنْبِیَآءِ لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" ① یعنی دین ایک اور شریعتیں مختلف، اگر غور کیا جائے تو قرآن کریم میں اس کا اشارہ نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں دین کے بارے میں ارشاد ہے وہاں فرمایا ﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ﴾ ② "ہم نے جو وصیت حضرت نوح علیہ السلام کو کی تھی۔ وہی وصیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کی وہی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کی کہ دین قائم کرو۔ اس میں تفریق مت ڈالو"۔ وہ اول سے لے کر آخیر تک ایک تھا۔ ﴿شَرَعَ لَکُمْ﴾ کے لفظ میں مجموعہ استعمال کیا گیا کہ تم سب کے لئے اللہ نے ایک دین کو مذہب کر دیا دین میں تفریق نہیں ہے۔

اور شریعت کے بارے میں فرمایا ﴿لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجًا﴾ ③ "تم میں سے ہر ایک جماعت اور امت کے لئے ہم نے شریعتیں اور راستے مختلف بنا دیئے"۔ جہاں دین کا لفظ ہے، وہاں مجموعے کو کہا گیا کہ تمہارے لئے ایک دین ہے اور جہاں شریعتوں کا ذکر ہے وہاں ﴿لِکُلِّ اُمَّۃٍ﴾ فرمایا ہر طبقہ اور ہر امت کے لئے فرمایا۔ غرض قرآن کریم سے بالکل تائید ہوتی ہے کہ دین واحد اور شریعتیں مختلف ہیں اور مزاج اقوام کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔

فقہ میں اختلاف مشرب ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے...... اب ظاہر بات ہے کہ یہ شریعت تو ایک ہی ہے۔ کوئی نیا نبی آنے والا نہیں، کوئی نئی کتاب آنے والی نہیں، نئی شریعت آنے والی نہیں۔ ذات نبوی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآن کریم خاتم الکتب ہے، شریعت اسلام خاتم الشرائع ہے۔ ہر چیز اس دین کی مختتم، اختتامی اور انتہائی ہے کہ اس کے بعد کوئی نئی چیز آنے والی نہیں ہے۔ مگر اقوام کے مزاج تو مختلف ہیں، بیشک دین

---

① ذکر الحافظ ابن رجب الحنبلی رحمہ اللہ تعالیٰ ان دین الانبیاء کلھم واحد وھو الاسلام. فتح الباری، کتاب الایمان ج: ۱ ص: ۷.

② پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۳.

③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۴۸.

اور شریعت تو ایک ہے لیکن جب یہ دنیا کی مختلف اقوام کیلئے پیغام ہے اور قوموں کے مزاج الگ الگ ہیں۔ یورپین اقوام کا مزاج اور ہے، ایشین کا اور، افریقنوں کا اور۔ اور ہم سب کے لئے ایک ہی شریعت ہے۔

اس لئے ضرورت تھی کہ شریعت کے اندر ایسے آئمہ ہدایت پیدا ہوں، جو مزاج اقوام کے مناسب شریعت کو سمجھائیں۔ آئمۂ ہدایت مختلف ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام ابن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ یہ چار ائمہ تو چانداور سورج ہیں کہ پورے عالم میں ان کی روشنی پھیلی ہوئی ہے اور بہت سے ائمہ تفقہ ہیں۔ امام بخاریؒ، حماد بن سلمہ، سفیان ثوری، سفیان ابن عینیہؒ یہ سب صاحب فقہ تھے۔ مگر ان سب کے فقہ دب گئے اور ان چار آئمہ کے فقہ اوپر آ گئے اور عام طور پر دنیا میں انہیں کو فقہاء مانتے ہیں۔ پوری ترکی، پورا افغانستان، ہندوستان کا ایک بڑا حصہ حنفی ہے۔ مغربی ممالک میں اکثریت مالکیوں کی ہے، نجد میں حنابلہ کی اکثریت ہے اور حجاز و مصر میں شوافع کی اکثریت ہے۔ غرض پوری دنیا انہی چار فقیہوں کے اندر گھری ہوئی ہے۔ انہیں چار کا مجموعہ اہلسنت والجماعت کہلاتا ہے۔ گویا اس وقت اہل السنّت والجماعت پوری دنیا میں چھائے ہوئے ہیں۔ انہیں کا مذہب رائج ہے۔

تو انبیاء آ نہیں سکتے تھے۔ نئی کتاب نہیں آ سکتی تھی مگر قرآن کریم کو اللہ اتنا جامع بنایا کہ اس کے اندر فقہیں مختلف نکل آئیں۔ ہر فقہ ہر قوم کے مناسب ہے، ایک فقہ شافعی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہو وہ اس پر عمل کرے۔ فقہ حنفی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہو وہ اس کا پابند ہو جائے۔ فقہ مالکی ہے، جس کو اس سے مناسبت ہے وہ اس کا تابع ہو جائے۔ اسی طرح فقہ حنبلی ہے۔ غرض ایک شریعت اصلی ہے۔ ایک شریعت فروعی ہے۔ اصلی شریعت تو ایک ہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مرحمت فرمائی اور شرائع مختلف ہیں یعنی اجتہادی امور میں اختلاف ہے۔ ائمہ سلف و آئمہ ہدایت نے دنیا میں پیش آنے و لے واقعات وحوادث کے لئے قرآن وحدیث سے احکام نکالے۔ جو خود ایک مستقل فقہ بن گیا۔ ان فقہوں میں ظاہر ہے کہ مزاجوں کا دخل ہے۔ اس لئے جس مزاج کی قوم ہوگی۔ اس فقہ کی طرف چل پڑے گی، جبکہ وہ سب کے سب حق پر ہوں گے اور عند اللہ قبول ہوں گے۔

تصوف میں اختلاف مسلک ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے...... یہی صورت صوفیاء میں بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ صوفیاء کا جو اصل بنیادی طریقہ ہے، جس کو احسانی سلوک کہتے ہیں، وہ ایک ہی ہے اور وہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ قلب کو پاک بناؤ، ذکر اللہ کی کثرت کرو۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ اب قلب کو پاک بنانے کے طریقے کیا ہیں؟ اس میں تجربات ہیں کہ چشتیہ نے اور طریقہ رکھا، نقشبندیہ نے اور طریقہ رکھا، سہروردیہ نے اور طریقہ رکھا۔ یہ درحقیقت قلوب کو مانجھنے کی تدابیر ہیں۔

جب قلوب منجھ گئے، تو آگے ذکر اللہ وہی ہے جو قرآن وحدیث میں ہے۔ ان حضرات نے کوئی ذکر نیا تجویز نہیں کیا وہی اذکار عشرہ ہیں۔ تسبیح، تحمید، تمجید، تھلیل، تکبیر ہے۔ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" تو حوقله، تعوّذ،

تسمیہ، استغفار اور درود شریف یہ سب کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ تمام طرق کے حضرات یہی اذکار بتلاتے ہیں۔ البتہ ان کے طریقے الگ الگ ہیں کہ اس کا دل کدھر چل رہا ہے۔ اس کو مانجھا جائے' مانجھنے کے طریقے الگ ہیں، ریاضات ومجاہدات الگ الگ تجویز کیئے۔ مگر وہ تدابیر کا درجہ ہیں۔ اگر کوئی ان کے خلاف کرے تو یہ نہیں کہ معاذ اللہ وہ اسلام سے خارج ہوجائے گا۔ اس لئے کہ اس کو عین دین نہیں کہتے ۔ دین کی ایک تدبیر کہتے ہیں۔ بہر حال فقہ میں دیکھو تو مشرب مختلف ہیں۔ تصوف میں دیکھو تو مشاغل مختلف ہیں۔ فقہ وتصوف میں دیکھو۔ تو علماء کے مسالک مختلف ہیں مگر بنیاد سب کی ایک ہے۔

ابلاغ وتبلیغ کے طریقے مختلف ہوتے رہے مگر سب کا ماخذ ایک رہا...... یہی صورت بعینہ دین کے ابلاغ وتبلیغ میں اب واقع ہوئی۔ دین کو پہنچانا، وہ تو ایک ہی ہے، جیسے آپ پہنچائیں گے۔ وہی اذکار، وہی نماز، وہی روزہ، زکوٰۃ، حج اسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے پہنچانے کے لئے ڈھنگ کیا اختیار کیا جائے؟ کہ کڑوی دوائی کیپسول کے بیچ میں رکھ کے نگلوادی جائے۔ اس میں تدابیر کے طور پر طریقے مختلف ہیں۔ پھر تدابیر کے درجے مختلف ہوتے رہے ہیں لیکن تدبیروں سے جو چیز پہنچائی گئی، وہ ایک ہے۔ اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

اب مثلاً مسلمانوں میں ابتدائی دور میں روایت پر زیادہ زور تھا کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت صحیح نہ ہو، لوگ نہیں مانتے تھے۔ اس واسطے اللہ نے محدثین پیدا کیئے۔ انہوں نے روایتوں کی چھان بین کرکے کھرے کو کھوٹے سے الگ کیا۔ اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا، جس میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخیں مرتب کیں، جو راویان حدیث ہیں۔ ان کے خاندان، کیریکٹر وکردار، حافظہ، ضبط اور ان کی عدالت پر تمام چیزیں لکھیں گویا پچاس ہزار آدمیوں کی سوانح عمری مرتب کی۔

پھر علم منکرات الحدیث مرتب کیا کہ حدیث کے بھی درجات ہیں۔ قوی، صحیح، ضعیف، متروک، مجہول وغیرہ یہ اصطلاحات مقرر کیں کہ سند متصل ہے تو حدیث مرفوع متصل کہلائے گی۔ اگر بیچ میں منقطع ہوگئی۔ تو اگر صحابی پر منقطع ہوگئی تو مرسل کہیں گے، وغیرہ۔ اصطلاحات مقرر کرکے ایک کانٹا اور میزان بنادی کہ حدیث میں غیر حدیث نہ شامل ہوسکے۔ اس میزان پر دیکھ لو. کھری چیز الگ ہوجائے گی اور کھوٹ الگ ہوجائے گا۔ تو ابتدائی دور میں زیادہ زور روایت پر تھا۔ تو روایت اور فن تاریخ کے اصول مدون کیئے گئے۔ روایتی طور پر دین کو نکھار کرکے پیش کردیا گیا، لوگوں نے قبول کیا۔

پھر ایک زمانہ درایت کا آیا کہ روایتیں تو کتابوں میں جمع ہوگئیں، یکجا ہوگئیں۔ لیکن ان روایتوں سے مسائل اور احکام کا نکالنا، اس میں اجتہاد کی ضرورت تھی۔ یہ دور ائمہ مجتہدین کا دور تھا۔ تو ائمہ مجتہدین نے مسائل کا استنباط کیا، یہ معلوم کیا کہ حکم نبوی کی علت کیا ہے جس پر یہ حکم دائر ہے۔ اس علت کو نکالا۔ اس علت میں اختلاف پڑا۔ فرعیات میں اختلاف پڑتا چلا گیا۔ تو مذاہب میں اختلاف پیدا ہوا۔ مگر کل کے کل حق پر رہے۔ اس لئے کہ سب کا

ماخذ کتاب وسنت ہے۔ یہ دور اجتہاد کا تھا۔ اس میں روایت پر زور نہیں تھا یہ دیکھتے تھے کہ تفقہ وفقہ کیسا ہے۔ جب تفقہ اور درایت معلوم ہوتی تب لوگ قبول کرتے تھے۔

پھر ایک زمانہ صوفیت پسندیت کا آیا۔ کہ جب تک قرآن وحدیث کو صوفیانہ رنگ میں نہ سمجھاؤ، لوگ سمجھتے نہیں تھے۔ پورے عالم پر صوفیت چھا گئی تھی۔ امام غزالیؒ شیخ محی الدین ابن عربیؒ وغیرہ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے قرآن وحدیث کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا۔ بہر حال ڈھنگ بدلتے رہے۔ قرآن وحدیث وہی رہا۔ لیکن سمجھانے کے طریقے الگ الگ ہو گئے۔ فروعات الگ الگ ہو گئیں، مگر ماخذ سب کا ایک تھا۔ بنیاد سب کی ایک تھی۔ اس لئے سب کے سب اہل حق تھے۔

اس کے بعد عقل پسندی کا دور آیا کہ عقلیات سے جب تک نہ سمجھاؤ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ تو شاہ ولی اللہ اور امام غزالیؒ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ انہوں نے دین کو عقلی رنگ میں سمجھایا اور جہاں نقلی دلائل تھے، وہاں عقلی دلائل بھی پیش کئے۔ مگر عقل کو نقل کے تابع رکھا۔ عقل، دین کے تابع ہے، دین پر حاکم نہیں ہو سکتی، حاکم دین رہے گا، اس کے خادم کے طور پر عقل بھی چلے گی۔ دین ایک دعویٰ کرے گا، عقل اس کی تائید کر کے اسے ثابت اور واضح کرے گی، خدمت کرنا یہ عقل کا کام ہے۔ اس لئے عقل کو خادم دین بنایا گیا۔ تو یہ دور ایسا تھا کہ جب تک عقلیات سے نہ سمجھاؤ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے بعد سائنس کا دور آیا۔ یہاں عقلیات سے زیادہ حسیات ہیں۔ محسوس چیز سے کسی چیز کو سمجھاؤ، تب لوگ سمجھتے ہیں۔ اللہ نے پھر ایسے علماء کرام پیدا کئے، حضرت مولانا گنگوہی، حضرت مولانا نانوتوی، رحمہما اللہ تعالیٰ ان لوگوں نے محسوسات کے انداز سے دین کو سمجھایا اور حسی مثالوں سے واضح کیا کہ دین حق ہے۔ گویا دین ایک دعویٰ کرتا ہے، محسوسات اس کی خدمت کرتے ہوئے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ جو لوگ منکر تھے، وہ سن کر مجبور ہوئے۔ مثلاً معراج کا مسئلہ تھا۔ تو قدیم فلاسفہ کہتے تھے کہ یہ محال ہے، یہ ممکن نہیں، بالکل صاف انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بیچ میں کرہ نار ہے وغیرہ۔ اس سے آدمی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذہ معراج ہو نہیں سکتی۔ اب جب لوگ چاند تک پہنچ گئے اور چاند کی مٹی کھود لائے، اب لوگ معراج کو ماننے پر مجبور ہوئے کہ حسیات میں ایک نظیر آ گئی، تو خواہ مخواہ مجبور ہوئے کہ معراج بھی حق ہے۔ جب مادی وسائل سے آپ چاند تک پہنچ سکتے ہیں، تو روحانی وسائل ان سے کہیں زیادہ قوی ہیں۔ ان سے کیوں نہیں پہنچ سکتے؟ حاصل یہ نکلا کہ دین دعوے کرے اور مغربیت پسند اس کو ثابت کریں تا کہ ان پر حجتیں تمام ہوں اور وہ جھک مار کر ماننے پر مجبور ہوں۔

ہمارے ہاں انور صابری ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ جب یہ لوگ چاند سے لوٹ کر آئے تو اس نے ایک نظم لکھی، اس کا ایک شعر مجھے بھی یاد رہ گیا، وہ کہتا ہے کہ

سفر سے چاند کے لوٹے جو منکر معراج ۔۔۔ شکست عقل نے کھائی بڑے غرور کے بعد

عقل انکار کرتی تھی۔ اب اسے جھک مار کے ماننا پڑا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ بیت اللہ تیار کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اعلان عام کردو۔ لوگو! بیت اللہ بن گیا ہے، آ کر حج کرو۔

عرض کیا یا اللہ! میری آواز کیسے پہنچے گی؟ فرمایا تم آواز لگاؤ، ہم پہنچائیں گے۔ تو مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کیا کہ: اے لوگو! بیت اللہ تیار ہو گیا ہے، حج کرو۔ حدیث میں ہے کہ: جن جن کی قسمت میں حج تھا۔ انہوں نے لبیک کہا۔ حتیٰ کہ جو ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے انہوں نے بھی لبیک کہا اور فرمایا گیا، جس نے جتنی دفعہ لبیک کہا، اتنے ہی حج اس کے لئے مقرر ہو گئے، دس دفعہ کہا تو دس حج، بیس دفعہ کہا تو بیس حج۔

اس پر لوگ اعتراض کرتے تھے کہ بھلا یہ ہو کیسے ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی آواز مقام ابراہیم سے پوری دنیا میں پہنچ جائے گی؟ لاؤڈ اسپیکر نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ آج لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ایک آدمی بولتا ہے تو مشرق سے مغرب تک سب جگہ آواز پھیل جاتی ہے۔ جب مادی وسائل میں اللہ نے قوت دی ہے کہ ایک آواز پورے عالم میں پھیل جائے تو روحانی وسائل میں یہ طاقت کیوں نہیں ہو سکتی؟ کہ آدمی روحانی قوت سے پورے عالم میں آواز پہنچا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی روحانی قوتوں سے وہ سب کام کرتے ہیں، جن کی حسی مثالیں آج مادی قوتوں سے دی جا رہی ہیں۔ اب امت کا مزاج اس پر ہو گیا کہ جب تک دین حسی مثالوں سے نہ سمجھایا جائے۔ لوگ نہیں سمجھتے۔ اللہ نے ایسے علماء کھڑے کر دیئے کہ حسی مثالوں سے انہوں نے دین کو سمجھایا۔

تو عقل کا دور آیا تو عقلاء حس کا دور آیا تو سائنس دان کھڑے ہوئے، صوفیت کا دور آیا تو متکلمین کھڑے ہو گئے۔ درایت کا دور ہوا تو فقہاء کھڑے ہو گئے۔ روایت کا دور آیا تو محدثین کھڑے ہو گئے۔ غرض دین ہر حالت میں چلتا رہا اور ہر شعبے میں نمایاں ہوتا رہا۔

جمہوریت پسندی کے زمانے میں دعوت و تبلیغ جماعتی طور پر مؤثر ہے...... اب یہی صورت تھی کہ دین کو دوسروں تک کس انداز میں پہنچایا جائے، تبلیغ کی جائے تو کس انداز سے کی جائے۔ دعوت دی جائے تو کس انداز سے دی جائے۔ یوں تو علماء دعوت دیتے آ رہے تھے اور سلسلہ دعوت برابر جاری تھا۔ مگر زمانے کے حالات ہوتے ہیں۔ آج کل جمہوریت پسندی کا زمانہ ہے۔ جب تک کسی چیز کو جماعتی طور پر پیش نہ کیا جائے، لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایک آدمی کتنا ہی ثقہ اور بڑے درجہ کا ہو، وہ کہہ رہا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک آدمی کی بات ہے۔ دو ہوں تو کہتے ہیں کہ خیر اور جب جماعت ہو تو جھک مار کے مجبور ہوتے ہیں کہ جماعت مل کر غلط کیسے کرے گی؟ بہر حال انفرادی طور پر برابر علماء دین پہنچاتے رہے۔ اگر نہ پہنچاتے تو آج مسلمان آپ کے سامنے کہاں سے آتے؟ انہی کی محنتوں کا صدقہ ہے کہ آج ہم فخریہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ستر کروڑ مسلمان ہیں۔ یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ لیکن دین کے راستے تو بند نہیں۔ آئندہ بھی دین کو پھیلنا ہے۔

جماعت میں مادی اور روحانی قوت ہوتی ہے...... اب راستہ یہ آ گیا کہ جب تک کوئی کام جماعتی طور پر نہ ہو، لوگ نہیں مانتے۔ مادی چیزوں میں حتیٰ کہ کھیل کود میں بھی ٹیمیں بنتی ہیں۔ ہندوستان کی ہاکی کی ٹیم پاکستان کھیلنے جارہی ہے اور پاکستان کی ٹیمیں ہندوستان آ رہی ہیں۔ وکلاء کو دیکھو تو ان کی ایک ٹیم ہے۔ ججوں کا ایک طبقہ ہے مزدوروں کی ایک جماعت ہے۔ اگر مزدوروں کو کوئی شکایت ہو ایک آدمی شکایت کرے، کوئی نہیں مانتا۔ لیکن اگر یونین بنالیں تو جھک مار کے مانتے ہیں، ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تو آج کا دور ہی جماعتی رنگ کا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آج کس قسم کی جمہوریت ہے۔ اسلام نے کس قسم کی جمہوریت پھیلائی ہے، وہ الگ بحث ہے، اس میں ہم پڑنا نہیں چاہتے، مگر بالاجمال یہ ہے کہ جب تک جمہوریت اور جماعتی رنگ پیش نہ ہو، وہ چیز قابل قبول نہیں ہوتی۔ لوگ اس کے اوپر مطمئن نہیں ہوتے، زمانے کے حالات ہیں۔ اب اگر دین پہنچانے ایک آدمی جائے، تو لوگ کہتے ہیں کہ ہاں بھئی! نیک آدمی ہے۔ لیکن اگر جماعت چلی جائے، تو دباؤ پڑتا ہے کہ ہے کچھ بات قرآن نے اس کی اصل بتلائی ہے۔ فرمایا ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلاً اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ﴾ ① ''اے پیغمبر! آپ اصحاب قریہ کی مثال بیان کر دیجئے''۔ ایک خاص قریہ اور بستی کے لئے فرمایا گیا کہ آپ مثال بیان کر دیجئے۔ ﴿اِذْجَآءَ هَا الْمُرْسَلُوْنَ﴾ ② جبکہ اللہ کے نبی اس کے اندر ہدایت کرنے کے لئے پہنچے آگے فرمایا ﴿اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ.﴾ ③ ''ہم نے اس قریہ میں دو رسول بھیجے کہ جا کے ہدایت کرو۔ تبلیغ کرو۔ اللہ کے احکام پہنچاؤ''۔

﴿فَكَذَّبُوْهُمَا﴾ ④ ''ان دونوں کو انہوں نے جھٹلا دیا''۔ فرماتے ہیں۔ "فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ" ''ہم نے انہیں قوت دی اور ایک تیسرے کا اضافہ اور کیا''۔

اب جماعتی حیثیت ہوگئی۔ "اَلْاِثْنَانِ اَوْفَوْقَهُمَا جَمَاعَةٌ." ⑤ ''دو آدمی یا اس سے بڑھ جائیں، تو جماعت کے حکم میں آ جاتے ہیں''۔ جماعت کا رد کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ فرو واحد کی بات کو آپ رد کر سکتے ہیں کہ شاید یہ شک یا شبہ میں پڑ گیا ہوگا۔ لیکن جب تین چار مل کر کہیں گے اور ایک دوسرے کی تائید کریں گے۔ پھر یہ وسوسے قطع ہو جاتے ہیں کہ اس سے غلطی ہوگئی ہوگی۔ غلطی ہوتی تو چار مل کر غلطی پر کیسے قائم ہوتے؟ عقلاً و عادۃً محال ہے۔

ظاہر بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں جو تعدد پیدا کیا گیا، وہ اس لئے نہیں کہ ایک نبی کی قوت کافی نہیں۔ انبیاءؑ سارے کے سارے جامع کمالات ہوتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر روحانیت میں کون قوی ہوسکتا ہے؟ تو جہاں تک قوت حق کا جان لینا ہے۔ اس کے لئے ایک نبی بھی کافی ہے۔ پھر یہ ایک کے ساتھ دوسرا کیوں بھیجا گیا؟ عوام کی رعایت کی گئی کہ وہ مان لیں۔ ورنہ فی نفسہ ایک نبی کافی ہے۔ مگر جب دو کو بھی جھٹلایا گیا، تو فرمایا: ﴿فَعَزَّزْنَا

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۳۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۳۔

③ پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۴۔ ④ پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۴۔

⑤ السنن لابن ماجه، كتاب اقامة الصلوٰة والسنة فيها، باب الاثنان جماعة ج: ۳ ص: ۲۳۸۔

بِثَالِثٍ﴾ ① ''ہم نے تیسرے کا اور اضافہ کیا''۔اب جماعت بن گئی۔ جماعت کا جھٹلانا انسان کی عقل سے باہر ہوتا ہے۔ کتنا بھی معاند ہو گا مگر جب جماعت کہے گی تو کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا کہ بھئی کچھ بات سچی معلوم ہوتی ہے۔ سارے آدمی مل کر جمع ہو کر آئے ہیں۔ تو جماعتی حیثیت غالب ہوتی ہے۔ اور ایک حدیث میں بھی ہے کہ ''یَدُاللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَةِ'' اللہ کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہوتا ہے۔ یعنی قوت خداوندی جماعت کی پشت پر ہوتی ہے۔ فردِ واحد سے الگ رہ سکتی ہے مگر جماعت کے اوپر ہوتی ہے۔

حتی کہ بعض علماء تو یہاں تک کہتے ہیں، حدیث تو نہیں ہے، تجرباتی بات ہے۔ کہ اگر چالیس مسلمان جمع ہوں، ان میں کوئی نہ کوئی ایک آدھ ضرور مقبول خداوندی ہوتا ہے۔ چالیس آدمی جب آئیں گے تو ایک کی مقبولیت سب میں کام کرے گی اور اس چیز کو مقبول بنا دے گی۔ بہر حال تعداد اور جماعتی رنگ میں ایک برکت کا اثر ہے۔ مادی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی، مادی تو یوں کہ جب افراد بڑھ گئے، انکار کی گنجائش نہیں رہی اور روحانی طور پر اس طرح کہ جتنے اہل حق بڑھ جائیں گے، حق ہی کو قوت پہنچے گی۔ حق میں اضافہ ہوگا۔ غرض جماعت ہی ایک ایسی چیز ہے جو مادی طور پر بھی مضبوط ہوتی ہے اور روحانی طور پر بھی مضبوط ہوتی ہے۔

جماعت تبلیغ کی برکت سے عمل کا ماحول پیدا ہو گیا...... ہمارے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے قلب پر اللہ نے تبلیغ کو ایک فن کی صورت میں القاء فرمایا۔ تبلیغ ہو رہی تھی، علماء دعوتیں بھی دے رہے تھے۔ مولانا کے قلب پر اللہ نے الہام فرمایا اور انہوں نے ایک طریقہ مقرر کیا، جو اس زمانے میں موثر ہو اور اس میں جماعتی رنگ ہو کہ ایک ایک فرد نہ جائے، جماعتیں جائیں، لوگوں کو گھروں سے نکال کر لائیں اور جماعت بناؤ، جماعتی طور پر جب آپ گشت کریں گے اور جماعت ایک زبان ہو کر ایک ہی بات کہے گی، قدرتی طور پر اس کا اثر پڑے گا۔ کوئی معاند ہو، کوئی دشمن ہو نہ مانے، دنیا میں ہر زمانے میں معاند اور دشمن رہے ہیں۔ مگر ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ عقل والوں کا اعتبار ہے۔ عقلمندوں کے سامنے جماعتی حیثیت کبھی نظر انداز ہونے کے قابل نہیں ہوتی۔ تو مولانا کے قلب پر اللہ نے اس طریقے کو القاء فرمایا۔

جب انسان جماعت کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ تو گھر میں عمل سے روکنے والی چیز گھر کی آسائشیں اور راحتیں ہی تو ہوتی ہیں۔ گھر میں آرام کرتا ہے تو کبھی نماز چھوٹ گئی، کبھی کوئی عمل چھوٹ گیا۔ لیکن جب گھر سے نکل گیا تو سامان راحت ہی منقطع ہو گیا۔ اب سوائے اللہ کے نام کے اور کوئی کام باقی نہیں رہ گیا کہ خواہ مخواہ آدمی اللہ ہی کا نام لے۔ گھر سے نکل کر جب مسجد میں آ گیا۔ اب اللہ کا نام نہیں لے گا تو اور کیا کرے گا؟ گویا عمل کرنے اور اللہ کا نام لینے پر مجبور کر دیا۔ تو فقط یہی نہیں کہ دعوت الی اللہ کی جماعتی صورت قائم کی بلکہ ایک عملی صورت بھی قائم کر دی کہ ہر شخص عبادت پر مجبور ہو۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۱۴۔

اس واسطے کہ ماحول کا ایک اثر پڑتا ہے۔ ماحول جب اللہ والوں کا ہوتا ہے، تو آدمی خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ علیہ بارات کے سلسلہ میں تھانہ بھون گئے تھے۔ ایک شادی میں شرکت کرنی تھی۔ جیسے بارات والوں کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ ہو تو اس سے ملتے جاتے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ علیہ تھانہ بھون میں موجود تھے۔ باراتیوں نے کہا کہ چلو بھئی! حاجی صاحب سے بھی مل لیں، بزرگ آدمی ہیں۔ مولانا گنگوہی حاضر ہوئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ علیہ نے مولانا گنگوہیؒ کو فراست باطنی سے پہنچالیا کہ اس شخص کے قلب کے اندر کوئی جوہر موجود ہے۔ خود فرمایا کہ کسی سے مرید بھی ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں، فرمایا مجھ سے ہی ہو جاؤ۔ یعنی کس تیقن سے فرما رہے ہیں کہ مجھ سے ہی مرید ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ: مرید ہونے کے لئے میں آیا نہیں۔ میں تو بارات میں آیا ہوں۔ فرمایا: ان دونوں میں کوئی تضاد تھوڑا ہی ہے؟ ٹھیک ہے بارات میں آئے تھے۔ اب مرید ہو جاؤ۔ انہوں نے کہ میں مرید ہو جاؤں گا تو آپ کہیں گے یہاں رکو اور اللہ اللہ کرو۔ یہ میرے لئے بڑا مشکل ہے۔ میں بچوں کو پالوں گا یا یہاں بیٹھ کر ذکر اللہ میں مشغول رہوں گا۔ فرمایا: یہ تو ہم نہیں کہتے کہ تم یہاں ٹھہرو۔ اب حضرت حاجی صاحبؒ بار بار فرما رہے ہیں کہ تم بیعت ہو جاؤ اور مولانا گنگوہی بار بار انکار کر رہے ہیں۔ لیکن بالآخر بیعت ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ: بس ایک چالیس دن میرے پاس ٹھہر جاؤ۔ عرض کیا۔ اسی لئے میں بیعت نہیں ہوتا تھا کہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔ فرمایا: بیس دن ٹھہر جاؤ۔ انہوں نے کہ میرے پاس بیس دن بھی نہیں ہیں۔ فرمایا: دس دن ہی ٹھہر جاؤ۔ ہوتے ہوتے آخر تین دن پر بات آئی کہ میں تین دن ٹھہر جاؤں گا۔

مجھے سنانا یہ تھا کہ بارات تو رخصت ہو گئی، مولانا گنگوہیؒ آکر تین دن کے لئے خانقاہ میں مقیم ہو گئے رات کو جب تین بجے کسی نے تہجد پڑھا۔ کسی نے ذکر اللہ کیا۔ اب پڑے پڑے شرم آئی کہ سارے تو اللہ اللہ کر رہے ہیں اور میں پڑا سوتا ہوں، تو خود بھی اٹھ کر وضو کیا اور چار رکعات پڑھیں۔ اگلے دن ارادہ کیا کہ اب میں نہیں پڑھوں گا، چاہے کوئی اٹھے نہ اٹھے۔ تو سو گئے۔ جب رات کے تین بجے لوگ اٹھے، تو ارادہ کیا کہ میں نہیں اٹھوں گا، مگر ماحول سے مجبور تھے، اٹھنا پڑا۔ تو کچھ تہجد پڑھی۔ اللہ اللہ بھی کیا۔ جب اسی طرح تین دن ہو گئے اور قلب پر اس کا اثر نمایاں ہوا، تو حضرت حاجی صاحبؒ سے عرض کیا۔ حضرت اگر آپ اجازت دیں تو کچھ اور ٹھہر جاؤں؟ فرمایا: ہم نے تو ٹھہرنے کو نہیں کہا تھا۔ تمہاری مرضی ہے۔ پھر دس دن ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ پھر بیس دن، پھر یہ معلوم ہوا کہ چالیس دن یا کتنے دن وہاں ٹھہرے۔ لیکن بہر حال خلافت لے کر وہاں سے واپس ہوئے۔ تو مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں ایک جماعت کا رنگ بنایا' وہاں ایک ماحول بھی تیار کیا۔ اس ماحول کے اثر سے آدمی مجبور ہوگا کہ آدمی ذکر اللہ کرے۔

ماحول کا اثر...... میں نے اپنی عمر میں تین ماحول دیکھے ہیں۔ ایک دار العلوم دیوبند کا ماحول، ایک گنگوہ کا ماحول

اور ایک تھانہ بھون کا ماحول۔ میری عمر آٹھ نو برس کی تھی۔ تو گنگوہ کا ماحول یہ تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ رؤں رؤں سے اللہ اللہ کی آواز آ رہی ہے۔ ہر ایک سے ذکر اللہ، ہر ایک سے اللہ اللہ۔ اس کا اثر کیا تھا؟

گنگوہ میں خانقاہ کے سامنے ایک بہت بڑا تالاب ہے اور شہر کے سارے دھوبی اس میں کپڑے دھوتے ہیں۔ تو ساٹھ ستر دھوبیوں کے کپڑے وہاں رکھے ہوئے ہیں اور بڑے بڑے مٹی کے کنڈے رکھے ہوئے ہیں۔ جس پر وہ کپڑوں پر پانی ڈال کر مارتے ہیں۔ اب دھوبی بے چارے بے پڑھے لکھے جاہل، جو کسی چیز سے واقف نہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ انہوں نے کپڑا اچھالا اور اس پر مارا، اور ہر ضرب کے ساتھ اِلَّا اللّٰہُ، اِلَّا اللّٰہُ سارا تالاب گونج اٹھتا، حالانکہ وہ جاہل اجہل تھے۔ لیکن یہ ماحول کا اثر تھا۔ خانقاہ سے جو ہر وقت اللہ اللہ کی اواز آتی تھی۔ تو دھوبیوں میں بھی وہ اللہ اللہ کی آواز چل پڑی۔ وہ بھی ہر ضرب کے ساتھ اِلَّا اللّٰہُ کا نعرہ لگاتے تھے۔ یہ تو وہاں کے ماحول کا اثر تھا۔ دار العلوم دیو بند میں یہ دیکھا کہ وہاں بے نماز رہنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہر نماز کے لئے ایک ڈیڑھ ہزار آدمی حجروں سے نکل کر مسجد میں آئے گا، تو کوئی کہاں تک بے نماز رہے گا، خواہ مخواہ شرما شرمی نماز پڑھے گا۔ تو یہاں بے نمازی رہنا بڑا مشکل ہے۔ اتفاقاً کسی کی قضاء ہو جائے، وہ الگ چیز ہے۔ لیکن تارک نماز بن جائے، یہ ممکن نہیں یہ ماحول کا اثر ہے، نماز پڑھنے پر مجبور ہے۔

تھانہ بھون کا یہ ماحول تھا کہ معاملات کی سچائی، دیانت اور تقویٰ۔ وہاں ہر طرح کے لوگ مقیم تھے امیر، بھی غریب بھی۔ کسی حجرے کو ہم نے نہیں دیکھا کہ کوئی تالا لگا کر گیا ہو۔ ایک شخص کو بھی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ وہاں تعلیم یہ ہوتی تھی، دیانت اور تدین پر قائم رہو۔ ایک دوسرے کو دوسرے سے تکلیف نہ پہنچے حتیٰ کہ اگر کسی کی کوئی چیز گر گئی، اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر حفاظت سے رکھو۔ یہیں پڑی رہنے دو۔ ممکن ہے وہ چیز والا آئے اور وہاں سے اٹھا کر لے جائے۔ ایک شخص تولیہ بھول گیا' تین دن تک مسجد کے فرش پر پڑا رہا۔ تیسرے دن وہ آیا اور اپنا تولیہ اٹھا کر لے گیا۔ یہاں دیانت، صفائی اور سچائی معاملات پر زور تھا۔ یہاں کے ماحول میں بد دیانت رہنا مشکل تھا۔

دار العلوم کے ماحول میں بے نماز رہنا اور گنگوہ کے ماحول میں رہ کر غافل رہنا مشکل تھا۔ ذکر اللہ کی کچھ نہ کچھ توفیق ہوتی تھی۔ ماحول کا قدرتی اثر ہوتا ہے، جو قلب کے اوپر پڑتا ہے۔ یہ مولانا مرحوم کی فراست باطنی تھی کہ جماعتی حیثیت قائم کر کے ایک ماحول بنایا۔ گھروں سے نکل کر اللہ کے گھر میں لوگ جمع ہوں۔ کوئی چلہ دے گا، کوئی دو چلے دے گا، کوئی دس دن، کوئی بیس دن ایک جگہ جمع ہوں گے، اب جب سارے مل کر ذکر اللہ کریں گے تو ایک آدمی کیسے ان سے غافل رہے گا۔ وہ خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہوگا۔ تو عمل کا راستہ بھی ڈال دیا، فقط تعلیم و تربیت ہی کا راستہ نہیں، بلکہ عملی راہ بھی ہموار کر دی۔ تو جماعتی حیثیت اس لئے ڈالی تاکہ لوگ اس کو قبول کریں۔ انفرادی بات کم قبول کرتے ہیں اور ماحول اس لئے بنایا کہ جماعت کے لوگوں میں خود دین راسخ ہو، یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ جماعت میں جانے والے کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ پہلے بے نماز تھے، اب

نمازی بن گئے۔ یہ تھوڑا اثر ہے؟ قدرتی من جانب اللہ اثر ہے۔ جب اس صحبت اور ماحول میں آئے گا، ممکن نہیں کہ آدمی اثر قبول نہ کرے۔

حدیث شریف میں نیک صحبت کی مثال عطار کی دکان سے دی گئی ہے۔ عطار کی دکان سے اگر آپ عطر نہ بھی خریدیں، کم سے کم خوشبو تو آ ہی جائے گی۔ دماغ میں فرحت تو ہو ہی جائے گی۔ اور بری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی گئی ہے۔ لوہار کی دکان پر جاؤ گے تو کالک ہی کپڑوں کے اوپر لگ جائے گی۔ کوئی پتنگا ہی آ لگے گا، کپڑا ہی جل جائے گا۔ کچھ نہ کچھ مضرت پہنچے گی۔ تو نیک صحبت سے ہمیشہ پاکیزہ اثرات پھیلتے ہیں اور بری صحبت سے برے اثرات پھیلتے ہیں۔

جماعت میں تربیت باطن بھی ہوتی ہے..... حضرت مولانا نے نیک صحبت کا ڈھنگ ڈال دیا کہ آدمی خواہ مخواہ ہی نیک بنے۔ ارادہ نہ بھی کرے، تب بھی نیک بننے پر مجبور ہوگا۔ کچھ ذکر اللہ، نماز اور روزے میں لگا، کچھ دیانت پیدا ہوئی، کایا پلٹ گئی۔ اتنے حالات بدل گئے تو اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ پھر ایثار اور ایثار کے ساتھ قناعت۔ ان چیزوں کی بھی تعلیم موجود ہے جو تربیت باطن ہے۔

اس لئے کہ جب آپ باہر جائیں تو گھر کا سارا سامان تو لے جا نہیں سکتے۔ زہد کی شان پیدا ہوگئی، پھر جب تک جڑے رہیں گے، تو ایک دوسرے کی اعانت بھی کریں گے۔ تو ایثار کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں خدمت گذاری کا جذبہ، ایثار کا جذبہ، ہر ایک کی خدمت کے لئے کھڑے ہو جانا، یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ جو جماعت کی برکت سے من جانب اللہ پیدا ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: ایمان دو چیزوں کا نام ہے۔ ''اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ'' اللہ کے اوامر کی تعظیم دل میں بیٹھ جائے اور مخلوق کی خدمت کا جذبہ دل میں پیدا ہو جائے۔ جماعتوں میں نکلنے سے بحمد اللہ، اللہ کی عظمت بھی دل میں بیٹھتی ہے اور خدمت خلق کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ ایک دوسرے کی اخلاص کے ساتھ خدمت گذاری کا جذبہ ابھرتا ہے۔

جو لوگ اپنا خرچ کر کے دنیا کے ملکوں میں جائیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ایثار ہی کر رہے ہیں۔ ایثار کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں اپنے خرچ پہ نکلیں۔ جو اپنا خرچ کرنے پر آمادہ ہے۔ وہ دوسرے کی خدمت سے کیسے گریز کرے گا۔ خود بخود خدمت خلق اللہ کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

جماعت تبلیغ کی مقبولیت کے آثار..... تو اس دور میں اصلاح کا اور طریقہ اس کے سوا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ طریقہ مولانا کے قلب مبارک پر وارد کیا اور اس تیس چالیس برس کے اندر اندر جماعتیں پھیلیں۔ دنیا کا کوئی ملک جہاں ہمارا جانا ہوا۔ ہم نے نہیں دیکھا کہ جماعت تبلیغ وہاں موجود نہ ہو۔ لندن، فرانس، امریکہ اور افریقہ میں جگہ جگہ موجود ہے۔ یہ من جانب اللہ مقبولیت کی بات ہے کہ اللہ کا نام لینے والے ہر جگہ پہنچ جائیں اور خدا

کے نام کی منادی دیں اور اعلان کریں۔ یہ آثار مقبولیت ہیں۔

اور میرا مقصد یہ ہے کہ یہ بناء ڈالنے والے خود مقبولان الٰہی ہیں۔لوگ کچھ اعتراض کیا کرتے ہیں۔لیکن بشری کارخانہ کونسا ایسا ہے جس پہ اعتراض نہیں ہوتے۔مگر میں سب کا جواب ایک ہی دیتا ہوں کہ بھئی! ایک عارف باللہ کے قلب میں یہ چیز من جانب اللہ آئی۔اس واسطے وہ امر خیر ہے۔اگر یہ کسی لیڈر کے ذہن میں آتی، میں یہ سمجھتا کوئی سیاسی مصلحت ہوگی۔کسی وطنی آدمی کے ذہن میں آتی، میں سمجھتا کوئی وطنی مصالح ہوں گی۔لیکن ایک اللہ والے کے دل پر یہ چیز وارد ہوئی۔اس میں فی الحقیقت خیر ہی خیر ہے۔اس میں من جانب اللہ برکات کے آثار ہیں۔تو سب جوابوں کا ایک ہی جواب ہے کہ اس سلسلہ کو اہل اللہ نے اٹھایا ہے۔اس میں ان شاء اللہ خیر ہے۔جماعتوں کا نکلنا، اس میں لوگوں کی اصلاح ہو جانا۔یہ خود اس کی ایک دلیل ہے کہ اس کی برکات پھیل رہی ہیں۔ملکوں کے اندر پھیل رہی ہیں۔

ہم فرانس میں گئے، وہاں پر ظاہر ہے کہ میرا تو کوئی تعارف نہیں تھا۔ہم پہنچے، ہوائی اڈے پر سینکڑوں آدمی استقبال کے لئے موجود ہیں۔مجھے حیرت ہوئی کہ میرا تو کوئی تعارف نہیں۔پہلی دفعہ آنا ہوا ہے۔بہرحال وہ سمجھے کہ ہمارا ایک خادم آرہا ہے، ہم سب چلیں، وہ ہوائی اڈے پر آگئے۔اب یہ ایثار اور خدمت، یہ جذبۂ خدمت ہی کی بات ہے، ورنہ میں کیا چیز تھا۔ایک معمولی آدمی، میری کوئی حیثیت نہیں۔مگر محبت میں یہ سب آگئے جگہ جگہ یہی دیکھا۔

اب انہوں نے کہا کہ تقریر بھی کرو۔ایک جلسہ بھی منعقد کیا۔وہاں سارے عرب تھے۔میں نے کہا کہ: مجھے تو عربی بولنے کی قدرت نہیں ہے۔کتابوں میں پڑھی تھی، مگر بولنے کا تعلق تو مشق ہے۔میں نے کہا کہ: میں اردو میں تقریر کروں گا، کوئی صاحب بعد میں عربی میں ترجمہ کریں۔مگر وہاں کے عربوں نے کہا ہم عربی میں تقریر سنیں گے، چاہے پانچ ہی منٹ ہو، تو صاحب وہاں پھر عربی میں تقریر بھی کی۔پندرہ بیس منٹ ٹوٹی پھوٹی جو سمجھ میں آئی۔وہ کردی۔بہرحال ہر جگہ امریکہ وغیرہ میں یہی دیکھا۔ہر جگہ جماعت موجود۔بغیر مقبولیت من جانب اللہ کے یہ چیز پیدا نہیں ہوسکتی کہ قلوب پر الگ اثرات ہیں، عمومیت الگ ہے، ملکوں میں پھیل جانا الگ ہے۔یہ ساری چیزیں اس کی دلیل ہیں کہ اللہ کی طرف سے یہ سلسلہ اتارا گیا اور یہ مقبول خداوندی بھی ہے۔

برما جب جانا ہوا تو میں نے دو ہی چیزوں پر زور دیا۔ایک تو یہ کہ بقدر ضرورت تعلیم دو تاکہ مسائل معلوم ہوں۔سب کا عالم بننا ضروری نہیں۔جزوی طور پر عالم ہونا فرض کفایہ ہے۔اگر ہزاروں میں سے ایک بھی بن گیا۔پوری جماعت کا فرض ادا ہوگیا۔لیکن دیندار بننا ہر ایک پر فرض ہے اور دینداری کے لئے کچھ ابتدائی مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے۔اس واسطے ابتدائی تعلیم اور اس کے ساتھ پھر سلسلہ تبلیغ کے اندر لگو۔اس سے تمہارے قلوب کی بھی اصلاح ہوگی، اعمال کی بھی اصلاح ہوگی اور دین بھی پھیلے گا۔اس کی اشاعت ہوگی۔بحمداللہ جماعت کے اثرات وہاں محدود نہیں، بلکہ پھیل رہے ہیں اور پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔یہ حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔

تبلیغ دین میں جماعتی حیثیت کا رد کرنا مشکل ہوتا ہے......تو آیت میں نے یہ پڑھی تھی کہ ہم نے رسول بھیجے۔ دو کو انہوں نے جھٹلا دیا تو ہم نے تیسرے کا اضافہ کیا۔ یہ جماعتی صورت پیدا ہوگئی۔ جماعتی حیثیت کا ٹھکرانا بڑا مشکل ہوگا۔ ماننا نہ ماننا، عمل کرنا نہ کرنا تو لوگوں کے اختیار میں ہے۔ لیکن عقلی طور پر اس کو کوئی رد کرے، یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک جماعتی آواز ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ رد کی جاسکے۔ بحمد اللہ یہ اللہ تعالیٰ نے جماعت کو توفیق دی اور جماعت کے ساتھ جو بھی وابستہ ہوا۔ ان کو توفیق دی اور اس توفیق سے بڑا کام ہوا۔

تعلیم و تبلیغ کا باہمی تقابل نہیں ہے...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ: یہ جماعت اس وقت ہمارے لئے آبرو ہے۔ اگر کوئی ہم سے کہے کہ بھائی! تم نے تبلیغ کیوں نہیں کی؟ ہم کہیں گے کہ ہماری جماعت تبلیغ کر رہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کوئی جماعت تعلیم میں لگی ہوئی ہے، کوئی تبلیغ میں لگی ہوئی ہے۔ یہ تقسیم عمل ہے، تقسیم عمل سے عمل دو نہیں ہوتے، بنیاد سب کی ایک ہوتی ہے۔ اب دارالعلوم میں ایک جماعت منتظمین کی ہے، وہ درس نہیں دے سکتی۔ مدرسین کی جماعت انتظام نہیں کر سکتی۔ یہ دونوں مدمقابل تھوڑا ہی ہیں۔ جو جماعت انتظام کر رہی ہے، وہ مدرسین کو تقویت پہنچا رہی ہے۔ جو درس دے رہے ہیں وہ منتظمین کو تقویت پہنچا رہے ہیں، تو جو جماعت تبلیغ کر رہی ہے، وہ جماعت تعلیم کو تقویت پہنچا رہی ہے، میں نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خود ان کا مقولہ سنا، ان کی شان عجیب تھی، فرمایا: ''بھائی! یہ سلسلہ میں نے اس لئے جاری کیا ہے کہ مدرسوں کو طالب علم ملیں اور مشائخ کو مرید ملیں''۔ اس واسطے یہ سلسلہ جاری کیا ہے تاکہ علم بھی پھیلے اور اخلاق بھی درست ہوں۔

اور مولانا مرحوم اس حد تک تھے کہ جب یہ کام ابتدائی شروع ہوا، تو ہر چھ مہینے کے بعد دہلی میں گزارتے تھے۔ کچھ دارالعلوم دیوبند میں، کچھ مظاہر العلوم میں۔ اور غایت تواضع سے فرماتے کہ: بھائی اتنا کام تو میں نے کرلیا۔ اب بتاؤ آگے کیا کروں؟

حالانکہ وہ خود ہی جاننے والے تھے۔ ان کے قلب پر یہ چیز وارد ہوئی تھی۔ لیکن تواضع کی انتہا تھی کہ دوسروں سے پوچھتے، حتیٰ کہ ہم جیسے چھوٹوں سے کہتے کہ بھئی! اب آگے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت آپ پوچھ رہے ہیں۔ آپ تو خود دوسروں کے لئے راہنما ہیں۔ مگر یہ کمال تواضع تھا کہ سب کچھ کر کے بھی سمجھتے تھے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور چھوٹوں سے مشورہ لیتے تھے۔ یہ ان کی شان تھی۔

ایک اللہ والے کے اخلاص نے پوری دنیا کو متحرک کر دیا......اور ایک دھن تھی اور ایسی دھن تھی کہ کسی کو کھانے کی اور سونے کی نہیں ہوسکتی۔ وہی دھن اللہ کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔ وہی دھن اور جذبہ ہے کہ جماعت آج تک حرکت میں ہے۔ ایک اللہ والے کے قلب کے اخلاص نے سب کو متحرک بنا رکھا ہے۔ بہرحال جماعت بھی مبارک ہے، اس کا کام بھی مبارک ہے اور جتنا زیادہ کیا جائے، جتنی اس میں شرکت زیادہ ہو، وہ انشاء اللہ باعث خیر و برکت ہوگی۔ جتنا وقت ہے دو، چلہ لگاؤ، دو چلے لگاؤ وہ انشاء اللہ خیر ہی خیر پائیں گے۔ کوئی برائی اور شر

نہیں ہوگی۔ دین بھی درست ہوگا اور دنیا بھی انشاء اللہ درست ہوگی۔ بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ بَارِكْ وَسَلِّمْ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

فضیلت النساء

”اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَاِذْقَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ٥ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. ②

تمہید...... بزرگان محترم! قرآن شریف کی آل عمران سے تین آیتیں اس وقت میں نے تلاوت کیں۔ان میں حق تعالیٰ شانہ نے حضرت مریم کا ایک واقعہ ذکر فرمایا جس میں ملائکہ نے حضرت مریم کو خطاب فرمایا ہے۔اس جلسہ کے منعقد کرنے کی غرض وغایت چونکہ عورتوں کو خطاب ہے اس لئے میں نے اس آیت کو اختیار کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو مردوں کے ہیں بلکہ بعض امور میں مردوں سے عورتوں کا حق زیادہ ہے۔اس لئے کہ بچوں کی تربیت میں سب سے پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔اسی سے بچہ تربیت پاتا ہے۔ سب سے پہلے جو سیکھتا ہے، ماں سے سیکھتا ہے، باپ کی تربیت کا زمانہ شعور کے بعد آتا ہے، لیکن ہوش سنبھالتے ہی بلکہ بے ہوشی کے زمانے میں بھی ماں ہی اس کی تربیت کرتی ہے۔گویا اسکی تربیت گاہ ماں کی گود ہے۔اگر ماں کی گود علم، نیکی، تقویٰ اور صلاحیتوں سے بھری ہوئی ہے، وہی اثر بچے میں آئے گا۔اور اگر خدانخواستہ ماں کی گود ہی ان نعمتوں سے خالی ہے تو بچہ بھی خالی رہ جائے گا۔ ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج ــــ تا ثریا می رود دیوار کج

کسی فارسی کے شاعر نے کہا ہے کہ: جب عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی جائے‘ تو اخیر تک عمارت ٹیڑھی ہوتی چلی جاتی ہے۔شروع کی اینٹ اگر سیدھی رکھ دی جائے تو اخیر تک عمارت سیدھی چلتی ہے۔جس چیز کا آغاز اور ابتداء درست ہو جائے اس کی انتہا بھی درست ہو جاتی ہے۔اس واسطے عورتوں کا مردوں سے زیادہ حق

① پارہ:۳،سورۃ آل عمران،الآیۃ: ۴۲، ۴۳. ② ۱۷ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ۔

ہے اور ہم اسی حق کو زیادہ پامال کر رہے ہیں۔ مرد تو ہر جگہ موجود ہیں اور عورتوں کو سنانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر عورتیں مردوں کے حکم سے آئی ہیں تو مردوں کا شکریہ!

اور اگر از خود آئی ہیں تو پھر ان کے دینی جذبے کی داد دینی چاہئے کہ ان کے اندر بھی از خود ایک جوش و جذبہ ہے کہ دینی باتیں سیکھیں اور معلوم کریں۔ بہر حال سب سے زیادہ خوشی یہ ہے کہ ان کے اندر دین کی طلب ہے۔ اگر خود پیدا ہوئی تو وہ شکریئے کی مستحق ہیں اور اگر طلب پیدا کی گئی تو اس طلب کے پیدا کرنے والے بھی اور جنہوں نے اس کو قبول کیا وہ بھی شکریئے کے مستحق ہیں۔ اس واسطے میں نے کہا: مردوں سے عورتوں کا زیادہ حق ہے، اس لئے کہ زندگی کی ابتداء انہی سے ہوتی ہے۔

عورتوں کی قوت عقل...... اس وجہ سے بھی کہ بچوں کا قصہ بعد میں آتا ہے خود خاوند بھی عورت سے متاثر ہوتا ہے۔ عورتیں جب کسی چیز کو منوانا چاہتی ہیں تو منوا کے رہتی ہیں۔ وہ ضد کریں، ہٹ دھرمی کریں یا کچھ کریں خاوند کو مجبور کر دیتی ہیں۔ اس میں ایک پہلو جہاں عورتوں کے لئے عمدہ نکلتا ہے وہاں ایک بات کمزوری کی بھی نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مَا رَاَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّ دِیْنٍ اَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰکُنَّ“ ① ”یہ عورتیں ہیں تو ناقص العقل، ان کی عقل کم ہے، مگر بڑے بڑے کامل العقل مردوں کی عقلیں اچک کر لے جاتی ہیں“۔ اچھے خاصے عقل مند بھی ان کے سامنے پاگل بن جاتے ہیں۔ جب وہ چاہتی ہیں کہ یہ کام ہو تو مرد ان کے سامنے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اور یہاں آپ کے ہاں بھی ایسا ہی ہوگا اس لئے کہ عورتوں کا مزاج سب جگہ ایک ہی ہے اور مردوں کی ذہنیت بھی ایک ہی ہے البتہ تمدن کا فرق ہے۔

شادی بیاہ وغیرہ میں جو اکثر رسمیں ہوتی ہیں وہ رسمیں تباہ کن ہوتی ہیں۔ وہ دولت اور دین کو بھی برباد کرتی ہیں، جب مردوں سے پوچھا جاتا ہے کہ بھئی! کیوں ان خرافات میں پڑے ہوئے ہو، تم سمجھ دار اور عقل مند آدمی ہو، اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ دولت اور دین بھی برباد ہو رہا ہے۔ تو کیوں ایسا کرتے ہو؟۔ کہ جی عورتیں نہیں مانتیں کیا کریں۔ گویا عورتیں حکام ہیں وہاں سے آرڈر جاری ہوتا ہے اور یہ غلام و رعایا ہیں ان کا فرض ہے کہ اطاعت کریں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہیں تو یہ ناقص العقل، مگر اچھے بڑے عقل والوں کی عقلیں اچک کر لے جاتی ہیں اور انھیں بے وقوف بنا دیتی ہیں۔ تو جب عورت میں یہ قوت موجود ہے کہ عقل مند کو بھی بے قوف بنا دیتی ہے اور اچھے بھلے مرد کو مجبور بنا دے، اگر وہ کسی اچھی چیز کے لئے مرد کو مجبور کرے گی تو مرد کیوں نہیں مجبور ہوگا؟

اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے یوں کہہ دے کہ: جناب سیدھی بات ہے کہ آپ کا حکم واجب الاطاعت ہے۔ آپ خدا کی طرف سے میرے مربی سب کچھ ہیں لیکن آپ نماز نہیں پڑھتے، جب تک آپ نماز نہیں پڑھیں گے میں بھی آپ کے حکم کی پابند نہیں ہوں۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب بیان نقصان الایمان بنقص الطاعات، ج: ۱ ص: ۸۶ رقم: ۷۶.

وہ جھک مارے گا ضرور پڑھے گا، چاہے خدا کی نہ پڑھے، بیوی کی ضرور پڑھے گا۔ جب عورتیں ضد کر کے دنیا کی بات منوالیتی ہیں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین کی بات نہ منوالیں۔ عورتوں کی بدولت بہت سے خاندانوں کی اصلاح ہوگئی ہے۔ عورتوں نے ضد کی مرد مجبور ہو گئے۔ ہمارے ہاں بعض خاندان ایسے تھے جو کچھ خرافات میں مبتلا تھے۔ اس واسطے کہ گھر میں دولت تھی، کہیں سینما، کہیں تھیٹر وغیرہ۔ نماز کا تو کہیں سوال ہی نہیں اتفاق سے عورت نہایت صالح اور دیندار گھرانے کی آ گئی چند دن اس نے صبر کیا بعد میں اس نے کہا صاحب! یہ نبھاؤ بڑا مشکل ہے اس واسطے کہ رمضان آئے گا تو میں روزے سے رہوں گی اور تم بیٹھ کر کھانا کھاؤ گے اور پکانے پر مجھے مجبور کرو گے میں پکانے کے لئے مجبور نہیں ہوں جہاں چاہے پکواؤ اس گھر میں یہ نہیں ہوگا۔ اس واسطے کہ اس بد دینی میں تمہاری اعانت کرسکوں یہ خود گناہ کی بات ہے۔ یا تو اپنا بندوبست کرو یا پھر ان خرافات کو چھوڑ و۔ آخر مرد مجبور ہوئے، نماز روزے کے پابند ہو گئے اور ان میں بہت سی اچھی خصلتیں پیدا ہو گئیں اس لئے سب سے بڑا مربی تو عورت ہے جو گھر کے اندر موجود ہے اس کی تربیت سے آدمی کام لے۔

اس لئے اپنی بہنوں سے یہ خطاب ہے کہ جب وہ ایسا دباؤ ڈال سکتی ہیں کہ مرد ان کے سامنے مجبور ہیں۔ تو جہاں دنیا کے لئے زیور، کپڑے لانے کے لئے، برتن لانے کے لئے گھر بنانے کے لئے دباؤ ڈالتی ہیں۔ اگر دیندار گھر بنانے کے لئے دباؤ ڈالیں تو یقیناً وہ دیندار بنیں اور وہ اپنے خاوند کے لئے اصلاح کا ذریعہ بن جائیں گی۔ اس لئے ان کی دل میں نیکی، تقویٰ اور بھلائی کا جذبہ ہونا چاہئے تا کہ خاوند پر بھی اس کا اثر پڑے۔ تو ایک عورت بچوں پر، خاوند پر اور کنبہ والوں پر بھی بہتر اثر ڈال سکتی ہے۔

عموماً سننے میں آیا ہے کہ خاندانوں میں جو جھگڑے اور تفریقیں پیدا ہوتی ہیں عورتوں کی بدولت پیدا ہوتی ہیں ایک دوسرے کو اتار چڑھاؤ کر کے بدظن بنا دیتی ہیں، دو حقیقی بھائیوں میں لڑائی پیدا کر دیتی ہیں حتیٰ کہ خاندانوں میں نزاع اور جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں اس کے برعکس اگر عورت نیک نہاد اور نیک طینت ہے تو بڑے بڑے جھگڑے ختم کرا دیتی ہے خاندان مل جاتے ہیں تو اپنی اس طاقت کو نیکی میں کیوں نہ خرچ کیا جائے، برائی اور بدی میں کیوں خرچ کیا جائے؟ جب اللہ نے ایک طاقت دی ہے تو اس کو صحیح راستے پر خرچ کیا جائے۔

دینی ترقی کے لئے مرد وعورت کے لئے ایک ہی راستہ ہے...... اس واسطے میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی۔ اس میں خصوصیت سے عورتوں ہی کے واقعات کا ذکر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک بزرگ ترین بی بی کا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی اس آیت کے پڑھنے کی نوبت آئی کہ عورتوں کو یہ شکایت پیدا نہ ہو جب خطاب کیا جاتا ہے۔ مردوں ہی کو کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اللہ نے مردوں ہی کو خطاب کیا تا کہ یہ غلط فہمی ان کی رفع ہو جائے۔ جیسے مردوں کو خطاب کیا ہے۔ عورتوں کو بھی کیا ہے۔ کہیں مرد عورت دونوں کو ملا کر خطاب کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو کہ جو دین کی ترقی کا راستہ مرد کے لئے ہے وہی عورت کے لئے ہے جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ

وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّاللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ ① مسلم مرد، مسلم عورت، مومن مرداور مومن عورت، عبادت گزار مرداور عبادت گزار عورت، سچا مرداور سچی عورت، صدقہ دینے والا مرداور صدقہ دینے والی عورت، روزہ دار مرداور روزہ دار عورت، حیاء کی حفاظت کرنے والا مرداور حیاء کی حفاظت کرنے والی عورت، اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والا مرداور کثرت سے ذکر کرنے والی عورت۔ان کے لئے وعدہ دیا ہے کہ اللہ نے ان کے لئے مغفرت، اجر عظیم اور آخرت کے درجات تیار کئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین کے راستہ پر چل کر جتنی ترقی مرد کر سکتا ہے۔ وہی بعینہ عورت بھی کر سکتی ہے۔اگر ایک مرد ولی کامل بن سکتا ہے تو عورت بھی ولی کامل بن سکتی ہے۔اسلام میں جیسے مردوں میں اولیاء اللہ کی کمی نہیں ہے۔ویسے ہی عورتوں میں بھی اولیاء اللہ کی کمی نہیں ہے۔اس بارے میں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ان عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ولایت کے مقام کو پہنچی ہیں اور ولی کامل گذری ہیں۔ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہیں کہیں حضرت رابعہ بصریہ، کہیں رابعہ عدویہؒ ہیں پھر صحابیات جتنی ہیں وہ تو ساری کی ساری اولیائے کاملین میں سے ہیں تو تابعین، تبع تابعین اور بعد کے لوگوں میں بڑی بڑی کامل عورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ پھر ہر فن کے اندر پیدا ہوئیں، محدث، مفسر، ادیب، شاعر اور مؤرخ بھی گذری ہیں۔ان کی تصنیفات ہیں اور ہزاروں مرد ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اگر عورت دینی ترقی نہ کر سکتی تو یہ عورتیں کہاں سے پیدا ہو گئیں؟

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں۔ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری وحی کا آدھا علم میرے سارے صحابہؓ سے حاصل کرو اور آدھا علم تنہا عائشہؓ سے حاصل کرو۔گویا صدیقہ عائشہؓ اتنی زبردست عالمہ ہیں گویا نبوت کا آدھا علم صدیقہ کے پاس ہے۔آدھا علم سارے صحابہؓ کے پاس ہے۔صدیقہ عائشہؓ ایک عورت ہی تو ہیں۔تو عورت کو اللہ نے وہ رتبہ دیا کہ ہزار ہا ہزار صحابہؓ ایک طرف اور ایک عورت ایک طرف اس سے معلوم ہوا۔عورت جب ترقی کرنے پہ آتی ہے تو اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ بہت سے مرد بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔تو اللہ کی طرف سے عورتوں کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہے۔چاہے دنیا میں ترقی کریں یا دین میں علم وفضل میں بھی برابر چل سکتی ہیں۔

آپ نے امام ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا ہوگا۔جن کی کتاب طحاوی شریف جو حدیث شریف کی کتاب ہے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔یہ عورت کا طفیل ہے امام طحاویؒ کی بیٹی نے حدیث کی کتابیں املاء کی ہیں۔باپ حدیث اور اس کے مطالب بیان کرتے تھے، بیٹی لکھتی جاتی تھی۔اس طرح کتاب مرتب ہوگئی۔گویا جتنے علماء اور محدث

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۵.

گذرے ہیں۔ یہ سب امام ابی جعفر کی بیٹی کے شاگرد اور احسان مند ہیں۔ یہ بھی ایک عورت تو تھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ امام طحاویؒ کی بیٹی تو محدث بن سکے، ہماری کوئی بہو بیٹی نہ بن سکے؟ وہی نسل ہے، وہی چیز ہے، وہی ایمان، وہی دین ہے۔ وہ علم آج بھی موجود ہے۔ توجہ اور بے توجہی کا فرق ہے۔ ان لوگوں نے توجہ دی تو عورتیں بھی ایسی بنیں کہ بڑے بڑے مرد بھی ان کے شاگرد بن گئے آج توجہ نہیں کرتیں، کمال نہیں پیدا ہوتا مگر صلاحیتیں موجود ہیں۔

عورت میں غیر معمولی ترقی کی صلاحیت موجود ہے...... بہر حال علماء اسلام نے ان بڑی بڑی عورتوں کا ذکر کیا ہے جو ولایت کے مقام تک پہنچی اور کامل ہوئی ہیں ہاں البتہ کچھ عہدے اسلام نے ایسے رکھے ہیں جو عورتوں کو نہیں دیئے گئے۔ وہ اس بنا پر کہ عورت کا جو مقام ہے وہ حرمت و عزت کا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اجنبی مردوں میں خلط ملط اور ملی جلی پھرے اس سے فتنے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ برائیوں کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لئے عورتوں کو ایسے عہدے نہیں دیئے گئے جس سے فتنوں کے دروازے کھلیں۔ لیکن صلاحیتیں موجود ہیں۔

صلاحیت اس حد تک تسلیم کی گئی ہے کہ علماء کی ایک جماعت اس بات کی بھی قائل ہے کہ عورت نبی بن سکتی ہے۔ رسول تو نہیں بن سکتی مگر نبی بن سکتی ہے۔ نبی اسے کہتے ہیں جس سے ملائکہ علیہم السلام خطاب کریں اور خدا کی وحی اس کے اوپر آئے۔ رسول اسے کہتے ہیں جو شریعت لے کر آئے اور خلق اللہ کی تربیت کرے اس لئے تربیت کا مقام تو نہیں دیا گیا مگر ان کے نزدیک نبوت کا مقام عورت کے لئے ممکن ہے۔

حتی کہ ظاہر یہ کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں۔ فرشتے نے خطاب کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی تھیں اور فرعون کی بیوی حضرت آسیہ علیہا السلام جو ابتداء سے ہی مسلمان تھیں۔ وہ نبوت کے مقام پر پہنچیں تو نبوت سے بڑا عالم بشریت میں انسان کے لئے کوئی مقام نہیں ہے۔ خدائی کمالات کے بعد اگر بزرگی کا کوئی درجہ ہے، تو وہ نبوت کا ہے۔ اس سے بڑا کوئی درجہ نہیں جب عورت کو یہ درجہ بھی مل سکتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ عورت کی صلاحیتیں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ سب مقام طے کر سکتی ہے۔ البتہ رسول نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ رسول کے یہ معنی ہیں کہ وہ شریعت کے ساتھ تربیت کرے، اس لئے عورت کو اس مقام پر نہیں لایا گیا کہ وہ اجنبی مردوں کی تربیت کرے۔ اس میں چونکہ فتنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے یہ مقام چھوڑ دیا گیا۔

یا جیسے شریعت اسلام کا مسئلہ ہے کہ قاضی جج اور چیف جسٹس نہیں بنائی جائے گی کہ وہ فیصلے کرنے لگے اس لئے کہ جب وہ فیصلہ کرنے بیٹھے تو مدعی اور مدعی علیہ اس کے سامنے آئیں گے۔ اس کو حق ہے کہ جرح کرے گواہوں کی حالت کو دیکھے۔ سب اس کے آمنے سامنے ہوں گے۔ اس میں پھر فتنے کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے اس مقام پر عورت کو نہیں لایا گیا حاصل یہ ہے کہ اگر عورت محنت و توجہ کرے تو کوئی مقام بزرگی اور علم فضل کا ایسا نہیں ہے جو عورت کو حاصل نہ ہو۔ امام طحاویؒ کی بیٹی، حضرت رابعہ بصریہؒ حضرت رابعہ عدویہؒ ہزاروں لاکھوں کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عورتیں، تابعین کی بیویاں، بیٹیاں۔ یہ بڑی بڑی عالم اور فاضل گزری ہی ہیں۔

عورت اولیائے کاملین کے لئے مربی بھی بن سکتی ہے..... حضرت رابعہؒ کے واقعات میں ہے کہ ایک دن جوش سے چلیں۔ ایک برتن میں آگ تھی اور ایک برتن میں پانی تھا۔ بہت ہی جذبے اور جوش کے ساتھ جارہی ہیں۔ لوگوں نے کہا: اے رابعہ کہاں چلی؟ کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن اور ایک ہاتھ میں پانی کا برتن کہاں جارہی ہو؟۔ جوش میں آ کر کہا کہ میں اس لئے جارہی ہوں کہ اس آگ سے جنت کو جلادوں اور اس پانی سے جہنم کو بجھادوں اس لئے کہ جو عبادت کرتا ہے جنت کی طمع میں کرتا ہے یا دوزخ سے ڈر کر کرتا ہے۔ اپنے مالک کی محبت میں کوئی عبادت نہیں کرتا۔ میں اس لئے جارہی ہوں تا کہ ان دونوں کو ختم کروں تا کہ بندوں میں خلوص پیدا ہو۔ اخلاص اور محبت خداوندی کا مقام پیدا ہو۔ اس مقام کی عورتیں بھی گذری ہیں جن کے جذبات کا یہ عالم ہے۔ عورتوں نے بہت بڑے بڑے اولیائے کاملین کی تربیت کی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ تابعی ہیں اور صوفیاء کے امام ہیں اور سلسلہ چشتیہ کے اکابر اولیاء میں سے ہیں ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ حضرت رابعہ بصریہؒ ان کے مکان پر آئیں کوئی مسئلہ پوچھنا تھا یا کوئی بات کرنی تھی معلوم ہوا حضرت حسن بصریؒ مکان پر نہیں ہیں۔ پوچھا کہاں گئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ دریا کے کنارے پر گئے ہیں اور ان کی عادت یہ ہے کہ اپنا ذکر اللہ یا عبادت وغیرہ دریا کے کنارے پر کرتے ہیں۔ بعض اہل اللہ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے ذکر اللہ کرنے کے لئے جنگلوں کی راہ اختیار کی۔ یا پہاڑوں میں بیٹھ کر اوراد کرتے ہیں اس میں ذرا یکسوئی زیادہ ہوتی ہے اور دریا کے کنارے پر بیٹھنے کے بارے میں صوفیاء لکھتے ہیں کہ قلب میں تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ مادی تاثیر اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ پانی کے کنارے پہنچ کر قلب میں فرحت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی فرحت اور نشاط پیدا ہوگا اتنا ہی قلب ذکر اللہ کی طرف مائل ہوگا بنیادی اور باطنی وجہ اس کی یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: چلتا ہوا پانی خود اللہ کی تسبیح کرتا ہے اللہ کا نام لیتا ہے اور ذکر کرتا ہے۔ پانی کے ذکر کا اثر بھی انسان کے قلب پر پڑتا ہے تو اس کی طبیعت اور زیادہ ذکر اللہ کی طرف مائل ہو جاتی ہے ان وجوہ کی بناء پر حضرت حسن بصریؒ اکثر دریا کے کنارے پر جا کر عبادت کرتے تھے۔

بہر حال رابعہ بصریہ کو معلوم ہوا کہ حسن بصری اپنی عادت کے مطابق ذکر و عبادت کرنے کے لئے دریا کے کنارے پر گئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی وہیں پہنچ گئیں۔ وہاں جا کے یہ عجیب ماجرا دیکھا کہ حسن بصریؒ نے پانی کے اوپر مصلی بچھا رکھا ہے اور اس کے اوپر نماز پڑھ رہے ہیں۔ نہ مصلی ڈوبتا ہے نہ تر ہوتا ہے گویا کرامت ظاہر ہوئی۔ رابعہ بصریہ کو یہ چیز ناگوار گذری اور اسے اچھا نہ سمجھا کیونکہ یہ عبدیت اور بندگی کی شان کے خلاف ہے۔ بندگی کے معنی یہ ہیں بڑے سے بڑا بزرگ لوگوں میں ملا جلا رہے۔ کوئی امتیازی مقام پیدا کرنا یہ ایک قسم کا دعویٰ اور صورۃً تکبر ہے کہ میں سب سے بڑا ہوں اس لئے کہ تم وہ کام نہیں کر سکتے جو میں کر سکتا ہوں۔ گویا میں بڑا صاحب کرامت اور صاحب تصرف ہوں، زبان سے اگر چہ نہ کہے مگر صورت حال سے ایک دعویٰ پیدا ہوتا ہے کہ اور اہل

اللہ کے نزدیک سب سے بڑی چیز جو ہے وہ دعویٰ کرنا ہے اس لئے کہ اس میں تکبر اور کبر کی علامت ہے اور ولایت کا مقام یہ ہے کہ تکبر مٹ کر خاکساری پیدا ہو۔ تو جس بزرگ میں تکبر یا کبر کی صورت بن جائے وہ بزرگ ہی کیا ہوا؟۔ حضرت رابعہؒ کو یہ چیز اس لئے ناگوار گزری کہ حسن بصریؒ بزرگوں کے امام اور وہ ایسی صورت پیدا کریں جس سے دعویٰ نکلتا ہو کہ میں بھی کوئی چیز ہوں، میں گویا بڑا کرامت والا ہوں۔ حسن بصریؒ کے لئے یہ زیبا نہیں تھا۔ یہ شان عبدیت کے خلاف ہے۔

بلکہ در پردہ گویا یہ دعویٰ ہے کہ میں خدائی اختیارات رکھتا ہوں کہ تم اسباب کے تحت مجبور ہو کے پانی پر کشتی سے جاؤ اور میں مجبور نہیں ہوں۔ میں پانی پر ویسے ہی چل سکتا ہوں، میرے پاس خدائی قوتیں موجود ہیں۔ جب یہ دعویٰ ہو گیا تو بزرگی کہاں رہی؟ اس واسطے یہ چیز اچھی نہ معلوم ہوئی۔ مگر چونکہ یہ بھی بزرگ ہیں تو انہوں نے اصلاح کی، اصلاح کس طرح کی؟ زبان سے کچھ نہیں کہا عمل سے اصلاح کی۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے پانی کے اوپر مصلیٰ بچھا رکھا تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ اپنے مصلے کو ہوا کے اوپر اڑا کر اس کے اوپر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اب مصلیٰ ہوا کے اوپر لٹکا ہوا ہے اور نماز پڑھ رہی ہیں۔ حسن بصریؒ سمجھ گئے کہ مجھے ہدایت کرنی مقصود ہے۔ فوراً اپنا مصلیٰ لپیٹا اور دریا کے کنارے پر آ گئے۔

رابعہ بصریہؒ نے بھی ہوا سے مصلیٰ لپیٹا اور نیچے آئیں اور آ کر دو جملے ارشاد فرمائے۔ وہ کتنے قیمتی اور زریں جملے تھے کہ دین دنیا کے ساری نصیحتیں ان دو جملوں میں کھپی ہوئی تھیں، فرمایا: اے حسن بصری!

برآب روی خسے باشی، برہوا پری مگسے باشی دل بدست آر کہ کسے باشی

اے حسن بصریؒ! اگر تم پانی پر تیر گئے تو کوڑا کباڑ اور کچرا بھی پانی کے اوپر تیرتا ہے یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے اور اگر رابعہ ہوا میں اڑی تو مکھیاں بھی تو ہوا میں اڑتی ہیں۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ اپنے نفس کو قابو میں کرو، اس پر کنٹرول حاصل کرو، تاکہ صحیح معنی میں انسان بنو۔ انسان بننا کمال ہے مکھی بننا کمال نہیں ہے۔ آدمی بننا کمال ہے۔ کوڑا کچرا بننا کمال نہیں ہے۔

ہم اگر ہوائی جہاز سے پچاس ہزار فٹ بلندی پر اڑ جائیں بے شک یہ بڑے کمال کی بات ہے۔ مگر یہ حیوانیت کا کمال ہے۔ انسانیت کا کمال نہیں ہے۔ اگر ہم ڈبکنی کشتی کے ذریعہ سمندر کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ تو یہ بھی حیوانیت کا کمال ہے۔ اس لئے کہ مچھلیاں بھی تو پہنچتی ہیں۔ آدمی سے ہم اگر مچھلی بن گئے تو کون سا کمال کیا، اسی طرح ہوا میں کرگسیں بھی اڑتی ہیں اگر آدمی سے کرگس بن گئے تو کون سا کمال ہوا۔ یہ حیوانیت کا کمال ہے انسانیت کا کمال نہیں ہے۔ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ گھر میں بیٹھا ہوا ہو اور عرش پہ باتیں کر رہا ہو۔ اپنے مصلیٰ کے اوپر ہو اور خدا سے اسے نیاز حاصل ہو۔ معاملات وہاں سے چل رہے ہوں۔ دیکھنے میں وہ فرشی ہو مگر حقیقت میں وہ عرشی ہو۔ فرش پر بیٹھے ہوئے عرش کے اوپر مقام ہو۔ یہ سب سے بڑا انسانیت کا کمال ہے جس کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ

والسلام نے سکھلایا۔

تو رابعہ بصریہؒ نے کتنی قیمتی بات کہی کہ حضرت حسن بصریؒ نادم اور اور شرمندہ ہوئے اور توبہ کی کہ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ میں اسے بڑا کمال سمجھ رہا تھا مگر آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ دیکھئے رابعہ بصریہ عورت ہے اور حسن بصریؒ مردوں کے امام ہیں۔ یہ ایک عورت ایک مرد کامل کو ہدایت کر رہی ہے اور اسے راستہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اس لئے عورت اگر کمال پیدا کرنا چاہے تو وہ بڑے بڑے مردوں کی مربی بن سکتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پوری امت کی استاذ ہیں...... ابن عباس رضی اللہ عنہما بڑے جلیل القدر صحابی ہیں امت میں سب سے بڑے مفسر قرآن ہیں۔ لیکن حضرت عائشہ کے شاگرد ہیں۔ علم زیادہ تر انہی سے سیکھا ہے۔ فتوے کی ضرورت ہوتی تھی تو صدیقہ عائشہؓ سے فتویٰ لیتے تھے۔ تو ابن عباسؓ ساری امت کے استاذ ہیں اور ان کی استاذ حضرت عائشہؓ ہیں گویا حضرت عائشہ علوم و کمالات کے اندر پوری امت کی استاذ ہیں۔

بعض صحابہ حضرت عائشہ سے کہا کرتے تھے کہ: ''مَا هٰذِهٖ بِاَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَآ اٰلَ اَبِیْ بَكْرٍ'' ① ''اے آل ابی بکر! یہ پہلی برکت نہیں۔ تمہاری تو اتنی برکتیں ہیں کہ امت احسان سے تمہارے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی''۔ اس لئے کہ حضرت عائشہؓ کے سوالات کرنے سے ہزاروں مسئلے کھلے ہیں، بڑی ذہین و ذکی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات ایسے کیا کرتی تھیں کہ دوسرے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔ جواب میں آپؐ علوم ارشاد فرماتے: یہ ساری امت پر احسان تھا اگر وہ سوال نہ کرتیں تو علم نہ آتا۔

مثلاً حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: اگر کسی شخص کے تین بچے پیدا ہوں اور پیدا ہونے کے بعد دودھ پینے کی حالت میں گذر جائیں برس دن یا چھ مہینے کے بعد انتقال کر جائیں تو وہ تینوں کے تینوں ماں باپ کی نجات کا ذریعہ بنیں گے، شفاعت کریں گے اور اس طرح سے کریں گے گویا اللہ تعالیٰ کے اوپر اصرار کریں گے کہ ضرور بخشنا پڑے گا۔ حدیث میں ہے کہ ماں باپ کے لئے جہنم کا حکم ہو جائے گا کہ یہ سزا کے مستحق ہیں، یہ جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہ تین بچے ملائکہ کے آگے آکے سامنے سے روکیں گے کہ یہ ہمارے ماں باپ ہیں، آپ ان کو کہاں لے کے جا رہے ہیں؟ وہ کہیں گے انہیں جہنم کا حکم ہے۔ بچے کہیں گے ہم نہیں جانتے یہ ہمارے ماں باپ ہیں جیسے بچے کی ضد ہوتی ہے۔ اس طرح ضد کریں گے۔ وہ کہیں گے حکم خداوندی ہے، بچے کہیں گے، ہوگا۔ اللہ نے ہمیں تو معصوم بنایا ہم انہیں نہیں جانے دیتے ہمارے ہوتے ہوئے نہیں جائیں گے۔ ملائکہ علیہم السلام کو لوٹنا پڑے گا اور عرض کریں گے۔ الٰہی! یہ بچے راستہ روک رہے ہیں جانے نہیں دیتے۔ معلوم ہوتا ہے بچوں کی ضد کے آگے فرشتوں کی نہیں چلے گی۔

جیسے باپ اگر بادشاہ بھی ہو اور بچہ ضد کرے تو بادشاہ کو بھی بچے کی ماننی پڑتی ہے اس کی حکومت کی ساری

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله ﷺ، ج: ۱ ص: ۴ رقم: ۳.

قوت دھری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح فرشتوں کی طاقت بھی رکھی رہ جائے گی اور وہ مجبور ہو جائیں گے۔ بچے انہیں لوٹا دیں گے تو فرشتے عرض کریں گے کہ خداوندا! آپ کا ارشاد تھا کہ انہیں جہنم میں ڈال دو، یہ بچے روک رہے ہیں، ضد کررہے ہیں، جانے نہیں دیتے حق تعالیٰ فرمائیں گے، ارے نادان بچو! تمہارے ان ماں باپ نے یہ برائی کی، یہ برائی کی، یہ گناہ کیا، یہ معصیت کی۔ یہ جہنم کے مستحق ہیں۔

یہ کہیں گے ہم نہیں جانتے انہوں نے کیا کیا، یہ تو ہمارے ماں باپ ہیں۔ اگر آپ کو انہیں جہنم میں ہی بھیجنا ہے تو ہمیں بھی بھیج دیجئے۔ اب ظاہر ہے کہ معصوم تو جہنم میں نہیں بھیجے جائیں گے اور اگر آپ نے ہمیں جنت میں بھیجنا ہے تو ہم انہیں بھی لے کے جائیں گے۔

حق تعالیٰ حجت کریں گے جواب دیں گے بچے وہاں بھی ضد کریں گے اخیر میں حق تعالیٰ فرمائیں گے ’’جاؤ ارے جھگڑالو بچو! ہمارا پیچھا چھوڑو۔ لے جاؤ ان ماں باپ کو جنت میں۔ چنانچہ ان کو جنت میں لے جائیں گے‘‘۔ یہ حدیث آپ نے صدیقہ عائشہ کو سنائی، اس پر صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سوال کرتی ہے کہ یا رسول اللہ! اگر کسی کے دو بچے اس طرح گذر جائیں۔ فرمایا دو کا بھی یہی حکم ہے پھر سوال کیا اگر ایک بچہ گذر جائے۔ فرمایا ایک کا بھی یہی حکم ہے حتی کہ فرمایا کہ: اگر کوئی حمل ضائع ہو جائے بشرطیکہ بچے میں جان پڑ گئی ہو۔ اس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ اس طرح سے ضد کر کے اپنے ماں باپ کو بخشوائے گا۔

اب دیکھئے چھوٹا بچہ جب گذرتا ہے تو ماں باپ پر اور بالخصوص ماں پر کیا گزرتی ہے اس کے تو وہ جگر کا ٹکڑا تھا اس نے نو مہینے اسے اپنے پیٹ میں رکھ کے پالا ہے۔ پرورش کیا تھا۔ پیدا ہونے کے بعد جب گذر جاتا ہے تو باپ کو تو کچھ جلدی صبر بھی آجاتا ہے مگر ماں کو نہیں آتا، اس لئے کہ اس کے لئے تو ایسا ہے جیسے اس کے بدن کا ٹکڑا کٹ کے ضائع ہو جائے، تو ماں بہت زیادہ پریشان ہوتی ہے لیکن جب یہ حدیث سنے گی کہ یہ میری نجات کا سبب بنے گا تو شاید اسے خوشی پیدا ہو جائے کہ میرے لئے کوئی دکھ نہیں اگر ضائع ہو گیا تو بلا سے ضائع ہو گیا، میرے لئے تو جنت اور نجات کا سامان ہو گیا۔

اگر صدیقہ عائشہؓ یہ سوال نہ فرماتیں نہ اتنا علم کھلتا نہ اتنی آسانی پیدا ہوتی۔ ہم تو یہی کہتے اگر تین بچے گزریں تو پھر جنت کا وعدہ ہے اور اگر دو یا ایک ہوا پھر جنت کا وعدہ نہیں۔ مگر صدیقہ کے سوال کرنے سے معلوم ہوا دو اور ایک کا بھی یہی حکم ہے۔ بلکہ حمل ساقط ہو جائے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ بشرطیکہ روح پڑ گئی ہو۔ تو صدیقہ عائشہؓ کی ذہانت و ذکاوت اور سوال کرنے سے امت کے لئے کتنی بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔ کتنے راستے نکلے، تو عورتیں ایسی بھی گذری ہیں جنہوں نے ہزاروں مردوں کے راستے درست کر دیئے اور ان کے لئے ہدایت کا سبب بن گئیں۔

عورت کے اندر بھی غیر معمولی تحمل کی صلاحیت موجود ہے...... شادی اور غمی ایسی چیز ہوتی ہے کہ اس میں آدمی کچھ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ زیادہ غم پڑے جب بھی پاگل سا ہو جاتا ہے۔ زیادہ خوشی آئے جب بھی آپے

سے باہر ہوجاتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی سنبھال لے وہ بڑا محسن ہوتا ہے۔ اسلام میں ایسی بھی عورتیں گذری ہیں انہوں نے ایسے وقتوں میں مردوں کو سنبھالا۔ حالانکہ مرد بہ نسبت عورت کے قوی القلب ہوتا ہے۔ عورت کا دل گو اتنا قوی نہیں لیکن عورت میں سمجھ بوجھ اور دین و دیانت ہے تو بڑے بڑے قوی مردوں کے سنبھالنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ ان کا چھ سات برس کا بچہ بڑا ہونہار حسین وجمیل، بیمار ہوا۔ اس زمانے کے مطابق دوا دارو کی گئی مگر بچہ اچھا نہ ہوا۔ ادھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو اچانک سفر پیش آیا اور انہیں ضروری جانا پڑ گیا۔ تو بیوی سے کہا کہ: دیکھو مجھے مجبوری کا سفر پیش آ گیا، میرا جانا ضروری ہے اور بچے کی حالت ایسی ہی ہے، ذرا دوا اور تیمارداری اچھی طرح سے کرنا اور میں جلدی آ جاؤں گا۔ کوئی زیادہ دیر کے لئے مجھے نہیں جانا۔ یہ فرما کر حضرت جابرؓ چلے گئے۔

جب آنے کا دن ہوا تو بچے کا انتقال ہو گیا۔ آپؓ گھر میں تشریف لائے اور بیوی کی دانشمندی، و دیانت دار اور ہوشیاری یہ ہے۔ ورنہ اگر کوئی آج کی طرح کی بیوی ہوتی جب وہ دیکھتی کہ خاوند آ رہے ہیں۔ تو وہ بڑا رونا شروع کر دیتی تا کہ معلوم ہو بڑا غم پڑا ہوا ہے۔ مگر دانشمند تھیں۔ اس لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے آنے کا وقت ہوا تو اپنے کو سنبھالا اور صورت ایسی بنائی کہ اسے کوئی غم نہیں ہے اور بچے کو اندر لٹا دیا۔ اس کی لاش پر چادر ڈال دی۔

حضرت جابرؓ آئے۔ تو جیسے عرب کا دستور ہے۔ بیوی نے بڑھ کر استقبال کیا، مصافحہ کیا اور اپنے خاوند کے ہاتھ چومے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ کہا: "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ بِعَافِیَۃٍ وَ خَیْرٍ" خدا کا شکر ہے عافیت میں ہے اور بڑی خیر سے ہے۔ غلط بات بھی نہیں کی اس لئے کہ مرنے کے بعد بڑی عافیت و خیر ہوتی ہے۔ تو ایسا جملہ کہا کہ غلط بھی نہ ہو اور خاوند کو تسلی بھی ہو جائے۔ وہ مطمئن ہو گئے۔

ان کے ہاتھ دھلائے کھانا کھلایا۔ اس لئے کہ آتے ہی صدمے کی خبر سنا دیتیں ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ پھر کہاں کا کھانا ہوتا، وہ اس کے سوگ میں لگ جاتے۔

کھانا کھلاتے کھلاتے کہا: میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتی ہوں۔ اس میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ فرمایا پوچھو۔ کہا اگر کوئی شخص ہمارے پاس امانت رکھوائے اور اس کی میعاد مقرر کرے کہ برس دن کے لئے رکھواتا ہوں۔ برس دن کے بعد واپس لے لوں گا۔ تو شریعت کا اس مسئلہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

فرمایا حکم کھلا ہوا ہے۔ اس کو ٹھیک وقت پہ ادا کرنا چاہیے۔ کہا، اگر امانت کے ادا کرتے ہوئے دل گھٹنے لگے اور دل نہ چاہے۔ فرمایا: دل گھٹنے کا حق کیا ہے۔ چیز دوسرے کی ہے۔ اپنی چیز پہ آدمی گھٹے جب دوسرے کی امانت ہے اور وقت مقرر تھا۔ اب اس نے مانگ لی، تو گھٹنے اور غم کرنے کا کیا حق ہے؟ کہا شریعت کا یہی مسئلہ ہے؟ فرمایا ہاں مسئلہ یہی ہے۔

کہا: وہ بچہ جو تھا وہ امانت تھا اللہ نے وہ سات برس کیلئے رکھوایا تھا۔ کل قاصد پہنچ گیا کہ امانت واپس کر دو۔

میں نے امانت واپس کردی۔ تو ہمیں گھٹنے کا تو کوئی حق نہیں؟ فرمایا نہیں ہے اور بیوی کے ہاتھ چومے اور کہا: خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے ایسی تسلی دی کہ مجھے بجائے غم کے خوشی ہے کہ ہم امانت ادا کر چکے اور بوجھ ہلکا ہو گیا۔ یہ عورتیں ہی تھیں جو اس طرح سے تسلی بھی دیتی تھیں۔ مگر یہ ان عورتوں کا کام تھا جن میں حوصلہ اور دین و دیانت کا جذبہ تھا۔ اور اگر عورتیں رواج کے مطابق چلیں تو آنکھوں میں نہ بھی آنسو ہوں مگر جب تعزیت کے لئے کوئی آئے تو بنا بنا کر رونا شروع کر دیں گی۔ دوسرے آئیں وہ بھی رونا شروع کر دیں۔ تیسرے آئیں وہ بھی۔ لیکن تحمل کی بات یہ ہے کہ روتے ہوؤں کو تھام لیا جائے غم زدہ لوگوں کو تھام لیا جائے اور تسلی دی جائے، یہ کام کیا تو مرد کرتے ہیں مگر عورتیں بھی ایسے حوصلے کی گذری ہیں جنہوں نے مردوں کے غموں کو ہلکا کر دیا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا پوری امت پر احسان...... حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی زوجہ پاک ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ: ساری امت پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا احسان ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی مرتبہ وحی آئی اور عالم غیب سے پہلی بار سابقہ پڑا۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو آپؐ نے اصلی شکل میں دیکھا۔ ورنہ انسانی صورت میں آتے تھے۔ صحابہؓ میں حضرت دحیہ کلبیؓ بہت خوبصورت اور حسین و جمیل صحابیؓ تھے ان کی شکل میں حضرت جبرائیل آیا کرتے تھے۔ صحابہ دیکھتے تھے کہ دو دحیہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک ادھر ایک ادھر جانتے تھے کہ یہ دحیہ کلبی صحابی ہیں اور یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ تو دو مرتبہ اصل شکل میں حضور علیہ السلام نے دیکھا۔ ایک تو جب غار حرا میں سب سے پہلی وحی آئی ہے۔ اس وقت اپنی اصلی شکل میں نمایاں ہوئے اور ایک معراج کی شب میں۔ اور یہ دیکھنا اس شان سے تھا کہ ان کے چھ، چھ سو بازو ہیں۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک جتنی فضا ہے، سب ان کے بدن سے گھری ہوئی ہے۔ اتنا عظیم قد و قامت ہے کہ سر آسمان پر ہے، پیر زمین پر ہیں۔ مونڈھے جنوب و شمال میں، چھاتی اور سینہ مشرق و مغرب میں ہے۔ گویا پوری فضا جبرائیل علیہ السلام کے بدن سے بھری ہوئی ہے۔ چہرہ سورج کی طرح چمک رہا ہے۔ ایک تاج بھی ان کے سر پر رکھا ہوا ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے۔ اس سے شعاعیں پھوٹ رہی ہیں اور ایک سبز رنگ کا کپڑا ہے جو ان کے بدن پر پڑا ہوا ہے۔ تو اتنی حسین و جمیل شکل مگر اتنی عظیم دیکھ کر، ایک دفعہ تو آپؐ گھبرا گئے اور آپؐ کے اوپر ہیبت اور لرزہ طاری ہوا۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ رجال غیب کو اس طرح سے دیکھا اور دیکھا بھی اتنی عظیم شکل میں۔ آپ گھبرا کر گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ'' مجھے کمبل اڑھاؤ، کمبل اڑھاؤ مجھے ڈر ہے کہ اب میں زندہ نہیں رہوں گا، میری جان نکل جائیگی۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا: کیا واقعہ ہوا؟

آپؐ نے واقعہ بیان فرمایا، تو حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی اور فرمایا: ''کَلَّا وَاللّٰہِ لَا یُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا

اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تُقْرِءُ الضَّیْفَ وَ تَحْمِلُ الْکَلَّ وَ تُعِیْنُ عَلٰی نَوَآئِبِ الْحَقِّ" ① "خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ صلہ رحمی، غریبوں کی مدد اور مہمان نوازی آپ کرتے ہیں، مسکینوں کو آپ پناہ دیتے ہیں۔ ساری دنیا کی خیرخواہی میں لگے ہوئے ہیں ایسے بندوں کو اللہ ضائع نہیں کیا کرتا۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں آپ کی جان نہیں جاسکتی"۔

یہ تو زبان سے تسلی دی۔ اور عمل یہ کیا کہ ہاتھ پکڑ کر ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں۔ یہ عرب کے لوگوں میں بہت بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے تھے۔ مذہباً نصرانی تھے اس لئے انجیل اور تمام آسمانی کتابیں لکھا بھی کرتے تھے اور ان کو یہ کتابیں یاد تھیں اور ان کے علوم سے واقف بھی تھے۔ مشرکین عرب یا خاندان قریش میں ایک یہ تھے جو اہل کتاب میں شامل ہوئے اور آسمانی کتابوں کے بڑے زبردست عالم ہوئے۔ حضرت خدیجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس لے گئیں کہ انکے حالات کا صحیح پتا وہ دے سکتا ہے جو عالم ہو اور دینی و تاریخی علوم سے واقف ہو۔ حضرت خدیجہؓ جب انکے پاس پہنچیں اور کہا ذرا سنئے یہ آپ کا بھتیجا کیا کہتا ہے۔

"اِسْمَعْ لِا بْنِ اَخِیْکَ؟" اپنے بھائی کے بچے سے پوچھئے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا حالت اس کو پیش آئی؟ ورقہ بن نوفل نے بڑی شفقت سے فرمایا: "یَا ابْنَ اَخِیْ مَاذَا تَرٰی؟" میرے بھتیجے کیا بات تم نے دیکھی؟ کیوں گھبرائے ہوئے ہو۔ آپ نے سارا واقعہ سنایا کہ میں اس طرح غار حرا میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایسی شخصیت نمایاں ہوئی۔ یہ اس کی شکل تھی اور یہ اس نے مجھ سے خطاب کیا۔ ②

ورقہ ابن نوفل نے کہا: اَبْشِرْ اَبْشِرْ۔ خوشخبری حاصل کر۔ یہ وہ ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی لے کر آتا تھا اور دیگر پیغمبروں کے پاس آتا تھا۔ خدا نے تم کو اس امت کا پیغمبر بنایا ہے جس کی خبریں سننے میں آرہی تھیں وہ تم ہی معلوم ہوتے ہو، اس لئے تم نہ گھبراؤ۔ یہ تو تمہارے لئے بشارت ہے۔ اور کہا کہ "کاش جب تم تبلیغ کا نام لے کر کھڑے ہو اور اسلام کی دعوت دو، میں اس وقت زندہ ہوتا تو تمہاری مدد اور اعانت کرتا۔ لیکن میں تو قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہوں"۔

سو برس سے زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ بڑے معمر اور بوڑھے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک ایسا کٹھن معاملہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا۔ یہ معاملہ کوئی بدنی بیماری کا نہیں تھا کہ کوئی بخار آ گیا ہو، کھانسی آ گئی ہو، یہ روحانی معاملہ تھا اور روحانی معاملہ بھی وہ جو پیغمبروں سے پیش آتا ہے۔ کسی معمولی ولی کا بھی نہیں بلکہ نبی الانبیاء کا معاملہ تھا۔ اس میں تسلی دینے کے لئے ایک عورت کھڑی ہوئی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، ہمارے زمانے کی کوئی عورت ہوتی تو وہ گھبرا کے کہتی۔ خدا جانے اب کیا ہوگا۔ جلدی سے کمبل اڑھاؤ اور ایک واویلا شروع ہو جاتا۔ لیکن انکا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱ ص: ۴ رقم: ۳۔

② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱ ص: ۴ رقم: ۳۔

گھبرانا تو بجائے خود ہے۔اس ذاتِ اقدس کو تسلی دی جو پورے عالم کی سردار بننے والی تھی۔ان کے دل کو تھامنے کی کوشش کی۔قول سے الگ تھاما،عمل سے الگ تھاما۔زبان سے یہ تسلی دی کہ آپ وہ نہیں ہیں کہ اللہ آپ کو ضائع کرے۔آپ تو سرتاپا بزرگ ہی بزرگ،خیر ہی خیر ہیں۔عادت اللہ یہ ہے کہ ایسی ہستیوں کو اللہ کھویا نہیں کرتا اور عمل یہ کیا کہ ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں۔یہ ایک عورت ہی تھی جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا درحقیقت پوری اس امت کو تسلی دینا ہے جو قیامت تک آنے والی ہے۔گویا اکیلی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پوری امت پر احسان ہے۔①

میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ عورتیں ایسی ایسی بھی گزری ہیں اس لئے عورتوں کا یہ خیال کرنا کہ ہمارا کام تو بس اتنا ہے کہ گھر میں بیٹھ جائیں۔کھانا پکا دیا۔زیادہ سے زیادہ بچوں کے کپڑے سی دیئے اور زیادہ ہوا،ان کی تربیت کر دی۔اس سے زیادہ ہم ترقی کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ میدان مردوں کا ہے۔ولی بھی مرد بنے گا،امام بھی مرد بنے گا،مجتہد اور خلیفہ بھی بنے گا۔ہم اس کام کے لئے نہیں ہیں۔تم چاہو تو مجتہد،ولی کامل بن سکتی ہو۔اللہ کی طرف سے تمہارے ساتھ الہام کا معاملہ ہو کہ تمہارے اوپر الہام آئے۔تم یہ بھی کر سکتی ہو۔جو ایک بڑے سے بڑے ولی کا حال ہو سکتا ہے۔وہ ایک عورت کا بھی ہو سکتا ہے۔بشرطیکہ عورت توجہ کرے مگر یہ توجہ نہیں کرتیں۔یہ ساری بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ یہ غلط فہمی رفع ہو جائے کہ عورت کے دل میں کھٹک پیدا ہو گئی کہ ہم نہ دینی ترقی کے لئے ہیں نہ عملی ترقی کے لئے اس کام کے لئے تو مرد ہیں۔

عورتوں کی علمی و اخلاقی ترقی میں مرد سنگ راہ ہیں......اگر برا نہ مانا جائے تو میں کہوں گا اس میں زیادہ قصور مردوں کا ہے۔یہ خیال انہوں نے اپنے عمل سے پیدا کیا ہے۔زبان سے تو کسی نے نہیں کہا ہوگا۔مگر غریب عورتوں کے ساتھ جو طریق عمل برتا گیا ہے۔کہ نہ ان کو تعلیم و ترقی دینے کا بندوبست،نہ دین سکھلانے کا بندوبست۔

گویا عملاً زبان حال سے آپ نے انہیں باور کرا دیا کہ تم اس لئے پیدا ہی نہیں کی گئی ہو کہ دینی و اخلاقی ترقی کرو۔یہ کچھ کریں گے تو ہم کریں گے۔اور ہم بھی افریقہ میں رہ کے نہیں کریں گے۔کوئی ہندوستان میں رہ کر ترقی کر لے تو کرے۔ہم اس لئے پیدا ہی نہیں کیئے گئے نہ ہماری عورتیں اس لئے پیدا کی گئیں۔

جب آپ نے اپنے طرز عمل سے عورتوں کے راستے بند کر دیئے ہیں۔تو ان غریب عورتوں کا کوئی قصور نہیں یہ قصور اصل میں مردوں کا ہے اور قیامت کے دن ان مردوں سے باز پرس ہوگی کہ تم نے کیوں تربیت کی طرف توجہ نہیں کی؟ کیوں ان کو تعلیم نہ دی۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ'' ②

''تم میں سے ہر شخص بادشاہ ہے اور قیامت کے دن ہر بادشاہ سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا

① الصحیح لمسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الامام العادل وعقوبة الجائر، ج:۱۳ ص:۱۴۵۹ رقم:۱۸۲۹.

② الصحیح للبخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن ج:۳ ص:۴۱۴.

کہ اپنی رعیت کو کس طرح سے رکھا؟'' آرام سکھ سے رکھا یا تکلیف سے؟ صحیح تربیت کی یا نہیں کی؟ دین پر لگایا یا دین سے ہٹایا تو فرمایا، ہر گھر کا مرد بادشاہ ہے اور جتنے گھر میں رہنے والے ہیں وہ درحقیقت اس کی رعایا ہیں۔ اس کے زیرِ عیال ہیں۔ قیامت کے دن سوال ہوگا کہ گھر والوں کے ساتھ تم نے کس قسم کا برتاؤ کیا؟ ملک کا بادشاہ ہے تو پورا ملک اس کی رعیت ہے۔ قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی رعیت کو کس حال میں رکھا انکی آسائش کی خبر لی یا انہیں تکلیفیں پہنچائیں۔ ان کو آبرو بخشی یا انہیں بے آبرو اور بے عزت کیا؟ ان کو ایذا پہنچائی یا ان کی راحت رسانی کا سامان کیا یہ ہر بادشاہ سے سوال ہوگا۔ استاذ سے اس کے شاگردوں کی نسبت سوال ہوگا کہ تیرے شاگرد تیرے حق میں بمنزلہ رعیت کے تھے۔ تو ان کا بادشاہ تھا۔ وہ تیری حکم برداری کرتے تھے تو نے ان پر کیا کیا حکم چلایا۔ شیخ سے اس کے مریدین کی نسبت سوال ہوگا کہ مریدین بمنزلہ رعیت کے تھے تو حکم کرنے والا تھا تجھے منوانے کا مقام دیا گیا تھا اور وہ ماننے والے تھے۔ تو نے کیا کیا چیزیں منوائیں۔ تو نے اس سے دین منوایا یا بری چیزیں اس سے منوائیں۔ غرض ہر شخص سے سوال کیا جائے گا۔ تو آپ سے اور مجھ سے بھی سوال ہوگا۔ عورتوں کے بارے میں بھی سوال ہوگا۔ کیونکہ وہ ہمارے زیرِ تربیت اور زیرِ عیال ہیں۔

عورتوں کے بارے میں مرض الموت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ توجہ عورتوں کی طرف دی ہے۔ حتیٰ کہ عین وفات کے وقت جو آخر کلمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہے وہ یہ تھا کہ ''اِتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَآءِ'' ① ''اے لوگو! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو''۔ یہ امانتیں ہیں جو تمہارے سپرد کی گئی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم امانت میں خیانت کرو اور قیامت کے دن تم سے باز پرس ہو۔ یہ آخری کلمہ ہے جو عین وفات کے وقت فرمایا ہے۔ وہ یہ تھا کہ عورتوں کی فکر کرو کہیں یہ ضائع نہ ہو جائیں۔ ان کو خراب نہ کر دیا جائے، ان کی تربیت نہ تباہ ہو جائے۔ ان کا دین نہ برباد ہو جائے اور دنیا نہ خراب ہو جائے۔

تو جس ذاتِ اقدس نے خود عورتوں کے بارے میں اتنی توجہ کی، اس کی امت کا بھی فرض ہے کہ وہ توجہ کرے۔ حدیث میں ہے کہ: ''اِنَّ اَكْرَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُكُمْ اَهْلًا'' ② تم میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم وہ مسلمان ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور عورتوں، بیویوں کے ساتھ لطف و مروت اور مدارات کا برتاؤ کرتا ہو''۔ مطلب یہ کہ جو عورتوں کے ساتھ زیادتی اور سختی سے پیش آئے، جو ان کا دل دکھائے وہ قابلِ تکریم نہیں ہے۔ اس حدیث کا حاصل یہی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ فرمائی اور پوری توجہ فرمائی اور عین وفات کے وقت آپ نے جو نصیحت ارشاد فرمائی وہ عورتوں کے بارے میں تھی۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الحج، باب حجة النبي ﷺ ج: ٢ ص: ٨٨٦ رقم: ١٢١٨.

② الحديث اخرجه البخاري ولفظه: ان من خيار كم احسنكم اخلاقاً، كتاب المناقب، باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم ج: ٣ ص: ٣٠٥.

امت کے لئے نبی اکرمؐ نے جہاں اتنا خیال کیا، امت کیا خیال کر رہی ہے؟ امت نے یہ کیا کہ طرز عمل سے یہ باور کرا دیا کہ تم نہ دینی ترقی کے قابل نہ دینی عمل کے قابل۔ یہ تمہارا کام ہی نہیں بس تمہارا کام یہ ہے کہ اگر تم غریب ہو تو گھر بیٹھ کے کھانا پکاؤ اور اگر تم دولت مند ہو تو کھانا ملازمہ پکا لے گی۔ تم اچھے کپڑے پہن لیا کرو، بہترین زیور پہن لیا کرو اور جو جی میں آئے آرائش زیبائش کر لیا کرو۔ بس قصہ ختم ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا۔

عشق صورت سے حقیقت کی محبت ختم ہو جاتی ہے...... اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بدنوں کو تو سنوار دیا لیکن دلوں کو بھی سنوارا ہے؟ بدن کی آرائش و زیبائش تو چند دن کی بہار ہے یہ چند دن میں ختم ہونے والی ہے۔ خدا بھلا کرے بخار کا تین دن میں بتلا دیتا ہے۔ ساری جوانی ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اگر آدمی جوانی کے اوپر ناز کرے اور چہرے کی تازگی و رونق پر اترائے تو تین دن کا بخار بتلا دیتا ہے کہ جوانی کی یہ حقیقت تھی۔ چہرے کی سرخی بھی ختم، منہ پر جھریاں پڑ گئیں اور تین دن میں بخار سے ایسا حال ہو گیا اور بخار نے بتلا دیا کہ سب سے بڑا مربی اور ناصح میں ہوں۔ یہ بتلا دیتا ہے کہ جس کے لئے سارا سب کچھ کیا جا رہا ہے اس کی یہ قدر و قیمت ہے۔

اس واسطے اہل اللہ نے اس کی خاص طور پر تاکید کی ہے کہ صورتوں کے حسن و جمال میں زیادہ مت گھسو سیرت کے حسن و جمال کو دیکھو، اخلاق کی پاکیزگی کو دیکھو۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک بزرگ کی خانقاہ میں اللہ اللہ سیکھنے کے لئے ہزاروں آدمی آتے تھے۔ ایک شخص آیا۔ ابھی بے چارہ نیا تھا بزرگی نے اس کے دل میں گھر نہیں کیا تھا، شیخ سے بیعت ہوا۔ شیخ نے اسے اللہ اللہ بتادی۔ اس نے بھی ذکر اللہ شروع کر دیا اور طریقہ یہ تھا کہ خانقاہ میں جتنے مریدین ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا کھانا شیخ کے گھر سے آتا تھا۔ ایک باندی تھی جو کھانا تقسیم کر جاتی تھی۔ یہ مرید جو نو وارد تھے۔ باندی انہیں کھانا دینے کے لئے آئی باندی ذرا اچھی صورت کی تھی۔ ان کی طبیعت اس کی طرف مائل ہوگئی۔ اب جب وہ کھانا لے کے آئے۔ یہ اسے گھورنا شروع کر دیں۔ شیخ کو پتہ چل گیا کہ یہ باندی کی صورت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وہ جتنا صورت و شکل میں الجھیں حقیقت اتنی کم ہوگی اور ذکر اللہ وغیرہ چھوٹ گیا بس یہ نگاہ بازی رہ گئی۔ جب وہ آئے اسے گھور رہے ہیں نہ اللہ کا نام اور نہ ذکر، عادت اللہ یہی ہے کہ بندہ صورتوں میں جتنا الجھتا ہے حقیقت سے اتنا ہی بے خبر بن جاتا ہے۔ جب صورت کے عشق میں مبتلا ہو گیا حقیقت کا عشق ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ صورت کے دیکھنے میں لگ گئے اور جو حقیقت تھی اللہ اللہ کرنا اور یاد خداوندی، اس سے غفلت شروع ہو گئی۔

شیخ کو پتہ چل گیا کہ ہمارے مرید اس بلا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ سبحان اللہ انہوں نے بڑی تدبیر سے علاج کیا۔ انہیں بلا کر یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی۔ ایسا مت کرو۔ بلکہ ایک تدبیر اختیار کی اور ہنسی کی تدبیر اختیار کی اور ان کی اصلاح بھی ہو گئی۔

وہ یہ کہ دستوں کی ایک دوا لا کر اس باندی کو کھلا دی۔ جمال گھوٹا یا کوئی دوسرا مسہل صبح سے شام تک اسے بڑی

تعداد میں دست آ گئے اور باندی کو یہ حکم دیا کہ ایک چوکی رکھ دی گئی ہے اس پر جا کر حاجت کرنا۔ وہ بیچاری ہر دس منٹ کے بعد جاتی۔ شام کو جب وہ چہرے کی سرخی باقی نہ رہی، ہڈی کو چمڑہ لگ گیا۔ صورت دیکھو تو دیکھ کے نفرت آئے اور وہ جو گلاب سا چہرہ کھل رہا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ ایک زردی سی چھا گئی۔

شیخ نے اب اس کو کہا کہ: اس مرید کے پاس کھانا لے کے جا اور تیرے ساتھ جو معاملہ کرے مجھے اس کی اطلاع دینا۔ اب وہ کھانا لے کے آئی تو انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب وہ آئے اور میں اس کو گھوروں۔ اور اب جو آئی تو دیکھا کہ ہڈیاں نکلی ہوئیں، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں، سرخی کی بجائے زردی چھائی ہوئی۔ انہیں بڑی نفرت پیدا ہوئی۔ کہا رکھ دے کھانا اور چلی جا جلدی یہاں سے وہ بیچاری کھانا رکھ کے چلی گئی۔ شیخ سے اس نے جا کے کہا، یہ اس نے کہا اور کہا بجائے اس کے کہ مجھے دیکھے، کہا چلی جا یہاں سے شیخ سمجھ گئے کہ علاج ہو گیا۔ شیخ تشریف لائے اور اس مرید سے فرمایا کہ میرے ساتھ تشریف لے چلئے، انگلی پکڑ کے لے گئے۔ وہ جو قدمچہ رکھا ہوا تھا جس میں کثیر تعداد دستوں کی نجاست بھری ہوئی تھی۔ فرمایا یہ ہے آپ کا معشوق اسے لے جایئے۔ اس لئے کہ جب تک یہ باندی میں موجود تھا باندی سے محبت تھی۔ اب یہ نکل گیا اور تو کوئی چیز نہیں نکلی۔ آپ کو نفرت ہو گئی معلوم ہوا اس باندی سے محبت نہیں تھی۔ اس گندگی سے محبت تھی۔ اس گندگی کو احتیاط سے لے جایئے اور صندوق میں رکھیئے یہ آپ کا معشوق و محبوب ہے ؎

عشق صورت آخرت ننگے بود

حقیقت یہ ہے کہ صورتوں کا عشق گندگی کا عشق ہے۔ سیرت کا عشق پاکیزگی کا عشق ہے۔ اعلیٰ ترین سیرت اخلاق ہیں محبت کے قابل یہ چیز ہے۔

صورت کی خوبیاں فتنہ اور سیرت کی خوبیاں امن پیدا کرتی ہیں...... بلکہ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ صورت کی خوبی فتنے پیدا کرتی ہے اور سیرت کی خوبی امن پیدا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ خوبصورت حضرت یوسف علیہ السلام ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا "فَإِذَا قَدْ أُعْطِيَ شَطْرُ الْحُسْنِ." "آدھا حسن اللہ نے ساری دنیا کو دیا اور آدھا حسن و جمال تنہا یوسف علیہ السلام کو عطا کیا"۔ حضرت یوسف علیہ السلام اتنے بڑے حسین و جمیل تھے یوسف علیہ السلام پر جتنی مصیبتیں آئیں وہ صورت کے حسن کی وجہ سے آئی ہیں۔ بھائیوں نے کنعان کے کنویں میں ڈالا، مصر کے بازار میں غلام بنا کے بیچے گئے۔ نو برس تک جیل خانہ بھگتا۔ یہ ساری صورت کی مصیبت تھی اور جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا۔

اس وقت خود حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ﴿اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ ① مجھے مصر کی سلطنت دیدو، تو وجہ یہ نہیں بیان کی کہ "اِنِّيْ حَسِيْنٌ جَمِيْلٌ" میں بڑا خوبصورت ہوں اس لئے مجھے بادشاہ بنا دو

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

بلکہ یوں فرمایا ﴿اِنِّی حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ﴾ ① ''مجھے سلطنت بخش دو اس واسطے کہ میں عالم ہوں''۔ میں جانتا ہوں کہ سلطنت کس طرح سے چلتی ہے میں اپنے علم وکمال سے سلطنت چلا کے دکھلاؤں گا۔ تو مصیبتوں کا جب وقت آیا تو حسن و جمال سامنے آیا اور سلطنت ملنے کا وقت آیا تو اندورنی سیرت، علم وکمال سامنے آیا۔ اس لئے صورت کی خوبیاں فتنے میں مبتلا کرتی ہیں اور سیرت کی خوبیاں دنیا میں امن پیدا کرتی ہیں۔

میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ: اگر غریب گھرانے کی عورت ہے تب تو بڑے سے بڑا کام مردوں کی طرف سے کیا سپرد ہوتا ہے؟ یہ کہ کھانا پکا کے دے، گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پال پرورش کر دے۔ اس کے فرائض ختم ہوگئے۔ اور اگر امیر گھرانے کی عورت ہے تو وہ بچوں کی دیکھ بھال نہیں کریگی وہ ملازمہ کرے گی کھانا بھی وہ پکائے گی ان کا کام یہ ہے کہ ذرا اچھے کپڑے پہن لئے۔ اچھا زیور پہن لیا، ذرا اور آزاد ہوئیں تو تفریح کے لئے بازار بھی ہو آئیں۔ یہ کام کرلیا اور زندگی کے فرائض ختم ہوگئے۔

آگے یہ کہ تمہاری سیرت کیسی ہے؟ تمہارا قلب کیسا؟ اخلاق کیسے؟ اس میں علم ہے یا نہیں؟ آخرت کا تعلق ہے یا نہیں؟ اللہ کے سامنے جانے کا کچھ خطرہ تمہارے سامنے ہے یا نہیں؟ قبر و حشر میں کیا گذرے گی انجام کیا ہوگا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ بس کھالیا، پی لیا، عمدہ لباس پہن لیا، بہتر سے بہتر زیور پہن لیا اور فرائض ختم ہوگئے۔

یہ تو اللہ کے ہاں سوال ہوگا کہ تمہیں بادشاہ بنایا گیا تھا کیا اس لئے کہ رعیت کو اچھا کھلا دو، پہنا دو اور ہم سے غافل کر دو؟ اس لئے تمہیں بادشاہ بنایا گیا تھا کہ مقصد کی طرف متوجہ کرو۔ وہ یہ کہ ہماری طرف متوجہ کرتے جس کے لئے تمہیں دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ یہ نہیں کیا تو تم سزا کے مستحق ہو، اس لئے میں سمجھتا ہوں اس میں عورتوں کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سارا مردوں کا قصور ہے کہ نہ ان کی تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں نہ ان کی تربیت کا، ان کی دلداری کا بڑے سے بڑا طریقہ ان کے ہاں یہ ہے کہ جو ان کی خواہش ہو وہ پوری کرو کپڑے، زیور دیدو، بس فرض ختم ہوگیا۔ یہ نہیں کرتے کہ ان کے دل کو سنواریں، ان کی روح میں آراستگی پیدا کریں کیا قیامت کے دن اس بارے میں ہم سے سوال نہیں ہوگا؟ کیا ہم سے پوچھا نہیں جائے گا؟ ضرور پوچھا جائے گا؟ ضرور پرسش ہوگی۔ اس جوابدہی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

دولت میں رہ کر عورت متقی بن سکتی ہے...... اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب عورت کی گود علم وکمال سے خالی ہوگی تو بچے میں علم کہاں سے آئے گا؟ بچہ تو ماں کی گود سے علم حاصل کرتا ہے۔ وہاں جہالت ہے تو وہ بھی جاہل ہوگا۔ وہاں محض ظاہری ٹیپ ٹاپ کی خواہش ہے بچے میں بھی یہی ٹیپ ٹاپ پیدا ہوگی اسے بھی دل کے سنوارنے کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا اور وہ بڑی عبرت کا واقعہ ہے۔ وہ اس کا ہے کہ اگر عورت دیندار بننا چاہے اور اس کو بنانا چاہیں تو بڑے بڑے آرام اور عیش میں رہ کر بھی دیندار بن سکتی ہے۔ اور بد دین بننا چاہے فقر و فاقہ میں

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

بھی بد دین بن سکتی ہے۔ دین کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی بھک منگا بن جائے تو دین دار بنے گا اور اگر کوئی کروڑ پتی ہو گیا، تو وہ دین دار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ غلط ہے۔ دین دار بننا چاہے تو کروڑ پتی بن کے بھی دیندار بن سکتا ہے اور نہ بننا چاہے تو فاقہ مست ہو پھر بھی بددین بن سکتا ہے اس پر میں واقعہ عرض کر رہا ہوں۔

وہ یہ کہ کابل کے بادشاہوں میں امیر دوست محمد خاں بہت دیندار بادشاہ گذرے ہیں، امیر امان اللہ خان مرحوم کے باپ امیر حبیب اللہ خاں تھے اور حبیب اللہ خاں کے باپ امیر عبدالرحمٰن تھے، ان کے باپ دوست محمد خاں تھے اور انکا زمانہ تھا۔ ان کے زمانے میں کسی دوسرے بادشاہ نے افغانستان کے اوپر حملہ کیا اور فوج لے کر چڑھ دوڑا۔ امیر صاحب کو اس سے صدمہ بھی ہوا اور دکھ بھی کہ ایک بادشاہ نے میری سلطنت پر حملہ کر دیا۔ ممکن ہے کہ بادشاہت بھی ختم ہو اور آنے والا ملک کو برباد کر دے۔

اسی فکر میں شاہی محل میں اندر تشریف لائے، انکی بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ بیگم سے یہ کہا کہ: آج ایسی خبر آئی ہے کہ کسی بادشاہ نے حملہ کیا ہے۔ میں نے اپنے شہزادے کو فوج دے کر بھیج دیا ہے تاکہ وہ جاکے دشمن کا مقابلہ کرے۔ بیگم نے کہا ٹھیک کیا اور گھبرایئے مت اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ غرض اپنے شہزادے کو فوج دے کر بھیج دیا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرے اور اس کو ملک میں نہ آنے دے اور اسے دور دھکیل دے۔ شہزادہ فوج لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن امیر صاحب گھر میں آئے اور چہرے پر غم کا اثر بیگم سے کہا کہ: آج ایک بڑے صدمے کی خبر آئی ہے اور وہ یہ کہ میرا شہزادہ ہار گیا۔ اس نے شکست کھائی اور دشمن ملک کے اندر چڑھا ہوا آ رہا ہے اور میرا بیٹا شکست کھا کر واپس بھاگتا ہوا آ رہا ہے مجھے اسکا بڑا صدمہ ہے' ملک بھی جا رہا ہے اور یہ بات بھی پیش آ گئی۔

بیگم نے کہا: یہ بالکل جھوٹی خبر ہے اور آپ اس کا بالکل یقین نہ کریں۔ اس نے کہا جھوٹی نہیں ہے یہ تو سرکاری پرچہ نویس نے اطلاع دی ہے۔ محکمہ سی آئی ڈی کی اطلاع ہے۔ اس نے کہا آپ کا محکمہ بھی جھوٹا ہے اور سی آئی ڈی بھی آپ کی جھوٹی ہے۔ یہ غلط خبر ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔

اب امیر صاحب کہہ رہے ہیں کہ سلطنت کی باضابطہ اطلاع ہے۔ یہ گھر میں بیٹھ کے کہہ رہی ہے کہ خبر جھوٹی ہے اس نے کہا کہ نہیں یہ باضابطہ بھی بالکل جھوٹ ہے۔ امیر نے کہا کہ: اب اس عورت سے بیٹھ کر کون جھک جھک کرے۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ نہ کوئی دلیل نہ کوئی حجت میں دلائل بیان کر رہا ہوں کہ محکمہ کی اطلاع اور ضابطہ کی خبر۔ اس نے کہا سب جھوٹ اب اس سے کون بحث کرے۔

جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَھُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ﴾ (۱) فرمایا کہ عورت میں کچھ عقل کی کمی ہوتی ہے۔ جب بحث ہوتی ہے تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بچپن سے زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے۔ جب ابتدا ہی سے رات دن سونا چاندی دل میں گھس

---

(۱) پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸.

گیا تو علم اور کمال کہاں سے گھسے گا۔ ایک چیز گھس سکتی ہے یا سونا گھس جائے یا علم۔ ذرا دودھ پینا چھوٹا تو اس کے کان میں سوراخ کر دیا تا کہ اس میں سونے کی بال پڑ جائے اور ذرا بڑی ہوئی تو ناک میں سوارخ کر دیا تا کہ اس میں سونے کی بالی بھی ڈال دو اور زیادہ ہوا تو گلے میں سونے کا طوق ڈال دیا، ہاتھوں میں سونے کی ہتھکڑیاں ڈالدیں اور پیروں میں سونے کی بیڑیاں ڈال دیں۔ غرض سونے چاندی کی قیدی۔ اور واقعی اگر عورتوں سے یوں کہا جائے کہ تمہارے بدن میں کیلیں ٹھونکی جائیں گی مگر وہ سونے کی ہوں گی۔ فوراً راضی ہو جائیں گی۔ جلدی کرو ٹھونک دو۔ مگر کیل سونے چاندی کی ہونی چاہئے۔ اس درجہ سونے اور چاندی کی محبت میں گرفتار ہیں کہ بدن چھدوانے کو تیار ہیں مگر سونا اور چاندی ہو۔ جب اس درجہ پر بات ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جو قرآن نے فرمایا:

﴿اَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① وہ جو سونے اور چاندی میں نشوونما پاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی قوت نہیں پیدا ہوتی۔ جب خاوند سے بحث ہوتی ہے وہ تو حجتیں پیش کرتا ہے اور یہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکتی ہے کہ نہیں یوں ہوگا۔

تو امیر صاحب نے دیکھا کہ بھئی میں حجت بیان کر رہا ہوں سرکاری خبریں دے رہا ہوں۔ یہ کہتی ہے سب غلط ہیں۔ اب اس عورت سے کون بحث کرے۔ محل سرائے سے واپس چلے آئے۔ دوسرے دن بڑے خوش خوش آئے اور کہا مبارک ہو۔ جو تم نے کہا تھا بات وہی سچی نکلی۔ خبر یہ آئی ہے کہ میرا شہزادہ فتح پا گیا اس نے دشمن کو بھگا دیا اور وہ کامیابی کے ساتھ واپس آ رہا ہے۔

بیگم نے کہا الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری بات اونچی کی اور میری بات سچی کر دکھائی۔ امیر نے کہا آخر تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا جو تم نے کل یہ حکم لگا دیا کہ میرا محکمہ بھی جھوٹا سی۔ آئی۔ ڈی اور پولیس بھی جھوٹی۔ تو تمہیں کوئی الہام ہوا تھا؟

اس نے کہا کہ مجھے الہام سے کیا تعلق اول تو میں عورت ذات، پھر ایک بادشاہی تخت پر بیٹھنے والی۔ یہ بزرگوں کا کام ہے کہ انہیں الہام ہو۔ بھلا مجھے الہام سے کیا تعلق؟ میں ایک معمولی عورت۔ انہوں نے کہا کہ آخر تم نے اس قوت سے کس طرح کہہ دیا کہ سب بات غلط ہے اور واقعہ بھی وہی ہوا کہ وہ غلط ہی ثابت ہوئی۔

اس نے کہا اس کا ایک راز ہے جس کو میں نے اب تک کسی کے سامنے نہیں کھولا اور نہ اسے کھولنا چاہتی ہوں۔ امیر نے کہا وہ کیسا راز ہے؟ اب امیر صاحب سر ہو گئے کہ آخر ایسا کون سا راز ہے جو خاوند سے بھی چھپا ہوا رہ جائے۔ اس نے کہا صاحب! کہ ایسی بات ہے کہ میں اس کو کہنا نہیں چاہتی۔ ''اَلْاِنْسَانُ حَرِيْصٌ فِيْ مَامُنِعَ.'' مثل مشہور ہے کہ جس چیز سے روکا جائے اس کی اور زیادہ حرص بڑھتی ہے کہ آخر اس میں کیا ہوگا۔ تو امیر صاحب نے کہ اب تو بتانا پڑیگا۔ جب بہت زیادہ سر ہو گئے تو اس نے کہا آج تک میں نے یہ راز چھپایا اب کھولے دیتی ہوں۔

---

① پارہ: ۲۵، سورة الزخرف، الآية: ۱۸.

وہ راز یہ ہے کہ مجھے اس کا کیوں یقین تھا کہ شہزادہ فتح پا کے آئے گا یا قتل ہوگا مگر شکست نہیں کھا سکتا۔ دشمن کو پیٹھ دکھا کے نہیں آ سکتا۔ یہ میرا یقین کس بنا پر تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ میرے پیٹ میں تھا۔ میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اس نو مہینے ایک مشتبہ لقمہ بھی اپنے پیٹ میں نہیں ڈالوں گی۔ رزق حلال کی کمائی میرے پیٹ میں جائیگی اس لئے کہ ناپاک کمائی سے خون بھی ناپاک پیدا ہوتا ہے اور ناپاک خون سے اخلاق بھی گندے اور ناپاک پیدا ہوتے ہیں تو میں نے عہد کیا اور نو مہینے اس کو پورا کیا کہ لقمہ حرام تو بجائے خود ہے۔ میں نے کوئی مشتبہ لقمہ بھی پیٹ میں نہیں جانے دیا۔ خالص حلال کی کمائی سے پیٹ کو بھرا۔ ایک تو میں نے یہ عہد کیا اس کو لازم رکھا اور اس پر عمل کیا۔

دوسری بات میں نے یہ کی کہ جب یہ پیدا ہو گیا تو ہزاروں دودھ پلانے والی ملازمات تھیں میں نے اس کو انہیں نہیں دیا، اپنا دودھ پلایا۔ دودھ پلانے کا طریقہ یہ تھا۔ جب یہ روتا میں پہلے وضو کرتی، دو رکعت نفل پڑھتی اس کے بعد اسے دودھ پلاتی۔ دعائیں بھی مانگتی۔ تو اندر پاک غذا پھر اللہ کی طرف توجہ۔ غرض دودھ بھی پاک، اس سے پیدا ہونے والا خون بھی پاک اور پاک خون سے پیدا ہونے والے اخلاق بھی پاک۔ اس لئے اس کے اندر بداخلاقی نہیں ہو سکتی۔ پشت دکھلا کر آنا اور بزدلی کرنا۔ یہ کمینے اخلاق میں سے ہے۔ شجاعت اور بہادری یہ پاکیزہ اخلاق میں سے ہے۔ جب اس کا خون پاک تھا تو یہ کیسے ممکن تھا یہ بزدل بنتا۔ یہ ممکن تھا یہ قتل ہو جاتا، شہید ہو جاتا، مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ پشت کے اوپر زخم کھا کر واپس آتا اور بزدلی دکھلاتا، جب اس کے خون میں ناپاکی نہیں تو اس کے افعال میں ناپاکی کہاں سے آئے گی؟

یہ وجہ تھی جس کی بنا پر میں نے دعویٰ کر دیا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ وہ شکست کھا کر آئے ہاں آپ یہ کہتے کہ شہید ہو گیا۔ میں یقین کر لیتی کہ وہ قتل ہو گیا۔ اس بناء پر میں نے یہ دعویٰ کیا تھا آج میں نے یہ راز کھولا۔ آپ اندازہ کریں کہ امیر دوست محمد خاں کی بیوی ایک اقلیم کی ملکہ ہیں۔ ہزاروں فوجیں اور سپاہ، حشم و خدم اس کے سامنے ہیں اور وہ جب تخت سلطنت پر بیٹھ کر اتنی متقی بن سکتی ہے تو ہماری بہو بیٹیاں معمولی گھرانوں میں رہ کر کیوں نہیں متقی بن سکتیں۔ ہمارے پاس کونسی ایسی دولت ہے۔ ہم اگر لکھ پتی یا کروڑ پتی بنیں سارے افریقہ کے مالک تو نہیں ہو گئے ہفت اقلیم کے بادشاہ تو نہیں ہو گئے۔ ایک ملکہ اور بادشاہ کی بیوی جب یہ تقویٰ دکھلا سکتی ہے تو میری بہنیں کیوں نہیں تقویٰ دکھلا سکتیں؟ میری بیٹیاں کیوں نہیں یہ تقویٰ دکھلا سکتیں؟ ان کے پاس تو اتنی دولت بھی نہیں کہ دولت کے قصہ سے کوئی وقت فارغ نہ ہو۔ فارغ وقت بھی ہوتا ہے۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ اگر دیندار بننا چاہیں عورت ہو یا مرد کروڑ پتی بن کے بھی بن سکتا ہے۔ نہ بننا چاہے تو فاقہ زدہ ہو کے بھی دین دار نہیں بن سکتا۔ بددین رہے گا۔ یہ اپنے قلب پر موقوف ہے اور قلب میں یہ جذبہ جب پیدا ہوگا جب اس قلب کی تربیت کی جائے اس کو تعلیم دی جائے اس میں علم ڈالا جائے اس میں اللہ کی عظمت پیدا کی جائے۔ اس میں حلال کی کمائی کی رغبت پیدا کی جائے، ناجائز باتوں سے بچنے کے جذبے پیدا کئے جائیں تب قلب میں صلاحیت آئے گی۔ پھر جو اولاد تربیت سے پیدا

ہوگی وہ صالحین میں سے ہوگی۔ وہ خود بخود تقویٰ وطہارت اور نفس کی پاکیزگی لئے ہوئے پیدا ہوگی تو واقعہ یہ ہے کہ بنیاد عورت سے چلتی ہے۔ مگر عورت کے بنانے کی بنیاد مردوں سے چلتی ہے، انجام کار ہماری آپ کی کوتاہی نکلتی ہے ہماری بہنوں کا کوئی قصور نہیں۔

پیدا ہوتے ہی بچہ تربیت کا محتاج ہوتا ہے...... یہ میں کوئی ان بہنوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا کہ بھئی آج فقط عورتوں کا جلسہ ہے اس لئے ایسی بات کہہ دوں جس سے وہ ناراض نہ ہوں۔ ایسا نہیں بلکہ امر حقیقت ہے کہ اگر ہم صحیح تربیت کریں۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ چار پانچ برس کی بچی بے چاری کیا جانتی ہے۔ جس راہ پہ ڈال دیں گے پڑ جائے گی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: پیدا ہوا ہوا بچہ اسی وقت سے تربیت کے قابل بن جاتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جب چار پانچ برس کا ہوگا جب اس کو تعلیم وتربیت دیں گے، ایسا نہیں ہے بلکہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت کا وقت آ جاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ بچہ مہینے بھر کا ہے۔ اسے ظاہر میں کوئی عقل وشعور اور تمیز کچھ نہیں۔ لیکن اس کے سامنے کوئی برا کلمہ مت کہو اور کوئی بری ہیئت بھی اس کے سامنے مت اختیار کرو، اس لئے کہ اس کو ہوش تو نہیں مگر اس کا قلب ایسے ہے جیسے سفید کاغذ، آنکھ کے راستے جو ہیئت جائے گی وہ اس کے قلب کے اوپر جا کے چھپ جائے گی۔ آپ برا کلمہ کہیں گے یا گالم گلوچ کریں گے۔ وہ کان کے راستہ سے جا کر اس کے دل پر چھپ جائے گا۔ جب وہ ہوش سنبھالے گا تو وہی باتیں بکتا ہوا ہوگا۔ غرض تربیت وہاں سے شروع ہوتی ہے ہم اس خیال میں رہتے ہیں کہ یہ بچہ ہے اسے کیا شعور ہے؟ جو چاہے اس کے سامنے کہہ دو اور چاہو کر گزرو، جو چاہو ہیئت بنالو، اسے کیا شعور؟ یہ درست ہے کہ اسے تمیز اور شعور نہیں ہے مگر یہ چیز کان، آنکھ کے راستہ سے جا کر دل پر چھپتی ہے۔ تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے بات بھی کرو تو تہذیب اور شائستگی کی کرو، کوئی بے جابات مت کرو، وہ بے جابات اس کے دل میں گھر کر جائے گی اور جب کوئی ہیئت دکھلاؤ تو بری ہیئت مت دکھلاؤ، اچھی ہیئت دکھلاؤ۔ آنکھ کے راستے سے وہی ہیئت اس کے دل پہ چھپے گی۔ اس بنا پر کہتے ہیں کہ تربیت پانچ برس کی عمر میں نہیں ہوتی۔ پیدا ہوتے ہی تربیت کا موقع آ جاتا ہے۔

بچہ ماں باپ کا نقال ہے...... یہ جب ہوگا جب خود ماں باپ میں تقویٰ وپاکیزگی اور احتیاط موجود ہو۔ جتنی یہ پاکیزگی برتیں گے، اتنی ہی پاکیزگی بچے کے قلب میں پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات کے بچے عموماً گالیاں دیتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ شہروں کے تہذیب یافتہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دیہات میں خود ماں باپ گالیاں بکتے ہیں۔ بچے کے دل میں بھی وہی چھپتی رہتی ہیں۔ شہر میں ذرا تہذیب کے کلمے ہوتے ہیں۔ وہ چھپتے رہتے ہیں اس کا اثر پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے آداب میں سے یہ رکھا ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچے کے لئے سب سے پہلے

بندوبست نہ روٹی کا کیا کہ اسے دودھ پلاؤ، نہ کپڑے کا کیا۔ خیر وہ بھی پہنا دے۔ پہلا بندوبست یہ کیا کہ اس کے (اسے غسل دینے اور ظاہری آلودگی سے پاکی کے بعد) دائیں کان میں اذان دو اور بائیں میں تکبیر، اذان کہنا ایسا ہے جیسے دیوار کے سامنے کہے تو دیوار کو کیا خبر؟

تو یہی بات آتی ہے کہ اسے خبر تو نہیں ہے مگر کان کے راستے جب اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پہنچے گا تو دل میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ کلمہ جب پہنچے گا تو دل میں اس کی چھاپ لگ جائے گی جب آپ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہیں گے دل پر رسالت پر ایمان لانا چھپ جائے گا۔ جب حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ کہیں گے کہ آپ کہیں گے کہ آپ نماز کی طرف دوڑو، یہی جملہ چھپ جائے گا۔ تو دائیں کان کو آپ نے توحید و رسالت، عمل صالح اور اللہ کی عظمت و بڑائی سے بھر دیا۔ اور بائیں کان کو تکبیر سے بھر دیا۔ اس میں اللہ و رسولؐ اور دین کی عظمت دل میں بٹھلائی۔ تو اذان و تکبیر ہوگئی۔ علماء لکھتے ہیں کہ اس اذان اور تکبیر کی نماز کونسی ہے؟ جو جنازہ کی نماز آپ پڑھیں گے اس کی یہ اذان و تکبیر ہے۔ دنیا میں آتے ہی اذان دی گئی تکبیر بھی کہی گئی۔ اور دنیا سے جاتے ہوئے جنازہ کی نماز پڑھی گئی یہ اس کی اذان و تکبیر تھی تاکہ ایک مومن بچے کی ابتداء اور انتہاء دونوں اللہ کے نام پر ہوں تو اللہ اکبر سے زندگی شروع ہوئی اور اسی پر ختم ہوگی۔ زندگی کا اول و آخر خدا کے نام سے چلا۔

اس کی بنا یہی ہے کہ ابتداً ہی جو اس کے دل میں چھپے اللہ کا نام چھپے کوئی گالم گلوچ اور برا کلمہ نہ چھپے اب اگر آپ تربیت دیں گے تو دل میں پیدا ہوتے ہی بیج تو آپ نے ڈال دیا۔ اب نماز کے لئے کہیں گے تو بیج موجود ہے اس میں پھل پھول لگنے شروع ہو جائیں گے عمل صالح شروع ہو جائے گا۔ ہاں خدانخواستہ تربیت نہ کی تو وہ جو بیج ڈالا تھا، وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔

زمین میں آپ بیج ڈال دیں لیکن نہ پانی دیں نہ دھوپ سے بچائیں بیج جل کر ختم ہو جائے گا۔ امید بھی نہیں رہے گی کہ اس میں کوئی درخت پیدا ہو۔ اس لئے بیج تو توحید و رسالت کا پیدا ہوتے ہی ڈال دیا جاتا ہے۔ آگے ماں باپ کو حکم ہے کہ "مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا" ① ''بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جاویں'' اور مار کر پڑھاؤ جب وہ دس برس کے ہو جائیں۔ یہ گویا تربیت اور آبیاری ہے کہ بیج وہاں ڈالا تھا اب پانی دینا شروع کرو۔ دھوپ سے بچاؤ تاکہ وہ بیج پھل لائے اور درخت بن جائے۔ یہ تربیت ہوگی تو اس کے بچے اور بچیاں بھی مستحق ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں بھی۔ آگے ماں باپ قصوروار ہیں اولاد قصوروار نہیں ہے۔ اولاد جب قصوروار بنے گی جب وہ عاقل بالغ ہو، شریعت کا خطاب متوجہ ہو۔ پھر اس سے مواخذہ ہوگا۔ مگر ابتدائی تعلیم نہ دینے کا مواخذہ ماں باپ سے ہوگا کہ کیوں نہ تم نے صحیح راستے پر ڈالا؟ کیوں غلط راستے پر ڈالا؟

عورتوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی ضرورت...... تو اس کی ضرورت ہے کہ عورتوں کی تعلیم کا بھی صحیح طریق پر

① المسند للامام احمد، مسند عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، ج: ۲ ص: ۱۸۰ رقم: ۶۶۸۹۔

بندوبست کیا جائے مثلاً ہمارے ہاں یہ قدیم زمانے میں دستور تھا بلکہ اب بھی کچھ قصبات میں ہے کہ اسکول یا کالج نہیں قائم ہوتے بلکہ محلے میں جو بڑی بوڑھیاں ہیں اور وہ پڑھی لکھی ہوئی ہیں تو محلے کی بچیاں ایک گھر میں جمع ہوجاتی ہیں۔ وہ گھر کے کام کاج بھی کررہی ہیں، قرآن شریف بھی پڑھ رہی ہیں، ترجمہ بھی پڑھ رہی ہیں مسئلے مسائل کے لئے ان کو بہشتی زیور پڑھایا جارہا ہے۔ یہ ان کی گھریلو تعلیم ہوجاتی تھی۔ جب یہ چیز کم ہوگئی تو مدرسے کھلے بچیاں وہاں پڑھنے چلی جاتی ہیں بہرحال کچھ نہ کچھ اس کی طرف توجہ ہے۔ یہ نہیں کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو جیسے خودرو درخت ہوتے ہیں کہ جدھر کو ان کا جی چاہے چلی جائیں۔

بہرحال ان کو گھریلو تعلیم دی جائے۔ جو عورتیں قرآن شریف پڑھی ہوئی ہیں یا اردو جانتی ہوں یا انہیں اپنی زبان میں مسائل معلوم ہوں یا کوئی کتاب ہے وہ پڑھائیں تا کہ ابتداء سے مسئلے مسائل کا علم ہو۔

اس لئے کہ شریعت اسلام نے علم کے سلسلے میں دو درجے رکھے ہیں۔ ایک درجہ ہر انسان پر مرد ہو یا عورت واجب ہے اور ایک درجہ فرض کفایہ ہے کہ سو میں سے ایک ادا کردے تو سو کے لئے کافی ہے۔ وہ حصہ جو ہر ہر شخص پر واجب ہے وہ ضروریات دین کا ہے کہ جس سے عقیدہ معلوم ہوجائے، اخلاق کا پتہ چل جائے حقوق کی ادائیگی، ماں باپ، اولاد، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے کیا حقوق ہیں۔ اللہ و رسول کا کیا حق ہے؟ کچھ عبادت، کچھ معاشرت، کچھ اخلاق، کچھ اعتقادات یہ سیکھنے تو واجب ہیں خوہ مرد ہو یا عورت اور ایک ہے پورا عالم بننا۔ یہ ہر ایک کے اوپر فرض نہیں ہے سو دو سو میں سے اگر ایک دو بھی عالم بن گئے تو سب کے لئے کافی ہے۔ ہاں ایک بھی نہیں بنے گا تو سب گنہگار ہوں گے۔

غرض فرض کفایہ کی یہ شان ہے کہ پوری قوم مل کر فرض کو چھوڑ دے تو پوری قوم گنہگار ہے۔ لیکن اگر ایک فیصد کو عالم بنا دیا، عمل دکھلا دیا تو ساری قوم کے اوپر سے گناہ ہٹ گیا۔ تو ایک فرض عینی ہے، یعنی ہر ہر شخص گنہگار، جو نہیں کرے گا وہی گنہگار ہوگا۔ اس لئے اتنا حصہ عورت اور مرد دونوں کے لئے ضروری ہے جس سے وہ یہ سمجھیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ ہم مسلمان کیوں ہیں؟ ہم پر کیا چیزیں فرض ہیں؟ ہم پر کیا ضروریات عائد ہوتی ہیں۔ عورت بھی اور مرد بھی اس کا حقدار ہے۔ اس کا سکھانا فرض ہے۔ خود مرد اپنی بچیوں کو سکھلائیں یا مرد کسی ایک عورت کو پڑھا دیں وہ عورت اور عورتوں کو تیار کردے کہ وہ گھروں میں جاکے یا کسی ایک جگہ مدرسہ قائم کر کے ان بچیوں کو پڑھا دے۔ اس سے زیادہ کوئی قصہ نہیں۔ ذرا توجہ کی جائے تو یہ معاملہ باآسانی ہوسکتا ہے۔

رہا عالم بنانا، سب کیلئے عالم بننا ضروری نہیں ہے۔ نہ مردوں کے لئے نہ عورتوں کیلئے۔ قوم میں سے ایک دو بھی بن گئے یا باہر جاکے بن گئے، ہندوستان جاکے بن گئے۔ پوری قوم سے گناہ ہٹ گیا، اس عالم کا فرض ہے، وہ اپنی قوم کی اصلاح کرے جو ان کی دینی ضروریات ہیں انہیں پورا کرے، انہیں مسائل بتلائے۔ فتویٰ دے، الجھنوں میں شرعی طور پر ان کی راہنمائی کرے۔ دل وساوس میں الجھ گئے ہوں تو فکر کا راستہ درست کرے۔ یہ اس کا فریضہ ہے۔

بہر حال مطلب یہ ہے کہ عورتیں بھی علم و اخلاق کی اتنی حقدار ہیں۔ جتنے آپ حقدار ہیں۔ جتنا حصہ آپ پر ضروری ہے وہ ان پر بھی ضروری ہے۔ ان کی دیکھ بھال آپ کے ذمہ ہے۔ اگر آپ نہیں کرتے تو آپ سے مواخذہ ہوگا۔ اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے تھے اور آیت یہ تلاوت کی تھی۔ ﴿وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ملائکہ علیہم السلام جب آئے اور انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے خطاب کیا۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہیں، نہایت مقدس اور پاکباز بی بی ہیں حتیٰ کہ بعض علماء ان کے نبی ہونے کے قائل ہیں۔ ان سے ملائکہ نے خطاب کیا اور کہا:

اے مریم! بشارت حاصل کر اللہ نے تجھے منتخب کیا تجھے پاکباز اور مقدس بنایا اور تیرے زمانے میں جتنی عورتیں ہیں ان سب پر تجھے فضیلت، بڑائی اور بزرگی دی۔ جب اللہ نے یہ انعام تجھے دیا اور برتر و برگزیدہ کر دیا۔ تو تیرا کام کیا ہے؟

﴿يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ﴾ ② "اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے عبادت گذار بندی بن کے رہ" ﴿وَاسْجُدِيْ﴾ سجدے اختیار کر ﴿وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ③ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔ رکوع سے مراد نماز ہوتی ہے، جہاں رکوع کا لفظ آتا ہے وہاں نماز کا ذکر ہے وہاں محض رکوع نہیں بلکہ پوری نماز مراد ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نماز قائم کرو، عبادت خداوندی کو اپنا شعار اور اپنی طبیعت بناؤ۔

اس لئے میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ مریم علیہا السلام کتنی بڑی پارسا اور پاک بی بی ہیں۔ ان کو اللہ نے کتنا بڑا مقام دیا کہ فرشتوں نے ان سے خطاب کیا یہ شرف کس کو حاصل ہوا؟ یہ بڑی قسمت کی چیز ہے۔ یہ ایک عورت کو شرف حاصل ہوا اگر حضرت مریم علیہا السلام کو یہ شرف حاصل ہوا۔ ہماری بہو بیٹیوں کو کیوں نہیں ہوسکتا بشرطیکہ وہ بھی وہی کام کریں جو حضرت مریم نے کئے۔

یہ الگ بات ہے کہ ان کی کچھ اور خصوصیات تھیں وہ ان کے ساتھ خاص تھیں۔ لیکن جو بڑائی اور کمال اللہ نے دیا تھا اس کے دروازے اللہ نے کسی کے لئے بند نہیں کئے۔ مریم علیہا السلام اگر ولی کامل بن سکتی ہیں تو ہماری عورتیں بھی ولی کامل بن سکتی ہیں۔ نبوّت کا بے شک دروازہ بند ہوگیا۔ نبی اب کوئی نہیں ہوسکتا۔ ایک ہی نبوّت قیامت تک کیلئے کافی ہے۔ اس نبوّت کے طفیل میں بڑے بڑے محدث، امام، مجتہد، اولیائے کاملین اور مجدد پیدا ہوں گے۔ فیضان قیامت تک اسی نبوّت کا کام کرتا رہے گا۔ گویا اتنی کامل نبوّت ہے کہ اسے ختم کر کے کسی اور نبوّت لانے کی ضرورت نہیں۔ جو مراتب تھے اس ذات پر ختم کر دیئے گئے۔ اب کوئی مرتبہ نبوّت کا باقی نہیں رہا جس کے لانے کے لئے کسی کو بھیجا جائے کہ اس پر یہ مرتبہ پورا کیا جائے۔

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۲. ② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۳.
③ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۴۳.

ایک ہی ذات پر سارے مراتب ختم ہو گئے یہ وہی ذات ہے جس کی روشنی قیامت تک چلتی رہے گی، روشنی کو پہنچانے والے اللہ تعالیٰ ہزاروں آئینے پیدا کر دے گا کہ آئینہ آفتاب کے سامنے ہوگا اور عکس اندھیرے مکان میں ڈالدے گا۔ وہ بھی روشن ہو جائے گا۔ تو نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا مگر ولایت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اس لئے اس نبوت کے نیچے رہ کر جو بڑے سے بڑا کمال مرد کو مل سکتا ہے وہ عورت کو بھی مل سکتا ہے۔ عورتیں مایوس نہ ہوں اور یہ نہ سمجھیں کہ علم وغیرہ تو مردوں کے لئے ہے، ہم صرف گھر میں بیٹھنے کے لئے ہیں۔ گھر میں ہی بیٹھ کر سب کچھ مل سکتا ہے اگر محنت کی جائے اور یہ توجہ کریں۔ اس واسطے میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی اس کے تحت تھوڑی سی تشریح عرض کی۔ خدا کرے ہمارے قلوب قبول کریں اور ہمارے دل مائل ہوں اور ہم حقوق کو پہچانیں۔ ہمیں اگر راعی بنایا گیا ہے تو ہم اپنی رعیت کی خبر گیری کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطاء فرماوے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَلَوْكَانَ النِّسَآءُ كَمَا ذُكِرْنَا لَفُضِّلَتِ النِّسَآءُ ـــ فَلَا التَّانِيْثُ لِاسْمِ الشَّمْسِ عَيْبٌ

عَلَى الرِّجَالِ ـــ وَلَا التَّذْكِيْرُ فَخْرٌ لِلْهِلَالِ

پیغام ہدایت...... ایک خط جو شادی کے موقع پر ارسال فرمایا (۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ

شادی اور نکاح سنت انبیاء علیہم السلام ہے اور اسے اسلام نے صرف معاملے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ عبادات کے زمرہ میں شمار کیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اذاتزوج العبد فقد كمل نِصْفُ الدِّيْنِ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِي النِّصْفِ الْبَاقِيْ.'' (۲) ''نکاح آدھا دین ہے آدمی کو چاہئے کہ بقیہ آدھا دین تقویٰ اور طہارت سے حاصل کرے''

نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ عفت، پاکدامنی اور خیال کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے آدمی حرام سے بچتا ہے اور حلال کے دائرہ میں محدود رہتا ہے۔ نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ اتحاد باہمی اور قبائل اور خاندانوں کے باہمی تعاون کی بنیاد پڑتی ہے۔ کتنے ہی اجنبی باہم مربوط ہو جاتے ہیں اور پہلے سے بیگانے ہوں تو یگانگت بڑھ جاتی ہے اور باہمی حقوق قائم ہو جاتے ہیں اسی لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے جہاں آبائی اور جدی نسب کو محل نعمت میں شمار فرمایا وہیں صہری اور سسرالی رشتہ کو بھی نعمت ظاہر فرمایا ارشاد خداوندی ہے ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا.﴾ (۳) ''اور اللہ ہی وہ ہے جس نے ایک قطرہ پانی سے بشر کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے نسب آبائی اور سسرالی رشتہ پیدا فرمایا''۔

---

(۱) از رسالہ دارالعلوم دیوبند، ماہ جون ۱۹۷۵ء۔ (۲) شعب الایمان، للبیهقی، ج: ۴، ص: ۳۸۳، رقم: ۵۴۸۶. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۱ ص: ۴۳۱. (۳) پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآیة: ۵۴.

پس جیسے نسب کو نعمت ظاہر فرما کر بشر پر اپنا احسان جتایا کہ یہ نعمت اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں دے سکتا ایسے ہی سسرالی رشتہ کو بھی نعمت ظاہر فرمایا کہ اجنبی دلوں کو اس طرح باہم ملا دینا بھی اسی کا کام ہے جو کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے نکاح کی غرض وغایت ظاہر فرماتے ہوئے اسے اپنی قدرت کی نشانی اور آیت قرار دیا۔

کیا یہ قدرت ہی کا کرشمہ نہیں کہ نکاح سے ایک منٹ پہلے مرد عورت باہم اجنبی ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو بعینہ اپنا دکھ درد نہیں سمجھتے اگر کبھی اجنبی عورت کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو سوائے عام انسانی ہمدردی کے آدمی اس کی کوئی خاص ٹیس اور چبھن اپنے دل میں اس طرح محسوس نہیں کرتا کہ بے چین ہو جائے اور اپنے دکھ درد کو بھول جائے۔ لیکن نکاح سے ایک منٹ بعد اگر عورت کے دکھ درد کی بات اس کے کان میں پڑ جائے تو وہ متفکر، پریشان اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے دکھ درد کو بھول کر منکوحہ کے دکھ درد کے مداوے میں مستغرق ہو جاتا ہے یہی صورت عورت کی بھی ہے۔ یہ دلوں کا ملاپ اور قلوب کی وحدت کیا محض قدرت کا ہی کرشمہ نہیں کہ دلوں کی دنیا یکدم بدل ڈالی اور جانبین کے دلوں میں انقلاب عظیم رونما فرما دیا اس لئے اگر اسے آیت اور نشانی فرمایا گیا ہے تو وہ ایک حقیقت واقعی ہے محض کوئی نظریہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ دو کا یہ ملاپ فریقین کے متعلقین کا بھی قدرتی ملاپ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی والے لڑکے والے کے اور لڑکے والے لڑکی والے کے دکھ درد میں شریک نہ ہوں اور باہم یگانگت محسوس نہ کریں اس لئے نکاح جیسے خود ایک آیت اور قدرت کے کرشموں کی ایک عظیم نشانی ہے ایسے ہی وہ باہمی اتحاد و یگانگت کا بھی ایک معجزانہ وسیلہ ہے اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح فرما کر قبائل کو اپنے ساتھ ملایا، باہم شیر و شکر فرمایا اور اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کے تعلق کی پختگی اور مضبوطی کا اہتمام تھا طلاق جو قاطع نکاح ہے باوجود جائز ہونے کے عنداللہ اس کو مبغوض قرار دیا۔

چنانچہ فرمایا: ''اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ عِنْدَاللّٰہِ الطَّلَاقُ'' '' جائز چیزوں میں سب سے زیادہ عداوت خدا تعالیٰ کو طلاق سے ہے''۔ کیونکہ یہ قاطع نکاح ہے۔ نکاح جو ذریعہ اتحاد و وحدت ہے تو طلاق قاطع اتحاد و ملاپ بھی ہے اس حال میں کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد وحید توحید کے ساتھ اتحاد باہمی بھی ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا جائے اور بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا جائے اور خدا سے ٹوٹے ہوئے دل کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے اس لئے وہ نکاح کے تعلق میں کسی ادنیٰ اختلال کو بھی کیسے گوارہ فرما سکتے تھے البتہ نکاحی تعلق مضبوط سے مضبوط اور ذریعہ اتحاد بنانے کا جو راستہ شریعت الٰہی نے طے فرما دیا وہ بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں ایک شفقت ایک اطاعت، جس سے معاشرہ کی گاڑی چلتی ہے۔

خاوند کو تو حکم دیا کہ وہ بیوی کے ساتھ انتہائی شفقت اور دلداری سے پیش آئیں اور نرم اخلاق سے اس کے دل کو موہ لینے کی سعی میں لگے رہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''اِنَّ اَکْرَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُکُمْ اَھْلاً۔'' (یعنی) ''تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم وہ مسلمان ہے جس کے اخلاق

پاکیزہ ہوں اور بیوی کے ساتھ لطف و مدارات کا برتاؤ کرتا ہو'' حتیٰ کہ آپ نے فرمایا کھانا کھاتے وقت اپنے ہاتھ سے بیوی کے منہ میں لقمہ دے دینا بھی صدقہ کے حکم میں ہے جس پر اجر دیا جاتا ہے اور اسے عبادت شمار کیا جاتا ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ازواج مطہرات کے ساتھ انتہائی ملاطفت اور دل جوئی کا عمل فرماتے تھے اس لئے بیویوں کے ساتھ دل جوئی اور ان پر لطف و کرم اور شفقت و محبت کے برتاؤ سے جہاں نکاح کی حقیقی غرض و غایت نکلتی ہے وہیں اس سے قلوب میں سکون اور باہمی مودۃ و اتحاد پیدا ہوتا ہے، ارشاد باری ہے ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ ① ''اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم میں سے تمہارے جوڑے بنائے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم میں آپس میں مودۃ اور رحمت پیدا ہو، بلاشبہ اس میں فکر کرنیوالوں کے لئے قدرت کی نشانیاں ہیں (کہ بے تعلق قلوب میں وہ کس طرح اچانک تعلق خاص بلکہ محبت باہمی کا علاقہ قائم فرما دیتا ہے)''۔

اور یہ اس لئے کہ بیوی خاوند کی وجہ سے اپنے گھر بار، ماں باپ، اپنے عزیز و اقرباء کو چھوڑ چھاڑ کر خاوند کے گھر آتی ہے کہ اس کی بن کر رہے اگر وہ بھی ملاطفت اور شفقت سے دست کش ہو جائے اور اس کے ساتھ بے رحمی اور ایذا رسانی کا برتاؤ کرے تو یہ غریب عورت کہاں جائے نہ ادھر کی رہے گی نہ ادھر کی اپنے عزیز تو خاوند کی وجہ سے چھوٹے اور خاوند بھی اپنا نہ ہوا تو اس غریب کا ٹھکانہ ہی کیا باقی رہا سوائے اس کے کہ غم میں گھل گھل کر اپنی زندگی ختم کر دے۔

ادھر بیویوں کو حکم دیا گیا کہ وہ خاوند کی اطاعت اور اتباع میں سرگرمی دکھلائیں اور کوئی حرکت ایسی نہ کریں جس سے خاوند کا دل ٹوٹے اور بیوی سے بیزار ہو جائے۔ جس سے اس تعلق کی غرض و غایت ہی فوت ہو جائے جیسے بدمزاجی، درشت کلامی، سرکشی اور نافرمانی اور شوہر کے مال میں خیانت یا مال کو بجائے شوہر کے گھر بار پر خرچ کرنے کے اس کی اجازت کے بغیر اپنے میکے پر صرف کرنے لگے جو بلاشبہ خیانت ہوگی اور خاوند کے لئے بددلی اور بیزاری کا باعث ہوگا، جس سے یقیناً اس تعلق کی خوشگواری اور نفس تعلق ہی کی بقاء میں خلل پڑ جائے گا۔ جس کے اثرات پورے گھرانے پر پڑنا قدرتی امر ہے اسی بناء پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتہائی بات فرما دی کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ شوہروں کو سجدہ کیا کریں چونکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا شرک اور قطعی حرام ہے اس لئے یہ امر نہیں کیا مگر اس سے اطاعت شوہر کی انتہائی تاکید برآمد ہوتی ہے کہ حرام اطاعت کے سوائے کوئی بھی اطاعت ایسی نہیں ہے جس کے لئے بیوی مامور نہ ہو اس لئے احادیث میں فرمایا کہ: اگر شب میں بیوی خاوند کیساتھ سرکشی برتتی ہے تو تمام ملائکہ اس پر لعنت کرتے ہیں یہی صورت دن کو بھی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ دو ہی باتیں اطاعت شوہر، ملاطفت زوجہ وہ ہیں جن کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان دونوں باتوں کا تعلق کسی ظاہری نمائش یا زینت پر نہیں رکھا گیا بلکہ ایک ایسی حقیقت پر رکھا گیا جو لا فانی اور جاودانی ہے مثلاً

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

اگر خاوند کی ملاطفت کا تعلق عورت کے ظاہری حسن و جمال، مال و دولت اور عرض و جاہت وعزت سے ہے تو یہ تمام چیزیں دنیا ہی میں پائیدار نہیں ہیں چہ جائیکہ آخرت میں کارآمد و نافع ثابت ہوں اس لئے کہ جب یہ کم یا گم ہوں تو شوہر کی ملاطفت ختم ہو جائے گی اور تعلقات میں کشیدگی بلکہ آخر کار انقطاع تعلق تک نوبت پہنچے گی اور اگر اس تعلق کی بنیاد عورت کی دین داری پر رکھی جائے تو دین سدا بہار اور دنیا کے بعد آخرت تک ساتھ جانے والا ہے اس لئے اس پر مبنی شدہ تعلق بھی دائمی اور مضبوط اور خوشگوار رہے گا جس میں کوئی عارضی چیز خلل انداز نہ ہوگی اس لئے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان امور کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ: ''تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ.'' ① ''عورت سے نکاح (بظاہر اسباب) چار وجوہ سے کیا جاتا ہے اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے، اس کے خوبصورت ہونے کی وجہ سے، اس کی عرفی عزت و وجاہت کی وجہ سے، اس کی دینداری کی وجہ سے سو تم ان تمام امور میں دینداری کو ترجیح دو''۔

ظاہر ہے کہ مال و جمال اور عرفی حیثیت آنی جانی چیزیں ہیں اگر بیوی پر لطف و شفقت ان کی بناء پر ہے تو اول تو یہ لطف و شفقت نہیں بلکہ خود غرضی ہے اور جس حد تک ہے بھی تو اس کے زوال سے تعلق زائل ہو جائے گا اور گھریلو زندگی میں ناچاقی اور بیزاری رونما ہو جائے گی جس سے گھر تباہ ہونے کی صورت پیدا ہوگی لیکن اگر نکاح کا مبنیٰ عورت کی دینداری ہے جو خاوند کے بھی دیندار ہونے کی کھلی علامت ہے۔ اور لطف و شفقت اس بناء پر ہوگا تو اس کی بنیاد خوف خدا پر ہوگی اور آدمی محسوس کرے گا کہ جب خدا نے اسے میرے ذمہ لگا دیا تو حسب اوامر خداوندی اس کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ کروں خواہ وہ حسین و جمیل ہو یا نہ ہو، مالدار ہو یا نہ ہو، صاحب جاہ و منزلت ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس جذبہ سے یہ ملاطفت و شفقت عین دین ہوگی اور مرتے دم تک قائم رہے گی ہاں اگر حق تعالیٰ دینداری کے ساتھ ساتھ حسین و جمال، مال و منال بھی جمع فرما دیں تو یہ سونے پہ سہاگہ ہے لیکن یہ امور تعلق کی بنیاد بنانے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ ہر آن قابل زوال و اختلال ہیں۔ بہر حال نکاح کے تعلق میں پختگی اور پائیداری ان دو ہی امور سے آتی ہے شوہر کی اطاعت اور زوجہ کی دلداری۔ دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ زوجہ کوئی باندی نہیں ہوتی، بلکہ شریک حیات اور رفیقہ زندگی ہوتی ہے، اس لئے اس کے ساتھ اونچ نیچ کا برتاؤ کسی طرح بھی جائز نہیں، وہ قابل احترام بنائی گئی ہے نہ کہ مورد تذلیل و اہانت۔ چنانچہ عرب ممالک میں آج بھی اگر عورت سامنے آجائے تو ''حرمتہ'' کہہ کر لوگ توقیر کے ساتھ اسے راستہ دیتے ہیں نیز اگر اس کی حرمت وعزت باقی نہ رہے تو گھر والے بلکہ اولاد تک بھی اس کی عزت نہیں کر سکتی اس لئے شریعت نے جہاں مرد کو عورت پر حقوق دیئے ہیں اسی طرح عورت کو بھی مرد پر حقوق دیئے ہیں تا کہ وہ معاشرہ میں باعزت رہے چنانچہ قرآن حکیم نے ارشاد

---

① الصحیح لمسلم، کتاب النکاح، باب استحباب نکاح ذات الدین، ج: ۲ ص: ۱۰۸۶ رقم: ۱۴۶۶.

فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ﴾ ① ”اور عورتوں کے بھی حقوق (مرد پر) اسی طرح ہیں جس طرح (مرد کے حقوق) عورت پر ہیں“۔

مثلاً اگر مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی خلع کا حق سونپا گیا ہے اگر نزاع باہمی ہے تو مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے افراد کو حکم منتخب کرنے کا برابری کے ساتھ حق دیا گیا ہے جو اس کی واضح دلیل ہے کہ عورت کو لاوارث بنا کر مرد کے سپرد نہیں کیا جاتا، بلکہ باعزت اور باحقوق بنا کر دیا ہے پس اگر بیوی کو اطاعت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے تو مرد کو دلداری کا۔ تو یہ دونوں کے منصب کا تقاضا ہے کوئی اونچ نیچ پیش نظر نہیں۔ خلاصہ یہ کہ معاشرتی مساوات کے ساتھ شوہر کی شفقت و اعانت اور زوجہ کی فرمانبرداری ہی سے گھریلو زندگی کی گاڑی رواں دواں ہو سکتی ہے جس کا اسلام نے راستہ بتلا دیا ہے کہ وہ دین اور دینی جذبات کی پائیداری اور شرعی معاشرت کی پابندی کے سوا دوسرا نہیں ہے اس لئے شوہر اور زوجہ کے مطالعہ میں ایسی کتابیں رہنی چاہیں جن میں زوجیت کے حقوق اور اسلامی معاشرہ، رہن سہن اور باہمی تعلقات کی خوشگواری کے طریقے واضح ہوں اور وہ بکثرت شائع شدہ ہیں جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بہشتی زیور یا حقوق الزوجین یا حقوق المعاشرۃ وغیرہ وغیرہ۔

امید ہے کہ احقر کی شرکت و حاضری نکاح سے یہ پیغام زیادہ نافع ہوگا شرکت تو وقتی چیز رہتی ہے اور یہ دوامی دستور العمل ہوگا۔ (وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ.)

پیغام ہدایت......ایک خط کا جواب ② محترم المقام زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مفصل گرامی نامہ ملا۔ میں سفروں میں رہا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، آپ نے اپنے کچے مگر سچے حالات تحریر فرمائے اور اپنی اصلاح سے مایوسی ظاہر فرمائی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں مایوسی کفر ہے، مایوس ہرگز نہ ہو جایئے، کوئی مرض ایسا نہیں جس کا علاج اللہ تعالیٰ نے نہ رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے مرض پیدا کئے تو علاج بھی پیدا کئے ہیں تا کہ بندوں کی عزیمت عمل اور اندورنی جوہر، ہمت قوی، عزیمت اور مدافعت کا ظہور ہو۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق امراض پیدا ہی نہ کئے جاتے باطنی امراض میں کفر وفسق کا نام ونشان ہی نہ ہوتا اور امراض باطن کے اسباب شیاطین اور کفار اور فساق کا ماحول پیدا ہی نہ کیا جاتا تو علاج اور اس کے اسباب یعنی اچھے اعمال، اچھے اشخاص کے پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی اور جب نہ اچھے ہوتے اور نہ برے، اچھائی ہوتی اور نہ برائی تو دنیا آخر کس چیز کا نام ہوتا، جسے پیدا کیا جاتا، بالفاظ دیگر دنیا ہی نہ پیدا کی جاتی۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ دنیا کا پیدا کیا جانا قرین حکمت تھا تو خوبی کے ساتھ خرابی، نیکی کے ساتھ بدی، تقویٰ کے ساتھ فجور، اسلام کے ساتھ کفر کا پیدا کیا جانا بھی ضروری اور عین حکمت تھا، تا کہ کفر کے مقابلہ سے اسلام کی قوت، فسق کے مقابلہ سے تقویٰ کی طاقت، بدی کے مقابلہ سے نیکی کی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۸۔ ② از رسالہ دار العلوم دیوبند ستمبر ۱۹۵۸ء۔

رفعت، کذب کے مقابلہ سے صدق کی عزت و فخامت نمایاں ہو آپ کے تخیل کے مطابق کہ اس شیطان کو کیوں میرے پیچھے لگا دیا۔ شیطان پیدا نہ ہونا چاہئے تھا تا کہ آپ کو نہ ورغلاتا لیکن پھر آپ ہی کے پیدا ہونے کی کیا ضرورت تھی نیز آپ میں مدافعت شر کی قوتیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی اور نیکی و بدی میں امتیاز کی قوت یعنی عقل پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور قوت ارادی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ حق کو باطل سے ممتاز دیکھ کر حق کی طرف اپنے ارادے سے دوڑیں اور یہ سب غیر ضروری تھا، تو وہ انسان کہاں رہتا، جس میں نہ قوت ارادی ہوتی نہ قوت تمیزی نہ عقل ہوتی نہ عزیمت ہوتی نہ طاقت مدافعت ہوتی، تو انسان کیا ہوتا، اینٹ پتھر کا ایک تودہ ہوتا اور جب ساری کائنات انسان کے لئے بنائی گئی اور انسان کا یہ عالم کہ وہ ایک تودۂ خاک، تو کائنات ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسے علم و عقل سے استعمال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ لہٰذا آپ کی رائے کے مطابق اور وہ بھی آپ کی کم ہمتی کی وجہ سے اس دنیا کو نا پید رہنا چاہئے تھا اور اب بھی اگر وہ ہے تو اسے صرف ایک تودۂ خاک ہونا چاہئے یہ سوائے تخیلات فاسدہ کے اور کیا ہے۔

آپ نے جو کچھ نیکی یا بدی کی، ارادہ و اختیار سے کی، اللہ تعالیٰ نے مجبور کر کے نہیں کرائی، کب ایسا موقع آیا کہ آپ اینٹ، پتھر کی طرح مسلوب الاختیار ہو گئے ہوں کہ آپ چاہتے ہوں نیکی کرنا مگر زبردستی آپ کا اختیار چھین کر آپ سے بدی کرا دی گئی۔ اس لئے اپنے کئے دھرے کو تقدیر کے سر ڈال کر بری الذمہ ہونے کی کوشش نہ کیجئے کہ یہ انتہائی جسارت اور گستاخی ہے۔ ایک تو آدمی بدی کرے اور اوپر سے بری الذمہ بن کر بدی کو اپنے مالک کے سر تھوپنے کی کوشش کرے۔

ان سارے فاسد تخیلات کا یک ہی علاج ہے، سب سے پہلے اپنی زندگی کا ایک نصب العین متعین کیجئے کہ آیا وہ دنیا ہے یا آخرت، اگر دنیا ہے تو اس کے کمانے کی فکر میں لگ جائیے اور حلال و حرام کا کوئی سوال نہیں جو جی میں آئے یا نام نہاد عقل میں آئے کرتے رہیے، بجز اس کے کہ جسے دنیا برا سمجھے دنیا کی خاطر اسے ترک کیجئے، جسے اچھا سمجھے اسے اختیار کرتے رہئے عاقبت کی فکر کو ترک کر دیجئے اور اگر آخرت ہے تو اسے کمانے کی فکر کیجئے تو پھر اخروی قانون سے مدد لیجئے کہ اس کی رو سے کون سی چیز حلال ہے، کون سی حرام اور دونوں دائروں میں خواہ دنیا ہو یا آخرت بہر حال اپنا ارادہ صرف کرنا ہو گا اور اختیار سے کام کرنا ہو گا، تقدیر کے حوالہ کر کے بری الذمہ ہونا ہے تو آج سے ملازمت، تجارت، زراعت سب ترک کر دیجئے کہ جو مقدر ہو گا، آپ ہی مل رہے گا، لیکن اس دائرہ میں اسباب رزق کا اختیار کرنا آپ کے نزدیک ضروری ہے، اس لئے زندگی کا ایک نصب العین متعین کر کے اپنی قوت مدافعت کا جائزہ لیجئے کہ وہ اس کی حد تک یہ زندگی کے نصب العین کے اجزاء کو حاصل کرنے اور اس کی منافی اشیاء کو دفع کرنے میں کام کرتی ہے۔

اخروی نصب العین کے لئے دستور العمل شریعت ہے، جس کے پانچ ارکان ہیں۔ عبادات، اخلاق،

اعتقادات، معاملات، عقوبات اور سب اختیاری ہیں، ان سب کو بنام خدا شروع کیجئے، فرائض کی پابندی، اخلاق کے تکمیل کے لئے کسی متخلق باخلاق اللہ کی طرف رجوع، عقیدہ کی اصلاح اور تخیلات فاسدہ سے گریز، معاملات میں فقہ کی پابندی، خود علم نہ ہو تو پوچھ پوچھ کر عمل۔

عقوبات کے سلسلہ میں مادی سزائیں مادی قوت نہ ہونے کی وجہ سے آج نہیں دی جاسکتی ہیں تو اسے بھی اللہ کی رحمت کہنا چاہئے اور اس کے قائم مقام استغفار کو رکھا جائے، جس کے معنی ماضی پر ندامت مستقبل کے لئے عزیمت کہ کچھ بھی ہو آئندہ یہ معصیت ہرگز نہیں کرنی، پھر بھی اتفاقاً شہوات سے مغلوب ہو کر ہو جائے تو پھر توبہ اور اپنے اوپر مالی جرمانہ جو صدقات کی صورت سے ہو، کیا جائے، ماحول کو حتی الامکان بدلا جائے، اگر وہ معصیت کا ماحول ہے اور دل کی کمزوری سے اس کے اثرات سے بچاؤ زیادہ دشوار ہو تو ماحول کی تبدیلی کی پوری سعی کی جائے جب اللہ کے لئے آدمی اپنے منافع تک ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے تو کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ اسے ادھر میں چھوڑ دیں، ادھر سے بلاشبہ دستگیری ہوگی ان سب عملی و نظری مفاسد سے بچنے کا ایک بڑا ذریعہ ذکر اللہ کی کثرت ہے زبان کو ذکر سے تر رکھا جائے، صبح و شام ذکر کا کوئی معمول کر لیا جائے، مثلاً صبح و شام سو سو مرتبہ "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" اور کلمہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا ذکر کیا جائے یعنی ایک تسبیح حسبنا کی اور ایک تسبیح کلمہ توحید کی صبح اور ایک شام کو، اس کے خلاف خیالات فاسدہ آویں تو لاحول پڑھی جائے جب نصب العین آخرت قرار دے لیا گیا تو منافی آخرت خیالات کو سوائے لاحول سے دفع کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے، یہ کثرت ذکر خود ہی قلب کو پاک کرے گا خیالات فاسدہ کو کم یا گم کرے گا قلب کی سختی کو مٹا کر رقت پیدا کر دے گا، اور برے ماحول سے نفرت دلا کر اچھے ماحول کے جذبات پیدا کرے گا، اس لئے ہر طرف سے ہٹ کر اس دستور العمل کو اختیار کر لیجئے اور برے خیالات پر لاحول بھیجئے، اس کے سوا دوسری راہ اصلاح کی نہیں، ساتھ ہی کسی کو اپنا رفیق عمل بنا لیجئے جو نیک مشورہ دے، اور کسی ایک کو مرجع افکار بنائیے کہ وہ وساوس اور ضعطوں کے وقت سنبھالتا رہے حاصل یہ کہ بیماری ہے تو طبیب متعین کیجئے اور اس کے سامنے حالات کی اطلاع، تدابیر کا اتباع اس پر اعتماد اور اس سے اعتقاد قائم کر کے ان چاروں باتوں کو مشعل راہ بنائیے۔ بھروسہ خدا کے فضل پر کیجئے مگر فضل کی علامت نیک عمل کو سمجھیئے اگر وہ نہیں ہے تو سمجھئے کہ فضل متوجہ نہیں ہے، اس وقت اس سے زیادہ کسی اور بات کی حاجت نہیں، اسی لئے سردست اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت، استقامت، ہمت اور عزیمت عطا فرمائے اور حسن انجام نصیب فرمادے، آمین، والسلام۔

(حضرت حکیم الاسلام) محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۷۔۹۔۱۱

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

حرف آغاز...... ۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک غیر معمولی اور عظیم اجلاس میں شرکت ہوئی جس کا موضوع تھا "فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ"۔ اس اجلاس میں ملک کے تمام مرکزی اداروں کے نمائندوں اور تقریباً ہر مکتب خیال کے فضلاء اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اجلاس کی اہمیت صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخر الدین علی احمد کی شرکت سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ احقر ناکارہ کو صدر اجلاس منتخب کیا گیا۔ چونکہ صدر مملکت نے صرف ایک گھنٹہ دیا تھا۔ اس لئے اجلاس کی پہلی نشست کی ساری کاروائی ایک ہی گھنٹہ میں پوری کی جانی ضروری تھی۔ ابتداء میں شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اس کے بعد محترم ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج و ڈائریکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ نے اجلاس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ پندرہ پندرہ منٹ صدر جلسہ اور صدر مملکت کی تقریروں کے لئے تھے۔ احقر نے اولاً اپنی تقریر سے جلسہ کا افتتاح کیا۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے چونکہ اس اہم موضوع پر کوئی تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہ تھا اس لئے تقریر میں چند بنیادی اور اساسی نقاط ہی بیان کئے جاسکے۔ البتہ نشست کے اختتام پر جب اس کا ذکر آیا تو ذمہ داران جامعہ نے اسے مناسب خیال فرمایا کہ یہ تفصیلات نقاط، مقالہ کے طور پر لکھ کر ارسال کر دی جائیں جس میں باقیماندہ نقاط بحث بھی شامل ہوں۔ اس لئے یہ مقالہ پیش کیا جارہا ہے جس میں وہ سب بنیادیں بھی ہیں جو اجلاس میں زبانی بیان کی گئی تھیں اور باقیماندہ نقاط بھی آگئے ہیں جو وہاں بیان میں نہ آسکتے تھے۔ ممکن ہے کہ ترتیب میں فرق ہو لیکن مقاصد سب آگئے ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس موضوع کے سلسلہ میں چند بنیادی نقاط پیش کر دوں جنہیں فکر جدید کی تعمیر اٹھانے والے حضرات کو پیش نظر رکھنا میرے نزدیک از بس ضروری ہے۔

عالم بشریت میں فکر و تفکر کی اہمیت...... پہلے بطور تمہید کے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عالم بشریت میں فکر و تفکر ایسی ایک عظیم اصولی بلکہ اصل الاصول قوت ہے کہ انسان کی ساری معنوی قوتیں اسی کے نیچے آئی ہوئی ہیں اور سب اسی کی دست نگر ہیں، جو بلا فکر ایک قدم بھی کسی میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ حواس خمسہ ہوں یا عقلی و دانش، ذوق و وجدان ہو یا بصیرت و تفقہ، حدس و تجربہ ہو یا جو ہر قیافہ ان سب کی قائد اور محرک فکر ہی ہے۔ پھر یہ فکر

نہ صرف یہ کہ انسان کی تمام معنوی قوتوں کا سر چشمہ ہی ہے، بلکہ خود انسان کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت بھی ہے جس سے اس کی انسانیت پہچانی جاتی ہے کیونکہ یہ قوت انسان کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں، اس لئے اگر اس فکری قوت کو انسان کی ماہیت کا حقیقی معرف کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

انسان کی مشہور و معروف تعریف حیوان ناطق یا حیوان عاقل سے کی جاتی ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس سے انسان کا کوئی امتیاز بخش تعارف نہیں ہوتا کہ اسے انسان کی حد تام یا جامع و مانع تعریف سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ عقل کا تھوڑا بہت جو ہر غیر انسان حتیٰ کہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایک کتے کو بھی اگر ایک جگہ ٹکڑا ڈال دیا جائے تو اگلے دن وہ پھر اسی جگہ آ موجود ہوگا۔ گویا وہ قیاس کرتا ہے کہ جب آج اس جگہ ٹکڑا ملا ہے تو کل کو بھی مل سکتا ہے اور جب مل سکتا ہے تو پھر اسی جگہ پہنچ جانا چاہئے، یہ صغریٰ کبریٰ ملانا آخر عقلی قیاس نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ خواہ وہ تعبیری اور لفظی نہ ہو مگر ایک حقیقت تو ہے، نیز عرف عام میں بعض جانوروں کو چالاک اور ہوشیار کہا جاتا ہے۔ جیسے لومڑی اور گدھے، بھینس کو عام طور سے احمق اور بلید کہتے ہیں، سعدی شیرازی نے کہا تھا کہ ۔

مسکن خر اگرچہ بے تمیز است   چون بارہمی برد عزیز است

اور کسی نے بھینس کے بارے میں بھی کہا کہ ۔

جاموش بے وقوف و بے ہوش   چوں شیر دہد تو چشم از وپوش

اگر ان حیوانات میں عقل و شعور کی جنس ہی نہ ہوتی تو یہ نوعی تفاوت کی تقسیم صحیح نہ ہوتی جو عرف عام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، اندریں صورت عاقلیت یا دریافت معقولات علی الاطلاق انسان کی خصوصیت قرار دے کر اس کی حد تام حیوان ناطق کو بتلایا جانا اور اس سے نوع انسانی کا تعارف کرایا جانا کوئی جامع مانع قسم کا تعارف نہیں ہوسکتا، البتہ فکر و تدبیر کے راستے سے حقائق کا تجزیہ کر کے ان میں امتیاز قائم کرنا، نئے نئے اکتشافات سے جزئیات پیدا کر لینا اور جزئیات کو جمع کر کے ان سے کلیات بنانا، کلیات سے جزئیات کا نکال لینا اور جزئیات کے عواقب و نتائج کو سمجھنا، نتائج کے معیار سے عواقب اور انجام دنیا و آخرت کو پیش نظر رکھنا، نوعی خیر سگالی اور اس کی منظم تدبیریں اور اصلاح معاشرہ کے لئے سوچ بچار وغیرہ بلاشبہ انسانی نوع ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ سب اسی فکر کے کرشمے ہیں، اسی لئے انسانی حقیقت کی اگر کوئی جامع مانع تعریف ہوسکتی ہے تو وہ حیوان ناطق نہیں بلکہ حیوان متفکر ہوسکتی ہے۔ کیونکہ فکر مندی، فکر نمائی اور فکری پیائش اور وہ بھی عمومی اور پوری نوع بشری کے لئے اور نہ صرف اس حیات کے لئے بلکہ حیات مابعد الممات تک کے لئے صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے، جو اس کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں۔ اس لئے حیوان متفکر ہی کو انسان کی حد تام تک کہنا کچھ زیادہ قرین عقل نظر آتا ہے۔

پس یہ فکری قوت ہی انسان کی سب سے بڑی فعال قوت اور اس کی ساری معنوی قوتوں میں اولوالامر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جس سے وہ کائنات میں متصرف اور ہر عنصری مخلوق سے اونچا سمجھا جاتا

ہے۔ پھر یہی نہیں کہ انسان اس قوت کا ایک ظرف ہی ہے جس میں عقل و دانش، ذوق و وجدان اور حدس و تجربہ جیسی قوتوں کی مانند فکر بھی ان ہی جیسی ایک قوت ہے اور دوسری قوتوں کی طرح وہ بھی کسی نہ کسی وقت اپنے محدود مخصوص دائرے میں کام دے جاتی ہے، بلکہ فکر کی طاقت اس کی تمام معنوی طاقتوں پر حکمران متصرف اور انکی روح ہے، جس کے اشاروں پر یہ ساری قوتیں آمادۂ عمل رہتی ہیں۔ اگر کہیں نمائشی کروفر کا بازار گرم ہو اور باجوں، گاجوں اور نعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہوں، لیکن اگر راہ گیر کسی دوسرے خیال میں مستغرق ہو تو ان میں سے ایک چیز بھی نہ آنکھ کو نظر آئے گی نہ کان کوئی آواز سن پائے گا۔ اور لاعلمی کے اظہار پر جب لوگ حیرت کریں گے تو وہ یہ کہے گا کہ میں فلاں بات کی فکر میں ڈوبا ہوا تھا، مجھے ان مناظر اور آوازوں کی کچھ خبر نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ آنکھ کان نہ خود دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں بلکہ قوت خیال و فکر ہی دیکھتی سنتی ہے۔ یہ آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی فکر کے آلات و وسائل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہی صورت عقل و دور اندیشی کی بھی ہے کہ آدمی زیرک بھی ہو اور دانائے روزگار بھی سمجھا جاتا ہو لیکن وہ کسی نظریئے کی سوچ میں محو ہو تو دوسرے کتنے ہی عقلی نظریات اس کے سامنے رکھ لئے جائیں، نہ وہ انہیں سمجھ سکے گا نہ ان کا شعور ہی پاسکے گا۔ کیونکہ اس کی قوت فکر یہ کسی دوسرے میں مصروف جولانی ہے اور فکر کو فرصت نہیں ہے کہ وہ اس نظریئے پر غور کر سکے۔ اسی طرح روحانی احوال و کیفیات کا ادراک بھی قوت فکر یہ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ اگر غیبی میدانوں میں فکر کی قوت متوجہ ہی نہ ہو یا کسی دوسرے روحانی مقام میں محو ہو تو دوسرے غیبی اور وجدانی لطیفے قلب پر بھی منکشف نہیں ہو سکیں گے۔ آخر مراقبات میں قوت فکر اور دھیان ہی کا تو استعمال ہوتا ہے۔ احسان یا تصوف کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کو اس طرح حاضر و ناظر تصور کر کے آدمی عبادت میں مصروف ہو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ سو یہ قوت فکر کا استعمال نہیں تو اور کیا ہے؟

انسان کی فکری قوت کی کار پردازی...... بہر حال یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ انسان کی معنویت میں حقیقی کار پرداز صرف یہ فکر ہی قوت ہے۔ وہ متوجہ نہ ہو تو قوت باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ اور قوت عاملہ سب معطل رہ جاتی ہیں۔ اس لئے جب وہ محسوسات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو حواس خمسہ ہرکاروں کی طرح اس کے حکم پر دوڑتے ہیں۔ جب عقلیات کی طرف منعطف ہوتی ہے تو عقل ایک خادم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ یہی قوت فکر جب غیبیات کی طرف چل نکلتی ہے تو وجدان و ذوق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔

اس لئے قوت فکر یہ نہ صرف یہ کہ انسان ہی کی خصوصیت ہے جو اس کی ماہیت کا سرنامہ ہے بلکہ اس کی ساری ہی اندرونی قوتوں کی روح اور ان کے حق میں محرک اور قائد بھی ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے کلام معجز نظام میں اسی حقیقت کو واشگاف فرمایا ہے۔ چنانچہ جو قومیں ان حسی طاقتوں' آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی وغیرہ کے ذریعہ معجزات ابنیاء کو دیکھتی تھیں اور ان کے پاک کلمات سنتی تھیں، مگر رضاء و تسلیم کا نام نہیں لیتی تھیں تو قرآن حکیم نے

اس کی وجہ آنکھوں کی نابینائی یا کانوں کی ناشنوائی قرار نہیں دی بلکہ دل کی نابینائی بتلائی ہے جو درحقیقت اس قوت فکریہ کی نابینائی ہے۔ارشاد فرمایا: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ﴾ ① ''بات یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ سینوں میں دل اندھے ہیں (جو فکر اور غور سے عاری ہیں)''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواس کی روح اور مدار کار فکر قلب ہی ہے نہ کہ نظر چشم ،فکر کی آنکھ نہ ہو تو حواس سب کے سب اندھے ہی رہ جاتے ہیں گو وہ طبعی آمادگی سے دید و شنید کا کام بھی انجام دیتے جائیں۔اس لئے قرآن حکیم نے منکرین کی ظاہری دید و شنید کو مانتے ہوئے بھی اس کی حقیقی کارکردگی کا انکار کیا ہے جبکہ اس کی غرض وغایت ہی اس پر مرتب نہیں ہوتی جو قوت فکر سے متعلق ہے کہ یہی فکری روح ان محسوسات کے پیکروں میں سے ان کی روح نکال کر لاتی ہے۔ارشاد حق ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ ② ''اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ) ان میں (گو) بعض ایسے بھی ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا کر بیٹھے ہیں۔کیا آپ بہروں کو سنا (کر ان کے ماننے کا انتظار کرتے) ہیں گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہراً) آپ کو (مع معجزات وکمالات) دیکھ رہے ہیں تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو''۔

اس سے واضح ہے کہ سن کر کسی چیز کو ان سنی کر دینا اور دیکھ کر ان دیکھی بنا دینا قوت فکر ہی کے تعطل سے ہوتا ہے جس کو قرآن نے عقل وابصار سے تعبیر کیا ہے گویا جس مبصر و مسمع میں یہ بنیادی شعور شامل نہ ہو جس کا قوۂ مفکرہ کے غور وفکر سے تعلق ہو تو وہ مبصر و مسمع بلحاظ حقیقت غیر مسموع اور غیر مبصر کے حکم میں ہے۔پھر اس طرح قرآن حکیم نے ایک دوسری جگہ ان منکروں کے حق میں فرمایا: جو پیغمبر علیہ السلام اور ان کے پیغمبرانہ اقوال وافعال کو دیکھتے اور سنتے تھے اور طبعی انداز سے وہ بینا اور شنوا بھی تھے لیکن فکر قلبی نہ ہونے یا نہ برتنے سے ان کے یہ حواس ،حیوانی حواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے اور ان میں وہ فکر شعور نہ تھا جو حقیقی معنی میں دیکھتا اور سنتا ہے جسے قرآن نے فقہ قلبی سے تعبیر کیا ہے۔ارشاد حق ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ③ ''ان کے دل ایسے ہیں کہ جن سے وہ سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو ہیں یہی لوگ غافل ہیں''۔

اس سے واضح ہوا کہ قلب کا محض طبعی شعور اصل نہیں جو حیوانات میں بھی موجود ہے بلکہ فقہ قلب اصل ہے،جس کا دوسرا نام قوت فکر ہے، وہ نہ ہو تو حواس کام ہی نہ کریں گے یا کریں گے تو وہ ناقابل اعتبار ہوگا اور غیر قابل التفات

---

① پارہ:۱۷،سورۃ الحج،الآیۃ:۴۶۔ ② پارہ:۱۱ سورۃ یونس،الآیۃ:۴۲،۴۳۔ ③ پارہ:۹ سورۃ الاعراف،الآیۃ:۱۷۹۔

جس سے نمایاں ہے کہ قلبی نور اصل ہے جس کا نام فکر ہے نہ کہ مطلقاً قلبی شعور جو چوپایوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

عقل کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا حقیقی معیار ...... اسی طرح عقل کے بارے میں بھی قرآن کریم نے یہی فیصلہ دیا ہے کہ اس کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا معیار بھی یہی قوت فکر ہے۔ عقل محض نہیں، یعنی عقل طبعی کی سوچ بچار کے باوجود جبکہ قلب کی فقہی سوچ بچار اس کا منشا نہ ہو جس کا نام فکر ہے۔

تو عقلی شعور بھی بے شعور اور نا قابل اعتنا ہو جاتا ہے، چنانچہ ایسے قلوب کے جو بے فکرے ہوں۔ قرآن نے انہیں عاقل نہیں کہا غافل کہا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ ① ''اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اسی سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے' ان میں سے ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں''۔

اس آیت کریمہ سے نمایاں ہے کہ برق و بخار اور بارش سے احیاء غبار (زمین) وغیرہ باوجود یکہ آنکھوں سے نظر آنے کی چیزیں ہیں جنہیں سب دیکھتے ہیں حتیٰ کہ چرند و پرند بھی اور ان سے اس دنیوی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خوف وطمع کا اثر بھی لیتے ہیں، لیکن فرمایا یہ گیا ہے کہ ان حوادث میں قدرت کی نشانیاں پنہاں ہیں اور ان ہی کی پہچان کرانا مقصود بھی ہے۔ وہ صرف عقل لڑانے والوں ہی کے لئے ہیں، آنکھ لڑانے والوں کے لئے نہیں اور عقل لڑانے کا نام ہی فکر کا استعمال ہے جو عقل کو کام پر لگاتا ہے، بے فکری اور بے توجہی سے عقلی تگ و تاز بھی عبث اور بے نتیجہ رہ جاتی ہے، بہر حال حس ہو یا عقل، ذوق ہو یا وجدان بلا فکر کے نابینا اور بے نگاہ سمجھے گئے ہیں جس سے فکر کا بلند مقام کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی انسان کو فکر و تدبر کی دعوت اور اس کا انداز ...... یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ مختلف دائروں میں انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دی ہے کہیں غور و فکر کے لئے انفسی آیات، کہیں شرعی اور علمی آیات سامنے رکھی ہیں اور کہیں وجدانی اور لدنی آیات اور ان میں تدبر اور غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے۔ انفسی آیات کی طرف رہنمائی کے لئے فرمایا ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ ② ''تمہارے اندر (خود دلائل معرفت) موجود ہیں کیا تم غور نہیں کرو گے؟''

کہیں آفاقی آیات پیش کیں جیسے ﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ③ ''کیا وہ آسمانوں اور زمین کے حقائق میں نظر (وفکر) نہیں کرتے؟''

کہیں ان دونوں نوعوں کو جمع کر کے فرمایا ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۴۔ ② پارہ: ۲۶ سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۲۱۔ ③ پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۸۵۔

اَنَّـهُ الْحَقُّ﴾ ① ''ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گردونواح میں بھی دکھادیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے''۔

کہیں شرعی آیات پیش کہیں اور قرآن حکیم کو غور و تدبر کے لئے پیش کیا۔ ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِغَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا﴾ ② ''کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے''۔

کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی حیات طیبہ کی شانوں اور پاکیزہ سیرت و کردار میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ تا کہ اس سیرت پاک کو دیکھ کر آپ کی دعوت کی صداقت دلوں میں آجائے اور لوگ اسے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں' فرمایا ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ﴾ ③ ''آپ فرمادیں اے پیغمبر! کہ میں تمہیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم دو دو اور فرادی فرادی اٹھو اور پھر فکر کرو کہ کیا واقعی تمہارے اس ساتھی (پیغمبر) میں کوئی دیوانگی یا جنون ہے؟ وہ تو اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ تمہیں آخرت کے شدید عذاب سے ڈرانے والے ہیں جو تمہارے سامنے آنے والا ہے''۔ ﴿اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ﴾ ④ ''کیا یہ فکر سے کام نہیں لیتے اپنے ساتھی (پیغمبر) کے بارے میں کہ کیا ان میں جنون ہے؟ وہ نہیں ہیں مگر ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے آخرت کے عذاب سے کیا یہ کسی مجنون کا کام ہے؟''

یہی صورت وجدانیات کی بھی ہے کہ حقائق غیبیہ کے انکشاف میں بھی یہی قلبی فکر کام کرتا ہے جس کو ''لب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس سے۔ منکشف شدہ علوم و معارف کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا کہ ﴿وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ ⑤ ''جسے حکمت دے دی گئی اسے خیر کثیر عطاء کر دی گئی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو گہری عقل والے ہیں''۔

حاصل کلام...... حاصل یہ ہے کہ مطلقاً عقل ایک طبعی غریزہ اور طبعی مادہ ہے، جیسے بینائی اور شنوائی وغیرہ، مگر وہ صورت عقل ہے جو مادۂ شعور ہے اور زیادہ سے زیادہ قیاس کے راستے سے کلیات کا ادراک کر لیتا ہے لیکن لب اور لباب حقیقت عقل ہے جس سے حقائق کونیہ اور حقائق شرعیہ منکشف ہوتی ہیں۔ اسی کا نام فکر ہے، یہ حکمت جسے خیر کثیر کہا گیا ہے۔ محض عقل طبعی سے برآمد نہیں ہوتی، بلکہ عقل عرفانی سے منکشف ہوتی ہے جسے لب کہا گیا ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے اس خاص قوت فکر کو جس کا تعلق قوانین الٰہی، معرفت خداوندی، حقائق نبوت اور اس کے ایوان کے انکشاف سے ہے جسے صبغت اللہ کہا گیا ہے۔ اسی کو کہیں فقہ قلبی سے، کہیں لب (عرفانی) کہیں نظر

---

① پارہ: ۲۵ سورة حم السجدة، الآیة: ۵۳. ② پارہ: ۵ سورة النساء، الآیة: ۸۲. ③ پارہ: ۲۲ سورة السبأ، الآیة: ۴۶.

④ پارہ: ۹ سورة الاعراف، الآیة: ۱۸۴. ⑤ پارہ: ۳، سورة البقرة، الآیة: ۲۶۹.

(باطن) سے، کہیں بصیرت سے اور انصباغ من اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسان کی ساری قوتوں، حواس عقل، وجدان عقل اور حدس و تجربے کو کام میں لگاتا ہے اور یہ صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے فکر کو انسان کا بنیادی جوہر قرار دے کر اس کا مصرف انفس و آفاق تشریع و تکوین اور کمالات ذات و صفات نبوی اور معرفت الٰہی کو بتلایا ہے اور جگہ جگہ اسی کی دعوت دی ہے اور ظاہر ہے کہ فکر و تدبر چشم بینا اور گوش شنوا کا کام نہیں، بلکہ قلب متفکر ہی کا کام ہے اور فکر ہی جب ان اعضاء حواس وغیرہ کی امام بنتا ہے تو وہ اس کی اقتداء میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور پھر فکر ان میں سے اصولی، کلی اور علمی مقاصد تک پہنچ کر معرفت حق کے مقام تک پہنچ جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام...... خلاصہ یہ کہ فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے۔ فکر ہی انسانی حقیقت کی فصل ممیز ہے، فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کی امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتی تو اجتہاد کا دروازہ کلیۃً مسدود ہو جاتا اور شرائع فرعیہ امت کے سامنے نہ آ سکتیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے۔ مگر اجتہاد کی جنس بہر حال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی، اس لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اگر اس بنیادی اصول بلکہ اصل الاصول کی طرف ہندوستان کے علمی حلقوں کی توجہ دلائی اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی دعوت دی اور ارباب علم و فضل کو انسانی اور ربانی حقائق کے اکتشافات کی طرف متوجہ کیا تو نہ صرف یہ کہ اس نے ایک بڑا بنیادی مسئلہ اٹھایا ہے، بلکہ خود جامعہ کی تاریخ کو بھی دہرایا ہے، کیونکہ جامعہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے رکھی تھی جس کا نصب العین ہی قدیم و جدید تعلیم کو یکجا کر کے ملت کی مختلف صلاحیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا تھا تاکہ فکر واحد کے راستے سے قوم کے ان دو گروہوں میں قدیم و جدید کی دوئی ختم کر کے انہیں افکار و خیالات اور عقائد و مقاصد کی وحدت سے قوم واحد بنا دیا جائے اس لئے بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس اقدام میں تبریک و تحسین کی مستحق ہے لیکن اس نئی نہضت اور فکر اسلامی کی تشکیل نو کے جذبات سامنے آنے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فکر کا علمی آغاز کس مرکزی نقطہ سے کیا جائے جس میں یہ تمام مذکورہ انواع جن کے لئے قرآن حکیم نے دعوت دی ہے سمٹ کر اسی مرکزی نقطہ کے نیچے جمع ہو جائیں اور کام بجائے پھیلنے کے سمٹ کر اس بنیادی نقطہ سے شروع ہو۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مرکزی نقطۂ منہاج نبوت...... اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی فکر کے لئے سب سے پہلی فکر ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہئے جس پر ہم اپنے فکر کی توانائیاں صرف کریں اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آ جائے گا بلکہ تشتت افزا اوہام و خیالات بھی خود بخود اس سے دفع ہوتے چلے

جائیں گے اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کے مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے جس کا نام منہاج نبوّت ہے۔ جس پر فکر کو مرکوز کر دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھی ہے اور ظلمتوں میں اجالا پھیلتا چلا گیا ہے۔ پس اس منہاج سے آج بھی آگے بڑھ سکتی ہے اس منہاج نبوّت کو سامنے رکھ کر ہمارے سامنے وہ مزاج آجائے گا جو اس امت میں نبی امت نے پیدا فرمایا ہے اور یہ واضح ہو جائے گا کہ خود اسلام کی تشکیل کا آغاز کس نوعیت سے ہوا کہ ہم اس کی فکر جدید کا آغاز بھی اس نوعیت سے کریں، نیز یہ بھی سامنے آجائے گا کہ اس کے ابتدائی مراحل سے گزر کر اور آخر کار اپنی انتہائی منزل پر پہنچ کر بحیثیت مجموعی اس امت کا مزاج کیسا بنایا؟ اور اسے کس ذوق پر ڈھالا؟

منہاج نبوّت کا امت کے مزاج اور ذوق کی تعمیر پر اثر...... غور کیا جائے تو اس منہاج نبوّت نے اصولی طور پر ہمیں دین کے بارے میں کمال اعتدال اور توسط کا راستہ دکھایا ہے۔ نہ تو اس نے ہمیں رہبانیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم عبادت اور دین داری کے نام پر دنیا کو کلیتہً ترک کر کے زاویہ نشین ہو جائیں۔ شہری آبادیوں تمدنی معاملات اور مدنیت کے سارے تقاضوں بلکہ خود اپنے سارے طبعی جذبات و میلانات کو بھی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں جا بیٹھیں کہ نہ گھر ہو، نہ در، نہ معاشرہ ہو، نہ معیشت ہو، نہ انسانی روابط ہوں، نہ قومی تعلقات، نہ موانست باہمی ہو، نہ اجتماعیت کہ یہ نہ اسلام کا مزاج ہے، نہ اس کا مطالبہ اور نہ ہی فطرت کا تقاضا۔ اس لئے اسلام نے اس کا نام رہبانیت رکھ کر اس کی برملا نفی کی ہے کہ "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" ① "اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں"۔

اور نہ ہی ہمیں بہیمیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم مدنیت کے نام پر عبادت الٰہی اور طاعت نبویؐ سے بیگانہ ہو کر کلیتہً نظام دنیا سنوارنے، اور جاہ و مال کے خزانے بٹورنے میں لگ جائیں اور راحت طلبی اور عیش کوشی میں غرق ہو جائیں اور ہماری زندگی کا نصب العین ہی ہوس رانی، حظ اندوزی اور ہوائے نفس کی غلامی کے سوا دوسرا نہ ہو، نہ عقائد رہیں نہ عبادات نہ فرائض رہیں نہ سنن نہ واجبات ہوں نہ ان کی لگن نہ قومی تربیت کا داعیہ رہے نہ صلہ رحمی اور خیر خواہی اور نہ اولاد و اقارب کا جذبہ، بلکہ دن رات ہوائے نفس کی پیروی، شبانہ روز لہو ولعب، عیش و طرب، و آرائش و آسائش اور نمائش و زیبائش، مالی تکاثر اور جاہی تفاخر ہی زندگی کا مشغلہ بن کر رہ جائے، سو اسے بھی اسلام نے نمائشی زندگی، متاع اور غفلت یا بالفاظ مختصر بہیمیت کہہ کر اسے امت کے قومی مزاج سے خارج کر دیا ہے۔

فرمایا: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ② ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ﴿ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ "اور دنیاوی زندگی

---

① قال الحافظ ابن حجر: لم اره بهذا اللفظ لكن في حديث سعد بن ابي وقاص عندالطبراني ان الله ابدلنا بالرهبانية الحنيفية السمحة دیکھئے: فتح الباری ج:۱۴ ص:۲۹۳. ② پاره:۳، سورة آل عمران، الآية:۱۸۵.

تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں اور آپ ان کو (ان کے حال پر) رہنے دیجئے کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے''۔

بلکہ اس افراط وتفریط سے الگ کر کے دنیا کو ترک کرانے کی بجائے اس کی لگن کو ترک کرایا ہے اور دین کو اصل رکھنے کے ساتھ اس میں غلو اور مبالغے سے روکا ہے۔ یعنی ایک ایسا جامع فکر دیا ہے جس میں دنیا کے شعبوں کو زیرِ استعمال رکھ کر ان ہی سے آخرت پیدا کی ہے، چنانچہ دنیا کو کھیتی بتلایا اور آخرت کو اس کا پھل۔ ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ.'' ① ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔

حاصل یہ نکلا کہ اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی بھی اتنی ہی ضروری ہے، اسلام کے ہر حکم میں جہاں اجرِ آخرت ہے وہیں حظِ دنیا بھی شامل ہے۔ مثلاً اگر مسواک میں ثوابِ آخرت ہے تو وہیں منہ کی خوشبو بھی پیشِ نظر ہے۔ اگر طیباتِ رزق میں بہ نیت حسنِ عبادت کی قوت رکھی گئی ہے۔ وہیں کام ودہن کے ذائقے سے بھی اجتناب نہیں بتلایا گیا ہے۔

اگر لباس میں بہ نیت آخرت اور غیرت حیاء اور سترِ عورت کا تحفظ اصل ہے تو وہیں حسنِ دنیوی اور وقار بھی ملحوظ ہے۔ اگر ازار کو ٹخنوں سے نیچا اور زمین سے گھسٹتا ہوا رکھنے کی ممانعت سے کبر ونخوت اور جاہ پسندی کے تخیل سے بچایا ہے تو وہیں لباس کو آلودگی اور گندگی سے پاک اور صاف رکھنے کی صورت اختیار کی گئی ہے جو دنیاوی مفاد ہے۔ اگر تختِ شاہی کا اصل مقصد عدل کے ساتھ تحفظِ ملک، خدمتِ خلق اور قومی تربیت بجوابد ہی آخرت اصل ہے تو وہیں اسے دنیوی وقار وعزت اور سیاست وقیادت کے حظوظ سے بھی بھرپور کیا گیا ہے بہرحال آخرت کی سچی طلب کے ساتھ دنیا کا کسب واکتساب بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ صائب نے اس ذوق کو کس خوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا۔

فکرِ دنیا کن اندیشہ عقبیٰ مگذار ۔۔۔ تا بعقبیٰ نہ رسی۔ دامنِ دنیا مگذار

غرض منہاجِ نبوت نے رہبانیت اور بہیمیت کے درمیان معتدل مزاج پر اس امت کو ڈھالا ہے، جس میں طبعی جذبات بھی پامال نہ ہوں بلکہ ٹھکانے لگ جائیں اور عقلی مقاصد کی تکمیل میں بھی فرق نہ پڑے اور وہ بروئے کار آجائیں، اس لئے اس منہاج کے عناصر ترکیبی تہذیبِ نفس، تدبیرِ منزل، سیاستِ مدن، تسخیرِ اقالیم، تعظیم امر اللہ، شفقت علی خلق اللہ، نظامِ اجتماعیت، جماعتی تنظیم ومرکزیت، اخلاق وایثار کی منظم تربیت، نظامِ عبادت اور نظامِ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس کے ساتھ فکرِ آخرت اور محاسبہ اخروی کا استحضار قرار پائے اور پوری قوم کو اسی رنگ میں رنگا گیا ہے تا کہ یہ قوم جامع دین ودنیا بن کر بجائے اس کے کہ دنیا کی اقوام کی جامد، مقلد اور مقتدی

① علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: لم اقف علیہ مع ایراد الغزالی له فی الاحیاء وفی الفردوس بلا سند عن ابن عمرؓ مرفوعاً: الدنیا قنطرة الآخرة فاعبروها ولا تعمروها. دیکھئے: المقاصد الحسنة ج: ۱ ص: ۱۱۸.

بنے، اسے خوددار بنا کر امام اقوام اور داعی حق وصداقت کی حیثیت دی گئی۔

جس طرح احمد مختار ہیں نبیوں میں امام ان کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

تشکیل جدید میں آج کی ضرورت...... پس آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس منہاج نبوّت کو سمجھ کر فکر اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب بیان سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں اسلامی فکر کی یہی تشکیل جدید ہوگی، ورنہ اس منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی جو قلب موضوع ہوگا، اس لئے تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے جدید ہوں اور دلائل قدیم تا کہ یہ تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الٰہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم ہے یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں اصول اور قوعد کلیہ اور ضوابطہ کی پابندی کی اہمیت...... اس تشکیل جدید کے سلسلے میں دوسرا قدم وہ اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاج نبوّت کے تمام عقائد واحکام واخلاق وعبادات اور معاملات واجتماعیات وغیرہ آئے ہیں، تا کہ ہماری تشکیل جدید کا سر چشمہ وہی اصول ہوں جن سے مسائل کی تشکیل قدیم عمل میں آئی تھی اور اس طرح قدیم وجدید کی تشکیل میں کوئی تفاوت یا بعد اور بیگانگی رونما نہ ہوگی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اصول کلیہ سے ہٹ کر یا انہیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی۔

اگر ایک شخص سائنس کی فکر کو مرتب یا حل کرنے کے لئے فن طب کے اصول سے کام لینے لگے جن کا سائنس کے اصول مسلمہ اور علوم متعارفہ سے کوئی تعلق نہ ہو یا منطق وفلسفہ کی فکر کی تشکیل کے لئے صرف ونحو کے اصول سے کام لینے لگے تو وہ کبھی اس تشکیل میں کامیاب نہ ہوسکے گا، اس لئے سب سے پہلے اسلامی فکر کی تدوین وترتیب میں اسلامی فکر کے اساسی اصول ہی کو سامنے رکھنا پڑے گا تا کہ ہماری تشکیل سے وہ ذوق فوت نہ ہونے پائے جو ان اساسی اصول میں پیوست کیا گیا ہے اور انہی سے شریعت کے قواعد ومقاصد تک پہنچا ہوا ہے یہ اصول وقواعد ہی درحقیقت منہاج نبوّت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، جس کا اثر پورے قانون شریعت میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر تشکیل جدید میں یہ قواعد واضوابط نہ رہیں تو وہ اسلامی فکر کی تشکیل نہ ہوگی صرف دماغی فکر کی تشکیل بن جائے گی۔

اصول وضوابط کے ساتھ جزئیات کے تعین کا مسئلہ...... البتہ ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کر دی ہیں، اس لئے ان میں تغیر وتبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔ البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی واجتماعی امور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے ادلتے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کئے ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے جن میں اصول وقواعد کے تحت توسعات ہوتے رہے ہیں اور

ہوتے رہیں گے، البتہ ایسے تغیرات کو چونکہ قواعد کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے۔ اس لئے ان میں بہر حال فنی استخراج کی ضرورت پڑے گی، جسے مبصر علماء کی بصیرت ہی حل کر سکے گی۔ جیسا کہ قرون ماضیہ میں کرتی رہی ہے۔ بس ایک مجتہد کو اجتہاد کی تو اجازت ہے ایجاد کی نہیں ہے کہ وہ اتباع کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے، خواہ یہ اتباع جزئیات کا ہو جبکہ وہ منصوص ہوں یا قواعد کلیہ کا ہو جب کہ وہ اجتہادی ہوں۔ جزئیات میں درحقیقت اتباع ان اصول اجتہاد ہی کا ہوتا ہے جس کے ذریعے یہ جزئیات باہر آتی ہیں۔ اس لئے اس تشکیل جدید کے موقع پر یہ کلیات و جزئیات سامنے رکھنی ناگریز ہوں گی اور انہی کے دائرے میں رہ کر یہ جدید تشکیل و ترتیب عمل میں آ سکے گی' نیز اگر اس تشکیل کا مقصد قومی تربیت ہے کہ افراد اس منہاج پر ڈھالے جائیں تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تربیت اصول اور کلیات سے نہیں ہو سکتی جیسے علاج اصول طب اور معرفت خواص ادویہ سے نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ مزاج کے جزوی احوال کو پہچان کر جزوی طور پر نسخہ نہ تجویز کیا جائے، یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ اگر قومی معالجہ اور قومی اصلاح پیش نظر ہو تو وہ محض اصول کلیہ سے نہیں ہو سکتی، بلکہ جزئیات عمل ہی سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اصولوں کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو وہ محض ذہن کی زینت ہوں عملی زندگی سے انہیں کوئی تعلق نہ ہو اور کوئی عملی پروگرام بھی ان کے پیچھے نہ ہو تو شریعت نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان میں زیادہ غور و خوض کیا جائے۔ مثلاً چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو قرآن نے اسلوب حکیم پر جواب دیا کہ اس کے منافع سے فائدہ اٹھاؤ ان کے حقائق کے پیچھے مت پڑو۔ ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّةِ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ (۱) ''آپ سے چاندوں کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے''۔

روح کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا دیا گیا کہ: تمہارا علم اتنا نہیں ہے کہ ان حقائق کو پہچان سکو تو کیوں اس ناقابل تحمل بات کے پیچھے پڑتے ہو۔ یہ حقائق یا خود ہی عملی ریاضت سے منکشف ہو جائیں گی یا اگر نہ ہوں تو قیامت میں تم سے ان کا کوئی سوال نہ ہوگا کہ نجات ان پر موقوف نہیں تھی۔ ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۲) ''آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے''۔ یا اسی طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرما دیا گیا کہ: تمہیں اس سے کیا تعلق تمہاری ترقی اور سعادت اس کے مقررہ وقت کے علم پر موقوف نہیں، صرف اس کے آنے کے یقین اور عقیدے پر موقوف ہے اور اس میں یہ جزوی تفصیلات شامل نہیں۔ ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا ○ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰھَا ○ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا﴾ (۳) ''یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب

(۱) پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۹۔ (۲) پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۵۔

(۳) پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۴۲، ۴۴۔

ہوگا، سواس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق اس (کے علم تعیین) کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے"۔

بہر حال قرآنی رہنمائی سے علم وہی مطلوب۔ اور قابل تحصیل ہے جس سے عملی زندگی میں کوئی سدھار پیدا ہوتا ہو اور سعادت دارین حاصل ہوتی ہو۔ حاصل یہ ہے کہ عملی زندگی محض اصول سے نہیں بنتی بلکہ جزئیات عملی سے بنتی ہے جس کی بروقت تمرین اور ٹریننگ دی جائے، اسی لئے کسی مربی نفس ربانی کی ضرورت ہے، ربانی کی تفسیر ابن عباسؓ نے "اَلَّذِیْ یُرَبِّی النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ ثُمَّ بِکِبَارِھَا" سے کی ہے۔ "یعنی ربانی وہ ہے جو ابتداء چھوٹی چھوٹی جزئیات سے لوگوں کی تربیت کرے"۔ اس لئے قرآن کریم نے تذکیر مواعظ اور امر بالمعروف کے نظام کو اجتماعی طور پر مستحکم کیا اور اسے تمکین فی الارض (حکومت وسلطنت) کی بنیادی غرض وغایت ٹھہرایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس منہاج پر ہم اپنی فکر کی توانائی صرف کریں وہ جہاں اصولی ہو وہیں وہ جزئیات عمل سے بھی بھر پور ہوتا کہ علم اور عمل دونوں جمع ہوسکیں کہ اس کے بغیر ہماری فکر اور اس کی تشکیل پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

حاصل مطلب...... حاصل یہی ہوا کہ فکر اسلامی کی ترتیب کے وقت جیسے اسلامی بنیادوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے ایسے ہی فقہ اور فقہی جزئیات کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ البتہ مناسب آج کے دور کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان جزئیات میں ترجیح وانتخاب جدا بات ہے۔ وہ اہل علم کا کام ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اصول کا تعارف اور ان کی جامعیت، وسعت نیز ان کے اندرونی مضمرات کی وضاحت ان کی جزئیات کے بغیر ممکن نہیں، نظری اصول کتنے بھی معقول اور دل پذیر ہوں لیکن جب تک ان کی عملی مثالیں سامنے نہ ہوں، ان کا حقیقی مفہوم واشگاف نہیں ہوسکتا ان جزئیات عمل ہی سے اسلام کی مجموعی اور صحیح صورت وشکل سامنے آسکتی ہے اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں جہاں ایک طرف مجموعہ دین کے اساسی اصول اور ان کے نیچے ہر ہر باب کے قواعد کلیہ یا ضوابط تفقہ ناگزیز ہیں وہیں دوسری طرف ان کے نیچے کی عملی جزئیات کا سامنے ہونا بھی لازمی ہے۔ ورنہ اصول کی وسعت وجامعیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔

فقہاء متقدمین کے استخراج جزئیات کی افادیت...... اس سے ہی ان حوادث، وواقعات پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے جو ان جزئیات کے استخراج کا باعث بنے جب کہ فقہاء امت نے قواعد شرعیہ سامنے رکھ کر ان کے بعید سے بعید محتملات کے احکام بھی ان قواعد سے نکالے، ظاہر ہے کہ ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانی ہوتی ہے گو حادثوں کی شکلیں حسب زمان مکان کچھ جدا جدا بھی ہوں، اس لئے وہی جزئیات آج کے حوادث میں بھی بیکار ثابت نہیں ہوسکتیں اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس ضرور کیا جاسکتا ہے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں سابق دور کی طرح کارآمد ثابت ہوں اور حالات کا پورا مقابلہ کرسکیں، ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش وجستجو کی ہوگی۔ بلکہ یہ جزئیات چونکہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہیں اس لئے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاج نبوت سے زیادہ قریب ہوں گی، اس لئے

بجائے اس کے کہ ہم از سر نو قواعد کلیہ سے جزئیات کا استنباط کر نیکی مشقت میں پڑیں یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش اور ترتیب میں وہ محنت و مشقت استعمال کریں پھر بھی اگر مفتی کو نئے استخراج ہی کی ضرورت داعی ہو تو جزئیات سابقہ ہی اس کا راستہ بہتر طریق پر ہموار کر سکیں گی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ جب یہ فقہی جزئیات کا ذخیرہ اصول سے جڑ ہوا سامنے آئے تو شاید ہمیں کسی نئے جزئیہ کے استخراج کی ضرورت ہی نہ پیش آئے کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ فقہاء امت نے اصول تفقہ اور قواعد شرعیہ کی روشنی میں بعید سے بعید محتملات تک کے احکام مستنبط کر کے جمع کر دیئے ہیں جس کے مجموعہ سے ایک مستقل فن بنام فقہ تیار ہو گیا جس میں ہر شعبہ زندگی کی بے شمار جزئیات موجود ہیں۔

اس لئے فکر جدید کی تشکیل میں قواعد کلیہ کے ساتھ ان جزئیات کو سامنے رکھنا از بس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ کو بھی کسی مرعوبیت یا اقوام کے طعن و استہزاء کی وجہ سے کبھی ترک کرنا گوارہ نہیں کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک بار بغداد (عراق) میں کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھانا کھلا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اسے فوراً اٹھا کر اس کی گرد جھاڑی صاف کیا اور تناول فرما لیا۔ غلام نے عرض کیا کہ یہ ملک متمدنوں دولتمندوں اور سیر چشموں کا ہے وہ اس حرکت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے فرمایا: ''أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِيْ لِهٰؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ.'' ''کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں؟'' غور کیا جائے کہ ایک طرف تو دین کے ایک ایک جزئیہ کی پابندی اور دوسری طرف ملکوں کی فتوحات، خلافت کی توسیع اور تسخیر اقالیم اور اس کے ساتھ متکبروں کا تمسخر وطعن، لیکن جو نشہ ان پاک ارواح میں فیضان نبوت سے پیوست تھا وہ اس قسم کے عوارض سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ آخر صحابہؓ سے زیادہ کون سنن دین کی جزوی جزوی پابندی میں پیش قدم تھا۔ مگر ان سے زیادہ پھر کون اسلامی فتوحات میں تیز قدم تھا، جس سے ایک طرف تو یہ واضح ہے کہ وقتی احوال و حوادث کے پیش نظر توسع اور ہمہ گیری کے معنی ذہنی ڈھیلے پن کے نہیں کہ قوموں کی رضا جوئی یا مجبوری یا آجکل کی اصطلاحی رواداری کے تحت اسلامی جزئیات میں مداہنت کی جاسکے۔

بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسلام نے اصول اس درجہ وسیع اور لچک دار رکھے ہیں کہ حوادث ان سے باہر نہیں جاسکتے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دین اپنے خاص مزاج اور اساسی پالیسی کے تحت نہ حوادث میں کبھی تہی دامن ثابت ہوا اور نہ اس نے کہیں اپنے اندر خلا محسوس کر کے سپر ڈالی۔ دوسری یہ بات بھی اس واقعے سے اور اس جیسے ہزاروں واقعات سے نمایاں ہے کہ اسلام روکھی اور سطحی قسم کا کوئی رسمی قانون نہیں بلکہ دین ہے۔ جس کی اساس کا بنیادی عنصر عشق و محبت ہے، جو ذات حق، ذات نبوی اور ذات صحابہؓ سے وابستہ ہے، اس لئے ایک سچا عاشق اپنے محبوب کی کسی ادا کو ایک آن کے لئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا، جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے یہاں ''حبیبی'' کا لفظ استعمال فرما کر

اس محبت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے،جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی جزئیہ کے ترک کرنے میں کوئی قانونی گنجائش بھی نکلتی ہو تو قانون عشق میں ایسی گنجائش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔اس لئے اسلامی مزاج میں یہ عشقی کیفیات بھی اسی طرح گھلی ہوئی ہیں جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے، جو ایک راسخ العقیدہ مسلم کو ہر ہر جزئیہ کا پابند کئے رہتی ہیں اور اس سے ایک انچ بھی نہیں ٹل سکتا،اس لئے تشکیل نو کے وقت اسلام کی اس خصوصیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی میں آزادی ضمیر اور حریت رائے کی حدود......لیکن اس انتہائی پابندی اور قیدوبند کے ساتھ ہی آزادی ضمیر اور حریت رائے بھی پوری فراخی کے ساتھ اسلام نے قوم کو بخشی ہے کہ ایک عام سے عام آدمی بھی اس قانون حق کے معیار سے مسلمانوں کے بڑے بڑے سربراہ پر روک ٹوک عائد کرسکتا ہے اور اسے عوام کی تنقید کو ماننے سے چارہ کار نہیں ہوتا،اس کے لئے سب سے بڑی نظیر نماز کی جماعت ہے،جس کا نام امامت صغریٰ ہے، جو کلیتہً امامت کبریٰ یعنی امامت وخلافت پر منطبق ہے، وہاں اگر امام اور امیر ہے تو یہاں بھی امام ہے۔وہاں اگر جہاد میں ہر نقل وحرکت پر نعرہ تکبیر ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر امام کے حق میں سمع وطاعت فرض ہے تو یہاں بھی ہے۔وہاں اگر مجاہدین کی صفیں مرتب اور سیدھی ہونی ضروری ہیں تو یہاں بھی یہی ہے، وہاں اگر میمنہ اور میسرہ ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر صفوف میں شگاف آجانا ناکامی کی علامت ہے تو یہاں بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔اس لئے امامت صغریٰ (جماعت صلوٰۃ) کے جو طور طریق رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامت کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں،اس صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کا مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو اس کی نماز ہی صحیح نہیں ہوسکتی۔چنانچہ اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ میں مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کر کے ہاتھ باندھیں، وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں، وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں، وہ سجدہ میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہوجائیں وہ ولا الضالین کہے تو یہ آمین کہیں، حتیٰ کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزوی غلطی بھی ہوجائے اور وہ سجدہ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی اس فکری خطاء میں ساتھ دیں اور سجدہ سہو کریں۔

لیکن حریت وآزادی یہ ہے کہ اگر امام قرات یا افعال صلوۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کرجائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرلے یا قرات صحیح نہ کرے یا کسی رکن میں غلطی ہوجائے اور اسے درست نہ کرلے، چنانچہ امام کی غلطی پر ہر ایک مقتدی پیچھے سے تکبیر وتسبیح کی آوازوں سے اس طرح متنبہ کرتا ہے اور کرنے کا حق رکھتا ہے کہ امام غلطی کی اصلاح پر مجبور ہوجائے۔

بعینہ یہی صورت امامت کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیر المومنین کی سمع وطاعت تو ہر معاملے میں واجب ہے ورنہ تعزیر وسزا کا مستحق ہوگا۔لیکن ساتھ ہی خود امیر کی کسی خطاء ولغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے، جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کرلے یا اس کا کوئی عذر سامنے نہ رکھے۔ فاروق اعظمؓ پر ایک اعرابی نے اس وقت اعتراض کیا جب کہ وہ بحیثیت امیر المومنین ممبر پر کھڑے۔ہوکر

خطبے میں اعلان فرما رہے تھے، ''لوگو! امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو۔'' اعرابی نے کہا کہ ہم نہ بات سنیں گے نہ اطاعت کریں گے۔ فرمایا کیوں؟ کہا مالِ غنیمت میں آپ کا حصہ عام لوگوں کی طرح صرف ایک چادر تھی، حالانکہ آپ کے بدن پر اس وقت دو چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا (عبداللہ بن عمر) دے گا، صاحبزادے نے فرمایا کہ امیر المومنین کا قد لانبا تھا، ایک چادر کافی نہ تھی اس لئے میں نے اپنی چادر پیش کر دی، وہی ان کے بدن پر ہے جو انہوں نے آج استعمال کی ہے، تب اعرابی نے کہا کہ: اب ہم بات سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ بہرحال منہاجِ نبوّت کے مزاج کی رو سے عمل میں تو یہ تقیید اور پابندی ہے کہ اس کے کسی کلیہ جزئیہ میں ڈھیلا پن گوارا نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ ایک عام آدمی کو بھی امیر المومنین تک پر کسی محسوس قسم کی فروگزاشت کے بارے میں اعتراض کا حق دیا گیا۔ لیکن حریتِ رائے اور اصول کے تحت آزادی بھی انتہائی ہے جو حقیقی قسم کی جمہوریت کی پردہ دار ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصول و قوانین کی یہ پابندی اور ان میں زندگی کو مقید کر دینا کوئی قید و بند نہیں جو ذہنوں پر شاق ہو، جب کہ ان ہی اصولوں کی پابندی سے اسلام اور اسلامی قوم عالمگیر بنی۔

اسلام اور اسلامی اصول کی عالمگیریت پر واقعاتی حقیقت کے شواہد...... آخر جب ہم اسلام کے حق میں ایک عالمگیر دین کے مدعی ہیں تو اس ہمہ گیری کے معنی ان کے انہی اصولوں کی ہمہ گیری کے تو ہیں، اگر وہ تنگ اور جامد ہوتے تو اسلام عالمگیر تو کیا عرب گیر بھی نہ ہو سکتا، لیکن جب انہیں اصول پر صدیوں ہمہ گیر حکومتیں بھی چلیں اور انہی اصول سے تربیت پا کر قوم میں عظیم عظیم شخصیتیں بھی ابھریں جنہوں نے مشرق و مغرب کو روشنی دکھائی اور ظلمتوں کی تنگنائیوں میں پھنسی ہوئی قوموں، نسلوں اور وطنوں کو ان کی مصنوعی حدبندیوں سے نکال کر انسانیت کے وسیع میدانوں میں پہنچایا تو کیا یہ اصول کی تنگیوں سے ممکن تھا۔ اس لئے فطری اصول اور فطرت کی پابندی کو قید و بند اور تنگی سمجھا جانا ذہنوں کی تنگی کی علامت ہو سکتا ہے۔ فطرت کی تنگی نہیں کہلایا جا سکتا۔ بالخصوص جب کہ ان اصولوں کی وسعتوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان سے ہر دور کے مفکر اور اہلِ علم و فضل نے استخراجِ مسائل کی حد تک بھی کام لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں۔ جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے ہدایت کا سامان موجود ہے۔

اس لئے تمدن و معاشرت کی مشخص عملی جزئیات اور سننِ زائدہ پر اس قانونِ فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا، بلکہ اس کو وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے، ہر زمانے میں جو نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں انہیں اہلِ علم ان کے اصول سے وابستہ کر کے ان کے احکام نکال سکتے ہیں، جیسا کہ مفکرانِ باب فتویٰ کا اسوہ اس بارے میں سامنے ہے۔ بالخصوص مسائل کے طرزِ استدلال کے بارے میں تو خاص طور پر ہر قرن جدید میں نئے رنگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ایک دور میں نظری فلسفہ نے رنگ جمایا اور دین کے بارے میں محض نقل و روایت لوگوں کے لئے تسلی بخش نہ رہی جب تک وہ عقلی چولے میں نہ آئے تو رازیؒ و غزالیؒ جیسے حکمائے ملت نے دین کو فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے لوگوں پر حجت تمام کی، ایک دور میں تصوف اور حقائق پسندی کا غلبہ ہوا تو ابن عربیؒ وغیرہ نے صوفیانہ اور

عارفانہ انداز سے اسلام کو نمایاں کیا۔ ایک دور میں معاشی فلسفہ کا زور ہوا تو شاہ ولی اللہؒ جیسے حکیم امت نے نظری و معاشی رنگ کے فلسفیانہ دلائل سے اسلام کو سمجھایا اور وقت کے مسائل حل کئے۔ ایک دور سائنسی اور مشاہداتی فلسفے کا آیا تو بانی دارالعلوم (دیوبند) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے محقق اور عارف باللہ نے اسلامی عقائد و اصول کو شواہداتی رنگ میں حسی شواہد و نظائر پیش کر کے اتمام حجت فرما دیا۔ جس سے ایک طرف اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت واضح ہوئی تو دوسری طرف اس کا توسع کھلا اور اس کے رنگ استدلال کی یہ لچک بھی واضح ہوئی کہ اس کے حقائق پر ہمہ نوع دلائل کا لباس سج جاتا ہے اور حقیقت بدستور حقیقت رہتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس میں یہ سارے الوان اور سارے نہج موجود ہیں جس سے ہر رنگ کا لباس زیب زدہ ثابت ہو جاتا ہے جو در حقیقت خود اس کا رنگ ہوتا ہے۔ البتہ حالات اور وقت کے تقاضے صرف اجاگر کر دیتے ہیں۔

دور جدید کی عملی و نظریاتی خصوصیات اور اسلامی قوت و شوکت...... آج کا دور سیاسی اور معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستوں اور معاشی فلسفوں کے غلبہ کا ہے، مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو۔ ان حالات میں جب تک کسی دینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے عوام کے لئے قابل التفات نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ نہ ہوگا۔ بلکہ اسی کے اندر کا ہوگا، حالات متحرک ہوں گے اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی پیکر اس تحریک سے نمایاں ہو کر اسلام ہی کی سیاست و اجتماعیت کے اصول و قوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں، جنہوں نے دین و دنیا کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نمود اسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب و سنت اور فقہ فی الدین کے انوار شامل تھے، البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کے حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے لیکن ان کے عملی کارناموں سے سے کوئی سبق نہیں لیا اگر قوم اپنے نظریات قائم رکھ کر آج کے عملی میدانوں میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت و شوکت دکھلا سکتی تھی جو اب سے پہلے دکھلا چکی ہے اور دنیا اس کی تقلید پر مجبور ہوتی نہ کہ قصہ برعکس ہو جاتا۔

دور جدید میں دینی مزاج کے مطابق فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا واحد طریق عمل...... بہر حال اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اصول، اسلامی مزاج اور نبوت کا منہاج بجنسہٖ قائم رکھ کر جس میں دیانت و سیاست اور عبادت و مدنیت بیک وقت جمع ہے۔ وقت کے مسائل کو نئی تشکیل و ترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہوگی جبکہ اس میں فقیہ المزاج شخصیات، اسلامی اصول کی روشنی اور جزئیات عملیہ کی رعایت، اسلامی مزاج کی برقراری، سلف صالحین کا اسوہ،

مرادات خداوندی کے ساتھ تقید، رضاء حق کی پاسداری، اجتماعی اصلاح وفلاح، اخروی نجات کی فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جائیں گی تو بلاشبہ ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' دینی ہی رنگ کے ساتھ منظر عام پر آ جائے گی۔ مگر اسی کے ساتھ ان منتخب شخصیات میں جہاں اس دینی فکر اور تفقہ مزاجی کی ضرورت ہے۔ جس کی تفصیل عرض کی گئی، وہیں اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مزاج اور وقت کو بھی پہچانتے ہوں۔ عصری حالات اور وقت کی ضروریات بھی ان کے سامنے ہوں، علوم عصریہ میں انہیں مہارت وحذاقت میسر ہو، دنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن کو بھی وہ سمجھتے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں کیونکہ حالات ہی اصل محرک فتاویٰ ہیں۔ اگر یہ منتخب شخصیات شرعیات کی خوگر ہوں لیکن عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت و مہارت کی حامل ہوں، عموماً اور اکثر وبیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناں گوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرین عصریات اکثر وبیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقے پر ڈال دیا جائے تو علماء کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابل وثوق ہوگی لیکن ممکن ہے جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی اور دوسری طرف ماہرین عصریات جبکہ عامۃً دینی مقاصد اور اسلام کے شرعی موقفوں کا زیادہ علم نہیں رکھتے اور قوم کے دینی مزاج سے کچھ بیگانہ بھی ہیں، اگر فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار محض انہی کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کی حد تک وہ ماہرین شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی بہر دو صورت تشکیل جدید کا خاکہ ناتمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اس تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمام تمدنی، معاشرتی اور سیاستی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائرے میں غور فکر اور باہمی بحث وتمحیص سے کسی فکر واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع فکروں کو کتاب وسنت اور اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لئے ہوئے ہوگی۔ جس میں دینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے گا اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا' نیز ایک طبقہ ہدف طعن و ملامت نہ بن سکے گا اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان سد راہ نہ ہوگا۔

تشکیل جدید کرنے والے مفکرین کے لئے ایک امر لازم...... البتہ مفکرین کو یہ ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اسلام کوئی رسمی اور دنیوی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس میں دنیا کے ساتھ آخرت بھی لگی ہوئی ہے اور ہر عمل میں خواہ وہ فکری ہو یا عملی، جہاں انسان کی دنیوی زندگی میں شائستگی کی رعایت رکھی گئی ہے اور انہیں تنگی اور ضیق وحرج سے بچا کر ہمہ گیر سہولتیں دی گئی ہیں۔ وہیں رضاء خداوندی اور آخرت کی جوابدہی بھی ان پر عائد کی گئی ہے۔ اس

لئے اسے محض دنیوی قوانین اور صرف معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر حوادث کا آلہ کار بھی نہیں بننے دیا گیا ہے، کیونکہ احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے، حال کے معنی ہیں ''مَاحَالَ فَقَدْ زَالَ'' کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگیا) پس حال تو بدلنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے لیکن اصول فطرت بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے البتہ ان شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں ضرور رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کرسکیں، اس لئے مفکر کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات اور نئے حوادث کو سامنے رکھ کر ان جزئیات کے مسائل کو سامنے لے آئے جو اس حادثہ کے بارے میں منہاج نبوت نے اصولاً یا جزءً وضع کئے ہیں اور ان پر منطبق کئے ہیں، پس مفکر، دانشور یا مبصر، مفتی کا کام حادثہ اور مسئلہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ دونوں میں تطبیق دے دینا ہے۔ نہ حالات سے صرف نظر کرنا ہے نہ مسائل سے قطع نظر کر لینا ہے اس لئے شریعت نے تمدنی اور معاشرتی احوال کی حد تک زیادہ تر قواعد کلیہ ہی سامنے رکھے ہیں نئی جزئی صورتوں کی تشخیص نہیں کی ہے کہ وہ ہر دور میں نئے نئے رنگ میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

سیاسی ''ملل ونحل'' کی تدوین کی ضرورت واہمیت...... فی زمانہ اسلامی مسائل میں انتشار یا ان کے بارے میں شکوک وشبہات کی بوچھاڑ کا سرچشمہ سب جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس سے زیادہ آج کے سیاسی نظریات دماغوں پر مذہب کے رنگ سے چھائے ہوئے ہیں۔ آج مسلک اور ازم بن رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی اور معاشی قوانین تیار ہورہے ہیں تو سیاسی اور معاشی، حتیٰ کہ عقائد بھی بن رہے ہیں تو وہ بھی سیاسی اور معاشی، چنانچہ سیاسی نظریات کے بارے میں اصطلاح بھی ٹھہرگئی ہے جو مذہب اور دین کے بارے میں رائج تھی کہ ہم فلاں نظریہ پر یقین رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایمان لاتے ہیں جو کسی دور میں دینی عقائد کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اس لئے آج ایک سیاسی ''ملل ونحل'' کی تدوین کی بھی اشد ضرورت ہے۔ جس میں سیاسی مذاہب کے عقائد وافکار کو تقابلی رنگ سے سامنے رکھ کر اسلام کے اجتماعی مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا جائے جس کے لئے چند مفکر عالم اور چند مفکر گریجویٹوں کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ قدیم زمانہ کے ''ملل و نحل'' اس دور کے پیدا شدہ مذہبی عقائد اور افکار کے پیش نظر مرتب ہوئے تھے۔ جب کہ دلوں پر سیاست کے ٹھپے لگے ہوئے نہیں تھے اب عصر حاضر کے سیاسی عقائد وافکار کو سامنے رکھ کر اسلام کے سیاسی اجتماعی اور معاشرتی مسائل کو دلائل وشواہد سے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

خوشی ہے کہ جامعہ اسلامیہ نے آج جب فکر اسلامی کی تشکیل نو کا مسئلہ اٹھایا ہے تو ممکن ہے کہ سیمینار کے ثمرے کے طور پر اس سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی رنگ کی ''ملل ونحل'' کی مضبوط بنیاد بھی پڑجائے۔ حدیث اور فقہی کتب میں معاشرتی تمدنی اور اجتماعی مسائل کی جو نوعیں ابواب وفصول کے ساتھ جن جن عنوانوں سے پائی جاتی ہیں وہ اپنی جامعیت اور اصولیت کی وجہ سے اپنے متعلقہ مسائل کی جزئیات پر کلیتہً حاوی ہیں اور ان میں فقہاء

امت کے دل ودماغ کا نچوڑ سمایا ہوا ہے اس لئے اگر ان عنوانات کے تحت کام کیا جائے اور آج کے معاشرتی، سیاسی اور تمدنی مسائل کو تقابلی انداز سے سامنے رکھ کر عملی اور فکری سعی کا محور بنایا لیا جائے تو اس میں تمام وقتی مسائل بھی آجائیں گے اور دوسرے مہم مسائل بھی شامل ہو جانے کی وجہ سے ایک بہترین سیاسی ''ملل ونحل'' تیار ہو جائے گی جو جامعہ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی توقع رکھنی چاہئے کہ یہ سعی چند زبان زد مسائل مثلاً بینک کاری، اسٹاک ایکسچینج وسودی معاملات یا انشورنس وغیرہ وغیرہ جیسے مالی اور تجارتی مسائل تک ہی محدود نہ رکھی جائے گی۔ کیونکہ جب فکرِ اسلامی کے بارے میں قدم اٹھایا جا رہا ہے تو وہ بھرپور اٹھنا چاہئے جس میں اس قسم کے تمام مسائل کا ایک ہی بار فیصلہ کر دیا جائے۔

امید ہے کہ اس تشکیل کے سامنے آجانے پر یہ شبہ بھی حل ہو جائے کہ آیا اسلام میں جمود ہے یا ذہنوں میں جمود ہے، جسے اسلام کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ اسے توڑنے والا خود اسلام ہے، جیسا کہ اس نے تیرہ صدیوں میں کتنے ہی جامد ذہن اقوام کا جمود توڑا ہے۔ اسلام نے اپنے اصولِ فطرت میں ماننے والوں کو محدود کر دیا ہے جس کے معنی جمود کے سمجھے جا رہے ہیں۔ لیکن اصولِ فطرت میں محدود رہنا جمود نہیں بلکہ جمود شکن ہے۔

اسلامی مزاج اور منہاجِ نبوّت کے اساسی اصول ..... منفی پہلو

1 ..... لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ. ''اسلام بغیر جماعت نہیں یعنی اسلام کا مزاج اجتماعیت پسندانہ ہے انفرادیت پسندانہ نہیں''۔

2 ..... لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ. ''یعنی دین کے بارے میں اسلام کا مزاج اختراع پسندی اور جدت طرازی کا نہیں بلکہ اتباع پسندی ہے۔ نیز گوشہ گیری اور انقطاعیت پسندی کا نہیں بلکہ عام مخلوق میں ملے جلے رہ کر کام انجام دینے کا ہے''

3 ..... ﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (۱) ''یعنی اسلام کا مزاج دین میں جبر واکراہ اور تشدد کا نہیں بلکہ نرمی ومحبت کے ساتھ حجت وبرہان سے حق واضح کر دینے کا ہے۔ ماننا نہ ماننا کلیتہً مخاطب کا اختیاری فعل ہے''۔

4 ..... لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْإِسْلَامِ. (۲) ''یعنی اسلام کا مزاج تخریبی یا ضرر رسانی نہیں بلکہ تعمیری اور نفع رسانی کا ہے''۔

5 ..... لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ فِي الْإِسْلَامِ. (۳) ''یعنی اسلام کا مزاج توہم پسندانہ نہیں کہ شگون یا ٹونے ٹوٹکے یا کسی کی بیماری کسی کو لگ جانے کا تخیل باندھ لینا اس کے یہاں معتبر ہوں بلکہ حقیقت پسندانہ ہے کہ امور واقعیہ ہی

---

(۱) پارہ: ۳، البقرہ: ۲۵۶.

(۲) السنن الامام الدارقطني، باب في المرأة تقتل اذا ارتدت، ج: ۴ ص: ۲۲۷ رقم: ۸۳.

(۳) الصحيح لمسلم، كتاب السلام، باب لاعدوى ولاطيرة، ج: ۴ ص: ۱۷۴۳ رقم: ۲۲۲۰.

اس کے نزدیک معتبر ہوتے ہیں۔خواہ وہ حسی اسباب سے ظہور پذیر ہوں یا معنوی اسباب سے تخیلاتی اور توہمانی خطرات ووساوس اس کے نزدیک اسباب نہیں ہیں کہ حوادث کا ان سے تعلق ہو“۔

6 ...... انالا نولی ھذا من سالہ ولا من حرص علیہ. ① ”یعنی اسلام کا مزاج طالب عہدے کو عہدہ نہ دینے کا ہے۔گویا عامۂ عہدوں کی طلب خود غرضی کی دلیل ہوتی ہے اور خود غرض انسان اپنی اغراض کی تکمیل میں مشغول رہ کر فرائض منصبی میں عادۃً قاصر رہتا ہے“۔

7 ...... ﴿لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ② ”یعنی اسلام کا مزاج کسی پر اس کی طاقت کے قدر بار ڈالنے کا ہے خواہ انسان ہو یا حیوان زائد از طاقت بوجھ رکھنا اس کے نزدیک ظلم ہے“۔

8 ...... لَيْسَ مِنَّامَنْ غَشَّنَا ③ ”یعنی اسلام کا مزاج گندم نمائی جوفروشی اور نمائشی خوبصورتیاں دکھلا کر وغل فصل کا نہیں بلکہ حقیقت پسندی اور حقیقت نمائی کا ہے“۔

9 ......﴿وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾ ④ ”یعنی اسلام کا مزاج تصنع، بناوٹ یا نمائش پسندی کا نہیں، بلکہ سادگی سچائی اور ظاہر و باطن کی یکسانی کا ہے“۔

10 ......﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ ⑤ ”یعنی اسلام کا مزاج شخصیاتِ مقدسہ کے نام پر تعصب، تنگی، حد بندی اور گروہ سازی کا نہیں بلکہ ان کی ہمہ گیر توقیر و تعظیم کے ساتھ بین الاقوامی طور پر اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور عالم انسانیت کو متحد کرنے کا ہے“۔

11 ......﴿لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ ⑥ ”یعنی اسلام کا مزاج دل چھوڑ کر بیٹھ رہنے اور بزدلی اور کم ہمتی دکھلانے کا نہیں بلکہ عزیمت اور قوت یقین کے ساتھ عالی حوصلگی اور ہمت مردانہ دکھلانے کا ہے“۔

12 ......﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ﴾ ⑦ ”یعنی اسلام کا مزاج کتنی بھی مشکلات کا ہجوم سر پر آ جائے مایوسی کا نہیں بلکہ امید بھروسہ اور اللہ پر اعتماد کے ساتھ ثبات و استقلال اور آگے بڑھتے رہنے کا ہے مایوسی اس کے نزدیک

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب مایکرہ من الحرص علی الامارۃ ج:۲۲ ص:۲۰ رقم:۶۶۱۶۔

② پارہ:۳سورۃالبقرۃ، الآیۃ: ۲۸۶۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ من غشنا ......ج: ۱ ص: ۹۹ رقم:۱۰۱۔

④ پارہ:۲۳ ،سورۃ ص،الآیۃ:۸۶۔

⑤ پارہ:۳، سورۃالبقرۃ، الآیۃ:۲۸۵۔

⑥ پارہ:۴،سورۃآل عمران،الآیۃ:۱۳۹۔

⑦ پارہ:۱۳ ،سورۃ یوسف،الآیۃ:۸۷۔

کفر کا شعبہ ہے"۔

13 ......﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ ① "یعنی اسلام کا مزاج دین کے بارے میں ضیق اور تنگی کا نہیں بلکہ فراخی کا ہے۔ معذور کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مناسب حال راہ نکال دی جاتی ہے"۔

14 ......لَنْ يُشَادَّ الدِّينَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ ② "یعنی اسلام کا مزاج دین میں غلو، مبالغہ اور تحمل بیجا کا نہیں ورنہ دین اسے ہٹا دے گا بلکہ اعتدال کے ساتھ بقدر طاقت بوجھ اٹھانے کا ہے۔ توسط و اقتصاد ہی اس کا بنیادی اصول ہے"۔

15 ......﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ③ "یعنی اسلام کا مزاج دوست اور دشمن میں یکساں انصاف ہے جانبداری یا بے جا رعایت یا خویش نوازی اس کے یہاں خلاف عدل اور خلاف تقویٰ ہے"۔

16 ......﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ ④ "یعنی اسلام کا مزاج عمل پر ابھارنا ہے کہ ہر ایک کو اسی کی سعی کام دے گی، دوسرے کی محنت کام نہ آئے گی تا کہ آدمی دوسروں پر تکیہ کر کے معطل نہ ہو بیٹھے، ہمت سے خود آگے بڑھے"۔

مثبت پہلو...... یہی صورت اسلام کے اساسی اصول میں مثبت ضابطوں کی بھی ہے، جس سے اسلام کا مزاج کھلتا ہے مثلاً

1 ......﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ ۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ ۢ بَيِّنَةٍ﴾ ⑤ "یعنی اسلام کا مزاج حجت پسندی، حجت طلبی اور تحقیق حال کا ہے جذبات پسندی یا محض شبہات یا قرائن بے تحقیق کسی کو انعام یا انتقام دینے کا نہیں"

2 ......﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَّاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ ⑥ "یعنی اسلام کا مزاج صلح جوئی اور امن پسندی کا ہے۔ لڑائی جھگڑا شر انگیزی اور فتنہ جوئی کا نہیں نیز اس کا مزاج احسان اور جود و کرم کا ہے۔ بخل، تنگی اور جزرسی کا نہیں"۔

3 ......﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ ⑦ "یعنی اسلام کا مزاج انتقام پسندانہ نہیں بلکہ کریمانہ اور مصائب یا ایذا رسانیوں پر صبر و تحمل اور عفو و درگزر کا ہے۔ اس کو اس نے اولوالعزمی کہا ہے"۔

4 ......﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ⑧ "یعنی اسلام کا مزاج باہمی بھائی بندی اور ملنساری کا ہے اجنبیت پسندی اور بیگانہ روش کا نہیں"۔

5 ......"اِنَّ النَّاسَ كُلُّهُمْ اِخْوَةٌ." "یعنی اسلام کا مزاج عام بھائی چارے کا ہے کہ تمام انسان بھائیوں کی

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۷۸۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر ج: ۱ ص: ۶۹ رقم: ۳۸۔

③ پارہ: ۶، سورۃ المآئدۃ، الآیۃ: ۸۔

④ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹۔

⑤ پارہ: ۹ سورۃ الانفال، الآیۃ: ۴۲۔

⑥ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۲۸۔

⑦ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷۔

⑧ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۰۔

طرح رہیں خواہ کوئی بھی قوم ہو اور کسی بھی مذہب کی ماننے والی ہو۔غلام سازی یا استحصال عوام یا گروہ سازیوں کے ذریعے بھائی کو بھائی سے جدا کر دینے کا نہیں ہے"۔

6 ......﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ ① "یعنی اسلام کا مزاج پورے عالم انسانیت کے احترام وتحفظ کا ہے انسانیت کی تحقیر وتذلیل اور لاپرواہی سے اس کے ضائع ہو جانے پر قناعت کر لینے کا نہیں"۔

7 ......﴿وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ، وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا، أُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا﴾ ② "یعنی اسلام کا مزاج خلط والتباس یا حق و باطل کو مخلوط کر دینے یا اقوام کی رضا جوئی کی خاطر حق و باطل کو جمع کر کے بین بین راہیں نکالنے کا نہیں بلکہ حق و باطل کو نکھار کر متمیز کر دینے کا ہے"۔

8 ......﴿اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾ ③ "یعنی اسلام کا مزاج دائرہ حق (اسلام) میں پورے داخل کرانے یک رخی کے ساتھ دلوں کو سکون واطمینان بخشنے کا ہے۔ناتمام اور ادھ کچرے کام سے دلوں کو ڈانواں ڈول کر دینے کا نہیں"۔

9 ......﴿أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا﴾ ④ "یعنی اسلام کا مزاج امانت داری اور امانت سپاری کا ہے بددیانتی خیانت پسندی یا غل فصل کا نہیں"۔

10 ......﴿وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ⑤ "یعنی اسلام کا مزاج اجتماعی امور میں استواری نظام اور قیام امارت پر امیر کے حق میں سمع و طاعت کا ہے اگر چہ ایک حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے لامرکزیت یا فوضویت اور بے مرکز جمہوریت اسلام کا مزاج نہیں یہ انتشار پسندی ہے"۔

11 ......﴿كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ﴾ ⑥ "یعنی اسلام کا مزاج ہر ایک کو اپنے ہی عمل پر ابھارتا ہے تاکہ دوسروں پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائے"۔

12 ......﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ ⑦ "یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ کوئی اپنی نسبت یا نسب یا انتساب پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائے جس نے جو کچھ کیا ہے وہ ضرور اس کے آگے آئے گا"۔

13 ...... ثَلٰثَةٌ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ (وَمِنْهُمْ) مُتَّبِعٌ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً جَاهِلِيَّةً. ⑧ "یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ

① پارہ:۶،سورۃ المائدۃ،الآیۃ:۳۲.
② پارہ:۶،سورۃ النساء،الآیۃ:۱۵۰.
③ پارہ:۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۲۰۸.
④ پارہ:۵،سورۃ النساء،الآیۃ:۵۸.
⑤ پارہ:۳،سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۲۸۶.
⑥ پارہ:۲۷، سورۃ الطور،الآیۃ:۲۱.
⑦ پارہ:۴،سورۃ النساء،الآیۃ:۱۲۳.
⑧ کنز العمال،ج:۱۶ ص:۵۸.

جاہلیت کی جن رسوم کو اس نے مٹا دیا ہے ان کا اعادہ یا نئی پگڈنڈیاں نکالنا اس کے لئے قابلِ برداشت نہیں کہ یہ خود اسلام کی تخریب ہے''۔

14 ......﴿مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ ① ''یعنی اسلام کا مزاج رسالت کی پیروی کرانا ہے۔ قانونِ حق میں ایجاد اختراع کرانا نہیں''۔

15 ......''اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ'' ② اور ''اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ.'' ③ ''یعنی اسلام کا مزاج ہر عمل کو خواہ عبادۃ ہو خواہ عادۃ، اخروی بنانا ہے، دنیا پر ختم کر دینا نہیں ہے نہ دنیاوی مفادات کو اصل رکھنا ہے، مگر دنیا ترک کرانا بھی نہیں بلکہ اسے اختیار کر کے اس میں سے آخرت نکلوانا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کو کھیتی کہا ہے، پس اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی کرنا بھی ضروری ہے ورنہ پھل نہیں مل سکتا، پس اسلام کے مزاج میں ترکِ دنیا نہیں بلکہ ترکِ محبتِ دنیا ہے اس لئے یہ ساری دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے تو وہ معطل نہیں چھوڑی جا سکتی اور انسان آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو اسے محض دنیا پر نہیں چھوڑا جا سکتا''۔

خلاصۂ اصول...... بہرحال کتاب و سنت کے یہ چند اساسی اصول جیسے اجتماعی، انفرادی، شخصی، جماعتی مرکزیت، امارت، سمع و طاعت، تفویض، عہدہ جات کی نوعیت، عوام کا طرزِ تربیت، اخلاقی بلندی، عملی جوش، معاشرت کا ڈھنگ، دین کی وسعت، خلط والتباس سے اس کا بالاتر ہونا، بدعات و محدثات سے گریز، اتباعِ رسالت، اخوت، ہمدردی، بے لوث عدل و انصاف، خدمتِ خلق، دنیا کا آخرت سے ربط اور آخرت کی مقصودیت وہ امور ہیں جن سے منہاجِ نبوت کا ذوق اور اسلام کا مزاج کھل کر سامنے آتا ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں جو سرسری طور پر ذہن میں آئیں ورنہ کتاب و سنت ان جیسے سینکڑوں اصول سے بھری ہوئی ہیں۔ ہمیں اپنی تشکیلِ نو میں ان سب کو بہرحال سامنے رکھنا ہے۔

تشکیلِ جدید میں سب سے زیادہ اہم قدم رجالِ کار کا انتخاب...... لیکن ان اقدامات میں سب سے زیادہ اہم قدم یا چوتھا قدم رجالِ کار کا انتخاب ہے جو دین کے مبصر اور فقیہانہ شان رکھتے ہوں۔ بحیثیت مجموعی دین کے اصول و فروع ان کے سامنے ہوں۔ اسلام کی حقیقی روح ان کی روحوں میں پیوست ہو اور اسلام کی وہ حکمتِ عملی اگر رجالِ کار ناواقف یا غیر فقیہہ یا غیر مبصر اور اسلام کی حکمتِ عملی سے نابلد، روحِ اسلام سے بیگانہ ہوں تو فکرِ اسلامی کی تشکیل ممکن نہ ہو گی۔ اس لئے سب سے بڑا مسئلہ شخصیات کے انتخاب کا ہے، حق تعالیٰ نے جب اس نا مکمل دین کو دنیا میں بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اولاً شخصیت ہی کا انتخاب فرمایا اور وہ ذات تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس کی وجہ یہ ہے کہ دین محض تعلیم و تفکیر کیلئے نہیں بلکہ تربیت کے لئے آتا ہے اور تربیت محض تعلیم یا کتاب کے

---

① پارہ: ۲۸ سورۃ الحشر، الآیۃ: ۷. ② علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: لم اقف علیھا مع ایراد الغزالی لہ فی الاحیاء، وفی الفردوس بلا سند عن ابن عمر مرفوعاً: الدنیا قنطرۃ الآخرۃ فاعبروھا ولا تعمروھا. دیکھئے: المقاصد الحسنۃ ج: ۱ ص: ۱۱۸.

③ شعب الایمان، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس. ج: ۷ ص: ۳۶۰.

نوشتوں سے نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ اس سے ہم آہنگ شخصیتیں اسے قلوب تک پہنچانے والی اور اپنے عمل سے نمایاں کرنے والی سامنے نہ ہوں۔ اس لئے دنیا کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا کہ امتوں کی صلاح وفلاح کے لئے محض قانون اتارا گیا ہو اور پیغمبر کی شخصیت نہ بھیجی گئی ہو، کیونکہ شخصیت ہی دین اور مسائل دین کو اس انداز اور اس حکمت عملی سے پیش کرسکتی ہے، جو شارع حقیقی حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کے لئے وضع کیا ہے۔ اس لئے وہی شخصیت مخاطب قوم کی نفسیات کی رعایت رکھتی ہے اور اس کے اجتماعی مزاج سے آگاہ ہوتی ہے جو ہدایت کے لئے منتخب کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر دور میں اس رنگ کی شریعت آئی جو رنگ مخاطب قوم کا تھا اور اس نوع کے معجزات سے نبوت کو ثابت کیا گیا۔ جو نوعیت اس دور کے ذہن ومزاج کی ہوئی۔

آج جبکہ نبوت ختم ہوچکی ہے تو انبیاء کا کام اس امت کے مجددوں اور مفکر علماء عرفاء کے سپرد کیا گیا کہ وہ شریعت کو اسی رنگ سے ثابت کرکے دلوں میں جمائیں جو آج کے دور کی نفسیات کا رنگ ہو۔

اس حقیقت کو امام ابن سیرینؒ نے جو ایک جلیل القدر تابعی اور تعبیر خواب کے امام ہیں ان لفظوں میں ادا فرمایا کہ: ''اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ.'' ① ''یہ علم (اور آج کی اصطلاح میں یہ فکر) ہی تمہارا دین ہے تو دیکھ لو کہ کس شخصیت سے تم دین (یا فکر) اخذ کررہے ہو''۔

جس سے دین اور دین کے فکر کی بارے میں ہمیں پوری رہنمائی ملتی ہے کہ تربیت کا سب سے بڑا ماخذ شخصیت ہے کاغذ اور نوشتے نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مربی اور معلم یا مصلح فکر اگر خود صحیح المنہاج ہوگا تو تب قلوب کی صحیح رہنمائی کرسکے گا ورنہ وہ خود اگر اس منہاج کی فکر لئے ہوئے نہ ہو یا قلب میں کوئی زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو کتاب وسنت سے بھی وہ اسی زیغ ہی کو سامنے لاکر دوسرے قلوب میں بھردے گا۔

آخر مسلمانوں میں آج کتنے متضاد فرقے ہیں جو قرآن ہی کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور اسی کا نام لے کر اپنی اپنی فکر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں اس حال میں کہ ان متضاد فرقوں میں کوئی ایک ہی حق وثواب پر ہوسکتا ہے۔ سب کے سب اس تضاد فکری کے ساتھ محق نہیں کہلائے جاسکتے۔ ظاہر ہے کہ کتاب وسنت کے سامنے ہونے اور اسے امام کہنے کے باوجود اگر کوئی فرقہ مبطل ہوسکتا ہے تو یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ اس راستے میں فکر صحیح اور مفکر کی ذات ہی اصل ہے اور کسی فرقے کے مبطل ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ اس کے ہاتھ میں کتاب وسنت اور دینی لٹریچر نہیں۔ بلکہ یہ ہوں گے کہ اس میں کوئی صحیح الفکر اور ذوق سلف پر تربیت یافتہ شخصیت نہیں، بلکہ کوئی مبطل اور زیغ زدہ شخصیت آئی ہوئی ہے پس اگر شخصیت صحیح ہو تو باطل نوشتوں سے بھی وہ حق ہی سامنے لے آئے گی اور اگر وہی فاسد الفکر ہو تو قرآن وحدیث سے بھی وہ باطل ہی نمایاں کرکے قلوب کو فاسد کردے گی۔ ورنہ قرآن کو امام کہنے والا کوئی مبطل فرقہ مبطل نہ ہوتا۔ اس لئے جب کہ ہم فکر اسلامی کی تشکیل کے لئے قدم اٹھارہے ہیں تو سب سے مقدم صحیح

① الصحیح لمسلم، المقدمة، باب بیان ان الاسناد من الدین...... ج: ۱ ص: ۱۴.

الفکر شخصیات ہی کا انتخاب ہے جس سے منہاج نبوّت کا صحیح اور متوارث ذوق ہمارے سامنے آ جائے اور اس سیدھے سے منہاج پر ہماری فکر استقامت کے ساتھ رواں دواں ہو۔

حرف آخر...... بہرحال فکر اسلامی کی تشکیل تو قابل تبریک ہے جس کا سہرا جامعہ اسلامیہ کے سر ہوگا لیکن اس میں سب سے پہلا قدم نشان فکر متعین کرنا ہے اور وہ منہاج نبوّت ہے۔ دوسرا قدم اس منہاج میں فکر دوڑانے کے لئے اس کے اصول وقواعد درکار ہوں گے۔ جس میں قواعد کلیہ اور فروعات فقہیہ سب داخل ہیں۔ تیسرا قدم اس مزاج کا پہچاننا ہے اور اسے سامنے رکھنا ہے جو ملت اسلامیہ کو بخشا گیا ہے اور اس پر اس کی صدیوں سے تربیت ہوتی آ رہی ہے۔ چوتھا رجال فکر کا انتخاب ہے کہ فکر کا ظہور، صاحب فکر ہی سے ہوسکتا ہے نہ کہ محض کاغذ کے نوشتوں سے اور پانچواں قدم ان ظاہری اور باطنی خصوصیات کی رعایت ہے جو اس منہاج کا جوہر اور اس کی خصوصیات ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اجلاس جامعہ میں تو قلت وقت کی وجہ سے قرآنی اصول کی صرف اجمالی فہرست ہی پیش کرسکا تھا۔ جو یقیناً تشنہ تفصیل تھی اور اب مقالہ کی صورت میں اس کی کچھ توضیحات بھی اگر پیش کر رہا ہوں تو قلت فرصت کی وجہ سے وہ بھی کچھ تفصیلی اور مرتب شدہ نہیں ہیں۔ بلکہ کثرت مشاغل کے سبب بھاگ دوڑ کے ساتھ جو بھی منتشر چیزیں سامنے آ رہی ہیں۔ انہی کو عجلت کے ساتھ جمع کر دیا گیا۔ جس میں نہ کسی خاص ترتیب ہی کی رعایت ہوسکتی ہے۔ نہ نظام کلام کی۔ اس لئے اسے ''جُهْدُ الْعَقْلِ دُمُوْعَهٗ'' کے مصداق سمجھنا چاہئے، جو ادائے فرض تو ہے۔ مگر لوازم فرض سے آراستہ نہیں ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس مہم کو انجام حسن تک پہنچائے اور ملت کے لئے ایک نافع قدم ثابت فرمائے۔ (آمین)

ماخوذ از ماہنامہ دارالعلوم دیوبند بھارت شمارہ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۷۹ء

اسلامی تمدن

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِ يْرًا ، وَّدَ اعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ! ①

اسلام کے پیش کردہ دوراستے...... بزرگان محترم! اسلام نے دنیا کے سامنے دوراستے پیش کئے ہیں۔گویا اسلام دوچیزوں کا مجموعہ ہے ایک اقترابات، دوسرے ارتفاقات۔

اقترابات کا مطلب یہ ہے کہ وہ راستے جن سے آدمی اللہ کا قرب اورنزدیکی پیدا کرسکے اس کی نزدیکی کی یہ صورت نہیں ہے کہ جیسے ہم آپ کے نزدیک ہوجائیں کہ گز بھر کی بجائے آدھ گزیا آدھ گز کی بجائے بالشت بھر کا فاصلہ رہ جائے۔اسے نزدیک کہیں گے مگر یہ نزدیک ہونا جسمانی ہے اور اللہ جسم نہیں ہے کہ اس کے نزدیک ہونے کا یہ مطلب ہو کہ ہم دوچار گز سرک جائیں یادس پانچ میل آگے پہنچ جائیں۔اس کی نزدیکی کا مطلب یہ ہے ہم اس سے مناسبت اور مضبوط تعلق پیدا کریں۔اس کے اخلاق سے متخلق ہوں۔اس کے کمالات سے باکمال بنیں۔ خدائی اوصاف ہمارے اندر نفوذ کریں تا کہ ہمیں خلافت اور نیابت خداوندی کا مقام حاصل ہو۔اس چیز کا نام اسلام میں اقترابات یعنی قرب خداوندی پیدا کرنے کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔اس کے لئے عبادات نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ رکھی گئی ہیں۔

دوسری چیز ارتفاقات ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ باہمی میل جول، لطف ومدارات، تمدن وتعاون اور مدنیت و شہریت کے اصول وطریقے ہمارے سامنے ہوں کہ کس طرح سے ہم دنیا میں زندگی گزاریں۔دنیا میں جیسے مساجد بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، گھر بنانے کی بھی ضرورت ہے، بازار بنانے کی بھی ضرورت ہے۔یہ سلسلہ ارتفاقات کے شعبے ہیں کہ آپس کا میل جول اور باہمی تمدن وتعاون، یہ ہم کس طرح سے انجام دیں۔اس کے لئے مختلف شعبے ہیں، جن کی تفصیلات اسلام نے پیش کی ہیں۔بہرحال یہ دوسلسلے ہیں، ایک اقترابات اور ایک ارتفاقات:

اس لئے کہ ایمان کے دوشعبے ہیں۔ایک اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ اور ایک اَلشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ اللہ کے

① ۱۴ اجولائی،۳۰ ۱۹۶۳ء افریقہ۔

اوامر اور بھیجے ہوئے قانون کی عظمت اور اس کی مخلوق پر شفقت و مدارات اور رحم و کرم کرنا یہ ایمان کے دو شعبے ہیں۔ اس لئے علم کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔

علم کی دو قسمیں...... امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْیَانِ." علم دو ہیں۔ ایک بدنی زندگی کا علم اور ایک روحانی زندگی کا علم۔ بدنی زندگی کے نیچے یہ تمام شعبے آتے ہیں۔ کھانا، پینا، گھر بنانا، بازار وغیرہ یہ تمام ضروریات۔

اور روحانی زندگی کے نیچے یہ شعبے آتے ہیں کہ کس طرح سے سجدہ کیا جائے، کس طرح اللہ کے سامنے جھکا جائے، کس طرح اس سے مناسبت پیدا کی جائے، تو جس طرح سے ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا دین و دیانت درست کریں، اسی طرح اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اپنی معاشرت و تمدن اور مدنیت کو بھی درست کریں۔

ہر ملت کا ایک مزاج ہے...... لیکن ہر قانون اور ہر ملت کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہودیت ایک ملت ہے، اس کا ایک مزاج ہے۔ نصرانیت ایک ملت ہے، اس کا خاص مذاج ہے۔ اسلام ایک ملت ہے، اس کا ایک مزاج ہے۔ اسلام میں بھی پھر ایک فرقہ اہل سنت والجماعت کا ہے، جس کو حق کہا گیا ہے۔ جتنے فرقے الگ الگ ہیں۔ ہر فرقے کا ایک مزاج ہے۔ اہل تشیع کا ایک مزاج، سنیوں کا ایک مزاج۔ غرض جس طرح سے ہر ہر طبقے کا مزاج الگ الگ ہے۔ پوری ملت کا مزاج بھی الگ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے مزاج کو باقی رکھ کر ہی اپنے اصولوں پر چل سکتے ہیں، اپنی بنیادیں قائم کر کے ہی اپنی تعمیر اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ہم نے دوسروں کی بنیادوں پر تعمیر کھڑی کی، تو دوسرے کو حق ہے کہ وہ کل کو کہہ دے کہ میاں! زمین اور بنیاد میری ہے۔ تم اپنا ملبہ اٹھاؤ اور اپنی تعمیر ختم کرو۔ آپ بے بس ہوں گے، اپنا لگا لگایا سرمایہ آپ کو ختم کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر ذاتی بنیاد پر تعمیر اٹھائی ہے تو کوئی کہنے والا نہیں ہے کہ تم ملبہ لے جاؤ، بنیاد ی میری ہے۔ آپ کہیں گے کہ بنیاد، زمین اور تعمیر بھی ہماری ہے۔ بہر حال ہر ملت کا یک الگ مزاج ہے جو اس کی تعمیر کی بنیاد ہے۔

دورِ جاہلیت کے تمدن کی بنیاد نفس پرستی پر اور اسلامی تمدن کی بنیاد حق پرستی پر ہے...... آج اس چیز کی ضرورت ہے، جس کے لئے مسلمان دنیا میں آیا کہ اس تمدن کو یہ غالب کرے جس کو اسلام لے کر آیا ہے۔ اس واسطے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے تو دنیا میں دو بڑے بڑے تمدن قائم تھے۔ ایک طرف فارسیوں کا تمدن تھا، جس پر کسریٰ کی حکومت تھی۔ ایک طرف رومیوں کا تمدن تھا، جس پر قیصر کی سلطنت تھی۔ روم میں عیسائیوں کا اقتدار تھا اور فارس میں فارسیوں کا اقتدار تھا۔ ان دونوں ملکوں اور حکومتوں نے تمدن کو انتہاء تک پہنچا دیا تھا۔ تاریخوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم اور آپ اس تمدن کے عشر عشیر تک بھی نہیں پہنچے، جتنا ان کا تمدن اونچا ہو چکا تھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ کوئی امیر اور رئیس اس وقت تک امیر نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کم سے کم ایک ایک لاکھ

روپے کا لباس اور زیور اس کے بدن پر نہ ہو۔ پٹکا ہو تو کم سے کم دس ہزار روپے کا۔ اسی طرح دیگر لباس بہر حال مجموعی تعداد لاکھ ڈیڑھ لاکھ تک پہنچتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں، ہمارا بڑے سے بڑا رئیس اس مقام پر نہیں پہنچ سکا کہ صرف اس کے بدن پر ایک لاکھ روپے کا لباس ہو۔ یہ ممکن ہے کہ اس کی ساری جائیداد کار کوٹھی لگا کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہو۔ مگر یہ کہ بدن پر ایک لاکھ روپیہ لگا ہوا ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ اور وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ امیر زادے کے بدن پر ایک ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگا ہوتا، تب وہ امیر سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں جگہ پانے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ یہی حال رومیوں کا تھا اور یہی فارسیوں کا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے اگر خالص تمدن مقصود ہوتا تو اس سے بڑا تمدن آج تک نہیں پیدا ہوسکا' جتنا ہو چکا تھا۔ آج کی خصوصیات اپنی جگہ ہیں کہ مشینی تمدن ہے۔ یہ بے شک انہیں میسر نہیں تھا۔ لیکن مشینی حالات کو چھوڑ کر جہاں تک عمارات، غنا اور امیری کا تعلق ہے تو وہ بہت اونچے پہنچے ہوئے تھے۔ یہی چیز مقصود ہوتی تو اسلام اسی کی تائید کر دیتا کہ فارسیوں کا اور رومیوں کا بھی تمدن حق ہے اور مقصود حاصل ہو جاتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی ضرورت نہ پیش آتی کہ جنگیں لڑ لڑ کر اس تمدن کو ختم کر کے اسلامی تمدن کو جگہ دیں۔

اس کی بناء یہ تھی کہ ان تمدنوں کی بنیاد محض نفس کی آرائش پر تھی۔ اسلامی تمدن کی بناء رضاء خدا اور حق پرستی پر ہے، اس لئے دونوں کا مزاج بدل گیا ہے۔ اسے دنیا میں رائج کیا اور اس کے لئے بڑی بڑی محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں۔ اعلیٰ طریق تو یہ ہے کہ تمام مسلمان مل کر زمانے کی ضروریات سامنے رکھ کر، زمانے کے تقاضوں کو قطع نظر کر کے نہیں، بلکہ سامنے رکھ کر دینی طور پر اس تمدن کی بنیاد ڈالیں اور اسے غالب کریں تاکہ دنیا کی قومیں ہمارے سامنے آئیں، جھکیں اور اسے قبول کرنے پر مجبور ہوں۔

دور حاضر کا تمدن جہاں اسلامی تمدن سے ٹکرائے تو اسلامی تمدن کو ترجیح دینی چاہئے...... رہا یہ کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ تو خوب کہا ہے لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے، وہ کہتا ہے کہ ؎

کیا ہوا آج جو بدلا ہے زمانے نے تجھے ۔۔۔ مرد وہ ہے جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

مردانگی کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ ہم جھک کر اپنے عجز کا اعلان کریں بلکہ ہم اپنا کردار اور کیریکٹر پیش کر کے دنیا کے سامنے اس کی خوبی اور برکت پیش کریں تاکہ دنیا ہمارے سامنے جھکنے پر مجبور ہو اور اس مشن کو لے کر آگے بڑھیں، جس مشن کو آگے بھیجنے اور پہنچانے کا ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ سے وعدہ کیا ہے۔

لیکن موجودہ حالات میں یہ ہمارے لئے دشوار ہے۔ ہم خواہ اپنی بدعملی سے یا تکوینی طور پر اس مقام پر آگئے ہیں کہ دنیا کی قوموں کو جھکا نہیں سکتے۔ مگر کم سے کم یہ جذبہ تو سرد نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے تمدن ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی اچھی چیزیں لینے کا کوئی مضائقہ نہیں۔ دنیا میں جب کوئی نیا تمدن آتا ہے، اس کی ایک ہوا ہوتی ہے اور ہوا جب چلتی ہے تو تنہائیوں میں بھی گھستی ہے۔ اس سے آدمی کو مفر نہیں ہوسکتا، اس سے آدمی الگ نہیں رہ سکتا۔

اس سے متاثر ہونا ضروری ہے مگر اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ کم سے کم ان مواقع کو دیکھیں جہاں اس تمدن کا اسلامی تمدن سے تصادم ہوتا ہے۔ اس میں ہم اپنے کردار اور اپنے مقاصد کو ترجیح دیں۔

دور جدید کے حوادث و واقعات سے اسلام صرف نظر نہیں کرتا...... جیسے مثلاً فرض کیجئے آپ تجارت کر رہے ہیں اور تجارت کے سلسلے میں مالی تمدنی مشکلات بھی پیش آ رہی ہیں۔ ان مشکلات کو آپ زیادہ سمجھتے ہیں۔ کچھ سنی سنائی ہمارے بھی سامنے ہیں۔ یقیناً مشکلات کا وقت ہے۔ لیکن جہاں ایسی چیزیں سامنے آ رہی ہیں جو مشکلات کا باعث ہیں۔ انہی مشکلات میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں، جو ان کا بدل بھی ہو سکتی ہیں۔ ان چیزوں کو اختیار کر کے آپ کو غور کرنا ہوگا کہ کس حد تک یہ چیزیں اسلام سے موافقت کرتی ہیں اور کتنی مخالفت کرتی ہیں۔ پھر مخالف چیزوں میں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ کس حد تک اسلام گنجائش دیتا ہے اور کس حد تک نہیں دیتا۔ میرا یقین ہے کہ کیسا ہی تمدن اور کیسا ہی زمانہ آ جائے، جو حوادث و واقعات پیش آتے ہیں، اسلام نے نہ پہلے کبھی ان سے قطع نظر کیا، نہ آج کرتا ہے اور نہ آئندہ کرے گا۔ ان کی رعایت کی جاتی ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر اسلام ایسی گنجائشیں دیتا ہے کہ قوم کا مفاد ختم نہ ہو۔ کچھ تھوڑا تغیر کر دیا۔ کچھ تھوڑی سی ترمیم کر دی۔ بعض چیزوں کو بعینہٖ قبول کر لیا۔ کچھ تغیر کچھ ترمیم کچھ خلاف کچھ قبولیت یہ مل کر کام چل سکتا ہے۔ ہمیں دنیا سے بہر حال الگ ہونا نہیں ہے۔

بعض چیزوں میں تھوڑا سا فرق پڑتا ہے ذرا سا طریقہ بدل دیں، فائدہ وہی کا وہی رہے گا۔ چیز بھی ضائع نہیں جائے گی اور حد جواز میں آ جائے گی ایسی صورتوں میں یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ ایک ممنوع اور گناہ میں مبتلا ہو کر رہیں۔ جب کہ ایسا طریقہ بھی ممکن تھا کہ فائدہ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ جاتا اور ہم کسی ناجائز چیز کے ارتکاب میں بھی مبتلا نہ ہوں۔

ہمارے ہاں میرٹھ میں حاجی عبدالغنی صاحب ایک تاجر تھے بڑے صالح اور نیک آدمی تھے۔ ان کے ہاں ٹوپیوں کی تجارت ہوتی تھی۔ ان سے دارالعلوم کے ایک فاضل نے فرمائش کی کہ مجھے دو ٹوپیاں بنا دی جائیں جو خالص زری کی ہوں اور کام اتنا گھٹا ہوا ہو کہ کپڑا نظر نہ پڑے۔ بس چاندی چاندی کا کام نظر پڑے کپڑا بالکل چھپ جائے۔

یہ اگلے دن پہنچے، انہوں نے کہا کہ ٹوپیوں کی تیس روپے قیمت ہے۔ پندرہ روپے کی ایک ٹوپی ہے۔ انہوں نے دیکھا تو ٹوپیاں بہت اعلیٰ اور ان کی مرضی کے مطابق بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا دام کل کو بھجوا دوں گا۔ حاجی صاحب نے کہا کہ: بے اعتمادی کی بات نہیں ہے۔ چاہے ایک مہینے کے بعد بھجوا دیں مگر آپ کے لئے یہ جائز بھی ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس میں ناجائز ہونے کی کیا بات ہے؟ کیا ادھار نہیں لیا جا سکتا؟

انہوں نے کہا کہ اس ٹوپی میں کپڑا بالکل نظر نہیں آتا۔ اسے مورّق کہتے ہیں اور مورق کام کپڑے پر ہو تو وہ چاندی کے حکم میں بن جاتا ہے اور چاندی کی بیع و شرا میں ادھار جائز نہیں ہے۔

اب یہ بے چارے چپکے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں فاضل دیوبند ہو کر بھی نہیں جانتا اور تم دوکان پر بیٹھ کر بھی

اتنے باریک مسائل جانتے ہو۔ مگر بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی تو کہا کہ اچھا یہ معاملہ ختم میں پرسوں دام لے کر آؤں گا۔

حاجی صاحب نے کہا کہ: میں ایسی ترکیب نہ بتلاؤں کہ ادھار بھی ہو جائے، جائز بھی ہو جائے۔ انہوں نے کہا وہ کیا ہے؟ کہا کہ آپ تیس روپے میرے سے قرض لے لو اور یہ ٹوپیاں نقد خرید لو۔ بعد میں قرض ادا کر دینا۔ اب یہ بے چارے بہت شرمندہ ہوئے۔ خیر ان کو بات سمجھ آ گئی اور انہوں نے بہت بہت ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا میں اس بات کو نہیں سمجھا تھا۔

بات وہی ہوئی کہ خریداری بھی ہوئی، ادھار بھی ہو گیا، مگر ذرا سے ردوبدل سے بات حد جواز میں آ گئی۔ غرض بہت سے مسائل خواہ بینکنگ یا لاٹری سسٹم ہو یا انشورنس کا ہو۔ جہاں ان میں کچھ ناجائز چیزیں نکلیں گی، ایسی گنجائشیں بھی پیدا ہوں گی کہ اگر ذرا سا ردوبدل کر لیا جائے تو فائدہ تو ہاتھ سے نہ جائے اور چیز حد جواز میں آ جائے اور ممنوع نہ رہے کہ جس سے آدمی گنہگار کہلائے اور کسی برائی کا مرتکب نہ ٹھہرے۔

دور حاضر کے پیش آمدہ واقعات میں مفتی اور صاحب واقعہ مل کر اعتدال کی راہ نکال سکتے

ہیں...... مگر اس کے لئے فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام آدمی کے لئے بھی فکر کی ضرورت ہے اور جو فتویٰ دینے والا مفتی ہے اس کے لئے بھی فکر کی ضرورت ہے کوئی سرسری چیز نہیں ہے اگر آپ کوئی چیز اجمالاً پوچھیں گے تو فتویٰ اور ہوگا، تفصیل سے واقعات سامنے رکھ کر پوچھیں گے تو حکم اور ہوگا۔ اگر آپ مجھ سے یوں پوچھیں کہ ہم تجارت کر رہے ہیں۔ اس میں سودی کاروبار ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہوں گا حرام اور ناجائز ہے۔ سود کو اسلام نے حرام کیا ہے۔ قرآن میں صاف آیت موجود ہے۔ اجمالاً پوچھنے کا تو یہ جواب ہے۔

اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ بینکنگ کا سسٹم جاری ہے۔ بین الاقوامی تجارت ہے اس لئے سود میں پڑنا ناگزیر ہے۔ تجارت کرنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔ تو یا تو یہ فتویٰ دو کہ ہم سب چھوڑ چھاڑ کے جنگل میں جا کر بیٹھ جائیں اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں گزر بسر کر لیں۔ دنیا کی قومیں بڑھیں گی ہم ان سے قطع نظر کر لیں گے کہ بھئی! بڑھتی ہیں تو بڑھ جائیں اور کل وہ ہمارے اوپر زیادتی کریں، تو ہم صبر کریں گے، مار کھائیں گے۔

اگر آپ یہ فتویٰ دیں تو ہم تیار ہیں۔ اور اگر آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ تمہیں دنیا کی قوموں کے دوش بدوش چلنا ہے۔ عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنا ہے بقدر ضرورت دولت بھی کمانا ہے۔ تو پھر اس مصیبت کا کیا علاج ہے؟ کہ اس سسٹم میں بعض چیزیں ناجائز بھی ہیں۔ آپ غور کریں تو مجموعی حالت پر، جب آپ تفصیلی حالات سامنے رکھیں گے اور مفتی ان پر غور کرے گا، پھر حکم دوسرا ہوگا، پھر اس میں کچھ نہ کچھ گنجائشیں نکلیں گی۔ البتہ کچھ ایسی چیزیں بھی نکلیں گی جس میں آپ کو کچھ تغیر کرنا پڑے گا۔ آخر شریعت یا دین کا قانون پبلک کے تابع تو نہیں ہو سکتا کہ جو آپ چاہیں، قانون ادھر ہی کو جھک جائے۔ وہ قانون کیا ہوا، وہ تو موم کی ناک ہو گئی۔ جدھر کو چاہا اسے پھیر دو۔ لوگوں کو ہی قانون کے تابع بننا پڑتا ہے۔

اسلام ابدی بین الاقوامی قانون ہے وہ بین الاقوامی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا...... لیکن جب کوئی قانون بین الاقوامی ہوگا، سامنے آئے گا، وہ یہ بھی کہے گا میں ہر زمانے اور ہر ملت کے لئے یکساں قانون ہوں، میرا پیغام دنیا کی ہر قوم کے لئے ہے۔ تو اس قانون کو یہ رعایت بھی کرنی پڑے گی کہ کس قوم کی کیا ذہنیت ہے؟ اس کی کیا نفسیات ہیں؟ اس کا اصول کیا ہے؟ اس کا لین دین اور معاشرت کا کیا اصول ہے؟ اس کی رعایت کرنی پڑے گی۔

اسلام جب ایک جامع اور بین الاقوامی مذہب ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اندر رعایتیں نہ ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ بین الاقوامی تجارت کی بنیاد ہی اسلام نے ڈالی ہے۔ اس سے پہلے دنیا کو بین الاقوامی تجارت کی خبر نہیں تھی۔ تجارتیں بے شک بڑی بڑی تھیں۔ لیکن ایک ملک اور ایک شہر میں ہوتی تھیں۔ لیکن ایک ملک سے دوسرے ملک کو اور دوسرے سے تیسرے پھر پوری دنیا کو مال سپلائی۔ اور پوری دنیا سے رقم اور روپیہ آئے اور جائے۔ یہ صورت نہیں تھی نہ ہی اس کے وسائل تھے۔ لیکن اسلام نے بنیاد ڈالی۔

قرآن کریم نے ایک دو نہیں بلکہ چھ سات قسم کے سفر بتلائے۔ تعلیمی سفر، تبلیغی سفر، اخلاقی سفر، تجارتی سفر اور سیاسی سفر وغیرہ۔ ان سفروں کی فضیلتیں بیان کیں اور ان سفروں کی نوعیتیں بیان کیں۔ تو بین الاقوامی مذہب نے بین الاقوامی راستے ڈالے اور چونکہ بین الاقوامی مذہب کو دنیا میں آنا تھا اور بھیجنے والا اللہ، جس کو ماضی اور مستقبل کی بھی اطلاع ہے۔ وہی جانتا تھا کہ بین الاقوامی مذہب اسی دور میں آنا چاہئے، جس میں بین الاقوامی وسائل بھی سامنے ہوں نقل وحرکت کے بین الاقوامی وسائل ہوں، ایک ملک سے دوسرے ملک جانا آسان ہو۔ ایک ملک کی خبر دوسرے ملک میں پہنچانا آسان ہو۔ تو یہ ترتیب تھی کہ چونکہ تمدن بین الاقوامی ہونے والا ہے۔ تو دین بھی بین الاقوامی ہوتا کہ دین بھی دنیا کے سامنے آسکے۔ ایسا بین الاقوامی دین دنیا کی اقوام کی ذہنیتوں کو قطع نظر نہیں کرسکتا۔ ان کی نفسیات کی رعایت کرے گا۔ جب کہ اسلام کے خود اندورنی دائروں کے اندر بھی یہ چیز ہے۔ ہر قرن میں ہر موقع پر مختلف ذہنیتیں پیدا ہوئیں۔ بلکہ ہر سو برس کے بعد قوم کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔ جب ایک نسل ختم ہوتی ہے۔ دوسری نسل آتی ہے۔ تو دنیا میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ نظریات بدلتے ہیں، جب ایک جنگ ہو کر صلح کا وقت آتا ہے تو بھی نظریات تبدیل ہوتے ہیں، تمدن بدلتا ہے۔ اس لئے اسلام نے بھی یہ خبر دی کہ ہر سو برس کے بعد ہم مجدد بھیجیں گے جو دین کو نکھاریں گے اور اس کی تجدید کریں گے۔ چونکہ سو ہی برس کے لئے ان ضرورتوں کا انتظام ہوتا ہے۔ اس لئے بعد میں آنے والوں کے لئے کل دین کی ان کے، مناسب حال، انہی کے رنگ میں، ان کی زبان میں تشریح کی جائے گی تا کہ وہ دین کو سمجھ سکیں۔

اگر قوم میں تصوف کا غلبہ ہوا تو اسلام نے اپنے کو صوفیانہ رنگ میں سامنے کیا تا کہ صوفی مشن لوگ سمجھ سکیں۔ صوفیانہ انداز میں تفسیریں لکھی گئیں۔ جیسے محی الدین ابن عربیؒ اور امام غزالیؒ ان لوگوں نے تفسیریں لکھیں۔ ایک زمانہ عقل پرستی کا آیا کہ لوگ بغیر عقل کی مدد کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ایسے مجدد پیدا ہوئے جنہوں نے

قرآن وحدیث کوعقلی رنگ میں پیش کیا۔امام رازی، شاہ ولی اللہ، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہ کام کیا کہ عقلی اصول پر تفسیریں لکھیں۔قرآنی مسائل کو خالص عقل کے جامے میں سمجھایا۔ایک زمانہ آیا، اس میں طبعیات کا غلبہ تھا۔تو طبعی رنگ میں قرآن وحدیث کو پیش کیا گیا۔قرآن کی یہ جامعیت ہے کہ وہ ایسا حسین چہرہ ہے کہ جیسا لباس پہنادو۔اتنا ہی حسین معلوم ہوتا ہے۔جس رنگ کی کوئی قوم یا طبقہ سامنے آتا ہے۔وہ اسی رنگ میں اپنے کو سامنے کرتا ہے۔جیسے اسلام میں یہ جامعیت ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کے طبقات اور دنیا کی قوموں کی ذہنیت الگ الگ ہو۔وہ سب کے لئے پیغام بنے اور سب کی نفسیات کی رعایت نہ کرے۔اس میں ایسے جامع اصول موجود ہیں، وہ ضرور رعایت کرے گا۔

ایسی اشیاء جو اپنی ذات سے ممنوع ہیں خاص اوقات میں مشروع ہو جاتی ہیں......مگر ضرورت اس کی ہے کہ سوال کرنے والے اجمالی سوال نہ کریں۔جن جن معاملات میں وہ مبتلا ہوں ان معاملات کو تفصیل سے واقعاتی رنگ میں پیش کریں۔یوں نہ پوچھیں کہ فلاں چیز جائز ہے یا نہیں۔بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟ انشورنش جائز ہے یا نہیں؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ناجائز ہے۔اسلام کے اصول کے خلاف ہے۔سود بھی ناجائز' انشورنش بھی ناجائز اور بیمہ کرانا بھی ناجائز۔فلاں اور فلاں چیز بھی حرام۔

لیکن جب ان واقعات کی تفصیل پیش کریں گے اور مجموعی پہلو جب سامنے آئیں گے، تو حکم میں گنجائش نکلے گی۔بلاشبہ اسلام میں شراب ناجائز ہے۔خاص حالات میں اسلام کی تفصیلات پیدا ہوتی ہیں۔لیکن یہ حکم تبدیل بھی ہوسکتا ہے۔چنانچہ اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کوئی ایسا مریض ہو کہ ڈاکٹر کہہ دے کہ یہ اس وقت تک زندہ نہیں بچ سکتا جب تک شراب نہ پئے۔اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ شراب پئے، وہ اپنی جان بچائے۔اسی طرح خنزیر ہے، اسلام میں بالکل نجس العین ہے۔اسلامی نقطہ نظر سے گوشت پوست ہی نہیں بلکہ اس کا جوہر بھی ناپاک ہے۔یہ ناجائز اور ممنوع ہے۔لیکن اگر کوئی مر رہا ہو، فاقے کی حالت میں ہو اور کوئی غذا نہ ملتی ہو، تو اسلام اجازت دے گا کہ اسے خنزیر کھلا دو، اسے مردار کا گوشت بھی کھلا دیں گے۔کفر کا کلمہ کہنا اسلام کو ختم کر دیتا ہے۔اسی طرح کوئی شرک کا کلمہ کہے۔لیکن اگر ایک شخص تلوار لے کر مسلم کی گردن پر کھڑا ہو کہ یا کفر کا کلمہ کہہ، ورنہ ابھی تیری گردن قلم کردوں گا۔اسلام اجازت دیتا ہے کہ دل سے ایمان پر مطمئن رہو، زبان سے کفر کا کلمہ کہہ دو۔اب کوئی شخص ہم سے یہ سوال کرے کہ صاحب! کفر کا کلمہ جائز ہے یا ناجائز؟ ہم کہیں گے بالکل حرام ہے۔آدمی کافر ہو جائے گا۔لیکن اگر یوں کہے میں اصول نہیں پوچھتا، میں تو یہ واقعہ پوچھتا ہوں کہ میرے اوپر ایک شخص تلوار لے کر آیا ہوا ہے، کہ کہہ کفر کا کلمہ' ورنہ گردن قلم کردی جائے گی۔اب یہ حکم ہوگا کہ تیرے لئے جائز ہے، کفر کا کلمہ کہہ دے۔

اس سے اندازہ ہوا کہ ایک شئے اپنی ذات سے بالکل ممنوع ہوتی ہے، لیکن حالات کے سامنے آنے سے اس میں گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔یہ صورت خواہ انفرادی ہو یا قومی ہو۔اسلام میں گنجائشیں نکلتی ہیں۔اسلامی قانون

میں لچک ہے۔ یہ اعتدال کا مذہب ہے۔ افراط وتفریط کا مذہب نہیں ہے۔ ایک درمیانی نکتہ پر ہے جس میں دونوں پہلوؤں کی رعایت نکلتی ہے۔

اس بناء پر میں عرض کر رہا ہوں کہ مسئلے دو ہی ہیں۔ ایک دیانات کا ہے جس میں عبادات آتی ہیں۔ ایک معاشرت کا ہے جس میں تجارت، معاملات، بیع وشرا، نکاح وطلاق، زمین کی خریداری، ٹھیکہ، کرایہ داری اور محکمہ قضا ومقدمات، فوجداری اور دیوانی عدالت، یہ اس کے نیچے آجاتی ہیں۔ ان سب کے اصول بتلائے گئے ہیں جو معتدل ہیں اور جامع بھی ہیں۔ ہر قوم کے جذبات کو اپیل کر سکتے ہیں، لیکن جب قوم اس کی طرف توجہ کرے یا خود سمجھے اور سیکھے یا پھر سیکھے ہوئے سے پوچھ کر اس پر عمل کرے، مگر شرط یہ ہے کہ تفصیل سے پوچھو۔ تو جس طرح استفتاء اور سوال کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ فکر کے ساتھ واقعات سامنے رکھیں۔ اسی طرح مفتیوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ سارے واقعات کے ایک ایک پہلو کو سامنے رکھ کر حکم لگائیں صرف اجمالی ذکر نہ کریں تفصیل کو سامنے رکھ کر فتویٰ صادر کریں مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس میں ایسی گنجائشیں نکلیں گی کہ قوم اپنے مفاد سے بھی محروم نہیں ہوگی اور ناجائز وحرام کا ارتکاب بھی نہیں کرے گی۔

مفتی کے سامنے تفصیلی واقعات لانے سے ہی جدید مسائل میں گنجائشیں نکل سکتی ہیں...... اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سوالات کو آپ ہی مرتب کریں اور جوابات کے لئے ہم علماء کی کمیٹی بٹھادیں گے کہ ان واقعات پر غور کر کے آپ فتویٰ دیں کہ کیا حکم ہے؟ یا تو یہ کہیں کہ قوم تجارت کو چھوڑ دے اور بالکل بین الاقوامی دنیا سے نکل کر جنگلوں میں جا کے بسر کرے۔ لیکن اگر اس کو ایک سچا شہری بننا ہے تو پھر جب اس کی شہریت بدل گئی ہے، اس کے مناسب آپ بھی گنجائشیں نکال کر فتویٰ دیں۔ جتنی اسلام نے گنجائش دی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

زیادہ سے زیادہ مفتی یہ کہے گا کہ: تم مجرم ہو۔ تم ناجائز چیزوں کا ارتکاب کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں مجرم کے لئے بھی گنجائشیں دی جاتی ہیں۔ شبہ کا فائدہ مجرم کو دیا جاتا ہے۔

اگر شبہ نکل آئے تو مجرم کی سزا اٹھالی جاتی ہے۔ تو ہم مجرم سہی، مگر ساتھ ہی کچھ شبہات بھی ہیں۔ ان شبہات کا فائدہ بھی ہمیں پہنچے گا۔ گنجائش ہمیں ملے گی۔ مگر واقعات کو پیش کرنے والے کو چاہئے کہ وہ تفصیلی واقعات ذکر کرے۔ اس زمانے میں اجمال اور سرسری بات سے کام نہیں چلتا۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے بالکل نابلد ہیں۔ ہم ان واقعات میں پڑے ہوئے نہیں۔ اب ہمیں کیا خبر کہ انشورنش میں کیا ہوتا ہے اور بیمے کس طرح سے کرائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ نہ تجارت کر رہے ہیں نہ انشورنش آپ حضرات مطلع ہیں، آپ تفصیل سے بتائیں۔

حکم بتلانا ہمارا کام ہے، واقعات بتلانا آپ کا کام ہوگا۔ اگر آپ نے واقعات میں اجمال برتا۔ تو ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، ہم تو یوں کہہ دیں گے کہ تم جو کر رہے ہو وہ حرام ہے۔ لیکن اگر واقعات اچھی طرح سے سامنے آئیں تو پھر جامع فتویٰ آئے گا۔

اس واسطے اس مختصر مجلس میں میں اتنا عرض کرسکتا ہوں۔ حضرات محترم مقررین نے جو کچھ کہا، وہ بیشک ہم تفصیل سے نہیں سمجھے۔ لیکن بالا جمال ایک اندازہ ہوا کہ دین و دنیا ان دونوں کے اندر ہمیں بڑھنا ہے۔ دین کی بھی حفاظت کرنی ہے۔ اپنی تعلیم اور مدارس کی بھی حفاظت کرنی ہے اور ساتھ ساتھ اپنی تجارت کو بھی حفاظت کرنی ہے۔ تجارتی لوگ نہ ہوں تو نہ مدارس چلیں، نہ علماء کی کتابیں چھپیں نہ کام ہو۔ تو دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ بہر حال واقعات کو شریعت کے سامنے پیش کر کے حل کیا جائے، اور فتویٰ حاصل کیا جائے۔ تاکہ لوگ بھی مطمئن رہیں کہ ہم کسی ناجائز پر نہیں چل رہے ہیں اور دنیا بھی ہماری چل رہی ہے۔ اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ ہم علماء کی ایک جماعت بٹھادیں گے، جو غور فکر کر کے اس کے بارے میں احکام دے آپ کا کام ہوگا کہ تفصیل سے واقعات ہمارے سامنے رکھیں تاکہ ان پر حکم دیا جا سکے۔

اظہار تشکر...... یہ چند باتیں مجھے گزارش کرنی تھیں اور اخیر میں اپنے بزرگوں اور بھائیوں کا اور مخلصین افریقہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ایک ناچیز بھائی کی پذیرائی فرمائی۔ اتنی عزت افزائی فرمائی' جس کا میں واقعی مستحق نہیں تھا۔ یہ محض آپ لوگوں کا کرم ہے۔ ہم اس کے شکر گزار بھی ہیں اور دل میں اس کا ایک نقش لے کر جائیں گے۔ یہ زبانی شکریہ نہیں، بلکہ دل معترف ہے اور جہاں جائیں گے دل میں اس کی قدر رہے گی اور اقرار رہے گا۔ اور سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ اس ماحول میں رہ کر ان حالات کے اندر بھی آپ لوگوں میں دینی جذبہ موجود ہے۔ گویا آپ چاہتے ہیں کہ ہماری نسلوں کے اندر دین و ایمان باقی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہر قوم کا کیریکٹر الگ ہوتا ہے۔ ہم اپنے قومی کیریکٹر کی خصوصیات چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اگر یہ جذبات موجود ہیں تو کام بالکل آسان ہو جائے گا۔ واقعات پیش کریں۔ فتویٰ ان کے اوپر ہوگا اور انشاء اللہ پھر زیادہ دشواری نہیں پیش آئے گی۔ تھوڑی بہت اس میں آپ کو تبدیلی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ بعض چیزوں میں ہم اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان میں لوٹا کے پیچھے لانا پڑے گا۔ اسلام نے اتنا زیادہ آگے بڑھنا نہیں بتلایا ہے۔ جیسے رجعت نہیں بتلائی کہ رجعت پسند بن کے پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ بھی نہیں بتلایا کہ بالکل آگے بڑھ جاؤ۔ اعتدال کے نقطے پر قائم رہو۔

بہر حال یہ چیز قابل قدر ہے اور ہم دعاء کرتے ہیں اور آئندہ بھی دعاء کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی مشکلات کو آسان فرمائے اور سیدھا اور آسان روشن راستہ کھول دے اور آپ کی تجارتوں اور دین میں برکت عطاء فرمائے۔ اس وقت نماز کا بھی وقت ہے۔ یہی چند ضروری کلمات عرض کرنے تھے اور میں شکریہ پر ختم کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

درس ختم بخاری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

”اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

ثمرات ختم بخاری...... بزرگان محترم و برادران عزیز طلباء! جہاں تک ختم بخاری کا تعلق تھا، وہ ہو گیا اور اس کا حق بھی ادا ہو گیا آخری حدیث پڑھی گئی اور دعا بھی ہو گئی۔

امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے اپنی (جامع) بخاری کی نسبت فرمایا: ”جَعَلْتُهٗ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اللّٰهِ حُجَّةً“ ”میں نے اس کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے“۔ اس کا ایک ثمرہ یہ ہے کہ ختم بخاری کے بعد جو دعائیں مانگی جاتی ہیں تو تجربہ بھی شاہد ہے، امت کا عمل بھی ہے کہ وہ دعائیں قبول ہوتی ہیں، اس لئے عام علماء میں یہ دستور رہا ہے کہ جب بخاری ختم کرنی ہوتی ہے تو مجمع ہو جاتا ہے، اجتماعاً دعاء کر کے ختم کرتے ہیں۔ اب یہ سسٹم اور بڑھ گیا ہے کہ باہر سے بھی لوگ بلائے جانے لگے ہیں، لیکن ہم لوگ طالب علمی کے زمانے میں دیکھتے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت اقدس مولانا انور شاہ صاحبؒ جب بخاری ختم کراتے تھے تو باہر سے کسی کو نہیں بلایا جاتا تھا۔ لیکن دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ، منتظمین سب جمع ہو کر ختم بخاری میں شریک ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ اب تک بھی جاری ہے کہ جب بخاری ختم ہوتی ہے تو دارالعلوم کے لوگ اور شہر کے لوگ بھی اطلاع پانے پر آ جاتے ہیں۔ اور دعا میں شریک ہوتے ہیں۔

بہر حال ختم بخاری پر دعا کا معمول رہا ہے۔ ایک تو درساً درساً ختم ہوا اس وقت تو ختم بخاری ہوتی ہی ہے۔ دعا بھی کرتے ہیں۔ ویسے بھی اگر کوئی مہم پیش آ جاتی ہے۔ خدانخواستہ مسلمانوں کو کوئی آفت پیش آئی یا کوئی مقصد کسی نے لکھ کر بھیجا اور چند مقاصد جمع ہو گئے، تو اس کے لئے بخاری کا ختم کرائے جانے کا مدارس میں اور دارالعلوم میں بھی معمول ہے۔ متعدد مقاصد و درخواستیں جمع ہو جائیں تو ایک دن اساتذہ اور طلباء جمع ہو کر ختم کرتے ہیں اور دعاء مانگتے ہیں اور اس کے اثرات بھی دیکھے گئے ہیں کہ حق تعالیٰ (دعا) قبول فرماتے ہیں۔

تقدیس بخاری...... امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب مقدس کو اپنے اور اللہ کے درمیان میں حجت ٹھہرایا،

اور حجت ہونی بھی چاہئے۔ اس لئے کہ جس اعتناء اور جس تقدس کے ساتھ امام بخاریؒ نے اس کتاب کو مدون کیا اس کی نظیر بھی دوسرے محدثین میں نہیں، حرم محترم میں جا کے اس کتاب کی کتابت اور تکمیل کی۔

اور فرماتے ہیں کہ ہر حدیث جب میں لکھتا تھا تو لکھنے سے پہلے غسل کرتا تھا، دو رکعت نفل پڑھتا تھا اور دعائیں مانگتا تھا کہ: اے اللہ! مجھ میں انشراح پیدا فرما۔ جب شرح صدر ہو جاتا تھا۔ تب ایک حدیث میں لکھتا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں تقریباً سات ہزار یا کم و بیش حدیثیں ہیں۔ تو چودہ ہزار نفل پڑھ کر امام بخاریؒ نے قلم بند کیا ہے ہر حدیث پر رجوع الی اللہ کیا ہے۔

تو اول تو حدیث خود کلام مقدس، کلام نبوی ہے، پھر مدون کرنے والے امام بخاریؒ جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور اس کی تدوین میں حرم محترم میں ہر حدیث پر دو رکعت نفل پڑھنا۔ تقدس ہی تقدس جمع ہو گیا پھر بھی اگر حجت نہ بنتی تو اور کیا ہوتا؟ تو وہ حجت بنی اور امت میں یہ تعامل جاری ہے کہ ختم بخاری کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ ختم بخاری کا حق تو ادا ہو گیا۔ حدیث بھی پڑھی گئی۔ دعاء بھی مانگ لی گئی۔ اب آگے زوائد کی بات ہے۔

جہاں تک حدیث کی شرح کا تعلق ہے وہ اساتذہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں کیا عرض کروں؟۔ میں تو ان سے بہت زیادہ کم علم ہوں تو وہ بھی حق ادا ہو گیا یا ہو جائے گا کہ جو استاذ بخاری پڑھانے کے متعلق ہیں۔ وہ حدیث کی شرح کر دیں گے اور اگر کسی درجہ میں کوئی شرح کر سکتا تھا۔ تو تین سال ہوئے یہاں آ کے شرح بھی کر دی تھی۔ جب ختم بخاری ہوئی تھی، میں بھی اس میں شریک ہوا تھا۔ تو حدیث پر تقریر ہو گئی تھی وہ آئندہ کے لئے بھی کافی ہے۔ اس وقت اس مقدس جلسے میں تو صرف اظہار مسرت و مبارک باد مقصود ہے۔

شرف اولیت...... کیونکہ جہاں تک انسانوں کا تعامل ہے۔ دو چیزیں خوشی کی اور مبارک باد کے قابل سمجھی گئی ہیں۔ ایک کسی شئے کا آغاز اور ایک اختتام۔ آغاز پر بھی لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور اختتام پر بھی۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشیاں مناتے ہیں، مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آج اس کی انسانیت کا آغاز ہو رہا ہے۔ ابتداء ہو رہی ہے۔ اس واسطے خوشی کرتے ہیں۔ کوئی شخص باغ لگاتا ہے تو پہلا درخت نصب کر کے احباب کو بلاتا ہے مٹھائی تقسیم کرتا ہے، اس لئے کہ باغ کا آغاز ہو گیا۔

کوئی شخص دکان کھولتا ہے تو اکثر اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے کہ صاحب! آپ ہی افتتاح کر دیں۔ مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بہر حال آدمی کا آغاز ہو یا اس کے افعال کا آغاز ایک خوشی کی چیز ہے اور اسی لئے کسی چیز کی اولیت کو شرف سمجھا گیا اور اس کو فضیلت مانا گیا ہے۔ جو شخص بھی کسی کام کی ابتداء کرے وہ ایک تاریخی چیز بن جاتی ہے کہ فلاں کام کا یا فلاں بات کا فلاں نے آغاز کیا ہے تو اولیت ایک شرف ہے۔

نورِ علم...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں جو احادیث آئی ہیں، ان میں اولیات کو ایک خاص

مقام حاصل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ.'' ① ''سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا فرمایا''۔

ظاہر بات ہے کہ نور سے مراد حسی نور نہیں ہے جیسے سورج یا چاند کا نور ہوتا ہے یہ نور اس کے سامنے معمولی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ہے، وہ نور حقیقت محمد یہ کا ہے۔ یعنی سب سے پہلے اللہ نے حقیقت محمد یہ پیدا کی اور وہ ہے نور یعنی میرا نور بنایا۔ حسی نور نہیں معنوی نور اور معنوی نوروں میں سب سے زیادہ علم کا نور اکمل ہے، جس طرح سے حسی نور کے چاندنے میں آپ راستہ پالیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ چیز اچھی ہے یا بری ہے۔ ادھر چلنا چاہئے ادھر نہیں۔ نور آفتاب میں راہ طے کرتے ہیں۔ اچھے برے کی تمیز کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر نور علم ہے جس میں کسی شی کی خوبی اور خرابی کو پہچانا جاتا ہے۔ علم کی روشنی میں جائز اور ناجائز اور حلال وحرام کی تمیز ہوتی ہے۔ یہ چیز مرضی خداوندی اور یہ نامرضی خداوندی ہے۔ یہ اللہ کی پسند اور یہ ناپسند ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کی تمیز سورج کے نور سے نہیں ہو سکتی۔ سورج کا نور شکلیں دکھلا دے گا اور علم کا نور حقیقتیں دکھلاتا ہے حقائق کے اندر امتیاز پیدا ہوگا۔ صورت دکھلا دینا یہ کوئی بڑی چیز نہیں۔ اس لئے آفتاب کا نور کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لالٹین، انڈے اور بجلی کا نور ہے۔ اس میں شکلیں، صورتیں، رنگ اور الوان پہچانے جاتے ہیں لیکن علم کا نور وہ ہے جس میں حقائق پہچانے جاتے ہیں جس کے اندر شریعتیں پہچانی جاتی ہیں۔ شریعتوں کے احکام کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ احکام کی علتیں پہچانی جاتی ہیں۔ علتوں سے احکام نکالے جاتے ہیں اسرار و معارف اور حقائق پہچانے جاتے ہیں تو علم کا نور بہ نسبت آفتاب کے نور کے عظیم نور ہے۔

حقیقت محمد یہ (صلی اللہ علیہ وسلم)...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت نور علم ہے یعنی آپ کی حقیقت میں علم گوندھ دیا گیا ہے اس لئے آپ نے فرمایا: ''اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ.'' ''اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطا کر دیئے گئے''۔ تو آپ اعلم البشر ہیں۔ کائنات میں وہ علم نہ ملائکہ کو دیا گیا نہ انسانوں کو جو علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ تو آپ ساری خلائق میں سب سے زیادہ علم والے اور اعلم الخلائق ہیں۔ وہ کیوں ہیں؟

اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت ہی علم سے گوندھ کر بنائی گئی ہے۔ اس لئے آپ کی شریعت علم سے لبریز ہے کوئی حکم نہیں جس کے نتیجے میں حکمت نہ ہو۔ کوئی نقل نہیں جس کے اندر عقل چھپی ہوئی نہ ہو۔ کوئی صورت حکم نہیں جس کے اندر حقائق کی تہ بہ تہ جمی ہوئی نہ ہو۔

حرف حرفش راست اندر معنی　　　　معنی در معنی در معنی

ایک ایک حرف کے اندر حقائق کے دریا چھپے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم آپ پر معجزہ بنا کر بھیجا گیا۔ وہ علمی معجزہ

① قال العلامة الكهنوى: وقد اشتهر بين القصاص حديث "اول ماخلق الله نورى" وهو حديث لم يثبت بهذا المعنى وان ورد غيره موافق له في المعنى.

ہے۔تو قرآن کریم کی حقیقت علم سے لبریز ہے۔تو ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم خود علم سے گوندھی ہوئی ذات ہوئی۔ شریعت وہ دی گئی جو علم سے لبریز ہے۔شریعت کا کوئی حکم نہیں جس کی حقیقت ولمیّت موجود نہ ہو۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی ارشاد فرمایا: ﴿اَدْعُوْآ اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَاوَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَامِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ ① ''میں اور میرے ماننے والے دین کے بارے میں بصیرت پر ہیں''۔یعنی اسلام چند بندھی رسوم کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ حقائق سے لبریز دین ہے جو اس دین کی واقفیت حاصل کرے گا علوم وکمالات سے بھر جائے گا۔دنیا اور آخرت کے سارے راز اس پر کھلیں گے۔بہر حال نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جامع العلوم ہیں۔

کمالات نبوّت کے منتہیٰ ......اور اس لئے آپ کو خاتم الانبیاء بنایا گیا۔ختم نبوّت کے معنی قطع نبوّت کے نہیں کہ نبوّت دنیا سے اٹھ گئی ہے۔ختم نبوّت کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ نبوت کے جتنے مراتب اور کمالات ہیں وہ آپ کی ذات پر لا کر جمع کر دیئے گئے۔اب نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے کہ بعد میں کسی کو نبی بنا کر لایا جائے اور اس کو ظاہر کیا جائے۔سارے کمالات نبوت علمی ہوں، اخلاقی ہوں عملی ہوں وہ سب آپ ؐ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ان کی انتہا ہوگئی۔تو آپؐ سارے کمالات نبوّت کے منتہی ہیں۔اخلاق کو دیکھو تو آپ صابر ہی نہیں بلکہ سید الصابرین ہیں، آپ شاکر ہی نہیں۔ بلکہ سید الشاکرین ہیں' آپؐ فقط حیاء والے ہی نہیں بلکہ حیاء والوں کے سردار ہیں اور حیاء کے سارے مراتب آپؐ میں جمع ہیں۔غیرت وحمیت اور شجاعت وسخاوت اور جتنے بھی اعلیٰ ترین اخلاق ہیں آپ ان سب کا منتہی ہیں کہ تمام اخلاقی درجات آپ پر لا کر ختم کر دیئے گئے۔اسی لئے فرمایا گیا ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ ② ''آپ خلق عظیم کے اوپر ہیں''۔

مراتب اخلاق......اس لئے کہ اخلاق میں اگر غور کیا جائے تو تین مرتبے نکلتے ہیں۔ایک خلق حسن، ایک خلق کریم اور ایک خلق عظیم۔خلق حسن کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امر کیا گیا، حق تعالیٰ نے فرمایا: ''خَلِیْلِیْ حَسِّنْ خُلُقَکَ وَلَوْمَعَ الْکُفَّارِ.'' ③ ''اے میرے خلیل! حسن اخلاق سے پیش آؤ، چاہے کفار ہی تمہارے سامنے کیوں نہ ہوں؟''

دوسرا درجہ خلق کریم کا ہے۔آدمی کا کریم الاخلاق ہونا یہ دوسرا مقام ہے اور تیسرا مقام خلق عظیم کا ہے۔ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ.'' ④ ''میں مبعوث کیا گیا

---

① پارہ:۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ:۱۰۸۔ ② پارہ:۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ:۴۔

③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم من اسمہ: محمد ج:۱۴ ص:۲۷۲. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ مؤمل بن عبدالرحمٰن الثقفی وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۸ ص:۲۰۔

④ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیھا. ج:۱۰ ص:۱۹۲۔

ہوں اس لئے کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں''۔

تعریف اخلاق......تو آپ پر کریمانہ اخلاق، اخلاق حسنہ اور اخلاق عظیم بھی مکمل ہو گئے۔ان تینوں اخلاق میں کیا فرق ہے؟خلق حسن کے معنی عدل ومساوات کے ہیں کہ جو ادھر سے ہو اس کے برابر ادھر سے ہو۔اگر آپ کے ساتھ کوئی ایک پیسے کا سلوک کرے تو آپ کا فرض ہے کہ ایک پیسے کے برابر آپ بھی سلوک کریں کہا جائے گا کہ انہوں نے خلق حسن برتا۔اخلاق حسنہ کا آدمی ہے کہ بدلہ برابر کر دیا۔

اس کے برخلاف اگر کسی نے آپ کو تھپڑ مار دیا تو آپ کو حق ہے کہ آپ بھی تھپڑ ماریں۔اگر تھپڑ سے زیادہ مکہ ماریں گے تو کہیں گے بدخلق آدمی ہے۔اسے برابری کا حق تھا کہ دوسرے نے اس کو تھپڑ مارا، اسے بھی تھپڑ مارنے کا حق تھا۔تھپڑ کی بجائے مکہ مار دینا بداخلاقی وزیادتی شمار ہوگی۔اس نے اتنی زیادتی نہیں کی تھی کی جتنی آپ نے کی تو آپ مستحق سزا ہوں گے تو خلق حسن کے معنی عدل ومساوات کے ہیں کہ نیکی اور برائی کے اندر برابر آپ بدلہ لیں یہ خلق حسن ہے۔

خلق کریم اس سے اگلا مرتبہ ہے۔وہ یہ کہ آپ کے ساتھ اگر کوئی برائی سے پیش آئے تو آپ بدلہ نہ لیں، بلکہ معاف کر دیں، درگزر کریں یہ خلق کریم ہے۔اگر بدلہ لے لیا تو خلق حسن ہے بشرطیکہ برابر سرابر بدلہ ہوا اور اگر برائی کو معاف کر دیا یا ایک روپے کے بدلہ میں دو روپے دے دیئے ورنہ ایک روپیہ کا بدلہ ایک روپے سے دے سکتا تھا۔تو کہیں گے خلق کریم کا برتاؤ کیا۔یہ آدمی کریم النفس ہے بہرحال مساوات سے آگے بڑھ کر کچھ کام کرے وہ خلق کریم کہلائے گا۔

اور تیسرا درجہ خلق عظیم کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے آپ کے ساتھ برائی کی تو نہ صرف یہ کہ آپ نے بدلہ نہ لیا نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا بلکہ اوپر سے برائی کرنیوالے کے ساتھ احسان بھی کیا۔یہ خلق عظیم ہے۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم......جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی۔فرمایا گیا ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ① اس سے زیادہ فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ ② وہ جو اللہ نے آپ میں کوٹ کوٹ کر رحمت بھر دی ہے۔اس کی وجہ سے آپ رقیق القلب ہیں، قلب مبارک نہایت نرم ہے۔ذرا سی مصیبت کسی کی دیکھی اور پگھل جاتا ہے۔قلب رحمت سے بھرا ہوا ہے۔﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ③ اگر آپ سخت دل ہوتے، یہ جو آپ کے اردگرد پروانوں کی طرح لوگ جمع ہیں۔یہ اٹھ اٹھ کر بھاگ جاتے۔سب آپ کے اخلاق نے انہیں جذب کر رکھا ہے۔آپؐ کے اخلاق کیا ہیں؟

پہلا درجہ فرمایا گیا ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ④ یہ نہیں کہا گیا کہ برابر سرابر بدلہ لے لیں۔اگر کوئی برائی کرے تو

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۹۹ . ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹ .

③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹ . ④ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹ .

معافی اور ایثار سے کام لیں۔ آپ معاف کر دیں، بدلہ لینے کا تصور نہ کریں۔ بدلہ لینے سے آپ کی ذات بہت بالاتر ہے۔ اگر چہ برابر کا بدلہ لینا وہ بھی خلقِ حسن ہے مگر آپ کے اخلاق اس سے زیادہ بلند ہیں۔ آپ کا ابتدائی خلق یہ ہے کہ جب کوئی برائی کرے تو آپ تو معاف کر دیں۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ① اس برائی کرنیوالے کے لئے دعاء مغفرت بھی کریں یہ ایک درجہ اور بڑھادیا۔ دوسرا گالیاں دے رہا ہے اور آپ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ② آپ ان سے مشورہ لیں یہ اس سے بھی اونچا مقام ہے۔ اس مجموعہ کا نام خلقِ عظیم ہے۔ تو خلقِ عظیم میں خلقِ حسن اور خلقِ کریم بھی درج ہے۔

درجات تربیت...... انبیاء علیہم السلام جامع الاخلاق ہوتے ہیں لیکن تربیت کرنے میں انبیاء علیہم السلام کے درجات ہیں ان درجات میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاں خلقِ حسن کا درجہ ہے۔ جس پر انہوں نے اپنی امت کو تربیت دی کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے، تمہارا فرض ہے کہ تم برائی کا بدلہ لو۔ موسوی شریعت کے اندر معاف کرنا جائز نہیں تھا۔

فرمایا گیا ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ......﴾ ③ ہم نے اہل تورات پر لازم کر دیا تھا کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے تو معاف کرنا جائز نہیں۔ بدلہ لینا ضروری ہے۔ اگر کوئی دانت توڑے، تمہارا فرض ہے کہ تم بھی دانت توڑ دو۔ کوئی آنکھ پھوڑ دے تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑ دو۔ کوئی تھپڑ مارے، تم بھی تھپڑ مارو۔ بدلہ لینا واجب ہے عفو کرنا جائز نہیں۔ یہ موسوی شریعت ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو خلقِ حسن پر تربیت دی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، انہوں نے خلقِ کریم پر تربیت دی۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی برائی کرے تو بدلہ لینا جائز نہیں۔ معاف کرنا واجب ہے۔ تو وہاں تشدد غالب ہے۔ یہاں تساہل غالب ہے۔ یہاں یہ حکم ہے کہ اگر کوئی تمہارے بائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کر دو کہ بھائی ایک اور مارتا جا خدا بھلا کرے۔

یہ نہیں کہ بدلہ لو۔ بدلہ لینا جائز نہیں، معاف کرنا واجب ہے جھک کر تواضع سے رہنا ضروری ہے۔ اسی میں تمہارے نفس کے لئے انکسار ہے۔ اسی میں اولیت واولویت ہے تو یہاں خلقِ کریم پر تربیت دی گئی۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو خلقِ عظیم پر تربیت دی ہے کہ کوئی برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلا کرو۔ ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ ④ ''دوسروں کی برائی کا بدلہ اپنی بھلائی سے دو۔ وہ گالیاں دے تم دعائیں دو''۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ جہاز میں سوار تھے اور حج کے لئے جا رہے تھے۔ لوگوں نے انکے مقام کو نہ پہچانا کسی نے برا کہا، کسی نے گالی دی، کسی نے کچھ اور کہا وہ گالیاں دے رہے ہیں اور جنیدؒ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ ان کو ہدایت دے اور انہیں وہی مقام دے جو تو نے مجھے دیا ہے تو وہ برائی کے درپے ہیں یہ ان کی بھلائی

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

③ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۴۵۔ ④ پارہ: ۲۴، سورۃ الفصلت، الآیۃ: ۳۴۔

کے در پے ہیں۔اس شان سے امت محمدیہ کو یہ تربیت دی گئی ہے کہ ان کے اندر خلق عظیم آئے۔

شرف خاتمیت ......عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ: اخلاق کے تین مراتب ہیں۔اعلیٰ ترین مرتبہ خلق عظیم ہے۔ اس کے بعد کوئی مرتبہ نہیں۔وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا تو آپ جامع الاخلاق اور جامع الکمالات ہیں۔علم بھی آپ کو اگلوں اور پچھلوں کا دیا گیا۔تو آپ جامع العلوم بھی ہیں۔احوال سابقہ سارے آپ کے اوپر طاری ہوئے تو آپؐ جامع الاحوال بھی ہوئے۔اس لئے آپ کو خاتم بنایا گیا کہ آپ کمالات علم، کمالات عمل اور کمالات اخلاق کے منتہی ہیں۔گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کمالات سے بھرپور ہے۔اس کو آپ نے فرمایا: ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ.'' سب سے پہلے میری حقیقت پیدا کی گئی۔وہ حقیقت علم اور کمالات سے گوندھی ہوئی ہے۔مگر عرض یہ کرنا تھا کہ مناقب میں اولیت کا ذکر کیا گیا۔اگر یہی چیزیں بعد میں پیدا کر دیتے کسی اور کو پہلے لاکر تو کمالات کے جامع جب بھی آپ ہی ہوتے مگر وہ جو اول ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ نہ ملتا۔تو اولیت بھی عطاء کی گئی۔تو ایک طرف تو خاتمیت عطاء کی گئی کہ آپؐ سب سے اخیر میں ہیں اور ایک طرف اولیت عطاء کی گئی۔

تو آپؐ ان کمالات میں جو اللہ نے عطاء کئے ہیں اول بھی ہیں آخر بھی ہیں۔رجوع آپ ہی کی طرف ہوگا۔ تو اولیت ایک عظیم فضیلت ہے۔یا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ مِنْهُ الْقَبْرُ.'' ① ''سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا اور بعد میں سب کو اٹھاؤں گا''۔ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو اٹھائیں گے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو جنت البقیع میں مدفون ہیں انہیں اٹھاؤں گا۔اس کے بعد مکہ کی طرف جنت المعلیٰ ہے۔وہاں کے قبرستان سے لوگ اٹھیں گے اور سب میرے ساتھ ہوں گے تو قبر سے اٹھنے میں آپ کی اولیت ثابت ہے۔

''اَنَا اَوَّلُ مَنْ یَّفْتَحُ بَابَ الْجَنَّةِ'' ② ''سب سے پہلے میں ہوں گا جو جنت کا دروازہ کھولوں گا''۔اس واسطے وہاں بھی آپ ہی کو اولیت حاصل ہے۔''وَاَنَا قَائِدُهُمْ اِذَا وَفَدُوْا وَاَنَا خَطِیْبُهُمْ اِذَا اَنْصَتُوْا'' ③ ''قیامت کے دن سب سے پہلے میں قائد ہوں گا''۔میری قیادت میں دنیا کی امتیں چلیں گی، میں ہی شفاعت کبری کروں گا، سب امتیں میرے جھنڈے کے نیچے آئیں گی۔تو دنیا وآخرت کی جتنی بھی اولیتیں ہیں، وہ سب آپؐ کے لئے ثابت ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ اولیت ایک عظیم شرف ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر چیز کی اولیت پر اور ابتداء وآغاز پر لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔

تکمیل پر مسرت ......اسی طرح سے دوسرا مقام اختتام کا ہے کہ اس پر خوشی منائی جاتی ہے۔جب کوئی چیز مکمل ہو جاتی ہے تو خوشی مناتے ہیں کہ آج پوری ہوگئی۔بچہ اگر تعلیم سے فارغ ہو کر سند حاصل کرے، آپ دعوت کرتے

① الصحیح للبخاری، کتاب الخصومات، باب مایذکر فی الاشخاص......ج: ۲ ص: ۸۵۰ رقم: ۲۲۸۱.

② مسند ابی یعلی الموصلی، شهر بن حوشب عن ابی هریرةؓ ج: ۱۳ ص: ۳۹۶.

③ السنن للامام الدارمی، باب ماعطی النبی ﷺ من الفضل، ج: ۱ ص: ۴۰.

ہیں کہ بچہ فارغ ہوگیا۔ یعنی اس کا علم حد اختتام کو پہنچ گیا۔ جو تدریس کا سلسلہ تھا، اس میں آخری مرتبے پر آ گیا۔ تو انتہاء کی بھی خوشی کرتے ہیں۔

آپ کہیں گے، بچے کی پیدائش پر خوشی کرنا صحیح ہے لیکن اس کا تقاضا یہ ہے جس دن اس کا انتقال ہو، اس دن بھی خوشیاں منائی جاتیں حالانکہ اس دن روتے ہیں خوشیاں کوئی بھی نہیں مناتا۔ اس قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ جب ابتداء میں خوشی کی گئی تو انتہاء میں بھی خوشی کی جائے۔

میں کہتا ہوں کہ: انتہاء میں بھی آپ خوشی کرتے ہیں۔ موت پر کبھی کوئی رنجیدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جب اچھی موت ہو بعض اوقات کہا کرتے ہیں کہ: بھئی بڑا اچھا آدمی تھا، خدا ایسی موت ہر ایک کو نصیب کرے۔ مرنا تو تھا ہی، مگر ایسی موت نصیب ہوئی، بڑی خوشی کی بات ہے، بڑی فرحت کی بات ہے۔ کوئی جام شہادت پی لے تو آپ کہتے ہیں کہ بھئی! موت تو اپنے وقت پر آتی ہے لیکن شہید ہو کر مرا ہے۔ کتنی خوشی کا مقام ہے۔

موت کی خوشی ...... اور ویسے بھی مرنے کے معنی اللہ سے مل جانے کے ہیں۔ تو کیا اللہ سے مل جانا کوئی غم کی چیز ہے کہ اس میں آدمی رنج کرے کہ ہائے فلاں آدمی خدا سے کیوں مل گیا؟ حدیث میں فرمایا گیا: ’’اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَعْلَمُ اَنِّىْ رَسُوْلُكَ.‘‘ ① ’’یا اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے، جو میرے رسول ہونے کا قائل ہے‘‘

کیوں محبت ڈال دے؟ کیوں موت محبوب بنائی گئی؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ: ’’اِنَّ الْمَوْتَ جِسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ.‘‘ ② ’’موت ایک پل ہے جس سے آدمی گزر کر محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے۔ اپنے پروردگار سے جا ملتا ہے‘‘۔ تو موت در حقیقت بندے کو خدا سے ملانے کا ذریعہ ہے۔ یہ نہیں کہ بندہ تو خدا سے مل رہا ہے اور آپ بیٹھ کر رنج کریں؟ اور آہ و فغاں کریں؟ بلکہ حقیقت میں موت بھی خوشی کی چیز ہے پھر بھی جو غم کرتے ہیں۔ وہ غم موت کا نہیں، جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے فلاں عزیز جدا ہو گیا۔ اس پر غم نہیں کہ مر کیوں گیا؟ اللہ سے کیوں مل گیا؟ بلکہ ایک نعمت ہم سے چھنی اصل میں اس کا غم ہوتا ہے۔ یہ غم اس کی موت پر نہیں ہوتا۔ یہ غم فراق کا ہوتا ہے کہ ہم سے فلاں آدمی چھن گیا۔

تو غم حقیقت میں جدائی کا کرتے ہیں۔ موت کا غم نہیں ہوتا، نہ اس کا غم ہوتا ہے کہ بندہ اللہ سے کیوں مل گیا؟۔ لہٰذا موت بھی ایک خوشی کی چیز ہے۔ اور اہل اللہ کے ہاں تو اس سے زیادہ فرحت کی چیز ہی کوئی نہیں۔

ابن الفارض کہتے ہیں ؎

---

① المعجم الكبير للطبراني، ج:۳ ص:۱۸/۷۴۔ علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه الطبراني وفيه محمد بن اسماعيل بن عياش وهو ضعيف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج:۱۰ ص:۳۰۹۔

② یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے دیکھئے: فيض القدير، ج:۳ ص:۲۳۳۔

خرم آن روز کزیں منزل ویراں بروِیم　　　　تا درمیکدہ شاداں و غزل خواں بروِیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے دیار کو چھوڑیں گے۔ اور اپنے محبوب حقیقی سے جا کے ملیں گے۔

شوق ملاقات محبوب...... حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جب وفات کا وقت آیا تو چہرہ کھلا ہوا ہے اور چہرے پر ایسی خوشی کہ عمر بھر اتنی خوشی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ لوگوں نے عرض کیا: ''موت کی تو تکلیف گزر رہی ہے اور چہرہ آپ کا دمک رہا ہے۔ خوشی سے نورانیت برس رہی ہے'' فرمایا: ''غَدًا نَلْقَى مُحَمَّدًا وَّاَصْحَابَهٗ.'' بس ''اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی''۔ اس لگن میں مطمئن ہوں۔ تو موت کی خوشی کوئی ان اہل حقیقت سے پوچھے کہ اس گندے عالم کو چھوڑ کر پاکیزہ عالم میں جا رہے ہیں یہاں کے دوستوں کو چھوڑ کر جن کی دوستی مشکوک ہے، ان دوستوں میں جا رہے ہیں جن کی دوستی میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

منصورؒ اکثر قبرستان میں رہتے۔ لوگ کہتے کہ شہروں کو چھوڑ کر قبرستانوں میں کیوں جاتے ہو؟ تو کہتے کہ میں اس قوم کے پاس رہتا ہوں جو نہ غیبت کرتی ہے نہ جھوٹ بولتی ہے نہ چغلی کھاتی ہے نہ بدخواہی کرتی ہے۔ مرنے کے بعد آدمی کی برائیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اس کی جتنی نیکیاں ہیں وہ ابھر جاتی ہیں۔ اس لئے آدمی ان سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے ملے تو اس سے بڑھ کر خوشی کا کیا مقام ہے؟ تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موت بھی خوشی کی چیز ہے اور آپ بھی درحقیقت خوش ہی ہوتے ہیں مگر اس کے اوپر جدائی کا غم چونکہ غالب ہو جاتا ہے تو وہ خوشی دب جاتی ہے۔ اگر جدائی کی غمی نہ ہوا کرتی تو شاید لوگ میت پر شادیانے بجایا کرتے کہ بڑا اچھا ہوا اللہ سے جا ملا۔ مگر اس خوشی کے اوپر جدائی کا غم غالب آ جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہے کہ خوشی کی دو چیزیں ہیں۔ ایک آغاز اور ایک اختتام۔

اصل خوشی...... آغاز میں توقع پر خوشی ہوتی ہے۔ ابتداء آدمی توقع باندھتا ہے کہ آج میں نے بچے کو پڑھنے کے لئے بٹھایا ہے۔ امید ہے کہ آٹھ برس میں عالم بن جائے گا۔ اس توقع پر خوشی مناتے ہیں یہ نہیں کہ آج کوئی خوشی میسر آ رہی ہے۔ اگر باغ لگاتے ہیں اس کی ابتداء میں خوشی کریں تو توقع کی خوشی ہوتی ہے کہ اب چند دن کے بعد پھل دے گا اور ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ غرض ابتداء کی خوشی محض توقع پر مبنی ہوتی ہے واقع پر مبنی نہیں ہوتی۔ لیکن انتہاء کی خوشی واقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ شی تکمیل کو پہنچ گئی۔ ختم ہونے کا یہاں یہ مطلب ہے کہ دلوں کے اندر مکمل ہو گئی۔ ساری احادیث کو عبور کر کے آج اس درجے پر آ گئے کہ ہم سات ہزار احادیث کے عالم بن گئے۔ بقدر استعداد ہم نے علم حاصل کر لیا۔ وہ ہمارے اندر مجتمع ہے۔ تو اختتام کے وقت جو خوشی ہوتی ہے۔ وہ تکمیل شئے پر اور ابتداء میں محض توقعات پر خوشی ہوتی ہے۔ کسی شے کا وجود نہیں ہوتا۔ اس لئے اصل خوشی اختتام کی ہے۔ تو آج خوشی کا دن ہے کہ بخاری ختم ہوئی۔

قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ...... غور یہ کرنا ہے کہ آخر ختم پر ہم نے کیوں خوشی منائی؟ آپ کو بخاری

پڑھنے کے بعد دو چیزیں حاصل ہوئیں۔ ایک متن حدیث اور اس کی مرادات جو آپ کے اساتذہ نے آپ کو سمجھائیں۔ کتاب الایمان اور اس کی احادیث کے یہ مطالب و مرادات ہیں۔ کتاب العلم اور اس کی احادیث کے یہ مطالب ہیں۔ یہ مفہوم شرعی ہے۔ کتاب الطہارات، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الحج اور پھر آگے معاملات اور کتاب الاجتہاد اور غزوات، ان تمام چیزوں میں دو ہی باتیں ہیں۔ ایک متن حدیث وہ آپ تک پہنچا اور آپ نے اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھ لیا اور دوسرا یہ کہ آپ کو سند ملی۔

آپ نے کہا مجھے یہ حدیث میرے استاذ سے پہنچی۔ اسے اس کے استاد سے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ مل گیا۔ گویا آپ کے قلب کا رشتہ قلب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہوگیا اور ایک نورانی سلسلے سے کلام کے لفظ اور معانی آپ کے قلب تک آگئے۔ تو متن حدیث کے ساتھ آپ کو سند بھی حاصل ہوگئی اور آپ مستند عالم ہوگئے۔

ضرورت سند...... اور محض عالم ہونا کافی نہیں، مستند عالم ہونا ضروری ہے۔ جس عالم کا بلا انقطاع سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہو جائے، وہی عالم ہے۔ اگر آپ دیکھیں اس سے سلسلہ ہی قطع ہوگیا۔ نہ اس نے کسی استاد سے تعلیم پائی نہ سند حاصل کی، نہ تربیت حاصل کی اور پھر وہ جو کچھ کہہ رہا ہے تو وہ قوت مطالعہ سے کہہ رہا ہے۔ اپنے نفس کو امام بنا کے کہہ رہا ہے کہ جو میرے نفس نے سمجھ لیا وہ میں کہہ رہا ہوں۔ ظاہر بات ہے وہ مراد ربانی نہیں ہوسکتی مراد نبوی نہیں ہوسکتی۔ اس کے نفس کی مراد ہوسکتی ہے۔

اس لئے کہ لفظ اللہ و رسول کے لئے، اور معانی اپنے ڈال دیئے لفظ منقول لئے اور معنی غیر منقول لئے وہ معانی ہمیں مطلوب نہیں جو سند کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو کر ہم تک نہ پہنچیں۔

مسلسلات...... محدثین نے تو سند کا یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ نہ صرف لفظ اور معانی ہی کو نقل کیا بلکہ ان ہیئتوں کو بھی نقل کیا ہے جو حدیث کے پڑھنے اور سننے میں ان کے سامنے آئیں، استاذ کی حالت و کیفیت کو بھی سند کے ساتھ نقل کیا۔ چنانچہ مسلسلات کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے ''الدر الثمین'' مستقل رسالہ لکھا اس میں فقط الفاظ و معانی کی ہی نقل و روایت نہیں بلکہ ہیئتوں کی بھی ہے۔ ان افعال کی بھی سند جو افعال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلائے جیسے کہ مثلاً حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''صَافَحْتُ بِكَفِّيْ هٰذِهٖ كَفَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ① ''میں نے اپنی اس ہتھیلی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے مصافحہ کیا اور اپنی ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی''۔ اور کہتے ہیں ''فَمَا مَسِسْتُ خَزًّا وَّلَا حَرِيْرًا اَلْيَنَ مِنْ كَفِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.'' ''میں نے جب اپنی ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی تو میں نے کوئی ریشم اور ملائم سے ملائم کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جیسی

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الصوم، باب مايذكر من صوم النبي صلى الله عليه وسلم والفطاره ج:٧ ص:٨٣.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک نرم تھی، تو میں نے اس کف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا''۔

تابعی کہتے ہیں کہ مجھے اجازت دیجئے میں آپ کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھوں تا کہ اس سلسلہ سے بالواسطہ میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی جائے، ان تابعی سے تبع تابعی بھی کہتے کہ مجھے آپ اجازت دیں کہ میں آپ سے مصافحہ کروں تا کہ دوواسطوں سے میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک پر رکھی جائے، اسطرح یہ حدیث چلی۔

عالی سند...... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ کو فرمایا کہ: اس وقت میری سند اپنی جماعت میں سب سے عالی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مجھ میں کم واسطے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے حدیث کی سند دوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ سہارن پور آ کر حدیث کی اجازت لو۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت! میں حاضر ہوں گا۔ لڑکپن کی بات تھی بھول بھال گئے۔ ایک برس گزر گیا۔ اتفاق سے میں ایک سفر میں ساتھ ہوا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ تو آیا نہیں؟ میں تجھے حدیث کی اجازت دیتا۔ میں نادم ہوا۔ میں نے کہا حضرت! اب حاضر ہوں گا۔ پھر ایک برس گزر گیا۔ وہ بھی لڑکپن کی بات تھی گزر گئی۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہجرت کر کے مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب فکر ہوئی کہ پھر یہ دولت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ تو میں نے سہارن پور کا سفر کیا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میں نے کہا: حضرت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ بہت خوش ہوئے مولانا زکریا صاحب سے فرمایا: مظاہر العلوم کے کتب خانہ میں جتنی حدیث کی متداول کتابیں ہیں سب لے آؤ۔ تو وہ معاجم مسانید اور صحاح ستہ لے آئے۔ ساری کتابیں جمع ہو گئیں۔ ہر ہر کتاب کا اول پڑھ کر حضرت نے مجھے حدیث کی اجازت دی۔ کچھ مجھ سے پڑھوایا، بعض کتابوں کی نقل کرنے کی اجازت دی۔

اس کے بعد فرمایا بھائی! مسلسلات کی اجازت بھی دے دوں گا۔ تو یہ جو مسلسل بالمصافحہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اس کی اجازت مصافحہ کر کے اور میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی رکھ کر دی۔ مصافحہ کیا اور حدیث نقل کی کہ یہ مصافحہ بھی مسلسل سند کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ ان واسطوں سے گویا تیری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر رکھی گئی۔

اس کے بعد دوسری حدیث ''حدیث مسلسل بالماء والتمر'' کی بھی عملاً اجازت دی۔ یہ حضرت علیؓ کی حدیث ہے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے کھجور کی ضیافت کی اور اس کے بعد آپ نے کھجور کھائی اور کھا کر الش حضرت علیؓ کو کھلایا اور پانی پیا اور پانی حضرت علیؓ کو پلایا۔ گویا کھجور اور پانی کی دعوت کی اور دعوت کر کے پھر وہ حدیث سنائی کہ کھجور اور پانی کی دعوت کرنے میں کیا فضیلت ہے۔

حضرت علی نے اسی طرح اپنے شاگرد کو اجازت دی کہ خود کھجور کھائی۔ الش اسے کھلایا۔ پانی پیا اور بچا ہوا پانی

پلایا اور حدیث پڑھی۔ یہ مسلسل عمل چلا آ رہا ہے تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کھجور منگوائی اور پانی بھی منگوایا (زمزم کا پانی) کھجور کھا کر الش مجھے کھلایا اور پانی مجھے پلایا اور حدیث نقل فرمائی۔ اور اس کی اجازت دی۔ تو عملاً حدیث مسلسل بالماء والتمر اور مسلسل بالمصافحہ کی اجازت دی اور پھر روایۃً ساری مسلسل کی اجازت دی کہ میں حدیث کی اجازت دیتا ہوں تو ان کی روایت کر سکتا ہے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ محدثین نے فقط قول نبی نقل نہیں کیا معانی بھی نقل کئے اور معانی ہی نہیں بلکہ وہ افعال اور ہیئتیں بھی سند کے ساتھ ہم تک پہنچائے جو افعال پہنچتے آئے ہیں۔

محدثین کی احتیاط...... معمولی سی بات ہے کہ میں نے مشکوٰۃ اپنے والد ماجد سے پڑھی تھی۔ تو نوحہ کی حدیث آئی۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا تھا۔ تو وہ وصیت کر کے جاتا تھا کہ چھ مہینے تک یا سال یا دو برس تک مجھے رویا جائے اب ظاہر بات ہے کہ اتنے دنوں تک آنکھوں میں کوئی آنسو لے کر بیٹھ جائے تو یہ ہو نہیں سکتا اور نہ روئے تو لوگ کہیں گے بھئی! کوئی بڑا آدمی نہیں تھا۔ معمولی تھا۔ مر گیا لہٰذا چھ مہینے روؤ تا کہ معلوم ہو کہ کوئی بڑا آدمی گزرا ہے۔ مگر اب چھ مہینے تک روئے کون؟ تو رونے والیاں کرائے پر رکھی جاتی تھیں کہ وہ چھ مہینے تک بیٹھ کر روئیں اور وہ عورتیں ہی رکھی جاتی تھیں۔ اس لئے کہ آنسو بہانا انہیں آسانی سے آتا ہے بس ارادہ کیا اور ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے شروع ہو گئے۔ تو رونے اور رلانے کے لئے عورتوں سے بہتر دوسرا کرایہ دار نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے عورتوں کو کرایہ پر رکھتے تھے۔ اجرت بھی دی جاتی اور کھانا کپڑا بھی اور ان کا طریقہ کیا تھا؟ گھر میں بیٹھی ہوئی ہیں کھا پی رہی ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیت کے لئے آیا، بس وہ فوراً گھیرا بنا کر بیٹھ گئیں اور انہوں نے "راں راں" کر کے رونا شروع کیا۔ "وَاكَذَاہ! وَاجَبَلَاہ! وَاشَمْسَاہ!" تو تو پہاڑ تھا، تو تو آفتاب تھا، چاند تھا، وغیرہ۔ اور پوری لے کے ساتھ اور کچھ "راں راں" کر کے دکھلایا کہ یوں روتی تھیں۔

ہمیں حیرت ہوئی کہ اس کی کیا ضرورت تھی؟ پھر خود ہی فرمایا کہ تمہارے ذہنوں میں سوال پیدا ہوا ہو گا کہ میں نے "راں راں" کر کے کیوں دکھلایا؟

فرمایا اس لئے کہ جب مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے حدیث پڑھی، تو انہوں نے یوں ہی "راں راں" کر کے دکھلایا تھا اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو اس حدیث پر انہوں نے بھی یوں ہی "راں راں" کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ: جب میں نے شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی یہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی یہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تو انہوں نے یہی کر کے دکھلایا اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جب میں نے شیخ ابو طاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث

پڑھی۔ انہوں نے یونہی کر کے شاہ ولی اللہ کو دکھلایا اور اس ''راں راں'' کی صحابی تک سند پہنچادی۔

تو محدثین نے اتنی احتیاط برتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ نقل کئے بلکہ ہیئتیں بھی نقل کیں۔ بلکہ وہ عوارض اور احوال بھی سند کے ساتھ پہنچائے تا کہ معلوم ہو کہ پورے وثوق کے ساتھ انہیں حدیث آئی اور حدیث سنی ہے۔

غیر مستند عالم...... اب جس شخص کے پاس سند نہ ہو، محض ترجمے دیکھ کر وہ حدیث بیان کرے۔ وہ قابل اعتبار نہیں وہ مستند عالم نہیں ہے۔ اسے عالم نہیں کہیں گے زیادہ سے زیادہ ناقل کہیں گے۔ اگر نقل صحیح کر دی، کہیں گے نقل صحیح کی۔ غلط کی کہیں گے غلط کی، لیکن عالم کہہ دیں؟ یہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ عالم کے لئے استناد لازمی ہے بغیر استناد کے علم، علم نہیں ہوتا۔

عقلی علوم میں استناد ضروری نہیں ہے کہ آپ فلسفہ میں صدرا پڑھ کر یوں کہیں کہ ''حَدَّثَنَا فُلَانٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَرَسْطُوْ وَ اَفْلَاطُوْنَ'' وہاں ضرورت نہیں۔ اس واسطے کہ عقلی چیزیں ہیں، ہمیں بھی عقل ہے۔ انہیں بھی عقل تھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی عقلی باتوں میں غلطی کر گئے ہوں۔ ہم کہیں گے غلط کام ہوا۔ ہماری عقل میں یہ چیز آتی ہے۔ تو ہر شخص کو عقل دی گئی ہے، دوسرے کی عقل اس کے لئے حجت نہیں وہ تخطیہ کر سکتا ہے۔

لیکن نقل و روایت کی چیز میں پابند ہونا پڑے گا استاذ کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم نقل کر کے کہے گا میرے استاذ نے یہ نقل کیا پھر وہ کہے گا میرے استاذ نے یہاں تک کہ صاحب شریعت تک سند پہنچ جائے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں، وہ وحی سے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھ سے یوں فرمایا۔ تو ہماری سند حق تعالیٰ تک متصل ہو جائے گی۔ اگر بیچ میں ایک کڑی بھی ختم ہوگئی علم مستند باقی نہیں رہے گا۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں، نہ اسے عالم مستند کہیں گے۔

مثال غیر مستند عالم...... اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے مادی وراثت میں جب تک باپ سے نسب ثابت نہ ہو آپ وارث کیسے بنیں گے؟ پہلے آپ یہ ثابت کریں گے۔ یہ فلاں کا بیٹا ہے تو اس کا جو ترکہ ہوگا وہ اس کو ملے گا اور اگر آپ یہ ثابت نہ کر سکے اور لوگوں نے کہا کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ اس کے بیٹے نہیں۔ معلوم نہیں اس کا باپ کون ہے۔ یہ فرضی طور پر کھڑے ہو گئے۔ وراثت نہیں مل سکتی۔ تو وراثت کے لئے نسب کا ہونا ضروری ہے باپ سے سلسلہ نسب ہو تو کہا جائے گا کہ وارث ہے۔

ٹھیک اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کی وراثت علم ہے۔ اس کا وارث بھی وہ بنے گا جس کا سلسلۂ نسب روحانی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہوا ہو۔ وہاں مادی نسب ضروری ہے، یہاں روحانی نسب ضروری ہے۔ وہاں بغیر مادی نسب کے وراثت نہیں مل سکتی، یہاں بغیر روحانی نسب کے علمی وراثت نہیں ملے گی۔

تو ہم اس علم کو علم کہتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سے پہنچا ہو، جس علم کا ہماری عقل نے

اختراع کیا ہو، سنی سنائی باتیں کہہ رہے ہوں یا کسی ترجمہ میں دیکھ کر کہہ دیں۔ وہ مستند نہیں سمجھی جائیں گی۔ ایسے آدمی کو عالم نہیں کہا جائے گا۔ عالم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مستند ہو۔ کن اساتذہ سے اس نے علم حاصل کیا ہے؟ اس کا سلسلۂ نسب علم میں کہاں پہنچتا ہے؟ اگر نہیں پہنچتا ہم کہیں گے بھئی! تو بے باپ کا بیٹا ہے۔ اور جو بے باپ کا بیٹا ہے وہ وراثت کا مستحق نہیں ہوتا۔ بہر حال سب سے بڑی چیز سند اور استناد ہے۔

سببِ تبریک...... اسی واسطے محدثینؒ کہتے ہیں "لَوْلَا الْاِسْنَادُ لَبَطَلَ الدِّیْنُ." اگر دین میں اسناد نہ ہوتو دین ہی باطل ہو جائے۔ "لَقَالَ مَنْ شَآءَ مَاشَآءَ." ① "جس کا جو جی چاہے گا کہہ مارے گا"۔

اور کہے گا یہ دین کی بات ہے۔ ہر ایک کو حق ہوگا لیکن جب ہم پوچھیں گے سند کیا ہے؟ کس کے شاگرد ہو؟ وہ کس کے شاگرد ہیں؟ آگے وہ کس کے؟ جب تک اسناد پیش نہ کرے گا اس کے علم کو ہم علم نہیں کہیں گے۔ غرض علم میں سب سے بڑی چیز سند ہے۔

تو آپ کے لئے سب سے بڑی قابل مبارکباد چیز یہ ہے کہ بخاری ختم ہوئی۔ یعنی آپ کو سند حاصل ہوئی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک روحانی نسب نامہ مل گیا۔ آپ وہی کہہ رہے ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا اور وہی باتیں سمجھا رہے ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھائی تھیں اور صحابہ نے تابعین کو اور تابعین نے تبع تابعین کو۔ تو ایک متن حاصل ہوا جس سے علم کا دروازہ کھلا۔ ایک سند حاصل ہوئی جس سے آپ کا علم مستند اور دوسروں کے لئے حجت بنا بغیر سند کے وہ حجت نہ ہوتا۔ اس لئے محدثین نے سند ضروری قرار دی۔

وقعتِ روایت...... اور اس میں بھی ایک درجہ رکھا ہے کہ اس شخص اور اس راوی کی روایت زیادہ وقیع ہے جو اپنے شیخ سے کثیر الصحبت ہو۔ ایک راوی تو وہ ہے کہ اس نے استاذ کی زیارت کی، ملاقات ہوئی۔ ایک حدیث نقل کی اور ایک وہ ہے کہ برس دو برس شیخ کی خدمت میں رہ کر اس نے فن حاصل کیا۔ ظاہر بات ہے جو برس دو برس اپنے شیخ کی خدمت میں رہے گا، اسے قول اور فعل ہی حاصل نہیں ہوگا، بلکہ اس کے قلب کو وہ رنگ بھی ملے گا جو استاد کے قلب کا رنگ ہے اس تک وہ کیفیات بھی منتقل ہوں گی جو استاد کے قلب میں اوپر سے منتقل ہوتی آرہی ہیں۔ اس لئے جو راوی کثیر الصحبت ہے اس کی روایت کا جو وقار ہوگا وہ اس راوی کی روایت کا نہیں ہوگا۔ جس کی چند گھنٹے ملاقات ہوئی۔ حدیث سن کر چلا آیا سند ٹھیک ہے۔ مگر سند کے ساتھ وہ کیفیات منتقل نہیں ہوں گی۔ جو استاذ کے قلب میں تھیں اور وہ اصل چیز ہیں۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ ② "اللہ کا رنگ سب رنگوں پر غالب ہے"۔ اللہ نے وہ رنگ اپنے نبیؑ کے قلب میں ڈالا۔ نبیؑ نے اپنے فیضِ صحبت سے وہ رنگ صحابہؓ کے قلوب میں ڈالا۔ صحابہؓ نے اپنے

---

① الصحیح لمسلم، المقدمة، ج: ا ص: ۳۸. ② پارہ: ا، سورة البقرة، الآية: ۱۳۸.

فیض صحبت سے وہ رنگ تابعین کے قلوب میں ڈالا۔ انہوں نے تبع تابعین کے، وہ کیفیات، قلب کی صفائی اور ذوق و وجدان کا رنگ بھی درحقیقت منقول ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہم اسی کو صحیح مانیں گے جو اوپر سے منقول ہو۔ یعنی اپنے ذوق کا علاج بھی اپنے استاد سے کرائیں گے تاکہ ہمارا ذوق صحیح ہو جائے۔ اپنے وجدان کو استاذ کے آگے پیش کریں گے کہ ہمارا وجدان صحیح ہے یا غلط؟ تو ذوق بھی وہی ہونا چاہئے، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ وجدان کا رنگ بھی وہی ہونا چاہئے۔ جو اللہ کے رسول کا ہے۔

ذوق صحیح...... یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کے چار فرائض قرآن حکیم میں ذکر کئے گئے ہیں ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ ① پہلا کام یہ ہے کہ آپ آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ الفاظ خداوندی پوری امانت کے ساتھ امت کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہے ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور تعلیم معانی کا سمجھانا اور مرادات ربانی کا ذکر کرنا ہے۔ اسکے بعد فرمایا:

﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ حکمت بھی سکھلاتے ہیں۔ حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکمت نظری اور حکمت عملی۔ حکمت نظری تعلیم کے اندر آ گئی۔ باقی حکمت عملی رہ جاتی ہے تو بلاغت کے قاعدے سے اگر ایک لفظ کے دو معنی ہیں اور ایک پہلے لفظ میں آجائیں۔ تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے دوسرے معنی ہیں۔ تو حکمت نظری تعلیم میں آ گئی۔ اس لئے الحکمۃ میں حکمت عملی مراد ہوگی۔ حکمت عملی سے مراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ عمل بھی دکھلاتے ہیں کہ یہ عمل اس طرح کرو۔ تو لفظوں میں تعبیرات پہنچائیں۔ معنی میں مرادات سمجھائیں حکمت میں عمل کر کے دکھلایا کہ اس نمونہ کا عمل پیش کرو اور چوتھا فریضہ ذکر کیا:

﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ④ آپ دلوں کو مانجھتے بھی ہیں۔ یہ وہی ذوق اور وجدان کا صحیح کرنا ہے کہ قلوب میں سے زیغ نکل جائے۔ ٹیڑھ نکل جائے۔ کجی نکل جائے، استقامت پیدا ہو اور فہم میں اتنی سلامتی آجائے کہ جو چیز اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی جائے وہ قطعاً دل کے اندر اترتی ہوئی چلی جائے۔ ٹیڑھ باقی نہ رہے۔ غرض سلامتی قلب، ذوق صحیح اور وجدان صحیح یہ تربیت سے حاصل ہوتا ہے۔ تو صحابہؓ کے ساتھ آپؐ نے محنت کی، تاکہ ان کا ذوق درست کریں، کجی باقی نہ رہے۔

اس لئے کہ اگر دل میں کجی رہ جاتی تو دل کی کجی کے ہوتے ہوئے جو آیت بھی سامنے آئے گی، دل اس کے وہی معنی سمجھے گا جو الٹے معنی ہوں گے۔ اگر معاذ اللہ کسی کے دل میں نصرانیت کا جذبہ گھسا ہوا ہو اور وہ نصرانیت کا ذوق لے کر قرآن پڑھے تو اسے ہر آیت سے نصرانیت ٹپکتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اگر قادیانیت کا ذوق لے کر آئے تو پورے قرآن سے قادیانیت ٹپکتی ہوئی نظر آئے گی۔

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲. ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.
③ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲. ④ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

اس واسطے کہ قرآن کے جملے بلیغ اور ذی وجوہ ہیں۔ کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ یہ استاذ اور مربی سمجھائے گا کہ یہ مراد ہے اور یہ مراد نہیں۔ اگر تربیت نہ ہو تو کئی معنوں میں سے آدمی اپنے نفس کے مطابق جو معنی سمجھے گا وہ اختیار کرے گا۔ وہ مراد نبوی نہیں ہوگی۔ اس کے نفس کی مراد ہوگی۔ اس لئے ذوق کا درست کرنا ضروری ہے۔ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف قرآن پیش کیا، ایک طرف دلوں کو مانجھ کر کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تشریح کی۔ تو علماً و عملاً و ذوقاً صحابہؓ وہی سمجھ گئے جو آپ کو سمجھانا تھا۔ اگر ذوق صحیح نہ ہو، عمل کا نمونہ سامنے نہ ہو تو مرادات ربانی سمجھنے کی کوئی صورت نہیں۔

مراد قرآن اور سنت...... یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو جب خوارج سے مناظرہ کرنے بھیجا تو ایک وصیت کی، فرمایا: دیکھو! خوارج کے سامنے قرآن سے دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے دلیل پیش کرنا۔ ابن عباسؓ نے عرض کیا، حضرت! قرآن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعا دی ہے ''اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' ① ''اے اللہ! ابن عباس کو قرآن کا علم وحکمت نصیب فرما''۔ اور اللہ نے مجھے قرآن کا علم عطا فرمایا ہے اور قرآن ہی میرا موضوع ہے۔ اور اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ قرآن سے دلیل پیش نہ کروں۔ سنت سے پیش کروں اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: قرآن کے جملے بلیغ اور ذی وجوہ ہیں کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم آیت پڑھ کر ایک معنی سے استدلال کرو گے، مخالف اسی آیت کو دوسرے معنی میں ڈھال کر اپنی دلیل پیش کرے گا، عوام کہیں گے یہ بھی تو قرآن پڑھ رہا ہے۔ حق واضح نہیں ہوگا۔ لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پیش کر دیا۔ اس میں دو معنی نہیں ہو سکتے۔ اس سے مراد متعین ہو جائے گی۔ اس واسطے ضرورت ہے کہ سنت سے استدلال ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قرآن سے من مانی مرادیں نکالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ بلا کہاں سے نازل ہو گئی۔ اس سے تو ہم وہی معنی لینے پر مجبور ہو گئے۔ جو اللہ کی طرف سے منقول ہوتے آ رہے ہیں اور ہمیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ وہ انکار کر کے حدیث کو بیچ سے ہٹاتے ہیں تا کہ آزادی حاصل کریں اور جو ان کے نفس و عقل میں اختراعی چیزیں آئیں۔ انہیں قرآن کی طرف ٹھونک دیں ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کی مراد نہیں ہوگی۔ ان کے نفس کی مراد ہوگی۔

کلام میں لب ولہجہ کا دخل...... اس واسطے کہ قرآن کی مراد سمجھانے میں لب ولہجہ کا بھی دخل ہے، کلام کی خصوصیات کا بھی دخل ہے، ماحول کا بھی دخل ہے جب ساری چیزیں قطع ہو جائیں تو مراد کیسے متعین ہوگی؟ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہماری اردو کا ایک جملہ ہے'' کیا بات ہے، اسکے کئی معانی آتے ہیں اور لب لہجہ سے معنی بدل

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ اللھم علمہ الکتاب...... ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۷۵.

جاتے ہیں اگر میں یوں کہوں کیا بات ہے؟ آپ سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں کہ بھئی! کیا معاملہ ہوا ہے؟ کیا واقعہ پیش آیا؟ اور اگر میں لہجہ بدل کر یوں کہوں کیا بات ہے۔اب کیا سمجھے؟ قطعاً سوال نہیں سمجھے، بلکہ آپ سمجھے کہ میں کسی شئے کی بڑائی بیان کر رہا ہوں کہ فلاں چیز کی کیا بات ہے۔ وہ تو بہت ہی بڑی ہے۔اور اگر میں لب ولہجہ بدل دوں اور کہوں کیا بات ہے۔اب آپ کیا سمجھے؟ اب نہ بڑائی سمجھے نہ سوال بلکہ تحقیر سمجھے کہ میں نے کسی شی کی حقارت بیان کی اور اگر پھر لب ولہجہ بدل کر اسی جملہ کو یوں ادا کردں کیا بات ہے۔اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ نہ بڑائی بیان کی نہ تحقیر نہ استفہام وسوال۔ تو ایک ہی جملہ ہے ''کیا بات ہے'' اور اس کے چند معنی ہیں اور سب معانی لب ولہجہ سے متعین ہوتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ اگر یہ جملہ خط میں لکھ کر بھیج دیں تو لب ولہجہ تو خط میں نہیں آئے گا۔ تو وہ اس جملہ سے وہی معنی سمجھے گا جو خیال اس کے نفس پر غالب ہوگا۔ لیکن اگر آپ بالمشافہ سامنے بٹھلا کر لب ولہجہ سے (یا کلام دے کر کسی شخصیت و پیامبر کے ذریعہ) سمجھائیں گے تو مخاطب وہی معنی سمجھے گا جو آپ کی مراد ہے۔لیکن اگر خط میں لکھ کر بھیجیں گے تو وہ وہی معنی سمجھے گا جو اس کے نفس پر کیفیت غالب ہوگی۔ گویا وہ اس جملے کے جو معنی سمجھے گا وہ (لفظ آپ کے ہوں گے) مراد اس کی اپنی ہوگی لکھنے والے کی مراد نہیں ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم اور حدیث نبوی کو سمجھ لیں بہت سے معنی ہوتے ہیں جو لب ولہجہ اور ماحول سے متعین ہوتے ہیں اور بہت سے معنی ہیں جو اسباب نزول سے متعین ہوتے ہیں۔ اگر ان سب امور کو قطع کر کے محض الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو ہر شخص اس سے وہی سمجھے گا جو اس کے نفس پر کیفیت غالب ہوگی اور ایسا کرنے سے بہت سے نقصانات وجود میں آئیں گے۔ بہت سے بد بخت ایسے بھی ہیں جو تلبیس کر کے دنیا کو دھوکہ دیں گے کہ یہ اللہ اور رسول کی مراد ہے۔ حالانکہ اللہ اور رسول کی مراد نہیں، اس کی اپنی مراد ہے۔لفظ اللہ کے لئے اور معنی اپنے بھر دیئے۔

لیکن اگر سند آ گئی، بیان رسول آ گیا، وراثتی معنی آ گئے جو صحابہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور مع کیفیات کے بیان کئے تو شی متعین ہو جائے گی اور ایسی صورت میں میں کسی کو دخل دینے کی مجال نہیں ہوگی۔ غرض جو بھی چاہے گا کہ میں قرآن میں من مانی مرادات کو داخل کروں وہ حدیث اور کلام سلف سے انکار کرے گا۔ وہ ان کے مفہوم کی حجیت کا انکار کرے گا تا کہ دنیا کے اندر اس کی حجیت قائم ہو۔ ہم کہتے ہیں دین وہ ہے جو سلسلے وار مرتب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر مسلسل مل جائے۔لفظ معنی اور کیفیت وحال بھی اور عوارض و واقعات اور احوال کے لحاظ سے بھی۔

ضرورت نبوّت...... آج وہ طلباء جنہوں نے بخاری شریف ختم کی ہے قابل مبارکباد ہیں۔ پہلی بات قابل مبارکباد یہ ہے کہ سات ہزار احادیث کے قریب متون ان کو حاصل ہوئے۔ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہیں اور کلام رسول کی عظمت وہی ہے جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جیسے اللہ

تک بندہ نہیں پہنچ سکتا جب تک بیچ میں رسول کا واسطہ نہ ہو۔ اس لئے کہ وہ نور مطلق ہیں اور بندہ ظلمت محض ہے۔ نور، ظلمت کے ساتھ نہیں جمع ہو سکتا۔ تو اللہ نے ایک برزخی مخلوق پیدا فرمائی کہ وہ بشر بھی ہیں۔ مگر اتنے کامل بشر کہ لطافتوں میں اللہ سے واصل ہیں۔ وہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ تو بندوں کے خدا تک پہنچنے کے لئے نبی واسطہ ہیں۔ نبی نہ ہو تو بندہ کا پہنچنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اللہ کا کلام اتنی عظمت و جلالت میں ہے کہ بندہ کا فہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو کلام رسول بیچ میں برزخ ہے کہ اس واسطے سے ہم کلام خداوندی تک پہنچیں گے۔

اگر کوئی کلام رسول کا واسطہ بیچ میں سے نکال دے اور چاہے کہ چھلانگ مار کر اللہ کے کلام تک پہنچ جائے تو وہ نیچے آ پڑے گا اور وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لئے کہ وہ کلام بہت اونچائی پر ہے، جیسے ذات خداوندی تک پہنچنا بغیر ذوات رسل کے ممکن نہیں ایسے ہی کلام ربانی کے حقائق تک پہنچنا ممکن نہیں ورنہ پھر نبی کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟۔ حضرت جبریل علیہ السلام قرآن شریف لکھ کر بیت اللہ شریف کی چھت پر رکھ دیتے اور ایک آواز لگا دیتے۔ اے لوگو! تم سب مریضان نفوس ہو اور یہ نسخہ شفا ہے اسے لے جاؤ اور اپنا اپنا علاج کر لیا کرو، پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہ تھی مگر پیغمبر بھیجا گیا۔ جیسے محض طب کی کتابوں کا مطالعہ کر کے نہ اپنا علاج کر سکتا ہے نہ غیر کا۔ کیونکہ کتاب میں اصول بیان ہوں گے۔ لیکن نبض پہچان کر کہ فلاں کو کیا روگ ہے؟ فلاں کا مزاج کیسا ہے؟ اس کے لئے تجربہ و تربیت کی ضرورت ہے اور کتاب کے اوراق تربیت کرتے نہیں۔ تربیت کرنے والی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ اگر شخصیتوں سے قطع نظر کر لیا جائے اور محض کتاب کے اوراق رہ جائیں تو کالے کالے نقوش تو سامنے آئیں گے۔ تربیت اور کیفیات سامنے نہ آئیں گی۔ اسی لئے اللہ کے کلام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کلام رسول کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم نہیں پہنچ سکتے۔ جو آج خوشی کا مقام ہے کہ کلام رسول آپ تک پہنچا، اور بڑی خوشی ہے کہ سند کے ساتھ پہنچا، محض قوت مطالعہ یا کتب بینی سے یا اختراع نفس سے نہیں پہنچا کہ اس میں نفس کا بھی دخل ہوتا ہے، شیطان کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اور بڑی خوشی ہے کہ سند کے ساتھ پہنچا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سلسلہ جڑ گیا۔ تو وہ طلبہ خوش نصیب ہیں جنہیں آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہوگئی اور ان کا قلب گویا قلب نبوت سے بواسطہ کلام نبوت واصل ہو گیا۔

امت محمدیہ کی سب سے بڑی عظمت...... اس امت کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اس امت میں اللہ کا کلام مستند طریق پر موجود ہے۔ آج قرآن کے بارے میں اگر کوئی دعویٰ کرے کہ اس کی سند کیا ہے تو امت کے علماء اپنی جگہ ہیں میں یہ کہوں گا کہ میری سند حق تعالیٰ سے متصل ہے۔ مجھے یہ قرآن میرے استاذ قاری عبدالوحید خان صاحب نے حفظ کرایا، ان کو قاری عبدالرحمٰن نے حفظ کرایا اور قرات سکھلائی، انہیں قاری عبداللہ صاحب مکی نے حفظ کرایا اور قرات سکھلائی اور انہیں ابراہیم نے سکھلائی اور سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گا کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبریل علیہ السلام نے پڑھا

اور جبریلؑ کے سامنے حق تعالیٰ شانہ نے تکلم فرمایا، تو حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہ تک پہنچ جاتی ہے۔

دنیا میں آج کون سی کتاب ہے جو سند متصل کے ساتھ اللہ تک پہنچے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہو کہ یہ الہامی کتاب ہے تورات، انجیل یا زبور ہے کسی کی سند نہیں ہے۔ بس ایک ہی سند ہے کہ: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ ① "باپ دادا کو یوں ہی کہتے سنتے چلے آتے ہیں"۔ ممکن ہے باپ دادا نے غلطی کی ہو۔ جب تک سند سامنے نہ ہو غلطی کا امکان ہے لیکن اگر سند سامنے ہے تو غلطی کا امکان نہیں ہے۔

فن اسماء الرجال...... اور مسلمانوں نے یہی نہیں کیا کہ سند لے لی۔ نہیں، بلکہ روایان حدیث کے لئے ایک مستقل فن ایجاد کیا۔ اور پچاس ہزار ایسے آدمیوں کی سوانح عمریاں مرتب کیں جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں۔ ان کے نسب نامے کیا تھے؟ ان کا کیریکٹر کیا تھا؟ ان کا کردار کیا تھا؟ ان کا حافظہ کیسا تھا؟ ان کا عدل وانصاف کیسا تھا؟ انکے قلب کے اخلاق کیسے تھے؟ پچاس ہزار آدمیوں کی سوانح عمریاں (فن اسماء الرجال) مرتب کر دیں۔ تو وہ کسوٹی ہے کہ دیکھ کر معلوم کر لیں کہ یہ راوی ہیں جن کے واسطے سے کتاب مبین ہم تک پہنچی ہے۔

غرض مسلمان اگر اللہ کا کلام اور اللہ کے رسول کا کلام لئے بیٹھے ہیں تو اس بھروسے پر نہیں کہ باپ دادا سے یوں ہی سنتے چلے آ رہے ہیں۔ ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ ② چاہے باپ دادا نے غلطی کی ہو، چاہے عقل نہ لڑائی ہو، پھر بھی تم یہی کہو گے کہ باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں۔ یہ کوئی سند کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو افواہ ہے۔ افواہاً کوئی چیز معتبر نہیں ہو سکتی۔ سند یہ ہے کہ میں نے فلاں سے پڑھا اور اس نے فلاں سے پڑھا اور اسی طور پر اس کی اللہ کے رسول تک انتہاء ہو جائے۔

دین کے ہر ہر جز کی سند...... تو مسلمانوں کے پاس ایک ایک حدیث کی سند موجود ہے۔ اگر چھوٹا جملہ بھی پڑھیں گے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچائیں گے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں استناد کی عادت پڑ گئی، وہ محض قرآن وحدیث نقل نہیں کرتے، بلکہ کوئی دینی فن نہیں کہ جس کی سند نہ ہو۔ آپ ہدایہ پڑھائیں گے، اس کی سند موجود ہے کہ صاحب ہدایہ سے ہمارے استاذوں نے اس اس طرح حاصل کیا۔ حتیٰ کہ تصوف کے اندر عرفاء حقیقت اور حضرات صوفیہ نے بھی سند کیساتھ۔

شیخ ابو اسحاق کا رسالہ قشیریہ ہے۔ اس میں حضرت جنید اور حضرت شبلی کے واقعات بھی نقل کئے ہیں اور سندیں بھی نقل کی ہیں تصوف کے اصول نقل کئے ہیں تو سندیں نقل کی ہیں۔ تصوف کا یہ واقعہ جنید یا شبلی سے یا سید الطائفہ سے فلاں سند کے ساتھ ہمیں پہنچا ہے۔

اور اس میں پھر آگے قرآن وحدیث سے ماخذ پیش کیا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے اخذ کیا ہے۔ تو تصوف کی سندیں الگ موجود ہیں، فقہ کی الگ، حدیث کی الگ۔ اور قرآن کی سند تو تواتر طبقات

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۰.

کے ساتھ ہے تو کوئی دینی فن یا دینی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ مسلمان یہ کہہ کے نقل کریں کہ ہم باپ دادا سے یونہی سنتے چلے آ رہے ہیں بلکہ وہ کہیں گے کہ میں نے فلاں استاذ سے پڑھا وہ اپنے استاذ کا حوالہ دے گا، وہ اپنے استاذ کا تو یہ کسوٹی ہے جس کے ہاتھ میں سند نہ ہو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا علم مستند نہیں، ماننے کے قابل نہیں۔ اس کی بات مانی جائے گی جو سند متصل سے بات کرے۔

تو آج ان طلباء کے لئے مبارکباد دینے کا وقت ہے جنہیں متن حدیث حاصل ہوا اور سند متصل کے ساتھ ہوا اس واسطے میں ان طلبہ کو بھی مبارکباد دیتا ہے۔ اور ان کے ساتھ ان کے اساتذہ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں' مدرسہ کے معاونین اور منتظمین کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی محنتوں کا پھل ان کے سامنے آ گیا اور سند کے ساتھ چند علماء تیار ہو گئے۔

مراتب علماء...... یہ ظاہر ہے کہ علماء سب ایک درجہ کے نہیں ہوتے کوئی اعلیٰ فہم رکھتا ہے کوئی متوسط درجے کا۔ ﴿فَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾. تو ایک درجے کے سارے نہیں ہوتے۔ بعض دقیق الفہم ہوتے ہیں۔ بعض بلید الفہم ہوتے ہیں' بعض غبی بھی ہوتے ہیں مگر خیر دیندار تو بن جاتے ہیں۔ ان کی عبادت اگر علم تک نہ پہنچا سکے تو کم سے کم ان کا عمل صحیح ہی قائم ہو جاتا ہے۔ بہر حال علماء ایک درجے کے نہیں ہوتے۔ مگر سب کے ساتھ حسن ظن رکھنا ضروری ہے جب کہ وہ سند کے ساتھ روایت کریں اور انہیں سند کے ساتھ علم حاصل ہوا ہو تو ہم سب کا فرض ہے کہ انکے ساتھ حسن ظن رکھیں۔ ان کی عظمت کریں۔ وہ عظمت ان کی ذات کی نہیں ہوتی۔ ذات تو گوشت پوست سے بنی ہوئی ہے وہ ہمارے اندر بھی موجود ہے، اس کی کیا عظمت ہے؟

وہ عظمت علم کی ہوتی ہے اور ان کے اندر اللہ اور اللہ کے رسول کے پاس سے علم آیا ہوا ہوتا ہے۔ اس واسطے علم کی اور اس نسبت اور سند کی تعظیم کی جاتی ہے۔ جو انہیں حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ تو یہ سب طلباء اور علماء جو تیار ہوئے ہیں، ہم سب کے لئے مستحق اور مستوجب تعظیم و عظمت اور وقار کے ہیں۔ "لِوَجْهِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" اور "لِوَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى" کہ انہیں حق تعالیٰ سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہو گئی ہے اس لئے ہم انکی عظمت کریں گے، کسی عالم کی تحقیر کسی طرح بھی جائز نہیں اس کی تحقیر سے علم کی تحقیر ہوتی ہے اور علم اللہ اور اللہ کے رسول کا ہے اس کی تحقیر ہمارے لئے کب جائز ہے؟ تو مستند عالم واجب التعظیم اور واجب التکریم ہے۔ اس واسطے ان دونوں کو عظمت دی جائے گی اور ان کو مبارکباد دی جائے گی۔ تو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اجازت حدیث...... اور چونکہ ختم کے لئے اپنی عنایت اور مہربانی سے انہوں نے مجھے بلایا اور اس سعادت میں شریک کیا کہ میں ختم کراؤں۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ میں اپنی سند پیش کر کے اس سند کی اجازت انہیں دوں جن طلبہ نے میرے سامنے حدیث پڑھی۔

میرا سلسلہ ایک یہ ہے حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ اور وہ شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے

شاگرد ہیں اور شاہ عبدالغنی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شیخ ابوطاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں (اس سے آگے سلسلہ سند ترمذی شریف میں مرقوم ہے) اور دوسرا سلسلہ سند یہ ہے کہ بندہ کو مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارن پوری نے اور ان کو مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اور ان کو شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ الی آخر سند نے اجازت فرمائی۔ ہر دو سلسلہ سند سے میں ان طلباء کرام کو اجازت حدیث دیتا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دورۂ افریقہ سے واپسی پر الوداعی خطاب

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ فَلا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. أَمَّا بَعْدُ!

محبت وشکر گذاری کو الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا...... بزرگانِ محترم، صاحب حق صدر باوقار، اراکین جمعیت علماء، اور ذمہ داران قوم! اس پچیس روزہ قیام کے سلسلے میں متعدد جلسے، مجلسیں ہوتی رہیں اور میں ان میں حاضر رہا۔ آج بھی ایک بڑا اجتماع سامنے ہے۔ لیکن اور جلسوں کی نسبتاً اس جلسے کی نوعیت کچھ جداگانہ ہے۔

اس سے پہلے جو جلسے ہوتے تھے وہ درحقیقت سننے کیلئے تھے اور آج کا جلسہ کچھ کہنے کیلئے منعقد کیا گیا ہے اس سے پہلے آپ حضرات سنتے تھے اور بولنے والا ایک ہی ہوتا تھا۔ لیکن آج میں سننے والا ہوں۔

سب حضرات بولنے والے ہیں۔ جس کی ترجمانی وہ حضرات فرمارہے تھے، جنہوں نے ابھی کلام کیا۔ ہمارے مولانا عمر دین صاحب، ہمارے محترم احمد اللہ صاحب اور محترم ڈاکٹر صاحب یہ حضرات کچھ کہنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا اور اس کو یوں کہنا چاہئے کہ اس ناچیز خادم کے پچیس روزہ قیام کے سلسلے میں جو کچھ آپ کا تاثر ہوا، اسے قدردانی کے ساتھ اور شکریہ کے الفاظ کے ساتھ آپ نے ظاہر فرمایا۔

ان الفاظ سے اور پچیس روزہ محبت کے طرزِ عمل سے، خود میرے اندر بھی محبت وشکر گذاری کے جذبات پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ میں انہیں الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکتا۔ وہ قلب کی کیفیات ہیں اور کیفیات الفاظ میں نہیں آسکتیں، کتنے بھی بڑے سے بڑے الفاظ میں کیفیات کی تصویر کھینچی جائے، محبت کو ظاہر کیا جائے لیکن وہ ظاہر ہو ہی نہیں سکتی۔ الفاظ کا دامن تنگ ہے اور جذباتِ محبت کا میدان بے حد وسیع ہے۔ تو الفاظ کی قبا کا لباس ان پر چست ہو ہی نہیں سکتا۔ کتنا ہی آدمی کھل کر بیان کرے۔ حق ادا نہیں ہوسکتا۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست؟

کسی عاشق سے کسی نے پوچھا تھا کہ بھائی عاشقی اور محبت کیا چیز ہے، اسے کچھ الفاظ میں بیان کرو ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

گفتم کہ تو چو ماشوی بدانی

یعنی میں محبت کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ قلبی کیفیات اتنی لطیف اور باریک ہوتی ہیں کہ الفاظ میں نہ سماسکتی ہیں نہ الفاظ ان کو ادا کرسکتے ہیں۔ خواہ وہ نفسانی کیفیات ہوں یا روحانی، الفاظ سے بالاتر ہیں۔

اگر کوئی بچہ آپ سے سوال کرے کہ جوانی کی کیفیات کیا ہیں؟ ذرا مجھے بتلا دیجئے۔ آپ کیا بتلائیں گے یوں کہیں گے کہ بیٹا! ایک دس برس کا انتظار کرو۔ جوان ہو جاؤ گے۔ خود بخود پتہ چل جائیگا کہ جوانی کیا چیز ہے۔ اس کی کی کیفیات ہیں۔ ایک نوجوان آدمی بوڑھے سے سوال کرے کہ بڑے میاں! مجھے بڑھاپے کی کیفیات بتلا دو؟ بوڑھا یہی کہے گا کہ: خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ بڑھاپے تک پہنچ جاؤ۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔ بڑھاپا کیا ہے۔ میں لفظوں میں کیسے ادا کروں؟

اسی طرح جب ایک بوڑھا آدمی اس کیفیت کو جو کسی محتضر کی جان پر گزر رہی ہو کسی پر نزع کی کیفیت ہو جان کنی ہو۔ اس کو شریعت اسلام میں محتضر کہتے ہیں کہ موت اس کے پاس آ گئی ہو۔ اب ایک بوڑھا اس محتضر سے پوچھے کہ تمہارے اوپر کیا گزر رہی ہے۔ الفاظ میں مجھے بتلا دو۔ وہ کہے گا کہ اس کیفیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ چند دنوں میں تمہارے اوپر بھی آنے والی ہے۔ اس وقت سمجھ میں آ جائے گی۔ یا ایک محتضر کسی میت سے پوچھے کہ: قبر میں تم پر کیا کیفیات گزریں۔ وہ بھی کہے گا بھئی! قبر میں آ جانا۔ آنا تو ہے ہی۔ وہاں سمجھ میں آ جائے گی۔ میں کیا بیان کروں؟ تو کیفیات کو نہ الفاظ ادا کرسکتے ہیں نہ وہ الفاظ میں سما سکتی ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھنے لگے کہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟ میں کیا بیان کروں؟ کتنا ہی بیان کروں، حق ادا نہیں ہوگا۔ سوائے اس کے یہ کہوں کہ چار پیسے خرچ کرو، سیب خریدو، کاٹ کے کھاؤ، پتہ چل جائے گا کہ سیب کی کیا کیفیات ہیں؟ مزے کو الفاظ میں میں کیسے ادا کروں؟ تو سیب کا مزہ ایک حسی مادی چیز ہے، وہ الفاظ میں ادا نہیں ہوسکتا، عاشقی اور محبت الفاظ میں کیسے سما سکتی ہے؟ کیسے ترجمانی ہوسکتی ہے؟ آپ حضرات کے محبت کے عمل سے جو شکر گزاری اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ الفاظ نہیں ہیں کہ انہیں ادا کیا جائے۔

آپ کی محبت کے جذبات دل کا جوہر بن گئے ہیں جو آخرت تک ساتھ جائیں گے...... پھر ایک طرف تو پچیس دن کا عمل ہے اور ایک طرف قول ہی قول ہے۔ کوئی عمل مجھ سے بن ہی نہیں پڑا۔ آپ حضرات کی طرف سے عمل کا ظہور ہوا۔ محبت کا عمل، مدارات کا عمل، اکرام ضیف کا عمل، آپ نے یہ عمل کر کے دکھلایا۔ ایک دن کی مہمانی ہو، دو دن کی ہو؟ یہ پچیس دن کی مہمانی؟ شرعی طور پر آدمی تین دن مہمان ہوتا ہے۔ اخلاقی طور پر مستحب ہے۔ گو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تین دن کی مہمانی واجب تھی۔ اور حدیث میں فرمایا گیا۔ اس زمانے کے لوگوں کو خطاب تھا کہ اگر کوئی تین دن مہمانی نہ کرے، ایک ہی دن میں جواب دے دے، تو مہمان کو حق ہوتا تھا کہ میزبان کے گھر سے اتنی قیمت کی روٹیاں اٹھا کے لے جائے جس میں تین دن کی مہمانی ہوسکتی ہے۔ مگر یہ ابتدائی حکم منسوخ کر

دیا گیا۔ ایک وقتی طور پر یہ حکم تھا، کیونکہ غربت کا دور تھا۔ اسلام لانے کے لئے لوگ آتے تھے، ان کی مدارات اور مہمانی نہ کی جاتی، وہ دین کی دولت سے محروم ہو جاتے۔ اس لئے تین دن کی مہمانی واجب قرار دی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ مستحب اور اعلیٰ و اولیٰ کا درجہ ہو گیا۔ البتہ اس سے کم جتنے دن یا جتنی دیر ٹھہرے، اس کا اکرام واجب قرار دیا گیا، بلکہ اس کو ایمان کا جز بتلایا گیا اور فرمایا گیا: ''مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ.'' ① ''جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ مہمان کی مدارات کرے''۔

مہمان کی مدارات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسے روزانہ مرغ ہی کھلایا جائے یا بریانی کھلائی جائے، یہ معنی نہیں۔ بلکہ یہ کہ جو کچھ بھی کھلایا جائے، محبت سے کھلایا جائے، چاہے چٹنی روٹی ہو اور اگر گوشت بریانی ہو اور ساتھ محبت و مدارات بھی ہو تو یہ نور علی نور ہے۔ غرض پچیس دن تک اسی طرح کی مہمانی کیا جانا، یہ مستحب ہونے کے درجات سے بالاتر ہے۔ واجبات میں نہیں تھی۔ محض محبت اور مخلصانہ جذبات تھے۔ تو پچیس دن کے عمل سے جو جذبات و تاثرات محبت اور شکر گزاری کے پیدا ہوئے وہ دس پندرہ منٹ میں الفاظ میں کیسے ادا ہو سکتے ہیں۔ وہ جذبات تو ساتھ جائیں گے، وہ دل کا جوہر بن گئے۔

اور یہ محبت کے جذبات انشاء اللہ آخرت تک بھی جائیں گے، دنیا تک محدود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ آپ حضرات نے جو مدارات و محبت فرمائی، وہ دنیا کی خاطر نہیں فرمائی، وہ آخرت کی خاطر فرمائی۔ کسی دنیوی رشتے سے نہیں کی کہ میرے سے آپ کی کوئی غرض متعلق تھی یا کوئی دنیا کا مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ محض اپنے دین کی محبت میں اس شبہ کی بناء پر کہ یہ شخص ہمیں کچھ نیک ہدایت کرے گا۔ تو یہ آخرت کے جذبات تھے۔ اس لئے اس کے تاثرات بھی یہیں تک نہیں ہیں، آخرت تک جائیں گے۔ جو چیز دنیا سے آخرت تک جانے والی ہو، اس کو الفاظ میں کس طرح سمایا جا سکے اور کون سا ایسا لفظ ہے کہ اس میں دنیا و آخرت دونوں سمٹ کر آ جائیں۔ اس لئے یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں ان جذبات تشکر کو یا اپنے ان تاثرات کو جو آپ حضرات کی محبت سے پیدا ہوئے۔ الفاظ میں ادا کر سکوں۔ بجز اس کے کہ دعا کی ہے اور یہ وعدہ ہے کہ آئندہ بھی دعا کروں گا۔ نیز دعا کے سوا اور کسی چیز کی ہم میں استطاعت بھی نہیں ہے۔

اور یہ اس لئے بھی کہ دعاء کے لئے اہلیت شرط نہیں ہے۔ نااہل بھی دعاء مانگتا ہے، اللہ اس کی بھی سن لیتا ہے۔ گنہگار بھی دعاء مانگتا ہے۔ اللہ اس کی بھی سن لیتا ہے۔ اس لئے دعاء مانگنے کے لئے اہل ہونا ضروری نہیں۔ اسی دعاء کی آپ سے بھی استدعا ہے۔ بجز دعا کے میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے کہ میں پیش کر سکوں۔

مولانا عمر دین صاحب نے یہ فرمایا کہ: وہ خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات سے تقریر کر رہے ہیں۔ خوشی اس کی ظاہر ہے کہ ان کے خیال کے مطابق پچیس روزہ قیام میں کچھ کام بنا رنج اس کا ظاہر کر رہے ہیں کہ آج

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار والضیف، ج: ۱ ص: ۶۸ رقم: ۴۷.

جدائی کا دن ہے لیکن میرے اندر اس وقت سوائے رنج کے کوئی خوشی کا نشان نہیں ہے۔

اس لئے جدائی کا غم الگ ہے اور کام نہ بننے کا غم الگ ہے اس لئے کہ کوئی خدمت نہیں بن پڑی۔ یہ تو آپ کی قدردانی اور محبت کی بات ہے۔ جو کہ آپ نے فرمایا کہ: اپنا سب وقت لگا دیا۔ کچھ بھی وقت نہیں لگایا۔ محض چند ساعتیں ایسی گزری ہیں۔ جس میں کچھ عرض کر سکا۔ جو مجھے کرنا چاہئے تھا' نہیں کر سکا۔ اس لئے میرے واسطے تو غم ہی غم کا موقع ہے۔ جدائی کا غم بھی ہے اور کچھ نہ کر سکنے کا غم بھی ہے۔ اب سوائے اس کے میں شکریہ کی بجائے آپ حضرات سے معافی چاہوں اور کیا کر سکتا ہوں جو تقصیرات ہوئی ہیں، ان سے آپ درگزر فرمائیں اور جو خدمت میں قصور ہوا ہے، اس کو نظر انداز فرمائیں۔ کریموں کی کریم النفسی یہی ہوتی ہے کہ قصور و تقصیر پر درگزر اور معافی کا برتاؤ کیا جائے۔

اصل شکریہ عملی زندگی میں انقلاب ہے ...... بہرحال ان دنوں میں جو بھی آپ نے خلوص اور محبت کا برتاؤ فرمایا، اس کے اثرات دل کے اندر موجود ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ان کا حقیقی شکریہ یہ ہے کہ جو گذارشات پیش کی گئی ہیں، ان پر عملی زندگی میں کوئی چیز سامنے آئے۔ عمل میں انقلاب پیدا ہو۔ یہ اصل شکر۔ یہ ہے شرعاً بھی شکریہ اسی کو کہتے ہیں کہ اگر قول کی بات بتائی گئی ہو، تو وہ قول کیا جائے، یہ شکریہ ہے اور اگر عمل کی بات بتائی گئی ہو، عمل کیا جائے، یہ شکریہ ہے اس لئے میں تو آپ کے شکریہ کا متمنی ہوں۔

یہ بھی ایک بے جا جرات اور جسارت ہے کہ میں آپ سے یوں کہوں کہ میرا شکریہ ادا کیجئے۔ مگر ہاں میں یہ جرات کرتا ہوں۔ آپ شکریہ ادا کریں۔ مگر عملی شکریہ ادا کریں۔ اگر ان پچیس دنوں میں کوئی کام کی بات آپ کے کانوں میں پڑ گئی ہے۔ تو اس پر عمل کر کے دکھلائیں۔

اور حقیقت میں یہ میرا شکریہ نہیں ہوگا۔ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی اور دین اسلام کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکرگزاری ہوگی کہ جن کی جوتیوں کے صدقے میں ہم کچھ کہہ سکے اور آپ کچھ سن سکے۔ تو اصل شکریہ جس کی مجھے خود طلب اور تمنا ہے وہ یہ ہے کہ عملی طور پر ہماری زندگی میں کوئی انقلاب پیدا ہو جائے۔ آپ حضرات تقریباً سو یا اسی سال سے یہاں ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد یہاں آئے، تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی آپ کو آج دولت یا عیش میسر ہے، یہ ان آباء و اجداد کا طفیل ہے۔ یہ ان کی دعاؤں کی اور خلوص کی برکت ہے۔ وہ آئے اور اپنا دین ساتھ لے کر آئے، دنیا بھی کمائی اور انہوں نے دین بھی کمایا اور دین کو مضبوطی سے پکڑا۔ ان کے دین کے آثار موجود ہیں۔ یہ جو آج اس ماحول میں آپ کے اندر دینی جذبات موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ان بزرگوں کا طفیل ہے۔ یہ ان کے اثرات ہیں جو آبائی طور پر آپ کے اندر منتقل ہیں۔ اسی سے آپ اندازہ کر لیں کہ اگر آپ ان تاثرات کو باقی رکھیں گے۔ آپ کی اولاد میں بھی وہ اثرات منتقل ہوں گے، جیسے ان آباء و اجداد سے آپ نے کچھ پایا، آپ کی اولاد بھی کچھ پائے گی اور اگر خدانخواستہ آپ نے ان اثرات کو چھوڑ دیا تو اولاد سے بھی کوئی توقع نہ رکھی جائے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں آنے والے اپنے دین میں بھی مضبوط تھے' دنیا میں بھی ان کے معاملات میں

کھرا پن اور خالص دینی رنگ تھا اور ڈھیلا پن نہیں تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا ہے کہ: جب کوئی قوم میری اطاعت کرتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں اس پر رحمت کرتا ہوں اور رحمت کا اثر اس کی سات پشت تک جاتا ہے اور جب کوئی قوم میری نافرمانی کرتی ہے۔ میں بھی اس پر لعنت کرتا ہوں اور میری لعنت کا اثر بھی سات پشت تک جاتا ہے۔ یہ جو آپ کی پشتوں میں دین اور جذبات دین کا اثر ہے۔ یہ ان بزرگوں کے اثرات ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد کا طفیل ہے، جنہوں نے اپنے قلوب کو دین سے بھر رکھا تھا۔ یہی عبرت کا مقام ہے۔ ہم بھی اگر اسی طرح سے ان کے دین کے جذبات سے بھرپور ہیں۔ تو ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ اس دین کا اثر ہماری اولادوں میں بھی قائم رہے گا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ حقیقی شکریہ یہ ہے کہ دین کی باتوں کو عملی طور پر دنیا کے سامنے ظاہر کیا جائے۔

اسلام درحقیقت نام ہی عمل کا ہے۔ اسلام قول یا خیال کا نام نہیں ہے۔ حدیث میں ہے "اَلْاِیْمَانُ سِرٌّ وَالْاِسْلَامُ عَلَانِیَۃٌ" ① ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جو قلب میں رہتی ہے، وہ عقائد کا مجموعہ ہے۔ اسلام کھلی ہوئی چیز ہے جو عمل کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ تو نماز، روزہ، حج زکوٰۃ سچ بولنا اور حسن معاشرۃ وغیرہ یہ اسلام ہے اور اللہ کو ایک جاننا، رسول کو برحق ماننا، قیامت کو برحق ماننا، یہ ایمان ہے۔ ایمان مثل جڑ کے ہے جو دلوں میں مخفی رہتا ہے اور اسلام مثل شاخوں اور پھل پھول کے ہے جو اوپر نظر آتا ہے۔ اس لئے اسلام عمل ہی کو کہتے ہیں، کسی تخیل کا نام اسلام نہیں ہے، اس لئے اسلامی چیز عمل سے ظاہر ہوگی، قول سے نہیں ہوگی اور جو چیزیں پیش کی گئی ہیں، وہ اسلام کی چیزیں پیش کی گئی ہیں۔

اس لئے کہ ایمان تو بحمداللہ ہر ایک دل میں موجود ہے۔ ہم جتنے بھی ہیں، آخرت کے، اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت کے بھی قائل ہیں اور سب چیزوں کو حق مانتے ہیں۔ اس لئے اس کے بارے میں کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو موجود ہی ہے۔ کسر اور کوتاہی جو ہم میں ہے وہ عمل میں ہے عقائد میں نہیں ہے۔ اس واسطے عمل ہی کی چیزیں زیادہ بیان کی گئیں۔ اس لئے اس چیز کی تمنا اور توقع بھی ہے کہ وہی چیزیں آگے ظاہر بھی ہوں۔ تو اصل شکریہ وہی ہوگا۔ اس لئے قول کا شکریہ بلاشبہ ایک قدر کے قابل چیز ہے۔ اس لئے کہ شکریہ جس طرح زبان اور قلب پر آتا ہے، اسی طرح عمل پر بھی آتا ہے۔ قلب کے شکر کے معنی اعتراف کے ہیں۔ زبانی شکر کے معنی بولنے کے ہیں۔ عملی شکر کے معنی عمل کرنے کے ہیں۔ تو قلب میں اور زبان پر بھی بحمداللہ شکر گزاری کے جذبات اور اقوال موجود ہیں۔ اب آگے انتظار ہے تو عملی زندگی کا ہے۔ عملی چیزیں سامنے آئیں، جن کے اوپر چلا جائے۔ پھر شکریے کی تکمیل ہو جائے گی۔

دنیوی مشکلات کے حل کے لئے دینی وروحانی تدبیر...... جو حالات آج کل پوری دنیا میں اور یہاں

① المسند للامام احمد، مسند انس بن مالکؓ، ج: ۳ ص: ۱۳۴ رقم: ۱۲۴۰۴۔

(افریقہ) بھی پیش آرہے ہیں۔ وہ زیادہ تر دین ہی کے اعتبار سے فی الحقیقت پریشان کن ہیں۔ دنیوی اعتبار سے مشکلات ہیں مگر دنیا کی مشکلات زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتیں کیونکہ عارضی ہوتی ہیں۔ ہوتی بھی ہیں ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ اگر دینی تکلیف پیش آئے، وہ زیادہ سوہان روح ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے مصیبت کا تذکرہ کیا۔ تو کیسا اچھا حل دل کو ہلکا کرنے کے لئے بتلایا۔

فرمایا جب کوئی مصیبت آئے پہلے یہ سوچے کہ وہ تمہارے دین پر آئی ہے یا دنیا پر آئی ہے۔ اگر دنیا پر آئی ہے تو وہ شکر گزاری کا موقع ہے۔ کہ الحمد اللہ دین محفوظ ہے، جو کچھ گزر رہی ہے دنیا پر گزر رہی ہے اور دنیا کی مصیبت چند دن کی ہوتی ہے۔ مگر دین کی مصیبت پائیدار ہوتی ہے، وہ لمبی چلتی ہے، اس کے آثار زیادہ ہوتے ہیں۔ اس واسطے اگر دین آفتوں سے محفوظ ہے، تو ہمارے لئے شکر کا موقع ہے۔

دنیا کی آفات بلاشبہ تکلیف دہ ہیں۔ لیکن ان کے حل بھی ہیں دنیوی اعتبار سے بھی، شرعی اعتبار سے بھی، وہ مصیبتیں ختم بھی ہو سکتی ہیں۔ خود دنیا ہی ختم ہونے والی ہے۔ تو اس کی مصیبتیں بھی عارضی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: انسان پر جو بھی مصیبت آتی ہے، وہ اپنی ایک عمر لے کر آتی ہے۔ اس میں اجمالی درجہ میں اس کا کچھ دفعیہ اور تدبیر کرو۔ مگر زیادہ اللہ کو سونپ دو۔ جب اس کی عمر پوری ہوگی، وہ اپنے وقت پر خود ختم ہو جائے گی اور اگر زیادہ ہاتھ پیر مارے تو بعض دفعہ الٹ پڑ جاتی ہے۔ جیسے کوئی شخص بیمار ہو تو، ڈاکٹر یا طبیب کو بلائے اور اپنا معمولی علاج شروع کر دے، بیماری اپنے وقت پر گزر جائے گی لیکن اگر اتنا اہتمام کیا کہ ایک ڈاکٹر صبح کو اور ایک شام کو اور ایک دوپہر کو علاج کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ وہ علاج معالجہ ہی خود مرض بن جاتا ہے۔ مرض کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

اگر کوئی چڑیا کسی جال میں پھنس جائے، تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ آہستہ بیٹھی غور کرتی رہے کہ کونسا سوراخ ہے جس سے میں جال سے نکل کر بچوں اور اگر زیادہ ہاتھ پیر مارنے شروع کئے تو جال اتنا پھنس جائے گا کہ پھر نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ تو مصیبت جب آتی ہے تو زیادہ ہاتھ پیر مارنے سے آتی ہے۔ صبر و تحمل اور تدبیر کہ کس راستے سے نکلیں، اس کی تدبیر، کیا ہو سکتی ہے۔ سکون و صبر کے ساتھ وہ کی جائے۔ کچھ مصیبت کو گوارا کر لیا جائے۔ کچھ تدبیر کی جائے اگر آدمی یوں چاہے کہ مصیبت آنے نہ پائے اور بالکل ختم ہو جائے۔ یہ ناممکن ہوا کرتا ہے یہ دنیا کی فطرت کے خلاف ہے۔ تو کچھ تھوڑی سی وہ گوارہ کی جائے، تھوڑی سی تدبیر کی جائے۔ بیچ کا راستہ نکل آتا ہے۔ مصیبت کو ہاتھ پیر مار کر بالکل دفع کرے تو آدمی پھنس جائے گا اور بالکل چپ بیٹھا رہے تب بھی دوامی طور پر پھنسا رہے گا۔ بیچ ہی کی چال کار آمد ہوتی ہے۔ بہر حال دنیوی مصائب آتے بھی ہیں، جاتی بھی ہیں۔ زیادہ خیال کرنے کی چیز یہ ہے کہ دینی مشکل نہ ہو جو ہمارے دین پر کچھ بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے جتنا بھی عرض کیا وہ دینی امور کے بارے میں عرض کیا، دنیوی، سیاسی یا انتظامی

معاملات ظاہر ہے کہ میں ایک غیر ملکی آدمی کہہ ہی کیا سکتا ہوں اور کہنے کی ضرورت جب ہو، جب ملک کے اندر با فکر اور باتدبیر لوگ موجود نہ ہوں وہ خود ہی متفکر ہیں اور تدبیر میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنا کام تو یہ ہے کہ دعا کی جائے۔ ہم دعا کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہر مشکل سے آپ حضرات کو بچائے اور امید ہے کہ مشکلات رفع ہوں گی۔ حسن نیت اور تدبر کے ساتھ چلا جائے اور اللہ سے معاملہ صحیح کر لیا جائے، مشکلات رفع ہو جائیں گی اور مشکلات تو انسان پر آتی ہیں۔ اس لئے کہ دنیا نام ہی مشکلات کا ہے۔ اگر مشکلات نہ ہوں پھر اس کو جنت کیوں نہ کہا جائے؟ اور جنت کی پھر طلب کیوں ہو؟ یہ سب اس لئے ہے کہ دنیا مشکلات کا نام ہے۔

بہر حال اس کی دعاء ہے اور انشاء اللہ رہے گی کہ حق تعالیٰ آپ حضرات کی ہر قسم کی دینی اور دنیوی مشکلات حل فرماوے۔ (آمین)

مصائب سے بری و بالا کردے اور طمانیت و سکون کی زندگی دین و دنیا دونوں کے لحاظ سے نصیب فرماوے۔ (آمین)

اس لئے میں جو کچھ بھی عرض کر رہا ہوں، وہ درحقیقت اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار ہے کہ خود میں کتنا متاثر ہوا۔ آپ تو اپنے دینی جذبات کی وجہ سے کچھ کلام سن کے متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن میں عمل کو دیکھ کے متاثر ہوں کہ پچیس دن میں ہر قسم کی محبت و مدارات اور قدر دانی سامنے آئی۔ ابتداء میں آتے ہوئے مجھے تشویش تھی کہ معلوم نہیں کیسا ماحول ہوگا۔ لوگ کچھ بات بھی سن سکیں گے یا نہیں؟ کس قسم کے جذبات ہوں گے۔ جب دور بیٹھے ہوئے اجنبیت ہوتی ہے، تو آدمی کو تخیلات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے کہ میرے عزیز نے بیان کیا۔ آنے کے بعد پہلے ہی دن معلوم ہوا کہ اپنے عزیزوں میں آ گئے۔ کوئی اجنبیت اور بعد محسوس نہیں ہوا۔ بالکل جیسے ہم گھر والے ہوتے ہیں اور پچیس دن کے بعد تو آدمی ویسے ہی گھر والا ہو جاتا ہے۔ مگر ہم تو پہلے ہی دن گھر والے ہو گئے۔

اس پر میں جتنا بھی شکر گزار اور اپنے جذبات اور قلب کے تاثرات کو ظاہر کروں، وہ کم ہی کم ہوں گے، سوائے اس کے کہ میں دعا کروں اور دعا کا وعدہ کروں اور آپ حضرات کے سامنے پیش کیا کر سکتا ہوں۔ البتہ اتنی بات آپ حضرات سے عرض کرنی ہے کہ یہ مشکلات کا زمانہ ہے۔ جس طرح اور تدابیر کی جاتی ہیں اور اہل الرائے جو تدابیر بتلاتے ہیں۔ اس پر چلا جائے۔ وہ تدبیریں اپنی جگہ ہیں۔ لیکن روحانی طور پر بعض ادعیہ اور چیزیں ایسی ہیں، وہ بھی مشکلات کے حل کے اندر معین ہیں اور ایک مسلم کیلئے ان سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ اللہ کے بتلائے ہوئے راستہ پر آدمی چل پڑے اور اس سے قطع نظر کرے کہ کیا ہوگا؟ بس وہ حل ہو جائے گی۔ مگر ہم ایسے ماحول میں ہیں۔ اس درجے کا تو ہمارا ایمان نہیں ہے کہ بالکل ہر چیز سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو روحانی سلسلے میں ڈال دیں لیکن میں کہتا ہوں کہ دنیوی و معاشرتی تدابیر ضرور ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ دینی تدابیر سے بھی غافل نہ رہا جائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشکلات پیش آتی ہیں۔ بعض غزوات اور جنگوں میں جب غیر مسلموں سے مقابلہ پڑا

ہے تو حق تعالیٰ نے اس وقت آیت اتاری۔ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ① اور اس کا ثمرہ بھی بتلایا کہ ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ ② اور جوں ہی صحابہؓ نے اس کا ورد شروع کیا تو اللہ کی خبر ہے کہ انقلاب پیدا ہو گیا اور مصیبت سے نعمت آ گئی۔ اور اللہ کے فضل سے برائیاں دور ہو گئیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص کم سے کم روزانہ صبح کی نماز کے وقت سو مرتبہ ورد کر لیا کرے اور یہ نیت کر لیا کرے کہ میری بھی مشکل حل ہو اور میرے بھائیوں کی بھی۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس کے بارے میں اللہ کا وعدہ ہے۔ ہر ایک وعدہ ٹل سکتا ہے اللہ کا وعدہ نہیں ٹل سکتا۔ یہ تو لکھی پڑھی بات ہے۔ اس سے مشکلات حل ہوں گی۔ اس لئے ایک تو یہ اور ایک یہ آیت کریمہ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ③ یہ حضرت یونس علیہ السلام کو تدبیر بتلائی گئی تھی جب کہ وہ مصیبت میں گرفتار ہوئے، اور مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو یہ دعاء تلقین فرمائی۔

اس کا اثر یہ نکلا کہ مصیبت ختم ہوئی اور ایسی بہترین فضا سامنے آئی کہ یونس علیہ السلام کے سامنے کامیابیاں ہی کامیابیاں تھیں۔ کوئی ناکامی باقی نہیں رہی۔ یہ ہمارے اعتقادات میں کچھ ضعف اور سستی ہے، جس کی وجہ سے ہم پورا دھیان نہ دے سکے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تجربہ تو کر کے دیکھئے، انشاء اللہ حالات بدلیں گے، یہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے۔ کسی اور کا بتلایا ہوا نسخہ نہیں ہے، جس کے علم میں کوئی کوتاہی ہو تو ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ④ صبح کو سو مرتبہ ورد کر لیا جائے اور ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ⑤ سوتے وقت اس کا ورد کر لیا۔ تو صبح کی دعا تو مصیبت سے نعمت کا انقلاب پیدا کرے گی اور شام کی یہ دعا غم سے مسرت اور ناکامی سے کامیابی کا انقلاب پیدا کرے گی۔ انہی دو چیزوں کی ضرورت ہے کہ زندگی کامیاب ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیوی تدبیر بھی کرو۔ مگر ظاہر بات ہے کہ محض تدبیر تو کارگر نہیں ہوتی اور اس پر اثرات پیدا کرنے والے تو اللہ ہی ہیں، اس لئے تدبیر تو بندے کا فعل ہے، لیکن بندہ فاعل تو نہیں ہے، فاعل مختار تو اللہ ہے، اس میں اثر ڈالنے والا تو وہ ہے۔ چھری کے اندر کاٹنے کا اثر ہے۔ لیکن اگر اللہ اثر چھین لے تو چھری کام نہیں کر سکتی۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری رکھی گئی تھی، چھری کی دھار بھی تھی، گلہ بھی نازک تھا۔ چاہئے تھا کہ کاٹتی اور اپنا اثر دکھاتی۔ مگر تاثیر نکال دی گئی تھی۔ کوئی اثر نہ دکھا سکی۔ گویا چھری میں اثر دینا یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا۔ آگ کی تاثیر جلانا ہے۔ لیکن حقیقت میں اللہ کی قدرت اور مشیت جلاتی ہے۔ آگ نہیں جلاتی۔ اس میں سے جلانے کی تاثیر نکال لی گئی۔ وہی آگ باغ و بہار بن گئی۔ اللہ رب العزت جو فاعل حقیقی

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۳۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۴۔ ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۷۔ ④ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۷۳۔ ⑤ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۷۔

ہیں۔ ان سے معاملہ صحیح ہونا چاہئے۔ آگ کو پانی ٹھنڈا کرنے والا نہیں ہے، مشیت ٹھنڈا کرتی ہے۔ اگر پانی کو آگ بنا دیں تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح چھری نہیں کاٹتی مشیت حق کاٹتی ہے۔

اس واسطے مشکلات کے رفع کرنے کی جہاں اور تدابیر کی جائیں وہاں بڑی تدبیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلائے ہوئے نسخوں کو استعمال کیا جائے اور اس کا ورد کیا جائے۔ امید ہے کہ چند دن کے بعد ہر شخص محسوس کرے گا کہ کچھ انقلاب ہوا ہے۔ کچھ خیر کی طرف بات آ رہی ہے۔ اس واسطے ادھر توجہ فرمائی جائے۔

شریعت کا ہر حکم دینی و دنیوی فوائد پر مشتمل ہے...... اس کے علاوہ جو جو چیزیں وقتاً فوقتاً عرض کی گئیں۔ وہ حقیقت میں دینی اعتبار سے بھی نافع تھیں، دنیوی اعتبار سے بھی۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں جس میں آخرت کے ساتھ دنیا کا مفاد شامل نہ ہو۔ گو میں نے اس کی پوری تشریح نہیں کہ کہ دنیوی فوائد کیا کیا ہیں۔ زیادہ دینی فوائد بتلائے گئے ہیں۔ لیکن جب آپ کریں گے، دنیوی فائدہ بھی آخرت کے ساتھ اس پر مرتب ہوگا۔

مسواک کے بارے میں علماء لکھتے ہیں اور احادیث میں ہے کہ مادی فائدہ تو یہ ہے کہ منہ میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سے امراض رفع ہو جاتے ہیں۔ آخرت کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی کو مرتے وقت کلمہ نصیب ہوتا ہے یہ گویا مسواک کی تاثیر بتلائی گئی۔ یہ اثر کیوں ہے؟ اس میں کیا راز ہے؟ اس کی تشریح اس وقت مقصود نہیں ہے کہ مسواک کرنے سے مرتے وقت کلمہ کس طرح منہ سے نکلے گا؟ یہ لمبا مضمون ہے۔ مگر بتلانا یہ ہے کہ اس میں دونوں فائدے ہیں۔ منہ کی خوشبو، یہ مادی فائدہ اور کلمہ نصیب ہو جانا یہ روحانی فائدہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شہادت کی حالت میں تھے، تو آپ مرض میں مبتلا تھے، زخم گہرا تھا، وفات قریب تھی۔ ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ جب وہ واپس چلا گیا۔ فرمایا اس نوجوان کو بلاؤ۔ اس کی لنگی پیروں سے اتنی نیچے پڑے ہوئی تھی کہ زمین کے اوپر گھسٹتی ہوئی آ رہی ہے۔ فرمایا "یَافَتٰی! اِرْفَعْ اِزَارَکَ فَاِنَّهٗ اَنْقٰی لِثَوْبِکَ وَاَتْقٰی لِرَبِّکَ" (1) "اے عزیز! اس لنگی کو زمین پر گھسیٹنے کی بجائے اوپر ٹخنوں تک اٹھا۔ یہ کپڑے کے لئے پاکی کا ذریعہ بنے گا اور تیرے لئے پروردگار کی رضامندی کا ذریعہ بنے گا۔ مادی فائدہ بھی بتلایا، آخرت کا فائدہ بھی بتلایا"۔

اسی طرح حدیث میں ہے "صُوْمُوْا تَصِحُّوْا" (2) "روزہ رکھو، صحت حاصل کرو"۔ تو روزہ کا دنیوی فائدہ صحت ہے اور آخروی فائدہ رضاء خداوندی ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا جہاں مادی تدابیر اختیار کی جائیں۔ وہاں روحانی تدابیر سے غفلت نہ کی جائے۔ اس پر انشاء اللہ دنیوی فوائد بھی مرتب ہوں گے۔

نیز دنیوی اور دینی تدبیر میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ صحیح ہے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ اس لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ صبح کے وقت بیٹھ کر دس پندرہ منٹ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ (3) کا ورد کر لے اور رات

---

(1) مصنف ابن ابی شیبة، ج: ٦ ص: ٢٧. (2) حدیث موضوع ہے دیکھئے: تذکرة الموضوعات ج: ١ ص: ٧٠.

(3) پارہ: ٤، سورة آل عمران، الآية: ١٧٣.

کو سوتے وقت پانچ منٹ صرف کر کے آیت کریمہ کا ورد کر لے۔ پھر انشاء اللہ اس کے اثرات نمایاں ہوں گے۔

میں نے ان چند کلمات سے اس وقت اپنے جذبات تشکر کا بھی اظہار کرنا ہے، اپنی محبت کا اظہار کرنا ہے اور دعا کے لئے دعویٰ تو نہیں کرتا۔ مگر بہر حال یہ ظاہر کرنا ہے کہ دعاء کے سوا اور کسی کا کا ہوں بھی نہیں۔ اس سے انشاء اللہ غفلت نہیں ہوگی۔ دعائیں برابر کرتا رہا ہوں برابر کرتا رہوں گا اور وہاں کے بزرگوں کو بھی توجہ دلاؤں گا کہ وہ بھی آپ سب حضرات کے لئے دعائیں کریں؟ ادھر دعاء ہو، ادھر مادی تدبیر اور روحانی تدبیر ہو۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مشکلات کا حل نہ نکلے۔ دنیوی و دینی دونوں مشکلات انشاء اللہ ختم ہوں گی۔

بار دگر شکریہ...... ان چند الفاظ کے ساتھ میں پھر مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ حضرات سے بھی دعاؤں کا خواہشمند ہوں۔ آپ دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں۔ مادی چیزیں منقطع ہو جاتی ہیں۔ لیکن دعاء منقطع نہیں ہوتی۔ اگر انسان آخرت میں بھی چلا جائے، جب بھی دعاء وہاں پہنچتی ہے۔ اس لئے اس سے آپ بھی فراموش نہ فرماویں۔

رہا یہ کہ یہاں دوبارہ آنا۔ تو میں کہتا ہوں کہ مولانا عمر دین صاحب کم ہمتی کیوں فرماویں کہ میں جوہانسبرگ سے یہاں آؤں۔ یہ ہمت فرمائیں کہ میں ہندوستان سے لوٹ کر پھر یہاں آ جاؤں۔ اس چیز کی کیا ضرورت ہے کہ میں تھوڑی دور جا کے پھر واپس آؤں۔

آپ کی محبت کی تو بے شک یہی بات ہے کہ تھوڑی دور سے واپس آؤں۔ مگر اصول یہ ہے کہ ڈاکٹر بھی موجود ہیں۔ وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ بھوک چھوڑ کے کھانا چاہئے۔ زیادہ پیٹ بھر کے آدمی کھالے گا تو کھانے کی طرف توجہ باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کچھ بھوک چھوڑی رکھنی چاہئے تاکہ بھوک باقی رہے اور دوبارہ خواہش ہو کہ پھر کھانا آئے اور جلدی جلدی کھانے میں معدہ خراب ہوتا ہے۔ بیچ میں کچھ فاصلہ ہونا چاہئے۔ اس واسطے آپ ہمت سے یوں کہیں کہ ہم وہاں سے بلوائیں گے۔ جوہانسبرگ سے بلوانا کوئی زیادہ ہمت کی بات نہیں ہے اور میں انشاء اللہ حاضری کے لئے تیار رہوں گا۔ نکما تو ہوں گا جیسے اب نکما ہوں، پھر رہوں گا۔ مگر آنے کے لئے بہر حال تیار رہوں گا۔ حق تعالیٰ حاضری بھی نافع فرماوے اور جو کچھ آپ حضرات کے لئے کہا جائے وہ بھی۔

ان چند جملوں کے ساتھ میں اپنے بھائیوں کا بہنوں کا اور اس ملک کے تمام مسلم باشندوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے اپنی محبت اور مدارات سے ہمارے قلوب کو موہ لیا ہے اور اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ حق تعالیٰ اس محبت کو باقی رکھے اور اس کو دارین میں ثمرات صالحہ کا ذریعہ بنائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ